

30/1/86

اسلامی معاشیات

اسلامی علوم کی فہرست میں ایک جدید فن کا اضافہ،
شیخ نظام کا ایک تحقیقی مرقع، روئے زمین کے
کابروقت جواب مولانا
گیلانی سے قرآنی آیتوں اور نبوی حدیثوں
کے ایسے نئے تشریحی پہلو جو اس کتاب میں پہلی دفعہ
پیش کئے گئے ہیں

مناظر الگملانی
سید طر اسنانی
صدر الشیخہ الدینیہ فی الجامعہ العثمانیہ

طائر طائر

دارالزاق

الکادارہ اشاعت اردو

عابد و وحید آباد

طبع اوّل

Rs 15.00

ایک نمبر

۱۹۴۶ء



پروپرائیٹر

سید عبدالرزاق تاج سکرکت
مالک ادارہ اشاعت اردو

عابد روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ رزاقی مشین پریس
ہدیر آباد دکن

فہرس

باب اول اسلامی معاشیات

۶	ایک تاریخی بیان	۱	ناب
۷	قرآن کے تاریخی بیان کا تجزیہ	۱	بدائش اور اسلام
۸	معاش گریز رجحانات کا اخروی انجام فسق ہے	۱	معاشی مسائل کے تاریخی انسان کے
۱۳	اسلام کے مذہبی خدام کی خصوصیت	۱	اور باہر
۱۱	معاشی مسائل کی اہمیت حدیثوں میں	۱	م کا نظام نانہ
۱۲	امت کی معاشی خوشحالی کیلئے پیغمبر کی دعا	۱	م کے معاشی میدان میں
	مسلمانوں کی معاشی پریشانی کو دیکھ کر پیغمبر کا	۲	مدار محنت
۱۱	پریشان ہو جانا	۱	ربایہ اور قرآن
۱۱	خوشحالی کو دیکھ کر پیغمبر کے چہرے کا دمک اٹھنا	۱	محنت اور قرآن
۱۱	اپنی آپ مدد پر لوگوں کو آمادہ کرنا	۱	محنت کی آسان شکل
	معاشی سہولت کے لئے ایک فرض نماز کی	۱	تنظیم اور قرآن
۱۶	فرضیت ساقط کر دی گئی	۱	کاروبار کے ضروری شرائط
۱۶	حضرت عمر کا ایک دلچسپ تعلیمی واقعہ	۱	کے راہبانہ اور مشرق کے جوگیانہ
	قیامت بھی قائم ہو رہی ہو جب بھی معاشی	۳	ت
۱۱	کاروبار کو ترک نہ کرنا چاہئے	۱	آخری نعمتوں
	زمین کی آباد کاری بھی مسلمانوں کے قرآنی	۴	
۱۱	فرائض میں ہے	۱	مد میں شراب کا کوئی پہلو نہیں
۲۱	آخرت کی آبادی کے لئے دنیا کو آباد کرنا	۱	راعت اور باغبان کے ساتھ قرآن
۱۱	کائنات کے جمالی پہلوؤں کی طرف چند	۱	خصوصی تعلق
۱۱	آنی اشارے	۱	معاشی گریز رجحانات

۲۳ مردوں کے ساتھ بھی اسلام کا جہاد فی سبیل اللہ نظر
 ۲۴ بدو وضع وید ہیئت شکل شیطان کی شکل ہے
 ۲۵ دارحی کے متعلق حضرت عمر کا ایک دلچسپ واقعہ
 ۲۶ درندوں کی صورت
 ۲۷ اسلام اور حسن کاری
 ۲۸ خدا بھی جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے
 ۲۹ حسن کار صناعتوں کا طبقہ خدا کو محبوب ہے
 ۳۰ معاشی جدوجہد بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے
 ۳۱ چند انقلابی صناعات کا انتساب پیغمبروں
 ۳۲ کی طرف قرآن میں
 ۳۳ قرآن کے ضمنی اشارے کی قیمت
 ۳۴ خود ایجادات کی مخالفت صحیح نہیں ہے
 ۳۵ جدید صنعتوں کے متعلق پیغمبرانہ نمونے
 ۳۶ غیر اقوام کی مفید صنعتوں کے سیکھنے پر
 ۳۷ پیغمبر اور صحابہ کا اجماع
 ۳۸ عہد نبوت میں رومی دبا ہے
 ۳۹ رومی دبا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 ۴۰ نے خود بنوایا تھا
 ۴۱ عجمی یا سن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
 ۴۲ مسجدوں کے ممبر کی تاریخ
 ۴۳ مسجد نبوی میں کرسی
 ۴۴ انگریزی دوا اور مسلمان
 ۴۵ عربی کمانوں پر ایرانی کمانوں کو ترجیح دی گئی
 ۴۶ عہد عثمانی میں ہوائی بونچکیاں مدینہ میں
 ۴۷ ہوائی قوت کی طرف قرآن کا ایک اشارہ
 ۴۸ خالص دنیوی امور کے معاشی نتائج
 ۴۹ ایک مغالطہ کا ازالہ
 ۵۰ اسلامی عبادات کی فلاسفی
 ۵۱ مولینا تھانویؒ کا ایک لطیفہ

آسمان وزمین کی برکتیں اور ایمان و تقویٰ
 مشکل سے تقویٰ سے
 ایمان والوں کو
 مقابلے میں بسایا جائے
 پانی برسانے کا قرآنی طریقہ
 حصول معاش کا قرآنی طریقہ
 دعائی تدبیر کی کامیابی و ناکامی
 کیا دعا صرف طفل تبتلی ہے
 بعض دعائی آیتوں کے متعلق غلط فہمی
 پیغمبروں کی بھی ہر دعا قبول نہیں ہوتی
 جنگ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعائی اضطراب
 دعائی تدبیر کے ساتھ عقلیت
 دونوں شعبوں میں فرق
 حق تعالیٰ کو
 طالبہ
 اصنامی نظام معاشی نظام ہے
 معذرت
 اس دشواری کے حل کی سہولت
 الملائکہ یا زندہ روحوں کے متعلق قرآن کا بیان
 حق تعالیٰ کو صرف اللہ المعاش بنانے کے نتائج
 حق تعالیٰ کو صرف اللہ المعاش بنانے کا مہلک خطرہ
 معاشی ضرورتوں کو خدا سے مانگنا
 نکما اور ناکارہ بنا دیتا ہے
 سلطانی و غیر سلطانی قوانین کا فرق
 لفظ سلطان
 غیر مسلم اقوام کی دنیاوی کامیابیوں کا
 امریکہ یورپ کی کامیابیاں
 علمیات کے متعلق ایک سرسری

۲۸۷	معاشیات کے دوا سکول
۲۸۸	دوسرا مکتب خیال
"	اسلام میں اشیاء کی معاشی تقسیم
۲۹۰	اشتراکی سرمایہ پانی، آگ، گھاس
۲۹۱	اشتراکی سرمایہ کے لمحات
۲۹۳	پانی کی مختلف قسمیں اور ان کے مختلف احکام
۲۹۴	بڑے بڑے دریا کا پانی
"	بڑے دریاؤں سے نہروں کا نکالنا
"	ان دریاؤں کے پانی کی قوت سے چکی وغیرہ
۲۹۵	چلانا یا موٹو چرس ان پر قائم کرنا
"	دریاؤں کے سوا پانی کے اقسام
"	نہروں، کنوؤں، تالابوں کے پانی کے
"	فروخت کا حکم
۲۹۶	پانی کی وہ قسم جو بیک سکتی ہے
"	شدید ضرورت کی چیزوں میں اشتراکیت کا
۲۹۷	نقطہ نظر
"	مملوکہ پانی میں بھی اشتراکیت کا اثر
"	مچھلیوں کا حکم
"	مچھلیوں کے سوا دوسری آبی پیداواروں
۲۹۹	کا حکم
۳۰۰	سیال معدنیات کے احکام
۳۰۱	نمک کا مسئلہ
۳۰۲	عام معدنیات کا حکم
۳۰۳	الکال (گھاس) کے مسائل کی تفصیل
۳۰۹	تیسرے اشتراکی سرمایہ آگ کے احکام
۳۱۰	عام شوارع اور راستوں کے احکام
۳۱۱	عام راستوں کا اسلام میں احترام
"	ہجر غیر آباد زمینوں کی ملکیت کے
۳۱۳	قوانین

۹۳	بین مغرب اور اس کے باشندوں کی
"	لازوال خصوصیت
۹۹	ہر حال آدمی ہے
۱۰۱	
۱۰۶	سری خصوصیت
۱۱۳	شہی ذخیرے کی نوعیت
۱۱۶	کی پانچ کجیاں
۱۱۷	نمائت رزق کا مطلب
۱۱۹	مذہب کے معاشی نظریے
۱۲۰	ت انسانی کے بعض عقلی نظریے
۱۲۱	نظریہ
۱۲۲	اور رہبانیت
۱۲۳	ح کا مطلب
"	از مالہ
"	م کی راہ
۱۱۱	سج اخلاق کا اسلامی طریقہ
۱۲۸	مالہ کی اسلامی تدبیر
۱۳۷	قدر کی قرآنی اصطلاح کی تشریح
۱۷۵	سطی رزق کی ذمہ داریاں
۱۹۲	ذری معیشت اور قانونی صبر
"	سطی معیشت کی ذمہ داریوں کی خلاف
۲۰۳	کے نتائج
"	معیشت اور اس کی ذمہ داریوں
۲۴۲	کے نتائج
"	شہادت منہن بلکہ قدرت کا
۲۴۹	

باب دوم

عامی معاشیات کے قانونی ابواب

۱۵ شغل اصل
۱۶ حکومت اور قیمتیں
۱۷ تجارتی سسٹم
۱۸ سرمایہ کا استعمال
۱۹ محنت و مزدوری
۲۰ مزارعت و مساقات
۲۱ نقدی طریقہ زیادہ مفید ہے
۲۲ حکومت کی آمدنی اور اس کے مصارف
۲۳ واعراض
۲۴ حکومت کی آمدنی اور اس کے مصارف
۲۵ واعراض
۲۶ خراج کے دوسرے مصارف
۲۷ زائد محصول کے عائد کرنے کا حکومت کو اختیار
۲۸ الصدقات
۲۹ ایک تاریخی تغیر
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰

۳۱۵ اقطاع یا جاگیروں کا حکم
۳۱۶ اسلامی جاگیروں کا مطلب
۳۱۹ رعایا کی اسلام میں تہذیبی قوت
۳۲۰ دوامی بندوبست
۳۲۱ تجزیر کا مطلب اور حکم
۳۲۲ مالک کی مرضی کے بغیر کسی چیز پر قبضہ کرنا
" لفظ کا مطلب
" قانونی شفعہ
" غیر اسلامی حکومتوں کی رعایا کے ساتھ مسلمانوں کے معاشی تعلقات
۳۲۳ غنیمت و فتنہ کی حالت کی وجہ
" خیر اسلامی ممالک میں سود، قمار وغیرہ کا حکم
۳۲۴ ہندوستان میں مسکریوا (سود) کا مسئلہ
۳۲۶ اکل بالباطل کا مطلب
" گداگری کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر
" تندرست و توانا آدمی کو بھیک دینا
۳۲۷ بھی ناجائز ہے
۳۲۸ قمار اور اس کی مختلف صورتوں کی حرمت
۳۳۱ حرمت سود کی وجہ

فاتحہ الکتاب

الحمد لله وكفى والصلاة والسلام على عباده الذين اصطفى۔
اسلامی معاشیات کے نام سے وہی کتاب آپ کے سامنے پیش ہو رہی ہے، جس کے متفرق
مختلف مقالوں کی شکل میں ہندوستان کے بعض علمی مجلات (معارف اعظم گڑھ، سیاست
اردکن وغیرہ) میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

بجز چند مختصر مقالوں یا کسی مختصر سلسلے کے سوا جہاں تک میں جانتا ہوں اس موضوع پر اردو
عربی یا اسی قسم کی دوسری زبانوں میں بھی غالباً اب تک کوئی مستقل کتاب اس موضوع پر نہیں لکھا
نہی، کو یا ایک بالکل نئی راہ سنی جس پر چلنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ یہ ظاہر مضمون کی ندرت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ
علم اہل علم و نظر کی طرف توجہ کے اس سلسلہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ قدیم و جدید
ن حلقوں سے۔
رہنے کی ہمت ان ہی عہد

بن مسائل و مباحث کو اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہیں تو یہ ساری
باتوں ہی میں۔ لیکن اسلام اور اسلامیات کے بحر محیط سے ان ہی موتیوں کا چننا اور چن کر
اس طریقہ سے ان کو مرتب کرنا کہ انسانی معاشیات کے دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کا
یہی ایک مستقل معاشی نظام لوگوں کے سامنے آجائے، یہ ظاہر آسان نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ
ماوجود اس کوشش کے جو اس راہ کی پہلی اور ابتدائی کوشش ہے۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ
اس کی دشواریاں باقی ہیں اور بہت زیادہ باقی ہیں۔ صحیح معنوں میں وہی آدمی اس راہ
میں باب ہو سکتا ہے جو ایک طرف فنی طور پر عصر حاضر کے جدید علم (معاشیات) کا ماہر حکیم ہو
ری طرف اسلامی حقائق و مسائل کے حقیقی سرچشموں تک اس کی رسائی ہو۔ قرآن و سنت
شہرہ ائمہ اسلام نے "اسلامی آئین" کو جس شکل میں مرتب کیا ہے، براہ راست ان کے
مذہب سے ہے کہ تعلیمی نظام کی خرابی اب تک اس قسم کی جامع قابلیت
نی پیدا کی میں شدید کاوٹ کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا شعبہ دینیات تعلیمی ادارہ ہے۔ جس میں اس تعلیمی مافات کی تلافی
کوشش ایک حد تک کی گئی ہے۔ اس چیزوں کی ضرورت ہے ان کی طرف قدم اٹھایا جا رہا ہے

اگرچہ رفتار جیسی کہ چاہیے بوجہ عطف میر ہیں ہے۔

تاہم مستقبل میں اگر کچھ توقع کی جاسکتی ہے تو اسی ادارہ کے تعلیم یافتہ افراد ہر
کی جاسکتی ہے۔

سچ پوچھیے تو جس بُری بھلی ناقص اور ادھوری شکل میں یہ

وہ جامعہ عثمانیہ اور اس کے شعبہ دینیات کے تعلیمی ماحول ہی کا یہ نتیجہ ہے۔

اس کتاب کے متفرق ابواب جس وقت شائع ہونے کے لئے پریس میں دیئے گئے

اُس وقت بھی میں نے اس کا اظہار کیا تھا کہ شعبہ دینیات کے ایم۔ اے میں ایک امیدوار

عزیز مولوی محمد یوسف الدین ایم۔ اے (سلمہ) نے اپنے امتحانی مقالہ کا عنوان اسی مضمون کو قرار

دیا تھا۔ اور ان کے اصرار سے خاکسار نے ان کی اس مہم کی نگرانی کی ذمہ داری اسی

سرلی سٹی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ میری یہی نگرانی

خدا کا شکر ہے کہ برادر موصوف نے نہ صرف ایم۔ اے کے امتحانی مقالہ کے تیار کر

کا میا بنی حاصل کی، بلکہ ایم۔ اے پاس ہو جانے کے بعد لگے ہاتھ مجلس تحقیق

علمیہ (ریسرچ بورڈ) کی زیر نگرانی اسی موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لئے بھی مقالہ تیار کر

کی اجازت حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ شعبہ معاشیات کے صدر استاد جلیل الدین

انور اقبال قریشی صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی کی خصوص

میں انھوں نے اسلام کے معاشی نظریے کے عنوان

اس مقالے کو مرتب کر کے مجلس کے سامنے پیش بھی کر دیا ہے۔ عنقریب اس کا

ہو جائے گا۔ ایک طرف تو اس سلسلہ میں ان کا یہ کام مکمل ہو گیا اور دوسری طرف خاکسار کو بھی

راہ میں جو چیزیں ملیں وہ اس کتاب کی شکل میں پیش ہو رہی ہیں۔ پس ڈاکٹریٹ کا وہ مقالہ جو برادر موصوف

نے مرتب کیا ہے اور خاکسار کی یہ کتاب، دونوں کے دونوں کام شعبہ دینیات ہی کے خصوصی نظام تعلیم

ہی کے فرائض قرار پا سکتے ہیں گویا ان دونوں کاموں کی راہ سے اردو زبان میں ایک قطعی حصہ

جدید سرمایہ اور اس سرمایہ کا کافی ذخیرہ انشاء اللہ مہیا ہو جائے گا۔ اور یہ توقع

نہیں ہے کہ آئندہ اس راہ پر کام کرنے والوں کے لئے شعبہ دینیات اور اس کے

کی یہ خدمت ایک اچھے مقدمہ کا کام دے گی۔

اس موقع پر اس کا اظہار بھی غالباً نامناسب نہ ہو گا کہ اگر کتب

یہ دونوں کتابیں ایک ہی موضوع پر ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ

سے ہر ایک کام بجائے خود اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی معاشیات کے مطالعہ کرنے والے ان میں سے کسی ایک

کتاب کو دیکھ کر دوسرے کے مطالعہ سے بے نیاز نہ ہونے لگے۔ برادر موصوف

نے تو ان کے ممتحنین ہیں، لیکن خاکسار نے کن لوگوں کو پیش نظر رکھ کر کام کیا ہے۔ اس کا
 نازہ کچھ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اس کتاب کے جن ابواب کو
 شائع نہیں کرایا گیا تھا اور ان کی ضخامت بھی کافی ہے۔ ان
 باب میں نہ صرف سلام کے معاشی نظام کے بعض اساسی کلیات ہی ملیں گے بلکہ شراعی
 کے ایک بڑے حصے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی دفعہ اس کی تفسیر اور ان کے
 باب کے متعین کرنے کی اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ روزمرہ ہم
 قرآن کی جن آیتوں کی سرسری طور پر تلاوت کرتے ہیں غور کرتے کے بعد ان میں کیسے عجیب و
 غریب حقائق و اسرار پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ فقیر کے نزدیک کتاب کا یہ حصہ خاص اہمیت
 ہے۔ ناظرین سے امید ہے کہ ذرا تھم کر توجہ کے ساتھ کتاب کے اس حصہ کا مطالعہ
 کریں۔ گویا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فنی حیثیت سے علماء معاشیات کی نگاہوں میں خواہ
 بہت حاصل کرے یا نہ کرے۔ لیکن قرآن کے مطالعہ کرنے والوں کو انشاء اللہ
 اس کتاب کے ذریعہ سے بعض ایسی چیزیں مل سکتی ہیں جو اس کے نواشاں اور کہیں نہیں
 ملیں گے اور قرآن کے
 بات نہ میرا غرض
 بہت موقر اگر مجھے کچھ ملا۔
 اور دارالترجمہ سرکار عالی کا صدقہ ہے کہ اس کی بعض ترجمہ کرائی ہوئی کتابوں تک
 میری رسائی ہو سکتی تھی۔ اور اب اس کا افسوس ہوتا ہے کہ بجائے قدیم طریقہ تعلیم کے اپنی
 یہی زندگی میں کاش! مجھے بھی کسی ایسے ادارے میں پڑھنے کا موقع ملتا جیسا کہ جامعہ عثمانیہ کا
 شعبہ دینیات ہے، تو غالباً اس ناقص کام کو زیادہ بہتر اور مکمل شکل میں پیش کرنے کا فخر
 مجھ سے حاصل ہوتا۔ لیکن بالکلیم پرانے قدیم نظامی درس کے ایک مستفید کی طرف سے جو کچھ
 صورت میں یہ پڑیہ پیش ہو رہا ہے۔ میری معذوریوں کو سامنے رکھ کر کوتاہیوں سے
 چشم پوشی کریں گے، یہ ایک رُخ کی بات ہے جو ایک رُخی تعلیم کے ایک طالب علم کی طرف
 سے ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اسی کو سامنے رکھ کر کام کرنے والے اس کام کو بتدریج
 "انشات" کی دنیا میں "اسلامی معاشیات" بھی اپنی ایک مستقل جگہ اور

دارالترجمہ سرکاری کی کتابوں کے پروفیسر ایس برنی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی بعض
 اور مقالات کے پڑھنے کا بھی موقع اس مسئلہ میں مجھے ملا ہے، اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ اپنے برادر
 مولوی سید مظہر احسن گیلانی امراے لکچرار مولانا
 الطیفان دالانے کے بعد مجھے ا
 انشا

صحیح مقام حاصل کر لے و ان اسرید الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ
تو کلت والیہ انیب۔

حق تعالیٰ سے دعاء ہے کہ جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ
اس حقیر کام سے درست فرمائے، آرزو اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔
دل آزر دہ مارا بہ نشیہ بہ نواز یعنی آں جاں زتن رفتہ بن باز رساں
کاش! زندہ اسلام، مردہ مسلمانوں کی زندگی کا پھر اسی طرح سبب بن جائے جیسے
زمانے میں بنا ہوا تھا۔ ہذا والسلام۔

خاکسار

مناظر احسن گیلانی

۲۳۔ رمضان المبارک ایک بجے شعبہ
یکم ستمبر ۱۹۴۵ء جوا الجامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

—+—

ہدایت :- غیر مطبوعہ حصہ ص ۸۷ سے ۲۸۴ تک ہے اس کتاب کے جن اجزاء کو لوگ پڑھ
ہیں ان کو بہر حال اس حقہ کا مطالعہ

اسلامی معاشیات

پیدائش | "اسلامی معاشیات" جو میری اس کتاب کا عنوان بحث ہے۔ قبل تفصیلی مباحث کے میں چاہتا
 اور سلام | ہوں کہ پہلے معاشی سہولتوں کے ذرائع یا عاملین پیدائش FACTORS OF PRODUCTION.
 اور اسے استفادہ کے متعلق اسلام کا جو نقطہ نظر ہے۔ اس پر ایک اجمالی تبصرہ اسلامی وثائق و مستندات کی
 لوں، آئندہ مباحث کے سمجھنے میں انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بڑی مدد ملے گی۔

عمل کی نشان دہی | واقعہ یہ ہے کہ انسان کے اندر جن بے پناہ تخیلی قوتوں کا پتہ قرآن نے
 ان کے اندر اور باہر | اپنے مشہور مسئلہ خلافت میں دیا ہے اور ان قوتوں کی بنا پر آدمی سے باہر
 صرف زمین ہی نہیں بلکہ آسمان زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی پیداواروں پر
 ساقط ہے۔ روزی بندوں کے لئے ہے۔

میں جو غیر محدود فراخی اور بے تباہ کشادگی پیدا کی
 ہے۔ اگر کویش نظر رکھا جائے تو سچ سعدی کی مشہور تعبیر

ابو باد و مد و خورشید ہمہ در کارند | تا تو تانے بکف آری و غفلت ز خوری
 عالم کا نظام "تانی" کی بنیاد پر یہ کہنا مبالغے سے خالی ہوگا کہ اسلام کے نقطہ نظر سے کائنات کا یہ سارا نظام
 بکف آری کا نظام ہے | "تانی" بکف آری کا نظام ہے۔ یعنی قدرت نے اس نظام کو اسی لئے قائم فرمایا ہے تاکہ
 اپنی معاشی سہولتوں کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ آدمی اس سے استفادہ کرے، نفع اٹھائے۔ پھر "تانی"
 ہی کے اس مہیب اور عظیم کارخانے کو قرآن کا انسان کے سامنے رکھنا اور زمین کے اندر قوتی
 مواد کا جو ذخیرہ محفوظ کیا گیا ہے اس کی طرف

قدس فیہا اقواتہا۔ | ناپ تول کر رکھ دیے اقوات (غذائی
 (حم سجدہ ع ۱) | ذخیرے) اس کے (یعنی زمین کے) اندر۔

مواہ للسان لیلین۔ | برابر ہے تلاش و جستجو کرنے والوں کے لئے۔

ملائے عام اور ان تمام معاشی پیداواروں کو فضل اللہ کے احترامی نام سے موسوم کر کے جدوجہد کی توانا پول کو
 وابتغوا من فضل اللہ (۲۸) | اور ڈھونڈو اللہ کے فضل کو۔

مرد و عورت کا معاش | کے تشریحی حکم سے بیدار کرنا اور اس قید کے ساتھ بیدار کرنا

مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں۔

للرجال نصيب مما اكتسبوا

اور عورتوں کیلئے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں۔

للنساء نصيب مما اكتسبن (النساء ۵)

تاکہ ایک طرف تو یہ معلوم ہو کہ ان معاشی ذرائع سے استفادہ کا حق نسل انسانی کے کسی خاص صنف کے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے یہ میدان کھلا ہوا ہے۔

کر دیا گیا کہ قرآن کا مشہور قدرتی قانون

نہیں ہے آدمی کے لئے مگر وہی جو اس نے کمایا

اجرت بمقدار محنت | ليس للانسان الا ما سعى

قریب ہے کہ دکھائی دے اسے اپنی کمائی۔

وان سعيه سوف يری (النجم ۲۴)

کا تعلق جس طرح اخروی معاملات اور نتائج سے ہے، اسی طرح یہ قانون دنیاوی کاروبار پر بھی چسپاں ہے جیسے معادی زندگی میں ہر شخص اسی کے پانے کا حقدار ہوگا جو اُس نے کمایا ہے اور اُس کے سامنے اس کی کمائی ہی نتیجے کی شکل میں پیش ہوگی۔ یوں ہی معاشی زندگی میں ہر ایک کا نصیب اور حصہ اُس کی محنت اور کوشش کی مناسبت ہی پر مبنی ہے۔ وہ جتنی محنت و جاں فشانی کرتا ہے، اسی حساب سے وہ حصہ

سرمایہ اور قرآن | سورة النساء کی آیت۔

اور نہ دیا کرو کم عقلوں کو اپنے اموال وہی جسے

ولا تؤتوا السفهاء اموالکم التي

بنیاد سے نہ دے گئے سہارا۔

جعل الله لكم قیاما۔

”اموال“ یا ”سرمایہ“ اور ”اصل“ کو انسان کے محتاط رہنے کی تاکید فرمائی، اسی طرح حضرت مرثی علیہ السلام کے سسے میں

محنت اور قرآن | ان خیر من استاجر القوی

یقیناً جسے تو نوکر رکھے اس میں اچھا وہ ہے جو

الامین (القصص ۲۶)

قوت والا ہو، اور امانت والا۔

محنت کی کے الفاظ سے جسمانی محنت و مزدوری کی بنیاد کو دو لفظوں ”القوی“ اور ”الامین“ کے ذریعے اساسی شرط ظاہر کرنا۔ یعنی اس قسم کے کاروبار کے لئے جس کی سرانجامی میں دماغ سے زیادہ ہاتھ پاؤں کی حرکت کی ضرورت ہوتی ہے توجہ دلائی جاتی ہے کہ صحیح نتائج کی امید اسی وقت لگائی جاسکتی ہے۔ جب کرنے والے جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ اپنے فرض اور خدمت کی بجا آوری میں خیانت اور بددیانتی سے کام نہ لیں۔ بلکہ ”الامین“ ہوں۔

تنظیم اور قرآن | پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے قفقے میں بادشاہ مصر سے ان کی گفتگو، اس گفتگو میں

علیہ السلام کا تنظیمی کاروبار کے سلسلے میں یہ فرمانا کہ

مقرر کرد مجھے زمین کی پیداواروں پر میں تملک

اجعلنی علی خزائن الارض (۶۷)

کرنے والا اور علم والا ہوں۔

حفیظ علیم (سورہ یوسف ۶۷)

تنظیمی کاروبار کے یعنی زمین کی پیداوار اور (خزائن الارض) کے تنظیم و ترتیب اور بدولت کے لئے جب ضروری شرائط حضرت نے اپنے آپ کو پیش کیا، تو اس وقت ہی کاروبار کے لئے جن صفات کی ضرورت

ضروری شرائط

یہ دو لفظوں (حفیظ و علیم) کی شکل میں ظاہر فرمایا مطلب یہ تھا کہ اس قسم کے کام میں ایک تو حفظ (یعنی
 ناؤنگرائی دیکھ بھال کا سلسلہ ناگزیر ہے) دوسرے علیم (یعنی نظم کرنے والے کی معلومات کو وسیع ہونا چاہیے)
 مسئلے میں دماغی اور ذہنی سرمایہ کی ضرورت ہے، بظاہر قرآن کے یہ چند اشارے
 میرے خیال میں یہ ایسے اشارے ہیں کہ غالباً غور کرنے والے ان میں وہ سب کچھ پاسکتے ہیں جو معاشیات
 کے مسائل میں آج ہزار ہا ہزار اوراق کے اندر بھی عالمیں پیدا کُنش (FACTORS OF PRODUCTION) یعنی
 سرمایہ، محنت، تنظیم کے متعلق بہ شکل مل سکتے ہیں، یا یوں کہئے کہ علماء معاشیات جن نتائج تک پہنچا
 سال کی فکر و نظر، تحقیق و تجسس کے بعد پہنچے ہیں۔ قرآن نے چند الفاظ میں ان آخری نتائج کو اشاروں اشاروں
 میں بیان کر دیا ہے۔ آئندہ ابواب میں اپنی اپنی جگہ ان ہی امور کے متعلق اسلامی نقطہ نظر سے تفصیلی بحث
 کی جائے گی۔ اس وقت ان کے ذکر سے مقصد صرف اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جو عام طور پر اسلام کے متعلق
 بھی پھیل چکا ہے۔ یعنی مذہب، اور دین کے غلط نام سے مختلف اقوام و اہم کے اندر جو
 معاشی گریز اور رجحان پیدا ہو گیا تھا، خیال کر لیا گیا ہے کہ اسلام بھی چونکہ مذہب ہے۔ اس لئے معاشی مسائل
 کے متعلق اس کا نقطہ نظر بھی ہی ہوگا، حالانکہ ابھی کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ مگر گذشتہ بالا چند سطروں میں جو کچھ بھی
 کہا ہے کیا ان کو دیکھ کر اس کے لئے کوئی اپنے اندر اس وسوسہ کی گنجائش پاسکتا ہے کہ
 اسلام کے راہبانانہ اور مشرق کے جو گیانہ میلانات کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش
 کے جو گیانہ میلانات پیدا ہو سکتی ہے۔ جو کچھ بھی تمہارے سامنے ہے سب کچھ تمہارا ہے۔ اسی لئے
 ہے کہ حد تک اپنی اکتسابی قوتوں کو بیدار کر کے تم ان سے استفادہ کرنا چاہو کر سکتے ہو۔ اسلام کے اس
 رجحانی صلائے عام اور حوصلہ پرورندائے دوام سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس افسردہ قنوطی پیغام کو
 کوئی ادنیٰ مناسبت بھی ہو سکتی ہے۔ جس میں غریب انسان کو باور کرایا جاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے سامنے ہے
 اس میں کچھ بھی تمہارا نہیں ہے، انسانیت کا کمالی ارتقاء اسی گریز اور فرار کے ساتھ وابستہ ہے جو ان امور
 اختیار کیا جائے۔ حتیٰ کہ اسی بنا پر صرف سنا نہیں گیا ہے۔ بلکہ دیکھا جا رہا ہے کہ کتنوں کے بدن سے
 پیرے اتروائے گئے۔ ان کے منہ سے لقمے چھینے گئے۔ ان پر پانی بند کیا گیا۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس جنون نے اس حد تک
 پہنچا کہ اسی آدمی کو جو ہوا کے بغیر عام فطری حالت میں غالباً چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی
 بیچارے کو جس دم وغیرہ کے نام سے ہوا میں سانس لینے کے حق تک سے محروم کیا گیا۔ غور کرنے کی بات ہر
 چیز میں ہے۔ معاشی ضرورت کے لحاظ سے جن کا درجہ ان سے برتر ہے،
 (سونا) العصۃ (چاندی) کے القناطیر المقنطرہ (ڈھیر کے ڈھیر) الخلیل المسومۃ (نشان زدہ
 گھوڑے) الاغنام (مویشیاں) الحرت (کھیتی) وغیرہ چیزوں تک کے متعلق جو قرآن

سنواری گئی ہے آدمی کے لئے خواہشوں کی چا

مُرَاتِقِ النَّاسِ حَبِ الشَّهَوَاتِ

یعنی عورتوں کی، اور بیٹیوں کی، ڈھیروں ڈھیر

مِنَ الشَّهَوَاتِ النَّسِیْنِ وَ

چاندی کی، خوبصورت گھوڑوں کی

الْمَقْنَطَرِ

۱ المسومة والا انعام والحث (آل عمران ۳) اور موشیوں اور کھیتوں کی۔

کا اعلان کرتا ہو۔ یعنی مدعی ہو کہ جس قدرت نے انسان اور انسان کی فطرت بنائی ہے۔ اسی نے آدمی کی جبلت میں ان امور کی گوارائی پیدا کشتی طور پر پیدا کی ہے۔ جیسا کہ لفظ ”رُزِقَ“ یعنی ان امور کی پسندیدگی اور ان کے حب و میلان کو آدمی نے خود اپنے اختیار سے اندر نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ پیدا کرنے والے نے آدمی کو ان امور کے میلان اور حب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور جو آدمی کی فطرت سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ واقعہ یہی ہے، اور ان امور کو تو کسی نہ کسی حد تک ضروریات معاشی شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قرآن تو صاف صاف لفظوں میں مالا بد مند (NECESSARIES) ضروریات سے گذر کر آسائش و راحت، رفاہیت و زینت وغیرہ کے ساز و سامان تک کے متعلق صرف جواز کے فتویٰ ہی پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ ”زینت اللہ“ اور ”الطیبات من الرزق“ (LUXURY) کے استعمال سے گریز کرنے والوں کو اس عتابی لہام

قل من حرم منیۃ اللہ الٰہی بولے کس نے حرام کی ہے اللہ کی آرائش کو

۲ اخرج لعبادة والطیبات من الرزق جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا اور

صاف ستھری روزی گو (الاعراف ۳۴ پ ۸)

دنیاوی نعمتوں کی نفرت اخروی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو لوگ قدرت کی ان نعمتوں سے ”الحیوة الدنیا“ اور معاشی نعمتوں کی نفرت کا مقدمہ ہے زندگی میں ان سے

ان کے کراہت زدہ قلوب پر اخروی نعمتوں کی قید و قیوت کا کتنا دردناک اثر ہے؟ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمانوں

ہی کو نہیں، بلکہ مسلمانوں کے سب سے بڑے روحانی پیشوا سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام تک کو

خود پیغمبرؐ یا ایہا النبیؐ لم یحضر صا ۲ حل اے نبی! کیوں حرام کرتے ہیں آپ اس چیز کو

سے سوال ۲ اللہ لک (التحریم ۲) جسے حلال کیا ہے اللہ نے آپ کے لئے۔

کے الفاظ سے حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا، جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ”روحانیت“ کے بلند سے بلند مقام تک

میں ان چیزوں سے گریز، جنہیں قدرت نے معاشی استفادہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے

کیا ہو گا۔ بلکہ باعث ضرر ہی ہو سکتا ہے۔ علامہ ابوبکر بن الجصاص اس بنیاد پر فرماتے ہیں۔

ترک لذائذ میں ثواب ۲ ان لا فضیلة فی امتناع جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ حلال فرما چکا ہو ان کے کھانے

کا کوئی پہلو نہیں ہے ۲ اکلھا (ص ۲۵۲ جلد ۳) سے پرہیز کرنے میں قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

روحانیت کی اخروی منزل بھی معاشی ترقیوں کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے اور سچ تو یہ ہے

۱۵ یورپ زدوں کا ایک گروہ جسے اپنی یورپ زدگی کا احساس بھی نہیں ہے، کچھ دنوں سے اس مضم کے خیالات پھیلا رہا ہے کہ بادشاہی

یا ملوکیت کا اسلام سخت مخالف ہے اور اسی لئے تیس سال عہد خلافت راشدہ کے بعد اس کا خیال ہے کہ تیرہ سو سال تک محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اپنے پیغمبر کی باغی رہی ہے، یا دوسرے لفظوں میں کام رہی ہے اور کا تو یہ ہے کہ تیرہ سو سال کے

مقابلے میں تیس سال کی دہ بھی مشکل کامیابی کیا کام قرار یا سکتا ہے۔ (بقیہ صفحہ آئندہ)

بھی قرآن انسانیت کے ارتقار کی آخری منزل یعنی "نبوت" کے منافی نہیں خیال کرتا، باوجود پیغمبر اور خدا کے رسول بننے کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق مختلف مقامات میں شیش محل، عرش و تخت و کرسی، محاریب (بڑی دیگیں) صافنات آبجاء (قیمتی گھوڑے) ہر قسم کے بتاء (معمار) غواص (غوطہ زن) جنود (اٹال) سب ہی چیزوں کا ذکر کرتا ہے اور ان تمام امور کو قرب الہی کے مقامات عالیہ کے منافی نہیں قرار دیتا۔ تو مجھے ان پر تعجب نہیں ہے جو اپنے جہل کی وجہ سے بعض مسلمانوں کے طرز عمل کو دیکھ کر اسلام کو بھی ایک قسم کا راہبانہ مذہب قرار دینا چاہتے ہیں۔ بلکہ حیرت ان پر ہے جو یہ جاننے کے باوجود کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے "اس بدیہی دعویٰ کو نظری قرار دے کر اس کے ثبوت میں بلا وجہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں، اور بعض کمزور یا ضعیف روایتوں سے استدلال کر کے گویا باور کرتے ہیں کہ خدا سخاوتہ اگر یہ چند روایتیں تو اعتراض کرنے والوں کا گویا اعتراض باقی رہ جاتا، میرے خیال میں تو اسلام رہبانیت نہیں ہے۔ اس کو دعویٰ قرار دیکر دلیل پیش کرنے کی زحمت اٹھانی ایسی بات ہے۔ جیسے کوئی دعویٰ کرے کہ روشنی تاریکی نہیں ہے۔ اور اس پر استدلال کے لئے بھی تیار ہو جائیے۔ ایسوں کے لئے جو اسلام کی طرف رہبانیت کو کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال کی تردید کے لئے قرآن کو جہاں سے بھی کھول کر دیکھا جائے گا۔ غالباً یہ کافی ہو سکتا ہے۔ جس کتاب کی جوہری تعلیم ہی اس پر مبنی ہو کہ قدرت نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے۔ اس کے لئے اس کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی "معائنہ" گریہ خیال کا اندیشہ کیا جائز ہو سکتا ہے؟ اگر اس کا ارادہ کیا کہ قرآن نے تفصیلاً کن کن چیزوں کے افادی پہلوؤں سے استفادہ کی طرف انسانی فطرت کو ابھارا ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہو گا کہ قرآن کے ایک تہائی حصہ کو نقل کرنا پڑے گا۔ بروجر و شجر و حجر، سفلیات و علویات میں آخر ایسی کونسی اہم چیز ہے جس کے افادی پہلوؤں کی طرف قرآن نے صراحتاً یا کنایتاً اشارہ نہیں کیا ہے۔ انسان ان چیزوں سے اپنی معاشی سہولتوں کے حصول میں جن جن طریقوں سے کام لیتا رہا ہے اور لے رہا ہے غور کیا جائے تو قرآن باوجودیکہ کوئی خالص معاشی کتاب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ان طریقوں کی طویل فہرست قرآنی آیات کی روشنی میں بہ آسانی مرتب ہو سکتی ہے۔ مثلاً زراعت، باغبانی، شکار، شکار کے مختلف طریقے یعنی آلات جلی سے شکار، شکاری کتوں، شکاری پرندوں (باز بھری وغیرہ) سے شکار، خشکی کے شکار، دریائی جانوروں کا شکار، مویشیوں کی پرورش، برتن و بھرتی جانوروں، پرندوں کے مختلف اجزاء، گوشت شہد وغیرہ سے استفادہ کی مختلف نوعیتیں، تجارت، تجارت کے سلسلے میں حیوانی

(۱) باب دیتے ہیں۔ یا امرئیلوں پر احسان جتلاتے ہوئے "جعلکم ملوکاً" کو بھی خدا کا احسان ٹھہرایا گیا ہے۔ نظریہ ملوکیت اگر غلط ہے۔ تو ان آیتوں کی کوئی نئی تفسیر تیار کرنی چاہیے۔ پس سچ یہ ہے کہ جمہوریت ہو یا ملوکیت۔ اس کا حال وہی شاعری کا ہے۔ یعنی حسن و قبح قبیح (اچھی شاعر یا بھلی شاعر) چیز ہے۔ (شاعری بری چیز ہے) اور بھلائی و برائی کا معیار یورپ نہیں، قرآن ہے! انشاء اللہ ایک الگ کتاب ہو

وغیرہ حیوانی، برقی و بحری سواریوں کے ذریعہ مواصلات و حمل و نقل کی سہولتوں کا ذکر، صنعت و حرفت اور اس کے مختلف بسیط و مرکب سادہ اور پیچیدہ شعبے مثلاً آہن گری، بخاری، زرگری، ظروف سازی، شیشہ سازی، زرہ سازی، پارچہ بافی، معاری، سنگ تراشی، کان کنی، خواصی، مزدوری حکومتی ملازمت، کاروباری تنظیم وغیرہ تقریباً وہ ساری چیزیں جن سے بعض معاشی علماء نے معاشی تختے مرتب کر کے اہل علم سے داد حاصل کی ہے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان تختوں کی خانہ پری صرف قرآنی آیات سے اگر کوئی کرنا چاہے تو مشکل ہی سے کوئی خانہ خالی رہ سکتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ان امور کی طرف بجائے وحی اور نبوت کے آدمی کی رہنمائی عقل و حواس سے کی گئی ہے، اسی لئے قرآنی آیات میں ان کا ذکر جہاں بھی آیا ہے، ضمناً ہی آیا ہے۔ تاہم اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاشی امور سے قرآن مسلمانوں کو کتنا قریب کھنا چاہتا ہے۔

زراعت و باغبانی کے | علی الخصوص زراعت و باغبانی کے متعلق تو قرآنی اشارات کی نوعیت ضمنی مباحث سے یقیناً ذرا زیادہ نظر آتی ہے۔ حالانکہ قرآن نے اپنے خطاب کا آغاز جس قوم اور ملک سے شروع کیا ہے، خصوصاً قریش مکہ، ظاہر ہے کہ ان کا ماحول زراعت وغیرہ سے گویا بے تعلق تھا۔ لیکن باوجود اس کے بار بار مختلف پیرایوں میں قرآن ابر و باد، برق و رعد، لواجح (حاملہ یامون سونی ہواؤں) بارش اور ان کے ساتھ کسانوں کے جذبات، خوف و طمع کا یہ مسلسل ذکر کرتا چلا جاتا ہے، لہذا ہاتھی کھیتوں، ہرے بھرے گہنے باغوں، ان کے مختلف موسمی حالات کا تذکرہ اس کتاب میں دہرا دہرا کر اس طرح کیا گیا ہے کہ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ شاید اس کتاب کا خطاب زیادہ تر ان ہی لوگوں سے ہے جو کاشتکاری اور باغبانی کے پیشوں میں مشغول ہیں۔ لوگوں کا قرآن کے متعلق خواہ کچھ ہی خیال ہو لیکن میرا ذاتی رجحان تو یہی ہے کہ گویا اس راہ سے مسلمانوں میں انسانی معاش کے اس اہم باب سے گونہ زیادہ مناسبت پیدا کرنا شاید یہ بھی مقصود ہو۔

معاش گریز، رجحانات کے متعلق قرآن کا ایک تاریخی بیان | خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی خطاب کا جو دائرہ ہے۔ رہنمائی

۱۵ بخاری میں ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس میں ہے کہ آلات کشا و زرعی کو دیکھ کر انھوں نے فرمایا کہ جس گھر میں یہ داخل ہوئے ہیں۔ وہاں ذلت داخل ہوئی ہے۔ اور اس قول کو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ظاہر ہے کہ گھروں میں آلات کشا و زرعی یا مولشی وغیرہ جن سے گندگی و عفونت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے داخل ہونے سے اس زمانے میں یہود کا یہ دستور تھا کہ وہ باغوں اور کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ اور جیسے ہندوستان کے ہندو وہ کہ ان کے کسان بیل، گائے، گوبر، مٹرے پتے کھیتوں کی ساری غلاتیں اپنے گھروں کے آگے اور ارد گرد پھیلائے رکھتے ہیں حتیٰ کہ زمین تک کو گوبر سے لیتے ہیں۔ حدیث میں بظاہر کاشتکاروں کے اس عام عارضہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دوسری حدیث میں بھی ہے کہ آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اپنے اہل بیت (انگنوں) کو پاک صاف رکھو اور یہود کے جیسا کہ بناؤ قرآن میں الزاموں کو حق تعالیٰ نے اپنی صفیہ اہل بیت پر اسی لئے کیا ہے۔ یہی باعث ذلت و اہانت ہے۔

جیسی معاش گریز زندگی والے میں نہیں سمجھتا کہ اپنے لئے اس دائرے میں وہ کہاں گنجائش نکال سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ معاشی زندگی کا جو نقشہ قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس میں ان کے لئے گنجائش نہیں ہے، بلکہ خود قرآن نے اس فطری مسلک کے متعلق تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی جس قوم کو جس زمانہ میں رہنا تھا۔ دین میں رہبانیت کے معاش گریز مسلک کا مطالبہ خدا کی طرف سے کبھی نہیں کیا گیا۔ گویا لا رہبانیت کی صفت صرف اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ بنی آدم کو خدا کی طرف سے جو دین بھی ملا ہے کسی میں اس کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ قرآن میں اس مسلک کے متعلق جو یہ مشہور الفاظ پائے جاتے ہیں

رہبانیتۃ ابتدعوہا ما کتبناہا

علیہم فاعوہا حق سرعایہا

فاتینا الذین امنو منہم اجرہم

و کثیر منہم فاسقون (الحمد، ۲/۲)

دیدی ہم نے ان کے ایمان والوں کو ان کی مزدوری۔ اور بہتیرے ان کے فساق ہیں۔

قرآن کے تاریخی بیان کا تجزیہ | دیکھنے میں تو یہ ظاہر یہ گئے چنے چند الفاظ ہیں۔ مگر میرے خیال میں اس آیت کا ایک ایک ٹکڑا

بیان کا تجزیہ | ”رہبانیت“ کی پوری تاریخ کا حامل ہے۔ مثلاً پہلا جز ”ابتدعوہا“ (ان لوگوں نے خود تراش لیا

ہے) ظاہر ہے کہ رہبانیت کو بجائے کسی اور مذہب کے ان نظریات میں شامل کر دیتا ہے جو براہ راست

انسانی نظروں فکر کے مرہون مست ہیں، یا یہ کہ فلسفہ ہے، مختلف اقوام کے مختلف افراد نے مختلف زمانوں

میں مختلف عوامل و موثرات سے متاثر ہو کر کبھی کبھی اپنی زندگی اس تخیل کے تحت گزارنی چاہی ہے۔ تاریخ اس کی

شہادت ادا کرتی ہے کہ یونانیوں اور رومیوں کے رواقیئیں و اشراقیئیں اسکندریہ کے فلاطونین، ہندوستان کے

جوگیہ وغیرہ نے فلسفہ کے ایک مکتب خیال کی شکل میں اسے پیش کیا تھا۔

دوسرا جز ”ما کتبناہا علیہم“ (یعنی ہم نے اس نظریہ حیات کا مطالبہ ان سے کبھی نہیں کیا) جس کا یہی مطلب

ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے علم و عمل کا جو نظام بنی آدم کو مذہب اور دین، دھرم وغیرہ کے ناموں سے ملتا رہا ہے

اس میں اس غیر فطری نظریہ حیات کا کبھی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اس جز سے صرف اسلام ہی کی برأت رہبانیت سے

ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ مذہب کی پوری تاریخ سے اس کی بے تعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کی

بنیاد پر ہر مسلمان اس کے ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہے کہ عیسائی مذہب ہو یا یہودی دین، ابراہیمی ملت ہو

یا نوحی دعوت کسی کا رہبانیت سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ قرآن کے اس تاریخی بیان کو پڑھنے اور ماننے کے بعد

مانتا ہے جو کبھی عیسائی، کبھی کسی اور دین کے ساتھ اسلام کا مقابلہ کر کے دعویٰ

رہبانیت سے بے تعلقی یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ شاید ان کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ حق

تعالیٰ کی طرف سے گویا کسی دین میں کبھی اس قسم کی راہبانہ زندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کیا قرآن کے نص صریح

کی یہ خلاف ورزی نہیں ہے؟

تیسرا جز ”اعوہا“ یعنی جن لوگوں نے اس خود تراشیدہ فلسفہ کو اصول حیات تسلیم کر کے

اسی کے مطابق زندگی گزارنی چاہی، قرآن کا یہ تاریخی بیان ہے کہ اس میں بھی جیسا کہ چاہئے تھا، کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا، جس کی وجہ ظاہر ہے، بعض خاص حالات مثلاً شدید ناکامی یا کسی سخت شخصی یا اجتماعی حادثہ سے متاثر ہو کر بعض زود اثر شدید الانفعال نفوس دنیا اور دنیاوی تعلقات سے داکمرد کر کے اتر گئے۔
خیالی، صرف خیالی زندگی کا نقشہ طے کرنے کی حد تک تو طے کر لیتے ہیں، لیکن جب عمل کرنا ہے تو پھر فطری قوانین میں آدمی کی جبلت جکڑی ہوئی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ ان قوانین سے مسلسل جنگ میں اسفوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت اور قوانین قدرت سے جنگ چھیڑ دینے کے بعد مسکین انسان کامیابی کو بھلا کیا توقع کر سکتا ہے؟ کامل استقلال اور غیر معمولی ضد سے بھی اگر کام لیا جائے پھر بھی پوری کامیابی قطعاً ناممکن ہے، اور یہی خبر قرآن ان کے متعلق دیتا ہے۔

چوتھا جز "فَاتِنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ" یعنی ان میں جو ایمان والے ہیں۔ ان کو اپنی مزدوری مل جاتی ہے۔ لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا جن غیر ضروری مشقتوں کو وہ برداشت کرتے ہیں۔ ان میں جس حد تک کامیابی ہوتی ہے، اس کی مزدوری ان کو مل جاتی ہے؟ یہ ظاہر یہی خیال گذرتا ہے۔ لیکن اگر واقعی قرآن کا یہی مطلب ہوتا تو چاہئے تھا کہ "الَّذِينَ آمَنُوا" یعنی ان میں جو ایمان والے ہیں، کی جگہ کچھ اس قسم کی عبارت ہوتی کہ ان میں جن لوگوں نے اس اصول کی نگرانی کی یعنی (الَّذِينَ رَعَوْهَا) انہیں ان کا اجر دے دیا گیا، مگر جب یہ اسلوب بیان نہیں اختیار کیا گیا۔ تو یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کو صرف اسے ایمان کا معاوضہ ملتا ہے۔ باقی جن غیر فطری مشاغل اور حالات میں اپنے آپ کو مبتلا کر کے جو دکھ و رسیببت وہ اٹھاتے ہیں۔ چونکہ وہ خدا کی مرضی اور مطالبے کے تحت نہیں، بلکہ اپنی خواہش اور اپنی مرضی، اپنے خود تراشیدہ فلسفہ کے زیر اثر اٹھاتے ہیں، اس لئے خدا کے پاس اگر اس کا کچھ اجر نہ ہو، تو عقلاً و دیناً اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، پس اس کو جو کچھ ملے گا ایمان کے تحت ملے گا۔ اور یہ حال تو ان کا ہے جو اپنی زندگی میں ایمان اور ایمانی اقتضاؤں پر قائم بھی رہے ہوں، ورنہ اس کے بعد آیت کا آخری جز "كثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ" (یعنی ان میں اکثر و بیشتر فاسق ہو جاتے ہیں) یہ تو ہر ملک کی اشرافیت اور رہبانیت کے آخری انجام کی ایسی رپورٹ ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے غالباً دفتر کے دفتر درکار ہیں، کلیسا اور پوپي نظام کی پوری تاریخ ہندوستانی جوگیوں، یوگیوں، بگشودوں، مونکوں، وام مارگیوں، اگھوریوں، وغیرہ کے ہزار ہا ہزار سال کے ناگفتہ بہ حوادث و واقعات دہرانے پڑیں گے۔

معاش گر زیر جانات کا | سچ یہ ہے کہ قدرتی قوانین سے جنگ کرنے کا آخری انجام اس کے سوا اور کیا آخری انجام فسق ہے | ہو سکتا ہے یا کیا ہو سکتا تھا۔ جہاں تک واقعات سے معلوم ہوا ہے قرآن

کی ترتیب کا بھی یہی اقتضا ہے کہ ابتداء میں جو اپنے آپ کو اس زندگی میں ڈالتے ہیں۔ ان کے تحت ایک حد تک وہ تو بننا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہی بے چاروں کی ظاہری شکل و صورت کے جو ان کے جانشین بنتے ہیں، چونکہ ان تاثرات سے وہ قطعاً خالی ہوتے ہیں۔ بلکہ عام طور پر عام میں اس عجیب و غریب زندگی رکھنے والوں کے متعلق جو حسن ظن پایا جاتا ہے، اس کو دیکھ کر اس گمراہ میں وہ شریک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ظاہری راہبازہ شکل و صورت جس سے یہ ظاہر تر کہ دنیا کا یہ تہمت ہے۔ اسی کو پوری

طاقت کے ساتھ حصولِ دنیا کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، جن کے یہ جانشین ہوتے ہیں۔ عوام کا ان کے ساتھ جبر واپتی
 محسن ظن باقی رہتا ہے، اس کے پردے میں پھر یہ کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے
 اہم جرم جو ان کا ہے یعنی ہر قسم کے اکتسابی مشاغل سے الگ تھلگ ہو کر ایک
 طرف تو ان کے سارے سرمائے کو جو قدرت اس میں عطا کرتی ہے۔ رائیگاں اور ضائع کرتے رہتے
 ہیں۔ اور ٹھیک کسی عضو کے ناسور کا جو حال ہوتا ہے کہ خون حیات کو پیپ اور ریم بنا کر ضائع کرتا رہتا
 ہے اور دوسری طرف ایسے اعضاء جو اس کے قریب ہوتے ہیں، ان کی غذا بھی کھینچتا رہتا ہے۔ اسی طرح
 یہ لوگ بھی اپنی توانائیوں کو ضائع کر کے بیچارے عوام کے گاڑھے پسینوں کی کمائی کو مختلف جیلوں سے
 بہ اس طور چوستے رہتے ہیں کہ ان سے یہ جو کچھ لیتے ہیں، اس کے معاوضے میں ان کو کچھ نہیں دیتے، چند فرضی
 ڈھکوسلے جن سے ان کا ضمیر خود بھی واقف ہوتا ہے، ان بے چاروں کی تسلی کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ اتنا بڑا سخت
 جرم ہے کہ ان کے دوسرے بعض بدترین فاسقانہ جرائم سے خاموشی اختیار کرنے کے باوجود قرآن نے
 نہایت تیز و تند لہجے میں ان کے اس جرم کا اعلان ان کے الفاظ میں کیا ہے۔

۱۰ کثیرا من الاحبار والرهبان	بہت سے اجبار (مذہبی علماء) اور رہبان
لواكلون اموال الناس بالباطل	(مذہبی مشائخ) کھاتے ہیں لوگوں کا مال بظلم
ويصلون عن سبيل الله والذين	باطل (جھوٹ) کے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ
يكنزون الذهب والفضة	سے۔ اور جو دھنڈ کرتے ہیں سونا اور چاندی
ولا ينفقونها في سبيل الله	نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو ان کو
فيشراهم بعد اب اليم	مردہ دیدیجئے دکھ بھرے عذاب کا۔ اس دن
يوم يحصى عليها في نار جهنم	پتیا جائے گا ان پر وہی دھنڈ جہنم کی آگ
فتكوى بها جباهم وجنوبهم	میں پھر داغی جائیں گی ان کی پیشینیاں
وظهورهم هذا ما كترتم	اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں یہ وہ ہے
لا نفسكم فذوقوا العذاب بما	جسے تم نے جمع کیا تھا اپنے لئے پس چکھو عذاب اس
كنتم تكتزون	چیز کا جسے تم نے جمع کیا تھا۔

اکل اموال الناس بالباطل جس کا حاصل مطلب یہی ہے کہ کچھ دینے بغیر لوگوں کا مال کھانا اس
 الزام کو قرآن ان پر عائد کر کے ایک اہم معاشی اصول کی طرف راہنمائی کر رہا ہے جس کا ذکر دوسرے مقامات
 میں متکرر کیا ہے۔ یعنی یہ ظاہر قرآن کا یہ نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بدن کا ہر عضو اپنی
 مدد کی خدمت انجام دیتا ہے، اور اگر ایسا نہ کرے تو اسی وقت اس عضو کو جسم سے آپریشن
 کر کے جدا کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جماعتی جسد کا جزیں کر فرد کو جینے کا حق عمومی طور پر اسی وقت حاصل ہوتا
 ہے کہ جس طرح یہ دوسرے فرد سے نفع اٹھاتا ہے۔ اسی طرح چاہیے کہ اپنی صلاحیت کے مطابق یہ بھی
 دوسروں کو خواہ کسی شکل میں نفع پہنچائے۔ ظاہر ہے کہ عام معاشی نظام کی بنیاد اسی داد و ستد لین دین پر

۱۰
 مبنی ہے۔ مثلاً کاشتکار غلہ دیتا ہے، پارچہ باف کپڑے بنتا ہے، طبیب علاج کرتا ہے، معلم علم تقسیم کرتا ہے۔ لیکن بزرگوں کے ان جانشینوں نے جو عوام کے حُسن ظن کی بنیاد پر ان سے مال لے کر کھاتے ہیں، کبھی یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ عوام سے یہ جو کچھ لیتے ہیں۔ اس غریب عامی کو اس کے معاوضے میں مادہ، شکل، نہ سہی کسی اور شکل میں مثلاً ذہنی، عقلی، روحانی فوائد میں سے کسی فائدے کی شکل میں ان کو یہ کیا دیتے ہیں؟ یہاں تو یہی نہیں ہے لیکن جیسا کہ قرآن کا بیان ہے۔ ان کی اکثریت یہ واقعہ ہے کہ کسی کو کچھ نہیں دیتی، اور جہاں تک میرا خیال ہے۔ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں دے رہے ہیں۔ اکل اموال الناس بالباطل کی آخر اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی ہے۔ چور بھی مثلاً کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال اڑا لیتا ہے لیکن اس مذہبی چوری سے غریب بدنام۔ مجرم چور کی چوری کو کیا نسبت؟

بہر حال یہاں تک تو اس طبقہ کی اکثریت کے معاشی جرم کا ذکر ہے۔ آگے حصولِ معاش کے اس غلط ذریعہ کو اختیار کر لینے کی وجہ سے جن اعتقادی اور ایمانی شرارتوں کے یہ مرتکب ہوتے ہیں۔ غریب عوام پر جہل کا کبیل اڑھا کر اللہ کی سیدھی راہ سے لوگوں کو چن چن خاص طریقوں سے یہ روکتے اور بھٹکاتے ہیں۔ قرآن میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق معاشی مسائل سے نہیں ہے۔ اس لئے اس کی بحث یہاں غیر ضروری ہے۔ البتہ اس کے بعد ایک اور طبقہ کا ذکر ہے۔ جو زائد از ضرورت آمدنی کو خدا کے بتائے ہوئے صحیح مصارف میں خرچ کرنے کی جگہ کُتر کرتا ہے، یعنی اسے جمع کرتا ہے۔ پھر دوسری زندگی میں جن حالات سے ان کنز کرنے والوں کو دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کنز کرنے والوں اور ان کے اخروی عواقب و نتائج کا اس موقع پر ذکر یعنی رہبانیّت والوں کے ساتھ ان کا تذکرہ اپنے اندر کیا کوئی مناسبت رکھتا ہے؟ بظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ راہبانہ زندگی بسر کرنے والوں کی اکثریت جس طرح خدا داد توانائیوں کے سرمائے کو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سال تک یونہی ضائع کرتی رہتی ہے اور اپنی انفرادی قوت سے جماعتی جسد کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتی، اسی طرح زائد از ضرورت آمدنی والے اپنے مالی سرمایہ سے بجائے نفع پہنچانے کے کنز بنانا کر اس کے افادی پہلوؤں کو ضائع کرتے رہتے ہیں، دونوں طبقوں میں یہی اشتراکی مناسبت ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جن اخروی سزاؤں کا ذکر فرمایا گیا ہے، اگرچہ بظاہر ان کا تعلق کنز والوں سے ہے۔ لیکن جب دونوں کے جرموں کی نوعیت میں تناسب ہے تو کیا سزا کی نوعیت میں بھی تناسب نہ ہوگا؟ بلکہ کنز والے اگر کسی کو اپنی مالی توانائی سے نفع نہیں پہنچاتے تو کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال بھی تو نہیں کھاتے، لیکن اجبار و رہبان کی اکثریت جیسا کہ گذر چکا۔ علاوہ اس کے اکل اموال الناس بالباطل کے جرم میں بھی مبتلا ہے۔ اور اس لحاظ سے اس طبقہ کا معاشی جرم بہ ظاہر کنز والوں سے زیادہ سخت معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں اس موقع پر کنز والوں کا ذکر ہو سکتا ہے کہ ایک خاص تاریخی کی طرف بھی

۱۱ آیت قرآنی وَلَا يَفْقَهُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (نہیں خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ کی راہ میں) یہ اسی کا حامل مطلب ہے۔ علماء کا اگرچہ اس پر اب اتفاق ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے۔ یعنی اموال پر شریعت کے زکوٰۃ عائد کی ہے۔ اس کو ادا (تقیہ بر صفحہ آئندہ)

اشارہ ہو، میرا مطلب یہ ہے کہ نزولِ قرآن کا جو عہد ہے۔ اس کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا یہ وہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

کرنے کے بعد جو رو بہ جمع کرتا ہے۔ وہ ان سزاؤں کا مستحق نہیں ہے۔ جن کا ذکر اس کے بعد کیا گیا ہے۔ لیکن صحابیوں میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ زائد از ضرورتِ روپیہ کے کتر کرنے کے سرے سے مخالف تھے۔ تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب ”الفقاری“۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ مطلقاً مال جمع کرنے کو حضرت ابوذر حرام سمجھتے تھے، یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ ان کے خیال کی بنیاد ایک اہم معاشی اصول پر مبنی ہے۔ اس مسئلہ کے تفصیلی مباحث کا ذکر آئندہ قانونی ابواب میں بھی آئے گا۔ یہاں ایک خاص مسئلہ پر نتیجہ ضروری معلوم ہوتی ہے یعنی اجارہ اور وہبان کا جو طبقہ جماعت کو تعلیماتِ ہندیہ، تدریس یا تالیف و عطا یا تذکرہ یا کسی اور ذریعہ سے واقعی نفع پہنچاتا ہے! اور اس کا رویہ اپنا وقت خرچ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام سے ان کو کچھ امداد ملتی ہو، تو یقیناً اس امداد کو اکل اموال الناس بالباطل ہم نہیں قرار دے سکتے۔ خصوصاً قدر ضرورت سے زیادہ آمدنی اس راہ سے جو ہو۔ وہ سبیل اللہ میں جب خرچ کی جائے مثلاً اشاعتِ اسلام، تاسیسِ مدارس و مکاتیب، نشر کتب وغیرہ میں اگر خرچ کی جائے تو چندہ بازی کے حارصے سے ”فتوحات“ کے اس سلسلے کو میں نہ ہی طبقہ کے لئے۔ اب بھی بہتر سمجھتا ہوں، کیا پیغمبر سے بھی بڑا نمونہ کوئی اور ہو سکتا ہے! اس میں شک نہیں کہ نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گلہ بانی بھی کی تھی اور تجارت بھی لیکن سوال منصبِ نبوت پر سرفرازی کے بعد ہے انسانوں کی رکھوالی کے سوا کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ آدم کی اولاد کا یہ سب بڑا راعی پھر کسی معاشی مشغلہ میں مشغول ہوا، خدیجہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دولت ان کی وفات ہی کے بعد نہیں بلکہ ان کی زندگی ہی میں قریب قریب ختم ہو چکی تھی حتیٰ کہ طائف کے رئیس نے پیغمبر کی غربت ہی کو انکارِ نبوت کی دلیل ٹھہرایا تھا۔ پھر ہجرت کے بعد مدینہ جب آئے اور کچھ ہی دن بعد سب کے جن کے مصارف کا بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا۔ جن میں آپ کے مولیٰ زید اور آپ کی دانی کھلائی ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں۔ تو اس وقت تک جب تک اسلامی فتوحات کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ آخر خود پیغمبر اور آپ کے اہل و عیال لوگ لواحق وغیرہ کی گزر بسر کا ذریعہ کیا تھا، سیرت نگاروں نے اگر اس کا ذکر نہیں کیا تھا تو کیا بخاری کے متعدد مقامات میں یہ روایت انس بن مالک خادم خاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی موجود نہ تھی کہ کان الرجل یجعل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم الخلات حتیٰ افتتح قرظہ والغیر (یعنی جب تک بنی قرظہ اور بنی نضیر کی جائد قبضہ میں نہیں آئی تھی، دستور تھا کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے الخلات یعنی کھجور کے کچھ درخت بخش کر دیتے تھے) جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہجرت کے چار پانچ سال تک صحابہ کرام جن کی حیثیت گویا مریدوں کی تھی خدمت کی اس سعادت سے سرفراز ہوتے رہے۔ ادنیٰ بھی متفرق روایتوں میں مختلف طریقے سے انصار کی ان خدمات کا تذکرہ حدیثوں میں آتا ہے۔ بلکہ صدقہ نہ لینا اور ہدیہ لینا۔ بعض صحابہ نے تو اسی ذریعہ سے آپ کو پہچانا، سلمان فارسی کا حال پڑھیے۔ شہداء اے اُحد میں مخیرق نامی صحابی جو یہودی سے مسلمان ہوئے تھے۔ اصحابہ روضہ الانف مختلف کتابوں میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک ہی نہیں بلکہ سات سات باغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیئے ”اموالی یجعل یضعہا حیث یشاء (یعنی میرے باغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد ہیں جو چاہیں کریں) برقہ، دلال، صائف، حسنی، الاعراف، المثبت، مشیرام، ابراہیم۔ ان باغوں کے نام تھے۔ مخیرق جب اُحد میں شہید ہو گئے۔ تو جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین الفرج مالہ ۲ و قافا و ہوا ۱ و حبس حبس۔ فی الاسلام (روضہ الانف ص ۱۴۳ ج ۲) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باغوں کو وقف فرما دیا۔ اور اس ام کا یہ پہلا وقف تھا۔ آخری باغ میں ایک بنگلہ بھی تھا۔ ماریہ قبطیہ ام المؤمنین کا مسکن وہی تھا۔ اسی لئے ان کے نام کی طرف منسوب ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ علماء اور مشائخ جن بزرگوں کی حیثیت واقعی ”کانبی فی امتہ“ کی تھی۔ بقدر ضرورت اگر وہ فتوحات کے لینے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ تو ان کے سامنے بھی نہ ہی کا ایک نمونہ تھا۔ ۱۲

زمانہ تھا، خصوصاً یورپ اور ہندوستان کا یہ وہ عہد تھا جس میں نام نہاد مذہبی پیشواؤں نے مختلف ترکیبوں سے عوام کو اپنے قبضہ میں اس طرح دبوچ لیا تھا کہ ان کی گرفت سے وہ کسی طرح باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ یورپ میں تو "اعترافِ جرم" کا ایسا ہتھکنڈہ مذہبی پیشہ وروں کو مل گیا تھا کہ ہر عامی اپنے جرائم کا پادری کے سامنے اقرار کر کے بظاہر خدا کی گرفت سے تو سمجھتا تھا کہ اسے نجات مل گئی۔ لیکن درحقیقت وہ پادریوں کی گرفت میں آ جاتا تھا۔

پھر سلاطین کا کلیسا کے نیچے اس طرح دب جانا کہ گویا پوپ کے فرمان کی خلاف ورزی قریب قریب حکومت سے دست برداری کے مترادف بن چکی تھی۔ نیز خدا کی رحمت کا عام بیوپار کلیسا کی نظام میں عام طور سے جو جاری تھا، اٹھ اٹھ آنے اور دس دس آنے سیر خدا کی رحمت کو پادری عام طور سے بیچ رہے تھے۔ آسمان پر وہی کھولا جاتا تھا، جسے زمین پر پادری کھولتے تھے۔ اور وہی آسمان پر باندھا جاتا تھا، جسے پادری زمین پر باندھتے تھے۔ یہ اور اسی قسم کی بیسیوں ترکیبیں تھیں جن کے ذریعہ سے عوام کی کمائی پر کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کا پورا اقتدار قائم تھا۔ من مانے طور پر جس کسی سے جس قدر جس وقت چاہتے تھے، عیسائی مذہب کے یہ اجارہ دار (علماء) اور رہبان (مشائخ) وصول کر لیتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ گرجوں اور چرچوں کے خزانے شاہی خزانوں سے کہیں زیادہ وسیع ہو چکے تھے۔ معمولی معمولی گرجے میں لاکھوں کی دولت بصورت "کنز" جمع رہتی تھی، مشہور واقعہ ہے کہ ہرقل کو ایمپریوں کے مقابلے میں فوجی مصارف کی جب ضرورت ہوئی۔ اور شاہی خزانہ ان مصارف کی پابجائی میں نا کافی ثابت ہوا تو روم کے اس قیصر کو قرض کی صورت میں سب سے بری مالی امداد چرچوں اور گرجوں ہی سے ملی۔ تقریباً ہی حال ہندوستان میں برہمنوں، سادھوؤں، یوگیوں اور جوگیوں نے پیدا کر رکھا تھا۔ خود محمود غزنوی کو سونمات میں جو غیر معمولی سرمایہ ہاتھ آیا تھا۔ وہ ہندو مذہب کے اجارہ دار رہبان کی "کنز" کی ہوئی دولت ہی تھی۔ اس زمانے میں بھی زار کی حکومت پر انقلاب برپا کر کے جب اشتراکیوں نے اقتدار حاصل کیا تو کون نہیں جانتا کہ شاہی خزانوں اور امراء کے اندوختہ دولت کے ساتھ یولشویک حکومت کو سرمایہ کی غیر معمولی مقدار روسی گرجوں ہی سے ملی۔ والقصد بطولہا۔

بہر حال تاریخ کے ان واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد دونوں آیتوں کی باہمی مناسبت کا کچھ سراغ ضرور مل سکتا ہے۔

"ترک دنیا" کو "حصول دنیا" کا آلہ بنا کر زندگی گزارنے والوں کا زور اگرچہ اب بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن پھر بھی ہر ملت و مذہب میں ایک طبقہ بے کاری سے روزگار حاصل کرنے والوں کا تقریباً دنیا کے ہر خطوں اور ملتوں میں موجود ہے اور گویا اب الذہب والفضہ کی ریل پیل کا حال ان کے یہاں اس پیمانہ پر تو نہیں ہے۔ جو کبھی تھا۔ تاہم ان کے بعض سربراہوں میں عہدِ ماضی کے کچھ نمونے اب بھی نظر آتے ہیں۔ سب کمائیں، خون کا پسینہ بنا کر کمائیں۔ اور ان کی کمائی سے محض قدیم روایات کی بنیاد پر کچھ لئے دئے کرے دھرے بغیر یہ وصول کرتے رہیں۔ اس سے صرف یہی نہیں کہ ان کی اکتسابی قوتیں اپنے افادی اور معاشی نتائج کو ظاہر کئے بغیر مسلسل سلسلہ بعد نسل قبروں میں دفن ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ بلکہ بے کاری کے اس عجیب

غریب سستے اور آسان روزگار کو دیکھ کر کتنے دلوں میں ان کی ریس کی ہوک اٹھتی ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ اس ریس کے سلسلے میں مکر و فریب خدع اور دجل کے جالوں میں کتنے غریب عوام کو آئے دن پھنس پھنس کر اپنی بیوی بچوں کے منہ سے نوالوں کو چھین چھین کر ان کے شکم کی دوزخ کو بھرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے جو کچھ اس طبقہ کے ذریعہ سے ہو چکا اور ہو رہا ہے۔ چونکہ خدا اور اس کے دین کے نام سے ہو رہا ہے۔ ان کو دیکھتے ہوئے سچ تو یہ ہے کہ جن سزاؤں کا ذکر قرآن میں ان کے متعلق کیا گیا ہے۔ اگر آخرت میں ان کے یہ مستحق ہوں تو شاید ان کے حق میں یہ زیادتی نہ ہوگی، آخر کچھ تو مصلحت ہے کہ اجارور ہیان کی اکثریت جس "اکل بالباطل" کی مرتکب ہے۔ اس کے ذکر کے ساتھ ان سزاؤں کا حق تعالیٰ نے یہاں کیوں تذکرہ فرمایا۔

اسلام کے مذہبی | شاید قرآن کے اسی طرز عمل کا اثر ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی خدمات انجام دینے والے طبقوں کا خدام کی خصوصیت ایک بڑا گروہ باوجودیکہ وہ مسلمانوں کی دینی خدمت میں اپنا زیادہ وقت اخلاص اور دیانت امانت سے صرف کرتا تھا، اور اس لئے جو امداد اسلامی حکومت یا عام مسلمانوں سے ان کو ملتی تھی۔ یہ "اکل بالباطل" (یعنی کچھ دیئے بغیر دوسروں کا مال کھانا) نہ تھا۔ لیکن قرآن کی اس نفی دھمکیوں سے غالباً وہ اتنے متاثر تھے کہ اس امداد کا لینا بھی انھوں نے پسند نہیں فرمایا۔ اور اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے دوسرے دھندے انھوں نے اختیار کئے۔ اگر کے دربار میں جب فقہائے اسلام پر تنقید شروع ہوئی۔ تو مفت خور برہمنوں اور سادھوؤں کو جس دربار میں ہر قسم کے انعام و اکرام کا مستحق سمجھا جاتا تھا، اسی دربار کا مشہور وزیر ابو الفضل اسلامی فقہاء کے متعلق کہا کرتا کہ "ہر جوتے گانٹھنے والے، مٹھائی بیچنے والے کا قول ہم پر حجت نہیں ہو سکتا" اشارہ اسلام کے ان علماء اور فقہاء کی طرف تھا جو عوام اور حکومت سے کسی قسم کی معاشی امداد لینا پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ مختلف دستکاریوں اور عام ذرائع معاش سے روزی حاصل کرتے تھے۔ ابو الفضل کی نگاہ میں ان کا یہی ہنر عیب بن کر چھ رہا تھا، فیا للعجب !!

بہر حال اجارور ہیان کی اکثریت حالانکہ فسق کے مختلف گفٹے و ناگفٹے بہ حالات اور حادثات میں مبتلا تھی۔ لیکن سب کی طرف (و کثیر منہم فاسقون) کے اجمالی اشارے پر کفایت کرتے ہوئے صرف ان کے اس ہی معاشی جرم یعنی "اکل اموال الناس بالباطل" کا کھلے کھلے صاف لفظوں میں قرآن نے جو اعلان کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں معاشی مہات اور معاشی مسائل کی کتنی اہمیت ہے۔ حالانکہ جہاں تک تاریخ کی شہادتیں ہیں۔ اس طبقہ کے دوسرے جرائم کچھ کم ہونے لگے اور شرناک نہ تھے۔

معاشی مسائل کی | یہ تو معاشی مسائل کے ساتھ قرآن کے تعلق کا حال ہے۔ داعی قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے اہمیت حدیثوں میں ملفوظات اور اس باب میں آپ کے جس طرز عمل کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں ملتی ہے اس کا ذخیرہ تو اتنا زیادہ ہے کہ سب کا ذکر اگر کیا جائے تو وہی ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مذہب کے غلط نمائندوں نے مذہب کے متعلق یہ عام کیفیت جو پیدا کر دی ہے کہ ادھر مذہب کا نام آیا اور دنیا کی نفرت، دنیاوی چیزوں کی عداوت میں ہیجان پیدا ہونا شروع ہوا۔ خیال یہی پھیلایا ہوا ہے کہ دنیا اور دنیاوی امور سے اپنے

ماننے والوں کو جو مذہب جس حد تک علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہو، یہی مذہب کا کمال ہے۔ لیکن آج یہ کون باور کرنے کے لئے تیار ہوگا کہ کوئی سیاسی لیڈر یا معاشی ریفاہ مر نہیں، بلکہ جو اپنے آپ کو انسانی تاریخ کے تمام مذہبی داعیوں اور رسولوں کا خاتم اور اپنی تعلیم کو سارے جہان کے مذہبی ذخیروں کے صحیح عناصر کا خلاصہ اور سب کی تکمیل کرنے والا قرار دیتا تھا، دنیا کی وہی سب سے بڑی اور دینی ہستی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے اور پُریم آنکھوں کے ساتھ اپنے خدا کے سامنے اپنی امت کو پیش کرتے ہوئے التجا کرتا ہے۔

پروردگار! یہ لوگ پیادہ ہیں (یعنی سواری نہیں رکھتے) انھیں سوار کیجئے۔ پروردگار! یہ لوگ ننگے ہیں، انھیں پہنائیے۔ پروردگار! یہ لوگ بھوکے ہیں، انھیں سیر کیجئے۔

امت کی معاشی خوشحالی | اللہم! انھم حفاء
کے لئے پیغمبر کی دعاء | فاحملہم! اللہم! انھم
عزاة! فاکسہم! اللہم! انھم
جیاع! فاشبعہم۔

مسلمانوں کی معاشی پریشانی کو اس کے سامنے کچھ لوگ اسی لباس میں جس میں بعض مذاہب کے ماننے والوں کا دیکھ کر پیغمبر کا پریشان ہو جانا رہنا مذہبی برتری کی دلیل ہے۔ یعنی کبیل بدن پر ڈالے ننگے پاؤں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہ صحابیؓ سے مروی ہے کہ ان کبیل پوشوں پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر مبارک کا پڑنا تھا کہ

فتقر وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اداس پڑ گیا چہرہ اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ معان لوگوں کے اس حال کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندر زنانہ میں تشریف لے گئے (غالباً کوئی چیز نہ ملی) پھر باہر تشریف لائے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوا کر ارشاد ہوا کہ مسلمانوں کو جمع کر دو، لوگ جمع ہوئے، ان غریبوں کی امداد پر لوگوں کو آمادہ فرمایا گیا، اور کافی امدادی سرمایہ جمع ہو گیا، جو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی راوی ہیں کہ وہی چہرہ مبارک جو اب تک ان غریبوں کے دیکھنے کے بعد اداس پڑ گیا تھا۔

فرائیت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کو دیکھا کہ سونے کی طرح دیک رہا ہے۔

خوش حالی کو دیکھ کر پیغمبر چہرہ مبارک سونے کی طرح دیکنے لگا، محض اس لئے کہ کچھ لوگ معاشی پریشانیوں کے چہرے کا دمک اٹھنا میں مبتلا تھے، ان کی یہ پریشانیاں اس تدبیر سے دور ہو گئیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کا یہ پہلو جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ مذہب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نبی الانبیا خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احساسات طیبہ اسی پہلو کے متعلق کتنے عمیق اور گہرے تھے۔

اپنی آپ مدد پر اور یہ طریقہ کہ اس قسم کے لوگوں کی امداد دوسروں سے کرائی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کو آمادہ کرنا خاص فوری ضرورتوں کے موقع پر کبھی کبھی یہ تدبیر بھی اختیار کی جاتی تھی، ورنہ اس احساس کے ساتھ ساتھ جس کا سراغ مذکورہ واقعہ میں ملتا ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری خصوصیت

عموماً یہ تھی کہ بجائے دوسروں کے خود صاحبِ ضرورت کو آپ آمادہ فرماتے کہ اپنی دشواریوں کو وہ اپنی اپنی توانائیوں کے ذریعہ سے حل کرے، جو قدرت نے آدمی میں اسی لئے پیدا فرمائی ہیں، حدیثوں میں اس مشہور واقعہ کا ذکر آتا ہے کہ ایک صاحبِ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کچھ امداد کے طالب ہوئے، وہی جو ابھی ایک جماعت کو کافی امداد دوسروں سے لاچکا تھا۔ ایک شخصی ضرورت کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار فرمایا جاتا ہے وہ سننے کے قابل ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو نہ خود اپنے پاس سے کچھ دینے کی کوشش کی اور نہ دوسروں سے دلویا، بلکہ ضرورت مند صاحب کو فرماتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ تمہارے پاس آخر کوئی چیز بھی ہے؟ وہ بیچارے اتنے غریب اور نادار تھے کہ جواب میں انہوں نے عرض کیا۔ میرے پاس صرف ایک ٹاٹ ہے۔ جس کے ایک حصہ کو اوڑھتا ہوں، اور دوسرے کو بچھاتا ہوں اور اس کے سوا ایک پیالہ بھی ہے جس میں پانی پیتا ہوں، ظاہر ہے کہ افلاس اور ناداری کی یہ انتہا ہے۔ لیکن جو معاشی قوتوں کو ابھارنے اور ان کی قیمت پیدا کرنے کے لئے بھی مبعوث ہوا تھا، اللہ کے وہی رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس جواب پر حکم دیتے ہیں کہ جاؤ اسی پیالے اور ٹاٹ کو لے آؤ، جو دنیا کو اس کی آخری کتاب دینے آیا تھا، اگر ایک طرف اس کے ہاتھ میں وہی کتاب تھی، تو اُسی دستِ مبارک میں آنکھوں نے دیکھا کہ غریب حاجت مند کا ٹاٹ اور پیالہ ہے، اور ٹھیک جیسے ہراج (نیلام) کرنے والے پکارتے ہیں،

من یشتري هذين

ان دونوں کو کون مول لیتا ہے۔

کی صداکانوں میں اسی دہنِ اطہر سے آرہی تھی۔ جو قیامت تک پیدا ہونے والی نسلِ آدم کو بآق لہم الجنة کی بشارت سنارہا تھا۔ ایک صاحب نے کہا:-

انا اخذهما بدرهم

میں لیتا ہوں ایک درہم میں۔

نیلام کرنے والے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر حاضرین کو مخاطب کر کے۔

من یزید علی درہم

ایک درہم پر اضافہ کون کرتا ہے۔

کے فقرے کے ساتھ قیمت کے اضافہ پر توجہ دلائی، بالآخر دو درہم پر بولی ختم ہو گئی، خریدار کو ٹاٹ اور پیالہ دیدیا گیا اور دو درہم جو قیمت میں وصول ہوئے تھے، دونوں کو حاجت مند انصاری کے حوالے کر کے ارشاد ہوا،

۱ اشتري هذا طعاما فانيداه ۲ لی

مول لینا اس سے اناج، پھر اسے تو اپنے

۳ اهلك واشتر بالآخر قد وصا

گھر والوں کے پاس ڈال دیجو، اور اس درہم

فاتنی بہ۔

سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔

حضرت انس جو روایت کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ حاجت مند انصاری نے یہی کیا، اور کلہاڑی خرید کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، سب دیکھ رہے تھے جو بکھری ہوئی انسانیت کو خدا سے ملنے آیا تھا، وہی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

شد عود ۲ بیدار - ٹھونکی ایک لکڑی اپنے دست مبارک سے۔

لکڑی ٹھونک کر کلہاڑی انصاری کے حوالہ کی گئی، اور اس کے بعد تاکیداً حکم دیا گیا۔

۲ ذہب فاحتطب وربع وکلا جاؤ اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لاؤ اور بیچو

۳ سینگ خمسة عشر یوما۔ اور نہ دیکھوں گا میں ہرگز تمہیں پندرہ دن تک

(یعنی پندرہ دن تک ملاقات نہ کرنا۔)

وہ چلے گئے۔ پندرہ دن بعد جب خدمت مبارک میں حاضر ہوتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہہ رہے ہیں کہ حضور ان پندرہ دنوں میں دس درہم آمدنی ہوئی۔ جس میں سے چند درہم کے تو کپڑے خریدے گئے، اور چند درہم کا طعام (غذہ) مول لیا گیا۔ مفلس کے افلاس کا ازالہ جس کے مبارک چہرے کو کندن کی طرح چمکا دیتا تھا۔ انصاری کی یہ رپورٹ سن کر اسنی کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

هذه ۲ خیر لک من ۲ ن تجی والمسلۃ یہ بھلا ہے تمہارے لئے اس بات سے کہ تم آؤ

نکتہ فی وجہک یوم القیامۃ۔ اس حال میں قیامت کے دن کہ بیٹک (سوال)

(مجمع الفوائد بحوالہ ابوداؤد و ترمذی) داغ بنا ہوا ہو تمہارے چہرے میں۔

جن ذاتی دلچسپیوں کے ساتھ حصول معاش کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنے کا نمونہ اس سوئے حسنہ بنویہ میں مل رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں اس کی کتنی اہمیت تھی۔ انصاری سے جو آخری فقرہ فرمایا گیا ہے، اس میں کلی طور پر آپ نے گداگری کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے یہ اسلام کا ایک مستقل قانونی باب ہے جس کی پوری تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی۔

حاصل اس کا وہی ہے کہ حتیٰ الوسع اسلام نہیں چاہتا ہے کہ جماعت کا کوئی فرد اپنی توانائیوں کو بے کار ضائع کر کے دوسروں کی اکتسابی قوتوں سے ناجائز نفع اٹھائے۔

معاشی سہولت کے لئے ایک فرض | لوگ غور نہیں کرتے، ورنہ سچ یہ ہے کہ سورہ نزل میں تہجد کی نماز کی نماز کی فرصیت ساقط کر دی گئی، فرصیت کا قانون جب عام مسلمانوں سے اٹھایا گیا۔ تو اس کی وجہ

بیان کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا۔

علم ۲ ن سیکون منکم مرضی و آخرون جان چکا ہے اللہ کہ تم میں کچھ لوگ بیمار پڑ جائیں گے

یضربون فی الارض یتبعون من اور دوسرے (مسلمان) زمین پر چلتے پھرتے رہیں گے

فضل ۲ للہ (النزل ۲۹) اللہ کے فضل کو ڈھونڈتے ہوئے۔

جس کا یہی مطلب ہے کہ اگر شب بیداری سب پر فرض کر دی جائے گی۔ تو فضل اللہ کے ابتغا یعنی تلاش معاش کے فریضے سے کچھ لوگ محروم ہو جائیں گے۔ اسلام نے نماز کے فریضہ کا اٹھالینا گوارا کیا لیکن تلاش معاش کے فریضہ سے لوگوں کو روکنا پسند نہ کیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اسلامی نقطہ نظر کے سب سے بڑے عملی شارح ہیں، مختلف کتابوں میں آپ کا یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ آپ مسجد میں تشریف لائے، دیکھا کہ مجمع کو مخاطب کر کے ایک شخص کہہ رہا ہے۔

”جہاد کی تیاری میں میری کوئی مدد کر سکتا ہے۔“

حضرت عمر کا ایک | کون نہیں جانتا کہ جہاد کا شمار اسلامی شریعت کی ان ہی عبادتوں میں ہے جو خدا کی
لچسپ تعلیمی واقعہ | طرف سے مسلمانوں پر فرض کی گئی ہیں، اسی اسلامی عبادت میں مشغول ہونے کے
لئے سائل مسلمانوں سے امداد طلب کر رہا تھا، لیکن سنتے ہو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیا کرتے ہیں، راوی کا بیان
ہے کہ آگے بڑھتے ہیں اور صدالگانے والے کا ہاتھ پکڑتے ہیں، اور مجمع کو مخاطب کر کے صدالگاتے ہیں۔

من يستاجر مني ليعمل ۲ رصده

کون نوکر رکھتا ہے اس کو میری طرف سے

اپنی زمین میں کام کرنے کے لئے۔

ایک صاحب نے عرض کیا مجھے ضرورت ہے۔ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ماہوار تنخواہ طے کرنے کے
بعد جہادی امداد طلب کرنے والے کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں، وہ لے جاتے ہیں، اور اپنے باغ اور
کھیت کے کام میں لگا دیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دماغ سے اس کا خیال نہیں نکلتا ہے۔ کچھ دن
گزرنے کے بعد مسجد ہی میں دریافت فرماتے ہیں، اس شخص کا کیا حال ہے، جن صاحب نے نوکر رکھا تھا
انہوں نے جواب دیا کہ حضور اب تو وہ بڑے بڑے مزرے میں ہے۔ تنخواہ سے کافی سرمایہ اس نے جمع کر لیا ہے، ارشاد
ہوا کہ اس سرمایے کے ساتھ جو اس نے اس عرصہ میں کمایا ہے، میرے پاس ذرا اسے بھیج دینا۔ ارشاد کی تعمیل
کی گئی۔ گلے میں ایک بھاری ٹھیلی (بیگ) لٹکائے دیکھا جاتا ہے کہ مسجد کا وہی سائل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ
عنہ کے پاس آ رہا ہے۔ جب وہ حضرت کے پاس آگیا، تو آپ نے اس کی بھری ہوئی بوجھل ٹھیلی کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

خذ هذه فان شئت فالان اغروا

لے اس کو، پھر اب جی چاہے تو جہاد کرو،

۲ شئت فاجلس (کنز العمال)

یا جی چاہے تو (گھر) بیٹھ!

قیامت بھی قائم ہو رہی ہو جب بھی | معاشی کاروبار میں مشغولیت پر اسلام کا کتنا زور ہے۔ وہ اسکی اہمیت پر
معاشی کاروبار کو ترک نہ کرنا چاہئے | کس حد تک اصرار کرنا چاہتا ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عائشہ صدیقہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس مشہور حدیث سے بھی ہو سکتا ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہ
روایت فرماتی ہیں،

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر

۲ قامت الساعة و فی احد کم

قیامت قائم ہو جائے۔ اور تم میں سے کسی

فسیلة فان استطاع ۲ ان لا تقوم

کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو۔ اگر اس کے بس

حتی یغرسها فی غیرہا،

میں ہو کہ کھڑا نہ ہو۔ جب تک کہ اس کو بولے

(کنز العمال بحوالہ حم)

تو چاہیے کہ اس پودے کو بولدے۔

زمین کی آباد کاری بھی مسلمانوں | اور سچ تو یہ ہے کہ جلیل القدر حنفی امام علامہ ابو بکر حبیب اللہ کا اگر یہ استدلال
کے قرآنی فرائض میں ہے، | صحیح ہے۔ اور بہ ظاہر اس کی صحت میں کوئی شبہ کرنے کی گنجائش نہیں یعنی
قرآن پاک کی آیت جس میں اللہ انوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔

۱ انشاء کم من الارض واستعمرکم
فیہا (ہود ۱۱)

اٹھا کر کھڑا کیا تمہیں زمین سے، اور آبادی
کرائی تم سے اس زمین میں۔

جصاص رحمۃ اللہ اس آیت کے تحت میں فرماتے ہیں۔

وفیہ الدلالة علی وجوب العمارۃ

للزراعة والعمران والابنية (۱۶۵ ج ۲)

یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کا آباد کرنا، کھیتی
باغبانی اور تعمیر کے ذریعہ سے واجب ہے۔

جس کا یہی مطلب ہے کہ زمین کی عمارت (آبادی) خواہ بشکل الزراعة (کھیتی) یا بشکل العمارات (باغبانی) یا بصورت
الابنية (تعمیرات) ہو، قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی بنیاد علامہ جصاص حنفی کے نزدیک جائز یا سنت ہی نہیں،
واجب اور فرض ہے، گویا اس شغل کی حیثیت وہی ہے جو نماز روزہ حج و زکوٰۃ کی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ
عربی زبان کے طرز خطاب سے جو واقف ہے۔ وہ الجصاص کے اس استدلال میں کوئی کمزوری نکال سکتا ہے۔
خصوصاً جب ہم تک ایک دو نہیں، بلکہ تقریباً مشہور و مستفیض روایتوں کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ
حدیثیں پہنچی ہیں، جن میں آپ نے صرف اسی کاشتکاری اور باغبانی کو نہیں جس سے کاشت کرنے والے یا باغ
لگانے والے کو نفع ہی پہنچے، بلکہ اس میں بھی جس سے وہ نفع گیر ہوا ہو، اس کے متعلق بھی مختلف پیرایوں میں حضور
صلی اللہ علیہ وسلم اخروی ثواب کی بشارت سناتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال ابنی صلی اللہ علیہ وسلم ما من
مسلم یزرع زرعاً أو یغرس غرساً
فیأکل منه طیر أو إنسان أو بهیمۃ
الا کانت له صدقۃ۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں ہے
کوئی ایسا مسلمان جس نے کھیتی کی ہو یا درخت
لگایا ہو، پھر اس کھیتی یا درخت سے پرند
کھائے یا آدمی یا جانور، مگر یہ کہ ہو گا وہ

(رداء البخاری فی صحیحہ) اس کی طرف سے صدقہ۔

وجہ ظاہر ہے کہ اس کھیت یا باغ لگانے والوں کو اگر نفع نہ پہنچا، تو کیا ہوا، اس نے تو اپنا فرض
ادا کیا، اور جس نے خدا کے عائد کئے ہوئے فرض کو ادا کیا، ثواب کا مستحق وہ نہ ہو گا، تو اور کون ہو گا، ما سوا
اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر بھی اشارہ فرمایا کہ کاشتکار اور باغبان نے خدا کی دی ہوئی قوتوں
سے کام لے کر اس چیز کو جو معدوم تھی، وجود کے لباس میں جلوہ گرہونے کا موقع دیا۔ اس سے اگر فرد کو نفع
اٹھانے کا موقع نہ ملا، تو جماعت کی خدمت کا فرض تو وہ بجالایا، اور جماعت ہی نہیں، خدا کی دوسری زندہ
مخلوق، مثلاً پرند یا بہیمہ (چوپائے) اگر اس سے مستفید ہوئے تو قصداً نہ سہی۔ ضمناً اپنے وجود اور اپنی توانائیوں
کو اس نے مفید ثابت کیا، اور اسلام یہی چاہتا ہے کہ خدا کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بے کار اور ضائع
ہونے سے بچایا جائے۔

مذہب اور دین کے متعلق آج جو غلط خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو سامنے رکھتے ہوئے کون یقین
کر سکتا ہے کہ اسلام بھی باوجودیکہ ایک دین اور مذہب ہے لیکن جن مشاغل و پیشیوں کو عام طور پر دنیاوی مشغلوں میں
شمار کیا جاتا ہے۔ اسلام نے ان سب پر آخری اجر و ثواب کو مرتب کر کے ان کو وہی مقام عطا کر دیا ہے۔ جو

عام دینی فرائض و عبادات کا سمجھا جاتا ہے۔ کہاں یہ نقطہ نظر کہ جو جس حد تک دنیوی کاروبار سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے گا، اُسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل کرے گا، اور کہاں یہ عقیدہ کہ دنیا کے مشغلوں میں انہماک اور ان کے ساتھ اشتغال ہی کو خدا کی خوشنودی اور نزدیکی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، مذہب کے ان غیر فطری غلط رجحانات کے استیصال میں اسلام نے کیا کام کیا ہے، ضرورت ہے کہ اس پر کوئی مستقل کتاب لکھی جائے، جیسا کہ ضرورت کا اقتضا تھا، اسلام میں بھی اجبار و علماء (مذہب کے قانونی اور تشریحی پہلوؤں کے خدام) اور رہبان (صوفیہ) یعنی مذہب کی حقیقی روح اور واقعی مقصد کے محافظوں کا گروہ ضرور پیدا ہوا، اور جب تک اسلام ہے، انشاء اللہ تعالیٰ یہ دونوں طبقے باقی رہیں گے..... اور ان کو باقی رکھنا چاہئے، لیکن نہ جاننے والے خواہ کچھ ہی کہیں، یا غلط مثالوں کو دیکھ کر ان طبقات کے صحیح نمائندوں کے متعلق غلط خیالات کیوں نہ قائم کر لئے جائیں، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اجاباً اور رہبان کے وہی افراد جو دوسرے ادیان و مذاہب میں "اکل بالباطل" پر گزارہ کرتے تھے، بحمد اللہ اسلامی اکابر و اسلاف کا دامن اس الزام سے پاک ہے۔ علماء کے طرز عمل کی طرف تو میں نے پہلے بھی کچھ اشارہ کیا ہے، لیکن "اکل بالباطل" یا مفت خوری میں سب سے زیادہ بدنام طبقہ صوفیہ کا ہے، جو نہ پڑھتے ہیں اور نہ پڑھنا چاہتے ہیں، بایں ہمہ جہل و ناواقفیت ہر قسم کے فیصلوں پر جبری ہیں، ان کو میں کیسے سناؤں کہ تمہارے غلط طعنوں سے جو گروہ اتنا مجروح و زخمی ہے۔ اسی طبقہ کا کوئی معمولی آدمی نہیں، بلکہ اساطین صوفیہ میں جس کا شمار ہے، میری مراد مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ ابوالکارم علاؤالدولہ سمستانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے جو تصوف و حقائق کے ایک خاص مکتب خیال کے پیشوا ہیں، مولینا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کسی خاص "مادی معاشیات کی کتاب میں بھی اس قسم کا معاشی نظریہ مل سکتا ہے، میں بجنسہ فارسی الفاظ کے ساتھ ان کی اصل عبارت نقل کرتا ہوں۔

حضرت سہمنا فی فرماتے ہیں :-

حق تعالیٰ اس زمین و مزارع را بحکمت آفریدہ و میخواید
کہ معمور باشد و فائدہ بخلق رسد، و اگر خلق بدانند کہ از
عمار دنیا کہ برائے فائدہ و دخل کنند، نہ بوجہ
حق تعالیٰ اس زمین و مزارع را بحکمت آفریدہ و میخواید
کہ معمور باشد و فائدہ بخلق رسد، و اگر خلق بدانند کہ از
عمار دنیا کہ برائے فائدہ و دخل کنند، نہ بوجہ

۱۷ تاریخوں میں لکھا ہے کہ مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص فاتح مصر کا طائف میں وہمط نامی جو تاجکستان تھا۔ "کان علی الف الف (اے ملیوں) خشبتہ الارتمات البطاف" ص ۱۱۵ "شکیب ارسلان" یعنی دس لاکھ ڈنڈے تھے، جن پر انگور کی بیللیں چڑھی ہوئی تھیں، امیر شکیب ہی نے نقل کیا ہے کہ جب طرابلس فتح ہوا، اور جبل اخضر پر حضرت عمرو بن العاص کی نظر پڑی تو فرمایا، "لولا اموالی بالحبز ما اخترت علی ہذا الارض" یعنی وہمط میں باغبانی کا استعمال کر چکا ہوں۔ ورنہ طرابلس کے جہاد میں جب جبل اخضر پہنچا تو اس کی سرسبزی دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ واقع میں طائف کی سرسبزی اُس کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔ بہر حال صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نقطہ نظر کا اس سے پتہ چلتا ہے، آج طرابلس کے ریگستانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن جبل اخضر کا کون ذکر کرتا ہے، یورپ کا بھی یہ دجل ہے ۱۲

۵۲۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ دینی غرض یا نیت ہی کی وجہ سے ثواب کا پہلو پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ دنیاوی نفع اور آمدنی کو نصب العین بنا کر جو معاشی کاروبار میں مشغول ہے۔ اس کو بھی آخری ثواب کا امیدوار قرار دیا گیا ہے ۱۲

اسراف چہ ثواب ست، ہرگز ترکِ عمارت خلق اللہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کی آباد نہ کنند، کاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔

یعنی فضول خرچی کے طور پر یہ آبادی نہ ہو (جیسے لوگ فخر مکان پر مکان بناتے چلے جاتے ہیں جس میں نہ رہتے ہیں اور نہ دوسروں کو رہنے دیتے ہیں) بہر حال نفع اور آمدنی کے لئے آباد کاری کے کام میں کتنا ثواب ہے۔ اگر لوگوں کو اس کا صحیح علم ہوتا تو ہرگز آباد کاری کے کام کو نہ چھوڑتے۔
و اگر بدانند کہ از ترکِ عمارت و گذاشتن زمین اسی طرح اگر لوگ یہ جانتے کہ آباد کاری کے راجع چہ گناہ حاصل می شود، ہرگز نہ گذارند کام کے چھوڑنے اور زمین کو بیکار پڑے ہونے کہ اسباب او خراب شود، دینے میں کتنا گناہ ہے۔ تو ہرگز وہ یہ نہ کرتے کہ آبادی کے جو اسباب ہیں، ان کو برباد ہونے کے لئے چھوڑ دیں۔ (مثلاً تالابوں اور کنوؤں کی خبر نہ لینا، نہروں کی مٹی صاف نہ کرنا، وغیرہ وغیرہ اسبابِ آبادی، جن کی بربادی کی طرف عوام کو توجہ نہیں ہوتی)

آگے تمثیل سے اس اسلامی نظریہ کی تشریح بایں الفاظ فرماتے ہیں :-

ہر کس کہ زمین دار کہ ہر سال ازاں زمین جو کوئی زمین کا کوئی ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس ہزار من خلد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی کوتاہی اور کاہلی و سستی سے بجائے ہزار من کے) نو سو من خلد اس زمین سے حاصل ہوا، اور اس کی وجہ سے تنو من خلد مخلوق کے حلق میں نہ پہنچ سکا تو (قیامت کے دن) اس (نفحات الانس جامی ص ۵۰۸ مطبوعہ کلکتہ)

سے اس سو من کی باز پرس ہوگی اور اسی کے برابر اس سے واپس مانگا جائے گا۔

وہی مذہب، وہی ثوابِ آخرت جسے غلط کاروں نے ایک مدت تک تقریباً تمام اقوام و امم میں ترک دینا اور معاشی کاروبار سے بھگانے، نفرت دلانے کے آلے کی حیثیت سے استعمال کیا۔ یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ کسی سگِ دنیا خرمیں نے نہیں بلکہ اسلامی رہبان (صوفیہ) کا جو سرگرم وہ ہے۔ وہ اسی مذہب و اسی ثوابِ آخرت کو حصولِ دنیا اور معاشی کاروبار کی گرم بازاری کے لئے استعمال کرتا ہے، اور بغیر کسی دغدغہ کے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے خلاف ورزی کرنے والوں بلکہ دنیاوی کاروبار میں پوری توجہ اور انہماک سے کام نہ لینے والوں تک کو "بازخواست" کی سزا کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

آج مثلاً ہندوستان کے ان کاشتکاروں کو جنہوں نے محض اپنی آبائی زمین اور قدامت پرستی کے تحت

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یقیناً اس کی ذمہ دار وہ حکومت بھی ہے جو دکھانے کی حد تک تو بہت کچھ دکھا رہی ہے، کسانوں اور کاشتکاروں کی رہنمائی کے لئے مستقل ڈیپارٹمنٹ ہر ہر صوبے میں لاکھوں لاکھ روپے کے مصارف سے قائم ہیں لیکن دکھانے کے ان دانتوں کے پیچھے چونکہ واقعی کھانے والے دانت نہیں ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی زراعت اس بیسویں صدی میں بھی ماضی کے ہزار ہا ہزار سال کے آثارِ قدیمہ کا ایک نمونہ بنی ہوئی ہوئی ہے۔ لا تسطعین من جنتہ

کشاورزی کے جدید آلات اور طریقوں کو ترک کر کے اس ملک کی پیداوار کو تقریباً سارے جہاں کی پیداوار کے مقابلہ میں انتہائی پستی کی حالت میں ڈال رکھا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے کسان زمین کے جس رقبہ سے تنو تنو من غلہ نکالتے ہیں۔ ہندی کسان اپنے باپ دادوں کے تقلیدی آسب کا مارا ہوا کسان اسی رقبہ سے بہ مشکل دس من نکالنے میں بھی دشواری محسوس کرتا ہے۔ آج کس کے پاس دنیا کے کس خطہ میں کس قوم کے پاس ایسا دین اور مذہب ہے جو ہندی کسانوں کے اس طرز عمل کو مذہبی گناہ، دینی جرم بتا کر ان کی عملی قوتوں میں بیداری پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام میں جس گروہ کو تارک الدنیا فقیروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی گروہ کا ایک پیشوا جو یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے کہ کسان کی کاہلی اور قلتِ توجہ کی وجہ سے پیداوار کی جو مقدار زمین سے باہر نہ آسکی، اور خلق خدا کے حلق تک نہ پہنچ سکی۔

بقدر آں از دے بازخواست خواہند کرد۔ اسی کے برابر اس شخص سے اتنا ہی واپس

مانگا جائے گا۔

آخرت کی آبادی کے | یقیناً یہ اسی دین کا پیغام ہے جس نے "استعمار الارض" یعنی زمین کی آبادی کو بھی انہی لئے دنیا کو آباد کرنا | فرائض میں داخل کر دیا ہے، جن کی بجا آوری پر مذہب میں جنت کی آبادی کے وعدے کئے گئے ہیں۔ آخرت کو آباد کرنے کے لئے دنیا کو آباد کرو، بتایا جائے کہ اسلام کے سوا اس نظریہ کی دعوت کس نے دی ہے، اور کون دے رہا ہے، اپنی توانائیوں کو تعطل اور بے کاری کے عوارض سے مفلوج کر کے بائذائی زندگی گزارنے والے خدا جانے اپنے اس مسلک کے متعلق کیا مایخویا پکارتے رہتے ہیں۔ لیکن صوفیانہ نقطہ نظر سے بھی جس نے اسلامی نظریات کی شرح کی ہے۔ وہ آخر میں اس اعلان پر اپنے مذکورہ بیان کو ختم کرتا ہے۔ حضرت علاؤالدولہ سمنانی آخر میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی

از کاہلی ترک عمارت زمین کند، و آں را
ترک دنیا و زہد نام نہد، جز متابعت شیطان
چیزے دیگر نیست۔
اپنی کاہلی سے زمین کی آبادی چھوڑ بیٹھا ہو،
اور اس کا نام اس نے ترک دنیا اور زہد
رکھا ہے۔ تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا
اور کچھ نہیں ہے۔

(ص ۵۰۸ نقحات)

اور قرآنی حکم سے اعراض کر کے جو دوسری مخالفت راہ اختیار کرے گا۔ اگر وہ شیطان کی پیروی نہیں
کر رہا تو اور کیا کر رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس قرآن نے
کائنات کے جمالی پہلوؤں | انا جعلنا صاعی الارض
کی طرف چند قرآنی اشارے | زینۃ لها (الکہف ۱۵)
کا اعلان کر کے "ما علی الارض" (یعنی روئے زمین پر جو کچھ ہے) اس کو زمین کی آرائش اور اس کا بناؤ منگوار قرار

۱۵۔ بانڈا بہاری لفظ ہے۔ عموماً درختوں پر ایک بناتی شے، جسے دوسرے صوبوں میں شاید قرض خواہ کہتے ہیں، بہار میں اس کا نام یہی ہے۔ یہ
اپنی غذا زمین سے خود حاصل نہیں کرتا بلکہ دوسرے درختوں پر سوار ہو کر ان کی حاصل کی ہوئی غذا سے پیٹ پالتا ہے ۱۲

وے رہا ہو، تو پھر زمین کی پیداواروں میں دخل، یعنی آمدنی اور نفع ہی کا پہلو کیوں پیش نظر رکھا جائے۔ خود اسی قرآن میں جب انسانی سواریوں تک میں یہ چاہا گیا ہے کہ نفع کے ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ ان سے ایک فتنہ کی آرائش اور زینت ہوتی ہے۔ تو خدا نے اور جن چیزوں کو زینت کے لئے بھی پیدا کیا ہے۔ اُن سے علاوہ مادی منافع کے زینت کا کام کیوں نہ لیا جائے۔ گھوڑوں، خچروں، گدھوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے

الخنیل والبغال والحمار لتركبوها و

گھوڑے، خچر، گدھے اسی لئے ہیں کہ ان پر

سوارینہ (النمل ۱۴)

سواری کرو، اور وہ آرائش ہیں۔

صبح اور شام کے سہانے وقتوں میں خصوصاً دیہات کی صبح و شام میں جو یہ منظر سامنے آتا ہے کہ گاؤں کی مویشیاں آپس میں ملی جلی صبح کو آبادی سے نکل کر چراگاہوں کی طرف جا رہی ہیں، اور شام کو واپس آتی ہیں۔

ولکم فیہا جمال حین تریحون و

تمہارے لئے ان (مویشیوں) میں جمال و حسن ہے

حین تشرحون۔

جب تم شام کو انھیں گھر واپس لاتے ہو، اور

صبح کو جب انھیں چراگاہ کی طرف بجاتے ہو۔

(النمل ۱۴)

کے چونکا دینے والے فقرے سے قرآن انسانی فطرت کی جمالیاتی جستجو کو ایک ”لذیذ یافت“ اس سہانے منظر کی طرف متوجہ کر کے عطا کرتا ہے۔

اسی طرح لباس کا ذکر کر کے ستر پوشی اور الحر والبرد (سردی و گرمی) سے حفاظت کے جو فوائد ہیں، اُن کے ذکر کے ساتھ ساتھ حُسن و زیبائی سے سج و سج کے جو نتائج لباس سے حاصل ہوتے ہیں، ان پر بھی متنبہ کرتے ہوئے سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا۔

یا بنی آدم قد انزلنا علیکم لباسا

اے آدم کے بچو، ہم نے اتارا تم پر لباس

یواری سوا تکم و ریشا۔

جو چھپاتا ہے شرکگاہوں کو تمہاری اور

وہ آرائش (بھی ہے)

(الاعراف ۳۱)

اس کے سوا آگے،

خذوا زینتکم عند کل مسجد

اپنی آرائش کو اختیار کرو، ہر مسجد گاہ

کے پاس،

(الاعراف ۳۱)

کا جو حکم دیا گیا ہے، اس میں تو لباس کو زینت اور زینت کو لباس قرار دیتے ہوئے بہ ظاہر اس طرف اشارہ ہے کہ جس لباس سے بجائے سنورنے کے آدمی کی ہیئت اور بگڑ جائے، اسے لباس ہی نہیں قرار دینا چاہیے خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عام دستور تھا کہ نیا جوڑا جب زیب تن فرماتے، تو اس وقت بے ساختہ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہو جاتے۔

الحمد للہ الذی کسانی ما یواری بہ

ستائش ہے اس اللہ کے لئے جس نے پہنائی

عورتی و اتجمل بہا فی حیواتی۔

مجھے وہ چیز جو چھپاتی ہے میرے ستر عورت کو

اور جمال حاصل کرتا ہوں میں اس سے زندگی میں۔

مردوں کے ساتھ بھی | شکر کے ان الفاظ میں "فی حیاتی" کی قید تو غالباً اظہار واقعہ کے لئے ہے۔ ورنہ اسلام کا جہاں
 اسلام کا جہاں قیامی نقطہ نظر | نقطہ نظر تو حیات و زندگی کے دائرے سے بھی آگے بڑھ کر موت تک کو اپنی آغوش میں لے
 ہوئے ہے۔ ترمذی کی مشہور حدیث ہے کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے۔

اذ کفن احدکم اخاه فلیحسن کفنه (ترمذی)
 جب کوئی تم میں سے اپنے بھائی کو کفن پہنا کرے
 تو چاہئے کہ اچھا کفن پہنا کرے اس کو۔

قبر تک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک کسی بدہمتی اور بھونڈے بن کو برداشت نہیں کر سکتی
 تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اتفاقاً کسی قبر میں کچھ رخنہ رہ گیا تھا۔ پورے طور پر جیسا چاہئے۔ برابر نہیں کی
 گئی تھی۔ حضرت انس خادم خاص نبوت کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس رخنہ کو نہ دیکھ سکے۔
 کثر العمال میں ہے کہ

۲ مرا بہا ۲ ن شدد۔ حکم دیا کہ اس رخنہ کو بند کر دیا جائے۔

ایک صحابی نے جو پاس ہی کھڑے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ حضور! اس بیچارے مردے کو کیا
 نفع پہنچے گا۔ جہاں کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھنے والے کو سمجھایا

۲ اما انہا لا تنفع ولا تنفع ولكن
 تضر عین ۲ لھی۔ بیشک اس سے نہ ضرر پہنچتا ہے نہ نفع، مگر
 ٹھنڈی ہوتی ہے اس سے زندہ کی آنکھ۔

یعنی مردے کو نہیں، بلکہ زندوں کی آنکھیں اس سے خشکی حاصل کرتی ہیں، اسی کے قریب قریب دوسری روایت میں ہے۔
 تطیب عن ۲ لھی

قبور تک میں جو دین آنکھوں کی خشکی تلاش کرتا ہو، آنکھوں کو بھلا معلوم ہو، ایسی قبر بنانے کی تعلیم دیتا ہو، اندازہ کیا جاسکتا
 ہے کہ دنیا کی اور چیزوں کے متعلق حسن کاری اور حسن پسندی میں اس کا پاکیزہ مذاق کتنا بلند اور مستقر ہوگا۔ نیک ناموں
 کے بدنام کرنے والے ان چند نفوس کو آج کس میں جرأت ہے جو یہ جا کر سنائے کہ جس الجھی ہوئی ڈاڑھی پر نشان
 بال، بے تگے لباس کو وہ مذہبی اور دینی شکل کا نام دے رہے ہیں۔ دین کے سب سے بڑے معلم صلی اللہ
 علیہ وآلہ وسلم کی نظر مبارک میں وہی بے دینی کی علامت شمار ہوئی تھی۔ مجمع الفوائد میں امام مالک کی سند
 سے یہ حدیث مذکور ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے۔ اتنے
 میں ایک آدمی داخل ہوا، جس کے سر اور ڈاڑھی
 کے بال الجھے ہوئے پریشان تھے، آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف کچھ اشارہ
 فرمایا، گویا اسے حکم دے رہے ہیں کہ اپنے
 بال اور ڈاڑھی کو درست کرے، اس شخص
 نے تباہی کیا، اور واپس پلٹ کر آیا، حضور

کان ۲ لنبی صلی اللہ علیہ وسلم
 فی ۲ لمسجد فدخل رجل شاعر
 ۲ اس ۲ واللحیۃ فاشا ۲ المیہ
 صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ کانہ
 یا صر با صلاح شعرہ ولحیتہ
 ففعل شمر رجع فقال صلی اللہ
 علیہ وسلم ۲ لیس ہذا خیرا

من ۲۱ یا قیاحد کہ قاتر المراس

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا یہ اچھا
نہیں ہے، اس بات سے کہ تم میں سے کوئی

کامنہ شیطان،

آتا ہے سر کے بالوں کو پریشان کئے ہوئے، گویا کہ وہ کوئی شیطان (بھوت) ہے۔

بد وضع و بد ہیئت شکل | گناہ شیطان کے آخری الفاظ بہت زیادہ قابل توجہ ہیں، اُن کے لئے جنہیں اپنی "تائید" اس
شیطان کی شکل ہے | واللہ والی شکلوں پر ملکوتیت کا مغالطہ لگا ہوا ہے، جن مسلمانوں کو اپنی دائرہ کی جنگلوں پر ناز،

وہی جنہیں دیکھ کر بجائے مسلمان ہونے کے کبھی کبھی سکھ ہونے کا دھوکا ہوتا ہے، ان کو نبوت محمدیہ کے سب سے بڑے مذاق
شناس فاروق اعظم کا یہ اثر یاد رکھنا چاہیے جسے بخاری کی شرح میں علامہ محمود بدر الدین عینی نے نقل کیا ہے۔

دائرہ کی متعلق حضرت | ۲۱ دائرہ ای رحلا قد ترک
عمر کا ایک دلچسپ واقعہ | لمحۃ حق کبرت فاخذ

حضرت عمرؓ اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے تھے
پھر آپ نے قینچی منگائی، اور ایک آدمی کو حکم دیا

یجذبہا ثم قال ۲۱ نوئی بجلتین ثم امر
رجلا فجن تحت تحت بد ۴۔

تو اس نے دائرہ کا جتنا حصہ ہاتھ کے نیچے تھا (غالباً بمقدار قبضہ چھوڑ کر) چھانٹ دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس شخص کی دائرہ پکڑ کر کھینچ رہے تھے، یہ جملہ قابل غور ہے، آج ایسی دائرہ ویوں
کو ہاتھ لگانے والا بیچارہ "کفر" کے فتوے سے کیا بچ سکتا ہے؟ اور فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف اسی فعل پر بس

نہیں فرماتے ہیں، اس کام کو ختم کر کے ارشاد ہوا،

درندوں کی صورت | ۲۱ ترک حد کہ نفسہ کا نہ سبع

تہا بے بعض لوگ اپنے آپ کو کچھ اس طرح چھوڑ دیتے

ہیں کہ گویا درندوں میں سے وہ کوئی ایک درندہ ہے

من ۲۱ السباع۔ (یعنی ص ۲۸۵ ج ۱)

درندوں میں سے ایک درندہ بن جانا ایک بڑا معیار ہے، ان لوگوں کے لئے جن کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ انسانیت کی تکمیل

اور اس میں حسن و جمال پیدا کرنے والا اسلام ان سے کیا چاہتا ہے۔ میں نے پیدا کرنے کا لفظ قصداً استعمال کیا، کیونکہ

شاید میری گذشتہ شہادتوں سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ اسلام صرف حسن پسندی اور جمال پذیرائی کے جذبات بیدار کرنے کی

ہی حد تک اپنے ماننے والوں پر اصرار کرتا ہے، حالانکہ جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے، اس سے اگر ایک طرف حسن پسندی

تو دوسری طرف حسن کاری کی حوصلہ افزائیوں پر کم روشنی نہیں پڑ رہی ہے۔ مگر آج جو اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں، ان

مسلمانوں تک اس آواز کو کون پہنچائے کہ تمہارے اسلاف کے فنون لطیفہ کا ایک بڑا شعبہ جس پر آج یورپ سر

۱۵ مطلب یہ ہے کہ فنون لطیفہ کی بعض ایسی شاخیں جن کے بڑھنے سے انسانیت کی جڑ کٹتی تھی۔ اسلام نے جڑ کی حفاظت کے لئے

فنون لطیفہ کی ایسی شاخوں کا تو کاٹ دینا ضروری خیال کیا جن میں سب سے زیادہ اہمیت تصویر کشی کو ہے۔ جزافاتی ظلمات کا وہ حیرت

انگیز کارخانہ جس کا نام اصنامی نظام یا بت پرستی ہے، جس کی بدولت ساری مخلوقات کے آقا انسان کو سارے جہان کی غلامی کا

طوق اپنے گلے میں ڈالنا پڑا، اور جس کی بدولت آدمی کی دولت، اس کی عزت، صحت بلکہ نسلی خصوصیتوں پر سینما کی اور عریانی تصویروں

سے جو زریں پڑ رہی ہیں، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، آئندہ قانونی ابواب میں بھی اس کا ذکر آئے گا ۱۲

دُھن رہا ہے۔ ان کی جمالیاتی دلکشیوں میں اس دینی تربیت کو بھی بڑا دخل تھا، جو اس دین کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی امت کی کی تھی۔ اگر صحیح مسلم کی یہ مشہور روایت صحیح ہے،

اسلام اور ان ۱۲ کتب الاحسان علی کل
حسن کاری شیء فاذا ذبحتم فاحسنوا ۱۲ الذبح
واذا قتلتم فاحسنوا ۱۲ القتل
اچھی طرح قتل کرو (یعنی سلیقے کے ساتھ)

اور نہ صحیح ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ مسلم کے سوا بھی صحاح کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ حسن و جمال کے قالب میں ڈھالے بغیر اسلام نہیں چاہتا کہ کسی مسلمان سے کوئی فعل بھی صادر ہو، سب سے آخری کام جس میں حسن کاری کا آدمی خیال نہیں کر سکتا، وہ قتل اور ذبح کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر جب ان افعال میں بھی پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حکم ہے کہ حسن پیدا کر لے کی کوشش کی جائے، تو ان صناعات اور کاریگریوں میں جن میں عموماً آدمی کی فطرت تناسب و جمال کو چاہتی ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کا نقطہ نظر کیا ہو سکتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرمانے کے بعد کہ

ان ۱۲ کتب الاحسان علی کل شیء اللہ نے ہر چیز میں حسن کاری کو واجب کیا ہے۔

کسی مزید گفتگو کی حاجت بھی نہیں رہتی۔ نیز حدیث کے اس حصے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حسن پسندی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذاتی مذاق بھی نہ تھا، بلکہ ہر چیز میں حسن پیدا کرنے کو اسی نے بندوں پر واجب کیا ہے اور اسی کو واجب بھی کرنا چاہئے تھا، جس سراپا حسن و جمال کے متعلق ارباب مشاہدہ کا بیان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ہے،

خدا بھی جمیل ہے جمال ۱۲ اللہ جمیل و محب
کو پسند کرتا ہے الجمال (مسلم وغیرہ)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہیں، اور جمال کو پسند فرماتے ہیں۔

احسان کا الاستاذ الامام مولانا نور شاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہ نے ایمان و احسان کی شرح حدیث پڑھاتے مطلب، ہوئے فرمایا تھا کہ ان مواقع میں احسان کا (حسن پیدا کر دین) لغت ترجمہ صحیح ہے۔ آپ کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ قرآن پاک میں ”المحسنین“ کا لفظ جہاں کہیں آیا ہے، اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ جو اپنے ایمان و عمل میں حسن پسند واقع ہوئے ہوں، یعنی ایمان و عمل کے ادنیٰ درجہ پر قانع نہ ہوں، بلکہ ان امور کے حسن کا جو درجہ ہے، اس کے حصول میں کوشاں ہوں گویا ”المحسنون“ مسلمانوں کا وہ طبقہ ہے جو زندگی کے تمام مطلوبہ شعبوں میں حسن پسند واقع ہوا ہو، ظاہر ہے کہ یوں سرکا بوجھ اتارنے کے لئے جو کام کئے جاتے ہیں، اس میں نہ زیادہ مشقت ہوتی ہے، نہ زیادہ وقت لگتا ہے، نہ زیادہ محنت صرف ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ ارادہ کر لیا جائے کہ جو کام بھی کیا جائے پورے حسن و سلیقہ کے ساتھ کیا جائے، اس کے لئے تو سب ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پھر ان حسن کاریوں اور محسنوں کو جمالِ مطلق کی محبوبیت کا مقام اگر حاصل ہوا جس کا قرآن میں بار بار اعلان کیا گیا ہے، تو اپنی

محنت و مشقت، جانفشانی کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں، میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ قرآن کے ”محسنین“ سے مراد ان ہی لوگوں کا گروہ ہے، جن کی زندگی خالق و مخلوق کے باہمی تعلقات کی تصحیح میں حسن کارانہ مجاہدوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ اور عموماً یہی اس سے مراد بھی لیا گیا ہے، ایمان و اسلام و احسان کی مشہور حدیث میں ”الاحسان“ کی جو شرح

تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن
تتراہ فانہ یراک۔
یو جو اللہ کو اس طریقہ سے کہ گویا تم اسے دیکھ
رہے ہو۔ پس اگر نہ دیکھ پاؤ اس کو (تو اتنی

بات بہر حال یقینی ہے کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

کے الفاظ میں کی گئی ہے، اس شرح سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اور اسی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں محسنوں کا طبقہ وہی ہے جسے عام محاوروں میں صوفیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول اگر واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے یعنی،

حسن کار صناعات کا | ان العبد الذی عمل
طبقہ خدا کا محبوب ہے | عملاً حب اللہ
جب بندہ کوئی کام کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ
چاہتے ہیں، کہ اس میں اتقان پیدا کرے
یعنی اس کو ٹھیک جیسا کہ چاہیے اسی

یقینہ۔

(کنز العمال) طرح انجام دے۔

تو میں نہیں سمجھتا کہ مسلمان صناعات اور کاریگروں میں جو لوگ اپنے اپنے مصنوعات اور اپنی اپنی دستکاریوں میں اس لئے اتقان و استواری تناسب و موزونیت پیدا کرتے ہیں کہ ان کا خدا ان کے اس فعل کو محبوب رکھتا ہے، تو حسن کاریوں کے اس گروہ کو بھی محبت کے اس امتیاز سے کیسے محروم رکھا جاسکتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ جس دین نے اپنے ماننے والوں کے لئے مشغولیت کا ایسا نظام پیدا کیا ہے کہ اس دین کے مطابق عزم کی پوری طاقت کے ساتھ جو دین دارانہ زندگی بسر کریں گے۔ ان کے لئے کاہلی و بیکاری

لے میں نے یہ ترجمہ ان لوگوں کے مطابق کیا ہے جن پر آیت ۲ لظاہر فلیس فوقک شیئ (تو ہی کھلا ہوا ہے، تیرے اوپر کچھ نہیں ہے) اس حدیث صحیح کا راز واضح ہو چکا ہے اور ع دیدہ آئینہ دار طلعت اوست کے مقام کو اپنا مقام بنا چکے ہیں، کسی مخلوق کو خالق کے ظہور کے بغیر ان کے لئے ناقابل تصورات ہو چکی ہے، ان پر لا حب الا فلیں (میں ڈھل جانے والے کو پیار نہیں کر سکتا) کی ابراہیمی تجلّی چمک چکی ہے، باقی جو عالم کو عالم کے خالق سے ٹوٹا ہوا تصور کر رہے ہیں اگویا کچھ ایسا خیال کرتے ہیں کہ معاذ اللہ عالم پیدا ایش میں تو خدا کا محتاج ہے لیکن وجود اپنے بقا میں خدا کی شاید اس کو ضرورت نہیں اسی لئے مخلوق کے وجود کو خالق کے وجود سے اس طرح جدا تصور کرتے ہیں جس طرح دہمخوقوں کے وجود یا ہم ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں، ایک کا تحقق دوسری مخلوق کے تحقق کے بغیر ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے عامیاناہ غیر قرآنی رجحانات والوں کے لئے اس حدیث کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”یو جو خدا کو اس طرح کہ گویا ان کو دیکھ رہے ہو یعنی خدا کے ساتھ ایسا ہی تعلق رکھنا چاہئے جیسے کسی دیکھے بھالے سے اگلے فقرہ کا مطلب یہ ہوگا کہ کیونکہ خدا کو اگر تم دیکھتے نہیں تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے اس لئے خدا کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہئے جیسے کسی دیکھے بھالے کے ساتھ کیا جاتا ہے بعض شراح حدیث نے اس کا یہ مطلب بھی لکھا ہے دیکھو! نووی شرح مسلم ۱۲

اپنا بیج پن اور بے روزگاری کے لئے کوئی گنجائش کیسے باقی رہ سکتی ہے؟

معلم الامۃ امام الفقہاء حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو یہ فرمایا کرتے تھے کہ

۲۱ لا کوہ ۲۱ ان ۲۱ ری ۲۱ لوجل فارغا

میں اس کو ناپسند کرتا ہوں کہ آدمی کو فارغ

لا فی عمل ۱۱ الدینا ولا فی ۱۱ الاخرة۔

دیکھوں، یعنی نہ دنیا کے کسی کام میں مشغول ہو

(مجمع الزوائد) اور نہ آخرت کے کام میں۔

غالباً اس کا یہی مطلب تھا کہ اسلام نے مسلمانوں کی عملی زندگی کا جو دستور اور آئین بنایا ہے، اس میں اس قسم کی لغو فارغ البالی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، لیکن آہ کہ "پین" کن بھینسوں کے سامنے آج بجائی جا رہی ہے جن کے "نظام الاوقات" میں "فراغت" کے سوا افسوس کہ کوئی دوسری گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ مسلمانوں کی "فارغ البالی" اور "فرصت" کے اسی عجیب و غریب ذوق کا یہ نتیجہ ہے کہ خدا کا وہ "دین" بھی آج اغیار کی محفلوں میں کاہلی کے پیغام اور بے عملی کے نظام کے نام سے بالآخر بدنام ہو کر رہا۔ جس کے متعلق گذر چکا کہ "ابتغاء فضل اللہ" یا معاشی جدوجہد میں مسلمانوں کے قدم دوسروں سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔ سورہ نزل میں ایک مستقل فرض نماز کی فرضیت تک کو منسوخ کر دینا گوارا کر لیا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ ارباب تنقید کو طبرانی کی اس حدیث پر سند کچھ اعتراض ہو۔ جس میں ہے کہ "ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا پیشہ اور گذر بسر کا ذریعہ شکار ہے، جنگلوں اور بیابانوں میں رہنے کی وجہ سے عموماً نماز یا جماعت کی سعادت سے میں محروم رہتا ہوں، میرے متعلق کیا حکم ہے۔ ترک جماعت کی سزا میں جس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے گھروں میں آگ لگوا دینے تک کی دھمکی دی تھی، اور ایک نابینا صحابی نے جب نابینائی کے عذر کو پیش کرتے ہوئے چاہا تھا کہ جماعت کی حاضری سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں، تو یہ دریافت کرنے کے بعد کہ اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے، صحابی نے اثبات میں جواب دیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فلا ۲ اذ ۲ (یعنی تو ایسی صورت میں تم مستثنیٰ نہیں ہو سکتے) فرمایا تھا۔ آج ایک معاشی عذر کے پیش ہونے پر سننے کی بات ہے۔ خدا کا وہی رسول (صلوٰۃ ہوں ان پر اور سلام ہو ان پر) کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

بہت اچھا مشغلہ ہے۔ مجھ سے پہلے جتنے پیغمبر

گذرے۔ سب کے سب شکار کرتے تھے اور

لغماً ۱۱ العمل، قد کانت قبلی

رسول کلہم یصطاد ویطلب ۱۱ الصید

۱۱ اور بعد کو بھی جن بزرگوں کو ملت اسلام میں انبیاء نے جنی اسرائیل کا مقام حاصل ہوا۔ مثلاً ولی الہند خواجہ بزرگ اجمیری قدس اللہ العزیز کے حالات میں پڑھیے، ۱۱ صطادو کے ذوق کا ثبوت ملے گا۔ سیدی الامام شیخنا وشیخ الہند بر اللہ منجعت نے گذشتہ رسولوں کے اس عمل سے حقہ پایا تھا۔ اب یاد نہیں کہ براہ راست حضرت والا سے سنا تھا، یا بیچ میں کوئی واسطہ ہے۔ کہ اپنے الاستاذ مولانا نو تو می رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شیخ الہند فرماتے تھے کہ شکاری رزق کو اطیب الرزق اس لئے قرار دیتے تھے کہ درمیان میں کسی آدمی کا ہاتھ نہیں ہوتا۔ براہ راست خدا سے روزی حاصل ہوتی ہے ۱۲

دیکھیں کہ من الصلوٰۃ فی جماعت
 ۲ ذ غبت عنہا فی طلب الرزق
 حبک للجماعة و اھلہا، وحبک
 ذکر اللہ و اھلہ و اسع علی
 ۲ ھلک و عیالک حلالا
 فان ذلک جہاد فی سبیل اللہ
 اور شکار کی تلاش میں نکلتے تھے۔ باقی
 جماعت کی نماز کے لئے تمہارے واسطے
 بس یہ کافی ہے کہ روزی کی تلاش میں جب
 تم کو جماعت سے خیر حاضر ہونا پڑے۔ تو
 جماعت کی محبت، جماعت والوں کی محبت
 اللہ کے ذکر کی محبت، ذکر اللہ میں مشغول
 ہونے والوں کی محبت اور اپنے اہل و عیال کے لئے حلال روزی کی تلاش کی خواہش، الغرض
 یہ سب چیزیں جماعت کی عدم حاضری کی قائم مقامی کرتی ہیں۔ چاہئے کہ اپنے اہل و عیال
 کے لئے طلب حلال میں کوشش کرو کہ یہ اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

معاشی جدوجہد بھی | صاحب مجمع الزوائد کا جو طبرانی جیسے محدثین کی حدیثوں میں سند اکوئی اگر سقم پاتے
 جہاد فی سبیل اللہ ہے | ہیں، تو اس پر تنبیہ کئے بغیر نہیں گذرتے، اس حدیث کے متعلق سکوت اختیار
 کرنا اولاً یہ خود دلیل ہے، اس بات کی کہ کم از کم ان کے نزدیک اس کی سند قابل اعتراض نہیں، ثانیاً جب
 قرآن کا نص شاہد ہے کہ ابتغائے رزق میں حرج واقع نہ ہو، اسی لئے تہجد کی فرضیت عام مسلمانوں سے
 ساقط ہوئی، تو اس میں کیا تعجب ہے کہ شارح قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ابتغائے رزق کے عذر کو
 پیش نظر رکھ کر جماعت کی حاضری جو ظاہر ہے کہ فرض ہونے کی حیثیت نہیں رکھتی اس سے کسی کو مستثنیٰ فرما دیا
 ہوا، بلکہ ارشاد گرامی کا آخری حصہ یعنی

واسع علی ۲ ھلک و عیالک
 حلالا فان ذلک جہاد ۲ فی
 سبیل اللہ
 اور چاہئے کہ اپنے اہل و عیال کے لئے
 طلب حلال کی کوشش کرو کہ یہ اللہ کی
 راہ میں جہاد ہے۔

میرے نزدیک تو سورہ فرل ہی کی آیتوں سے بظاہر مستنبط و ماخوذ ہے، اس لئے کہ تہجد کی فرضیت
 کے سقوط کے وجوہ بیان کرتے ہوئے قرآن میں ایک وجہ تو ابتغاء فضل اللہ اور دوسری وجہ اسی کے بعد
 و اخر من یقاتلون فی سبیل اللہ (یعنی دوسرے لوگ اللہ کی راہ میں قتال اور جہاد کریں گے) بھی بیان کی گئی
 ہے۔ یعنی انہی دونوں عذروں کی بنیاد پر اس نماز کی فرضیت ساقط کی جاتی ہے۔ جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے
 کہ خود قرآن نے بھی معاشی جدوجہد کو جہاد فی سبیل اللہ کا ہموزن اور ہمدوش قرار دیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے
 کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت یہ فتویٰ دے رہے تھے کہ اہل و عیال کے مصارف اور نفقہ کی جستجو
 و تلاش میں تنگ و دو، یہ بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ اس وقت سورہ فرل کا یہ طرز بیان آپ کے پیش نظر
 نہ تھا، رونے والا اگر اجل کے مسلمانوں کو دیکھ کر ع امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں (اقبال موعوم) کے الفاظ کے ساتھ
 عمر بھر روتا رہا۔ تو کیا واقعی اس کا یہ نوحہ غلط نوحہ اور اس کا یہ گریہ غلط گریہ تھا،
 یا للعجب! جس سرزمین کو نزول قرآن کی سعادت نصیب ہوئی تھی، آج خصوصیت کے ساتھ اسی کے فرزند

ہر قسم کے معاشی کاروبار سے بے تعلق ہو کر صرف بیرون عرب کے مسلمانوں کے سینے کے بوجھ بن کر اپنی آبر و خاک میں ملا رہے ہیں، اور کیا کہوں کس کی آبر و پر داغ لگا رہے ہیں۔

لمثل هذا يذوب القلب من كمد ان كان في القلب ايمان و اسلام

اسلام اور کیا کرتا، اسلام کا رسول (صلوٰۃ اللہ علیہ) اور کیا کہتا جو کچھ کہا جاسکتا تھا اور جو کبھی کسی سے نہیں کہا گیا تھا۔ سب تو کہہ دیا گیا تھا، پھر اگر کسی قوم کو اسی پر اصرار ہو کہ جو کچھ کہا جائے گا، ہم نے طے کر لیا ہے کہ وہ نہ

۱۰ ہنگامہ برپا کر دیا گیا ہے کہ عرب ایک چٹیل ریگستان میں میدان ہے، وہاں پیدا ہی کیا ہو سکتا ہے۔ مگر کہنے والوں کو کیا کہنے، جہاں اللہ کا گھر ہے اس میں شک نہیں وہ تو بن کھیتی کا بیابان اور وادی غیر ذی زرع ہے۔ لیکن یمن و نجد، مامہ و بحرین وغیرہ کے میر حاصل خطوں کو جانے دیجئے خود سرزمین حجاز کا واقعی ہمیشہ سکیمیا ہی حال تھا، جو آج ہے۔ میں نے کسی موقع پر اسی حجاز کے تاجستان دہط نامی کا تذکرہ کیا تھا، جس میں دس لاکھ بیلین منڈوے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اسی حجاز میں خیبر بھی تو ہے۔ آج بھی جن لوگوں نے اس کا معائنہ کیا ہے بھاسیعة و دية سائلة و نخیلا فوق المقصور (الارتسامات ص ۲۷) یعنی بہتی ہوئی سات ندیاں ہیں اور نخلستانوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ وادی القریٰ کا بھی یہی حال ہے، مدینہ منورہ کے اطراف میں حقیقہ کبریٰ و صغریٰ کی ندیاں، ینبوع کے متعلق یا قوت نے لکھا ہے کہ اس میں ایک سو ستر چشمے جاری تھے مشہور نو مسلم لیوپولڈ صاحب جو اسد اللہ کے نام سے مشہور ہیں اور بخاری کا ترجمہ کر رہے ہیں شکیبایہ رسلان نے ان کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جب میں عرب کی سیاحت کر رہا تھا تو حجاز کے جنوبی حصے میں ”بیشہ“ نامی وادی پر گزر ہوا۔ اس وادی میں اس کے اطراف کی زمینوں میں جو صلاحیت انھوں نے پائی، کہتے تھے کہ مکہ اور اطراف مکہ والوں کی خوراک سالانہ کے لئے صرف حجاز کی دہی زمین کافی ہے۔ علاوہ نخلستانوں کے سرزمین عرب اپنے اندر معدنیات کی جو دولت چھپائے ہوئے ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، سونا، چاندی، تانبہ، قلعی حتیٰ کہ اب تو پٹرول تک کے ذخیروں کا پتہ اس سرزمین میں مل چکا ہے لیکن افسوس ہے۔ اپنے عہد شاداب میں مسلمانوں نے پورے ملک کو لاڈ اور پیار میں بگاڑ دیا، کہتے ہیں کہ مصر کی زمین کا پانچواں حصہ حرین پر وقف ہے، سلطان محمد فاتح نے جس دن قسطنطنیہ میں پہلا قدم رکھا۔ اعلان کیا وقف مائینہ قیصر علی مدینہ ۲ یعنی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ کمالی عہد سے پہلے تقریباً پانچ کروڑ روپیہ ترک حرین پر خرچ کرتے تھے۔ دنیا کے سلاطین و امرا جو کچھ بھیجتے تھے۔ اس کا کوئی ٹھکانا ہے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ بہمنی بادشاہ محمد شاہ کی والدہ حج کے ارادے سے مکہ جانے لگیں، تو بادشاہ نے اپنی طرف سے والدہ کی خدمت میں باشندگان حرین میں تقسیم کرنے کے لئے جو رقم دی تھی۔ فرشتہ اور خانی خاں وغیرہ نے لکھا ہے کہ وہ چار صد من طلا و ہفت صد من نقرہ، تھا۔ چار سو من سونا اور سات سو من چاندی۔ من ایک عورت اپنے ہاتھ سے عرب لے جاتی ہے اور سب کو وہیں خرچ کر کے واپس آتی ہے۔ آج بھی اسی دکن سے اس زمانے میں بھی کم از کم دس ہزار ماہوار سے کم رقم قاطنین حرین کے لئے سلطنت اصفیہ خلد با اللہ نہیں بھیجتی۔ افسوس کہ یہی خیر ایک گونہ باعثِ مشرعوں کا۔ جدوجہد اور کمانے کی صلاحیت وہاں کے باشندوں سے جاتی رہی۔ آخر یہی حجاز تھا کوشش کی گئی تو عرفات جیسے میدان میں بھی نہر جاری ہو گئی، عبد اللہ بن عامر کہا جاتا ہے کہ صحابی تھے۔ یعنی بچپن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش ہوئے تھے۔ بصرہ سے مکہ تک اسفوں نے اپنے گورنری کے زمانے میں کنواں اور مرا بنوئی تھی۔ حتیٰ کہ اتھنذ بعرفات حیاضاً و نخللاً، مسلمانوں کا دارالہجرت عرب ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن معاشی ضیق جب تک ہے۔ جاننے والے آخر کہاں جائیں ۱۲

سین گے تو اس کا علاج کس کے پاس ہے۔ رسول اللہ کو تو رسول اللہ کے خدا نے بھی کہہ دیا تھا،
 فَنُوحًا مَّا نَمُوتُ حَتَّىٰ نُنْفِثَ رُوحَنَا فَمِنْ حَيْثُ نَحْنُ فَمِنْ حَيْثُ نَمُوتُ
 تم چونکا دو، ان پر تم کو داروغہ نہیں بنایا گیا
 ہے۔ پھر جو بیٹھ پھرے اور انکار کرے گا، تو
 اللہ العزیز اب الاکبر۔
 اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔

چند انقلابی صناعات کا انتساب | کہتے ہیں کہ سعودی حکومت نے بعض جدید مغربی ایجادات مثلاً ٹیلی فون وغیرہ کو عرب
 پیغمبروں کی طرف قرآن میں، میں جب اخل کیا، تو نجد کے سپاہیوں نے ان کو شیطان فی اعمال قرار دے کر اور یہ
 کہتے ہوئے کہ ان میں شیطان بولتا ہے، ان چیزوں کی سخت مخالفت کی، ہو سکتا ہے کہ نجدی سپاہیوں کی طرف اس قسم کے واقعات
 جو عموماً منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں کچھ حقیقت کا حصہ بھی شریک ہو، لیکن کیا اس کی ذمہ داری ایک لمحہ کے لئے اس دین
 کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کسی کو ہو سکتی ہے جس دین کی سب سے اہم اساسی آسمانی کتاب میں اپنے اپنے عہد کی بعض
 انکشافات کو خدا کے برگزیدہ اولوالعزم پیغمبروں کی طرف منسوب کیا گیا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود حضرت حق تعالیٰ اجل
 مجدہ نے ان کو اپنی تعلیم اور وحی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ آخر قرآن پڑھنے والوں میں کون نہیں جانتا کہ حضرت نوح علیہ السلام
 کی کشتی جس کی خواہ اس زمانے میں کوئی اہمیت نہ رہی ہو، لیکن جس عہد میں اس جدید انکشاف و ایجاد کو حضرت نوح
 علیہ السلام نے دنیا میں پیش کیا تھا، یقیناً اس وقت وہ اسی قسم کی عجیب و غریب چیز تھی، جیسے ہم اس زمانے کی جدید
 ایجادوں کو حیرت و تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا اس کشتی کی ایجاد کے متعلق قرآن نے دہر ادھر اگر یہ نہیں بیان کیا ہے کہ

۱۵ بلکہ اپنے ایک مضمون میں جو رہبر دکن ۱۹۲۹ء کے صنعتی نمبر میں شائع ہوا ہے، خاکسار نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جن ایجادات انکشافات کے
 متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں کسی انقلابی عہد کا ان سے آغاز ہوا، اگر سوچا جائے تو ان انقلابی ایجادوں کی فہرست میں
 شاید نوح پیغمبر علیہ السلام کی اس ایجاد کو بھی امتیازی مقام عطا کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو حضرت نوح علیہ السلام
 کی اس کشتی کے متعلق یہ خیال کرنے کی ہے کہ کشتی کے لفظ سے اردو میں جو مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً حضرت نوح کی اس صنعتی ایجاد
 کی حیثیت اس سے مختلف تھی۔ اتنا تو قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ آسامیوں کو چیرتی پھاڑتی یہ کشتی آگے بڑھتی چلی جاتی تھی
 قرآنی الفاظ ہیں وحی تجری بجمع فی صوح کالجبال (کشتی بہر رہی تھی، کشتی والوں کو لئے ہوئے ایسے تھیلوں میں جو پہاڑ جیسے تھے)
 اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کشتی جس کا اردو ترجمہ ناؤ کیا جاتا ہے۔ کیا اس قسم کے تھیلوں کو وہ برداشت کر سکتی ہے؟ پھر قرآن
 سے بھی جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر تم کے چرند، دند، پرند وغیرہ کے ایک ایک جوڑے اس میں رکھے گئے تھے۔ اس سے ۷۰ کی وسعت و
 گنجائش کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، اور بائبل میں جو تفصیلات اس کشتی کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ ان کے بعد تو اس کو ناؤ یا کشتی کہنے کی کوئی
 وجہ ہی نہیں ہو سکتی تو رات کتاب پیدائش میں ہے۔ ”تو اپنے واسطے گوپھر (ساگوان) کی لکڑی کی ایک کشتی بنا، اس کشتی میں کوٹھریاں
 تیار کر اور اس کے باہر اندر پرال لگا، اور اس کو ایسی بنا کہ اس کی لمبائی تین سو ہاتھ اور اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی
 اونچائی تیس ہاتھ کی ہو، اور اس کشتی میں ایک روشن دان بنا۔ اسے اوپر سے ہاتھ بھر چھوڑ کر تمام کر، اور کشتی کے ایک طرف دروازہ بنا،
 اور نیچے کا طبقہ، اور دوسرا تیسرا بھی بنا، پیدائش باب ۷۔ ۱۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ جہاز سازوں کی صنعت حضرت
 نوح کے ہزاروں سال بعد ایک بال بھی ترقی نہ کر سکی؟ البتہ اسٹیم اور برقی کے عہد میں بلاشبہ ترقی کی دوسری اہمیت برصغیر اُٹھدہ)

و اوحینا الی نوح ان اصنع الفلک
 باعیننا۔ (الاعراف)

اور ہم نے وحی کی نوح کی طرف اس بات کی کہ
 بنا کشتی میری نگاہوں کے سامنے۔

اور جو حال کشتی نوح کا ہے، ہم قرآن ہی میں پڑھتے ہیں کہ انبیائے بنی اسرائیل کے دوسرے
 اولوالعزم نبی حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے،
 وعلمناک صنعۃ لبوس لکم لتحصنکم
 اور سکھایا ہم نے (داؤد) کو تمہارے لئے (انسانوں
 کے بچاؤ کے لئے) زرہ بنانا، تاکہ حفاظت کرے
 من یمسکم۔ (الاسراء)

تمہاری لڑائیوں میں۔

آج توپ اور بندوق، بلکہ بم یا اس کی مختلف جہاں گداز، عالم سوز قسموں کے مقابلے میں یقیناً اب
 اس غریب "زرہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے لیکن سوچنا چاہئے اس زمانے کو سوچنا چاہئے جب اون اور بال
 سے ننگے جسم رکھنے والے اس نازک اندام انسان پر بارٹھ اور دھار والے فوکیلے ہتھیاروں سے حملہ کر دیا گیا تھا

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

منزل میں اس صنعت نے طے کی ہیں۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ حضرت نوح کی صنعتی ایجاد ایک ایسی ایجاد تھی، جس کے بعد نسل انسانی انقلاب
 کے ایک جدید دور میں داخل ہوئی، یعنی آج جو دنیا کے مختلف اقوام اور خطوں میں انسان آباد ہیں۔ اور ہر جگہ تمدن و عمران کا تلاطم برپا ہوا،
 یقیناً اس کا امکان اسی ایجاد کے بعد پیدا ہوا، ورنہ جو نوح از ممدروں، اور ذخار دریائوں کو پھانڈ پھانڈ کر بنی آدم کے گھرانوں کا ایک براعظم
 سے دوسرے براعظم کی طرف منتقل ہونے کی اس سے پہلے صورت ہی کیا تھی۔ شناوری کے زور سے کوئی ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف
 جانا بھی چاہتا تو ہفتوں بلکہ مہینوں پانی میں تیرتے رہنا کیا آسان تھا۔ اور کسی زمانے میں مان لیا جائے کہ لوگوں میں اس کی قوت بھی
 ہوگی۔ جب بھی اس ذریعہ سے افراد ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے تھے۔ لیکن اہل و عیال، ساز و سامان کے ساتھ خاندانوں کے
 منتقل ہونے کو سچ پوچھئے تو اسی نوحی ایجاد نے ممکن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں بھی بنی آدم آباد ہیں کسی نہ کسی شکل میں نوح
 کی اس ایجاد کا تذکرہ ان میں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ امتداد زمانہ سے واقعات کے بعض اجزاء میں رد و بدل بھی ہو گیا ہے۔ بلکہ عموماً ہر ملک
 والوں نے اس واقعہ کا مرکز اسی علاقے کو قرار دے رکھا ہے جس میں وہ اکر مقیم ہوئے۔ ہندوستان والے ہمالہ کی بلند ترین چوٹی کو "ناؤ
 بندھن" قرار دیتے ہیں۔ اور بجائے نوح کے کشتی والے کا نام منو بتاتے ہیں۔ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ منو کا یہ لفظ مہا نوح (بڑے نوح) کا ایک تلفظ
 ہو، ٹھیک جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوؤں میں شیو حضرت شیت کے نام کا تلفظ ہے۔ کیونکہ ت کا تلفظ اب بھی عربی میں بہت ہی ہلکا
 ہے۔ اسی طرح وشو کے متعلق بھی بعض کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کے نام کی دوسری ہیئت ہے۔ وش کا لفظ شاید کوئی آخری لفظ یعنی
 حضرت یار شتی وغیرہ کی قسم سے ہو، افسوس ہے کہ ہندوستان قدیم میں فن تاریخ سے بڑی بے اعتنائی برتی گئی۔ اس لئے عموماً
 اس ملک کے رجال تھوڑے دن کے بعد میتھاجی یعنی دیومالا میں جا کر شریک ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے ایک بڑے عالم عبد الکریم
 جلی کا تو خیال ہے کہ ہندوؤں کا برہما دراصل حضرت ابراہیم ہیں۔ واشدا علم بالصواب ۱۲

۱۲ بارٹھ دار ہتھیاروں کی ایجاد کا قصہ جو بائبل سے معلوم ہوتا ہے، وہ عجیب ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند
 ہابیل نامی کو قابیل نے مار ڈالا۔ تو اسی قابیل پر حضرت آدم نے لعنت فرمائی۔ اور قابیل اس علاقے سے جہاں اس زمانے میں حضرت آدم کی
 اولاد آباد تھی بھاگ گیا۔ بائبل میں قابیل کا تلفظ قان لکھا ہے۔ اس کے بعد سے کہ قان اپنی جو رو سے ہم بستر ہوا اور (بقیہ پر صفحہ آئندہ)

یقیناً اس وقت خدا کی رحمتوں میں سے ایک بڑی رحمت یہ بھی تھی کہ لوہے جیسی کرخت و سخت دھات کا اتنا نرم پڑ جانا کہ تاروں کی شکل میں اس کا کھینچنا آسان ہو گیا۔ پھر ان تاروں سے چھوٹی چھوٹی کڑیوں کے بنانے پر قادر ہو جانا۔ تاہم اس کی انہی کڑیوں سے لوہے کے ایسے لباس کے تیار ہو جانے کا امکان پیدا ہوتا کہ جس طرح جسم انسانی پر سوتی اور اونی کپڑے چست ہو کر لپٹ جاتے ہیں۔ یہی کیفیت..... اس لباس میں بھی پیدا ہو گئی۔ قرآن میں جن امور کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی

والناله الحديد ان عمل سباغات

وقدر فی السرد۔

(سبار ۱۴ پ ۲۲)

اور نرم کر دیا ہم نے (داؤد) کے لئے لوہا (تاکہ)

بنائیں وہ (بدن پر خوب چست ہو کر اتر جائیو الی زریں)

(اور سکھایا ان کو) کہ ٹھیک انداز سے کے ساتھ

جوڑیں کڑیوں کو۔

قرآن کے ضمنی اشار کی قیمت جیسا کہ میں بار بار اس پر متنبہ کرتا چلا آ رہا ہوں کہ قرآن نہ براہ راست کوئی معاشی کتاب ہے اور نہ صنعت و حرفت و ایجاد و اکتشافات پر بحث اس کے حقیقی مقاصد میں داخل ہیں۔ لیکن ضمناً بھی قرآن میں جس چیز کا ذکر آ گیا ہے، یقیناً وہ قرآن ہی کی چیز ہے، ہم مسلمانوں میں اپنی آسمانی کتاب کے متعلق نفاق کا وہ رویہ بحد اللہ اب تک

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

وہ حاملہ ہوئی اور جنوک کو جنی۔ پھر جنوک کی اولاد کا تذکرہ کرتے ہوئے آگے بیان کیا گیا ہے کہ اس کی چند پشتوں کے بعد ملک نامی آدمی اس کے خاندان میں پیدا ہوا۔ ملک کے چند بیٹے ہوئے۔ ان میں سے ایک لڑکا جس کا نام یویل تھا۔ وہ تو بین اور بالسنری بجا نیوالوں کا باپ تھا اور ملک کا دوسرا بیٹا تو بلقان تھا، جو تانبے اور لوہے کے سب باڑھ دار ہتھیاروں کا بنانیوالا تھا (پیدائش ۱۴) جس کے معنی یہی ہوئے کہ گانے بجانے کے آلات اور مردم کشی کے اوزار اور ہتھیاروں کی ایجاد کا کام آدم علیہ السلام کے اسی قابیل یا قائن کی نسل والوں نے انجام دیا اگر اس پر غور کیا جائے کہ مشرقی ممالک (جو نسل انسانی کا پہلا مولد و منشاء ہے) ان سے متصل ہو کر براہ خشکی مغربی ممالک کی طرف جانے کا راستہ جس سرحدی علاقے سے گذرتا ہے اس کا نام اس وقت تک "بلقان" ہے۔ اور اس کا جائزہ لیا جائے کہ گانے بجانے اور مردم کشی کے آلات و اوزار بنانے کی فطری صلاحیت کن اقوام میں زیادہ پائی جاتی ہے اور اس وقت بھی ان ایجادات کا سربراہ کن قوموں کے سر بندھا ہوا ہے۔ تو آسانی سے پتہ مل سکتا ہے کہ قائن یا قابیل کی اولاد کون لوگ ہیں مردم کشی کے آلات کا سب سے بڑا مظاہرہ "موجودہ جنگ اعظم" میں ہوا، اس جنگ میں مشرقی فوجوں کے لئے کیا انتظام کیا گیا۔ لارڈ منسٹر نے جو خاکہ اس کے لئے پیش کیا تھا اخبار پاپیر ۲۲ دسمبر ۱۹۱۴ء میں وہ شائع ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ فوجیوں کے لئے یورپین عورتیں مہیا کی جائیں۔ ریڈیو زیادہ سے زیادہ مقدار میں فراہم کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ ان کیلئے فلم اشار (یا گانے والی رنڈیاں) مہیا کی جائیں۔ بند ساروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ان تک پہنچائی جائے۔ کچھ اس سے اور کچھ اس عجیب و غریب سوال سے، یعنی قابیل جب اس علاقے سے بھاگ ہی گیا۔ جہاں اس وقت نسل انسانی آیا دھکی۔ تو پھر یہ جو قابیل میں ہے کہ قائن اپنی جوروں سے ہم بستر ہوا۔ یہ جو نسل انسانی کی اسے کہاں ملی؟ بعض کا خواب و خیال ہے کہ جنگوں میں بعض ایسے جانور بھی پائے جاتے ہیں جو شکلاً و صورتاً انسانوں سے بہت مشابہ ہیں، ان کا بیان ہو کہ قابیل کو جو رد بنانے کے لئے مادہ اسی قسم کے جانوروں سے مل گئی تھی، واللہ اعلم۔ پچھلے دنوں انسانی نسل کے رشتے کو بعض صحرائی جانوروں سے ملانے کی کوشش بیالوجی کے بعض مفکرین نے جو کی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جن لوگوں کو دیکھ کر ان کا ذہن اس مسئلہ کی طرف منتقل ہوا۔ ان میں کوئی واقعی جھلک اس خیال کے منتقل کرنے کی نہ تھی۔ آدمی جب خیر کو دیکھتا ہے، تو معاً اس کا ذہن گھوڑے اور گدھے دونوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور جب دو مختلف نسلوں میں دادیہال دنیا نہال ہو تو اس قسم کے انتقال ذہنی پر تعجب نہ ہونا چاہئے ۱۲

نہیں پیدا ہوا ہے جس کا اظہار بعض دفعہ اس زمانے کے دوسرے ارباب مذاہب اپنی ان کتابوں کے متعلق کرتے ہیں۔ جنہیں کہنے کی حد تک تو وہ بھی آسمانی اور اور خدا کی نازل کی ہوئی کتابیں کہتے ہیں، لیکن باوجود اس کے بسا اوقات ان چیزوں کے متعلق جن کا ان کی ان ہی مذہبی کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان ہی کے متعلق یہ کہہ دیتے ہیں کہ عوام کا جو خیال اور جو عقیدہ کسی چیز کے متعلق اس زمانے میں تھا، اسی کی رعایت کرتے ہوئے ہماری ان کتابوں میں غلط بیانی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لیکن ایک مسلمان ایک لمحہ کے لئے اس عقیدہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ خدا کی طرف غلط بیانی کے انتساب کی بھلا کسے جرات ہو سکتی ہے؟ پس خواہ ایسی باتیں ہوں جن کا ذکر قرآن کا اصل مقصود ہے۔ یا جن چیزوں کا ذکر قرآن میں ذیل یا ضمیمہ آگیا ہو چونکہ بہر حال وہ خدا ہی کا کلام ہم مسلمانوں کے نزدیک ہے۔ اس کی وقعت اور قیمت کے لحاظ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ آج مسلمانوں کے متعلق کہنے والے خواہ کچھ ہی کہیں لیکن جب ہی قرآن شروع شروع میں نازل ہوا تھا۔ تو ہم صحابہ کو دیکھتے ہیں کہ اصلی اور حقیقی مسائل ہی نہیں، بلکہ جن امور کا ضمیمہ قرآن میں ذکر آگیا تھا۔ ان کو بھی ایک واقعہ اور حقیقت تسلیم کر کے ان سے استفادہ کی کوشش کرتے تھے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ قرآن طب کی کوئی کتاب نہیں ہے اور نہ اس میں مادی امراض کے علاج و معالجہ کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ لیکن اللہ کی مختلف نشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں النحل (شہد کی مکھی) اور اس کی جہلی خصوصیات کا بھی ذکر آگیا ہے جن میں ایک بات یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ

يَخْرُجُ مِنْ بَطْنِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ
فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ۔
(النحل)

نکلتا ہے شکم سے ان مکھیوں کے ایک مشروب جس
کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں
کے لئے شفا ہے۔

۱۔ اس موقع پر مجھے اپنی وہ تقریر یاد آتی ہے جو حیدرآباد کے یونانی طبیہ کالج میں چند سال ہوئے اطباء کی ایک جماعت کے سامنے اُن کی فرمائش پر کی گئی تھی! اسی زمانے میں یہ تقریر اجازت صدق (لکھنؤ) اور بہار صحت (دہلی) وغیرہ میں شائع ہو گئی تھی تقریر کا موضوع قرآن کی یہی آیت تھی۔ خاکسار نے اطباء کو خطاب کر کے آمادہ کیا تھا کہ قرآن کے اس اشارے پر اگر وہ غور کریں۔ تو ممکن ہے کہ جہاں دنیا میں چند طبی نظامات جاری ہیں۔ ان کے مقابلے میں آپ دنیا میں ایک مستقل جدید طبی نظام اس قرآنی آیت کو بنیاد بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ تقریر تو لمبی تھی حاصل بظاہر یہ تھا کہ یونانی طب جس میں عموماً بنیاتی دواؤں سے امراض کے ازالے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن بنیاتی دواؤں کے جوہر کا حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ حالانکہ شفا بخشی کا سارا دار و مدار اسی پر ہے۔ اسی لئے عموماً طبی نسخوں میں لکھا جاتا ہے کہ کوئی بیجہ در آب تازہ کردہ صبح جو شائیدہ مائیدہ صاف نمودہ بالائش فلاں دوا پاشیدہ پس نبات سفید مصری آمیختہ بنوشند کے عمل کے لئے کم از کم آٹھ علی منزلوں سے عموماً ہر دوا کے استعمال میں لوگوں کو گزرنا پڑتا ہے اور پھر بھی دواؤں کی کھنگی و فرسودگی اور دوسرے اسباب کی وجہ سے صحیح شفا فی عناصر کا ان سے حاصل کرنا عسر نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بجائے اس کے اگر بنیاتی ادویہ کی اسی روح یا جوہر کو قرآنی اشارے سے حاصل کریں۔ یعنی قرآن میں النحل (شہد کی مکھی) کی جو صفت ذلولیت (سدھ جانے کی صلاحیت) بیان کی گئی ہے۔ تجربہ بھی شاہد ہے کہ جس پھول کا رس چاہئے، عادی کرنے کے بعد آپ مکھیوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کے الفاظ شکر کل الثمرات۔ (پھر کھا ہر قسم کے نباتات کے جوہر یا مکھن کو) لغت سے ثابت کیا گیا کہ ثمر کے معنی پھل کے بھی آتے ہیں۔ اور ثمر مثلاً دودھ سے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ان کے مولیٰ اور تلمیذ رشید نافع راوی ہیں کہ
 ۱۲ بن عمر صاحب انت تخرج
 قرحة دلاشیء الا لطح المو ضح
 بالعسل ولقہ یخرج من بطونہا مثل
 مختلف الوانہ فیہ شفاء للناس
 (جمع الفوائد ص ۱۳۱)
 یعنی ابن عمر کا قاعدہ تھا کہ ان کے جب کوئی
 پھرڑا یا پھنسی یا اور کچھ چیز نکل آتی تو شہد کا
 اس پر لیسپ چڑھاتے اور قرآن کی اس
 آیت کو تلاوت کرتے (یعنی یخرج من بطونہا
 شراب مختلف الوانہ فیہ شفاء للناس)

ظاہر ہے کہ شہد میں شفا بخشی کی اس خاصیت کا اظہار قرآن میں ضمناً کیا گیا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں
 ابن عمرؓ نے اس کو کس نقطہ نظر سے دیکھا، کیا انھوں نے یہ سمجھ کر اسے قابل لحاظ نہ خیال کیا کہ عربوں یا
 عرب کی بڑی بوڑھیوں کا شہد کے متعلق چونکہ یہی خیال تھا، قرآن نے (ایضاً وباللہ) اس عامی خیال کو
 دہرا دیا ہے۔ یقیناً انھوں نے یہ نہیں کیا، بلکہ اسے ایک واقعہ مسترار دیا۔ اور اس واقعہ سے استفادہ

(یقیناً صفحہ گذشتہ)
 گئی نکالنے کو بھی کہتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ شہد کی مکھی میں قدرت نے اس کی بھی صلاحیت رکھی ہے کہ جس بناتی چیز کا چاہا جائے وہ جوہر کھینچ کر خارج
 کر سکتی ہے۔ پھر جوہر حاصل کر کے یہ دیتی ہے۔ قرآن نے ”شراب“ کے لفظ سے اشارہ کیا کہ وہ ذائقہ انسانی کے لئے مشروب ہے یعنی ایسی خوش ذائقہ
 شیرینی پیدا ہو جاتی ہے کہ نبات سفید آمینق کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ابلان امور کو پیش نظر رکھ کر اگر دوائی نباتات کی کاشت الگ الگ
 قطعات میں کی جائے۔ اور ہر قطعہ کے ساتھ شہد کی مکھیوں کے ایک جھنڈ کو ثمرات کشتی کے لئے معین کر دیا جائے۔ اور جوہر حاصل کر کے یہ
 مکھیاں عطا کریں۔ ان کو بوتلوں میں بھر بھر کر بجائے دواؤں کے دواخانے میں رکھ لیا جائے۔ اور مریضوں کو بجائے دواؤں کے وہی شہد
 استعمال کرایا جائے یعنی جس مریض کے لئے ایک ہی دوا کافی ہو، اسے بس اسی دوا کا شہد دیا جائے، اور جسے دو دواؤں کی ضرورت
 ہو۔ اس کے نسخے میں دو قسم کے شہد رکھے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس، جیسے مفردات سے آج کل نسخے تیار کئے جاتے ہیں بجائے دوائی
 مفردات کے، نسخے ان مختلف دواؤں کے شہد سے مرتب کر کے مریضوں کو دیا جائے۔ یہ نئی بناتی قدرتی دوا مصنوعی ترکیبوں
 سے تیار کی ہوئی دواؤں سے یقیناً زیادہ مفید اور بہتر ہوں گی۔ اور سہولت یہ ہوگی کہ ہر بوتل سے یہ مقدار ضرورت صرف شہد
 لینے کی ضرورت ہوگی۔ اور چند شہدوں کا آمیزہ مریض کی دوا بن جائے گا۔ نہ کوٹنے کی ضرورت نہ پھانتے کی۔ میں نے علاج کے اس قرآنی
 نظام کے متعلق تجویز کیا تھا کہ اس کا ”عسلی نظام“ نام رکھا جائے۔ ہمارا فائدہ اس میں صرف اس قدر ہے کہ قرآنی الفاظ ”فیہ
 شفاء للناس“ ایک کلیہ بن جائے گا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ ہر مرض کے لئے اس مرض کے مناسب شہد کا استعمال باعث شفا ہوگا
 قرآن میں ”مختلف الوانہ“ کے الفاظ ہیں یعنی شہد کی مختلف قسموں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ
 آج کل علاج شمسی کا ایک طریقہ جو دنیا میں مروج ہے، جس میں مختلف رنگ کی بوتلوں میں صرف پانی بھر بھر کر دھوپ میں
 لوگ رکھ دیتے ہیں۔ اور جس مرض کے لئے جس رنگ کی بوتل کا پانی مختص ہے۔ وہی استعمال کراتے ہیں۔ ہو سکتا
 ہے کہ قرآن کے ان الفاظ میں رنگ کی اس تاثیر قوت کی طرف اشارہ ہو۔ گویا شہد کے مختلف رنگوں کو دیکھ کر
 مختلف امراض کے لئے ان کو مختص کیا جاسکتا ہے۔ شہد میں اشیاء کے مزاج کی حفاظت کا بھی جو قدرتی خاصہ ہے
 اس سے بھی آپ کام لے سکتے ہیں ۱۲

کی وہ کوشش بھی کرتے تھے۔

پھر ایسی ایجادیں، جنہیں انسانی تاریخ میں انقلابی ایجادات کی حیثیت حاصل ہے۔ کم از کم یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ہزار ہا ہزار سال تک ان ایجادوں نے بنی آدم کی مشکلات زندگی میں آسانیاں پیدا کیں۔ جب قرآن ان کو اولوالعزم پیغمبروں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ تو اس سے اگر یہ نتیجہ پیدا کیا جائے کہ ضروریات زندگی میں جن اختراعات اور ایجادوں سے آسانیاں فراہم ہوتی ہوں، ان سے لوگوں کو روشناس کرنے کی کوشش گویا ایک طرح سے پیغمبروں کا کام ہے۔ تو جو کچھ قرآن میں ہے اور قرآن نے جن الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے۔ اس کے لحاظ سے کیا یہ..... ایسی بات ہوگی، جسے خواہ مخواہ سمجھا جائے۔ کہ قرآن کی طرف زبردستی منسوب کیا جا رہا ہے۔

ایجادات کے غلط استعمال کی وجہ سے | مجھے حیرت ہوتی ہے کہ بعض لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں خود ایجادات کی مخالفت صحیح نہیں ہے | اور قرآن کو خدا کا کلام تسلیم کرتے ہیں۔ یہی حضرات محض

اس لئے کہ آج یورپ والے اپنی بعض جدید ایجادوں سے غلط استعمال لے رہے ہیں۔ بجائے استعمال کی تصحیح کے۔ سے ایجادات و اختراعات کے رجحان ہی کو دنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں اور دینی چیز جسے قرآن میں قرآن نازل کرنے والے خدا نے جلیل القدر پیغمبروں، بلکہ خدا نے اپنی تعلیم و وحی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی کو علانیہ انسانیت کے لئے لعنت قرار دینے سے نہیں جھکتے۔ اور تماشا یہ ہے کہ اہلہوں کا ایک گروہ ان لوگوں کے ان ارتجاعی خیالات کو مذہب کی طرف منسوب کرتا ہے۔ وہ خود باور کئے بیٹھے ہیں اور دوسروں کو باور کراتے پھرتے ہیں۔ کہ یہ ساری تنگ خیالیاں دنیا میں جو آج پائی جاتی ہیں، ان کا ذمہ دار مذہب ہے۔ میں ان حالات کو دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ان لوگوں کی منطق وہی ہے کہ لڑتا تو انسان تھا۔ لیکن اتفاقاً یہی جنگ جب مذہبی طبقات میں چھڑ گئی۔ تو لوگوں نے ان لڑائیوں کی ذمہ داری بجائے انسانوں کے اس مذہب کے سر تنہو پ دی۔ جو اتفاقاً ان لڑنے والوں کا مذہب تھا اس میں شک نہیں کہ ایجادات و اختراعات کے خلاف بعض قلوب میں خصوصاً یورپ کے مسلسل غلط استعمال کی وجہ سے جو گرائیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان میں اکثر مذہبی ہی لوگ ہیں۔ لیکن ان گرائیوں کے متعلق یہ خیال کہ انہیں مذہب نے پیدا کیا ہے۔ کم از کم اسلام اور قرآن جس مذہب کو پیش کرتا ہے۔ اس کے لحاظ سے تو قطعاً غلط ہے۔ آخر تاریخ کی ایسی ہمہ گیر ایجادیں جیسی کہ جہاز رانی، اور زرہ بانی کی صنعتیں ہیں۔ قرآن جب ان کو پیغمبروں کا کام بتاتا ہے۔ تو اب آپ ہی بتائے کہ ایجادی صناعات اور اکتشافی کوششوں کی بلندی کے لئے اب اس سے بھی زیادہ بلند چیز اور کیا پیش کی جاسکتی ہے۔

۱۵ اس موقع پر بے ساختہ حکیم الامت مرحوم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کا وہ لطیفہ یاد آجاتا ہے یعنی دارالعلوم دیوبند سے حضرت کے پاس ایک زمانے میں یہ شکایت پہنچی کہ وہاں چوری کے کچھ واقعات پیش آئے ہیں۔ اور لوگ بعض طلبہ کو اس سے متہم کرتے ہیں۔ حضرت والا نے یہ سن کر فرمایا کہ بھائی طلبہ! درود بھی دینی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اب میں کہنے والوں کو کیا کہوں، دوسروں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ خود مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نمونے اور اپنے جس اسوہ حسنہ کو اس باب میں چھوڑا ہے میں نہیں سمجھتا کہ لوگ سکا کیا جواب دے سکتے ہیں۔

جدید صنعتوں کے متعلق | کون نہیں جانتا کہ جب مدینہ منورہ پر عرب کے جاہلی قبائل ایک کمان بن کر یہودی سرمایہ کو پیغمبرانہ نمونے، زور سے حملہ آور ہوئے، تاریخ میں جس واقعہ کی بغیر غزوۃ الاحزاب یا جنگ خندق سے کی گئی ہے، اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی کے اشارے سے مدافعت کے اس جدید طریقے کو یہ کشادہ پیشانی اختیار فرمایا جس سے عرب قطعاً ناواقف تھا، میری مراد خندق سے ہے، جو مدینہ منورہ کے اطراف میں کھودی گئی تھی، جسے دیکھ کر ابوسفیان (سپہ سالار قریش) نے کہا تھا۔

واللہ ہذہ صکیدۃ ما کانت
العرب تکیدھا۔

قسم خدا کی اس گھاٹ کو (اپنی جنگوں میں) عربی
کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔

لیکن یہ جاہلی ذہنیت تھی کہ نئی چیز کو دیکھ کر گو، اس طریقے سے اس پر اعتراض کیا گیا۔ لیکن اسلام نے جس نمونے کو اس سلسلے میں پیش کیا وہ یہی تھا کہ خود اسلام کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صحابیوں کے ساتھ ایک عجیب طریقے

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

اسلامی علوم کے طلبہ یہ تو کبھی چور نہیں ہو سکتے، ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض چوروں نے طالب علمی شروع کی ہو۔ اور یہ فعل ان ہی لوگوں کا ہو سکتا ہے۔ بعینہ یہی بات ان معاملات میں صادق آتی ہے۔ یعنی جنگ یا لڑائی مذہبی لوگ نہیں کرتے۔ بلکہ جنگ جدال کرنے والے کبھی مذہبی بن کر لڑائی کرتے ہیں۔ یا تنگ خیال، رجعت پسند بھی مذہب والے نہیں ہوتے، بلکہ تنگ خیال یا رجعی خیالات رکھنے والے اتفاقاً اگر کسی مذہب کے بھی پابند ہوتے ہیں۔ تو بے وقوفی سے لوگ ان کے خیالات و جذبات کو مذہب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ پس واقعہ یہی ہے کہ گو قرآن کی بحث کا حقیقی موضوع جیسا کہ اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے۔ اور فقیر نے بھی اپنی متعدد کتابوں اور مقالوں میں بیان کیا ہے کہ اس کی بحث کا حقیقی موضوع تو انسان ہے۔ انسان کیسے بنتا اور بگڑتا ہے۔ بنتے ہوئے وہ اتنی بلندی حاصل کر لیتا ہے کہ ملائکہ سے بھی اونچا ہو جاتا ہے۔ اور بگڑتے ہوئے وہ اتنا بگڑتا ہے کہ الانعام (چوپائوں سے) بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ اصل مقصود تو قرآن کا اسی مسئلہ کو سلجھانا ہے لیکن ضمناً اس سلسلہ میں وہ دوسری باتوں کا بھی ذکر کرتا ہے خصوصاً جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے اس کی بحث کے حقیقی موضوع سے تعلق ہوتا ہے۔ اب ان ضمنی امور کے متعلق ایک خیال تو ان لوگوں کا ہے کہ عامیانه خیالات کی رعایت کرتے ہوئے مذہبی کتابوں میں (العیاذ باللہ) خلاف واقعہ امور کا بھی تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ جنت اور دوزخ کے متعلق اس قسم کے خیالات پھیلاتے ہیں کہ حور و قصور جنت و انہار کا جو ذکر قرآن میں پایا جاتا ہے۔ محض اُمّ الکبیری کیلئے ہی ورنہ جنت کو ان امور کے تعلق؟ پھر حسانی وغیرہ الفاظ جن کے معانی کا کوئی معین خیال خود بونے والوں کے دماغ میں بھی نہیں تانا۔ انھی سے جنت و دوزخ کی وہ تشریح کرتے ہیں جس کے دوسرے معنی ایہی ہو کہ قرآن نے گویا (العیاذ باللہ) غلط بیانی سے کام لیا۔ ایسی غلط بیانی جسکی وجہ سے لاکھوں لاکھ انسان صو کے میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف اذراط کا یہ حال ہو دوسری طرف تفریط کی کیفیت یہ ہے کہ بعض لوگ اپنی آسمانی اور مذہبی کتابوں کے سہم الفاظ کا مدد آج یہ بھی ثابت کر سکی کوشش کر رہے ہیں کہ جدید خرافات و ایجابات اور وہ ساری نئی چیزیں جنہیں یورپ آج پیش کر رہا ہے۔ ان سب تذکرہ ہماری ان کتابوں میں موجود ہے۔ بہترین مثال اس تفریط کی ہمارے زمانے میں دیانند سرمستی جی نے اپنی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش میں پیش کی ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ توپ، بندوق، ہوائی جہاز، ریل، انجن وغیرہ وغیرہ ان ساری چیزوں کا ذکر ہمارے وید میں موجود ہے لیکن صحیح راہ نہ وہ ہے اور نہ یہ ہے ۱۲

مدافعت کو اختیار کرنے میں مشغول ہیں، سب کے ہاتھ میں پھاوڑے ہیں اور سب کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق سے مٹی کھود کھود کر باہر پھینک رہے ہیں۔ بخاری میں براہ بن عازب صحابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے تھے۔

سأنت ابنی صلی اللہ علیہ وسلم دیکھا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہمارے

ساتھ مٹی ڈھوتے تھے۔

ینقل معنا التراب۔

غیر اقوام کی مفید صنعتوں کے سیکھنے پر بلاشبہ خندق کے اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر قوم ہی کا کوئی پیغمبر اور صحابہ کا اجماع اس کے اختیار کرنے میں قطعاً پس و پیش کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ پیغمبر نے خود اپنے عمل اور اپنے صحابیوں کے اجماع سے اس کی سنت قائم فرمادی ہے۔

آج اپنے عہد انحطاط و زوال میں مسلمانوں کے سامنے سے پیغمبر کی یہ سنت تو نکل گئی، اور یاد رہی بھی تو وہ روایت جس کی صحت میں بھی لوگوں کو کلام ہے۔ یعنی

من تشبه بقوم فهو منهم اور جو کسی قوم کے جیسا بنے کی کوشش کرے گا

وہ ان ہی میں سے ہے۔

اور اس بنیاد پر مسلمانوں میں ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے، جو مسلمانوں کو ہر ایسی چیز کے اختیار کرنے سے روکتا ہے۔ جس کا دنیا کی کسی غیر مسلم قوم سے تعلق ہے، مگر ان ہی سے میں پوچھتا ہوں کہ اس حدیث کا اگر وہی مطلب ہے

۱۔ روایت چونکہ ابوداؤد کی ہے۔ اس لئے جیسا کہ علقمی وغیرہ نے لکھا ہے کہ حسن کا پہلو اس کی سند پر غالب ہے۔ اگرچہ مقاصد حسن میں اسناد ہی نے اسکو بھی جو جگہ دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنائی کے خیال میں یہ روایت چندال قابل اعتبار نہیں ہے، بہر حال مان بھی لیا جائے کہ پیغمبر ہی کا قول ہے لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ کسی نفع وغیرہ سے بے پروا ہو کر محض اس لئے کہ کسی کی ادا بجا جائے۔ اور زبردستی اس کی ریس میں اسی ادا کو اختیار کرنا تشبہ کا صحیح مطلب عربی زبان کے محاورے کی روش سے ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کیفیت اسی شخص پر طاری ہو سکتی ہے۔ جو اس شخص یا اس قوم سے مرعوب و مغلوب ہو گیا ہو جس کی بلا وجہ محض اس لئے کہ فلاں آدمی یا فلاں قوم کا یہ طریقہ ہے۔ اس نے ریس کی ہو ایسی صورت میں ظاہر کا یہ انقلاب باطنی انقلاب کی ذیل بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر یہ حدیث نہ بھی ہوتی جب بھی قرآنی آیت و من یتولہم منکم فاندہم منہم اور یہود و نصاریٰ سے جو دوستی کرتا ہے، وہ ان ہی میں سے ہے) کی بنیاد پر اسی نتیجہ تک میں پہنچتا ہوں نتیجہ تک حدیث کا مفہوم پہنچا رہا ہے۔ لیکن کسی فائدے کی بنیاد پر کسی طور یا طریقہ عمل کو اختیار کرنا یہ بالکل جداگانہ امر ہے اس کو تشبہ سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ مثلاً ہم اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان جیسے گرم ملک کا ایک آدمی اس جوتے کو استعمال کرتا ہے جسے بوٹ کہتے ہیں جس میں تھوڑی دیر کے بعد ہی پاؤں میں بدبو کی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب جوتے سے پاؤں نکالا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں مرا ہوا چوہا بڑا ہے، بجز اس بات کے کہ جو لوگ یورپ والوں سے مرعوب ہیں۔ اور ان کی ہر ادا انہیں محبوب ہو گئی ہے۔ وہی اس قسم کے احمقانہ فعل کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ اور اس کو اگر تشبہ قرار دیا جائے تو یہ صحیح ہو گا۔ لیکن مغربی اقوام کی میکانیکی و صنعتی ایجادات و اکتشافات کو سیکھنا، ان کے معاشی و عمرانی علوم کو پڑھ کر ان سے استفادہ کرنا۔ اسے جو تشبہ قرار دے گا۔ وہ دیوانہ نہیں تو اور کیا ہے ۱۲

جو آپ لوگ پھیلارہے ہیں۔ تو پیغمبر نے عجیبوں کے اس مکینہ (گھات) کو کیوں اختیار فرمایا۔ اور کیا یہ ایک ہی مثال ہے پڑھئے، فتح خیبر کے واقعات پڑھیئے۔ ان ہی میں ایک واقعہ آپ کو یہ بھی ملے گا کہ صعب نامی قلعہ پر جب مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قلعہ کے تہہ خانوں کی تلاشی کا حکم دیا تو لکھا ہے

عہد نبوت میں | وجدوا فی ہذا الحصن الذی
رومی دبا بے | هو حصن الصعب الہ حرب

و دبا بات و منجینقا۔ (سیرت محمدیہ)

یعنی ”دبا بات“ اور ”منجینق“ جو قلعہ کشانی کے رومی آلات تھے، یہودیوں نے رومیوں سے ان کی صنعت سیکھی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ جدید آلات حرب پیش ہوئے۔ تو کیا یہ قرار دے کر کہ کافر رومیوں اور یہودیوں کے یہ آلات حرب ہیں، آپ نے ان کو پھینک دینے کا حکم دیا؟ فتح خیبر ہی کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ دو قلعے و طیح اور سلام چودہ دن کے محاصرے کے بعد بھی جب فتح نہ ہوئے تو لکھا ہے

ہم علیہ السلام ان يجعل علی من فیہا
ارادہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو لوگ
المنجیق۔ (کتاب مذکور)

اگرچہ اس کی نوبت نہ آئی، اور دونوں قلعے یوں ہی فتح ہو گئے، پھر خیبر کے بعد طائف کے محاصرے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کے ان آلات حرب سے کام لیا جو عربوں اور مسلمانوں کے لئے ایک جدید چیز تھی بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طائف پر جو دبا بے استعمال کیا گیا تھا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی بنوایا تھا تاریخ کے الفاظ یہ ہیں

رومی دبا بے رسول اللہ | اول دبا بے صنعت فی الاسلام
صلحہم نے خود بنوایا تھا؟ | دبا بے صنعت علی الطائفین
حامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(الکتا فی ص ۲۷۵)

جن سے معلوم ہوتا ہے کہ طائف کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی دبا بے تیار کرائے تھے۔ اسی طائف کے محاصرے میں منجینق کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا تھا۔ الکتا فی ہی نے لکھا ہے۔

اول من رھى بالمنجیق رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اهل الطائف
دخل نفر من اصحاب رسول اللہ
سب سے پہلے منجینق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے استعمال فرمایا طائف والوں پر (صورت
یوں ہوئی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند

طبقات ابن سعد وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جرش نامی شہر اُس زمانے میں دبا بات اور منجینق و عرادات کی صنعت میں مشہور تھا۔ عروہ بن مسعود ثقفی اور محمود بن غیلان جو مشہور صحابیوں میں ہیں۔ ان حضرات نے جرش جا کر ان آلات کے بنانے کا طریقہ سیکھا تھا۔ طبقات ص ۲۲۱ و قد تصیف ج ۲۔ جرش کہاں ہے؟ بعض اے ین کا ایک شہر بتاتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شرق اردن کا کوئی شہر تھا ۱۲

صلی اللہ علیہ وسلم تحت دیابۃ ثم رجعوا
 ۱۲ فی جلد ۱ الطائف لیحقوا (الکتانی ص ۲۵)
 صحابی دبا بے میں داخل ہو کر طائف کی فطیل تک
 پہنچے۔ تاکہ اس کے دروازے میں آگ لگا دیں۔

دیکھ رہے ہیں آپ، عجیبوں کی مدافعت کا بھی ایک طریقہ خندق اور رمیوں کے اقدام کے جو مخصوص ذرائع (دبابات و منجنیق وغیرہ تھے) سننے اور دیکھنے کے ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار فرما لیتے ہیں اور ان سے کام لیتے ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں یورپ نے جو جدید آلات حرب ایجاد کئے، مسلمان اور مسلمانوں کی حکومتیں انھیں دیکھتی اور صرف دیکھتی رہیں، سیکھنے اور اخذ کرنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوئی۔ اس کا خمیازہ دنیا میں جو کچھ بھگتنا پڑا وہ تو خیر ہم بھگت ہی رہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ آخرت میں بھی اپنے پیغمبر کو ہم مسلمان کیا منہ دکھائیں گے؟ اور لطف یہ ہے کہ نقصان یہ جو ہوا سو ہوا ہی، شہادت کرنے والے شہادت کرتے ہوئے عموماً اس کا الزام مسلمانوں کے مذہب کی طرف عائد کرتے ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا، مذہب کی وجہ سے ہوا، یا مذہب سے بعد ان نتائج کا ذمہ دار ہے؟

عجمی لباس اور پیغمبر | اور کیا اس باب میں نمونے محض حربی مکائد و آلات ہی تک محدود ہیں۔ شلوآر جسے عربی میں سراویل کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق لباس ہی سے ہے۔ اب سنئے محدثین کیا کہتے ہیں۔ پوری تفصیل تو کتبوں میں پڑھیے، خلاصہ یہ ہے کہ عرب میں عام دستور لنگی (ازار) باندھنے کا تھا۔ لیکن ایرانی شلوآر (سراویل) استعمال کرتے تھے۔ اتفاقاً بعض عربی تاجر ایران سے عرب سراویل لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک جب اس ایرانی لباس پر پڑی تو آپ نے اسے خرید لیا۔ ابوہریرہؓ جو اس واقعہ کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ یہ دیکھ کر میں نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ! نک لتلبس السراویل؟
 یا رسول اللہ! کیا آپ شلوآر پہنیں گے؟

جواب میں ارشاد ہوا،

اجل! فی السفر والحضر واللیل والنهار۔
 ہاں! میں سفر میں حضر میں دن میں رات میں ہر حال میں اس کو پہنوں گا۔

اور ایسا کیوں کروں گا، اس کی وجہ اسی کے بعد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ
 فانی امرت بالستر فلم أجعل شیئاً
 کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے ستر پوشی کا، اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس نہیں پاتا۔
 استوصنہ (جمع الفوائد عن اصحاب السنن والموصلی)

یعنی وہی بات کہ نفع کا پہلو کسی چیز میں اگر پایا جا رہا ہو، تو محض اس لئے کہ کسی دوسری قوم کی طرف وہ منسوب ہے، اسے چھوڑنا تنگ دلی کی بات ہے، نقصان اس میں دوسروں کا نہیں، خود اپنا ہے۔

مسجدوں کے | اور مسلمانوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ آج مسجدوں میں ہر محراب کے بازو میں جو ممبر ممبر کی تاریخ نظر آتا ہے۔ یہ ممبران کی مسجدوں میں کہاں سے آیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کے اظہار سے بعض طبقوں میں میری طرف سے کچھ برہمی پیدا ہو، لیکن ان چیزوں کو میں کیسے چھپاؤں جن کے چھپانے کو جرم

قرار دیتے ہوئے خود پیغمبر نے آگ کے لگام کی دھکی دی ہے اور ان ہی دھکیوں کا نتیجہ تھا کہ مرتے مرتے بھی صحابہؓ جو کچھ جانتے تھے اسے پہناتے چلے جاتے تھے۔

اتنا تو غالباً سب ہی جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ پہلے اس مشہور تاریخی ستون سے ٹیک لگا کر دیا کرتے تھے جس کا نام استن حنّانہ ہے۔ لیکن کھڑے ہو کر خطبہ دینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کچھ رحمت محسوس فرمانے لگے تو جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، یعنی وہ فرماتے ہیں کہ

حسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یخطب يوم الجمعة فی جذع فی
المسجد قائماً فقال ان فی القیام حد
شق علی فقال له تمیم الداری لا
اعمل لک ممبراً لکما رأت بالشام فشاو
المصطفیٰ المسلمین فی ذلک فر و ۲۲ ن
یتخذ و ۵۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن ایک
تھم سے لگ کر جو مسجد میں تھا خطبہ کھڑے ہو کر
ارشاد فرماتے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کھڑے
ہونے میں مجھے گرانی محسوس ہوتی ہے۔ تب
تمیم داری نے عرض کیا کہ کیا آپ کے لئے ہم ممبر
نہ بنائیں، جیسا کہ میں نے شام میں دیکھا ہے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں سے مشورہ
کیا، رائے یہی ملے ہوئی کہ ممبر بنایا جائے۔

(الکتانی بحوالہ ابن سعد ج ۱ ص ۶۸)

اور اس حد تک تو روایت گونہ ابھی مبہم ہے۔ الکتانی ہی نے قل قشندی کے حوالے سے جو یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ
سب سے پہلے ممبر جس شخص نے بنایا وہ تمیم داری
ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے
بنایا تھا اور شام کے گرجوں میں تمیم داری نے
ممبروں کو دیکھا تھا۔

اول من عمل الممبر تمیم الداری عملہ
للنبی صلی اللہ علیہ وسلم وکان قد رای
منابراً لکنائس بالشام۔

(الکتانی صفحہ مذکور)

جس سے معلوم ہوا کہ شامی عیسائیوں کے گرجوں میں تمیم داری نے اس ممبر کو دیکھا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں جبکہ
ہمیں معلوم ہے کہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ پہلے نصرانی تھے۔ ان کا آنا جانا بہ سلسلہ تجارت عیسائی ممالک میں ہوتا تھا
بہر حال کچھ بھی ہو، مورخین کا یہ بیان اگر صحیح ہے اور نہ صحیح ہوئے کی کوئی وجہ نہیں، تو حاصل اس کا اس کے سوا اور کیا
ہوا کہ مسلمانوں کی مسجدوں میں آج خطیب جس ممبر پر بیٹھ کر جمعہ کا خطبہ دیا کرتے ہیں۔ یہ عیسائیوں کے گرجوں کی چیز ہے،
جسے حضرت تمیم داری کے مشورے سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مسجد میں داخل کیا، اور اس پر بیٹھ کر آپ نے
خطبہ ارشاد فرمایا، ظاہر ہے کہ خطبہ بالکل ایک دینی کام ہے۔ لیکن اس دینی کام کے انجام دینے میں ممبر سے چونکہ آسانی میراثی
تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اختیار کرنے میں بھی کوئی مضائقہ محسوس نہیں فرمایا۔

مسجد نبویؐ میں کرسی اور گو عہد نبوت کے بعد اس کا سراغ نہیں ملتا، لیکن صحیح مسلم اور نسائی میں جو یہ روایت
پائی جاتی ہے۔ ابو رفاعہ العدوی صحابی راوی ہیں کہ

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا
اس وقت آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے،
میں نے عرض کیا کہ ایک مسافر ہے اپنے دین
کے متعلق دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوا
ہے، وہ نہیں جانتا کہ اس کا دین کیا ہے،
ابور فاعہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہوئے اور
خطبہ ترک فرما دیا (غالباً جمعہ وغیرہ کا خطبہ تھا)
اور میرے پاس تشریف لائے۔ پھر ایک
کرسی لائی گئی، میں خیال کرتا ہوں کہ اس کرسی کے پائے لوہے کے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اس پر بیٹھے اور جو باتیں اللہ نے آپ کو بتائی تھیں مجھے سکھانے لگے۔

انتهیئت الیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
وهو یخطب فقلت یا رسول اللہ حل
غریب یسال عن دینہ لا یدری
ما دینہ قال فاقبل علی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم وترک خطبتہ
حتی انتھی الی فاتی بکرسی حسبت
قواعد حدید قال ففعل علیہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وجعل لیمنی ما علمہ اللہ الحدیث
کرسی لائی گئی، میں خیال کرتا ہوں کہ اس کرسی کے پائے لوہے کے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اس پر بیٹھے اور جو باتیں اللہ نے آپ کو بتائی تھیں مجھے سکھانے لگے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممبر کے ساتھ مسجد نبوی میں کرسی بھی لاکر رکھی جاتی تھی۔ اور خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ
وسلم اس پر تشریف فرما ہو کر تعلیم دیا کرتے تھے۔

۱۔ واضح یہ ہے کہ دین نام اس چیز کا ہے جس کے اجزاء و عناصر کے ساتھ حق تعالیٰ کی رضامندی و ناراضامندی کا تعلق ہو، اظہار ہے کہ کسی قول و فعل یا عقیدہ
وغیرہ کے متعلق یہ حکم لگانا کہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے یا نہیں، اس کا علم خدا ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ اپنے جی سے کسی چیز کے متعلق یہ
حکم لگانا کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے یا ناخوش ہوتا ہے کھلی ہوئی بات ہے کہ خدا پر یہ جھوٹا باندھنا ہی یعنی عربی میں جسے "افراء علی اللہ" کہتے ہیں قرآن
میں ایک سے زیادہ مقامات پر اعلان کیا گیا ہے کہ "من ظلم ممن افری علی اللہ کذباً" (یعنی اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے) سچ پوچھئے تو
بہت اسی کا نام ہے یعنی اپنے جی سے کسی عمل یا فعل کے متعلق لوگ یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ اس کے کرنے پر ثواب ہوگا۔ نہ کرنے پر گناہ ہوگا۔ جو
کھلا ہوا افراء علی اللہ ہے لیکن کسی نئے یا جدید کام کا اس طور پر اختیار کرنا جس کا تعلق نہ ثواب سے سمجھا جائے، نہ عذاب سے محض نئے ہونے کی وجہ
سے اس کو بدعت قرار دینا غلط ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دین کا جو دستور سپرد کیا ہے اس کے
اندر استقلال و متم کی چیزیں ہیں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کے مقاصد و اغراض کی تصریح کے ساتھ ان کی ظاہری شکل و صورت بھی مقرر کر دی گئی ہے
مثلاً نماز کا جو حال ہے کہ ہر رکعت میں ایک کوع دو سجدے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ جائز نہ ہوگا کہ کوئی اپنی طرف سے بجائے دو سجدوں کے ایک سجدے کا
رکعت میں اضافہ کرے اسے تین سجدے بنادے لیکن اسی کے مقابلے میں بعض مطالبات شریعت کے ایسے ہیں کہ ان کی کوئی خاص صورت معین
نہیں لکھی ہے، بلکہ آزادی بخشی گئی ہے کہ جس شکل میں مسلمان چاہیں اس مطالبہ کی تکمیل کریں مثلاً جہاد کا حکم ہے کہ مقصود کلمۃ اللہ کا بلند کرنا اور کفر کی شوکت کا ارادہ ہو کسی زمانہ
میں تلوار اور نیزے سے اس مقصد کو حاصل کیا جاتا تھا پھر جب پابندی کا زمانہ جواب گیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کا فرض ہے کہ اصل مقصد جہاد کی تکمیل اسی شکل میں
کریں جو اس زمانہ کا اقتضا ہے پھر اللہ مسلمانوں کے فہم عمومی پر یہ نکات ہمیشہ واضح رہے ہیں، دوسری قوموں کو تعجب نہ ہو کہ ایک طرف تو مسلمانوں میں تنازعہ پایا جاتا
ہے کہ اپنے مذہب کے ایک ایک نقطہ پر اصرار کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہر زمانے میں خصوصاً جب تک خطاط کا عارضہ اس قوم کو لاحق نہ ہوا تھا پوری فیاضی کیساتھ دنیا کی
قوموں کے طور و طریقہ کو زندگی کے ہر شعبے میں یہ جذب کرتے چلے گئے ہیں ان لوگوں کو مسلمانوں کا صحیح نقطہ نظر معلوم نہیں ہے۔ ورنہ ان کے اس متضاد طرز عمل پر تعجب نہ ہوتا ۱۲

اور اس سلسلے میں نظائر و امثال کی جو کثرت ہے اسے میں کہاں تک بیان کروں، کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تنگ آستینوں کا جبہ جسے رومی جبہ کہتے تھے ہدیہ پیش ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اس لئے کہ وہ رومی (یعنی یورپ) کی طرف منسوب ہے زیب تن فرمانے سے انکار نہیں کیا، بلکہ اس کو پہن کر بسا اوقات آپ نمازیں پڑھتے تھے جس کا ذکر صحاح کی کتابوں میں عموماً کیا گیا ہے، مقوقس شاہ مصر نے خدمت والا میں ایک بلوری پیا کہ بھی تحفہ ارسال کیا تھا، لکھا ہے

فکان یشرّب منه (مواہب لدنیہ) اس پیالے میں رسول اللہ پیا کرتے تھے۔

انگریزی دوا | لیکن آج ان بزرگوں کو کون سمجھا سکتا ہے کہ بعض دواؤں کے استعمال سے وہ محض اس لئے اور مسلمان گریز کرتے ہیں کہ لوگ انہیں "انگریزی دوا" کہتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ کسی انگریزی دوا میں اگر کوئی ایسی چیز شریک ہوا جس کا استعمال اسلام میں ممنوع ہے مثلاً شراب وغیرہ تو یہ دوسری بات ہے لیکن محض انگریزی کی طرف کسی دوا کا منسوب ہو جانا، میں نہیں جانتا کہ یہ احتراز کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ یقیناً دواؤں کا پیدا کرنے والے خود حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ ہیں شفا بخشی کی اگر ان میں خاصیت ہے، تو یہ خاصیت بھی خدا ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ بجائے کسی مسلمان کے اس دوا کی خاصیت کسی غیر مسلم نے اگر دریافت کی ہے۔ تو محض دریافت کرنے کی وجہ سے، کیا وہ دوا اس کی ہو جائے گی۔ خدا کی دوا باقی نہ رہے گی؟ ہم تو صحیح بخاری میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ علیکم بھذا العود ۲ اہندی۔ اس ہندی لکڑی کو اختیار کیا کرو۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں اس دوا کو ہند کی طرف منسوب کر کے اہندی فرمایا کرتے تھے یہ زمانہ ہندوستان کا وہ تھا جس میں کفر و بت پرستی، شرک کی تاریکیوں کے سوا اس ملک میں اور کچھ نہ تھا۔ پھر کسی غیر اسلامی ملک یا قوم کی طرف منسوب ہو جانے ہی کی وجہ سے کسی دوا کا استعمال اگر قابل احتراز ہو جاتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہندی کی تصریح کے ساتھ اس کے استعمال پر لوگوں کو آمادہ کیوں فرماتے تھے؟ واقعہ تو یہ ہے کہ الاوائل کے علوم و فنون کو الاواخر تک پہنچانے میں، یعنی مسلمانوں سے پہلے دنیا کی جس قوم

۱۱۔ بدل جب تک مل سکتا ہو۔ اس وقت تک حرام چیزوں کا دوا استعمال بھی جائز نہیں ہے۔ یہ صرف امام ابو حنیفہ کا فتویٰ ہے۔ ورنہ ان کے سوا دوسرے ائمہ حتیٰ کہ خود امام صاحب کے تلامذہ امام محمد وغیرہ کا فتویٰ یہی ہے کہ بدل ملے یا نہ ملے دوا ہر اس چیز کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔ حالت صحت میں جس کا استعمال مسلمانوں پر حرام کیا گیا ہے۔ لیکن انگوری شراب کے سوا شراب کی دوسری قسموں کے متعلق امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک میں جو صحت پائی جاتی ہے۔ اہل علم کے لئے ابتلا کے موجودہ زمانے میں قابل غور ہے ۱۲

۱۲۔ عود ہندی ایک قسم کی لکڑی تھی جو ہندوستان سے عرب و سائر ہوتی تھی۔ اس لئے اس کو عود ہندی کہتے تھے، نام اس کا قسط بتایا جاتا ہے اہل علم بھی مختلف امراض میں اسے مفید بتاتے ہیں۔ حدیث میں بھی ہے کہ سات بیماریوں میں یہ مفید ہے، علما نے لکھا ہے کہ سات کے لفظ سے سات کا عدد منصوص نہیں ہے۔ بلکہ بہت سی بیماریوں میں ان کے مفید ہونے کے اظہار کا یہ ایک طریقہ ہے جو عربی محاورے پر مبنی ہے ۱۳۔ اسلامی مصنفین ۱۴۔

۱۳۔ خصوصاً قدما کی یہ ایک اصطلاح ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے علم عرب کا جو ایک جدید نظام مسلمانوں کو ملتا تھا اسی کے مقابلے میں یونانیوں یا ایرانیوں ہندیوں وغیرہ کے علوم اور اہل علم تھے لیکن زمانے نے ربح بدل دیا۔ اہل اسلامی علوم کو قدیم و پارینہ علوم میں شمار کیا جاتا ہے ۱۴۔

اور جس ملک میں بھی علم و دانش کا جو سرمایہ جمع ہو چکا تھا، اس سرمایہ کے اکثر و بیشتر حصہ پر قابو حاصل کر کے اور جس حد تک ان سے اپنے عہد میں ممکن تھا ان میں اضافہ کر کے پچھلی نسلوں تک ان کو پہنچانے میں مسلمانوں نے جو درمیانی واسطہ کا کام انجام دیا ہے خواہ احسان فراموشوں کی جماعتیں اس کا اقرار کریں یا نہ کریں، لیکن یقیناً یہ ایک واقعہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس واقعہ کے وقوع میں اگر یہ سمجھا جائے کہ بہت بڑا دخل ان ہی پیغمبرانہ حوصلہ افزائیوں کو ہے، جن کا اظہار اپنے قول و فعل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہتے تھے۔ تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اکتانی نے عربین عبد السلام الامام کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ عرب جس کمان کو استعمال کرتے تھے۔ نسبتاً وہ ہلکی اور ان کی زد بھی زیادہ کارگر نہیں ہوتی تھی، بخلاف اس کے ایرانیوں کی کمان ہر لحاظ سے عربی کمانوں سے بہتر ہوتی تھی لکھا ہے کہ

عربی کمانوں پر ایرانی | صدح قسی العجم وقال ہم
کمانوں کو ترجیح دی گئی | اقویٰ منکم رمیہ۔
(اکتانی ص ۲۸، ۲۹ ج ۱)
انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ایرانی
کمانوں کی تعریف فرمائی۔ اور فرمایا کہ تیر پھیکے ہیں
وہ زیادہ زوردار ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عربی کمانوں کو چھوڑ کر مسلمانوں نے ایرانی کمانوں ہی کو اختیار کر لیا۔
تاریخوں میں لکھا ہے کہ مصر کی مہم پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمانے لگے تو وواعی خطبہ اس وقت فوج کے سامنے آپ نے جو دیا تھا، اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا
السهم بالسهم والرمح بالرمح والسيف
تیر کا مقابلہ تیر سے، نیزے کا نیزے سے، تلوار کا
بالسيف (اکتانی ص ۲۲، ۲۳ ج ۱)
تیلوار سے۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر وقت اور ہر ملک و مقام کے لحاظ سے جو چیزیں بھی مسلمانوں کو ان امور میں بہتر نظر آئیں، انہیں اختیار کریں۔ یقیناً حضرت ابو بکرؓ کے اس خطبہ کی بنا پر آج مسلمانوں کو یہ خطبہ دینے والا کہ توپ کے مقابلہ میں توپ، ہوائی جہاز کے مقابلہ میں ہوائی جہاز استعمال کرو۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسی بنیاد پر یہ کہنا بھی اسی سنت صدیقیؓ کو زندہ کرنا ہو گا کہ سائنس کے مقابلے میں سائنس، کیمیا کے مقابلے میں کیمیا، ایجادات کے مقابلے میں ایجادات الغرض مقابل کی طرف سے جو چیز بھی سامنے آئے، چاہیے کہ مسلمان بھی اسی طریقے کو سیکھیں، اور اسی سے اس کا جواب دیں، واللہ اعلم تاریخوں کی یہ روایت کہاں تک صحیح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بعض فوجیوں نے شکایت کی کہ ریشمین لباسوں میں دشمنوں کو دیکھ کر ہمارے دل مرعوب ہوتے ہیں، باوجودیکہ عام حالات میں مسلمان مردوں کو ریشمین لباس کے استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ لیکن لکھا ہے کہ اس شکایت کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان فوجیوں سے فرمایا
وانتم تلبسوا کما تلبسوا (اکتانی جلد ۱ ص ۲۷)
تم بھی وہی پہنا کر جو وہ پہنتے ہیں۔

فقہ حنفی میں یہ چیز نہ جہایا جاتا ہے کہ جنگ کے موقع پر اگر ضرورت ہو تو فوجیوں کے لئے ریشمی کپڑوں کا استعمال جائز ہے غالباً اس کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی مشورہ ہے۔

اکتانی نے شہاب مرجانی ایک قازانی مؤرخ اور عالم کے حوالے سے یہ بات جو نقل کی ہے کہ

عہد عثمانی میں ہوائی | ان الروح المہویۃ بالریاح
پولن چکیاں مدینہ میں | المحدثۃ المتمدنۃ فی الضلالت
ہوائی چکیاں جو ان ہواؤں سے چلائی
جاتی ہیں جو مختلف صندوقوں میں جکڑ

المتعددة وكان ذلك في سنة ۲۹ بعد
الهجرة في خلافة عثمان (ص ۶۶ ج ۲)

کھاتی رہتی ہیں ۲۹ء میں حضرت عثمانؓ کی خلافت
کے زمانے میں مدینہ میں قائم ہو گئی تھیں۔

ممکن ہے کہ بعضوں کو اس میں کچھ شبہ ہو، لیکن نبوت کبریٰؐ نے عرب کی سرزمین میں جو بیداری پیدا کی تھی اس کو سامنے رکھتے ہوئے میرے نزدیک تو "یون چکی" کا عہد عثمانی ہی میں مدینہ منورہ کے اندر مروج ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے۔ بلکہ پھر مجھے وہی بات دہرائی پڑتی ہے کہ قرآن اگرچہ ایبادات و اکتشافات و صنعت و حرفت کی سکھانے والی یا نوایس فطرت اور اس کے امکانات پر بحث کرنے والی کتاب نہیں ہے۔ اس کا ایک معین مقصد اس "الصراط المستقیم" کی طرف انسانیت کی راہنمائی ہے جس پر چلنے والوں کے ساتھ حق تعالیٰ اپنی انعامی نسبت قائم فرمادیتے ہیں مسلمانوں سے نماز میں پانچوں وقت اسی ہدایت اور راہنمائی کی دعا کرائی جاتی ہے۔ اور قرآن کے کسی حصے کو سنا کر امام اس کا جواب خدا کی طرف سے لوگوں کو سناتا ہے۔ لیکن ضمناً جن امور کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، چونکہ وہ بھی خدا ہی کا بیان ہے۔ اس لئے یقیناً وہ بھی کوئی واقعہ ہی ہوتا ہے۔ اب آپ دیکھئے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق متعدد مقامات پر قرآن کا یہ بیان کہ ہم نے ہوا کو سلیمان کے لئے مسخر کر دیا تھا اور اس طور پر ہوا ان کے قابو میں آگئی تھی کہ

تجری بامراة مرعاء حیث
چلتی تھی ہوا دھیرے دھیرے حضرت سلیمانؑ کے حکم سے جدھر وہ چاہتے تھے

۲ صاب
ہوائی قوت کی طرف قرآن کا ایک اشارہ | پھر دوسری جگہ سورۃ الانبیاء میں ہے۔

ولسلیمان الريح عاصفة تجری
اور قابو میں کر دی گئی ہوا سلیمان کے جوئے روند
بامراة۔

بہ ظاہر جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زیر اقتدار ہوا کچھ اس قدر آگئی تھی کہ جس رفتار پر چاہتے اسے چلا سکتے تھے، تیز کرنے کی ضرورت ہوتی تو تیز بھی کر سکتے تھے، عاصفۃ کے لفظ کا یہی اقتضاء ہے، اسی طرح موقع ہوتا تو اس کی رفتار کو دھیمی بھی کر دیتے تھے۔ "رخاء" کے لفظ سے یہی سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہوا پر حضرت سلیمان کو یہ اقتدار کسی معجزاتی رنگ میں بخشا گیا ہو، عام خیال یہی ہے۔ لیکن معجزاتی رنگ ہو یا یہ سمجھا جائے کہ ہوا کا کوئی قانون حضرت کی گرفت میں آگیا تھا۔ بہر حال جب ہوا ان کے قابو میں آگئی تھی، تو اس واقعہ کا وقوع بہر حال

۱۵ اس مسئلہ کی تفصیل میری دوسری کتابوں میں پڑھنا چاہئے خلا یہی کہ عمومی اطلاق کے لحاظ سے تو القرآن اس پوری کتاب کا نام ہی جس میں قرآن کی دوسری سورتوں کے ساتھ سورۃ فاتحہ بھی شریک ہے لیکن خود قرآن میں سورۃ فاتحہ کو "الفتح المبین" کے نام سے موسوم کر کے "القرآن العظیم" کا ذکر اسکے مقابلے میں کیا گیا ہے۔ گویا اس لحاظ سے سورۃ فاتحہ اور "القرآن العظیم" دو الگ الگ چیزیں ہو جاتی ہیں یعنی ہیں تو دونوں ہی وحی اور حق سبحانہ و تعالیٰ کے الفاظ لیکن مقصد سورۃ فاتحہ کا یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی اس درخواست کو خدا کے دربار میں پیش کریں۔ اسی درخواست کا جواب ان کو "القرآن العظیم" کی شکل میں دیا جائے گا۔ نماز دراصل اسی درخواست اور اس درخواست کے جواب کے پڑھنے کی ایک باضابطہ شکل ہے، امام عام مقتدیوں کی طرف سے دربار الہی میں درخواست کو پیش کرتا ہے لوگ، آمین کہتے ہوئے گویا اپنے دستخط ثبت کرتے ہیں۔ پھر امام اس کے بعد خدا کی نمائندگی کرتے ہوئے قرآن کا کوئی حصہ سناتا ہے یعنی جو درخواست پیش کی گئی اس کا یہ جواب ہے ۱۶

کسی شکل ہی میں ہوا ہوگا، آپ ذریعہ علم میں اختلاف کر سکتے ہیں۔ یعنی الہام سے یہ علم ان کو حاصل ہوا تھا۔ یا عقل و فکر کا یہ نتیجہ تھا۔ لیکن ہوا کے کسی خاص قانون کا علم جس کے بعد اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا آسان ہو جائے۔ اس کے انکار کی تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، اور جاتے والے جانتے ہیں کہ عام طور پر علم کے جس سلسلے کو لوگ عقل و فکر کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ علم بھی وہیں سے آتا ہے جو الہامی علوم کا سرچشمہ ہے۔ قرآن تقویٰ کے ساتھ فجور کے متعلق بھی جب خبر دیتا ہے کہ

فَالْهَمُّهَا فَجُورٌ هَا وَتَقْوَاهَا۔

پھر الہام کیا اللہ تعالیٰ نے (نفس انسانی)

میں اس کے فجور کو اور اس کے تقویٰ کو۔

تو جو چیزیں فجور نہیں ہیں، الہام کی طرف منسوب کرنے میں اس کے متعلق آخر کیا مضائقہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال بات خواہ مخواہ طویل ہو گئی۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ خواہ کوئی صورت بھی پیش آئی ہو لیکن قرآن کے اس اشارے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج دنیا پر اسٹیم اور گیس یا برقی وغیرہ کی قوتوں کا راز واضح ہوا ہے، اگر توجہ کی جائے تو طاقت کا ایک بڑا ذخیرہ ہوا میں بھی ایسا مل سکتا ہے کہ اس کو قابو میں لانے کے بعد آدمی اپنی مرضی کے مطابق اس سے کام لے سکتا ہے۔ آج نہیں تو ہو سکتا ہے کہ دنیا پر کل ہوا کے اس قانون کا راز واضح ہو، کیا تعجب ہے کہ اس راز کے طشت از بام ہونے کے بعد وہ ساری قوتیں جن پر آج دنیا کو تار ہے۔ وہ ہوا ہو جائیں، کیونکہ جتنی آسانی کے ساتھ ہر جگہ ہوا آدمی کو میسر آتی ہے اتنی سہولت کے ساتھ نہ پٹرول ہی ہر جگہ مل سکتا ہے اور نہ اسٹیم اور نہ برقی قوتوں کو اس آسانی کے ساتھ ہم فراہم کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک تو قرآن کے اس اشارے میں ارباب فکر کے لئے ایک پیغام ہے۔ چاہیں تو قوت کے ایک نامعلوم ذخیرے کی سراغ رسانی کا اسے ذریعہ بنا سکتے ہیں، کیونکہ اس کو تو میں مستخرج سمجھتا ہوں، جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یورپ و امریکہ سے جہاں کوئی جدید چیز ایجاد ہو کر دنیا کے بازاروں میں پہنچی تو ایک طریقہ جاری ہو گیا ہے کہ بعض لوگ اپنی پرانی کتابوں کو بفلوں میں لے کر کہتے ہوئے دوڑتے ہیں کہ آج سے ہزاروں سال پیشتر یہ چیز ہمارے یہاں بھی موجود تھی، کچھ لغت کے دوران کار اشاروں، کچھ اپنی ذہنی زور آزمائیوں سے مدد لے کر چاہتے ہیں کہ توڑ مروڑ کر اپنے اس مقصد کو کسی نہ کسی طرح ثابت ہی کر دیں، میرے نزدیک پدرم سلطان بود کے بے جا اور جھوٹے فخر کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ تورات و انجیل کے مغربی مفسرین نے جو یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ خدا کی طرف منسوب کرنے کے باوجود ان کتابوں کے بیانات کی وقعت ان کی نگاہوں میں بوڑھیوں کی کہانیوں سے زیادہ باقی نہیں رہی ہے۔ عام طور پر مصلحت عام کی رعایت قرار دے کر ان حقیقتوں کا صاف انکار کر دیتے ہیں۔ جو تورات و انجیل کے صریح الفاظ سے ثابت ہوتے ہیں خدا کا جو وزن ان کے قلوب سے نکل گیا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن قرآن کو قرآن کے الفاظ کو ہم مسلمان خدا کی کتاب، خدا کے الفاظ سمجھتے ہیں۔ خواہ ضمناً ہی کسی چیز کا اس میں ذکر کیوں نہ کیا گیا ہو۔ لیکن جب قرآن میں یہ ذکر آیا ہے تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اندر کوئی خاص معنویت رکھتا ہے۔ آج نہیں تو دنیا پر کل اس کی اصلیت واضح ہوگی، میں نے مثلاً آپ کے سامنے چند چیزیں پیش کی ہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ قرآن پڑھنے والوں کے سامنے قرآنی مضامین کا یہ پہلو بھی رہے تو اچھا ہے۔ خدا اور خدا کا کلام اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کو اسی نظر سے دیکھیں، اور اس کی اہمیت کو محسوس کریں واللہ یعول الحق وھو یرھدی السبیل۔

خالص دینی امور | میں اپنی اصلی بحث سے ایک حد تک کچھ دور ہٹ گیا۔ چند مفید معلومات نہ تھے جی راضی نہ ہوا کہ
کے معاشی نتائج | مسلمانوں تک انھیں نہ پہنچایا جائے۔ بہر حال اب میں پھر اصل گفتگو کی طرف واپس ہوتا ہوں

یہ کہہ رہا تھا کہ عام طور پر جن چیزوں کو لوگ خالص دنیاوی کاروبار اور معاشی جدوجہد کے ذیل میں شمار کرتے ہیں
یعنی استعمار، راضی، کھیتی، باغبانی، تعمیر، وغیرہ۔ اسلام نے ان امور کو بھی دینی نتائج کے پیدا کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے
میں نے کہا تھا کہ دین کو آباد کرنے کے لئے اسلام دنیا کے آباد کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے جو کچھ عرض
کرنا تھا۔ عرض کر چکا۔ اب اسی کا دوسرا رخ، یعنی اسلامی تعلیمات کے جن عناصر کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ
خالص دینی امور اور مذہبی عناصر ہیں، اگر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ اخروی منافع و ثمرات کے ساتھ ساتھ اسلام
نے ان کو دنیوی اور معاشی کامیابیوں کا بھی وسیلہ قرار دیا ہے۔

ایک مغالطہ | میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کی تفصیل سے پہلے کسی کو اس مغالطہ میں نہ مبتلا ہونا چاہیے کہ شاید میرا
کا ازالہ، | اشارہ اسلام کے خدائی فوجداروں کے ان فیلسوفانہ تاویلوں کی طرف ہے، جن کی تعبیر اس زمانہ میں

عموماً "فلاسفی" کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ اور اسی بنیاد پر نماز کی فلاسفی، روزے کی فلاسفی، حج کی فلاسفی، اور خدا جاننے
کن کن چیزوں کی فلاسفیوں پر پہلے تو کانفرنس کے اسٹیج اور جلسوں کی پنڈال ہی میں دھواں دھار تقریریں ہوتی
تھیں، لیکن بہ تدریج اب بڑھتے ہوئے جہہ دستار اور میز و محراب بھی یا حسرتاً کہ ان ہی فلاسفیوں کی آواز باز گشت آ رہی
"الآخرت" کا یقین جن سے چھین لیا گیا تھا، اگر "الدین" کو بھی وہ "الدنیا" بنانے پر مجبور ہوں۔ جن نتائج کا

وعدہ "الآخرت" میں کیا گیا ہے، اگر "الاولیٰ" اور اسی "الحیوة الدنیا میں ان کی نگاہیں آج ان ہی نتائج کو ڈھونڈ
رہی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان کے "بلغ علم" کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ ذکر اللہ جو اقامت "صلوة" کا قرآنی مقصد ہے۔ جو اس ذکر اللہ
کے فوائد سے اندھا بنایا جا چکا ہے۔ بتایا جائے کہ وہ بیچارہ نماز کے قیام و قعود میں گرائی "معدہ کی خفت کو اگر تلاش
نہ کرے تو اور کیا کرے جس کے لئے "تقویٰ"، "شکر" کے الفاظ بے معنی ہو چکے ہیں۔ وہ روزے کو جسمانی صحت کی ایک طبی

تدبیر اگر قرار دے رہا ہے تو بتایا جائے کہ آخر اس کے لئے چارہ کار ہی کیا ہے؟ جس کی تنگ نگاہ میں موجودہ زندگی
کی تنگیوں سے زیادہ انسانی حیات کی کوئی اور شکل سمجھ نہیں سکتی، وہ مسلمان ہونے کے دعویٰ کو آخر کس طرح بنا ہے گا جب تک
کہ ان ساری چیزوں کو جن کا حوالہ اخروی دور وجود میں دیا گیا ہے، انھیں کسی نہ کسی صورت سے اس زندگی میں ڈھونڈ کر
نکا لے۔ "الدین" کو بھی "الدنیا" یا "آسمان" کو بھی جو زمین "اس لئے بنا رہا ہے کہ اس کا دل اسی "الحیوة الدنیا سے راضی

ہو چکا ہے، موت کے بعد اپنے آگے وہ کچھ نہیں پاتا یا کچھ نہیں پانا چاہتا۔ اس کوتاہ فہمیت حرمان نصیب بیچارے کو تو خیر
معذور بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن دین کے منادیوں، الآخرت کے داعیوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جب وہ بھی عصری
ماحول سے متاثر ہو کر اسلام کے خالص لاہوتی عناصر اور دینی ارکان کی فلاسفی بیان کرنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔
اسلامی عبادات کی فلاسفی | مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ عبادتوں کے جو فوائد فلاسفی کے

۱۔ فلاسفی کے لفظ پر حضرت حکیم الامت کا فقرہ یاد آیا۔ کسی تقریر میں ارشاد ہوا کہ میرا نے مدرسوں میں ہم نے فلسفا کا نام سنا تھا، اب اس زمانہ

میں فلاسفی کا چرچا جب سننے میں آیا تو خیال گذرا کہ "فلاسفی" کوئی مادہ کیا پیدا ہوئی ہے ۱۲

نام سے آج بیان کئے جا رہے ہیں۔ وہ ان عبادتوں پر مرتب نہیں ہوتے یا نہیں ہو سکتے، اگرچہ سچ یہ ہے کہ کسی کو ورزش ہی کرنا اگر مقصود ہو، تو نماز کی چند ہلکی ہلکی اٹھک بیٹھک سے غالباً اس کے لئے زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ ڈنٹر پیڈ، مگدر ہائے ڈبل کا کام کرے، یا طبی اغراض سے جو روزے کو استعمال کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے مناسب ہوگا کہ فاقے کی ان صورتوں کو اختیار کرے۔ جن کے درمیان میں بعض چیزوں کے پینے اور استعمال کرنے کا مشورہ اطا دیتے ہیں، مثلاً بیج بیج میں نمک آلودہ پانی کے چند گھونٹ بھی پیتا چلا جائے پھلوں کا رس بھی کبھی کبھی نوش جان کرے۔ اس کے لئے دینی اوقات کی پابندی فضول ہے۔ سحری اور افطار کے فیود سے ممکن ہے کہ ان جسمانی منافع سے محروم رہے جو طبی مشوروں کے فاقے سے آدمی حاصل کر سکتا ہے۔

مگر بالفرض اگر اسلامی عبادات پر یہ فوائد مرتب بھی ہوتے ہوں، جب بھی ان فوائد کو ان عبادتوں کا ذاتی مقصود قرار دینا، صرف یہی نہیں کہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ ہے۔ یعنی قائل کے قول کی ایسی توجیہ ہے، جس سے قائل خود راضی نہیں ہے، قرآن اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو مقاصد ان کے بیان کئے ہیں یہ اس کے خلاف ہے اور اسی لئے میرے نزدیک تو ایک حد تک اس قسم کی توجیہیں اقرار علی اللہ و علی الرسول کے حدود تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ خدا پر اور اس کے رسول پر جھوٹ کے انتساب کی بے جا جرات ہے۔

مولینا تھانویؒ | یوں بھی بقول حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ان فلا سیفوں کی ایسی مثال ہے کہ عرق گلاب کا استعمال کا ایک لطیفہ | کوئی یہ بتائے کہ اس سے استنجا کیا جاسکتا ہے، اپنی مائیت اور سیالیت کی وجہ سے ظاہر ہے کہ جو عرق گلاب سے آبدست کا کام لے گا۔ بلاشبہ اس کی نجاست کا تنقیہ ہو جائے گا۔ لیکن کیا عرق گلاب کا یہ صحیح استعمال اور اس کی یہ صحیح قیمت ہے۔ آم کی گٹھلی بونے والے سے اگر پوچھا جائے کہ تم اسے کیوں بورہ ہو، کیا یہ جواب اس کا صحیح ہوگا کہ پتوں اور لکڑیوں کے لئے بورہ ہوں تاکہ لیندھن میں وہ کام آئے، واقعہ یہ ہے کہ جو بھی آم کے درخت لگاتا ہے۔ اس کا اصلی مقصد تو آم کے پھل ہی ہوتے ہیں۔ ضمناً اور ذیلیاً لکڑی اور پتوں کا نفع بھی خود بخود حاصل ہو جاتا ہے مولینا المعنوی فرماتے ہیں ۵

ہر کہ کار و قصد گندم باندش کاہ خود اندر قلع می آیدش
گیہوں کی کاشت کرنے والوں کا اصل مقصود تو گیہوں ہی ہوتا ہے۔ گھاس بھونسہ تو ذیلی نتیجہ ہے جو گیہوں کے کے طفیل میں حاصل ہی ہو جاتا ہے۔ یوں ہی اسلامی عبادات کی اصلی غرض تو وہی ہے جو قرآن و حدیث میں مذکور ہے مثلاً نماز کے مقاصد کو ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے

اقم الصلوٰۃ لذكری (ظہ ۱۶) قائم کر دینا میری یاد کے لئے۔
روزے کو فرض قرار دیتے ہوئے لعلکم تتقون (تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو) لعلکم تشکرون (تاکہ تم شکر کرو) ارشاد ہوتا ہے ۱۲ غیر ذلک من ۱۱۲ مورا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ ان اغراض کے ساتھ ساتھ ذیلی طور پر کسی کو وہ منافع بھی حاصل ہو جائیں جنہیں آج ان عبادات کی توجیہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بہر حال اسلام کے خالص دینی و مذہبی عناصر مثلاً ایمان و یقین، توبہ و استغفار، صلوٰۃ و زکوٰۃ، حج و صوم، وغیرہ وغیرہ کے متعلق میں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان خالص دینی چیزوں سے بھی دنیوی فوائد اور ان مذہبی ارکان سے بھی

معاشی منافع حاصل کرنے کا ایک پہلو اسلام میں پایا جاتا ہے، اس سے میری غرض وہ نہیں ہے جسے اپنی طرف سے اسلام کے نادان دوست چست گواہوں کی شکل میں نمودار ہو ہو کر اپنے نزدیک گویا ایک قسم کے ضعف اور سستی کا ازالہ اسلامی تعلیمات سے کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، میرے نزدیک اس سے اسلام کی بنیاد استوار و چست نہیں بلکہ کمزور اور سست ہوتی جا رہی ہے، آخر جب انہی اغراض کو آدمی دوسرے بہتر طریقوں سے زیادہ بہتر شکلوں میں حاصل کر سکتا ہے، جب وہ محلہ کی کمیٹیوں سے نماز کی جماعت کا، اور سالانہ کانفرنسوں سے عید و بقر عید کی نمازوں کا نفع حاصل کر سکتا ہے۔ تو خواہ مخواہ ایک جدید عصری شکل کو چھوڑ کر ان ہی دینی اغراض کے لئے ان فرسودہ پرانی شکلوں کے اختیار کرنے پر کیوں اصرار کرتے گا۔ جب عالمگیر موٹر کا انعقاد جلیوآ اور کشمیر کے سبزہ زاروں اور مرغزاروں میں ممکن ہے تو اسی کانفرنس کو وہ حجاز کے تپتے ہوئے ریگستان اور چٹیل میدان میں منعقد کر کے شرکار کی راہوں میں رکاوٹ، اُن کے آرام میں خواہ مخواہ خلل کیوں پیدا کرے گا۔

بہر حال میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ کوئی میری ذاتی رائے یا میرے دماغ کا کوئی خود تراشیدہ نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی کو اور صرف اسی کو پیش کر دینا چاہتا ہوں جس کی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود واضح الفاظ میں تشریح کی ہے۔ اس باب میں قرآنی آیات کا جو ذخیرہ ہے، سب کا نقل کرنا تو مشکل ہے مثلاً لا چند مشہور آیتوں کا تذکرہ کر کے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو چیزیں اسلام کی خالص دینی عناصر شمار ہوتی ہیں، کیا ان آیتوں میں اُن ہی کو معاشی فوائد اور دنیوی منافع کے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں قرار دیا گیا ہے، مثلاً ارشاد ہوتا ہے

اور زمین کی برکتیں | ولو ان ۲ اھل القرع امنوا
اور ایمان و تقویٰ | واتقوا لفتحنا علیہم
برکات من السماء والارض (الاعراف ۹)

جس کا بغیر کسی تاویل و توجیہ کے صریح مطلب یہی ہے کہ آسمان و زمین کی برکتیں جو ہمارے معاشی فوائد ہی کی دوسری تعبیر ہے۔ ہم ان کو ایمان و تقویٰ کی قوت سے بھی حاصل کر سکتے ہیں، ان برکات سے انسانی زندگی کتنی شگفتہ صاف و پاک، سُستری ہو جاتی ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں جس کا نام ”حیاتِ طیبہ“ ہے۔ وعدہ کیا جاتا ہے، ہر مرد اور عورت کو مہیا طیب کر کے کہ

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ دھو
مؤمن فلنحیئہ حیوۃ طیبۃ۔
جو کوئی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت بجا لیکہ وہ
ایمان والا ہو، تو ضرور ہم اسے جیتا رکھیں گے
سُستری زندگی کے ساتھ۔

(النحل ۱۲)

”فلنحیئہ“ کے لفظ میں لام اور مشدّد کوّن سے وعدے میں جتنی و توثیقی طاقت بھری گئی ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو عربی زبان جانتے ہیں، صاف صاف کھلے کھلے الفاظ میں اس وثیقہ کا اعلان کیا جاتا ہے کہ

مشکل کشائی | من یتق ۲ اللہ یجعل لہ عجز جاد
تقویٰ سے | ویزقہ من حیث لا یحتسب۔

اللہ سے جو ڈر کر (گناہوں سے) بچے گا۔ بنائے گا اللہ
اس کے واسطے نکلنے کی راہ اور روزی پہنچائے گا اُسے
ایسی جگہ سے جہاں سے اسے امید نہ ہو۔

(الطلاق ۲۸)

کش مکش حیات کی دشواریوں کو تقویٰ سے حل کیا جاسکتا ہے۔ اور ایسی روزی یا رزق جس کے ذرائع کا پہلے سے سان گمان بھی نہ ہو، الغرض قرآن کی ایسی آیتیں مثلاً

۱۲ نالینصر رسلنا والذین آمنوا فی

الحیوة الدنیا ویوم یقوم الا شہاد۔

(مومن ع ۵)

ہم قطعاً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی۔ اور ایمان والوں کی اس حیات دنیا میں۔ اور اس دن بھی جب گواہیاں قائم ہوں گی۔

یا

۱۳ الذین قالوا امرنا بنا ۱۲ اللہ ثم

استقاموا ننزل علیہم الملائکۃ ان

لا تخافوا ولا تحزنوا نحن اولیاءکم

فی الحیوة الدنیا و فی الآخرۃ۔

(حم سجدہ)

یقیناً جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ڈٹ گئے۔ اترتے ہیں ان پر فرشتے یہ لے کر کہ نہ ڈرو اور نہ گھو، ہم تمہارے یاد و پشت پناہ ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یا پیغمبروں کو جب اہل کفر نے وطن سے باہر کر دینے کی دھمکی دی، تو قرآن میں ہے کہ

پس پیغمبروں پر ان کے خدا نے وحی کی کہ تم ظلم

کرنے والوں کو قطعاً برباد کر دیں گے۔ اور ضرور

بسائیں گے ہم تمہیں زمین میں ان کے نیست و نابود

ہونے کے بعد یہ (وعدہ) ان کے لئے ہے جو میرے

مقام سے ڈرا اور ڈرا میری دھمکی سے۔

ایمان والوں کو زمین پر کفر والوں

کے مقابلے میں بسایا جائے گا

۱۴ الظالمین ولنسکنکم الارض ص

بعد ہم ذلک لمن خاف مقامی و خا

وعید۔ (ابراہیم)

ظاہر ہے جس زمین (الارض) کے متعلق پیغمبروں پر خدا نے وحی کی۔ وہ اس دنیا ہی کی زندگی والی زمین تو ہے۔ اعلان کیا گیا

ہے کہ حق تعالیٰ کے مقام اور خدا کی دھمکیوں سے جو بھی ڈرے گا۔ اسی کو زمین میں بسایا جائے گا۔ مشہور آیت استخلاف میں

بھی جنت ہی نہیں زمین میں بھی تمکن کا وعدہ ایمان والوں سے کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ شرک نہ کریں اور اللہ ہی کو پوجتے

چلے جائیں۔ قرآن ہی میں ضمانت دی جاتی ہے کہ تقویٰ سے اس معاشی سہولت کو بھی جو چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ

قرآن کی آیت

جو ایمان لائے اور ڈر کر گناہوں سے بچا کرتے ہیں

ان کے لئے بشارت ہے "الحیوة الدنیا میں بھی

اور "الآخرۃ" میں بھی۔ اللہ کی باتوں میں تبدیلی

نہیں ہو سکتی۔

۱۵ الذین آمنوا وکانوا یتقون لنهم

البشری فی الحیوة الدنیا و فی الآخرۃ

لا تبدل لکلمات اللہ۔

(یونس ۱۱)

میں تو اسی ایمان اور تقویٰ کو اخروی منافع کے ساتھ ساتھ دنیاوی کامیابیوں کی بشارت کا ذریعہ قرار دے کر حق تعالیٰ نے

اس کو اپنا ایک ایسا کلمہ یا ایسی بات یا ایک ایسا قانون قرار دیا ہے جو کبھی بدل نہیں سکتا، یعنی ایسی اٹل بات ہے جو اپنے مقررہ نتیجہ

سے جدا نہیں ہو سکتی مطلب یہی ہوا کہ ایمان و تقویٰ کسی میں پایا جائے اور اس کی زندگی ان نتائج سے محروم ہو، ایسا نہیں

قرآن نے دوسری جگہ اسی مقصد کو اپنے اس مشہور فیصلے کی صورت میں ادا کیا ہے۔

۱۲ مَحْسَبَ الَّذِينَ جُتِحُوا السَّيِّئَاتِ
۱۳ اَنْ يُجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ سَوَاءً طَحِيًّا هُمْ وَمَا مَقْمُرُ
سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (جاثیہ ۲۵)

کیا خیال کر لیا ہے ان لوگوں نے جو بدیوں کو بٹور
رہے ہیں کہ ہم بنادیں گے ان کو ان لوگوں کی مانند جو
ایمان لائے اور نیکیاں کیں، برابر ہو جائے گی ان کی
زندگی اور ان کی موت، برا فیصلہ ہو جو وہ کر رہے ہیں

یعنی ممات (موت) ہی کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کے نتائج کو وابستہ نہ خیال کرنا چاہیے، بلکہ محیا (زندگی) بھی ان لوگوں
کی جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ جیتے ہیں، ان لوگوں کی زندگی سے بالکل جدا ہو جاتی ہے جو بجائے صالحات کے ”السیئات“
(بد کرداریوں) میں مبتلا ہیں، پانی برسانے اور بادل بنانے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جس کے متعلق سنتے ہیں کہ آج یورپ
امریکہ میں تجربہ ہو رہا ہے، اگرچہ تجربہ سے بات آگے نہیں بڑھی ہے۔

لیکن اسی توبہ و استغفار کو جس کے متعلق شاید سمجھا جاتا ہے کہ قبر اور قبر کے بعد ان کے نتائج سامنے آئیں گے، قرآن
بارش برسانے اور لانے کے آگے کی حیثیت سے استعمال کرنے کا اس آیت میں صراحت حکم دیتا ہے پیغمبر نے اپنی امت سے کہا
پانی برسانے کا | یا قوم استغفروا ربکم ثم تولوا
قرآنی طریقہ | الیہ یوسل السماء علیکم مدد ارا
وینزکم قوة الی اوتکم۔

اے میرے لوگ، اگر تم طلب کرو اپنے مالک سے
پھر پلٹو اسی کی طرف: بھیجے گا وہ آسمانوں کو تم پر
موسلا دھار بارش کے ساتھ اور بڑھائے گا وہ

تمہاری قوت میں قوت کو۔

(ہود ۱۲)

آج تو کوئی شاید اس تجربے کے ماننے کے لئے بھی تیار نہ ہو، لیکن ہم کیا کریں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کا یہ بیان ہے، جسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ

بینما رجل فی فلاة من الارض فسمع
صوتانی سماعة ۲ سق حذیقة فلان
فتحنی ذلک ۲ السحاب فافزع ماءه
فی حرة فناد ۲ مشاجة من
تلک ۲ الشراج وقد استوعبت ذلک
الماء کله فنبع الماء فاذا رجل

اچانک اس حال میں کہ ایک آدمی جا رہا تھا کسی
میدان میں کہ اس نے ابر کے ایک ٹکڑے سے آواز
سنی ”سیراب کرو باغ کو فلاں شخص کے“ آواز کے بعد
دیکھا کہ بادل کا وہ ٹکڑا ایک کنارے کی طرف ہٹ
گیا اور برسا دیا اس نے پانی ایک چٹیل میدان میں
پھر خنجر نالیوں میں سے ایک نالی میں سارا پانی

۱۵ اگر دجال والی حدیثیں اگر صحیح ہیں تو ہمیں یہ باور کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ کسی زمانے میں آدمی اس تجربہ میں بھی کامیابی حاصل کرے گا۔ آخر دجال بھی
تو آدمی ہی ہوگا، وہ جہاں چاہے گا بارش برسائے گا، صحیح حدیثوں میں جب یہ موجود ہے تو اس کا کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ سائنس ترقی کر کے اس نقطہ تک پہنچے گی۔ بلکہ ان
حدیثوں میں تو یہ بھی مذکور ہے کہ مرنے کو بھی وہ زندہ کرے گا۔ گویا قانون حیات و واقعہ ہو جائیگا، مسافت کا مسئلہ جتنا اس نے مانے میں غیر اہم ہو رہا ہے اس سے کیا
اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ کرہ زمین کے ہر ملک ہر شہر ہر گاؤں کا دورہ آدمی چالیس دن میں کر لے پراگر قادر ہو جائے، جیسا کہ دجال کے متعلق مروی ہے تو اس
میں حیرت کی کیا بات ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ دجال ہی پر سائنس کے کمالات و انکشافات کا آخری عروج ختم نہ ہوگا ۱۲

قائم فی حدیقة یحول الماء بمسحاته
فقال یا عبد اللہ ما اسمک قال فلا
للاسم الذی سمعہ من السحاب
فقال یا عبد اللہ لم سالتنی عن
اسمی قال سمعت صوتا فی السحاب
الذی ہذا ما تہ یقول اسق
حدیقة فلان باسمک فما الذی
تضع فیہا قال اما اذ اقلت
ہذا فانی انظر الی ما یخرج
منہا فالصدق ثلثہ واکل انا و
عیالی ثلثہ وار دنیہ ثلثہ۔

سمٹ کر آگیا اور ایک طرف بہنے لگا۔ آواز
سننے والے کا بیان ہے کہ میں اس پانی کی
روانی کے پیچھے پیچھے چلا، کیا دیکھتا ہوں کہ
ایک آدمی ایک باغ میں کھڑا اپنی کدالی سے
پانی کو الٹ پلٹ رہا ہے۔ میں نے اس سے
پوچھا اے اللہ کے بندے تیرا کیا نام ہے۔
اس نے بتایا کہ فلاں نام ہے یہ وہی نام تھا
جسے اس نے لکھ ابر سے سنا تھا تب باغ
والے نے کہا اللہ کے بندے تم نے میرا نام
کیوں دریافت کیا جواب میں اس نے کہا کہ
جس ابر کا یہ پانی ہے اس سے میں نے یہ آواز

سنی کہ سیراب کر فلاں کے باغ کو یہ تمہارا ہی نام تھا۔ اب یہ تو بتاؤ کہ اس باغ کے ساتھ تم کرتے کیا ہو تب
باغ والے نے کہا کہ خیر جنت میں یہ بات سنائی تو سنو! میں اس تمام پیداوار کو جو باغ سے حاصل ہوتی ہے۔
اس کی نگرانی کرتا ہوں۔ پھر ایک تہائی پیداوار کو صدقہ کر دیتا ہوں، اور تہائی میں میرے اہل و عیال کھاتے
ہیں۔ اور ایک تہائی کو پھر اسی باغ میں واپس کر دیتا ہوں (یعنی مصارف باغبانی میں اسے خرچ کرتا ہوں)۔

گویا آپاشی کی بے شمار تدابیر و وسائل میں قرآن کی رو سے اس کا ایک اہم ذریعہ توبہ و استغفار بھی ہے اور حدیث کی رو سے اس کی
ایک کارگر تدبیر جس کی تصدیق تجربہ سے ہو چکی ہے صدقہ ہے، اور یہی میری غرض تھی کہ ایمان و تقویٰ، توبہ و استغفار، صدقہ
خیرات وغیرہ جو خالص دینی اشغال و اعمال ہیں، اخروی منافع کے ساتھ ساتھ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے معاشی سود
بہبود، دنیاوی فلاح و صلاح کے بھی وہ ذرائع اور اہم و مؤثر ذرائع ہیں، اور یہ تو چند سرسری مثالیں ہیں، قرآن حدیث پر
جن کی حقوری بہت بھی نظر ہے۔ باول و علہ یہ چیزیں ان کے سامنے آ سکتی ہیں۔ اگر استیعاب کیا جائے تو ایک فرتیاری ہو سکتا
ہے، اور غار میں بند ہو جانے والے تین آدمیوں کا جو طویل قصہ بخاری شریف میں ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ الاخرۃ میں
نہیں، بلکہ الدنیا ہی میں اعمال صالحہ نے مشکلات سے اُسفین نجات بخشی، میں نے اشارہ کیا ہے اس پہلو سے روایت
و آیات پر غور کیجئے۔ خود ہی باتیں سمجھ میں آتی چلی جائیں گی۔

حصول معاش کا حکیمانہ طریق | ان قرآنی محکمات اور نبوی ہدایات کے سوا یوں بھی توبہ سوچنے کی بات ہے کہ اپنی معاشی ضرورتوں
اور سہولتوں کے سلسلے میں ہم جن چیزوں کے محتاج ہیں، جو اُسفین پیدا کر رہا ہے وہ نہیں، بلکہ
صرف جن راہوں سے وہ پیدا ہو رہی ہیں ان کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچا کر اسی کے مطابق عمل کا صحیح طریقہ اختیار
کرنا حصول معاش کی اگر یہ حکیمانہ (سائنٹفک) تدبیر ہے تو غور کرنا چاہیے کہ ان ہی چیزوں سے افادہ و استفادہ کے
باب میں قدرتی طور پر اس طریقہ عمل کا اختیار کرنا ہمارے لئے کس درجہ ناگزیر ہے۔ جو علم و یقین کی اس روشنی کا اقتضاء
ہے۔ جو خود ان چیزوں کے خالق اور پیدا کرنے والے کے متعلق ہم اپنے اندر رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہم سے باہر پیدا

ہو رہا ہے اور جو قوتیں اور طاقتیں ہمارے اندر پیدا ہو رہی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ قرآن ان کے متعلق صرف یہی علم نہیں عطا کر رہا ہے کہ ان سب کی تخلیق اور ان سب کے عمل پیدائش کا تعلق حق تعالیٰ کی تنہا ذات مبارک اور صرف اسی کے ارادہ قاہرہ سے ہے، بلکہ اس نے تو بار بار اس کا بھی اعلان کیا ہے کہ اس تخلیقی توحید کے علم و یقین کا نقش ہر اس فطرت پر کندہ اور کھد ہوا ملے گا، جس سے یہ پوچھا جائے کہ ان سب کا پیدا کرنے والا کون ہے۔ قرآن کبھی اسی سوال کو یوں دریافت کرنے کا حکم دیتا ہے۔

وَلْتَنۡسَآلِہٖمۡ سَالَتِہٖمۡ مِّنۡ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ ۚ

وَالْاَرْضِ ۚ (زمر، زحرف، لقان) اور زمین کو۔

یعنی آسمان و زمین کے نظام کے متعلق اگر پوچھو گے کہ اس کو کس نے پیدا کیا، پھر خود خبر دیتا ہے،
لیقولن ۲ اللہ۔ (جس سے بھی پوچھا جائیگا وہ جواب میں) قطعاً کہیں گے کہ اللہ

پھر اسی سوال کو ذرا وسعت دے کر یوں دریافت کرایا جاتا ہے۔

وَلْتَنۡسَآلِہٖمۡ سَالَتِہٖمۡ مِّنۡ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

وَسُخَّرَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ ۚ (لقان، زمر، عنکبوت) اور اگر پوچھو گے ان سے کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور مسخر کیا آفتاب و ماہتاب کو۔

یعنی اس نظام کی تخلیق ہی نہیں، بلکہ آفتاب اور اس کی روشنی و حرارت سے اسی طرح ماہتاب اور اس کی روشنی سے جو فائدے پہنچائے جا رہے ہیں، یہ کون کر رہا ہے، خبر دیتا ہے کہ جواب میں وہی۔
لیقولن ۲ اللہ۔ قطعاً وہ بھی کہیں گے کہ اللہ۔

اسی دائرے کو اور کشادہ کر کے سوال کی صورت یہ قائم کی گئی ہے

وَلْتَنۡسَآلِہٖمۡ سَالَتِہٖمۡ مِّنۡ نَّوۡلِ السَّمَآءِ مَآءٍ

فَاصۡبَاہِ ۚ (لقان، زمر، عنکبوت) اور اگر پوچھو گے ان سے کس نے اتارا آسمان سے پانی اور جلایا اس سے زمین کو اس کے

مرجانے کے بعد۔ (عنکبوت ۱۱)

یعنی صرف علوی اجرام کے منافع ہی نہیں، بلکہ سمندروں سے ابھرے بنا کر پانی کا اڑنا منجمد کر کے پھر اسی کو بارش کی شکل میں کھیتوں اور باغوں میں پہنچانا، مردہ زمین کو اس دریغ سے ہر سال نئی زندگی بخشی۔ یہ سارا معاشی کاروبار کون انجام دے رہا ہے، قرآن یقین دلاتا ہے کہ اس سوال کے جواب میں بھی وہی۔
لیقولن ۲ اللہ۔ قطعاً وہ بھی کہیں گے کہ اللہ۔

اور آخر میں تو صاف صاف الرزق جو معاشی فوائد کی گویا قرآنی تعبیر ہے، اس کو بھی سوال کا جزئیہ کر یوں پوچھوایا جاتا ہے۔

قُلۡ مِّنۡ مِّزۡنِ قَدۡمِہٖمۡ مِّنۡ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

وَمِنۡ مِّلۡکِ السَّمۡعِ ۚ (لقان، زمر، عنکبوت) اور کون کون روزی پہنچاتا ہے تمہیں آسمان سے

مِخۡرَاجِ الْحٰی مِّنۡ اَمۡیۡتِہٖمۡ وَمِنۡ مَّخۡرَجِ

اَمۡیۡتِہٖمۡ مِّنۡ الْحٰی وَمِنۡ یَّدِیۡہِہٖمۡ ۚ (یونس ۱۱) اور کون کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا،

زندہ کو مردے سے۔ اور کون ٹھیک ٹھاک کرتا ہے کام کو۔ (یونس ۱۱)

یعنی آسمان وزمین کے موجودہ نظام اور ان کے باہمی تعلقات سے رزق، یا معاشی فوائد کو کون پیدا کر رہا ہے۔ اور یہ تو باہر کا سوال ہوا، پھر جن اندرونی قوتوں مثلاً بینائی و شنوائی، دانائی کی اعانت سے آدمی جن چیزوں کو حاصل کر رہا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خود یہ حیات اور زندگی جو ہماری تمام اندرونی قوتوں کا سرچشمہ اور منشاء ہے۔ دونوں کو طاکر من بندہ الامر کا سوال جس کا ترجمہ ہے کہ (ہر کام کو ٹھیک ٹھاک کر کے کون درست کرتا ہے) مطلب یہ ہے کہ اندر کی قوتوں سے ہویا باہر کی طاقتوں سے ہر چھوٹے اور بڑے کاروبار کو سوال میں داخل کر کے قرآن دریافت کرتا ہے کہ یہ سب کس کے حکم اور ارادے سے ہو رہا ہے۔ یہ سب کون کر رہا ہے جواب کے متعلق پھر وہی ایک خبر کا اعلان کیا جاتا ہے۔

لیقولن اللہ۔ (ان سارے سوالات کے جواب میں بھی)

وہ قطعاً ہی کہیں گے کہ ”اللہ“۔

یہ اقرار انسانی فطرت میں کس طرح گھر کئے ہوئے ہے۔ قرآن ہم کو اس ایمان و یقین پر مجبور کرتا ہے کہ سب کچھ اللہ کر رہا ہے، صرف یہی واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر فطرت کے خمیر میں اس واقعہ کا علم اور یقین بھی پیوستہ و سرشتہ ہے۔ پھر جن راہوں اور قدرت کے جن قوانین و ضوابط کے تحت یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، جب ان کے متعلق صحیح معلومات فراہم کر کے اسی کے مطابق طریقہ عمل کے اختیار کا نام حکیمانہ (سائنٹفک) طریقہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ تو جو پیدا کر رہا ہے اسی سے ان پیداواروں کو حاصل کر لئے اس کی باتوں کا ماننا، تاکہ ہماری مرضی پوری ہو، اس کی خلاف مرضی کی باتوں سے بچنا اپنی اپنی استطاعت و وسعت کی حد تک اس کی مرضی پر چپنا غلطی سے ہٹ جانے کے بعد معافی مانگتے ہوئے پھر اسی کی مرضی کی طرف پلٹنا اور ان تدبیروں کے ساتھ ساتھ جو وہ پیدا کر رہا ہے۔ گڑا کر اس سے مانگنا جس کی دوسری تعمیر ایمان و عمل صالح، تقویٰ، توبہ، واستغفار، دعا، الحاح وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ بتایا جائے کہ آخر کس وجہ سے حصول معاش کی یہ تدبیر صحیح حکیمانہ تدبیر نہیں ہے، اگر عمل کا پہلا طریقہ علم کی صحیح روشنی میں اختیار کیا جاتا ہے تو کیا عمل کا دوسرا طریقہ جہل کی تاریکی میں اختیار کیا گیا ہے، اگر عمل کے پہلے طریقہ پر علم اور مشاہدہ تحقیق و تجربے کی قوتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں، تو کیا دوسرے طریقہ پر بھی وہی یقین وہی علم ہمیں نہیں مجبور کرے گا جس کے متعلق بتایا جا چکا کہ قرآن انسانی جبلت کا اُسے لازوال علم قرار دیتا ہے کہی عجیب بات ہے کہ قرآن سے ہم اس علم کو بھی حاصل کرتے ہیں کہ

کہوا اے اللہ آپ ہی مالک ہیں ملک کئے دیتے ہیں

جسے آپ چاہتے ہیں، اور جسین لیتے ہیں جس سے چاہتے

ہیں، آبر و بخشے ہیں جسے چاہتے ہیں، اور رسوا کرتے

ہیں جسے چاہتے ہیں۔ الخیر (ساری بھلائیوں)

آپ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر

ہیں، آپ ہی رات کو دن میں گم کرتے ہیں اور دن کو

رات میں گم کرتے ہیں۔ نکالتے ہیں آپ ہی

زندہ کو مردے سے اور نکالتے ہیں مردے کو

قل اللہ مالک الملک توئی الملک من

نشاء وتفرع الملک ممن نشاء وتعرن

نشاء وتذل من نشاء بیدک الخیر

انک علی کل شیء قدیر تو لیج اللیل فی

الہمار وتولیج الہمار فی اللیل وتخرج

الحی من المیت وتخرج المیت من

الحی وتوزنراق من نشاء بغیر حساب

(آل عمران ۶۶)

زندہ سے، اور روزی پہنچاتے ہیں جسے چاہتے ہیں، حساب کے بغیر۔

جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا کام مثلاً حصولِ سلطنت و حکومت، اور چھوٹے سے چھوٹا کام مثلاً روزنی روزی جس میں چیونٹیاں اور کیڑے کوڑے بھی ہمارے شریک ہیں، کام کے یہ دونوں سلسلے براہِ راست حق تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور کس طرح بندھے ہوئے ہیں

ما یفتحہ اللہ للناس من رحمۃ
فلا یمسک لہا وما یمسک فلا یرسل
لہ من بعدہ۔

جو کچھ کھولتا ہے خدا لوگوں کے لئے رحمت کے
(ہر شے سے) تو نہیں ہو کوئی روکنے والا اس کا، اور جسے
روک دے خدا تو نہیں ہے، بھیجنے والا اس رحمت کا

اس کے بعد کوئی۔

(الفاطر ۲۲)

یعنی اپنی رحمت کے جس دروازے کو کسی پروا کر دے، آسمان و زمین کی کوئی دوسری قوت پھر اسے بند نہیں کر سکتی اور جسے بند کر دے کوئی دوسرا پھر اسے کسی طرح کسی حال میں کھول نہیں سکتا۔ جب ”الخیر“ زہرہ چیز جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہو اور جس سے ہم نفع اٹھا سکتے ہوں) سب کی سب اسی کی مٹھی میں اور ید میں بند ہے، تو بتایا جائے کہ اسی ”الخیر“ کا مطلب اس کی طلب میں قرآن کے حکم

فابتغوا عند اللہ الرزق (عنکبوت ۲۴) پس ڈھونڈو اللہ کے پاس روزی کو۔

اور

واسئلوا اللہ من فضله (النساء ۵) اور مانگو اللہ سے اس کے فضل کو۔

کی تعمیل کرتے ہوئے، جس کے پاس ”الخیر“ ہے۔ اسی سے اگر اس ”الخیر“ کو مانگتا ہے تو بتایا جائے کہ عقل و دانش، حکمت و دانائی کا بھی اس کے سوا اور کیا اقتضاء ہو سکتا ہے، میرے نزدیک تو معاشی جدوجہد کے سلسلے میں عمل کا پہلا طریقہ اگر کوئی عقلی تدبیر ہے تو دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ عقلی تدبیر کہلانے کا مستحق ہے۔

دعائی تدبیر کی | ناکامیوں کے ہزار ہا تجربات کے بعد بھی جب آدمی کے لئے تدبیر کے پہلے شعبہ کا ترک کرنا عقلی کی کامیابی و ناکامی | دلیل ہے تو محض اس لئے کہ دعائیں بھی کبھی قبول نہیں ہوتیں۔ تدبیر کے اس طریقہ سے محض اسی لئے

بے تعلق ہو جانا آخر نادانی و حماقت کیوں نہ ہو، اپنے اختیار پر بھی جھیل اختیار نہیں ہے۔ اور اپنا اقتدار بھی جن کے اقتدار میں نہیں ہے۔ جب ان ہی میں کسی کے اندر لوگوں کو اختیار اور اقتدار کا کچھ سراغ ملتا ہے، مثلاً کسی حکومت کا ہم میں کوئی عہدہ دار یا حاکم ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود بیچارے سلاطین کو بھی کب اپنے نمائشی اختیار پر کامل اختیار ہوتا ہے۔ بہر حال اسی نمائشی اختیار و اقتدار کے مظاہر کو دیکھ کر جب دیکھا جاتا ہے کہ مسلسل نامنظوریوں کے باوجود ان کی بارگاہوں سے درخواستوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا، ہزار دفعہ جس کا معروضہ مسترد ہو چکتا ہے، وہ ایک ہزار ایک کے بعد منظوری کی توقع کرتے ہوئے درخواست دینے سے نہیں گھبراتا، پھر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جو محکوم نہیں حاکم ہے، تابع نہیں تبوع ہے، جاہل نہیں عالم ہے، صاف لفظوں میں کہئے کہ جو بندہ نہیں خدا ہے۔ اگر کسی بندے کی کسی درخواست کو کسی وقت نہیں قبول فرماتا، یا جاہل کے جہل کا اپنے علم کو تابع نہیں بناتا تو یہ کیسے باور کر لیا جاتا ہے کہ جس کے اختیار میں سارے جہان کے اختیارات اور جس کے اقتدار کے ساتھ سارے جہان کے اقتدارات اٹکے ہوئے ہیں۔ بندے کے کسی مطالبہ کا پورا کرنا اس کے اختیار سے الیا ذبا للہ خارج ہے۔

کس قدر عجیب ہے کہ اپنی رحمت سے مایوس ہونے والوں کو جو کافر قرار دیتا ہے۔ اللہ کے ان بندوں سے جو خدا سے نہیں۔ بلکہ خدا کے بندوں سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ اُن سے کون پوچھے کہ آخر کس بنیاد پر تم نے اپنے خالق سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے مایوس بنایا، خدا نے تو کہا ہے کہ

لَا يَأْسُ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ

نہیں نا امید ہوتا کوئی اللہ کی رحمت سے مگر

جو کفر والے ہیں۔

الکافرون۔

کیا دعا صرف | جس کا یہی مطلب ہے کہ کافر ہوئے بغیر کوئی حق تعالیٰ کی رحمتوں سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ لیکن لوگ ہیں طفل تسلی ہے | جو ایمان و اسلام کے دعویٰ کے بعد بھی اس کی رحمتوں سے ناامید ہو کر دعا و استغفار کو مشکلات حیات کے حل کی راہ میں ایجاد باللہ جھوٹی طفل تسلی تک قرار دینے کی جسارت کر جاتے ہیں۔ علانیہ کہتے ہیں کہ دعاؤں سے کیا ہوتا ہے جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا اگر کچھ فائدہ ہو سکتا ہے تو یہی کہ اضطراب و بے چینی کی حالت میں آدمی کو اس سے گونہ قوت اور اطمینان کی خشکی مل جاتی ہے۔ اور یہ خیال کس بنیاد پر قائم کر لیا گیا، محض اس لئے کہ دعا کی گئی تھی، چونکہ قبول نہیں ہوئی، اس لئے حصول مقاصد کی اس تدبیر کی تاثر ہی کا انھوں نے انکار کر دیا۔ جو بات جس وقت کہی جائے۔ اسی وقت اسی شکل میں پوری ہو جائے۔ دعا کا مطلب جنھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ انھوں نے خدا کو خدا بھی باقی رکھا، یا اس کو کار بر آری کی کوئی ایسی مشین یا آلہ فرض کر لیا جس کا کھٹکا ان کے دل و دماغ اور زبانوں میں لگا ہوا ہے، گویا وہ چاہتے ہیں کہ ادھر اس کھٹکے کو دبا دیا جائے۔ اور چاہتے ہیں کہ اُن کا آلہ اُن کے مطلوب کو ان کے سامنے لا کر حاضر کر دے، بعضوں کو قرآن کی آیتوں

جواب دیتا ہوں میں پکار کی، پکارنے والا جب

اجیب دعوة الداع اذا دعان

پکارتا ہے وہ مجھے۔

(البقرہ ۲۱۰)

یا

ادعونی استجب لکم (المومن ۲۱)

پکارو مجھے میں جواب دوں گا تمہیں۔

بعض دعائی آیتوں | وغیرہ سے بھی شاید مغالطہ ہوا "استجابت" و "اجابت" کا ترجمہ بجائے جواب دینے کے انھوں کے متعلق غلط فہمی | نے جو مانگا جائے اس کا قبول کرنا خدا جانے کس لغت کی بنیاد پر فرض کر لیا۔ حالانکہ پھر وہ اور بتوں کے پوجنے والوں کے مقابلے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اُن کے بہرے گونگے مردہ بے جان معبود جب اپنے پوجنے والوں کی پکار اور دہائی کو سنتے ہی نہیں تو جواب کیا دیں گے لیکن جس کی ذات مینا و شنوا، حی و قیوم، سب کو محیط، سب کے قریب ہے، وہ ہر ایک پکارنے والے کو قطعاً جواب دیتا ہے، لیکن پکارنے والے جو کچھ مانگتے ہیں اسے دے بھی دیتا ہے یہ مطلب ان آیتوں کا کہاں سے لیا گیا۔

پیغمبروں کی بھی | کم از کم میں تو اس سے ناواقف ہوں۔ آخر جس قرآن میں یہ آیتیں ہیں۔ اسی میں تو ہے کہ ہر دعا قبول نہیں ہوتی | معمولی ہستیاں نہیں، نوح و ابراہیم جیسے اولوالعزم پیغمبروں کی بعض درخواستوں کے قبول کرنے سے حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ خود سید الانبیاء والمرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو خطاب کر کے قرآن ہی میں فرمایا گیا کہ منافقین کی مغفرت کی درخواست اگر آپ ستر بار بھی پیش کریں گے تو اسے منظور نہیں کر سکتا۔ حدیثوں میں بھی ہے کہ

مسلمانوں کے باہمی جنگ و قتال کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اس سے ان کو محفوظ رکھا جائے لیکن نا منظور ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا، مگر باوجود وعدہ کے محض اس لئے کہ خدا خدا ہے بندہ نہیں ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ سب سے غنی ہے، کیا معلوم کہ ایسا عہد کب کیا جائے گا۔ کس حال میں کیا جائے گا۔ خدا کے وعدوں پر سب سے زیادہ بھروسہ کرنے والی ہستی کو میدانِ بدر میں دیکھا گیا تھا کہ سر خاک پر پڑا ہوا ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ

جنگِ بدر میں آنحضرت | قاتلت یومِ بدر شیئاً من
صلعم کا دعائی اضطراب | قتال ثم جئت فاذا رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی سجودہ
یا حی یا قیوم فرجعت فقاتلت ثم جئت
فوجدتہ کذلک (فتح الباری)

اے میں بدر کے دن ایک لڑائی بھیر آیا تو کیا دیکھتا ہوں
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سجدہ میں (اے زندہ
اے تھامنے والے سارے جہان کے یعنی) یا حی یا
قیوم فرما رہے ہیں پس میں پلٹا اور لڑا، پھر آیا تو
پاتا ہوں حضور کو اسی حال میں۔

سجدے سے سر اٹھایا جاتا ہے، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں، تن بدن کا ہوش باقی نہیں ہے۔ مونڈھے سے
چادر مبارک ڈھلک کر گر گئی ہے، لیکن کامل انہماک واستغراق، دل کی ساری قوت و توجہ، اصرار والحا ج کے ساتھ
زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں

اللہم انی انشدک عہدک و وعدک
اللہم ان شئت لم تعبد اللہم ان
ان ترہلک ہذا العصابة من اهل
الاسلام لا تعبد فی الارض۔
(بخاری و مسلم و صحاح)
یا اللہ آپ کو یاد دلاتا ہوں اپنا عہد اور اپنا
وعدہ۔ اے اللہ اگر آپ چاہیں تو نہ پوچھے
جائیں آپ۔ اے اللہ اگر تباہ ہو گئی یہ ٹکڑی
اسلام والوں کی، تو نہ پوچھے جائیں گے آپ
زمین میں۔

وعدہ کے باوجود رب اور رب کی نصرت کو جس بے کلی اور اضطراب سے آج ڈھونڈھا جا رہا ہے کہ بقول حضرت عبد اللہ
ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

ما سمعنا من اشد انی شد ضلالة
اشد من اشد من محمد لربہ۔
(فتح الباری)

ہم نے نہیں سنا کہ اپنی گم گشتہ چیز کو کوئی ڈھونڈھ رہا ہو
اس طرح جس طرح محمد اپنے رب کو ڈھونڈھ رہے
تھے (یعنی اس کی نصرت کو تلاش کر رہے تھے)

مالک کے قدموں پر اس لوٹنے والے کو دیکھ دیکھ کر دوسروں سے نہیں رہا جاتا اور جیسا کہ بخاری میں ہے
تب ابو بکرؓ نے آپ کے دستِ مبارک کو پکڑ لیا۔
فاخذ ابو بکر بیدہ وقال حبیبک۔
اور کہا کہ بس ہے آپ کے لئے۔

اسی کی تفصیل مسلم میں ہے کہ

فاتاک ابو بکر فاخذ رداءہ فالقاه
علیٰ منکبہ ثم التزمہ من وراءہ
تب آئے ابو بکرؓ اور پکڑ لی چادر کو آپ کے اوڑ والی
اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مونڈھے پر پھر لپیٹ گئے

وقال یا بنی اللہ فانہ سینجرا لک

ابو بکرؓ بیچے سے! درکہہ ہے تھے اے اللہ کے نبیؐ قریب

وعدک۔

ہے کہ پورا کیا جائے آپ کے ساتھ آپ کا وعدہ۔

وعدہ جو کیا گیا تھا، اس کو تو بہر حال پورا ہونا ہی تھا اور وہ پورا ہو کر رہا۔ لیکن حصول مقاصد کی اس کئی تدبیر کی تعلیم ہمیں جس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہے ان کے اس نمونہ میں ان لوگوں کے لئے بھی عبرت ہے جو سرے سے دعائی تاثیروں سے مایوس ہو کر ان کے منکمر ہو بیٹھے ہیں! اور بصیرت ہے ان کے لئے بھی جو استیجابت کا ترجمہ جو کچھ مانگا جاتا ہے وہ اسی وقت دیدیا جاتا ہے اپنی طرف سے کر کے اپنی ہر دو رکعت کے بعد کی دعاؤں پر امید لگا بیٹھتے ہیں کہ جو کچھ مانگا گیا ہے کارکنانِ قضاء و قدر اسے آسمانوں سے لئے آ رہے ہوں گے۔ اگر یہ معاملہ اتنا آسان تھا تو اس تدبیر کے سب سے بڑے ماہر اور معلم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصرار و الحاح اور ان الفاظ کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، جو اس حدیث میں ہم پڑھتے ہیں بہیں اپنی معاشی ضرورتوں میں بھی دعائی طریقہ عمل کو پوری قوت کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، اس دعویٰ کے ثبوت میں چونکہ واقعاتِ بدر کے اس حصہ سے روشنی پڑتی ہے، اس لئے قصداً میں نے اس چیز کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ بدر کی ان دعاؤں میں جو کچھ مانگا جا رہا تھا۔ اگرچہ اصل مقصود تو دین ہی کا غلبہ اور حق و صداقت کی سر بلندی ہی تھی۔ لیکن جس معاشی دعار کا ذکر ابتدائی بیان میں آیا تھا یہی مسلمانوں کو پیش کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

”یہ دردگار! یہ بھوکے ہیں انھیں یہ فرما، یہ پیادہ پا ہیں انھیں سواری دے، یہ ننگے ہیں انھیں کپڑے پہنا۔“

اہل علم جانتے ہیں کہ اس کا تعلق بھی جنگِ بدر سے ہے۔ یعنی بدر کے میدان میں کفار کے مقابلے میں جب مسلمان صفت آرائی کر رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ دعار فرمائی تھی۔ تو کیا دین کے ساتھ اس دعار میں دنیا کا پہلو بھی نہ تھا؟

دعائی تدبیر کے ساتھ عقلی تدبیر کے | اسی جنگ کے موقع پر کامیابی کی اس کلی اور کلیدی تدبیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طرف اتنا اہناک تھا یعنی کامیابی کا حقیقی اختیار جس کے ہاتھ میں تھا۔ اس سے مانگنے میں ایک طرف اتنا زور صرف ہو رہا تھا، تو جاننے والے جانتے ہیں کہ دوسری طرف جن راہوں سے حق تعالیٰ جنگ میں کامیاب ہوئیواہوں کو کامیابی عطا فرماتے ہیں، جنگ کے ان ضوابط و آئین کے اختیار کرنے میں بھی آپ نے کوئی دقیقہ اٹھانا نہ رکھا تھا۔ میدانِ جنگ میں بہترین موقع کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں میں ترتیب، اسلحہ کے استعمال میں ترتیب، تیرکب چلائے جائیں، تلوار کب نکالی جائے، پتھروں اور ڈھیلوں سے غنیم پر کس وقت حملہ کیا جائے، ہر ایک کا ایک خاص فاصلہ مقرر فرما دیا گیا تھا، دشمنوں کی ہر حرکت و سکون کی نگرانی، مادی ذرائع سے ممکنہ حد تک ان کو منقطع کرنے کی تدبیریں وغیرہ وغیرہ، ان میں سے ہر بات کی تعلیم اور ان پر اپنی خاص توجہ۔ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قائم کئے ہوئے تھے یہاں تک کہ دستِ مبارک میں خود تیر لے کر صفوں کی ترتیب کو درست فرما رہے تھے۔

اعتدال کے نظری نقطہ نظر سے جن طبائع میں اخراج پیدا ہو گیا ہو۔ اس سلسلہ میں ان کا کچھ بھی مذاق ہو۔ لیکن حق کا مزاج

۱۱۔ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے محض عقلی تدبیروں کو پیش نظر کر کے غزواتِ نبویہؐ پر ایک صفحہ لکھا ہے جس سے ان کی غرض یہ نہ تھی

جیسا کہ بعضوں کو غلط فہمی ہوئی کہ ان ہی تدبیروں کے ساتھ ان لڑائیوں کی کامیابی کو منجھ خیال کرتے ہیں، بلکہ صرف ایک پہلو کو نمایاں کرنا مقصود ہے ۱۲

خالص فطری حال پر باقی ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ ان کی فطرت حصول مقاصد کی راہ میں تدبیر کی اسنی جامعیت کو چاہتی ہو یعنی جو پیدا کر رہا ہے۔ اس سے بھی مانگا جائے اور جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، ان میں بھی تلاش کیا جائے تعلیم کی یہی جامعیت اسلام (خدا کی تعلیم) کی خصوصیت ہے۔ اسلام کو الدین الیقین (لازوال سیدھی راہ) قرار دیتے ہوئے قرآن میں جو یہ فرمایا گیا ہے

فطرۃ اللہ الٰہی فطرۃ الناس علیہا لا تبدل لخلق اللہ - اللہ کی آفرینش جس پر پیدا کیا اس نے آدمی کو۔
اللہ کی پیدا کی ہوئی چیز کا بدلنا نہیں ہے۔

اس کا یہی مطلب ہے کہ جن فطری اقتضات اور حالات پر قدرت نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ مذہبان میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ فطرت کے اس نقطہ سے جن کی طبیعتیں مہٹ گئی ہیں۔ وہ ان ہٹی ہوئی طبیعتوں کو پھر فطرت کے اس مقام پر واپس کر دیتا ہے۔ جس کے بعد آدمی کے تمام فطری مطالبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ اپنی کامیابیوں اور کامیابیوں کے سلسلے میں تدبیر و طریقہ عمل کے ان دو شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ کو جو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ بہ ظاہر اس کا سبب ان کے مزاج اور طبیعت کا فطری بگاڑ ہوتا ہے۔

دونوں شعبوں کی اہمیت میں فرق | البتہ پیدا کرنے والا چونکہ ایک ہے، اور جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، وہ بے شمار ہیں اور کسی بے شمار کہ ان کی حد ہے نہ حساب، گہرینے کے لئے ایک ایک قطرے کو بقول غالب رحمہ اللہ دام ہر مروج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ۔ کے گونا گوں پیچیدہ اور نازک قوانین سے سابقہ پڑتا ہے، اس لئے تدبیر کا پہلا شعبہ دوسرے شعبہ سے نسبتاً آسان ہے۔ ایک سے تعلق رکھنا اور وہ بھی بھیک مانگنے سوال کرنے کا تعلق رکھنا ایسا کام ہے کہ جس سے کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ بھی بالآخر اس کام کو کر ہی لیتا ہے، اسی لئے اس کا جذبہ تو قدرت نے ہر ایک میں رکھا ہے، اور اسی کا نام اصطلاحاً مذہبی جذبہ ہے۔ لیکن تدبیر کے دوسرے شعبہ میں عمل پیدائش کے ان پیچیدہ قانون سے سابقہ پڑتا ہے کہ ہاتھ سے چیمہ کو منہ تک پہنچانے میں آدمی کو ہزاروں مرحلوں کا اندیشہ گذرتا ہے یا جیسے غالب نے محسوس کیا کہ ایک ایک قطرہ کو موتی کی حالت تک پہنچنے کے لئے دریا کے ہر حلقہ موج میں نہنگوں کے سینکڑوں منہ جو کھلے پڑے ہیں سب کو بند کرنا پڑتا ہے بقول کاشتکاروں کے ”بگڑی کے ایک پھرے میں کام بگڑتا ہے“ گویا

رفتم کہ خارا ز پاشم منزل نہاں شد از نظر

کا خطرہ قدم قدم پر پیش آتا ہے۔ اسی لئے تدبیر کے اس جزئیاتی اور تفصیلاتی شعبہ کا حق ادا کرنا جیسا کہ چاہیے ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس پر وہی قانون پاسکتا ہے جو پیدائش کے سارے قوانین اور ان کے نازک پہلوؤں پر گہری نظر رکھتا ہو اور عمل کی قوتوں سے بھی قدرتا سرفراز ہو، غالباً یہی وجہ ہے کہ تدبیر کے اس شعبہ کا مکلف ہر شخص اپنی اپنی عقل اور قوت عمل ہی کے حساب سے ہے، بخلاف پہلے شعبے کے کہ وہ ایک کٹی تدبیر ہے، پیدائش کی راہوں سے نہیں، بلکہ خود پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مانگنا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا، مانگنا ایک ایسا فعل ہے کہ دنیا میں جو کچھ نہیں کر سکتا۔ مانگنے پر تو وہ بھی قادر ہوتا ہے اور مانگ ہی اس کی آخری پناہ ہے، اسی کے ساتھ جب ان امور پر بھی غور کیا جائے کہ پیدا کرنے والا چونکہ ایک ہے، وہ بدل نہیں سکتا۔ لیکن جن راہوں سے پیدا کر رہا ہے اس کو اختیار ہے کہ انہیں بدل دے۔ پھر تدبیر کے پہلے شعبے کا طریقہ عمل جس عملی اساس پر مبنی ہے (یعنی سب کچھ حق تعالیٰ پیدا فرما رہے

ہیں) چونکہ وہ ایک یقینی بلکہ جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ فطری وجدان ہے، بخلاف دوسرے شعبے کے کہ جن راہوں سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اولاً ان سب کا احاطہ آسان نہیں اور احاطہ کر لیا بھی جائے تو چونکہ اس سلسلے کی ساری معلومات عقل و حواس سے حاصل ہوتی ہیں، اس لئے عقل و حواس کے حدود میں اسباب و علل کے جو حلقے داخل ہیں ان تک تو رسائی ممکن بھی ہے لیکن ان کی سرحدوں سے جو حلقے باہر ہیں۔ ان کے متعلق اقرار جہل کے سوا عقل کے لئے کوئی چارہ کار نہیں، اسی لئے سمجھنا چاہیے کہ اس راہ کی عقلی کوشش جس حد تک بھی پہنچی ہو، لیکن جو طریقہ عمل عقل کے ان معلومات و تجربات پر مبنی ہوگا، بہر حال ناقص علم اور ناقص تجربہ ہی پر وہ مبنی ہوگا۔ الحاصل تدبیر کے ان دونوں شعبوں کے یہی نمایاں امتیازات ہیں، جس کی بنیاد پر اگر مذہب میں تدبیر کے پہلے شعبے کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، تو یقیناً وہ اس کا مستحق ہے، قرآن مجید میں

لله غیب السموات والارض والیہ
یرجع الامر کله فاعبدہ وتوکل علیہ

اللہ ہی کی ہیں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں
پلٹتی ہے بات سب کی سب اسی کی طرف تو اسی کو پوجو

چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگاؤ۔

(۱۲)

کی جو تعلیم دی گئی ہے۔ اس کا بھی مطلب ہے کہ عقل سے تم زیادہ سے زیادہ پیدائش کے ان ہی آئین و قوانین کو دریافت کر سکتے ہو جو حواس و عقل کی رسائی کے حدود میں ہوں۔ لیکن "السموات والارض" کے قوانین کا وہ حصہ جو حواس و عقل سے غائب ہے۔ یعنی "غیب السموات والارض" ان کے متعلق تمہارے لئے چارہ کار ہی کیا ہے۔ بجز اس کے کہ وہی ذات جس کے ساتھ تمام چیزوں کی پیدائش وابستہ ہے، سارے کاروبار کی جس پر انتہا ہے۔ اسی کو اپنا وکیل بنا کر اسی کو پوجتے اسی سے مانگتے چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ، گویا عقل و حواس کی راہوں سے جو معلومات حاصل ہو سکیں ان کا جو اقتضار ہو اس کو پورا کرنے کے بعد واقعہ یہی ہے کہ آخری پناہ آدمی کے لئے پیدا کرنے والے کی پناہ اور اس پر توکل اعتماد کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ جب ساری باتیں اسی کی طرف لوٹ کر جاتی ہیں اور وہی مختار کل ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنے اوپر ٹیک لگانے والوں کو وہ بے ٹیک اور بے سہارا کر دے گا۔

من یتوکل علی اللہ فہو حبیبہ (الطلاق ۲)

جس نے ٹیک لگایا اللہ پر وہ پس ہے اس کو

کا یہی مطلب ہے کہ بہر حال ایسا آدمی بے سہارا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی مقصد ہے اس کا کہ

ومن یکفر بالطاغوت ویؤمن

اور الطاغوت (یعنی ہر وہ چیز جو خدا سے

طغیان و سرکشی پیدا کرے) اس کا جس نے انکار

کر دیا اور اللہ کو مان لیا تو اس نے پھر تمہیں مضبوط ترین

کڑے کو نہیں ہے مسک بھی اس کے لئے۔

(البقرہ ۲۲۸)

کیونکہ جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگرچہ وہ بھی خدا ہی کی بنائی ہوئی راہیں ہیں اور اسی لئے قرآن میں ان کا نام "سنتہ اللہ" (اللہ کی راہ ہے) اور یہ حق تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ بدلنے کی قدرت کے باوجود بندوں کی سہولت کے لئے جس چیز کی پیدائش کا جو طریقہ جاری فرما دیا گیا ہے، عموماً اسے بدلا نہیں جاتا۔ سنتہ اللہ کی اسی عدم تبدیلی پر ہمارے تمام عقلی قوانین کی قانونیت اور کلیت مبنی ہے اور ان ہی کلیت پر سارے کاروبار کا دار و مدار ہے۔ ورنہ پیدائش کی راہیں اگر روز بدلتی رہتیں تو

کسے بھروسہ ہو سکتا تھا کہ جو چیز جس طریقہ اور جس راہ سے آج پیدا ہوئی ہے۔ کل بھی اسی طریقہ سے پیدا ہوگی، خدا نخواستہ ایسا ہوتا تو زراعت ہو، یا تجارت، صنعت ہو، یا حرفت، دنیا کا کوئی معاشی کام کیا سرانجام پاسکتا تھا؟

مگر ظاہر ہے کہ پیدائش کی عام راہوں کے متعلق ہماری جو معلومات ہیں، سنۃ اللہ کے تمام گوشوں پر ان کے حاوی ہونے کا تو دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ آگ جلاتی ہے بیشک عام آدمیوں کے لئے یہی اللہ کی سنت ہے جو آگ میں کودے گا جلے گا۔ لیکن کون مدعی ہو سکتا ہے کہ اپنے رسولوں اور برگزیدوں کے ساتھ بھی خدا کی یہی سنت اور اس کا یہی برتاؤ ہے۔ پانی میں آدمی ڈوب کر مر جاتا ہے۔ خدا کی یہ سنت ہے۔ لیکن پھلی اسی پانی میں ڈوب کر زندہ رہتی ہے۔ کیا یہ خدا کی سنت نہیں ہے۔ الغرض سنۃ اللہ کی عدم تبدیلی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو علم سنت اللہ کے متعلق ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اس میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی، مگر اسی کے مقابلہ جو پیدا کر رہا ہے۔ وہ خود بھی غیر متبدل اور اس کے متعلق جو ہمارا علم ہے وہ بھی غیر متبدل ہے، پس اسلام کو ان تدبیروں کا بھی احترام کرتا ہے، جو تغیر پذیر معلومات پر مبنی ہیں۔ یعنی ہم جنہیں عقلی تدبیریں کہتے ہیں، اصرار کیا گیا ہے کہ حتیٰ الوسع ان معلومات کے مطابق طریقہ عمل اختیار کرنے میں سستی اور غفلت نہ برتی جائے۔

ولیاخذ واحد رھمۃ ۱۲ سلمتھم
ودالذین کفروالوتغفلون عن
اسلمتھم ۱۲ امتعکم فیملون علیکم
میلۃ واحدۃ ولا جناح علیکم
ان کان بکم اذی من مطر ۱۲ وکنتم
مرضی ۱۲ تضعوا ۱۲ اسلمتھم وخذوا
خذ رکم (النساء ۵)

کو، اور لئے رہو، بچاؤ کے سامان کو۔

اسی قسم کی قرآنی ہدایات کو اگر جمع کیا جائے، تو ان کا ایک ذخیرہ تیار ہو سکتا ہے، ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں تدبیر کے اسی شعبہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جنہیں ہم عقلی تدبیریں کہتے ہیں۔ بیماری وغیرہ میں ہتھیار اتارنے کی اجازت دے کر پھر

خذ وخذ رکم (النساء ۵)

اپنے بچاؤ کے سامان کو پکڑے رہو۔

کے حکم کو بحال رکھنا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تدبیر کے اس شعبے کو بھی اسلام میں کتنی اہمیت ہے، ابو داؤد وترمذی کی مشہور حدیث

من بات و فی یدک سریح غمر
فاصابہ شیئ فلا یلو من ۱۲
نفسہ۔

جورات کو اس طرح سو جائے کہ اس کے ہاتھ
میں آلائش کی بو ہو، اور اسی وجہ سے کوئی (ضرر)
اس کو پہنچے، تو چاہئے کہ ملامت نہ کرے، مگر خود اپنے

آپ کو (بسا اوقات چوہا سانپ یا اسی قسم کے حشرات آدمی کو نقصان اسی بے احتیاطی کی وجہ سے پہنچ جاتا ہے)

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمادی ہے کہ اگر ان تدبیروں کے ترک کرنے سے کسی کو نقصان پہنچے تو اس نقصان کا وہ خود ذمہ دار ہے، پھر ناقص معلومات، ناقص تجربات پر تدبیروں کا جو شعبہ مبنی ہے۔ بے شمار پیچیدہ قوانین سے متعلق ہونیکی وجہ سے تغیر و تبدیلی کے احتمالات سے وہ پاک نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس سلسلے کے غیبی حلقے ہماری نگاہوں سے اوجھل بھی ہیں۔ علاوہ اس کے جن راہوں سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ علم و ادراک وغیرہ کے حیاتی صفات سے بھی عموماً خالی ہوتی ہیں۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے جب تدبیر کے اس شعبہ کو ہم ترک نہیں کر سکتے، نہ عقلاً ترک کر سکتے ہیں نہ ہماری فطرت اس کی اجازت دیتی ہے۔ نہ دین کا یہ حکم ہے۔ تو تدبیر کا وہ شعبہ جو ناقص معلومات پر نہیں بلکہ علم کے لازوال ٹھوس غیر متبدل اساس پر مبنی ہے، بہتوں سے نہیں، بلکہ اس تدبیر میں صرف ایک ہی سے کہنا ہے جو کچھ کہنا ہے، ایک ہی سے پانا ہے جو کچھ پانا ہے، اسی کے ساتھ اگر یہ بھی پیش نظر رکھا جائے کہ تدبیر کی اس راہ میں ہمارا جس سے تعلق ہے، وہ ایک حی و قیوم زندہ و توانا دانا و بینا ذات ہے، صرف یہ ہی نہیں بلکہ رحم و کرم سے بھی معمور ہے۔ رحم الراحمین ہے۔ اپنے رسول کے ذریعہ سے اس نے خود اپنی اس خصوصیت کا اعلان کیا ہے کہ :-

من لم یسأل اللہ یغضب علیہ۔ جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر غصہ

فرماتے ہیں۔ (ترمذی)

من لم یسأل اللہ غضب اللہ علیہ۔ اللہ سے جو نہ مانگے۔ حق تعالیٰ اس پر غصہ

فرماتے ہیں۔ (حصن حصین بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ)

جس کا کام ہی دینا ہے دینے ہی کے لئے بیٹھا ہے، اگر اسی کے حکم

رب المشرق والمغرب الا هو پالنے والا پورب و پرکھیم کا، نہیں ہے کوئی الا اس کے

سوا۔ بس بنا لو اس کو اپنا وکیل۔ (المزل ۲۹)

کی تعمیل کرتے ہوئے مشرق و مغرب کے اسی پالنے والے پر اپنی زندگی کی ضروریات پر ہم بھروسہ اور اعتماد کریں۔ اور اس سے ہم یہ امید رکھیں کہ بہر حال وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا، ہم پر رحم کرے گا، ہماری ضرورتوں کو پوری کرے گا، توبت یا جائے کہ عقلاً و فطرۃ، دنیا و ایماناً ہم اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کا یہ قول جو نقل فرمایا ہے کہ

انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی صا میں اپنے بندے کے خیال کے پاس ہوتا ہوں پس

شاء (متفق علیہ) خیال کرے بندہ میرے متعلق جو چاہے۔

حق تعالیٰ سے ہمیں فطرۃ جو توقع رکھنی چاہیے۔ اس حدیث میں اسی توقع کے قائم کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا

ہے۔ بلاشبہ عقلی تدبیریں ناگزیر تدبیریں ہیں، لیکن جو اصل واقعات کے عالم ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ قطعیت کے لحاظ سے دونوں تدبیروں میں کیا نسبت ہے۔ واقعہ تو یہ ہی ہے جس کا اعتراف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کو خطاب کر کے ان الفاظ میں فرمایا ہے

رب لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین اے میرے رب مجھے میرے حوالہ نہ کیجئے (یعنی بجا

۱۰ اصلح لی شانی کله فانک ان تکلی
 ۱۱ نفسی تکلی ۱۲ لی ضعف و عورة
 و خطیئة و ذنب و ۱۳ لا ۱۴ ثق
 ۱۵ الا برحمتک۔

اپنے آپ مجھے خود اپنے بھروسہ پر نہ چھوڑیے بلکہ
 کے لئے بھی اور سمجھا دیجئے میری باتیں ساری کیونکہ
 اگر آپ نے مجھے میرے سپرد کر دیا تو آپ سوچیں
 دیں گے مجھے صرف کمزوری کو اور عورت کو چھوڑ

کو، گناہ کو، اور میں نہیں بھروسہ کرتا مگر صرف آپ کی رحمت اور مہربانی پر۔

”الٰہی نفسی“ کے الفاظ سے تدبیر کے ان ہی شعبوں کی طرف اشارہ ہے، جن کا تعلق آدمی کے ناقص معلومات، تجربات
 والی ناقص عقل اور اس کے ناقص اختیار و قوی سے ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کرنا تو سب ہی چاہئے، تدبیر کے
 دونوں شعبوں کے حقوق کو ادا کرنا چاہئے۔ لیکن اگر بالفرض ان دو میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ہی پڑے، تو ظاہر ہے
 کہ دیوانوں کے سوا اوکون ہوگا جو پہلے شعبہ کو ترک کر کے دوسرے شعبہ کو اختیار کرے گا۔ پیدا کرنے والے سے اس
 کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے مانگنے اور اسی کے ساتھ پیٹے رہنے میں اگر کچھ نہیں، تو یہی کیا کم ہے کہ غلام کو آفات ہر گشتی
 اور مناجات کی سعادت تو حاصل ہو جاتی ہے۔ ”وابتغوا عند اللہ الرزق“ و اسئلوا من فضلہ (مانگو اللہ سے روزی، مانگو
 اللہ سے اس کے فضل کو) اس حکم کی تعمیل کی وجہ سے

من جاء بالحسنة فله عشر مثا لها
 دس گنا دیا جائے گا۔

جو ایک نیکی لے کر حاضر ہوگا۔ اس کو اسی کے برابر

کی بنیاد پر اس ایک نیکی کے صلے میں دس نیکیوں کے ملنے کا استحقاق تو پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف اس حدیث
 میں اشارہ کیا گیا ہے کہ

ما من عبد یدعو بدعاء الا ۱۰ تا
 ۱۱ اللہ ما سأل ۱۲ و کف عنه من
 ۱۳ السوء ۱۴ و ۱۵ دخر له فی ۱۶ الآخرة
 خیرا منه (حسن حصین ترمذی در زین)

کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ مانگے وہ کوئی دعا پھر
 یا اللہ تعالیٰ اس کی اسی دعا کو پوری فرماتے ہیں
 جو اس نے مانگی تھی، یا کسی برائی (مصیبت بلا) کو
 روک دیتے ہیں۔ یا ذخیرہ کر دیتے ہیں اس کے

لئے الآخرة میں کوئی ایسی چیز جو اس کی مانگی ہوئی چیز سے بہتر ہوگی۔

جس کا یہی مطلب ہوا کہ حصول مقاصد کی یہ تدبیر کسی حال میں ضائع نہیں ہوتی۔ جس مقصد کے لئے یہ تدبیر اختیار کی گئی
 ممکن ہے کسی وجہ سے مانگنے والے کو وہ نہ ملے۔ لیکن کچھ نہ ملے، اس راہ میں یہ نہیں ہو سکتا، اسی لئے بعضوں نے کہا ہے کہ یہ
 مانگنے والوں کو جب روپیہ ہی مل جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ ہماری دعا قبول ہوئی، لیکن بجائے روپیہ کے جب
 دینے والا شرفی دیتا ہے۔ تو جو نہیں جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں دعا قبول نہیں ہوئی۔ اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ کوئی
 دعا مسترد اور نامنظور نہیں ہوتی۔ ان کے کلام کا ایک مطلب یہ ضرور ہو سکتا ہے، شاید اس بنیاد پر اگر ”استجاب“ و ”اجابت“

۱۷ عورت ان کمزوریوں کو کہتے ہیں جنہیں آدمی ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ بس خود ہی جانتا ہے۔ یا اس کا خدا، اور وہ اس کے لئے کوئی اچھا
 لفظ نہیں ہے۔ ناگفتنی چاہا جائے تو نہفتنی بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔ مگر عام طور پر سمجھا نہ جائے گا ۱۲

وغیرہ قرآنی الفاظ کا ترجمہ "قبول کرنا" کر لیا جائے۔ تو اس لحاظ سے اس کی تصحیح ہو سکتی ہے۔ اور فرض بھی کیجئے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ خدا بہر حال خدا ہے بندہ نہیں ہے، اس کا علم اگر ہمارے جہل کا ساتھ نہ دے، اور ہم جو کچھ مانگ رہے ہوں۔ اس کا دینا خود ہمارے لئے یا کسی دوسرے نظم کے اختلال کا باعث ہو، تو پھر بھی تدبیر کا یہ ایسا عمل ہے کہ علاوہ ان مواعید کے جس کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں کیا گیا ہے، یوں بھی اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ دینے والے سے ہمارے تعلقات کی ہمیشہ یہی نوعیت رہنی چاہیے۔ یعنی جو مل جائے اس پر شکر کیا جائے۔ شکر کی خاصیت لئن شکرتہ لا تزدک۔ اگر گن گاؤ گے تم، تو بڑھاتے چلے جائیں گے۔

ہم تمہیں۔

(ابراہیم ۱۲)

قرآن میں بتائی گئی ہے۔ گویا حاصل شدہ نعمتوں کی ترقی کا شکر ایک قرآنی ذریعہ ہے، اور جو نہ ملا، نہ ملنے سے ممکن ہے کچھ صنق ہو، تکلیف ہو۔ لیکن اپنی کوشش سے جو اس تکلیف کو ٹال نہیں سکتا اسے صبر کرنا چاہیے، صبر کے متعلق اولئک علیہم صلوات من ربہم ورحمۃ واولئک ہم المفلحون۔ (البقرہ ۲) یہی لوگ ہیں جن پر صلوات ہیں اُن کے مالک کی طرف سے اور رحمت، اور یہی لوگ راہ یافتہ ہیں۔

کے وعدوں کے سوا صبر کا ایک بڑا عظیم ثمرہ انما یوفی الصابرون اجرہم بغير حساب۔ (الزمر ۷۳) بلاشبہ پورا پورا کر دیا جائے گا صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغير شمار کے۔

بھی بتا دیا گیا ہے اور جو حق تعالیٰ کی معیت و رفاقت کے سرور سے آشنا ہیں۔ ان کو تو واللہ مع الصابرين۔ (البقرہ) کی بشارت ایک سے زیادہ مقامات پر سنائی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تدبیر کی اس راہ میں ملے جب بھی کامیابی ہے، نہ ملے جب بھی کامیابی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری تمام تدبیروں میں اس عجیب و غریب بے خطا تدبیر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے، اپنی معاشی زندگی میں تدبیر کی اس راہ پر چلنے والوں کا سچ پوچھو تو یہی طرزِ عمل اُن کا وہ سلوک بن جاتا ہے۔ جس کے لئے لوگوں نے خواہ مخواہ دنیا کی لذتوں کو ترک کیا، گھر سے چھوٹے، در سے چھوٹے اور پھر جیسا کہ قرآن کے حوالے سے بیان ہو چکا کہ جس مقصد کے لئے سلوک کی یہ راہ وہ اختیار کرتے ہیں، وہ بھی بیچاروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ زندگی کی ان ہی معاشی کش مکشوں میں واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کے لئے روحانی اور معادی ترقیوں کی ایک واضح راہ پیدا کر دی تھی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاشی ضرورتوں کے لئے مذہب کی اس راہ کا استعمال لوگوں نے کیوں ترک کر دیا۔ بدبختوں کا وہ گروہ جس پر رحمت کا دروازہ بند کیا گیا ہے اور اسی لئے دعا کے تاثری نتائج کے متعلق اُن کے دلوں میں انکار پیدا ہو گیا ہے۔ آخر حدیثوں میں جب آیا ہے

من فتح لہ فی الدعاء فتحت لہ باب الرحمة۔ جس کے لئے دعا کی راہ کھولی جائے۔ کھولا گیا ہے کے لئے رحمت کا دروازہ۔

تو دعا میں جن کا جی نہیں لگتا، باایں ہمہ دشواریاں عقلی تدبیروں کی ہر راہ اُن پر آسان ہے۔ لیکن حصول مقصد کی جو آسان

ترین راہ تھی وہی ان کے لئے دشوار ہو گئی۔ تو اس کا مطلب مذکورہ بالا حدیث کی بنیاد پر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو نصیب پر رحمت کا دروازہ اس کے جرائم کی سزائیں بند کر دیا گیا ہے۔ مگر اُن کو تو خیر دُور ماریے، تعجب تو اُن پر ہے کہ جن کی ساری زندگی رحمت حق ہی کی تلاش میں بسر ہوتی ہے۔ انہوں نے آخر کس بنیاد پر تمام دعائی و عبادتی، ایمانی و دینی مشاغل کا رُخ صرف ”الآخرت“ کی طرف پھیر دیا ہے۔ خود بھی اپنی معاشی مشکلات میں ان سے نفع اٹھانا نہیں چاہتے۔ اور ان مسلمانوں پر بھی کم ہمتی کو تاہ نظری کا الزام لگاتے ہیں۔ جو معاد اور الآخرت کے ساتھ ساتھ اپنی دینی اور دعائی زندگی کو معاشی کامیابیوں کا ذریعہ بنا چاہتے ہیں، سن کر مجھے تو حیرت ہوئی جب مجھے یہ سنایا گیا کہ حصول صحت کے لئے دعا مانگنے سے بعضوں نے اس لئے انکار کر دیا کہ اتنے بڑے خدا سے اتنی چھوٹی چیز یعنی دنیا میں تندرست رہنے کی دعا کیا مانگوں۔ کیسی عجیب بات ہے۔ پیغمبر سے پیغمبر کے عم محترم حضرت عباسؓ نے جب پوچھا میں خدا سے کیا مانگوں، تو جواب میں فرمایا گیا۔

یا عمر۔ سللہ العافیۃ۔
 چچا جان! اللہ تعالیٰ سے صحت و تندرستی مانگیے۔

یہ بھی ارشاد فرمایا گیا،

فان احد الم یعط بعد الیقین خیر
 یعنی ایمان کے بعد دنیا میں صحت سے زیادہ بہتر چیز
 من العافیۃ۔
 کسی کو نہیں دی گئی۔

کس قدر تعجب ہے اسلام میں ایک مستقل نماز استسقاء کی صرف اس لئے رکھی گئی ہے کہ مرنے کے بعد نہیں، بلکہ مرنے سے پہلے اسی ”الحیوة الدنیا“ میں آدمی اس نماز کے نتائج سے متمتع و مستفید ہو۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دین کو دُنیا کیلئے استعمال کرنا، کوتاہ نظری ہے۔

قرآن کی ایک پوری سورت میں | اب کہنے والوں کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ عموماً نمازوں میں پڑھی جانے والی چھوٹی حق تعالیٰ کو الہ المعاش بنانا یکا مطالبہ سورتوں میں مشکل ہی سے ایسا کوئی نمازی مسلمان ہوگا، اور جو مسلمان ہے وہ نمازی نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ بہر حال کون نہیں ہے جو سورۃ القریش یعنی عوام جسے لایلف والی سورت کہتے ہیں۔ دن میں متعدد بار فرائض و سنن و نوافل میں اس سورۃ کو نہیں پڑھتا جو معنی نہیں جانتے ہیں۔ کم از کم مطلب تو اس کا سمجھتے ہیں۔ پھر اس پوری سورۃ کا کیا مطلب ہے؟ حق تعالیٰ نے اپنی عبادت کا مطالبہ اس سورۃ میں جس بنیاد پر کیا ہے وہ یہی تو ہے کہ بیت اللہ (کعبہ) کے اس رب کو پوجو جو بھوک میں کھانا کھلاتا اور خوف سے جس نے اسن عطا فرمایا ہے۔ پھر ان دونوں باتوں کا تعلق معاش سے ہے یا معاد سے؟ یہی نہیں بلکہ سورۃ کا آغاز جس ربانی احسان سے کیا گیا ہے۔ اور اس کو ”فلیعبدوا“ (پس پوجو رب ہذا البیت کو) اس مطالبہ کی وجہ قرار دیا گیا ہے وہ ”رحلت الشتاء والصیف“ کا ایلاف ہی تو ہے۔ یعنی تجارتی سفر گرمیا اور سرما کے موسموں میں قریش جو کیا کرتے تھے۔ اور بیت اللہ کے کے محافظ و پڑوسی ہونے کی وجہ سے بے روک ٹوک اندرون عرب اور بیرون عرب میں تجارتی سامانوں کو لے کر گھومتے پھرتے تھے۔ رومی اور ایرانی حکومت نے کعبہ ہی کی نسبت کا خیال کر کے آزاد تجارت کا لائسنس ان کو دے رکھا تھا کیا یہ ساری باتیں معاشی احسانات ہی کے ذیل کی چیزیں نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔ اللہ اللہ کامل ایک پوری سورت میں حق تعالیٰ کو الہ المعاش بنانے کا قرآن میں مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے سوا کوئی دوسرا مضمون اس میں نہیں

بیان کیا گیا ہے، لیکن اس پر بھی کہا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کو الہ المعاش بنا کر یوحنا دون مہتی ہے تنگ نظری ہے بہر حال میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ پیغمبروں کی دعوت کا پہلا کلمہ

یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من

اے میرے لوگو! یوحنا اللہ کو، نہیں تمہارا

الہ سوا اس کے۔

۱۲ غیرہ (سورہ)

کی آیت کو جو قرار دیا ہے، اس کا یہی مطلب ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ جن راہوں سے عمل پیدائش کا ظہور ہو رہا ہے۔ وہ تو خیر عقل و حواس کے پردہ ہیں لیکن خود پیدا کرنے والے سے استفادہ جس فطری جذبہ کی راہنمائی میں دعا و عبادت، نذر و قربانی وغیرہ مختلف اشغال و اعمال کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ اس جذبے کے تعلق کا مستحق اللہ کی ذات مبارک کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں، اُسی کی دوسری تعبیر یہ ہے۔۔۔۔۔ کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی الہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زندگی ہو یا مرنے کے بعد جو آنے والی زندگی، ہر زندگی کی ضرورتوں سے استفادہ کی اس تدبیر کا تعلق ہے۔ یعنی اللہ ہمارا الہ ان حاجتوں اور ضرورتوں میں بھی ہے۔ جن کے ہم اس ”الحیۃ الدنیا“ میں محتاج ہیں، اور ان میں بھی جو ”الحیۃ الاخری“ میں پیش آنے والی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ ہی ہمارا ”الہ الدنیا“ بھی ہے اور ”الہ الاخرہ“ بھی۔ یقیناً پیغمبروں نے حق تعالیٰ کی الوہیت کو ”الدنیا یا الاخرہ“ کسی ایک کی ضرورتوں کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے، بلکہ عموماً اس دعوت کا خطاب جن لوگوں سے تھا۔ اور جن کی غلطی کی تصحیح مقصود تھی۔ چونکہ استفادہ کی اس تدبیر کو عموماً وہ معاشی مشکلات ہی کی راہوں میں استعمال کرتے تھے، یعنی غیر اللہ کو الہ بنا کر جو کچھ مانگا جاتا تھا، وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں مثلاً بارش برساتی جائے، مویشیوں کا دودھ اور ان کی نسل بڑھائی جائے۔ کھیتوں کی پیداواروں میں برکت دی جائے۔ آفتوں سے محفوظ رکھ کر باغوں کو پھلوں سے بھر دیا جائے، قحط کا ازالہ ہو، بیماریاں اور وباؤں سے ملک کو محفوظ رکھا جائے اقبال مند اولاد بخشی جائے۔ دشمنوں پر فتح حاصل ہو، انی غیر ذلک من الامور المعاشیۃ، یقیناً غیر اللہ کی پوجا پاٹ، دعا و عبادت، نذر و قربانی وغیرہ سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، عموماً اسی قسم کی چیزوں کا مطالبہ کیا جاتا تھا اور غیر اللہ کو الہ بنا کر جو انھیں پوجتے ہیں ان کی غرض بھی یہی ہوتی تھی۔ اور اب بھی اس مسلک کے جو پابند ہیں۔ ان کی غرض بھی یہی ہوتی ہے۔

اصنامی نظام | اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ مشرک قوموں کا یہ نظام جس کا دوسرا نام اصنامی نظام ہے۔ یہ معاشی نظام ہے | اصنامی نظام بالکل ان قوموں کا ایک مستقل معاشی نظام تھا۔ آج بھی دنیا میں جہاں کہیں یہ نظام موجود ہے۔ بجز معاشی ضرورتوں کے ان سے قطعاً کوئی دوسرا کام نہیں لیا جاتا۔ کسی بت پرست کو نہیں دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے الہ یا معبودوں اور دیوتاؤں سے یہ مانگتا ہو کہ اُسے عذابِ قبر سے بچا یا جائے۔ جہنم کی پریشانیوں میں مدد کی جائے۔ جہنم سے محفوظ رکھ کر جنت کی ابدی زندگی عطا کی جائے۔ ان نیک کاموں کی توفیق دی جائے۔ جن سے مرنے کے بعد سکون حاصل ہو، بلکہ جو کچھ مانگا جاتا ہے۔ وہ اسی دنیا کی ضرورتوں کے متعلق مانگا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ان سے پیغمبروں کا جو یہ مطالبہ تھا کہ بچائے غیر اللہ کے حق تعالیٰ ہی کو اپنا الہ بناؤ۔ مخاطب کے طرز عمل کی بنیاد پر اس مطالبہ کی سب سے پہلی غرض یہی ہو سکتی ہے کہ جن حاجتوں اور ضرورتوں کے لئے تم

غیر اللہ کو الہ بنائے ہوئے ہو، ان ہی حاجتوں اور ضرورتوں کے لئے بجائے اُن کے حق تعالیٰ کو اپنا الہ بناؤ چونکہ وہ اپنی دنیاوی حاجتوں اور ضرورتوں میں غیر اللہ کو الہ بنائے ہوئے تھے، اس لئے کھلا ہوا مطلب یہی ہوا کہ اللہ کو الہ بنانے کا اُن سے جو مطالبہ کیا جاتا تھا۔ اس مطالبہ میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جن اغراض کے لئے تم غیر اللہ کو الہ بنائے ہوئے ہو، اُن کے لئے بھی خالق حق تعالیٰ ہی کو اپنا الہ تمہیں بنانا چاہیے۔ اور جب یہ واقعہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اسی اللہ کو ان ہی دنیاوی حاجتوں اور ضرورتوں اور معاشی مشکلات کے لئے الہ بنانا، یکایک تنگ نظری اور سست ہمتی کیوں ٹھیرادی گئی، حالانکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا دعوتِ انبیاء کے اس کلمہ کا ابتدائی اور اَوّلیٰ رُخ دنیاوی زندگی ہی کی پیچیدگیاں ہیں، لوگ کسی غلبہ حال اور ذوق و سرمستی کے زور میں ایک بات کہہ دیتے ہیں۔ لیکن آئندہ اس کے نتائج پر ان کی نظر نہیں ہوتی، پھر جب اس کے برے نتائج سامنے آجاتے ہیں تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہو گیا، یہی مسئلہ ہے! ابتدا میں تو بیچاری دنیاوی دنیا، نجس و ناپاک کی ضرورتوں کو حقیر آنی جانی فانی ناقابل لحاظ غیر اہم ضرورتیں قرار دے کر خود بخود دیر رائے قائم کر لی گئی کہ حق تعالیٰ کی عظیم و برتر مہستی کے سامنے بھلا ایسی ہلکی چھوٹی موٹی بلکہ چھپوری ضرورتیں کیا پیش کی جائیں۔ اُن کے لئے تو عقلی تدبیریں کافی ہیں۔ البتہ آئندہ زندگی کے ہولناک مصائب مدہش جاں گسٹاں خطرات اس قابل ہیں کہ اُن کے واسطے اللہ تعالیٰ سے التجا کی جائے کہ وہی ضرورتیں اس کی شایانِ شان ہیں لیکن معاشی ضرورتوں اور دنیاوی حاجتوں میں پٹا ہوا انسان بیرونی موثرات کے تحت کچھ دن تو ممکن ہے، دنیاوی ضرورتوں کے حصول میں استفادہ کے اس طریقہ سے رُک جائے یعنی دنیاوی ضرورتوں اور معاشی حاجتوں میں اللہ کو اپنا الہ نہ بنائے۔ اور ان کے لئے محض عقلی تدبیروں کو کافی سمجھے لیکن آدمی کا غیب طلب خیال ذہن زیادہ دن تک ناقص عقل کے ناقص معلومات ناقص تجربات والی تدبیروں پر بھروسہ کر کے ہمیشہ کے لئے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا، ہر ضرورت کی پیدائش میں محسوس قوانین و ضوابط کے پیچھے اس کی فطرت اشارہ کرتی ہے کہ نامحسوس اسباب کی بھی کڑیاں ہیں، وہ پاتا ہے کہ عقل کی راہ سے قابو میں زیادہ سے زیادہ وہی حلقے آسکتے ہیں جن تک حواس کی اعانت سے عقل پہنچ سکتی ہے۔ لیکن اس دائرہ ہے جو باہر ہیں۔ ان کے متعلق مطمئن ہونے کی کیا صورت ہے۔

یہی نازک وقت ہوتا ہے کہ معاشی ضرورتوں کے غیبی سوالات کے متعلق اس کی راہنمائی اگر واقعی الہ یعنی اُن ضرورتوں کے حقیقی پیدا کرنے والے خالق کی طرف نہیں کی گئی، تو احساس ضرورت کی شدت سے بے چین ہو ہو کر گھبرا کر ان ہی چیزوں کو وہ الہ بنا لیتا ہے۔ جن کے متعلق وہ خود ہی جانتا ہے کہ پیدا کرنے کے عمل کا اُن سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر باوجود اس علم کے کہ جو پیدا کر رہا ہے۔ ہم اس سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزیں نہیں مانگ رہے ہیں پھر بھی مانگتا اسی سے ہے۔ اصنامی نظام والوں کے سامنے اپنے علم اور عمل کے تناقض کا یہ سوال ہمیشہ آتا رہتا ہے مگر چونکہ ایک غلطی دوسری غلطی کو پیدا کرتی ہے۔ کچھ اپنی قومی روایات کی پیروی، رسم و رواج کا دباؤ، بہر حال اُن کو مجبور کرتا ہے کہ علم و عمل کے اس تضاد میں توافق پیدا کیا جائے۔ پھر اس راہ میں تو جیہوں اور تاویلوں کا جواب کھولا گیا۔ اس کا قصہ طویل ہے۔ انتہایہ ہو گئی کہ یونانیوں کے اصنامی نظام کی تصحیح کے لئے جب ارسطو آمادہ ہوا تو اس کو بالآخر یہ دعویٰ کرنا پڑا کہ خدا ایک ہے اور ایک ایک ہی چیز کو پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہی اس کی خالص حدت کا

انتہائی کمال ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جب ہر چیز کا وہ خالق ہی نہیں ہے تو ہر چیز اس سے مانگی کیوں جائے۔ مگر اسی کے ساتھ ارسطو کا یہ قول بھی تھا کہ مادہ پر تمام صورتوں کا فیضان اول حق ہی سے ہوتا ہے۔ یعنی ہر چیز کا خالق وہی ہے۔ اور یہ اس فطری علم کا زور تھا جس کی قرآن نے خبر دی ہے۔ آج کون ہے جو ارسطو کے اس دماغی خبط کو سلجھا سکے، اور یہ تو فلسفہ کے پُر رعب نام سے خواص کو مطمئن کیا جاتا تھا۔ مشرکین کے عوام کو تمثیل کے مغالطہ میں مبتلا کیا گیا، خدا کو انسانی بادشاہ فرض کر کے باور کرایا گیا کہ گو سب حکم و احکام بادشاہ ہی کے چلتے ہیں۔ لیکن بہر حال بادشاہ سے کوئی چیز اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ماتحت حکام کو بھی خوشامدوں سے راضی کیا جائے۔ ان کے پاس کچھ تحفے تحائف کی ڈالیاں پیش کی جائیں۔ لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ بادشاہ تو اہل غرض کے حال سے ناواقف ہوتا ہے، مجبوراً اپنے ماتحت حاکموں سے اسے علم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ماتحتوں کو بھی راضی رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ بادشاہ کے پاس اہل غرض کے حسبِ منشاء رپورٹ کریں۔ عایموں سے پوچھا جاتا ہے کہ خدا جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور خالق ہے۔ وہ کیا کسی چیز سے ناواقف بھی رہ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمی کا فطری علم اس سوال کے جواب میں بجز استغفر اللہ کے اور کیا کہہ سکتا ہے۔

بہر حال باوجود ان تمام حماقتوں اور تہافتوں کے پھر بھی معاشی ضرورتوں کے لئے غیر اللہ کو لوگ الہ بناتے ہوئے چلے ہی جاتے ہیں اور یہ صرف ایک غلطی کا نتیجہ ہے کہ دنیاوی ضرورتوں کو اللہ کے آگے پیش کرتا اس کی شان سے بلاوجہ گری ہوئی بات قرار دی گئی۔ یہی وہ راز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ

۱۱ ارسطو نے اس کے بعد عقول عشرہ کے نظریہ کے ساتھ ہر فلک میں ایک مجرد روح اور ایک حیوانی نفس کو ثابت کر کے گویا یونانیوں کے دیوتاؤں اور دیویوں کے وجود کو فلسفہ دیا، انہمیاں کو تو مغول اللہ بنا کر وحدت کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا مجبوراً اگر آدمی ان ہی زندہ روحوں سے نہ مانگے تو اور کیا کرے۔ اشرقیہ نے ریا نوع کے نظریہ سے اصنامی نظام کی تصحیح کی، اس لئے میر خیال ہے کہ الہیات کے نام سے اٹو لوجیا کا جو ترجمہ یونانی زبان سے عربی میں ہوا۔ یہ دراصل وثنیت اور شرک بت پرستی کا علم کلام تھا جس میں اٹو لوجی (خرافیات) میں ان کا ملک مبتلا تھا! اسی کو اٹو لوجی (مقیالوجی) کا نام دیکر انھوں نے فلسفیانہ تعبیروں کے زور سے اسے فلسفے کی شاخ بنا لیا ۱۲

۱۲ وہ شفاعت جو بادشاہ کے جہل و رنہ واقفیت پر مبنی ہوتی ہے، چونکہ حق تعالیٰ میں اس کی گنجائش نہیں اس لئے عوام کو سکھایا جاتا ہے کہ شفاعت کے دوسرے پہلو سے فائدہ اٹھائیں یعنی ہم گنہگار ہیں حق تعالیٰ ہماری بات سن نہیں سکتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شفاعت کے اس پہلو میں بھی تو پہلے ضرورت اس کی ہے کہ جس کا آدمی خطا کار ہے اس کی نگاہوں میں کم از کم اتنی وقعت تو پیدا کر لے کہ خود اس کے کہنے سے نہیں تو کسی قابل احترام معزز ہستی کے کہنے سے اس پر رحم کیا جائے اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سفارش کرنے والوں کی نہیں۔ بلکہ جس کے پاس سفارش کرنا مقصود ہو۔ ممکنہ حد تک اس کو راضی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسی کو شفاعت ماذونہ کہتے ہیں۔ قرآن میں جہل والی شفاعت اور شفاعت ماذونہ دونوں کا ذکر کر کے شفاعت کی پہلی قسم کو حق تعالیٰ کی شان سے بعید قرار دے کر دوسری قسم کی تصحیح کی گئی ہے جو حق تعالیٰ کی اجازت اور اذن پر موقوف ہے، اور اسی لئے اس شفاعت کے حاصل کرنے کے لئے شفاعت کرنے والوں کی عبادت و خوشامد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اُسی کی عبادت اُسی کی منت و سماجت کی جس کے اذن و اجازت پر یہ شفاعت موقوف ہے ۱۲

یسال احد کم ربہ حاجاتہ کلہا
حتی یسال شسع نعلہ ۲۲ قطع
(رواہ الترمذی)

چاہیے کہ تم میں سے ہر کوئی مانگا کرے خدا سے
اپنی ہر حاجت کو۔ حتیٰ کہ مانگے اللہ سے قسم
جوئی کا جب وہ ٹوٹ جائے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ

حتیٰ صلح عجیبہ

حتیٰ کہ اپنے خمیر کا نمک بھی۔

مطلب یہی تھا کہ جب ہر چیز چھوٹی ہو یا بڑی۔ دنیا کی ہو یا آخرت کی۔ سب کی پیدا کرنے والی تنہا حق تعالیٰ کی ذات مبارک ہے۔ تو پیدا کرنے والوں سے ان چیزوں کے حاصل کرنے کا جو طریقہ ہے۔ اس طریقہ سے بڑی ہی چیزیں، یا آخرت ہی کی چیزیں کیوں مانگی جائیں۔ بلکہ سب کچھ مانگنا چاہیے حتیٰ کہ خمیر میں ڈالنے کے نمک کی لنگریاں وہ بھی، کاش! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے جو مقصد مبارک تھا۔ وہ سمجھ لیا جاتا تو معاشی ضرورتوں کے لئے اللہ کو الہ بنانے کا طریقہ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں سے مفقود نہ ہو جاتا۔ اور بالآخر امت اسلامیہ کے ایک بڑے طبقہ نے ان ہی معاشی حاجتوں اور ضرورتوں کے لئے مختلف ناموں سے جو الہ آج تراش لئے ہیں، اور جسے دیکھ دیکھ کر اہل ایمان کا کلیجہ پھٹا چلا جاتا ہے، کہ ایک طرف غربت و فلاکت کے ان دنوں میں آج بھی مسلمانوں کی روٹ ان کا وقت ان کی توانائیوں کی بہت بڑی مقدار ان لا حاصل تدبیروں پر صرف ہو رہی ہے، اور یہ تو دنیا میں ہو رہا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس سلسلے میں کتنوں کے اعمال و افعال شرک جلی کے ان حدود تک پہنچے ہوئے ہیں جنکے بعد اخروی زندگی کی ان تباہیوں سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ جس کی تلافی پھر کسی وقت کسی صورت سے ممکن نہیں کہ

۱۲ اللہ لا یغفر ۱۲ یشرک بہ
قطعاً خدا نہیں بخشتا یہ بات کہ شرک ٹھیرایا جائے
اس کے ساتھ کسی کو۔
(النساء ۴۸)

قرآن کا اٹل اور قطعی فیصلہ ہے۔

معذرت | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک ”معاشیاتی مقالہ“ میں شرک و توحید، عبادت و دعا کے ان مباحث و مسائل کا ذکر اور وہ بھی اتنی دراز نفسیوں کے ساتھ بظاہر دیکھنے والوں کو عجیب معلوم ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں اسلامی معاشیات کو بیان کر رہا ہوں۔ نہ کہ عصری معاشیات و اقتصادیات کے مسائل پر میں نے قلم اٹھایا ہے میری یہ علمی حیانت اور بددیانتی ہوتی کہ معاشیاتی فلاح و بہبود کے سلسلے میں اسلام نے جو تدبیریں پیش کی ہیں ان تدبیروں میں سے کسی جز کو ابنا زمانہ کے متحضر اور ٹھٹھوں کے خوف سے قلم انداز کر دیتا۔ حصول رزق کی راہ میں عقلی تدبیروں کے ساتھ ساتھ اللہ کو الہ بنانے کی مقدس تدبیر سے آج دنوں میں جو اعراض و انحراف پیدا ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان پر ہماری باتیں ضرور گراں گذر رہی ہوں گی، ان کے قلوب مجھ پر افسوس اور عقل قہقہے لگا رہی ہوگی۔ ایسوں کے آگے قرآنی آیت

کیا یہ جوتہیں روزی پہنچا رہا ہے۔ اگر روک لے
اپنی روزی کو؟ بلکہ یہ غوطے کھا رہے ہیں سرشتی
اور بچڑک ہیں۔

۱۲ من ہذا الذی یوزقکم ۱۲
۱۲ مسک رزقہ بل لحو ۱۲ فی عتو و نفور
(الملك ۲۹)

پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں جن دلوں میں اب تک اس کا یقین باقی ہے کہ جو پڑھا گیا وہ کسی بندے کا نہیں بلکہ رزاق ذوالقوۃ المتین کا کلام ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے سننے کے بعد وہ کیوں نہ لرزائیں گے، نہ سوچنے والوں کو کیا کہئے۔ آج حصول معاش کی راہ میں تدبیر کے اس شعبہ کو غلط طریقے سے استعمال کرنے والے دنیا کے بڑے بڑے علاقوں میں لاکھوں اور کروڑوں روپے صرف کر رہے ہیں۔ اور آج کیا ہمیشہ مختلف اقوام و اُمم کے قدیم آثار کو جا کر دیکھا جائے۔ اصنامی نظام جس کے متعلق میں بتا چکا کہ بالکل وہ ایک معاشی نظام ہے۔ اس کی بقا و استحکام، اور اس نظام کے متعلقہ معلومات و اکتشافات کی مہارت کے مدعیوں کی اعانت و امداد میں عوام و خواص بلکہ ہر ملک کی حکومتوں نے یقیناً اس سے زیادہ اور بہت زیادہ صرف کیا ہے جتنا اس زمانے میں موجودہ معاشی تدبیروں کی پابجائی میں پبلک اور حکومتیں، بنکوں، بیمہ کمپنیوں، اتحادی انجمنوں، اور معاشیات کے پروفیسروں، کتابوں وغیرہ پر خرچ کر رہی ہیں، دنیا کا ایک ایک منہ موجودہ عہد کے دن دن کا لحوں کی قائم مقامی کر سکتا ہے۔ اس زمانے کا ایک ایک بچہ بڑی بڑی جاگیروں کا مالک تھا، اتنی بڑی کہ عصر حاضر کے دن دن ماہرین معاشیات کی تنخواہیں اس سے ادا ہو سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اصنامی نظام حصول معاش کی قطعاً بے بنیاد، بے حاصل تدبیر تھی، اسلام اور اسلامی تعلیمات کے سوا آج دنیا میں کس کے پاس ایسی طاقت ہے جو حصول معاش کے اس غلط نظام سے انسانیت کو نجات بخشنے، اور بنی آدم کی کمائی ہوئی آمدنیاں، خداداد توانائیاں اس راہ میں جو بلا وجہ ضائع ہو رہی ہیں، اُن کا اسناد کرے؟

یہی غرض تھی جس کی وجہ سے اس باب میں مجھے کافی طوالت سے کام لینا پڑا۔ لیکن جو کچھ کہا گیا ہے جس طریقہ سے کہا گیا ہے۔ اگر خلاص و صداقت سے اس کی اشاعت کی گئی، تو جو معاشی خدمت کسی سے بن نہیں آئی ہو اسلام کے ذریعہ سے انشاء اللہ تعالیٰ اس میں ضرور کامیابی ہوگی واللہ غالب علیٰ امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ خلاصہ یہ ہے کہ آلہ باطلہ (غلط معبودوں) سے انسانیت کا معاشی تعلق اس وقت تک ٹوٹ نہیں سکتا، قطعاً نہیں ٹوٹ سکتا جب تک کہ پیدا کرنے والا خالق (اللہ) الہ المعاش بھی بن کر اس کے سامنے نہ آجائے۔ ایسا الہ المعاش جو ہر وقت ہر حال میں ہر جگہ اس کے ساتھ ہو، اس کے پاس ہو، اس کو محیط ہو، ظاہر و باطن اول و آخر سب پر وہی حاوی ہو جائے چھا جائے، آج فکری انقلاب اور اعتقادی ہلچل پیدا کرنے والی کتابوں میں قرآن کے سوا اور کوئی ایسی کتاب نسلِ آدم کے پاس موجود ہے جس سے بوجہ الاثم اس ناگزیر انسانی ضرورت کے حل کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ وہی انسان جو زندگی کے تمام شعبوں میں اعانت تو حق تعالیٰ سے حاصل کر رہا تھا۔ لیکن بھن دوہرو

۱۔ اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ اس نظام کے تحت زندگی گزارنے والوں کے نہ اخلاقی پہلوؤں پر اس نظام کا کوئی اثر مرتب ہوتا ہے اور نہ اخروی زندگی کے عملی پہلوؤں میں کوئی جنبش و حرکت پیدا ہوتی ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جن آلہ اور دیوتاؤں کو اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے یہ پوجتے ہیں۔ نہ ان کی طرف سے اُن کو کوئی ایمن حیات اور دستور اخلاق ملتا ہے۔ نہ مرنے کے بعد ان معبودوں اور ان کے پوجنے والوں میں کسی آنے والے تعلق کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اسی لئے ایک خالص مادہ پرست اور رُبت پرست کی زندگی میں ان حیثیتوں سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں اصنامی نظام کو بجائے مذہبی نظام قرار دینے کے ایک خالص معاشی نظام سمجھتا ہوں ۱۲

گار ہاتھ، یقیناً اسی کتاب نے ایسا کسٹعین (ہم تجھی سے تیری ہی پیدا کی ہوئی چیزوں سے مدد حاصل کر رہے ہیں) کے اقرار کرنے والی فطرتوں، جیلوں کو ایسا کسٹعین (یعنی اسی لئے تجھ ہی کو، پوجتے ہیں اور تجھ ہی سے مانگتے ہیں) کے صراطِ مستقیم پر چلا دیا، اسی کی بے لاگ، خرخشوں، دغدغوں سے بالکل پاک آسمانی آواز کا زور تھا کہ دفعتاً روئے زمین کے بڑے حصوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا جو واقعی مستعآن تھا۔ وہی ان کا معبود بھی بن گیا۔ اور خواہ دوسروں کی کچھ ہی رائے ہو۔ لیکن میرے نزدیک تو آدمی جس کا کھارہا ہے۔ اسی کا گن گائے۔ اس مقصد میں کامیابی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ لہ (الآخرۃ) لہ (الآخرۃ) اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے) کے ساتھ لہ (الاولیٰ) (دنیا کے معاملات بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں) کے قرآنی یقین کو بھی دلوں میں پوری طاقت کے ساتھ بیدار نہ کیا جائے اور یہ کہ

من کان یرید ثواباً لدنیا فعند اللہ

جو چاہتا ہے دنیا، تو اللہ کے پاس دنیا کا

ثواب بھی ہے اور الآخرۃ کا بھی۔

ثواب لدنیا والآخرۃ (النساء ۵۱)

کے صلائے عام کو دنیا کے آخری کناروں تک پہنچانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھانا رکھا جائے۔ جو واقعہ ہے وہ کہا جائے گا۔ اور کہنے سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا کہ ببلاتے بچوں، بے سہارا عورتوں کی فکر میں چور بھوکے پیٹ اور تنگ بدن والے پر اگندہ روزی، پر اگندہ دل۔ انسان کی تسلی نہ ان لمبے چوڑے وعدوں فقط وعدوں سے ہو سکتی ہے۔ جن کی تجارت تعلیمی حلقوں اور اشاعتی اداروں، اقتصادیات و معاشیات، اکاؤنٹی و کفایت شعاری وغیرہ مختلف پر شوکت ناموں سے اس دعویٰ کے ساتھ ہو رہی ہے کہ جو کچھ محسوس ہو رہا ہے، پیدائش کی ان ہی راہوں اور صحت ان ہی راہوں کو عقل کے قابو میں لانے کے ساتھ ہی وہ سب کچھ مل جائے گا، جس کے بغیر آدمی دل کے چین اور جان کے آرام سے محروم ہے۔ اور نہ محفل حال کی ان راہباز خیالی اور صرف خیالی بلند پروازیوں اس زمینی انسان کو آسمانی فرشتہ بنا کر اتنا وسیع النظر، رفیع العزم بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہیں کہ اپنی معاشی ضرورتوں کو مذہبی جذبے کی راہنمائی میں غیب سے حاصل کرنے میں وہ شرماتے لگے۔ یقیناً وہ ہو سکتا ہے اور نہ یہ، پھر وہی صورتیں ہیں۔ کروڑ ہا کروڑ روپوں کی تھیلیاں ہر سال معاشی استفادے کے بے بنیاد وہم کی شکار ہو کر باطل الہ وہی معبودوں، من مانے اختراعی ڈھکوسلوں کی راہوں میں قومیں جو دنیا کے اکثر حصوں میں لٹا رہی ہیں، بے دریغ انتہائی بے دردی کے ساتھ لٹا رہی ہیں۔ خدا کے لئے نہ سہی، انسانیت ہی کے تمام فرائض کو بالائے طاق رکھ کر ٹھکرا کر اسٹیں لٹنے دیا جائے، اقتصادِ نظام اور معاشی جسد کے اس ناسور کو چھوڑ دیا جائے۔ انتہائی بے رحمی کے ساتھ بہنے، بہتے رہنے کے لئے چھوڑ دیا جائے صرف اس قوم کے جاہلانہ اکرہی مغالطہ کے نیچے دب کر چھوڑ دیا جائے۔ جو کار کے رنگوں اور نکٹائی کے بندشوں کی غلطیوں کے ٹوکنے کو بھی اپنا (ایٹیٹی کٹی) یا آدابی فرض اور حق خیال کرتی ہے۔ لیکن مذہب کے نام سے خواہ کتنی ہی خطرناک مہلک ہمالیائی غلطی کا ارتکاب کیا جا رہا ہو، اہلوں کو باور کرایا گیا ہے کہ اس کے متعلق لب ہلانا بھی جرم اور بدترین روادارانہ جرم ہے، پس اس جرم سے بچنے کے لئے خدا کے مجرم اور انسانیت کے مجرم بننے پر صبر کر لیا جائے، یا پھر پیاسے کو پانی دے کر پیشاب پینے سے، بھوکے کو روٹی دے کر کیچڑ کھانے سے روک دیا جائے، دوسرے نفلوں میں جو واقعی پیدا کرنے والا ہے اسی کو آدمیوں کا الہ المعاش بنا کر ان چھوٹے اور چھوٹے معاشی الہوں سے نجات بخشی جائے اور یوں آخری خساروں کے ساتھ اس عظیم لا حاصل معاشی تاوان سے انسان کے معاشی نظام کو بچا لیا جائے۔

اس دشواری کے | یوں کہنے کے لئے، آدمی کی زبان جس چیز کو چاہے، دشواری یا ناممکن ٹھیرالے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اللہ ہی حل کی سہولت | کو لوگ اپنا ایمان لیں یہ غالباً اتنی آسان بات تھی کہ شاید ہی دنیا کا کوئی لاہوتی یا معاشی مسئلہ اتنا آسان ہو۔ آخر اللہ کو الہ بنانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ کسی دوسرے سے نہیں بلکہ پیدا کرنے والے ہی سے اس کی پیداواروں کو مانگا جائے، بتایا جا چکا ہے کہ علم و یقین کی جس لازوال اساس پر تدبیر کا یہ شعبہ مبنی ہے یعنی یہ مقدمہ کو ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے، یہ ایسا دعویٰ ہے کہ جس پر سبھی پیش کیا جاتا ہے۔ وہ قدرت کی طرف سے اس دعویٰ کے ”وجدان“ کو اپنی فطرت کے خمیر میں گندھا ہوا پاتا ہے، معمولی تنبیہ سے اس میں یہ شعور چمکا ٹھکتا ہے کہ خلق و ربوبیت کی توحید کا یہ اقرار اس کی جو ہر ذات میں گھلا ہوا ہے، قرآن نے اس کی خبر دی ہے، تجربہ اس کا شاہد ہے، ظاہر ہے کہ اس کا یہی مطلب ہوا کہ قدرت نے خود کافی ہو کر استدلال و احتجاج کے تمام جھنجھٹوں سے اس مسئلہ میں ہمیں بے نیاز کر دیا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے تو پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے مانگنے کے لئے

یہ کہ پوجتے رہنا مجھ ہی کو، یہی ہے راہ سیدھی۔

ان۲ عبد و فی هذا صراط مستقیم (یسین ۲۲)

کی تعمیل کے سوا آدمی کے لئے چارہ کار ہی کیا رہ جاتا ہے، اور اللہ کو الہ مان لینے کے ساتھ ہی الہ باطلہ کا نظام دہم برہم ہو کر علاوہ اخروی فوائد کے معاشی خساروں اور تاوانوں کی وہ ساری راہیں دفعتاً خود بخود مسدود ہو جاتی ہیں جن کی بے حاصلی کو دیکھ دیکھ کر بصیرت والوں نے ہمیشہ خون کے آنسو بہائے۔

الملائکہ یا زندہ روحوں کے | ان اس سلسلہ میں قرآن اور کیا کرتا، خدا کے سوا کسی دوسرے کے متعلق پیدا کرنے متعلق قرآن کا بیان | یا خالق ہونے کا شبہ نہ کبھی ہوا نہ ہو سکتا تھا، لیکن یہ واقعہ تھا کہ پیدائش کے محسوس ذرائع کی چونکہ ان غیبی زندہ ذرائع اور قوتوں پر انتہا ہوتی تھی جن کا مختلف ممالک میں ”الملائکہ“ ”فرشتے“ ”دیوتا“ وغیرہ نام تھا، زیادہ سے زیادہ اگر الوہیت کا کچھ اندیشہ ہو سکتا تھا اور اکثر لوگ کو ہوا تو وہ یہی ”الملائکہ“ ہو سکتے تھے۔ اگرچہ ان کو خالق اور پیدا کرنے والا نہ سمجھنا ان کے الہ ہونے کی تغلیط و تکذیب کے لئے کافی تھا۔ لیکن آدم کو اطمینان تک کہ کلہم اجمعون کا مسجود تبارک ان لا حاصل مصارف کے دروازے جو ان کی پوجا پاٹ میں کھلے ہوئے تھے۔ قرآن نے اچانک بند کر دیئے۔ آخر جب انسان اور اس کی انسانیت کا مقام اتنا بلند ہے کہ ان ہی دیوتاؤں یا ”الملائکہ“ کو آدم کے سجدے میں گرایا گیا، تو پھر سلسلہ کائنات و مخلوقات کی اور کون سی ہستی اس کی مستحق رہ جاتی ہے جس کے آگے آدمی جھکے موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلیوں کو مخاطب کر کے کتنی صحیح بات فرمائی تھی جسے قرآن نے بھی نقل کیا

موسیٰ نے کہا کیا اللہ کے سوا تمہارے لئے

قل ۲ غیر اللہ ۲ بعیکم الہا و هو فضلكم

کوئی اور الہ ڈھونڈھوں، حالانکہ اس نے تو برتر

علی ۲ العالمین۔

(الاعراف ۹)

بخشی ہے تمہیں سارے جہان پر۔

ترجمان الاسلام مغفور ڈاکٹر اقبال نور اللہ مرقدہ نے قرآن کی اسی قسم کی آیتوں کے مفاد کی تعبیر اپنے اس مشہور شعر میں کی تھی
در دست جنوں من اجر میل زبوں صیدے
یزدال یکند اوراے ہمت مردانہ

انسانیت کے بلند مقام اور اصنامی نظام میں اس کی جو درگت بنی ہے مولانا روم نے بھی ع
مفروضہ خوش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

ایک معاشی مسائل کی کتاب میں اس خالص مذہبی سوال پر بحث پڑھنے والوں کے لئے خواہ ایک بے محل گفتگو
ہی کیوں نظر نہ آئے لیکن کیا کروں آئندہ پیش آنے والے معادی مصائب و شدائد کے سوا میری آنکھیں جن معاشی تباہیوں کا
مشاہدہ اس راہ کی غلطیوں کی وجہ سے کر رہی ہیں، بے دردی کے ساتھ اصنامی نظام کے ٹھیکیداروں نے انسانی
توانائیوں کی کمائی ہوئی دولت پر دھاوا بول دیا ہے، ضرورتوں اور حاجتوں میں جکڑے ہوئے انسان کی عقلی کمزوری
وہی میلانات سے نفع اٹھا کر ان پر ظلم روا رکھا گیا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ بے دینوں کا طبقہ دین اور دھرم ہی کے نام
سے کر رہا ہے، جو کچھ کر رہا ہے، مذہب کا نام سن کر دنیا چپ ہو جاتی ہے، سب کچھ جاننے اور سب کچھ سمجھنے کے
باوجود چھوڑ دیا گیا ہے کہ انسان نما درندوں کا یہ گروہ جاہل انسانوں کو بھاڑے اور بھاڑ کر کھا جائے مرنے
کے بعد جو کچھ سامنے آنے والا ہے، اگر دلوں میں اس سے ڈر نہیں پیدا ہوتا تو کم از کم ان معاشی تباہیوں کی رُک
تھام کے لئے انسانیت کے ہی خواہموں کو اٹھنا چاہیے۔ بیٹریوں کے منہ سے آدمی کے بچوں کو چھڑانا چاہیے۔

علمائے اسلام کا وہ طبقہ جو عام مسلمانوں میں شیخ سڈو کے بکروں، خواجہ خفرائی بٹیروں، اور ازیں قبیل
بیسلیوں اور ہامی خرافات کو دیکھ دیکھ کر کھٹکتا رہتا ہے، اور منبر و محراب کو اپنی ڈانٹوں اور جھڑکیوں سے ہلائے ہوئے
ہے۔ اس سے میں پوچھتا ہوں کہ باوجود سب کچھ کہنے، سب کچھ سنانے کے آپ کی تقریروں کا اثر آپ کے مصلو
سے باہر کیوں محسوس نہیں ہوتا، آپ کی دھکیاں صرف مسجدوں اور مدرسوں کی دیواروں سے ٹکر کر صرف آپ ہی کی
طرف کیوں واپس ہو رہی ہیں، کیا بات ہے کہ تاویلوں اور توجیہوں کی آڑ میں کرنے والے وہ سب کچھ کر رہے ہیں
جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال تو یقیناً غلط ہے کہ مسلمانوں کا یہ عام گروہ جو ان خرافی اوہام اور مشرکانہ افعال میں
مبتلا ہے۔ وہ اللہ کا منکر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت میں اس کو شک پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن
ان کے نزدیک خدا کی کتاب باقی نہیں رہی ہے، مسلمانوں کے اس ارتداد کا میں قطعاً قائل نہیں ہوں مرض کے
اسباب کی تشخیص غلط اور قطعاً غلط ہے، مشاہدہ اور معائنہ کے خلاف ہے۔ البتہ اگر جان کی امان دی جائے تو میں
کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کے کلام اور رسول کی باتوں کے استعمال کرنے میں ان ہی بزرگوں سے شاید کچھ چوک ہو رہی
ہے جنہیں ان چیزوں کے استعمال کا قدرتی حق حاصل ہے۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ لات و منات، ہبل و عززی سے عرب کے جاہلوں کو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)
نے جب چھڑایا تھا تو کیا اس حکم اور مشورہ کے ساتھ چھڑایا تھا کہ اپنے فرضی جھوٹے معبودوں سے وہ اپنی جن
ضرورتوں کو مانگا کرتے تھے چونکہ وہ ادنیٰ درجہ کی دنیاوی ضرورتیں ہیں۔ اس لئے خالق کے آگے اپنی ان ضرورتوں
نہ پیش کریں، بلاشبہ یہ ایک خلاف واقعہ اور غلط دعویٰ ہوگا، بلکہ بات وہی تھی کہ جو کچھ بھی اپنے معبودوں اور دیوتاؤ
سے مانگا کرتے تھے، حکم دیا گیا تھا کہ اُن ہی کا مطالبہ خدائے واحد سے کریں۔ جو کچھ مانگا جاتا تھا۔ اس میں کوئی
تبدیلی عمل میں نہیں آئی تھی بلکہ جس سے مانگا جائے۔ صرف وہ بدل دیا گیا تھا۔ بہر حال مجھے اپنے اس خیال پر

اصرار اور شدید اصرار ہے کہ صرف معاشی دشواریوں اور دنیاوی حاجتوں ہی نے عام مسلمانوں کو ان ناگفتہ بہ امور میں مبتلا کر دیا ہے، عموماً ساری بدعات، اور شرکی کاروبار کے پیچھے غور کیا جائے گا تو معاشی محرکات ہی پوشیدہ نظر آئیں گے۔ یہ خیال کہ ان اعمال و اشغال کی تہ میں کوئی دینی یا اعتقادی، اخلاقی یا روحانی محرکات چھپے ہو ہیں، صرف ایک بے بنیاد خیال ہے، صرف زبانی دعوے ہیں جن کا صحیح احساس شاید بولنے والوں کو بھی اس وقت نہیں ہوتا جب وہ اپنے ان اعمال و افعال کی توجیہ میں طرح طرح کی خوش اعتقادیوں کو پیش کرتے ہیں۔ یقیناً مانئے خدا کو الہ المعاش بنا کر جب تک مسلمانوں کے سامنے آپ نہیں پیش کریں گے، اُس وقت تک صرف الہ المعاد والے خدا سے وہ تعلق ان کا قطعاً قائم نہیں ہو سکتا جس کا مطالبہ قرآن میں ہر مسلمان سے کیا گیا ہے معادی خدا جو صرف الآخرۃ میں سزا و جزا یا الجنۃ والنار کا مالک ہے۔ اُن جھوٹے خداؤں سے کیسے بے نیاز کر سکتا ہے جن کے متعلق باور کرانے والوں نے باور کر رکھا ہے کہ اُن میں کوئی نوکری دلاتا ہے، کوئی اولاد تقسیم کرتا ہے۔ کوئی جنوں کو بھگاتا ہے۔ کوئی دشمنوں کو شکست دیتا ہے، ہاں وہی خدا جو الہ المعاد ہے۔ وہی الہ المعاش بنا کر بھی مسلمانوں کے سپرد جب کر دیا جائیگا تو اس وقت بلاشبہ انسان کی فطرت ان جھوٹے اور جھوٹے معبودوں کو خود بخود چھوڑ بھاگے گی یہ

تانا بیند کود کے کو سیب ہست او پیاز گندہ راند ہر دست
لیکن سیب دیئے بغیر آپ اگر چاہتے ہیں کہ سچے بدبودار پیاز کو چھوڑ دے تو آپ کا یہ ایک غیر فطری مطالبہ ہے۔ گونگے بہرے جمادات تک کے آگے ترپنے کے لئے یہ مضطر اور مصیبت زدہ انسان تیار ہو جاتا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں، اپنی ان ہی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ٹرپ رہا ہے ان کے قدموں پر، اپنا سب کچھ حتیٰ کہ کبھی کبھی جان عزیز کے نثار کرنے تک سے دریغ نہیں کرتا خیال تو کیجئے کہ ان ہی ضرورتوں کے لئے اگر اس کو واقعی مالک الملک ارحم الراحمین کے قدموں پر لوٹنے کی دعوت دی جائے۔ تو کیا وہ اس سے اعراض کر سکتا ہے۔ لیکن، دین کے سارے زندہ تعلقات اس زندگی میں جب خدا سے توڑ لئے گئے ہیں تو قسمتِ ہماقت پسند، انسان آپ ہی بتائے کہ آخر شدتِ تکلیف میں خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کے سامنے اگر کھڑا ہو گیا ہے تو اس میں کیا صرف اسی کا قصور ہے؟ لا پرواہیوں کی یہ انتہا ہے کہ عوام ہی نہیں۔ اچھے پڑھے لکھے مولویوں سے بھی جب کلمہ دعوت لا الہ الا اللہ کا ترجمہ پوچھا جاتا ہے۔ تو بتا دیا جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے۔ بس یہی اس کا حاصل ہے۔ حالانکہ یہ نہ اس کا لفظی ترجمہ ہے نہ اس کا مفاد ہے، آخر اگر اللہ میاں ایک ہیں یہی اس کا مطلب ہے تو پھر اس میں غریب بندوں کا کیا فائدہ؟ کس قدر عجیب بات ہے کہ بچھڑے ہوئے انسان کو اسی لفظ الہ کے حلقہ سے اپنے بھلائے ہوئے مالک اور رب سے جوڑا گیا تھا۔ بتلایا گیا تھا، ہر قوم کو ہر زمانے میں، ہر ملک میں بتلایا گیا تھا۔ کہ زندگی کی تمام ضرورتوں، اور کشمکش حیات کی تمام مشکلات اور دشواریوں میں انتہائی عاجزی اور نیا زندگی، مسکن و خاکساری، تذلل و ابتهال کی انتہائی شکلوں کے ساتھ جان و دل کی پوری قوت سے جس کی طرف نہیں بھاگنا چاہیے، ہر حال میں بھاگنا چاہیے، وہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے، لیکن ے
وہی پر کھل پڑا کبوتر کا ٹوک جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا

کلمہ دعوت کے ہر لفظ کو سمجھا گیا، سمجھایا گیا، صرف ایک لفظ اللہ کی تعبیر واجب الوجود سے کر کے دلائل کا انبار اور دفاتر کا طومار تیار کر دیا گیا۔ جس چیز سے کسی کو انکار نہ تھا، جس اقرار کو شکم مادر سے لے کر ہر آدمی پیدا ہوتا ہے۔ ساری طاقت اسی مانے ہوئے اقرار کے منوانے پر خرچ کر دی گئی۔ لیکن دعوت کے اس کلمہ میں الہ کا لفظ جو اس سارے کلمہ کی جان تھا جو عبد کو اپنے معبود سے ملاتا تھا۔ اسی کو ہر قسم کی تشریح و توضیح سے بے نیاز ٹھہرا کر چھوڑ دیا گیا اور ساری توجہ ادھر پھیر دی گئی کہ خالق کائنات کو ایک مانا جائے، گویا جس نے یہ مان لیا۔ اس نے اس فرض کو ادا کر دیا جو اس کلمہ کے ذریعہ سے خدا نے اپنے بندوں پر عائد کیا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے، اسلامی تعمیر کی جو پہلی اینٹ تھی، اسی کے متعلق کتنی سخت غفلت سے کام لیا گیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ دین کے پہلے کلمہ کے ساتھ، دین کے سرداروں اور امت کے پیشواؤں کا یہ ہی سلوک اگر باقی رہا تو ”اصنامی نظام“ کے متعلق کسی شکل کسی نام سے

اے میرے مالک ان بتوں نے راہ ماری
بہترے آدمیوں کی۔

سرباۃ من ۲ ضللن کثیر ۲ من
الناس۔

کے ابراہیمی شکوہ کو تاریخ یقیناً دہراتی رہے گی۔
ولقد ۲ ضل منکم جبلاً کثیراً۔
(یسین ۲۴)

کی گرمی بازار کا موقع شیطان کو ملتا رہے گا، اس وقت تک ملتا رہے گا۔ قطعاً بے روک ٹوک ملتا رہے گا جب تک کہ
الذی هو یطعمنی ویسقین واذامت
فہو یشفین۔ (اشعرار ۱۱)

والے اللہ کو روٹی کا بھوکا اور پانی کا پیاسا، مرض کے بعد صحت کا جو یا انسان، الہ کی صورت میں نہ پالے گا،
اور جب اس کو پالے گا تو خود بخود بے کتاب و بے معبود اوستا
انی لا احب الا فلین۔
(الانعام)

میں نہیں چاہتا ڈھل جانے والے کو،
(نگاہوں سے اوجھل ہو جانے والے کو)

۱۔ اللہ کو معاشی الہ بنانے سے بے اعتنائی ہی کا غالباً ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ جن دعاؤں اور قرآنی آیتوں مثلاً لا الہ الا انت سبحنک
انی کنت من ۲ الظالمین وغیرہ میں حق تعالیٰ کو اسی دنیا کی مشکلات کا الہ بنا کر جو مخاطب کیا گیا ہے۔ معنی سے بے تعلق قطعاً بے تعلق کر کے مسلمانوں کا
وہ طبقہ بھی حل مشکلات میں انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہوا جو اب تک معاشی معاملات میں اللہ سے نفع اٹھانے کو جرم خیال کرتے رہے۔ مجھے افادہ
کے اس پہلو سے انکار نہیں لیکن کہنا یہ ہے کہ الفاظ کے ساتھ مثلاً مذکورہ بالا آیت کے اس مفہوم کو بھی پڑھنے والے اگر عیش نظر رکھیں یعنی ”پروردگار اترے سو میرا
کوئی الہ نہیں ہے، الہ ہونے میں آپ کا کوئی شریک اور سا جہی ہو، اس سے آپ کی ذات پاک ہے، میں خود ہی راہ سے ہٹنے والا تھا کہ آپ کے ہوتے
ہوئے دوسروں سے امید باندھیں دوسروں سے ڈرا ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے اس تعلق کی یافت سے سکون کی جو خشکی دلوں کو مل سکتی ہے۔ سینہ کج
بوجہ اس سے ملتا ہے۔ کیا متر یا افسوں کے طور پر ان الفاظ کو صرف دہرانے سے یہ کیفیت حاصل ہو سکتی ہے ۱۲

کی روشنی سے حب و عشق، عبادیت و بندگی کی دنیا جگمگا اٹھے گی۔ جو واقع میں کسی سے کسی وقت کسی جگہ اوجھل نہ تھا اس کے بعد انسان کے ”وجدانی شعور“ کے سامنے بھی بے نقاب ہو جائے گا۔ الغرض جو سامنے تھا، وہی سامنے آجائے گا۔ حصولِ معاش کی راہ کی ایک مستقل تدبیر جس کی طرف اسلام نے خصوصیت کے ساتھ راہ نمائی کی تھی چونکہ بتدریج اس سے استفادہ کا رجحان مسلمانوں میں کمزور ہوتے ہوتے قریب قریب اس نقطہ کو پہنچ چکا ہے کہ ”معاشیات“ کے باب میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے، اور صرف یہی ہو کر رہ جاتا تو غنیمت تھا۔ استفادہ کی اس راہ سے بے تعلقی نے بعض مدہش و مہیب روحانی و اخروی خطرات کو مسلمانوں کے سامنے کر دیا ہے اور اسی کے ساتھ غربت و فلاکت کے ان دنوں میں بھی ان کی کمائی ہوئی آمدنیوں کی ایک بڑی معتد بہ مقدار لا حاصل بلکہ شدید مضرت رساں راہوں میں برباد ہو رہی ہے، دیکھ دیکھ کہ ہمیشہ کڑھتا رہتا ہوں، قرآن پڑھتا ہوں، اور پھر مسلمانوں کو دیکھتا ہوں، دماغ مختل ہو جاتا ہے، روح کا پنتی ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ بیقراری میں قلم چلتا گیا اور بہ مشکل اس بحث کو ختم کر کے ایک دوسرے اہم مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ورنہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ کہتا جاؤں، مسلسل کہتا جاؤں، اس وقت تک کہتا جاؤں جب تک کہ یقین نہ پیدا ہو لے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، مسلمان اس کے ماننے پر مضطر و مجبور ہو گئے واللہ صمد نور و لو کوہ ۲ الکافرون ط

حق تعالیٰ کو صرف اللہ م بہر حال اس مسئلہ کو ختم کر کے اب اس دوسری چیز کو بیان کرتا ہوں جس کی المعاش بنانے کے نتائج طرف میں نے اشارہ کیا تھا، مطلب یہ ہے کہ میرے ان اصراری بیانات سے کہیں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ میں خالق و مخلوق، عابد و معبود کے باہمی تعلقات کی تصحیح کے نتائج کو یا دوسرے لفظوں میں ایمان و تقویٰ علیٰ صالح، دعا و عبادات، توبہ و استغفار، توکل و تسلیم صبر و شکر وغیرہ مذہبی حقائق اور دینی عناصر کے متعلق اس بات کا خدا نخواستہ مدعی ہوں کہ ان کے ثمرات و نتائج صرف اسی زندگی تک محدود ہیں، یا مذہب کے ان مہمات عالیہ کا آخری مقصد صرف اسی ”الحیوۃ الدنیا“ کی مشکلات کا حل ہے۔ گویا مذہب کا سارا نظام (العیاذ باللہ) صرف معاشی صلاح و فلاح، بقا و ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ یقیناً یہ غلطی اسی قسم کی غلطی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت غلطی ہوگی جس میں حق تعالیٰ سے معاشی تعلقات کے توڑ لینے کی وجہ سے آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مبتلا ہو گیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایسا مذہب مذہب ہی کب باقی رہتا ہے جس میں انسان کے لامحدود منازل حیات کو صرف بطنِ مادر اور شکمِ قبر کے درمیان چند گنے گنائے دنوں تک محدود کر دیا جائے، یا یوں کہیے کہ لے دے کر انسانیت کا سارا زور اور ان ہی چند لمحہ بھی ہوئی سالنوں کے سلجھانے پر صرف کر دیا جائے، جو دوسرے سانس لینے والے جانوروں کے ساتھ آدمی کو بھی زمین کے اس محدود کرہ پر کچھ دن کے لئے عطا ہوئی ہیں، اس تنگ خیالی، تنگ دلی، تنگ نظری کی مذہب میں تو کیا گنہائیں نکل سکتی ہے۔ فکر و نظر کے غیر دینی نظاموں میں بھی آدمی کی بلند فطرت، سیال ذہنیت اس کو برداشت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتی ہے۔ قرآنی آیت

کہیے کیا تمہیں بتائیں کہ خسارے میں کاموں کے

حساب سے کون ہے یہ وہی لوگ ہیں جن کی

قل هل ننبتکم بالاحسنین

۲ اعمال الذین صنل سعیمہم فی

کوشش اسی پست زندگی میں گم ہوگئی۔ بجا لیکو

الحیوة الدنیا وہم یحسبون انہم

خیال پکا رہے ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

یحسنون صنعا (الکہف ۱۷)

میں بجا ارشاد ہوا ہے کہ سعی و عمل، جدوجہد میں اس سے زیادہ حیران نصیب، کوتاہ بخت، تاوان زدہ، دیوالیہ اور کون ہو سکتا ہے جس نے احسن تقویم کے قالب میں بھری ہوئی خلافتی توانائیوں کو

نہ چاہا اس نے لیکن صرف اسی پست زندگی کو

لم یورد الا بالحیوة الدنیا ذلک مبلغہم

یہ ہے رسائی ان کے علم کی۔

من العلم (النجم ۲۴)

کے تنگ دائرہ میں گم کر دیا ہوا اور

خوش ہو گئے اسی پست زندگی کے ساتھ اور

مرضوا بالحیوة الدنیا واطمئنوا

اسی کے ساتھ مطمئن ہیں۔

(یونس)

کے شکنجوں میں دب کر اپنی روحانی موت کو طمانیت و سکینت یقین کر بیٹھا ہو، دوسرے جو چاہتے ہیں کہیں جس مسلک کو چاہیں اختیار کریں لیکن ”مقام محمود“ کی بلندیوں پر قدم جمانے والے ابنی الخاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان و اسلام کی بیعت حاصل کر کے جنہوں نے قرآنی علم کو اپنا علم بنایا ہے اور علم محیط کی اسی لازوال سرمدی روشنی میں انسانی عروج و ارتقاء کی آخری منزل ۲۸ نالی سربیک المنتہی کا نقطہ اوج سر صو ۲۸ من ۲ اللہ اکبر کی لاہوتی شکل میں جن کے سامنے جلوہ افروز ہو چکا ہے۔ فرشتہ صیدوں، پیمبر شکاروں، یزداں گیروں کا یہ ایمانی گروہ قطعاً اپنے کو اپنے سرمایہ کو اتنے ارزاں ستے داموں میں بیچنے پر ایک لمحہ کیلئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتا، قرآن کے حرف حرف لفظ لفظ سے جب ع

مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

کے پیغام کی مسلسل صدائیں اس کے کانوں میں گونج رہی ہوں، بلاشبہ ہم جب اسی معاشی دنیا میں ہیں، اور ہمیں یہاں بھیج ہی دیا گیا ہے۔ تو یقیناً اس کی بھی ضرورت ہے کہ اللہ کو ہم اپنا الہ المعاش بھی بنائیں لیکن اس کے معنی یہ کب ہیں کہ معاد (آئندہ زندگی کی مشکلات) کے لئے اللہ کو الہ بنانے کی ضرورت باقی نہ رہی، یہ کتنی بڑی کور بختی ہوگی کہ جس کے پاس ”الاولیٰ“ اور ”ثواب الدنیا“ کے ساتھ ”الآخرۃ“ اور ”ثواب الآخرۃ“ بھی ہے، اپنی آخری زندگی میں باوجود ضرورت شدید ضرورت کے اتنی شدید ضرورت کہ اس کے مقابلے میں تو شاید معاشی ضرورت کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ یہاں کا کام تو پیدائش کی راہوں کو عقلی قابو میں لانے سے بھی بہر حال کچھ چل ہی جاتا ہے لیکن الامر یؤمئذ للہ

۱۰ بلکہ سورہ زمر کی وہ آیتیں جن میں ہے کہ اگر ساری دنیا ایک ہی نقطہ پر جمع نہ ہو جاتی تو الرحمن کے شکر وں کو ایسے مکانات دے دیئے جاتے جن کی چھتیاں اور سڑھیاں چاندی کی ہوتیں اور ہر طرح کی زینت و زینت کے سامان سے ان کو لاد دیا جاتا جیسا کہ قرآنی آیت کا حاصل ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کافروں میں بھی جو لوگ غریب منطس نظر آتے ہیں۔ وہ محض اس وجہ سے ہے کہ اللہ کی رحمت نے نہیں چاہا کہ آدم کی اولاد محض اس مغالطے میں مبتلا ہو کر بے دین ہو جائے اب تو کفر کے ساتھ بھی چونکہ غربت پائی جاتی ہے اس لئے دولت مند ہونے کے لئے کافر ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اللہ اکبر قرآن نے جو کچھ کہا ہے اگر وہ صورت واقعی کفر کی ہوتی تو سبک عقلوں کا کیا حال ہوتا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ سورہ جمعہ میں جمعہ کی نماز کے متعلق یہ حکم دیتے ہوئے کہ جیسا اس کے لئے پکارا جائے تو اس وقت بیچ (یعنی تجارتی کاروبار) کو (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

۷۷
کی گھڑیوں میں تو پیدا کرنے والے سے مانگنے کے سوا اس کی پیداواروں کو اور کسی ذریعہ سے حاصل بھی نہیں کیا جاسکتا
پھر ایسا دیوانہ کون ہوگا جو معاشی ضرورتوں میں تو اللہ کو الہ بنانے سے نہ شرمائے۔ لیکن معادی حاجتوں کے لئے اسی
اللہ کو الہ بنانے اور اس کے آگے گڑ گڑانے التجا و زاری کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرے۔ جو بد نصیب ایسا کرے گا
قرآن نے اس کے متعلق یہ فرما کر کہ

فمنهم من يقول ربنا اننا في الدنيا
توان میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے مالک
دے ہمیں دنیا میں۔
(البقرہ ۲)

مالہ فی الاخرۃ من خلاق (البقرہ ۲)
مالہ فی الاخرۃ من نصیب (الشوریٰ ۱۹)
نہیں ہے "الاخرۃ" میں اس کا حصہ۔
نہیں ہے "الاخرۃ" میں اس کا حصہ۔

کی دھمکی کا اعلان کیا ہے۔ تو سوچا جائے کہ طرف کا یہ چھوٹا تنگ مایہ شخص اور کس چیز کا مستحق ہو سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں
کہ ان تنگ بینوں، کوتاہ دیدوں کے لئے آخرت میں "کچھ نہیں" ہے۔ بلکہ قرآن کی آیت

من كان يريد العاجلة عجلنا له
فيها ما يشاء من نريد۔ ثم جعلنا
له جهنم نصلها من صوما
مدحوسا۔
جو چاہتا ہے (اسی جلدی والی دنیا کو) تو جلدی
کر دیتے ہیں ہم اسی دنیا میں جتنا ہم چاہیں،
اور جس کے لئے ہم چاہیں پھر بناتے ہیں اس
کے واسطے جہنم، پھاندے گا اس میں درد ریا

ہوا، دھمکا را ہوا۔
(اسرائیل ۱۵)

میں تو ان ناشکروں کے متعلق جنہوں نے انسانیت کے لامحدود و تکریمی سرمایہ کو اس بے دردی سے ضائع
کیا جس کے گلشن سدا بہار میں ہر قسم کی تنگ دامانیوں کا فیاضانہ علاج ہر اس پیمانے پر لمیرا سکتا تھا۔ جو سوچا جاسکتا
ہے لیکن چند کلیوں پر قناعت کرنے والے تنگ ظرفوں نے اپنے اسی علیٰ کل شئی قدیر مالک کی جو رحمن الدنیا کے

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو، یہ جو فرمایا گیا ہے کہ تجارت یا لہوی مشاغل کو دیکھ کر لوگ اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جس کا دوسرا
مطلب یہی ہوا کہ معادی مسائل کے مقابلہ میں معاشی مسائل کو لوگ زیادہ اہمیت جو دیتے ہیں۔ یہ طرز عمل ان کا قطعاً غلط ہے کیونکہ مقابلہ کے وقت
ظاہر ہے کہ معاد کی ابدی زندگی کے سامنے معاشی زندگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی! اسی کی طرف وعاظ اللہ خیر من اللہ و التجارۃ (اور جو اللہ کے
پاس ہے وہ تجارت اور لہو سے بہتر ہے) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۃ کے آغاز میں یہود اور ان کے طرز عمل کا ذکر بھی اسی لئے کیا گیا ہے کہ دیندار
کے دعوے کے باوجود اس قوم پر سب سے بڑی لعنت جو مسلط ہوئی، وہ یہی تھی کہ معادی مسائل کے مقابلہ میں یہودیوں کے یہاں معاشی
مسائل مثلاً تجارت کھیل تما شوں نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔ انتہا اس لعنت کی یہ ہوئی کہ انہوں نے تورات سے آخرت کی
زندگی، یعنی معاد کے تذکرے ہی کو نکال دیا۔ اشارہ اسی کی طرف کیا گیا ہے کہ تورات کے اٹھانے کے بعد انہوں نے پھر اسے نہ اٹھایا
اور اسی چیز نے موت کا خوف ان میں پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کو چونکا دیا گیا ہے کہ معاد کے مقابلہ میں اگر ان میں بھی معاشی مسائل زیادہ
اہمیت حاصل کر لیں گے۔ تو موت کا خوف ان پر بھی مسلط ہو جائے گا۔ اور شاید وہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ معاش یعنی الرزق کی ذمہ داری
اس سورۃ کے آخر میں بھی و اللہ خیر الرازقین کے الفاظ میں لی گئی ہے ۱۲

ساتھ ”رحیم الآخرۃ“ بھی ہے جب ناقدری کی، جو اس کا واقعی وزن اور حقیقی وقار تھا، اپنی چھپوری ذہنیوں میں گر اس وزن اور وقار کے احساس کی وہ گنجائش نہیں پاتے تو نجات کے ان چھوٹوں کو درد راتے، دھتکار تے ہوئے لعنت کے تاریک گرھوں میں اگر ڈھکیل دیا جائے تاکہ اسی میں وہ کڑھیں اور ابد تک کڑھتے رہیں، پچھتاؤں، اور ابد تک پچھتاؤں رہیں، دانت پیسیں اور ابد تک پیستے رہیں، اور یوں کئے کا خیارہ بھگتیں اور بھگتے رہیں تو اس کے سوا وہ کس سلوک کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

حق تعالیٰ کو صرف الہ المعاش | جزاء و فاقا کے اُن آثار کا ظہور تو ”الدنیا“ کے بعد ”الآخرۃ“ کی آنے والی زندگی بنانے کا مہلک خطرہ، میں ہوگا، لیکن اُن لوگوں کے لئے جو حق تعالیٰ کی الہ المعادی شان سے بے پروا ہو کر محض الہ المعاش ہی بنانے کا رشتہ ان کے ساتھ رکھتے ہیں، ان دو تعلقوں سے صرف ایک یعنی معاشی تعلق کو تمام کر دوسرے سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔ اور یوں ایک ہی کنارہ پر بیٹھ کر صرف اسی الحیوۃ الدنیا کی کامیابیوں کے لئے اس کو پوجتے ہیں، نمازیں بھی اسی لئے پڑھتے ہیں، تلاوت بھی اسی لئے کرتے ہیں، خیر و خیرات کے مدوں میں بھی اسی لئے دیتے ہیں، تاکہ مثلاً ان کی نوکری برقرار رہے، ترقیوں کی راہیں ان پر کھلیں، تجارت میں فروغ ہو، فصل پوری ہاتھ لگے، بال بچوں سے گود بھری رہے، گھر کا اقبال اونچی ہو، اعزاز بڑھے ”علیٰ حروف“ یعنی کنارے بیٹھ کر اس طریقہ سے اللہ کے پوجنے والوں کو قرآن میں اس سے بھی ڈرا یا گیا ہے کہ کہیں ”الدین“ کے ساتھ وہ اپنی ”الدنیا“ بھی نہ ڈھال بیٹھیں، ارشاد ہے،

اُن میں بعض ایسے ہیں جو پوجتے ہیں خدا کو
کنارے پر بیٹھ کر، پھر اگر پہنچی اُسے کوئی
سجلائی، تو مطمئن ہو گیا اس کے ساتھ، اور اگر
پہنچی کوئی آزمائش تو پلٹ پڑا اپنے رخ پر
یرباد کر بیٹھا الدنیا بھی اور الآخرۃ بھی یہی

و منهم من یعبد اللہ علیٰ حرف
فان اصابہ خیر اطمان بہ و
ان اصابہ فتنۃ انقلب علی
وجہہ خسراً لدنیا و الآخرۃ
ذلک ہوا الخسار المبین۔

ہے کھلا ہوا خسارہ۔

مطلب یہ ہی ہے کہ معادی معاملات میں تو خدا سے اپنے آپ کو بے نیاز بنائے ہوئے تھا ہی، لے دیکر ایک معاشی رخ حق تعالیٰ کی طرف اس کا باقی تھا، اس رخ سے جب تک پاتا رہے گا، اس وقت تک تو خیر لیکن عالم کا علم اگر اس کے جہل کا ساتھ خود اسی کے فائدہ کے لئے کسی وقت نہ دے اور اس کی حکمت و رحمت کا تقاضا ہے کہ نہ دے، تو ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ الہ المعاش ہونے کی حیثیت سے اس وقت خدا کو الہ بنانا اس کے لئے برابر ہو جائے گا، کتنا نازک وقت اور کٹھن گھڑی اس کے لئے یہ صورت ہوگی، خدا کا یہ یک رخا تجارتی جب معاشی فلاح و بہبود ہی کے لئے خدا کو پوج رہا تھا، اتفاقاً اس راہ کی کامیابیوں کے دروازے جب اپنے اوپر بند پائے گا تو کب تک وہ اس ”حرفی“ عبادت و دعا پر صبر کئے بیٹھا رہے گا۔ معادی منافع تو اس کے سامنے ہیں نہیں، رہ گئے تھے معاشی فوائد، جب ان میں بھی ناکامیوں کے سوا اپنے سامنے کچھ نہیں دیکھتا تو خطرہ اور بہت زیادہ خطرہ ہے کہ اگلا وہ خدا کے سامنے سے ہٹ جائے، معادی رشتہ تو پہلے ہی سے ٹوٹا تھا، رہ گیا تھا معاشی ربط، سودہ بھی (العیاذ باللہ)

جب اس کا ختم ہو گیا، تو اب بارگاہ حق میں حضورِ می کی کیا صورت اس کے لئے باقی رہ جاتی ہے؟ محرومی اور کسی سخت محرومی ہوگی جس کا ایسی حالت میں وہ محض اسی لئے شکار ہوا کہ جو ہم انسانوں کا الہ المعاش ہونے کے ساتھ الہ المعاد بھی تھا، اسی ذات پاک کو یہ نادان صرف الہ المعاش بنا کر پوجتا رہا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یاس کی تلخ کامیاں، اس قسم کے یکِ خفی عبادت والوں کی زبانوں سے ان حالتوں میں اولِ فول کی جو گندگیاں اگلو اتی ہیں، وہ تو شاید ان مسکینوں کے لئے بھی قابلِ برداشت نہ ہوں، جو اپنے مالک سے نہ معاشی ہی تعلق رکھنے کی ضرورت سمجھتے ہیں اور نہ معادی کی، بلکہ صرف عقلی سہاروں کے بل بوتے پر زندگی گزارتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت بھی نیک حرامی اور بغاوت و سرکشی کی ایک بدترین شکل ہے جس کی تھوڑی بہت تفصیل شاید آئندہ کی جائے۔ لیکن جن بد بختوں کا انجام اُن سے بھی بدتر ہوا، اُن سے زیادہ کھلے ہوئے خسارے اور گھاٹے میں کون رہ سکتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ یکِ خوں کا یہ گروہ جاتا تو ہے خدا سے معاش مانگنے، لیکن کبھی کبھی اس کی واپسی (العیاذ باللہ) ایسی شکلوں میں ہوتی ہے کہ معاش کے ساتھ اپنی معاد کو بھی اپنے ہاتھوں یہ برباد کر بیٹھتا ہے۔ درپے دنیا دیں ہم رفت و آں ہم رفت این ہم رفت کی نامرادیاں اسی قسم کے لوگوں کے لئے ہیں، بر غلاف اس کے، جو حق کو معاشی و معادی دونوں کناروں سے پکڑتے ہیں۔ معاش میں بھی الہ کا حقیقی رُخ حق ہی کی طرف رہتا ہے اور معاد میں بھی ان کی ٹکٹکی فضلِ حق ہی کے ساتھ بندھی رہتی ہے، اُن کے لئے کس بات کا خطرہ ہے؟ معاشی جہات میں بالفرض اگر ان کو ناکامی بھی محسوس ہو، اگرچہ واقع میں وہ بھی کامیابی ہوتی ہے جس پر بظاہر ناکامی کا غلاف چڑھا رہتا ہے۔ لیکن یہ ظاہری ناکامی بھی ان کو خدا سے اس لئے جوڑے رکھتی ہے کہ ان کا دوسرا رُخ یعنی معادی رشتہ تو خدا سے بہر حال باقی رہتا ہے بڑی سے بڑی معاشی محرومیاں بھی ان کو خدا کے قدموں سے دور نہیں کر سکتیں، بلکہ جیسا کہ گذر چکا وہ اپنی ہر معاشی ناکامی کو معادی کامیابیوں کا ذریعہ، صبر و رضا، تسلیم و تفویض وغیرہ مختلف قرآنی تدبیروں سے بناتے چلے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ معادی امور سے بے پروا ہو کر حق تعالیٰ سے صرف یکِ خفی معاشی نسبت اگرچہ بہتوں کے لئے آج مذہبی امتیاز اور دینی برتری کی سند بنی ہوئی ہے لیکن قرآن نے جن عواقب اور خیمہ زوں پر متنبہ کیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی ان کی غلط مذہبی زندگی مذہبی زندگی قرار پانے کی مستحق ہو سکتی ہے؟

پس صحیح بات یہی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو جو خدا اور جو معبود اللہ کے نام سے عطا کیا ہے، وہ مسلمانوں کا الہ المعاش بھی ہے اور الہ المعاد بھی۔ اسی لئے ایک مسلمان کا صحیح دینی مقام یہی ہو سکتا ہے کہ ”الہ المعاش“ ہونے کے ساتھ جو رب بندوں کا ”الہ المعاد“ بھی ہے، اسی کے قدموں پر سر ڈالے۔

مرا بنا اتنا فی الدنیا حسنة و

فی الاخرۃ حسنة و قنا عند ربنا

اے ہمارے مالک دیجئے ہمیں دنیا میں بھی

بھلائی اور الاخرۃ میں بھی بھلائی اور پچا لیجئے

(البقرہ ۲۰)

ہمیں عذاب سے آگ کے۔

کے ساتھ گڑا گڑا رہے۔

معاشی ضرورتوں کو خدا سے مانگنا | ”الہ المعاد“ کو ”الہ المعاش“ بنانا بہت ہی اور تنگ نظری ہے۔ اس مغالطے کا کیا آدمی کو نکما اور ناکارہ بنا دیتا، اثر زیادہ تر قدیم مشرقی ذہنیاتوں میں پایا جاتا ہے اس مغالطے کے متعلق مجھے

جو کچھ عرض کرنا تھا، اور جن دینی و دنیوی، روحانی و مادی مفاسد کے دروازے اس غیر قرآنی ذہنیت کی بدولت کھلے ان سب پر یہ تفصیل گفتگو ہو چکی۔ لیکن ذہنیوں کا جو سانچہ مغرب کی مختلف آنچوں سے گچھل گچھل کر اس زمانہ میں تیار ہو رہا ہے۔ میں جان رہا ہوں کہ میری گفتگو کا ایک بڑا حصہ ان مسکینوں کو اس فکر میں گھلا رہا ہوگا کہ معاشی ضرورتوں کے متعلق بھی مسلمانوں کو اگر یہ تعلیم دی جائے گی کہ اپنے خدا سے ان کو مانگ لیا کریں۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سعی و عمل کا جو بھی بچا کچھ ذوق مسلمانوں میں باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی ان سے نکل جائے گا۔ یوں ہی مسلمانوں کی بیکاری ویسے عملی، کاہلی، نکتہ پین کا دنیا میں شہر ہے۔ لیکن جب ان کو یہ یقین دلایا جائے گا کہ تقویٰ کی راہ سے بھی آدمی اپنی روزی حاصل کر سکتا ہے، معاشی فراغت مالی ایمان و عمل صالح سے بھی پیدا ہو سکتی ہے، تو ایک لوٹا پانی اور چند سجدوں سے جو چیز مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی کے لئے لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ عقلی تدبیروں کی جھنجھٹوں میں پھنس کر آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملائیں۔ کانپا ٹھٹھا ہے نسل آدم کا یہ عجیب و غریب طبقہ کانپا ٹھٹھا ہے۔ جب سنتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مذہبی واعظ اسلام کو دینی اور دنیوی ہر قسم کی کامیابیوں، خوش حالیوں کا ضامن قرار دے رہا ہے۔ خدا خواستہ یاد کرانے میں اگر واعظ کامیاب ہو گیا۔ قومی درد کے مریضوں کا یہ گروہ فیصلہ کئے ہوئے ہے کہ مسلمانوں کی موت کا وہی دن ہوگا۔ ان کی امت نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی یہی فکر، جیسا کہ ان کا بیان ہے۔ صبح و شام انھیں گھلا گھلا کر دُبلانا جلی جا رہی ہے۔ مذہبی دیوانوں پر عموماً ان کی تیوریاں اسی لئے پڑھتی رہتی ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اب تک اس سلسلہ میں میں جو کچھ کہ چکا ہوں مختلف پیرایوں میں ضمناً ان خود تراشیدہ بیجا وسوسوں کا ازالہ کرتا ہوا بھی چلا آیا ہوں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ جب تک صاف صاف کھلے لفظوں میں مستقلاً اس بحث کو بھی طے نہ کر لیا جائے گا۔ ان وسوسوں کا استیصال جیسا کہ چاہیے شاید نہ ہو سکے گا، گو بلا وجہ طوالت ہوگی۔ لیکن جن کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ اگر ان ہی کو مطمئن کرنے میں کامیابی نہ ہوئی، تو پھر بجائے خود جو مطمئن ہیں محض ان ہی کو خوش کرنے سے کیا حاصل؟ مسلسل کہتا چلا آیا ہوں کہ اپنی معاشی زندگی میں جن چیزوں سے ہم استفادہ کر رہے ہیں۔ ان کے متعلق و مستقل سوالات ہیں، یعنی انھیں کون پیدا کر رہا ہے؟ یہ پہلا سوال ہے، کن راہوں اور کن طریقوں سے پیدا کر رہا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے۔ فرض کیجئے کہ مٹی کے برتن بن بن کر کسی چاک سے اتر رہے ہیں۔ کون بنا رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گھار بنا رہا ہے! کن طریقوں سے بنا رہا ہے۔ اس کے جواب میں گھار کے ہاتھ کی لکڑی، چاک، چاک کی گردش، ہاتھ کے کام، ان سب کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یاریل چل رہی ہے۔ کس طاقت سے چل رہی ہے؟ اس سوال کے جواب میں کوئلہ، پانی، انجن کے تمام پیرزوں، انجن کا لوگوں سے جو تعلق ہے۔ ہر ریلوے کے تمام اجزاء، پھینے، پٹری وغیرہ ان تمام امور کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں جو چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، ان کو کون پیدا کر رہا ہے۔ اسی کا جواب ہے کہ اللہ پیدا کر رہا ہے! گذر چکا کہ اس جواب کے علم و یقین کو قدرت نے انسانی فطرت میں اس طریقہ سے رچا دیا ہے کہ کون پیدا کر رہا ہے؟ جس سے بھی یہ سوال کیا جائے گا قرآن کا دعویٰ ہے کہ سوال کی چوٹ سے بیدار ہو کر جواب دینے والا اپنے شعور میں اللہ کے سوا اور کسی کو پا نہیں سکتا، مجبوراً زبان سے اس کو وہی کہنا پڑتا ہے۔ جسے اپنی شعوری یافت سے وہ کسی طرح باہر نہیں نکال سکتا، اشیاء کی بیدار نش کے متعلق یہ پہلے سوال کا جواب ہے، رہا دوسرا سوال یعنی کن راہوں سے۔ کس طریقہ سے یہ چیزیں پیدا ہو رہی

ہیں؟ اسی کا جواب ہے کہ جو ہماری عقل و حواس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اشیاء کی پیدائش کے متعلق انسانیت کی تحقیقی و تفتیشی ادراکی قوتیں جس جواب کو پاتی ہیں، وہی اس سوال کا حقیقی جواب ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ان معاشی پیداواروں کو خود پیدا کرنے والے سے حاصل کرنے کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں۔ اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنی معاشی ضرورتوں میں الہ بنایا گیا۔ اور جن راہوں سے یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان راہوں کا علم حاصل کر کے اپنے قابو میں لا کر ان سے مستفید ہونا۔ اسی کا دوسرا نام عقلی و حسی تدبیر، جسمانی و مادی مشقت و محنت ہے۔

میں نے کہا تھا کہ اللہ یا خالق عالم کو الہ بنا کر ان پیداواروں سے استفادہ کے متعلق جو تدبیر اختیار کی جاتی ہے، اس تدبیر کی بنیاد علم کے ایک قطعی اور فطری اساس پر مبنی ہے، اور گو تدبیر کے دوسرے شعبہ کی بھی عقل و حواس کے تجربی معلومات ہی پر بنیاد قائم ہے۔ لیکن تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہونے کے باوجود بتایا گیا تھا کہ قطعیت و یقین آفرینی کی وہ کیفیت اس میں نہیں پائی جاتی جس قسم کی قطعیت اس علم میں پائی جاتی ہے۔ جس پر تدبیر کا پہلا شعبہ مبنی ہے۔ مگر قطعیت کے اس فقدان کے باوجود اسلام کا نقطہ نظر اس باب میں یہ پیش کیا گیا تھا کہ اپنی اپنی یافت اور علم کی حد تک آدمی اسی کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے کہ فطرت کے ان قوانین سے بے اعتنائی نہ برتے۔ جن کی راہوں سے دنیا میں خیر و شر کا ظہور ہو رہا ہے۔ کہا گیا تھا کہ جو ان سے لاپرواہی اختیار کر کے کسی مصیبت کا شکار ہو جائے تو

نظامت کرے مگر اپنے آپ کو۔

فلا یلوم من لا نفسہ۔

کے پیغمبرانہ الزام سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ اس باب میں قرآنی اشارے جو پائے جاتے ہیں۔ ان کے نمونے بھی پیش کئے گئے تھے۔ بتایا جائے کہ اس کے بعد اسلام اور کیا کرتا۔ کھیت جوتے پر اگر کسان سے اصرار کیا جائے تو محض اس لئے کہ جوتے کی تاکید جس کسان کو کی جائے گی کسی کو اس کا خفقان پیدا ہو کہ تخم ریزی کو وہ چھوڑ بیٹھے گا یا کھانا چھوڑ دے گا، پانی سے بیزار ہو جائے گا۔ اگر یہ صرف خفقان ہے، تو پھر خواہ مخواہ یہ اندیشہ جن لوگوں کو اندر ہی اندر ستا رہا ہے کہ معاشی ضرورتوں میں مسلمان اگر خدا سے یا ان ضرورتوں کے پیدا کرنے والے سے مانگنے کے عادی ہو جائیں گے، تو جن راہوں سے یہ ضرورتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان میں غور و فکر اور ان پر قابو پانے کی تدبیریں چھوڑ بیٹھیں گے۔ ایک قسم کا غیر منطقی خفقانی اندیشہ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ کسی کو یا سجا مہ پہننے کا اگر مشورہ دیا جائے۔ تو اس کا یہ مطلب کیسے لے لیا جائے گا کہ کرتہ پہننے سے اسے روکا جا رہا ہے۔ یا پانچواں پہننے والا کرتہ پہننا چھوڑ دے گا۔ کسی طالب علم کو استاد اگر لکھنے کی تاکید کرے۔ تو اس کے کیا یہ معنی ہیں کہ وہ پڑھنے سے اس کو منع کر رہا ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اپنی ضرورتوں میں خالق تعالیٰ کو الہ بنانا اور اس کی طرف رجوع کرنا، اس کی بنیاد خواہ جتنے بھی قطعی اور فطری علم پر قائم ہو۔ لیکن بہر حال تعلق تو اس تدبیر کا ایک غیبی قوت سے ہے۔ اس لئے اگر لوگوں کو اس تدبیر کے اختیار کرنے پر توجہ دلائی جائے۔ تب ہیہ و تاکید کی جائے تو اپنی غیبی خصوصیت کی بنیاد پر وہ اس کی مستحق ہے۔ بخلاف تدبیر کے دوسرے شعبہ کے کہ اس کا تعلق غیب سے نہیں بلکہ مشاہدات و محسوسات سے ہے اور آدمی کا قاعدہ ہے کہ وہ غیب سے تو غافل ہو سکتا ہے۔ لیکن مجنوںوں اور دیوانوں کے سوا عام حالات میں حسی قوانین، اور مشاہداتی امور سے اعراض تقریباً ناممکن ہے۔ ان قوانین کو چھوڑنے پر کسی کو بالضرر اگر آمادہ بھی

اسلامی معاشیات
کیا جائے تو مشکل ہی سے کوئی اس کی تعمیر پر تیار ہو سکتا ہے۔ پھر یہاں تدبیر کے اس شعبہ کو ترک کرانے کے
کیا معنی۔ اس کے متعلق تو خاموشی سے بھی کام نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ گزر چکا کہ تدبیر کے پہلے شعبہ (یعنی پیدا کرنے
والے سے مانگنے) کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبہ (یعنی جن راہوں سے وہ پیدا کر رہا ہے) ان کے اقتضات
کی تکمیل کو اسلام میں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ ان سے اعراض و انحراف چونکہ پیدا کرنے والے کی مقررہ سنتوں
سے انحراف و بغاوت ہے۔ اس لئے ان سے لاپرواہی اگر سوچا جائے تو یہ خدا سے جنگ ہے۔ غالباً یہی مطلب
ہے ابو داؤد۔ الحاکم وغیرہ کی اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع دی ہے کہ
سیکون فی ہذا الامۃ قوم یعتدون
اس امت میں کچھ لوگ ہوں گے جو حد سے تجاوز
فی الاعتداء والدعاء۔
کریں گے۔ تجاوز کرنے میں اور دعاء میں۔

اور امام بخاری نے قرآنی آیت
۱۲ منہ لا یحب المعتدین۔
خدا کے مقررہ حدود سے تجاوز کرنے والوں

کو اللہ نہیں چاہتا۔

کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے۔

۱۲ فی الدعاء وغیرہ۔
یعنی دعاء اور دعاء کے جوابات میں۔

اسی بنیاد پر علماء امت کا یہ اجتماعی و اتفاقی فیصلہ کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم رقمطراز ہیں۔

۱۲ جمع العلماء ۱۲ منہ لا یحبون ۱۲ ن
علماء کا اتفاق ہے کہ آدمی کے لئے جائز نہیں

۱۲ دعوا الانسان ۱۲ ان یطلع السماء او
ہے کہ وہ ایسی دعاء مانگے کہ آسمان پر چڑھیں گے

۱۲ تحول یجبل الفلا فی ذہب ۱۲ و یحی لہ
یا فلاں پہاڑ کو سونا بنا دیا جائے یا مردہ کو

الموتی وغیرہ (الحزب الثانی بر حاشیہ حصین ص ۲۵)
زندہ کر دیا جائے۔

پیدائش کے مقررہ قوانین کے بدل دینے کی درخواست خود پیدا کرنے والے سے بھی کرنا مذہباً جب جائز نہیں ہے تو پیدائش

کے ان معینہ طریقوں کا چھوڑنا ان لوگوں کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے، جنہیں ان ہی قوانین کا پابند بنا کر حق تعالیٰ

نے پیدا کیا ہے۔

سلطانی و غیر سلطانی | البتہ ایک چیز جس کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ پیدائش کی جن راہوں کے متعلق باور

قوانین کا تعلق | کرانے والے یہ جو باور کرتے رہتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے جانا ہے، وہی واقع میں بھی خدا کی

بنائی ہوئی قطعی راہیں ہیں، یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا کہ باور کرانے والے اپنے نزدیک اسے خیال کئے ہوئے

ہیں۔ ابھی عرض کیا گیا تھا کہ واقعی جو خدا کی بنائی ہوئی مقررہ راہ ہے۔ اس سے اعراض یا اس کی خلاف ورزی

تو خدا کی، خدا کی مرضی کی، خدا کے قانون کی خلاف ورزی ہے، ایک ایسی چیز کے توڑنے کی یہ کوشش ہے جس

کے توڑنے کی درخواست خود پیدا کرنے والے سے بھی اسلام جائز قرار نہیں دیتا۔ لیکن عام طور پر جن نظریات

و مسلمات کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ فطرت کے قوانین اور قدرت کے آئین ہیں۔ ظلم ہو گا اگر ہر شخص کو

اس کا حق نہ دیا جائے کہ بجائے خود وہ بھی اس کی تحقیق کرے کہ واقع میں وہ خدا کی مقررہ راہیں ہیں یا

نہیں محض دوسروں کے قول پر بھروسہ کر کے ان کی ناقص معلومات کے متعلق یہ اصرار کرنا کہ انھیں خدائی قانون یقین کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ نہ یہ عقلاً درست ہو سکتا ہے، اور نہ مذہباً۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر انسانوں ہی کے مسلمات اُن ہی کے نظریات کے متعلق۔

ما۲ نزل ۱ اللہ بہا من سلطان۔

نہیں اتارا خدا نے اس کے لئے سلطان۔

کا اعلان، یا

لاؤ کوئی کھلا ہوا "سلطان"

فاتو۲ بسلطان حسین۔

وغیرہ کے مطاببات جو پائے جاتے ہیں۔ ان سے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مختلف چیزوں کی پیدائش کی جو مختلف راہیں اس عالم میں پائی جاتی ہیں، اور ہم اپنے معلومات و تجربات کی بنیاد پر ان کے متعلق جو نظریات و قوانین بناتے رہتے ہیں۔ قرآنی تعلیم کے لحاظ سے ان قوانین کے ایک سلسلہ کو تو ہم سلطانی قوانین کہہ سکتے ہیں اور اسی کے مقابلے میں دوسرے سلسلہ کا "غیر سلطانی قوانین" نام رکھا جاسکتا ہے۔

لفظ سلطان اور نزول کی تحقیق | "سلطانی قوانین" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بادشاہی قوانین ہیں، یعنی حق تعالیٰ کو بادشاہ اور سلطان قرار دے کر ان کے بنائے ہوئے قوانین کو سلطانی قوانین کے نام سے میں موسوم کر رہا ہوں، اردو میں سلطان کے معنی چونکہ بادشاہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے قدرتا لوگوں کا ذہن شاید اسی طرف منتقل ہو جائے۔ ضرورت ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں کی جن سے قوانین کی یہ تقسیم پیدا ہوتی ہے۔ شرح کر لی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان میں سلطان کے لفظی معنی "غلبہ" اور "تسلط" کے ہیں۔ چونکہ سلاطین کو بھی ملک پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے سلطان کے لفظ کا ان پر بھی اطلاق ہونے لگا۔ مگر ان آیتوں میں "سلطان" کا لفظ دراصل غلبہ اور اور استیلاء، تسلط ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تو سلطان کے لفظ کی تحقیق ہوئی، دوسرا لفظ جو یہاں قابل غور ہے وہ "ما۲ نزل ۱ اللہ" میں "نزل" کا لفظ ہے۔ انزل کا مادہ نزول ہے۔ نزول کے معنی اترنا اور انزال کے معنی اتارنا ہے، عام طور پر قرآن کی طرف بھی تنزیل و انزال کے الفاظ قرآن میں چونکہ نسباً کئے گئے ہیں۔ اس لئے دوسری چیزوں کی طرف بھی جب اس لفظ کو حق تعالیٰ کی نسبت سے منسوب کیا جاتا ہے، تو پہلا خیال اسی تنزیل اور انزال کے معنی کی طرف ہلا جاتا ہے۔ جو قرآن کے متعلق سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً

ما۲ نزل ۱ اللہ بہا من سلطان۔

نہ اتارا خدا نے اس کے لئے سلطان۔

کے متعلق عموماً ذہن ادھر منتقل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے متعلق کوئی وحی نہیں ہوئی۔ یا پیغمبروں کو کوئی علم اس کے متعلق عطا نہیں ہوا۔ اگر اس آیت میں بھی "انزل" کے یہی معنی لئے جائیں گے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سلطانی قوانین سے مراد وہ قوانین ہوں گے۔ جن کے قانون الہی ہونے کی تصریح قرآن میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کی گئی ہو، اور غیر سلطانی قوانین سے مراد وہ باتیں ہوں گی، جن کی تصریح شریعت میں نہ پائی جاتی ہو، لیکن سچ یہ ہے کہ محض "انزل" کے لفظ کی بنیاد پر اگر ایسا سمجھا جاتا ہے۔ تو خود قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کون نہیں جانتا کہ قرآن میں "الحمد" کو ہے کے متعلق بھی یہ آیت پائی جاتی ہے۔

وانزلنا الحديد فيه باس
اتارا ہم نے لوہے کو جس میں بہت زیادہ
شدید -
زور بھرا ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ ”الحديد“ یعنی لوہے کے متعلق یہ باور کرنا کہ حق تعالیٰ نے کسی پیغمبر پر اس کی بھی وحی کی، نہ عقلاً صحیح ہے نہ نقلاً بلکہ اس کا صاف کھلا ہوا سلفاً عن خلف ہی مطلب سمجھا گیا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے لوہے کو پیدا فرمایا“ جس سے معلوم ہوا کہ ”انزل“ کے لفظ کو صرف الہام و وحی کے ساتھ مختص کرنے پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

اب ان لغوی تشریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ یہ ظاہر خیال میں یہی بات آتی ہے کہ اس دُنیا کے کچھ قوانین تو ایسے ہیں جن میں خدا نے سلطانت کی صفت پیدا کی ہے۔ یعنی اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ ان کی واقعیت کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً آگ جلاتی ہے، مرچ تلخ ہے، شکمیا قاتل ہے۔ آفتاب روشن ہے، گرم ہے، قدرت کے ان ہی قوانین کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی اصطلاح کی بنیاد پر میں ”سلطانی قوانین“ قرار دیتا ہوں، اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں جن کے ساتھ انسان کی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے۔ وہی غیر سلطانی یا تیں سمجھی جائیں گی۔ اس تقسیم کے بعد اب باسانی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائش و تخلیق کی وہ واضح اور کھلی ہوئی راہیں جن کے آثار و نتائج کا کسی حال میں کسی طرح انکار ممکن نہ ہو، انسانی فطرت پر جن قوانین کی سلطانت اور تسلط کی یہ کیفیت ہوگی۔ خدا کے ان سلطانی قوانین کا سنتہ اللہ ہونا یقینی ہے۔ اسی لئے اس کو چھوڑ کر کسی اور راہ سے ان چیزوں کی پیدائش اور حصول کی کوشش کرنے والے مثلاً بغیر بیوی کے اولاد کو ڈھونڈھنے والے، جوتے بوئے بغیر، لہلہاتی فصلوں کی آس لگانے والے، شکمیا کھا کر زندگی کی امید رکھنے والے، خدا کے مقرر کردہ قوانین کے متعلق باخیاذ اعتدالی طرز عمل اختیار کر کے گویا اس سے لڑنے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہیں۔

لیکن معاشیات ہو، یا سیاسیات، طبیعیات ہو یا عمرانیات، یا اسی قسم کے عام عقلی و ذہنی علوم، ان کے تمام نظریات و مسئلہات کے متعلق یہ فیصلہ کہ ان میں سے کسی نظریہ یا کسی مسلمہ کی خلاف ورزی، خدا کی سنت یا سلطانی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتنی بڑی زبردستی ہے۔ جزییات تو خیر جزییات ہیں ان عقلی علوم و فنون کے کلیات بلکہ اساسی مقدمات تک بھی اجماعی مشتبہ اور محمل نظر و بحث ہیں، طبیعیات ہی کو لیجئے جن پر ہزار ہا ہزار سال سے انسانی عقل مسلسل کام کرتی چلی آرہی ہے لیکن تفصیلات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اس علم کے مختلف دبستانوں مثلاً ایلوپیتھک، ہومیو پیتھک کے بنیادی مقدمات ہی میں آسمان و زمین کا فرق ہے، ایک میں ضد کو ضد سے دفع کرنے کا تجربہ پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس کا سارا معاملہ جاتی نظام اسی اساس پر مبنی ہے۔ دوسرے میں بالکل اس کے خلاف، علاج بالمثل کے نظریہ پر اصرار کیا جاتا ہے علاج کے ان دونوں متضادم و متخالف نظاموں سے لوگوں کو شفا بھی ہوتی ہے، اور نہیں بھی ہوتی ہے! اب فرض کیجئے کہ ایلوپیتھک طریقہ علاج کو ترک کر کے کوئی ہومیو پیتھک والوں کی طرف رجوع کرتا ہے، تو کیا اس پر یہ الزام لگانا درست ہوگا کہ وہ قدرت کے قانون سے جنگ کرتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے طبی تجربات، اور علاجی نظریات اس وقت تک اپنے تاثری نتائج کے لحاظ سے عموماً ایسے حال میں ہیں کہ ان کی غیر قطعی یا غیر سلطانی کیفیت کی وجہ سے اگر کوئی علاج و معالجہ کی نفع بخشی کا بھی منکر ہو جائے تو

جہاں تک اقعات کا تعلق ہے، ایسے آدمی پر بھی سنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام شاید قرین انصاف نہ ہوگا۔

ایسی صورت میں غور کرنے کا مقام ہے کہ پیدائش کی راہوں کے متعلق غور و فکر کا جو سلسلہ جاری ہے اور اس وقت تک ان ہی کو پیش نظر رکھ کر انسانی زندگی کے معاشی پہلو کے متعلق جو قوانین اور کلیات آئے دن بن رہے ہیں کبھی سرمایہ داری کے نظام میں انسان کی فردوس گم گشتہ کا سراغ لگایا جاتا ہے، اور مشورہ دیا جاتا ہے کہ سود خواری یا اولاد کبیر کی توریث۔ الغرض گنج سے گنج کھینچنے میں جس قوم کے افراد جس حد تک کامیاب ہوں گے اسی حد تک اس قوم کا معاشی نظام ترقی کی منزلوں کو طے کرے گا۔ کبھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ انسان اگر اپنی کھوئی ہوئی جنت کو پھر پانا چاہتا ہے، تو ان تمام راہوں کو بند کرے جن سے ملک و قوم کے خاص خاص افراد کی جیبوں میں دولت سمٹی ہو، حکم دیا جاتا ہے کہ جو ہم میں غریب ہیں۔ وہ تو خیر غریب ہی ہیں۔ لیکن آدم کی اولاد میں تھوڑے بہت امیروں کی جو مقدار ہے، بزور شمشیر ان کو بھی غریب بنا دیا جائے۔ مجھے اس سے ابھی بحث نہیں کہ سرمایہ دوستی اور سرمایہ دشمنی ان دونوں متخالف نظریات میں معاشی فلاح و بہبود کے لحاظ سے صحیح کون ہے اور غلط کس کو قرار دیا جائے۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ جن علوم و فنون میں آئے دن ایسے متناقض نظریات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ ان ہی نظریات کو سلطانی فیصلوں کے رنگ میں پیش کرنا، خود بھی ان پر حد سے زیادہ اصرار کرنا۔ اور دوسروں کو بھی ان کے ماننے پر مجبور کرنا۔ اور اس حد تک مجبور کرنا کہ جس بد قسمت کو تھوڑا بہت بھی ان سے کچھ اختلاف ہو، ان پر سنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام لگا دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے، بلکہ حکیمانہ تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) کا اقتضا، تو یہ تھا کہ لفظی سطوتوں، لسانی طغیوں، افسانوی مغالطوں، شاعرانہ بیروں سے دماغوں کو بالکل آزاد کر کے اعتمادی کیفیت کو قوانین کے سلطانی رنگ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا، جن چیزوں میں سلطانت کا رنگ تیز نظر آتا۔ اسی حد تک اعتماد و وثوق کی کیفیت میں بھی تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اور جس میں جس حد تک سلطانت کا رنگ دھیمہ محسوس ہوتا۔ اعتمادی کیفیت کے احساس پر بھی اسی حد تک کم زور دیا جاتا۔ اصل حقائق کی واشگافی کا یہی اور صرف یہی محتاط اور محفوظ ترین طریقہ ہے۔ اور یہی آزاد تنقیدی ذہنیت ہو سکتی تھی۔ جس کے پیدا کرنے کے لئے قرآن میں اس قسم کی آیتوں کا مثلاً

ان ہی الاۓاء سمیتہا ۲۱
اباءکم ما انزل اللہ بہا من سلطان
ان یتبعون الاۓاء الطن وما ھو الا لفس
دادوں نے نہیں تارا اللہ نے ان کیلئے سلطان نہیں پیروی کرتے ہیں لیکن صرف اس کی اور ان باتوں کی جن میں کاجی چاہتا
نام (یا الفاظ) جسے رکھ لیا، تم نے اور تمہارے باپ
نہیں ہے ان کو اس کی دانش (صحیح) نہیں پیروی
کر رہے ہیں وہ لیکن اس کی اور اس کی واقعہ سے
آدمی کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔

ما لھم بہ من علم ان یتبعون
الاۓاء الطن وان الطن لا یغنی
من الحق شیئاً۔

بار بار عائدہ مختلف پرانیہ بیان سے کیا گیا ہے، ورنہ صرف اس لئے کہ جو روٹی اچھی پکاتا ہے وہ خیا طمی
اس بھی ضرور ماہر ہوگا، یا صنعتی دستکاریوں، میکانیکی اولوالغریبوں میں جس نے مذاقت کا ثبوت دیا ہے، کوئی وجہ

نہیں ہو سکتی کہ اجتماعی مسائل اور معاشی نظریات میں اس کی عقل غلطی کرے۔ گویا جس کے شعرا چھپتے ہیں! اس کے دماغ کے ریاضیاتی نتائج کو بھی یقیناً صحیح ہونا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطانت کے قدرتی معیار سے ہٹ کر تحقیق و تلاش کے باب میں جہاں کہیں ان غیر منطقی تقلیدوں کی وبا پھوٹی ہے، یا اسی طرح اس راہ میں جہاں ناموں کو پوچھا گیا ہے۔ بڑائی کے ساتھ جس کا چرچا کیا گیا۔ اس کی ہر بات بڑی سمجھی گئی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ قوموں کے اس طرز عمل نے لوگوں کو کن کن چیزوں کے ماننے پر مجبور نہیں کیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہیں بے احتیاطیوں کی بدولت قوموں اور امتوں کو قرنہا قرن تک غیر سلطانی کیا افتراقی قوانین تک کی جکڑ بندیوں میں پھڑپھڑانا پڑا ہے اور کتنے ہیں جو انہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، آخر ان ہی انسانوں میں کتنے ہیں جنہیں بدہ کے دن میں مصائب کا طوفان نظر آیا۔ غریب تیرہ کے عدد میں اتنی قوت لوگوں کو محسوس ہوئی کہ کسی سخت سے سخت حادثہ کو وقوع کر دینے کے لئے وہ کافی ہے۔ فاسخانہ اقدام کو بدبختانہ انجام سے بدلتے ہوئے کتنوں نے راہ کاٹنے والی غریب کالی بتی کو دیکھا ۱۱ غیر ذلک من الخرافات والا وہاں حالانکہ سلطانی معیار سے جانچنے کا اصول اگر اختیار کیا جاتا۔ تو ایک ان دیکھے فرضی دن یا تیرہ اکائیوں کے مجموعہ میں کیا واقعی یہ کراستیں باقی رہ سکتی تھیں، راہ کاٹ کر گذر جانے والی بتی کی مجال تھی کہ کسی فرد کو نہیں، بلکہ قوم کو حرمان نصیبی کے خندقوں میں ہمیشہ کے لئے

۱۱ جس طرح سلطانی کی اصطلاح قرآن سے حاصل کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ اصطلاح بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ جو سلطانی قوانین کے بالکل مفہوم مخالفت کی تعبیر ہے۔ یعنی ایسی باتیں جنہیں خدا نے چیزوں کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا ہے۔ ان کے متعلق یہ باور کر لینا کہ اس سے فلاں چیز پیدا ہوتی ہے۔ فلاں نتیجہ اس پر مرتب ہوتا ہے مثلاً بدہ کے دن کے متعلق یہ یقین کرنا کہ ہر قسم کے نقصانات اس شخص کو پہنچا دیتا ہے جو سفر کے لئے اس دن اپنے گھر سے نکلے گا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نقصانات کا ذریعہ خدا نے تو بدہ کو بنایا نہیں۔ اب جو غریب بدہ کے سران آثار و نتائج کو تقویٰ پتے ہیں۔ دراصل خدا پر افترا اور جھوٹ باندھ رہے ہیں حام و وصید، سائبہ وغیرہ جانوروں کی طرف عربوں نے جن آثار کو منسوب کر رکھا تھا۔ قرآن میں اس کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے بل الذین کفرو یفترون علی اللہ الکذب و اکثرهم لا یعقلون ۱۲

۱۲ ان غیر سلطانی افتراقی قوانین نے بربادیوں کے جس سیلاب کو پیدا کیا ہے۔ آج اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، زراعت ہو یا تجارت معاشرتی تقریب ہو یا کوئی انفرادی کام، صرف ہندوستان محض ان ہی افتراقی قوانین کی بدولت ہر سال کروڑ ہا کروڑ روپے کا نقصان اٹھا رہا ہے۔ اور کوئی نہیں جو مصائب کے اس طوفان سے اس ملک کو نجات دلائے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مدتوں لال رنگ کے گتوں کی کاشت سے کسانوں نے اس لئے نفع نہ اٹھایا کہ ان کو بار کر دیا گیا تھا کہ اس گنے کو جو بوئے گامرجائے گا جس سال میرے عزیز بھائی سید مہکم احسن گیانی نے اپنے گاؤں گیلان میں اس گنے کی کاشت کی ابتدا کی۔ علاقہ میں شور مچا ہو گیا۔ کتنوں نے ہاتھ جوڑے پاؤں پکڑے کہ خدا اس کی کاشت نہ کیجئے۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی سال میرے والد حافظ ابوالخیر مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ پھر کیا تھا! گ کی طرح اطراف کے دیہاتوں میں خبر پھیلا دی گئی کہ سرخ گتوں نے آخر بولوی صاحب کے والد ہی کو ختم کر دیا۔ میں جب گھر پہنچا۔ اور بدتمیزی کے اس طوفان میں مہکم سلمہ کو گھرایا۔ تو ان کافر کسانوں کے سامنے اپنے گھر کے مرنے والوں کی طویل فہرست پیش کی اور پوچھتا گیا کہ آخر ان بیچاروں کو کس گنے نے مارا۔ لیکن وہ ہر حال ہی کہتے رہے کہ بیکاران گتو، کو جو کہ حافظ صاحب کو آپ لوگوں نے ختم کرایا ۱۲

جھونک دے۔ لیکن کیا تمنا ہے کہ سلطانی راہوں میں معاشی پیداواروں کو ڈھونڈتے ہوئے جو ایمان و تقویٰ، دعا و استغفار، صبر و شکر، توکل و تسلیم کے مختلف ناموں سے ان تدبیروں کو بھی اختیار کرتا چلا جاتا ہے جن سے خود پیدا کرنے والے کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔ حصول معاش کی راہ میں اس طرز عمل کے نتیجہ خیز ہونے پر جو بھروسہ کرتے ہیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر وہی طبقہ گھبرایا جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی سرپیٹ لیتا ہے۔ جس نے خدا جانے کتنی غیر سلطانی راہوں کو بیدائش کی سلطانی راہ محض اس لئے باور کر لیا ہے کہ انجن بنانے والے، ہوائی جہاز اڑانے والے ریڈیو بجانے والے یورپ کا یہی عقیدہ ہے۔

گوجی تو نہیں چاہتا کہ کھدوں۔ لیکن آئندہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہی بیان چونکہ اس کی تہید بن جائیگا اس لئے کہہ ہی دیتا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ آج معاشی جدوجہد کے سلسلے میں دعا و استغفار، توکل و تسلیم وغیرہ یا دوسرے لفظوں میں وہی کہئے کہ پیدا کرنے والے سے اس کی پیداواروں کے مانگنے کی خواہش گھٹائی جا رہی ہے۔ تو گو سیلج پر قومی شیونوں میں تو یہی کہا جاتا ہے کہ خدا سے مانگنے کا ہمیں انکار نہیں ہے، خدا کی بات تو اپنی جگہ پر درست ہے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ ان رجحانات کو اگر زیادہ تیز کر دیا گیا۔ تو حصول معاش کے جو واقعی اسباب ہیں۔ مسلمان ان کے اختیار کرنے میں سست پڑ جائیں گے۔ مسلمانوں کے جن طبقات ہیں اس قسم کے خیالات واضح یا نا واضح شعوری یا غیر شعوری شکلوں میں نشوونما پا رہے ہیں۔ چونکہ ان خیالات کی پیدائش میں، ان ہی حالات کو دخل ہے۔ جن میں آج یورپ مبتلا ہے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے، ان مغربی مؤثرات پر بھی بحث کی جائے۔ آئندہ آپ کے سامنے جو چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ غور سے ان کو پڑھیے۔ دلوں کا پھیرنے والا تو وہی ہے جس کی دونوں انگلیوں میں بندوں کے قلوب ہیں۔ اپنا جو فرض ہے اسے ادا کرتا ہوں و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

گذشتہ بالا مباحث میں آخری بات جو میں نے ”قرآنی مینا“ کے حوالوں سے پیش کی تھی، یعنی ”حیات طیبہ“ اور صاف ستھری معاشی زندگی کی ضمانت قرآن کی رو سے اسی میں ہے کہ خالق کائنات کو ”المعاد“ بناتے ہوئے اُسی کو اپنا ”المعاش“ بھی تسلیم کر لیا جائے۔ جن واضح اور کھلے کھلے لصوص سے یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے۔ آپ انہیں پڑھ چکے۔ ایک مسلمان کے لئے تو یہی کافی ہے کہ یہ قرآن کی آیتیں ہیں۔ اور یہ اس کے عطا فرمودہ ہدایات ہیں جس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں ناقص مقدمات سے پیدا کئے ہوئے ناقص نتائج کی کوئی قیمت نہیں۔ خواہ بہ ظاہر ان میں جتنی بھی معقولیت نظر آتی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مان کر جو طے کر چکا ہے کہ اسی ایمان پر زندہ رہوں گا اور اسی پر مروں گا۔ ایسا آدمی تو یقیناً شک و شبہ سے بلند و برتر ہو چکا ہے۔ لیکن کمزور ایمان والوں کو بسا اوقات وساوس ستاتے ہیں۔ قرآن میں چوں کہ ان وساوس کے ازالے کا بھی کافی سامان کیا گیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے اس مقدمے کو اسی بحث پر ختم کیا جائے۔

غیر مسلم اقوام کی دنیاوی بات یہ ہے کہ کچھ آج ہی نہیں۔ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی تعلیم کو مسترد کامیابیوں کا دھوکہ کرنے والوں میں خود بخود اور خود راؤں کا ایک طبقہ عموماً ایسا بھی پایا گیا ہے جو

اپنی معاشی کامیابیوں، بہ ظاہر کامیابیوں اور فراخ بالیوں کو دکھا دکھا کر اس دعویٰ کے پیش کرنے کا عادی تھا۔ قرآن میں یہ اس الفاظ یعنی

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ

اگر پیغمبروں کی بات بہتر ہوتی تو اس کی طرف

سبقت وہ لوگ نہ کرتے جو پیغمبروں کے ماننے والے ہیں۔

جس کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہتے تھے کہ زندگی کے کسی اصول یا طریقہ حیات کے خیر اور بہتر ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ ہم اور ہمارے دماغ نے اس کے پالنے میں سبقت کی ہو، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ یا جس کے سمجھنے میں ان کے دماغ نے پیش قدمی نہ کی، یہی چیز اس کے غلط اور بے معنی ہونے کے لئے وہ کہتے تھے کہ کافی ہے۔ استدلال کرتے ہوئے ان کا بیان یہ بھی تھا جسے قرآن ہی نے نقل کیا ہے، یعنی کہتے

نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا

اموال اور اولاد میں تو ہم بڑھے ہوئے ہیں۔

نَحْنُ بِمَعْنٍ بَلِين۔

اور ہم عذاب پالنے والوں میں نہیں ہو سکتے

درحقیقت یہ اسی لب و لہجہ میں گفتگو ہے۔ جسے آج ان قوموں نے اختیار کر رکھا ہے۔ جو خود بھی اپنے آپ کو تمدن اقوام اور اپنے ممالک کو شائستہ و مہذب ممالک کے نام سے مشہور کئے ہوئے ہیں۔ اور جو ان کے نام لیوا یا دعار گو ہیں۔ وہ بھی ان ہی شاندار جباری القاب و خطاب سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ قرآن ہی میں ہے کہ جب پیغمبران کو خدا کی آیتیں سناتے ہیں تو پیغمبروں کے منکر کہتے

۱۲ یٰۤاَلسَّٰفِقِیْنَ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ

یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بناؤ کہ مرتبہ

۱۲ حَسَنٌ فِدَا یَا۔

میں کون بہتر ہے۔ اور کس کے جلسے زیادہ

(طہ) شاندار ہیں۔

امریکہ و یورپ | سادہ الفاظ میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یورپ اور امریکہ کے باشندے جو ”المعاش“ تو خیر کی کامیابیاں دور کی بات ہے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ کو ”المعاد“ بنا کر بھی پوجنے پر آج آمادہ نہیں۔ بلکہ اپنی تمدنی بلندیوں، تو نگری کی بے پناہ قوتوں کو دکھا دکھا کر دُنیا کو یہ باور کر رہا ہے کہ معادی نہ سہی، لیکن معاشی جدوجہد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے خدا کو ”الا“ بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگر دُنیا میں خدا کو خوش و ناخوش رکھنے ہی پر معاشی ترقیوں کا دار و مدار ہوتا۔ تو یورپ اور امریکہ کے باشندوں کو چاہئے تھا کہ دُنیا کے غریب ترین لوگ ہوتے۔ لیکن معاملہ بالعکس، دن کی روشنی میں ہر شخص کو نظر آ رہا ہے، فحور کی کوئی شکل، فسق کوئی طریقہ، المھاو کی کوئی صورت، زندہ و بے دینی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے، جس میں یورپ کا پانی ملک اور امریکہ کے ناستک ادھر م لوگ مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے کہ معاشی عروج کا بھی کوئی زینہ ایسا نہیں ہے جس پر پہنچنے سے یہ محروم رہ گئے ہوں۔ قال سے نہ سہی۔ لیکن زبان حال سے وہی۔

نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا

اموال اور اولاد میں تو ہم بڑھے ہوئے ہیں

نَحْنُ بِمَعْنٍ بَلِين۔

اور ہم عذاب پالنے والوں میں نہیں ہو سکتے۔

کی آواز آج بھی بنی آدم کی بستیوں میں گونج رہی ہے۔ اور یہ گونج کانوں سے گذر کر دلوں کی گہرائیوں میں اس حد تک

جگہ پکڑ چکی اور بتدریج پکڑتی چلی جا رہی ہے کہ کچھ مجھ ہی سا کوئی دیوانہ ہو تو ہو کہ اپنے عہد کی ذہنیاتوں سے بے پروا ہو کر یہ جانتے ہوئے کہ میری ہر بات میری ہی طرف واپس ہو رہی ہے۔ لیکن باوجود اس کے انتہائی سادگی کی راہ اختیار کر کے وہ وہی کہتا چلا جائے جس کے کہنے اور پہنچانے ہی کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنائے ہوئے ہو لیکن باایں ہمہ جنون و وارفتگی۔ یہ واقعہ ہے کہ پیش کرنے کی حد تک تو جو کچھ میری سمجھ میں آتا گیا۔ پیش کرتا چلا گیا۔ مگر جو واقعہ ہے اسے کیسے چھپاؤں کہ یہ احساس بھی ساتھ ساتھ دل میں مسلسل چٹکیاں لیتا چلا جاتا تھا کہ جس موسم میں تو یہ چیزیں پیش کر رہا ہے۔ یہ ایسا موسم ہے جس میں تیری بات نہ صرف بہتوں پر گراں ہی گذر رہی ہوگی۔ بلکہ ایک بڑا گروہ ان کا بھی ہوگا۔ جن کے جڑوں سے باہر نکلنے کے لئے بے ساختہ قہقہے بے چین ہوں گے، بلکہ ممکن ہے کہ بعضوں کے اندر سے نکل بھی پڑے ہوں۔ اگرچہ سرگرمیوں کے اس احساس اور قہقہوں کے ان خطرات کے مقابلے میں میرا دل بھی مسلسل قرآن ہی کی ان آیتوں کی تلاوت و درود میں مشغول ہو جاتا تھا۔ یعنی اس قسم کے لوگوں کو خطاب کر کے مختلف الفاظ میں قرآن میں ڈانٹتے ہوئے جو ارشاد فرمایا گیا ہے۔

کلوا و تمتعوا قليلاً انکم عجمون
کھا لو مزے اڑا لو تھوڑے دن کے لئے
(المرسلات)

یا خبر دی گئی ہے

الذین کفرو ۱ یتمتعون و یاکلون
کما تاكل ۱ الانعام و النار مشوی لهم
جنوں نے کفر کیا اور مزے اڑا رہے اور کھا رہے
ہیں سی طرح۔ کھا رہے ہیں جیسے چوپائے کھاتے
ہیں۔ اگ ٹھکانا ہے ان کا۔
(سورہ محمد)

ان لوگوں کو جنہیں آج اپنے عزیز الکیم (آنریبل، اسکوئر) ہونے پر ناز ہے، انہیں کو جتلا دیا گیا ہے کہ آج کچھ بھی نظر آ رہا ہو۔ لیکن بہر حال زندگی کے ایک ایسے دور سے انہیں دوچار ہی ہونا پڑے گا جہاں
حق ۱ ۱ انک ۱ انت ۱ العزیز الکوریہ
اب چکھ! تو بڑی عزت آبرو والا
(الدخان)

کے کچھ کوں سے ان کی مہمان نوازی کی جائے گی۔ بہر حال اسی قرآن میں بکثرت آپ کو ایسی آیتیں ملیں گی جن میں لاہوتی استغنا کے ساتھ

و کم ۱ اهلکنا قبلہم من قرن ہم
اشد منهم بطشا فنقبوا فی البلاد
اور ہلاک کر دیا ہم نے کتنے قرن کو جو پکڑ میں
ان سے سخت تھے۔ وے بلاد میں گھس پڑے
تھے۔ پھر یہ کیا کوئی جائے خلاص۔
صل من محیص۔

ان لوگوں کو چونکایا گیا ہے۔ جنہیں اپنی گرفت و بطش کی شدت اور بلاد اللہ میں تسخیری قوتوں کے ساتھ گھس پڑنے چھا جانے نے یہ باور کرا دیا ہے کہ ہلاکت و زوال کی راہوں کو اپنے اوپر اور اپنی قوم و ملک پر وہ بند کر چکے ہیں۔ وہی جو قسمیں کھا کھا کر مالنا من زوال (ہمارے لئے زوال نہیں ہے) کے دعووں سے آسمان کو سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ ان ہی کو خطاب کر کے اعلان کر دیا گیا ہے۔

فلا تحسبن اللہ محلف وعده
مرسلہ ۱۲ ان اللہ عنہ حیر
ذو انتقام۔

ہرگز نہ خیال کرنا کہ اپنے رسولوں سے خدا نے جو
وعدے کئے ہیں۔ ان کا خلاف کرے گا۔ قطعاً
اللہ تعالیٰ غالب اور انتقام والا ہے۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نوحی، عادتی، ثمودی، بابتی، مصری اور یمنی وغیرہ تمدنوں اور ان کے زوال و سقوط کے
جو قصے قرآن میں بار بار دہرائے گئے ہیں، صرف ناموں کی خصوصیت سے قطع نظر کر لینے کے بعد جس کا جی چاہے
ان تمام قرآنی قصص کو موجودہ عمرانی بغاوتوں، اور تمدنی طغیانوں پر منطبق کر کے اپنی تسلی حاصل کر سکتا ہے۔
لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ ان ایمانی آیات اور قرآنی مسکنات کے سوا جہاں تک میرا خیال ہے
قرآن ہی میں ڈھونڈھنے والوں کو ایسی چیزیں بھی مل سکتی ہیں، جن میں غور کرنے والے اگر غور کریں گے تو اس پر
دقیقاً نوسی و سوسہ کا خواہ یا ور کرانے والے اسے جتنا بھی جدید اور عہد روشن خیالی کی پیداوار قرار دیتے ہوں بہرہ
اسی پیش یا افتادہ عام مغالطہ کا جواب قرآن ہی میں ایسے سلجھے ہوئے الفاظ میں مل سکتا ہے جن سے ایمان ہی
نہیں۔ بلکہ آدمی کی عقل بھی چاہے تو خنکی حاصل کر سکتی ہے۔ اور اب میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ ان ہی
قرآنی آیات کو اپنی سمجھ کے مطابق پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ یوں بھی اس کی ضرورت اس لئے زیادہ محسوس
ہو رہی ہے کہ قرآن کی مذکورہ بالا دھکیوں کا ایک جواب بھی عام طور پر دنیا میں پھیلا دیا گیا ہے۔ باور یہ کر لیا جاوے
ہے۔ وہی جن کے سامنے بتدریج ان کے کرتوتوں کے مہیب نتائج و انت دیکھا رہے ہیں۔ ان ہی کی طرف سے
یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ جیسے انسانی افراد کا بچپن، جوانی کے عہد سے گذر کر بالآخر پیرائے سالی کے پنجہ میں گرفتار ہوتا
ایک قدرتی واقعہ ہے، اور بڑھاپے کے بعد موت کے آغوش میں چلا جانا ہر جینے والے کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی
طرح قومیں بھی چونکہ اسی قانون کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔ بالآخر بوڑھی ہو کر اپنی طبعی موت کے ساتھ مرجاتی
ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن پیش آنے والے عواقب و نتائج کے متعلق قرآن الارم دے رہا ہے۔ ان نتائج کو
بجائے خدا کی انتقام اور ناراضی کے چاہتے ہیں کہ فطرت اور نیچر کی طرف منسوب کر دینے کا عام جواب پیش آنے
سے پہلے ہی تیار رکھیں۔ اس جواب کا ڈھنڈورہ اتنی شدت سے پٹیا گیا ہے کہ خدا کا عذاب حالانکہ ان اقوام کے
سامنے گویا بے نقاب ہو چکا ہے، لیکن توجیہ اور تاویل کا یہی ”پتھر“ ہے۔ جو صداقت کی بھوک کی انسانی فطرت
کے منہ میں اس لئے ٹھونسنا جا رہا ہے تاکہ تلاش و جستجو کے جن جذبات میں حالات ہلچل پیدا کر رہے ہیں۔ جذبات
کے اس تلاطم کو ساکن اور ٹھنڈا کر دیا جائے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسی پتھر سے عبرت و بصیرت کی آنکھیں بھی کھل گئیں
اندھی بنائی جا رہی ہیں۔ غیر تو غیر مجازاتی اور اخلاقی مکافات کی شکل میں ان واقعات کی تفسیر و توجیہ کی عادت
خود مسلمانوں میں دیکھا جا رہا ہے کہ بتدریج دھیمی پڑتی چلی جا رہی ہے اور روشن خیالی یا بلند مغزئی وغیرہ الفاظ کے
خول میں وہی پرانی جاہلی منطق دہرائی جا رہی ہے۔ قرآن میں جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یعنی

وان یرو کسفامن السماء ساقطاً
اور دیکھیں اگر وہ آسمان کے کسی ٹکڑے

یقولوا سبحان ربنا کرم۔
کو گرتا ہوا، تو کہنے لگیں یہ تو کوئی تہہ بہ تہہ

جما ہوا بادل ہے۔

ٹوٹے ہوئے ہار کے مانند ایک انتقام کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا مختلف شکلوں میں سامنے آتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھینسوں کے سامنے کوئی بین بجا رہا ہے۔ یا ان کا حال ان بکریوں کا سا ہے جن کے سامنے ان ہی کے منہ سے نکال نکال کر قصاب ان ہی کے بھائی بندوں کے گلوں پر چھری پھیرتا چلا جاتا ہے۔ ان کے خون سے سارا میدان لالہ زار بنا رہتا ہے۔ لاشیں تڑپتی رہتی ہیں۔ لیکن بے حس بکریوں میں اس کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے۔ اندھی بنی ہوئی گونگی اور بہری بنی ہوئی۔ جو کچھ ہوتا رہتا ہے اسے اطمینان سے دیکھتی رہتی ہیں۔ گویا یہ طے کئے ہوئے ہیں کہ جو کچھ بھی کسی طرح سے بھی سمجھا جائے گا۔ لیکن ہم نہ سمجھیں گے۔

خیر یہ تو جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے قطع نظر کر کے اس وقت میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن قوموں کی فردوسی زندگی کو دیکھ دیکھ کر ہر خیر اور بھلائی کے پرکھنے، جانچنے کا آج ان ہی کو جو معیار بنایا گیا ہے۔ کیا ان کی موجودہ زندگی درحقیقت واقعی فردوسی زندگی ہے؟ ایسی زندگی جس سے محروم رہ جانے والوں کو ٹنک اور پس کے بھنسل میں جلتے رہنا چاہئے، کیا ان کے باہر جو کچھ نظر آ رہا ہے، ان کا اندر بھی درحقیقت وہی ہے جو سمجھا جاتا ہے، قرآن کی روشنی میں چل کر حقیقت تک جو پہنچنا چاہتے ہیں، چاہئے کہ ذرا صبر اور معقول فکر و تامل کے ساتھ ان آیتوں پر غور کریں جو آپ کے سامنے اب لائی جا رہی ہیں۔

اصل آیات سے پہلے چند تمہیدی کلمات سن لیجئے۔

علم معاشیات کے متعلق | بات یہ ہے کہ اکانومی جو قدیم یونانی زبان کی ایک پُرانی اصطلاح ہے۔ عربی میں ایک سرسری تاریخی تبصرہ | اس کا ترجمہ تدبیر المنزل "کیا گیا تھا۔ یونانی فلسفہ کو حکمت نظری (تھیورٹیکل) اور حکمت عملی (پراکٹیکل) کے دو حصوں میں تقسیم کر کے ثانی الذکر یعنی حکمت عملیہ کی ایک شاخ اسی تدبیر المنزل کے لفظ سے موسوم تھی۔ سمجھایا یہ جاتا تھا کہ گھریلو زندگی کے تعلقات سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔ عربی میں چونکہ گھر کو منزل کہتے ہیں۔ اسی لئے تدبیر المنزل اس فن کا نام رکھا گیا تھا۔ گھریلو زندگی کے تعلقات سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ میاں، بیوی، بال بچے، نوکر چاکر وغیرہ کے متعلق مسائل و ضوابط اس فن میں بتائے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں "مال اور متمول" بھی۔ فن تدبیر المنزل کا ایک جز ان کتابوں میں ہوتا تھا۔ محقق طوسی نے اپنی کتاب اخلاق ناصری میں فن تدبیر المنزل اور جن امور سے اس میں بحث کی جاتی ہے! انہی کو بتاتے ہوئے لکھا ہے

بباید دانست کہ مراد از منزل دریں موضع
نہ خانہ است کہ از خشت و گل و سنگ و چوب
کنند بل از تالیف مخصوص است کہ میان
شو و والد و مولود و خادم و مخدوم و متمول

جانتا ہے کہ منزل کے لفظ سے یہاں
مراد اینٹ اور چوڑے پتھر اور لکڑی کا بنا ہوا گھر
نہیں ہے۔ بلکہ اس ترکیبی ہیئت کی یہ تعبیر ہے
جو بیوی، میاں، ماں، باپ، لڑکے، غلام، نوکر چاکر

مال اور مال والے سے مرکب ہوتی ہے۔

و مال اخذ۔

گویا فن تدبیر المنزل کے چار عنوانوں یا چار اجزاء میں سے ایک عنوان بحث یا ایک جز "متمول اور مال" کا بھی ان کتابوں میں ہوتا تھا۔ اسی لئے سمجھا جاتا تھا کہ منجہ دیگر مقاصد و اغراض کے اس فن کی بڑی غرض

خایت یہ بھی ہے کہ "تیسرا سبب معاش و توصل بہ کمال کے حسب اشتراک مطلوب باشد" (یعنی معاش کے اسباب میں سہولت بہم پہنچانا۔ اور اس کمال تک رسائی حاصل کرنا جو باہم (کسی گھر کے رہنے والوں کے اشتراک) بنیاد پر فراہم ہو سکتا ہو) لیکن یونانی زبان کی جو کتابیں اس فن میں لکھی گئی ہیں، ان کا حال تو معلوم نہیں جس کی بڑی وجہ وہی ہے جیسا کہ یہ خبر دینے کے بعد کہ حکماء و قدما در ادب میں نوز اقوال بسیارست۔ "محقق ہی نے یہ لکھا ہے

نقل کتب ایشان در فن از لغت یونانی ان حکماء کی کتابیں یونانی زبان سے عربی

بلغت عربی اتفاق نیفتادہ است۔ زبان میں منتقل نہیں ہوئی ہیں۔

عام طور پر اسلامی فلسفہ کی کتابوں میں جہاں حکمتِ عملیہ کی بحث آتی ہے مصنفین اس مشہور فقرہ

کے استعمال کرنے کے عادی نظر آتے ہیں یعنی

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن شریعت

قد قضت الشریعت المصطفویۃ

اس حاجت کی تکمیل کر چکی ہے۔

الخراج الوطر عنہا۔

البتہ طوسی نے صرف اتنا پتہ دیا ہے کہ

فن تدبیر المنزل کی ایک مختصر کتاب بروس حکیم کی

مختصرے از سخن ابروس کہ در دست متاخران

پچھلے لوگوں کے پاس پائی جاتی ہے۔

موجود است۔ (اخلاق ناصری ص ۱۱۷)

واللہ اعلم بالصواب یہ ابروس نامی حکیم کون شخص ہے۔ کیا نیوفیثاغوری اسکول کا مشہور معاشی

ماہر و مصنف بروسن کے نام کی یہ تصحیف ہے جس کی کتاب کا عربی ترجمہ حال ہی میں یعنی ۱۹۲۸ء میں ہائڈل برگ

جرمنی سے شائع ہوا ہے سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی کتابوں میں اس فن کے متعلق جو مباحث پائے جاتے

ہیں۔ وہ بروسن ہی کی کتاب "اروس کوٹومی کوٹوس" سے ماخوذ ہیں جس کا عربی میں ترجمہ ہو گیا تھا۔ اور اب یورپ

والوں نے تلاش کر کے اسی عربی ترجمہ کو شائع کیا ہے۔

کچھ بھی ہو، مجھے کہنا یہ ہے کہ "مال اور متمول" یعنی فن تدبیر المنزل کی اس شاخ کے مسائل اگرچہ نئے

نہیں ہیں، نہ اکائمی کا یہ لفظ ہی نیا ہے۔ اپنی اپنی حیثیت سے ہر زمانے میں اربابِ نظر و فکر کا ایک طبقہ اس کے

متعلقہ مسائل پر بحث و تحقیق کرتا رہا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں یوں تو دنیا کے اکثر علوم و

فنون کے بڑھانے اور پھیلانے میں یورپ والوں نے جو کام کیا ہے۔ یہ تو ایک عام بات ہے۔ مگر خصوصیت

کے ساتھ اس "مال و متمول" کی چھوٹی سی اکائمی کی شاخ میں مغربی فضلاء اور اربابِ تدقیق نے جتنی وسعت

پیدا کی ہے۔ اگر عمق سے قطع نظر کر لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس فن کے طول و عرض کو آج جتنا بڑھا دیا

گیا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ "مال و متمول" کے پرانے گئے چنے چند کلیات کے مقابلے میں یہ دعویٰ بے جا نہیں ہے

کہ اس عہد کا فن "معاشیات" ایک نو ایجاد اور بالکل تروتازہ فن ہے۔ گذشتہ دو ڈھائی صدیوں میں اس فن

نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی کتابوں سے چاہا جائے تو ایک بڑی لائبریری قائم کرنے والے قائم کر سکتے ہیں۔

شاید ہی کوئی دن گذرتا ہوگا جو یورپ کی بیسیوں زبانوں میں اس فن کی متعدد کتابیں نہ شائع ہوتی ہوں اسی کا

نتیجہ ہے کہ اس وقت تک دنیا کا یہ علم ایک ایسے سیال رواں دواں حال میں ہے کہ بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عصری علوم میں مشکل ہی سے اس صفت خاص میں اس فن کے ساتھ موجودہ علوم میں کوئی علم اس کی ہمسری کر سکتا ہے۔ حال یہ ہے کہ کتبیں ادھر لکھی جاتی ہیں۔ لکھنے والے محنت اور کوشش کر کے بالکل تازہ بہ تازہ نوبہ نو نظریات کو اپنی کتبوں میں درج کرتے ہیں، لیکن ان پر سال بھی گزرنے نہیں پاتا کہ کالج بدر ہونے کی رسوائی کے ساتھ علمی دائروں میں اپنی وقعت و قیمت وہ کھو بیٹھتے ہیں۔ معاشیاتی پیشہ وروں کے متعلق تو میں نہیں کہتا، شب و روز جب وہ اسی دھندے میں ڈوبے رہتے ہیں۔ تو ان پر بھی یہ حالت طاری رہتی ہے یا نہیں۔ لیکن جن بیچاروں کا ”معاشیات“ مخصوص مطالعاتی مضمون نہیں ہے، یہ واقعہ ہے کہ کسی وجہ سے اگر ان کو اس فن کے متعلق یا اس کے کسی نظریہ یا مسئلہ کے متعلق کچھ بھی لکھنا پڑتا ہے تو ماہرین اور فن کے ابناء، الاوقات کے استہزائی قہقہوں کے خوف سے ان کا قلم کانپتا جاتا ہے۔ ڈرتے رہتے ہیں کہ استحضار و استدلال میں جن کتبوں کے اقتباسات یا جن نظریات کو وہ پیش کر رہے ہیں۔ ان کا معاشیاتی دنیا سے ”دیس نکالا“ تو نہیں ہو چکا ہے، پھر اسی کے ساتھ ”متمول و مال“ پر بحث کرنے والوں نے اس قلیل عرصہ میں باخود ہا ایسے اساسی اختلافات پیدا کر لئے ہیں کہ بجائے خود ہر اختلاف ایک مستقل مکتب خیال کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ فن سے جس کا پیشہ وراہہ تعلق نہیں ہے۔ اس بیچارے کو سخت دشواری پیش آتی ہے کہ جس کتاب سے وہ کام لے رہا ہے۔ یا جس مسئلہ کو وہ دلیل و شہادت میں پیش کر رہا ہے اس کا تعلق ان بھانت بھانت کی معاشی بولیاں بولنے والوں میں سے کس ٹولی سے ہے۔ معیاری معاشیات والوں سے؟ یا ترقیبی والوں سے؟ یا افہامی والوں سے؟ پھر مصنف اس کا پروتاری معاشیات کا حامی ہے، یا بورژوا والوں سے اس کا رشتہ ہے، وہ برل ہے یا اشتراکی؟ کر سچینی معاشیات کے زیر اثر اپنے نظریات اس نے بنائے ہیں۔ یا مرکزائل اسکول والوں سے ساز باز رکھتا ہے۔

مگر ج۔ ہر لحاظ بہ شکل دیگر ایا برآمد۔ کے سیمیا کی بہرپ بھرنے کے باوجود جس کی وجہ سے جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اس فن کے نظریات و مسائل پر بحث کرنے والے عموماً دغدغوں اور ذہنیوں میں غلطی و پیچا رہتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کا وہ منطقہ بارہ جہاں عروج و اقبال کی بلندیوں پر اس فن کو پہنچا یا گیا ہے یعنی سرزمین مغرب، اس علاقے کے باشندوں میں ایک خاص احساس کا اثر اتنا مستحکم اور پائدار ہے کہ جدت طرازیوں کے اس طوفان میں بھی ان کا یہ احساس جوں کا توں، اسی حال پر ”ہماں ست کہ بود“ کی چٹان پر قدم جمائے ہوئے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان اور انسانیات کے متعلق جب اور جس زمانے میں کچھ سوچنے سمجھنے یا رائے قائم کرنے یا اصول و ضوابط بنانے کا ارادہ اس ملک میں کیا گیا ہے۔ تو پہلے بھی دیکھا گیا اور اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ بیٹھتے تو ہیں وہ یہ ارادہ کر کے کہ ہمیں جو کچھ سوچنا اور طے کرنا ہے۔ اس کا تعلق انسان اور آدم کی اولاد سے ہے۔ لیکن خدا ہی جانتا ہے اسباب اس کے کیا ہیں کہ بحث جب شروع ہوتی ہے تو وہی ”انسان“ جو بحث و تحقیق کا موضوع بنا کر چنا گیا تھا، اچانک ایسا مغلوم ہوتا ہے کہ اس کے انسان ہونے کا خیال حافظوں سے پھسل کر باہر ہو گیا۔ پھر اس کے بعد یہ جو کچھ

سرزمین مغرب اور اس کے باشندوں کی ایک لازوال خصوصیت

سمجھتے ہیں، جو کچھ سمجھاتے ہیں، ہر ایک سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی بحث کا موضوع آدمی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ آج تو خیر ممکن ہے کہ عین وقت پر حافظہ کی اس عجیب و غریب معکوسیت کی توجیہ کر لی بھی جائے کہ کچھ دنوں سے انسانی نسل کے شجرہ نسب کو اسی ملک کے بعض مفکرین نے غیر انسانی خانوادوں سے جوڑ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کا شعوری یا غیر شعوری عکس سوچنے والوں کے دماغوں پر پڑتا ہو مگر میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ آج ہی نہیں، بلکہ اُس وقت بھی جب ڈارون کی کتاب اصل انواع سے زیادہ ان کے قلوب میں مسیح علیہ السلام کی انجیل اور موسیٰ علیہ السلام کی تورات وزن تھا۔ ان کے مقابلے میں کسی دوسرے کی اس ملک کے رہنے والے نہ کچھ سننا ہی چاہتے تھے اور نہ ماننا ہی چاہتے تھے لیکن اس زمانہ میں بھی جب اس غریب انسان کے متعلق یہ سوال اٹھایا گیا کہ آدمی کی اصل حقیقت کیا ہے تو اس وقت بھی بجائے آدمی ہونے کے یہی طے کیا گیا تھا کہ باہر سے وہ کچھ ہی نظر آتا ہو، لیکن اپنی اصل حقیقت کی رو سے وہ بشر نہیں ملک ہے۔ یعنی آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ اسی فیصلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہبی احکام کی پابندی کا آخری مقصد یہ قرار دیا گیا کہ آدمی فرشتہ بن جائے۔ یعنی جو ”ہے“ پھر وہی وہ ہو جائے۔ اسی موروثی عقیدے کا اثر آج تک یہ ہے کہ مرنے کے بعد جی اٹھنے اور آخر دی سزا و جزا کے یقین کو حالاں کہ ان ممالک کی عمومیت کھو چکی ہے۔ لیکن باوجود اس کے جہاں کہیں آنے والی زندگی کے متعلق اس خیال کا تذکرہ آ جاتا ہے۔ یعنی اس نئی آنے والی نشاۃ میں آدمی کو اپنے فطری احساسات اور مطالبات کے مطابق زندگی ملے گی۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انہار جنات و حور و مقصور والی قرآنی جنت کا ذکر ان کے سامنے اگر کبھی کیا جاتا ہے۔ تو سنتے ہی ہر یورپ زدہ فطرت تلکلا اٹھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھینچ کر اس کی فطرت پر کسی نے کوئی پتھر دے مارا۔ قرآنی جنت کے متعلق عصری ذہنیاتوں کی اس عجیب و غریب بھڑک کی اصلی وجہ بے دے کر کل یہی ہے۔ چوں کہ عوام کو وجہ معلوم نہیں، اس لئے سادگی کے ساتھ سمجھنے والے بے چارے یہ سمجھ جیتے ہیں کہ شاید یہ بھی سائنس ہی کے کسی نظریہ یا کیمیا کے کسی کشف کا نتیجہ ہوگا۔ جس کی وجہ سے یورپ کے باشندوں نے آئندہ زندگی میں انسانی فطرت کے ان مطالبات کی تکمیل کا انکار کر دیا ہے۔ جن کا قرآن میں مسلسل وعدوں کی شکل میں تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن جانتے والے جانتے ہیں کہ اس کی تہ میں بھی درحقیقت مغربی ذہنیت کی وہی خصوصیت پوشیدہ ہے۔ یعنی آدمی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بندر ہو سکتا ہے، لنگور ہو سکتا ہے، فرشتہ ہو سکتا ہے، بھوت اور شیطان سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان جو خیر نہیں ہو سکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ وہ انسان نہیں ہو سکتا۔

مذہبیت کے دور میں اس ملک کے باشندوں کا عام رجحان جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ رہبانیت کی طرف عموماً جو پایا جاتا تھا، لہذا زندگیات اور انسان کے فطری احساسات کے تقاضوں کو غلط یا صحیح طریقہ سے دبانے کی کوشش جو ان میں جاری تھی۔ تو اس میں بھی دراصل آدمی کے فرشتہ ہونے کی اسی خوش اعتقادی ہی کو

لے یہ کوئی مذاق کی بات نہیں، بندر اور لنگور ہونے کا مغربی نظریہ تو نسل انسانی کے متعلق عام ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ نیکوں کے حق جیسے یہ عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد فرشتے بن کر اٹھائے جائیں گے۔ اسی طرح بدکاروں اور شریروں کے متعلق ان ہی عیسائیوں کا یہ خیال بھی تھا کہ وہ شیطان اور بھوت مرنے کے بعد بن جاتے ہیں ۱۲

زیادہ دخل تھا۔ سمجھایا جاتا تھا کہ بھیہمی اور حیوانی کثافتوں کی چادر اس غریب فرشتہ کو اوپر سے لپٹ گئی ہے۔ اس چادر کو چاک کر کے اپنی ملکوتیت کے چمکانے میں جو زیادہ کامیاب ہوگا۔ وہی اپنی اصل حقیقت سے زیادہ قریب ہوتا چلا جائے گا۔ وہی یورپ جس کا آسمان بھی آج معاش ہے اور زمین بھی اس کی معاش ہی ہے۔ آج جو محترم معاشیت یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ صرف شکم ہی شکم بن کر رہ گیا ہے۔ اسی یورپ کا حال اپنے ملکوتی عہد میں ہی ”معاشیات“ کے متعلق یہ تھا۔ جیسا کہ اسی ملک کے ایک معاشی مورخ نے لکھا ہے۔

”معیشت ان کے (یعنی انہی قدیم ملکوتی عیسائیوں) کے نزدیک کبھی فی نفسہ قابل توجہ نہ بنی۔ مقاصد معینہ (یعنی فرشتہ بننے کی مہم اور اس کے مقدمات) کے لئے ذریعہ کی حیثیت سے قدروں کی ہمہ گیر نظام میں اس معیشت غریب کی جگہ کہیں حاشیہ پر تھی۔“

انتہایہ ہے کہ جدید معاشی دور کا آغاز جن بزرگوں کی اصلاحی آواز کی بدولت جیسا کہ اسی ملک کے لوگوں کا بیان ہے، ظہور پذیر ہوا ہے۔ میری مراد پرنٹسٹن فرقہ اور ان کی اصلاحی اقدامات سے ہے دوسرے نہیں۔ اسی اصلاحی پیغام کے سرخیل اعظم یعنی جناب لوتھر تک کے مواعظ اور خطبات میں اُس وقت تک اس قسم کے فقرے بے جھجک استعمال ہوتے تھے مثلاً لوتھر کا مشہور مقولہ ہے۔ وہ کہا کرتا تھا

”دولت ان ہی ٹھیٹھ گدھوں کو (اللہ میاں) دیتے ہیں جنہیں وہ کچھ ارزانی نہیں فرماتے۔“

اور ظاہر بھی یہی ہے کہ کلیسا کے مذہب سے لوتھر جتنا بھی بیزار ہو۔ لیکن اس مذہب کا تو وہ بہر حال معتقد بلکہ سرگرم وکیل اور حامی تھا۔ جس کا لضب العین آدمی کو فرشتہ بنانا قرار دیا گیا تھا! ایسی صورت میں اگر دولتمندوں کو لوتھر صاحب گدھ یا ٹھیٹھ گدھے کے نام سے موسوم کرتے تھے تو جس کا لضب العین ملک ہونا ہو، اس بلند لضب العین کو چھوڑ کر جس نے اپنی ساری توانائی دولت مند ہونے پر خرچ کر دی ہو اپنی اس حماقت کی وجہ سے اگر سمجھنے والے اسے گدھا سمجھتے تھے تو غلط کیا سمجھتے تھے۔

لیکن خیر یہ تو پرانی بات ہے۔ صدیوں کی کشمکش کے بعد فرشتہ بنانے والے مذہب کے جوئے سے اس ملک والوں نے اپنے آپ کو آزاد کر لینے میں جب کامیابی حاصل کی تو جیسا کہ ٹاؤن نے لکھا ہے مذہب نے انسانی طمع پرہیز سے قیود عائد کر رکھے تھے۔ سوٹھویں صدی کی تجارتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے (مذہب) کے اقتدار کا مقابلہ کیا گیا اور سترھویں صدی کے آخر تک مذہب آئندہ معاشیات پر حکمران نہ رہ سکا۔ تاہم اس کے اقتدار کی دھجیاں باقی رکھیں۔۔۔۔۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے پرزور مقابلہ میں طلب درس کے قانون اور نفع و راحت کے نام پر معاشیات اور مذہب کے درمیان طلاق واقع ہو گئی۔“

(داستان دہقان ص ۳۲۶)

یعنی وہی تاریخی اعلان ”جو حضرت شعیب علیہ السلام کے مقابلہ میں ان کی معاشی قوم نے

ان نفعل فی ۲۰ موالنا منشاء ہم اپنے اموال میں جو چاہیں کریں۔

کے الفاظ میں یہ کہتے ہوئے کیا تھا، یعنی انھوں نے شعیب علیہ السلام سے پوچھا کہ
”تمہاری یہ پوجا پاٹ (صلوات) کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم اپنے مالیات کے
مستعلق جو چاہیں کریں۔“

گویا ان کا بھی خیال تھا کہ صلوات (مذہبی کاروبار، دعا پوجا وغیرہ کو) انسان کے معاشی کاروبار
سے کیا تعلق ہے؟ شاید وہ بھی یہی کہتے ہوں کہ مذہب محض ایک پرسنل اور شخصی مشغلہ کی حیثیت سے جینا چاہیے تو
جی سکتا ہے۔ لیکن زندگی کے عمومی اور اجتماعی شعبوں میں اس کی دخل اندازیوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا
دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ کلیسا (صلوات) کو وہ اموال ”یا دنیاوی کاروبار سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔
بہر حال مجھے تو یہ کہنا ہے کہ مذہبی خوش اعتقادیوں کی پٹی اتر جانے کے بعد اور کچھ نہیں تو کم از کم
اس کی امید بے جا نہ تھی کہ شاید غریب آدمی اب یورپ والوں کو آدمی نظر آئے گا۔ مگر اب اسے کیا کہئے کہ یوں
سوچنے کی حد تک تو ان کو دور کی، بڑی دور دور کی سوچی، اتنی دور کی کہ وہاں تک جیسا کہ ان ہی کا دعویٰ ہے
ان سے پہلے کسی کی نگاہ نہیں پہنچی تھی۔ لیکن ٹھیک جس وقت یہ آسمان کے ان دیکھے تاروں کو گن رہے تھے۔
پاتال کے جگر کو بھی چاک کر کے ان کی نظر آگے جا رہی تھی۔ اس وقت بھی یہی دیکھا گیا کہ جو سب سے قریب
تھا، یعنی خود اپنی حقیقت ان کی نگاہوں سے اس بد اعتقادی کے عہد میں بھی اسی طرح اوجھل رہی جیسے
خوش اعتقادی کے قرن میں اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ غریب انسان بجلی کی روشنی میں بھی ان کو انسان نظر نہ آیا۔
لے دے کر انقلاب اور تجدد کا اثر اس مسئلہ پر اگر کچھ پڑا تو وہ صرف یہ پڑا کہ آدمی فرشتہ باقی نہ رہا۔ لیکن یہ بات کہ
آدم زاد آدم زاد نہیں ہے۔ اس پر ان کا اصرار پھر بھی باقی ہی رہا۔ یعنی ملکوتیت کا انکار کر کے اعلان کر دیا گیا کہ آدمی
آدمی زادہ نہیں۔ حیوان زادہ ہے۔ اور اسی کو ایک فیصلہ کی صورت میں قبول کرنے کے بعد معاشی ضابطہ جو انسانوں
کے لئے بنایا گیا۔ اس کی بنیاد بھی اس پر رکھی گئی کہ باہم انسانوں کا دوسرے انسانوں سے وہی تعلق رہے گا
اور اسی کو رہنا چاہیئے۔ جو دریا کی رہنے والی مچھلیوں اور جنگل باسی درندوں، چرندوں وغیرہ حیوانات کے درمیان
اسی قانون کا نام تنازع البقاء کا قانون رکھا گیا۔ طے کر دیا گیا کہ جیسے چھوٹی مچھلیوں کو نگلنا ہر بڑی مچھلی کا
یا کمزوروں کو فنا کر کے اپنی بقا کا انتظام کرنا، جنگل کے ہر زور آور جانور کا قدرتی حق ہے۔ اسی طرح آدمی بھی
جب آدمی نہیں۔ بلکہ اسی قسم کے دریائی یا صحرائی حیوانوں میں سے ایک حیوان ہے۔ تو تنازع البقاء کی جدوجہد
میں اس کو بھی آزاد ہونا چاہیئے۔ معاشی دائروں میں دریا اور جنگل کے اسی قانون کی تعبیر سرمایہ داری کے
نظام سے کی گئی۔ اور چھوڑ دیا گیا۔ ہر قسم کی انسانی پابندیوں سے آزاد کر کے چھوڑ دیا گیا، ہر اس شخص کو جو
کسی نہ کسی طرح سرمایہ کی قوت پر قابض تھا کہ جو اس قوت سے محروم ہیں اپنی بقا و ارتقاء کی راہوں میں جس
طرح چاہے ان سے کام لے، جو سرمایہ نہیں رکھتے وہ خود ان کی بیوی، ان کے بچے، ان کی محنت، ان کی شفقت
ان کا خون، ان کا پسینہ، بلکہ ان کی زندگی، ان کی موت، سب کا واحد مقصد یہ ٹھیرایا گیا کہ سرمایہ داروں کی سرمایہ
داریت یا گنج والوں کے گنج کے استحکام و مزید ترقی میں جذب ہوتا رہے۔ الغرض امیروں کے لئے اگر غریبوں کو
مر جانا پڑے تو یہ فیصلہ کیا گیا۔ اور رحم و ترس کھائے بغیر یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ ان کا یہی قدرتی غرض ہے۔ ان کی

موت سے اپنی زندگی پیدا کرنا یہ سرمایہ داروں کا فطری حق ہے۔ سورا اتفاق پر سورا اتفاق دیکھئے کہ ان ہی دنوں میں جب انسانی آبادیوں پر جنگل کے قانون کو منطبق کرنے کے لئے یا سرمایہ داری کے نظام کو فروغ دینے کے لئے جہاں حکومت اور سلطنت کی قوتوں سے لوگ مداخلہ حاصل کر رہے تھے، وہیں بیالوجی کے ایک اسکول کی طرف سے نسلی انسانی کا وہی منحوس شجرہ نسب بھی مرتب کر کے پیش کر دیا گیا تھا جس میں آدم کی اولاد کا رشتہ جنگلی جانوروں سے جوڑا گیا تھا۔ مسئلہ سائنس کا تھا یا فلسفہ کا یا صرف وسوسہ کا ایک تماشہ تھا۔ اس کو تو چھوڑیے اونگھنے والوں کو سٹھیلنے کا یہ اچھا بہانہ ہاتھ آیا۔ بچی کھچی ضمیر کی آواز کو دبائے کے لئے ایک ڈھلی ڈھالی یہ منطقی دلیل بھی ہاتھ آگئی کہ آخر جھاڑیوں اور غاروں کی زندگی میں باپ داداؤں نے جس کام کو قدرتی حق کی حیثیت سے انجام دیا تھا۔ کھلی زمین یا اینٹ پتھر کے احاطوں میں رہنے کے بعد ان ہی کے پوتوں اور پوتوں کے لئے وہی حق غیر قدرتی کیوں ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تجدید و انقلاب، تحقیق و اکتشاف کے اس عہد میں اگرچہ سب کچھ بدل گیا۔ لیکن انسان کے متعلق یہ بات کہ وہ انسان نہیں ہے اپنے حال پر باقی رہا۔ نقطہ نظر میں تغیر اگر کچھ ہوا بھی تو یہی ہوا کہ مذہبی عہد میں جسے فرشتہ قرار دیا گیا تھا، لامذہبی کے اس دور میں وہی جانور ٹھہرایا گیا اور اس پر اصرار کیا گیا۔ اس حد تک اصرار کہ سرمایہ داری کے نظام کے بڑے بڑے حماۃ بھی چیخ اٹھے۔ کتابوں میں اب تک آدم اسمتھ (A. SMITH) کا جو یہ مقولہ نقل کیا جاتا ہے۔

”اپنے اپنے طور پر اپنے ذاتی مفاد کے حاصل کرنے میں گو ہر شخص کو آزاد ہونا چاہیے
لیکن (اگر مذہب نہیں) تو قوانین عدل و انصاف میں تو رد و بدل نہ کرنا چاہئے۔“

(داستان دہقان ص ۲۲۶)

لیکن اس دغظ کا اثر جو کچھ ہوا وہ یہ تھا۔ جیسا کہ مشہور معاشی مورخ ٹاؤٹنی نے لکھا ہے۔
”اٹھارہویں صدی کے پرزور مقابلہ میں اس کی (یعنی آدم اسمتھ) کی تعلیم کا بنیادی
اصول بھی فراموش کر دیا گیا۔“

اور کل تک جن کی فطرت کی ملکوتی لطافتوں پر قرآنی جنت کے قصور و حور کا تصور بھی کثافت کا داغ بن جاتا تھا ان ہی کے جانشینوں کو دیکھا گیا کہ جنگلی درندوں، ٹھیک درندوں کی طرح ان کے بڑے چھوٹوں کے نگلنے میں بغیر کسی شرم و حیا کے بے جھجک منہمک ہیں۔ ڈارلنگ نے اس دردناک نظارہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔
”طاقتور کمزوروں کی کمزوری سے اور ہوشیار جاہلوں کی نادانی سے فائدہ اٹھاتے

چلے جا رہے تھے۔“ (داستان دہقان ص ۳۲۴)

مگر ظاہر ہے کہ آدمی اگر فرشتہ نہ تھا تو واقع میں وہ جانور بھی تو نہ تھا۔ جانور ہونے کے اس خبط کا دورہ آخر کب تک ٹھہرا رہتا۔ ناداروں کا لاوارث طبقہ سرمایہ داروں، صرف سرمایہ داروں کے لئے ہے۔ اور اس طور پر ہے کہ ناداروں کا کوئی حق سرمایہ داروں پر نہیں ہے۔ ان پر صرف فرائض عائد ہوتے ہیں۔ لیکن حقوق کے خانے میں ان کے لئے کچھ نہیں ہے۔ حقوق کے حقدار صرف سرمایہ دار ہیں۔ انسانی فطرت جس درجہ بھی مسخ ہو گئی ہو۔ لیکن ظلم کے اس پہاڑ کو وہ کب تک سنبھالے رکھ سکتی تھی۔ بالآخر اس یک طرفہ بار کے اٹھانے والوں کی گردنوں میں

جمنش شروع ہوئی۔ کنوتیاں بدلنے لگیں جن کی آنکھیں تھیں انھیں سوچنے لگا۔ انھیں دیکھنے والوں میں سے ایک نے لکھا ہے۔

”سرمایہ داری کے طوفان بے پناہ نے ہر طرف وہ سراسیمگی پیدا کر دی تھی کہ اچھے اچھوں کے قدم اکھڑے جاتے تھے۔ دولت و افلاس، ثروت و فلاکت، ترقی و تباہی، آبادی و بربادی کے میجر العقول تضاد نے بے شمار ایسے مسائل پیدا کر دیئے تھے جن کا حل کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔“

اسی میجر العقول تضاد کی نہ سلجھنے والی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے لوگ جب اٹھیں گے، خیال یہ پیدا ہونے لگا کہ تب نہیں تو شاید اب جس ”انسانیت“ کے چہرے پر اس ملک میں نقاب پڑا رہا ہے وہ اٹھ جائے ہو سکتا ہے کہ آدمی جس ملک میں اب تک آدمی نہیں سمجھا گیا ہے۔ ان کو واقعی نظر آجائے کہ وہ آدمی ہی ہے۔ آدمی ہونے کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے۔

لیکن قسمت کی خوبی ملاحظہ فرمائیے، پتھر پتھر ہی باقی رہا، پانی پانی ہی سمجھا گیا، ہوا ہوا ہی باقی رہی۔ درختوں کے متعلق یقین کیا گیا وہ درخت ہی ہیں۔ الغرض جو چیز واقع میں جو کچھ تھی وہ وہی سمجھی بھی گئی۔ اور یہ نہ سمجھا جاتا تو اور کیا سمجھا جاتا۔ کسی چیز کے لئے کسی دوسری چیز کا ثبوت تو دلیل کا خواہاں ہوتا ہے۔ حرکت کو زمین کے لئے ثابت کرنے میں استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن زمین زمین ہی ہے۔ یعنی شے کا ثبوت خود اپنی ذات کے لئے، دوسرے اصطلاحی الفاظ میں ”ثبوت الشئ لنفسہ“ یہ تو منطق کے ان مقدمات میں سے ہے جس سے زیادہ جلی، واضح، بدیہی مقدمہ کوئی دوسرا نہیں ہے، چار چار ہی ہے، بھلا اس میں بھی کوئی شک کر سکتا ہے، مگر کیا کیجئے، سب کچھ سمجھا گیا۔ دنیا کا ہر دعویٰ پر کھا گیا، ہر رسم ہر رواج پر تنقید کی گئی۔ لیکن مرغی کے متعلق ایک ٹانگ کا دعویٰ کسی طرح سے، کسی زمانے میں، کسی کے منہ سے جو نکل گیا تھا، یعنی وہی بات کہ ”انسان انسان نہیں ہے“ یہ دعویٰ اس میجر العقول تضاد کے حل کے زمانے میں بھی من و عن اپنے اسی پختہ رنگ پر قائم رہا۔ جو ابتداء میں کسی نہ کسی طریقہ سے اس ملک کے باشندوں کی ذہنیاتوں پر چڑھ گیا تھا یا چڑھا رہا گیا تھا۔ البتہ نظام سرمایہ داری کے مقابلے میں بجائے ان جانوروں کے جن میں بے زوروں کو زور والے اپنی خوراک بنا رہے تھے۔ یا اب تک بنا رہے ہیں۔ یہ طے کیا گیا کہ آدمی کا شمار ان جانوروں میں ہونا چاہیئے جن کے ہر فرد کو وہی گھاس چارہ، وہی دانہ پانی ملتا ہے۔ جو دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ مارٹن ٹوٹھرنے تو صرف دو لہندوں کو انسانی قطار سے نکال کر گدھوں کے طویلہ میں ڈھکیل دیا تھا۔ لیکن فکری انقلاب کے اس دور سے میں دو لہندوں کے ساتھ نادولتوں کو بھی اسی معاشی قانون کا پابند بنا دیا گیا جس کے پیچھے گدھے پابند ہیں۔ یعنی ایک گدھے کو جیسے گھاس چارے کی اسی مقدار کے لینے کا حق چہرہ گاہ سے ہے۔ جتنی مقدار دوسرے گدھوں کو میسر آتی ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کو بھی کوئی حق نہیں ہے کہ دوسروں کو جو کچھ ملا ہے یا مل رہا ہے اس سے زیادہ لینے کا مطالبہ کرے یا زیادہ مقدار کو اپنے اقتدار میں لائے۔ یونہی چرنے چگنے کے بعد کسی گدھے کے لئے جیسے یہ جائز نہیں ہے کہ گھاس کے کسی

گٹھے کو اپنی ذاتی ملکیت بنا کر طویلہ میں محفوظ کر اے یا اپنے بیٹوں اور پوتوں تک ان کو پہنچائے۔ مطالبہ کیا گیا کہ مساوات اور عدل کے اسی قانون کی تعمیل آدم زادوں کو بھی کرنی پڑے گی۔

اسی مضمون کو کبھی فلسفہ کی زبان میں ذرا مشکل اور پیچیدہ بنا کر اور کبھی افسانوی پیرایوں میں آسان بنا کر مختلف طریقوں اور بھانت بھانت کے لہجوں میں لوگوں نے پھیلا نا شروع کیا۔ زبانوں سے اپنی گویائی کی قوتوں کا مظاہرہ کیا گیا، قلم انشا اور تحریر کا زور جتنا دکھا سکتا تھا۔ پوری طاقت سے اس نے دکھایا۔ فصاحت کے دریا بہا دیئے گئے، بلاغت کے سمندروں کو انڈیلنے والوں نے انڈیل دیا۔ اتنا ہنگامہ کیا گیا کہ لوگوں کی یہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ خود کہنے والوں کی اکثریت کو اب بھی اس کی خبر نہیں کہ وہ غریب کہنا کیا چاہتے ہیں۔

مگر اب کسی کو برا معلوم ہو یا سبھلا، میرے نزدیک تو سارے مباحث کا خلاصہ لے دے کر وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ اگرچہ سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں، یا ان کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ معاشیات کا یہ مساواتی نظریہ عہد حاضر کی کوئی نئی اُپج ہے۔ جس کے پانے میں انسان کا دماغی ارتقاء اب کامیاب ہوا ہے۔ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سبلی حد تک تو پچھلوں نے وہی دھرایا ہے جو پہلوں نے کہا تھا۔ یعنی آدمی آدمی نہیں ہے۔ ”یہی پہلوں نے بھی کہا تھا اور یہی پچھلے بھی کہہ رہے ہیں۔ البتہ اسی مقدمہ کا ایجابی پہلو یعنی پھر آدمی ہے کیا؟ رد و بدل اگر کچھ ہوا ہے تو اسی سوال کے جواب میں ہوا ہے۔ یعنی پہلوں نے تو کہا تھا کہ آدمی فرشتہ ہے۔ ملک ہے۔ اس کے بعد والوں نے فرشتہ ہونے کی نفی کر کے جانور ہونے کا فتویٰ لگایا۔ پھر ان سے اختلاف کرنیوالے جو آج اختلاف کر رہے ہیں۔ ان کا اختلاف تو بالکل معمولی ہی یعنی جانور نہ ہونے پر اتفاق کر لینے کے بعد صرف اس میں اختلاف ہے کہ وہ کس قسم کا جانور ہے۔ آیا اس قسم کا جانور ہے جن کے بڑے چھوٹوں کو نگلتے ہیں، یا ان مویشیوں میں اس کو شکار کرنا چاہیے جن کے افراد میں ضروریات حیات کے استعمال کے اعتبار سے تفوق اور برتری نہیں پائی جاتی۔ وہی بات جو گدھوں، گھوڑوں، بکریوں، کوؤں اور چیلوں کی معاشی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ گویا ان دونوں مسکوں میں وہی فرق ہے جو کسی ظرف نے کہا تھا کہ سرمایہ داری کے نظام کی جس قانون پر بنیاد قائم تھی۔ اگر اس کا نام پچھلی آرم یا بھیڑیا آرم رکھا جائے تو سرمایہ دشمنی کے اساسی قانون کی تعبیر بکری آرم، بھیڑ آرم، زاغ آرم، زغن آرم سے کی جاسکتی ہے۔ خیر میں اس وقت اس کے لئے تیار بھی نہیں ہوں کہ ان مختلف مشارب و مسالک کی تحقیق کروں اور ان میں باہمی جواہرات ہیں ان پر بحث کروں بلکہ مقصود صرف اس ذہنیت کا دکھانا تھا جو خصوصیت کے ساتھ بنی نوع انسانی کے متعلق کردہ زمین کے اس خاص حصہ میں ابتداء سے پائی جاتی ہے۔ غرض اس تذکرہ سے یہ تھی کہ اس کے مقابلے میں شران کا جو بیادی نظریہ ہے وہ ذرا واضح اور روشن شکلوں میں لوگوں کے سامنے آ جائے۔ کیوں کہ بات مقابلہ ہی سے زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ بتنی کا مشہور مصرعہ ہے

و یضدھا تبین الاشیاء

آدمی بہر حال آدمی ہے | مطلب یہ ہے کہ کسی حیثیت سے ہو، معاشی حیثیت سے ہو یا معادی نقطہ نظر سے

بہر حال میں قرآن کا اس پر اور صرف اسی پر اصرار ہے کہ ”آدمی بہر حال آدمی ہے“ وہ جب دُنیا میں پیدا کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی وہ انسان اور آدمی ہی بن کر پیدا ہوتا ہے۔ جب تک زمین کے اس کرہ پر جیتا ہے تو آدمی ہی بن کر جیتا ہے حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی دوسری زندگی کو لئے کہ میدان قیامت میں جب وہ آئے گا تو اس وقت بھی وہ آدمی ہی رہے گا، اور جزاء و سزا کے فیصلوں کے بعد جنت میں جو جائیں گے، وہ بھی آدمی ہونے کے سوا اور کچھ نہ ہوں گے، اور یہی حال ان کا بھی ہوگا جو (عیاذ باللہ) مستحق جہنم قرار پائیں گے۔ اسی لئے ایسے تمام خیالات جن میں انسانیت کے متعلق باور کرایا جاتا ہے کہ انسانیت کے سوا وہ کچھ اور ہو جاتی ہے، اسلام نے سب کو مسترد کر دیا ہے۔ مثلاً بعض مذاہب کے متعلق مشہور ہے کہ ان میں فنا فی الاصل کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ یعنی مرنے کے بعد آدمی آدمی نہیں رہتا۔ خدا جو اصل کائنات ہے۔ وہی وہ ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان خدا بن جاتا ہے۔ یہ تو نیکو کاروں کا انجام بتایا جاتا ہے اور بدکاروں کو سمجھایا گیا ہے کہ دوسری زندگی پر بجائے آدمی رہنے کے وہ ہاتھی بن جاتے ہیں، یا گھوڑے یا چوہوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، یا جیسا کہ ابھی عیسائیوں کے متعلق عرض کیا گیا کہ مرنے کے بعد ان کے یہاں بھی دوسری زندگی میں انسان سے انسانی احساسات و جذبات چھین لئے جاتے ہیں، پھر جونیک ہیں وہ تو فرشتے اور جو بد ہیں، وہ شیطان اور بھوت بن جاتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کی انسانی جنت کے ذکر سے دلوں میں آج کل ایک قسم کی گرانی جو پیدا ہو گئی ہے۔ اس گرانی کی تہہ میں درحقیقت انسان کے متعلق انسان نہ ہونے کا یہی مغالطہ پوشیدہ ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کی خلافت کے تذکرے کے سلسلے میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ سجدے کے مطالبے پر الملائکہ نے تو آدم کو سجدہ کیا۔ لیکن شیطان نے انکار کر دیا۔ اور انکار کی توجیہ کرتے ہوئے یہ جو اس نے کہا کہ میں آتش زادہ ہوں۔ اس لئے اس خاک زادہ سے بہتر ہوں۔ میرے نزدیک یہ قصہ جن عمیق اسرار و حقائق پر مشتمل ہے ان میں ایک اشارہ اسی مغالطہ کے ازالہ کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی شیطانی بصیرت رکھنے والوں کے سامنے سے ہو سکتا ہے کہ آدمی کی حقیقت اسی طرح کہیں اوجھل نہ ہو جائے۔ جیسے ابلیس آدم کو نہ پہچان سکا۔ اور ظاہری حالت سے دھوکہ کھا کر خاک زادہ قرار دیتے ہوئے، آدم کا جو صحیح مقام تھا اس سے ان کو گرا دینا چاہا، دوسرے الفاظ میں گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق مختلف اقوام کو جو مغالطہ لگنے والا تھا، ابتدا ہی میں اس طریقہ سے اس مغالطہ کے ازالہ کا سامان کر دیا گیا تھا، آخر آپ ہی بتائیے کہ جن لوگوں نے بجائے آدم زاد ہونے کے یہ وسوسہ دُنیا میں پھیلایا ہے کہ آدمی حیوان زادہ ہے ان کے اس قول میں اور شیطان کے اس دعویٰ میں کہ ”وہ کیا ہے، صرف خاک زادہ ہے“ اس لحاظ سے کہ انسان کو انسانیت کے صحیح مقام اور اس کے قدرتی مرتبہ سے دونوں نے گرا دیا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ دونوں نظریات (طینی و بوزینی) میں کیا فرق ہے۔ بہر حال انسان

۱۔ میرا ہی ایک پُرانا شعر ہے۔ اس نے طینی کہہ دیا اور اس نے بوزینی کہا۔ سچ تو یہ ہے ڈارون ابلیس سے کچھ کم نہ تھا۔ طین کے معنی عربی میں مٹی کے ہیں۔ قرآن میں شیطان کا قول جو نقل کیا گیا ہے اس میں ”طین“ ہی کا لفظ ہے۔ اسی کی طرف طینی سے اشارہ کیا گیا۔ اور بوزینی ظاہر ہے کہ بندر کے لئے فارسی لفظ ہے۔ اشارہ ستر ڈارون کے مشہور نظریہ ارتقاء کی طرف ہے ۱۲

انسان ہی ہے۔ غیر انسان نہیں ہے۔ معاشی مسائل ہوں یا معادی عقائد، اسلام نے سب کی بنیاد منطق کے اسی بدیہی مقدمہ پر رکھی ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بنیاد اگر اس پر نہ رکھی جاتی تو آخر کیا کیا جاتا۔ شکر کے اوصاف، اس کے حالات، آثار و خواص پر جو بحث کرنا چاہے گا، ظاہر ہے کہ وہ یہی سوچ کر تو بحث کرے گا کہ ”شکر شکر ہے۔“ دیوانہ ہی ہوگا جو ایسی صورت میں شکر کو بجائے شکر کے خواہ مخواہ یہ مان لے کہ وہ نمک ہے۔ اور جو ایسا کرے گا۔ اگر اس کی بیانی کی ہوئی باتیں شکر پر منطبق نہ ہوں تو اس میں بحث کرنے والوں کا قصور ہوگا۔ یا بیچاری شکر مستحق ملامت ہوگی کہ اپنے اوپر نمک کے حالات، کیفیات، آثار و خواص کے بیان کو کیوں منطبق ہونے نہیں دیتی۔ جیسا کہ بارہا عرض کر چکا ہوں، اپنے اس مقالے کو میں نے معاشیات کے صرف اسلامی مسائل و نظریات کی حد تک قصداً چوں کہ محدود کر رکھا ہے۔ اس لئے ان تفصیلات میں جانے کا میرے لئے قطعاً موقعہ نہیں ہے کہ انسان کے معاشی مسائل کی تدوین و ترتیب کا کام جن لوگوں نے یہ فرض کر کے انجام دیا ہے کہ وہ انسان نہیں، بلکہ جنگل کا بھیڑیا یا دریا کی مچھلی ہے، یا جن حضرات نے بجائے بھیڑیے یا مچھلی کے انسان کی انسانیت کا انکار کر کے چاہا ہے کہ بکریوں اور مینڈھوں، بیلوں اور گھوڑوں، کوؤں اور کبوتروں وغیرہ کے معاشی قوانین کو انسان کے معاشی قوانین پر منطبق کر میں۔ عقل کے ان ناخن تراشٹوں کو اپنی اس عجیب و غریب کوشش میں کن بوالعجبیوں اور طرفگیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ بجائے سلجھانے کے اپنی خود ساختہ گتھیوں میں یہ کس طرح الجھ گئے کیونکہ اس کے لئے تو ایک مستقل کتاب کی حاجت ہے، بلکہ اپنے بیان کو صرف اسلامی مسائل تک محدود رکھتے ہوئے اب صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ”آدمی آدمی ہی ہے اور کچھ نہیں ہے۔“

اس اساسی بنیاد کو پیش نظر رکھ کر قرآن میں جو چند ایسے کلیات پائے جاتے ہیں جنہیں مسلمانوں کو خدا نے اس لئے عطا فرمایا ہے کہ اپنی معاشی دشواریوں کو ان کی راہ نمائی میں حل کریں۔ پس اسی کو پیش کردوں لیکن ان کلیات سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ”الانسان“ یا ”البشر“ یا ”بنی آدم“ ”الناس“ وغیرہ الفاظ سے جس جتنی جاگتی ہستی کی بقیہ قرآن کرتا ہے۔ قرآن کے نظر میں اس کے ایسے مخصوص امتیازی صفات و خصوصیات کیا ہیں، جن کا اس کی معاشی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ اور جن سے اس کی زندگی کے معاشی قوانین مستثر ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ قرآن کے معاشی انسان کے نمایاں خط و خال کیا ہیں۔ تمہیدی طور پر ذہن نشین کرنے کی یہ تو پہلی بات ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری بات جس کا اس موقع پر جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اپنی معاشی زندگی میں (یعنی از شکم مادر تا بہ شکم قبر) جن قدرتی پیداواروں سے آدمی مستفید ہو رہا ہے۔ اور جس سے استفادہ کا یہاں اسے موقعہ عطا کیا گیا ہے۔ ان کی نوعیت اور خصوصیت قرآن نے کیا بیان کی ہے۔ آئندہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، شاید میں اس میں کہہ بھی نہیں سکتا۔ جب تک کہ ان دو باتوں کو پہلے طے نہ کر لوں۔ بلکہ سچ ہے کہ قرآن کے پیش کردہ ”معاشی نظام“ کی بنیاد ان ہی دو باتوں پر مبنی ہے۔

انسانی فطرت | بات یہ ہے کہ انسانی فطرت یوں تو قدرت کے راز ہائے گراںمایہ کا ایک لامحدود گنجینہ ہے
کی خصوصیات | اور قرآن نے مختلف مقامات پر مختلف الفاظ مختلف پیرایہ بیان میں ان کی طرف اشارے بھی کئے ہیں۔ لیکن اس وقت میری گفتگو انسانی فطرت کی صرف ان خصوصیات تک محدود ہوگی جن کا معاشی

مسائل سے تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سب سے پہلے جو چیز آتی ہے وہ خُلُقِ الْإِنْسَانِ ضَعِيفٌ کی مشہور آیت کا مفاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی ہو یا آدمی کے سوا دوسری جان رکھنے والی ہستیاں، زندگی کی مدت جن کی جتنی بھی ہو، اس مدت کو گزارنے کے لئے جن ضرورتوں کی وہ محتاج ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا حصول زیادہ تر جسمانی توانائیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب مقابلہ کر کے دیکھئے کہ جسمانی توانائیوں میں اس غریب انسان کا اسی جیسی زندگی رکھنے والی دوسری ہستیتوں کے مقابلہ میں کیا حال ہے۔ مشاہدہ کی بات ہے۔ بے گناہ اور بے نوائی کے جس حال میں آدمی اس دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ مشکل ہی سے دوسرے زندہ وجودوں میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ آخر جوان، بال، کھر، پر، بازو، سینک، چنگل اور ازیں قبیل بیسیوں قدرتی ساز و سامان کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ گویا ان میں ہر ایک اپنی چادر، اپنا اورٹھنا بچھونا، اپنا لباس، اپنی کھڑاؤں کھٹے یا بوٹ، اپنی سواری وغیرہ وغیرہ لے کر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ بھلا اس کا مقابلہ وہ غریب کیا کر سکتا ہے۔ جو ایک زندہ لو تھڑے کے سوا ابتداء میں گویا کچھ نہیں ہوتا اور رنگا، ہر قسم کے سامانوں سے خالی جسد بھی جو اس کو ملتا ہے سوا تننازک و ناتواں، حساس، اثر پذیر جسد ہوتا ہے کہ اپنے طبعی مسکن (گھر ہوا) کے موسموں کی معمولی شدت کا مقابلہ بھی باسانی نہیں کر سکتا۔ گرمی ہو یا سردی۔ ان موسمی تغیرات کی ہلکی سی شدت آدمی کو بھلا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ حالانکہ زمین کے کرہ پر اسی انسان کے ساتھ کتنے آنے والے آئے، رہے اور آباد ہوئے۔ ان کا مسکن بھی وہی ہے جو انسان کا مسکن ہے، لیکن موسمی تکلیفوں سے بچنے کے لئے ان کو ان در در سروں میں مبتلا ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ جن میں غریب آدمی مبتلا رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً جتنی بھی جان رکھنے والی ہستیاں ہیں، پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان میں بھی وہ ساری قوتیں اچانک ظہور پذیر نہیں ہوتیں جن سے آئندہ اپنی زندگی کی ضرورتوں کی فراہمی میں وہ کام لیتی ہیں، بلکہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دن اس کیلئے گزارنے ہی پڑتے ہیں۔ اسی لئے ابتداء میں قدرت کی طرف سے ان کے ماں باپ میں اس کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا ہے کہ اپنے اپنے طریقہ سے اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش و نگرانی کریں۔ مگر اس لحاظ سے بھی جب آدم زادوں کا مقابلہ دوسرے حیوان زادوں سے کیا جاتا ہے تو آسمان و زمین کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک مرغی کے ہی بچوں کو دیکھئے، کوئی شبہ نہیں کہ مہینے دو مہینے تک ان کو اپنی ماں کی نگرانی کی حاجت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس نگرانی میں جو آدم زاد کو اپنی ماں کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اور اس نگرانی میں جو مرغی کے بچوں کو اپنی ماں کی ہوتی ہے کوئی نسبت بھی ہے۔ انڈا کھٹکنے کے ساتھ ہی مرغی کے بچے دانہ چگنے لگتے ہیں۔ ان کی ماں کا کام صرف تلاش کرنا اور بلا کر ان کی خوراک کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کتنے سلیقے سے دو دن کے بچے ان دانوں کو چگتے ہیں۔ مرغی کے ان سعید و باتینز بچوں کو خیال تو کیجئے، گوشت کے اس لو تھڑے سے کیا تعلق جس کا نام آدمی کا بچہ ہے اور فرق اسی نقطہ پر ختم کب ہوتا ہے؟ آدمی کے سوا جتنے بھی ہیں، جتنی کم مدت میں ان کا پیدائشی ضعف قوت کے انتہائی مدارج تک پہنچ جاتا ہے۔ اس مدت کو اس طویل زمانہ سے کیا سروکار جو آدمی کے بچوں کو

اسی قوت کے حاصل کرنے میں صرف کرنا پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن مدارج کو دوسرے دنوں میں طے کرتے ہیں آدم زاد مہینوں میں ہی نہیں، بلکہ برسوں میں طے کرتا ہے۔ ماں باپ کی اعانت و امداد سے آزاد ہو کر خود اپنی معاش کے متکفل ہونے کے لئے آدمی کو عام حالات میں کم از کم پندرہ سولہ سال کی مدت تو چاہئے لیکن اس سولہ سال کی مدت میں دیکھا جاتا ہے کہ انسان کے سوا تقریباً جتنے بھی ہیں خود وہی نہیں بلکہ ان کی چند شقیں ضعف کے مدارج کو طے کر کے قوت کے اسی مقام پر ہوتی ہیں۔ جہاں ہانپتے کانپتے گرتے پڑتے بہ ہزار خرابی آدمی کا بچہ پہنچتا ہے۔ پھر جب اس پر غور کیا جائے کہ پیدائشی ضعف کے ازالہ کے بعد دوسروں میں معاشی ضرورتوں کے حصول کی جو قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ عموماً آخر عمر تک ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ ماں باپ کی نگرانی سے الگ ہونے کے بعد یہی وجہ ہے کہ زندگی گزارنے کے لئے ان میں سے کسی کو کسی دوسرے کی قطعاً حاجت نہیں ہوتی ہر ایک اپنی خود کفنی زندگی گزارتا ہے۔ اپنی قوت بازو سے آخر وقت تک خود کما کما کر اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ لیکن بنی آدم کا کیا حال ہے۔ ایک تو خدا خدا کر کے ان کے ضعف کا ازالہ ہی برسوں کے بعد ہوتا ہے۔ اس کے بعد حصول معاش کی جو قوتیں انسان کے دست و بازو میں نمایاں ہوتی ہیں۔ زیادہ زمانہ گزرنے نہیں پاتا کہ بتدریج دیے پاؤں پھر وہی پیدائشی ضعف مختلف راستوں سے، مختلف بھیس میں سر نکالنا شروع کرتا ہے اور بالآخر ایک ایسے نقطہ تک پہنچ کر رہتا ہے کہ تقریباً وہی حال جس حال میں آدمی پیدا ہوا تھا، دیکھا جاتا ہے کہ پھر اسی کی طرف پلٹ گیا۔ جیسے شروع میں نگرانوں کا مال باپ کی شکل میں محتاج تھا۔ آخر میں وہی آدمی ان ہی نگرانوں کا بیٹے اور بیٹیوں، پوتے اور پوتیوں کا دست نگر نظر آتا ہے۔ پیدائشی ضعف کی طرف جیسے قرآن میں خلق الانسان ضعیفا کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ظہور قوت کے بعد دوسرا ضعف جو اس پر طاری ہوتا ہے مندرجہ ذیل آیت کریمہ

خلقکم من ضعف ثم من بعد
ضعف قوۃ ثم من بعد قوۃ
ضعفا و شیبہ۔

پیدا کیا خدا نے تمہیں ضعف سے، پھر ضعف کے بعد قوت (نمایاں ہوتی ہے) اور قوت کے بعد پھر ضعف اور پیرانہ سری (آدمی پر مسلط ہو جاتی ہے)

میں ذکر فرمانے کے بعد قوت کے بعد والے طاری ہونے والے ضعف کے ان آثار کا تذکرہ جو آدمی کے ظاہر جسد میں نمایاں ہوتے ہیں، بایں الفاظ فرمایا گیا کہ

ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق
اور جسے ہم معمر کرتے ہیں۔ پلٹتے ہیں ہم اسے اس کی خلقت میں۔

یہ تو باہر میں ہوتا ہے کہ لمبے لمبے ہاتھ پھولی پھولی گردنیں، مچھلیاں نکلے ہوئے بازو، قوت و زور سے بھری ہوئی پیٹھیں، پیٹھوں سے جکڑی ہوئی ٹانگیں بتدریج گھٹتے گھٹاتے، گھٹتے گھٹاتے ایک لپٹی ہوئی گٹھری کی شکل میں بدل جاتی ہیں۔ گویا وہی گوشت کا ایک زندہ لوتھر جیسے آدمی شروع میں معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں بھی وہی کیفیت بلکہ شاید اس سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اس لوتھرے پر جو ابتداء میں پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کو پیار آتا ہے اور اس جھری پڑے ہوئے کانپنے والے اور مقرر مقررانے والے مضغہ گوشت کے دیکھنے سے تو نگاہوں کو دکھ پہنچتا ہے

اسلامی معاشیات
طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔ بسا اوقات دیکھنے والوں میں گھن پیدا ہوتی ہے۔ تنکیس اور پٹاؤ کی یہ کیفیت تو باہر میں
میں طاری ہوتی ہے، اور اندر میں جو انقلاب برپا ہوتا ہے، باطنی قوتوں کی ساری آبدیاں جس طرح اچڑکے
برباد ہوتی ہیں قرآن ہی نے

ثم نردہ الی ارضہم لعلہم یعلمون بعد علمہم شیئاً۔
پھر پٹا دیتے ہیں ہم اس کو بدترین سن کی
طرف (یہ اس لئے ہم کرتے ہیں تاکہ نہ جانتے
جاننے کے بعد کسی چیز کو۔

کے الفاظ میں اس واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ دراصل اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ شخصی حیثیت سے انسانوں کے کم ہی کام
ایسے ہوتے ہیں۔ جسے وہ اپنے سامنے مکمل کر کے دنیا سے جاتا ہو۔ عام حال اس سلسلے میں وہی ہے کہ ع
کار دنیا کسے تمام نہ کر دے۔ اور اجتماعی حیثیت سے زمین کے اس کرہ پر آدم کی نسل زندگی کے جن جن شعبوں
کے متعلق سہولتوں کے پیدا کرنے کی دھن میں مشغول ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رفتار جتنی بھی سست ہو
لیکن عموماً پچھلی نسلوں میں دیکھا جاتا ہے کہ اگلی نسلوں کے حساب سے بات کچھ نہ کچھ آگے بڑھتی چلی ہی آرہی
ہے۔ لیکن جس رفتار سے انسان کی اجتماعی کوششیں اس راہ میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس کا اندازہ صرف اسی
سے ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے تاریخ کے نامعلوم زمانے سے آدمی جدوجہد میں
مصروف ہے، سمجھا جاتا ہے کہ اس راہ میں اس نے بہت بڑا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ خصوصاً جب سے ہوائی جہازوں
کے ذریعہ سے آدمی قابو یافتہ ہو گیا ہے کہ پہاڑوں، دریاؤں، اندیوں، نالوں اور نشیب و فراز کے جھگڑوں
سے گویا آزادی مل گئی، پلوں، سڑکوں، بندوں کی جھنجھٹوں کی ضرورت مسافت کے طے کرنے میں باقی نہیں رہی
بلاشبہ یہ ہوا ہے لیکن بات مقابلہ سے سمجھ میں آتی ہے۔ مقابلہ کر کے جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ سب کچھ ہو جانے
کے باوجود بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان چڑیوں، طوطوں، مینوں، گدھوں، چیلوں اور کوؤں کے برابر بھی تو نسل
انسانی زندگی اس انتہائی ترقی یافتہ شعبہ میں نہیں پہنچی ہے۔ اسی نقل مکانی کے مسئلہ میں یا بالفاظ دیگر مواصلات
کے ذرائع میں وہ نہ تو ہے کے محتاج ہیں نہ لکڑیوں کے نہ پٹرول کے اور نہ ان دوسری گیسوں کے جن کے بل
بوتے پر انسان نے ہوائی راستوں پر اقتدار حاصل کیا ہے، اب بھی ان اجزاء میں سے کوئی چیز اگر غائب ہو جائے
جو ہوائی جہازوں کو اڑانے کے لئے ضروری ہیں تو آدمی بازو ڈال دے گا۔ مگر اسی کے مقابلے میں ایک معمولی
کھٹی، لنگڑا مچھر، جب اس کا جی چاہتا ہے۔ صرف پروں کے کھولنے کی دیر ہے۔ یہ گیا، وہ گیا، فضاء آسمانی
میں گم ہو گیا، اُن! خلق اللہ انسان ضعیف کی یہ کیسی کھلی تفسیر ہے۔ مچھروں اور مکھیوں کے مقابلے میں بھی
جو معذور ہو، اور ان تعلیم اور ترقیوں کے دعووں کے بعد بھی معذور ہو، اس کی ناتوانیوں اور زبوں حالیوں کا
کوئی ٹھکانہ ہے۔ اور اس پر بھی حال یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس سے بن آیا وہ تنہا نہیں بلکہ ایک ایک کام کے لئے
ہزاروں اور لاکھوں ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بقول شخصہ کہ آدمی کے منہ میں روٹی کا ایک لقمہ بھی جو
جاتا ہے تو بیسیوں ہاتھوں سے گزرنے کے بعد جاتا ہے، گیہوں کے بونے والے، جوتے والے، پانی دینے
والے، کاٹنے والے، بھونسنی صاف کرنے والے، تولنے والے، بیچنے والے، بازار میں لانے والے، دکان میں

رکھنے والے، خریدنے والے، پینے والے، آٹا کو لاد کر لانے والے، پکھنے کے برتن کو بنانے والے، ایندھن کی لکڑیوں کو لانے والے، دسترخوان پر چھنے والے، جب ان سب ہاتھوں کے کام ختم ہو جاتے ہیں، تب لقمہ توڑ کر اٹھانے والے کا ہاتھ اس لقمہ کو منہ تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ تو ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ہر سلسلہ کے ساتھ جو دوسرے سلسلے ہیں، مثلاً ہل کی لکڑیوں کے کاٹنے والے، ہل میں لوہے کو مٹونکنے والے، لوہے کو کان سے کھود کر بازار میں لانے والے، اگر یوں سوچا جائے تو روٹی کے اس ایک لقمے میں کام کرنے والے ہاتھوں کی تعداد خُدا ہی جانتا ہے۔ کہ کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اسی بے نوا دے سرو سامان غریب انسان کے مقابلہ میں دیکھئے، ان کو دیکھئے جو اسی قسم کی جان رکھتے ہیں جیسی یہ رکھتا ہے۔ اس میں بھی چوبیس گھنٹوں میں تحلیل یافتہ اجزاء کی جگہ بدن میں بدل پہنچانے یا تلافی مافات کی مسلسل ضرورت رہتی ہے، بلکہ ان میں کتنے ہیں جو دن بھر میں سیروں نہیں منوں خوراک کے محتاج ہیں۔ آخر ان ہی میں ہاتھی بھی تو ہے، دھیل مچھلی بھی، اڑدے، اور گنیڈے بھی، اور کیا کیا بتایا جائے کہ کیا کیا ہیں۔ لیکن ان میں جو بھی ہیں، اپنی ساری ضرورتوں کو صرف اپنی قوت بازو سے مہیا کرتے ہیں۔ حاتم طایوں کی منت سے ہر ایک کی گردن آزاد ہے۔ ان میں بعضوں کو اس مدت کی دگنی اور چوگنی مدت اسی زمین میں گزارنی پڑتی ہے۔ جتنی انسان گزارتا ہے۔ بلکہ اگر کرکس (گدھ) وغیرہ کی طول عمری کا افسانہ صرف افسانہ نہیں ہے۔ تو ان کی معاشی زندگی کی مدت کی طوالت کا مقابلہ انسانی افراد کیا، ان کی نسلیں اور پشتہ نہیں بھی تو نہیں کر سکتیں، مگر باوجود اس کے ان میں ہر ایک کی زندگی خود کفایتی زندگی ہے۔ وہی خود کفایتی زندگی جس کے لئے آدم کی اولاد تڑپ رہی ہے، لاکھوں برس سے تڑپ رہی ہے۔ انفرادی طور پر جب اس کا حصول ناممکن نظر آتا ہے تو کرہ زمین کے مختلف حصوں میں وہی اور فرضی حدود پیدا کر کے ان فرضی حدود کے باشندوں کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ ہر ایک سے ممکن نہ ہو تو کئی ایک جوان فرضی حدود میں رہتے ہیں۔ وہ تو اپنی زندگی کو خود کفایتی زندگی بنالیں، یعنی ان فرضی حدود کے باہر رہنے والوں کی امداد سے تو مستغنی ہو جائیں حیوانوں کے ہر فرد کو خود کفایت کا جو مقام عالی حاصل ہے۔ اگر وہاں تک رسائی ممکن نہ ہو تو آدمی کی ٹویوں کو تو خود کفایتی ہونے میں کامیاب بنایا جائے۔ لیکن جس مقصد میں اجتماعی قوت و طاقت سے کام لینے کے باوجود آدمی کو کامیابی نہیں حاصل ہو رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے سوا ان جیتے جاگتوں میں جتنے ہیں۔ سب ہی کامیاب ہیں، اور کیوں کامیاب نہ ہوں۔ آدم کے بچوں کا ضعف اور ان کی ناتوانی خواہ سابق ہو یا لاحق، یعنی پیدائش کے بعد والی کمزوری ہو یا ظہور قوت کے بعد جو ضعف لاحق ہوتا ہے وہ ہو، کہ وہ تو خیر ضعف ہی ہے۔ لیکن زندگی کا جو عہد آدمیوں میں قوت اور زور کا عہد سمجھا جاتا ہے ایک تو یوں ہی دو ضعفوں میں گھرا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ دونیسٹیوں کے بیچ والی ہستی بھی ایک قسم کی ہستی ہی ہوتی ہے، عربی کا مشہور مقولہ ہے

۱۔ وجود بین العدین عدم ۲۔ دونیسٹیوں کے درمیان والی ہستی بھی

ہستی ہی ہوتی ہے۔

لیکن اسے صوفیانہ غلو بھی اگر قرار دیا جائے، جب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قوت و طاقت، توانائی

اور زور کے اس زمانے میں بھی آدمی میں قوت کے جو آثار نمایاں ہوتے ہیں، خم ٹھوکنے والے، مونچھوں پر تاؤ دینے والے اپنے متعلق اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر جتنی تعلیموں اور فن ترانیوں سے بھی کام لیتے ہوں مگر اس کا راز بھی ہلکے سے مقابلہ سے کھل جاتا ہے۔ کچھ نہیں صرف غریب چیونٹیوں کو بھی لاکر مقابلہ کے اس میدان میں کھڑا کر دیجئے، اور اندازہ لگانے والوں سے پوچھئے کہ قوت و طاقت کے اس عہد میں زور و قوت کا جو حصہ آدمی میں پایا جاتا ہے، اس کو ان غریب چیونٹیوں کی قوت سے کیا نسبت ہے۔ جواب میں ارباب تجربہ و مشاہدہ کا یہ بیان سنئے۔

”چیونٹی اپنے وزن سے ترہ سو گنا بوجھ کھینچ سکتی ہے۔“

کیا معنی کہ چیونٹی کے مختصر قد میں قدرت جتنی قوت بھرتی ہے۔ اگر آدمی میں بھی قوت کا یہی پیمانہ ہوتا تو لکھتے ہیں کہ ”اس قوت سے سات ہزار سات سو من وزنی چیز پکڑ کر وہ اٹھا سکتا تھا۔“ یعنی کچھ نہیں صرف ایک چیونٹی کو قوت کا جو حصہ ملا ہے، اگر آدمی کو ملتا تو سو ایکڑ کی پیداوار کو (ایک ایک آدمی) ایک ہی دہلہ میں کھیت سے گھر پہنچا سکتا تھا ایک شہر سے دوسرے شہر تک جس مال کو منتقل کرنے کے لئے پوری ایک مال گاڑی کی ضرورت ہوتی ہے ایک سوداگر خود ہی تنہا اسے کھینچ کر لاسکتا تھا، اور یہ اس زور بازو کا حال ہے۔ جسے اپنے اندر محسوس کر کے یہ آدم زاد کیا کیا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن مقابلہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ آدم کے بچوں کو اتنا بھی تو نہیں ملا ہے جس کی غریب ”مور ضعیف“ حصہ دار ہے۔ ایک چیونٹی ہی کیا لکھنے والوں نے تو اسی سلسلہ میں یہاں تک لکھا ہے کہ پتنگوں اور پروانوں میں اچھلنے اور کودنے کی جتنی قوت ہوتی ہے۔ اگر آدمی میں بھی قوت اسی نوعیت کی ہوتی تو تین سو فٹ بلندی تک ایک چھلانگ میں یہ پہنچ سکتا تھا۔

بہر حال کتابوں میں پڑھئے، زندہ چیزوں کی ایک بڑی تعداد میں قوت و طاقت کا وہی معیار آپ کو نظر آئے گا، جس کے سامنے غریب انسان کی اٹھی ہوئی گردن انتہائی شرمندگی سے جھک جاتی ہے اور خدا کی بات خلق الانسان ضعیفا کے ماننے پر اپنے آپ کو وہ مجبور پاتا ہے۔

اور یہ بھی بنی نوع انسان کی وہ پہلی خصوصیت جس کا قرآن کے حوالے سے میں یہاں ذکر کرنا چاہتا تھا، میرے نزدیک انسان کے جس معاشی نظام کو اسلام نے پیش کیا ہے اس میں منجملہ دوسری چیزوں کے فطرت انسانی کی اس خصوصیت کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔

دوسری خصوصیت (۲) دوسری خصوصیت اسی سلسلہ کی وہ ہے جس کی طرف قرآن ہی میں باری لفظ تنبیہ کی گئی ہے۔

دیکھ تو! کس طرح ان میں بعض کو جن پر

ہم نے برتری عطا کی ہے۔

۱۲ نظر کیف فضلنا بعضہم علی

بعض (بنی اسرائیل)

۱۱ بعضوں کا بیان ہے کہ چیونٹی اپنے دانت سے اس چیز کو کھینچ لیتی ہے جو اس کے وزن سے تیس ہزار گنا زیادہ وزنی ہو یہ معلومات رسالہ سائنس اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ دیکھئے اگست ۱۹۴۳ء کی اشاعت ۱۲

اور برتری بخشی خدا نے تم میں بعض کو
بعض پر۔

ورفع بعضکم فوق بعض درجات
(الانعام)

یا

اور ہم ہی نے اوپنا کر دیا ہے تم میں بعض کو
بعض پر مدارج کے لحاظ سے۔

ورفعنا بعضکم فوق بعض درجات
(زخرف)

کے الفاظ میں آپ کو ملیں گی۔

مطلب یہ ہے کہ یوں تو تماشہ گاہِ عالم کی بنیاد ہی صفات و کمالات کے تفاوت پر مبنی ہے۔ جہاں
میں وہ صفات نہیں پائے جاتے جن کا بنائے کو مالک بنایا گیا ہے۔ نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن
سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے بہرہ نہیں ملا ہے۔ جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد قائم
ہے۔ اور صفات و کمالات کے تفاوت کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ گلاب
کی دو پنکھڑیاں بھی باہم ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہو سکتیں۔ تجربے اور مشاہدے نے ثابت کیا ہے کہ بائیں ہاتھ
ایک رنگی ایک پنکھڑی کچھ نہ کچھ خصوصیت اپنے اندر ایسی ضرور رکھتی ہے۔ جو دوسری پنکھڑی میں نہیں پائی جاتی۔
”تجلیات میں تکرار نہیں ہے“ تفاوت و صفات ہی کے مسئلہ کی یہ صوفیانہ تعبیر ہے۔ غالب مرحوم نے ع لوج
جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں“ کے مصرعہ میں اسی واقعہ کو دہرایا ہے۔ بلکہ اس واقعہ کی واقعیت پر اتنا
بھروسہ کیا گیا ہے کہ اسی پر اعتماد کر کے حکومت والوں نے ہر شخص کے ابہام (ہاتھ کے انگوٹھے) کے نشان کو
دستخط کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شخص کے انگوٹھے کی لکیریں دوسرے
شخص کے انگوٹھے کی لکیروں سے کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رکھتی ہیں، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صفات
کے تفاوت کا اگر یہ تماشہ دنیا میں نہ پیش ہوتا تو ان گنت بے شمار طرح طرح کی بوتلموں ہسیتوں سے آج عالم
جو بھرا ہوا نظر آ رہا ہے۔ کثرتوں کا یہ مجموعہ ظاہر ہے کہ صرف ایک واحد شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا۔ ایک چیز کا
دوسری چیز سے امتیاز کی صورت ہی اس کے سوا کیا تھی کہ صفات و کمالات میں باہم ایک کو دوسرے سے جدا
کر دیا جائے۔ لیکن بائیں ہاتھ اختلافات و امتیازات یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ موجودات کی مختلف
قسموں میں جو صفت بندی کی گئی ہے۔ کسی سلسلہ کو نباتات، کسی کو جہادات، کسی کو حیوانات، کسی کو انسان
جو ہم کہتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس اختلاف کے باوجود کچھ چیزوں کے اندر ایٹلاف و مجانسیت و
مشابہت بھی یقیناً پائی جاتی ہے، اور اتنی زیادہ مجانسیت و مشابہت کہ اسی بنیاد پر ان کو کسی نہ کسی ایک
نوع یا صنف کے نیچے ہم داخل کرتے ہیں۔ ایک ایک جنس یا ایک ایک نوع کے افراد میں باوجود صفاتی امتیازات
کے وحدت کے مشترک جہات بلاشبہ اتنی کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ بجائے دو کے ان کو ایک جنس یا ایک
نوع کے نیچے اگر مندرج کیا گیا ہے تو قطعاً یہ غلط اندراج یا غلط صفت بندی نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر ہم گھوڑوں
گدھوں، بیلوں کے افراد کو اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی سمجھتے ہیں اور اسی نقطہ نظر سے ان تمام

انواع میں ایک نوع کے نیچے افراد انسانی بھی مندرج ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ انسان کے سوا حیوانات کی جتنی دوسری نوعیں ہیں، مثلاً گھوڑا، ہاتھی، بیل وغیرہ، گو ان کے افراد میں بھی صفات و کمالات کا تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے اگر ہر نوع کے تمام افراد نہیں تو ایک نوع کے جو مختلف اصناف ہیں مثلاً بکروں کی ایک ایک صنف کے افراد پر اگر غور کیجئے تو باوجود صفاتی تفاوت کے اس صنف خاص کے افراد میں اتنی یکجہتی پائی جاتی ہے کہ جو کمالات ایک فرد میں پائے جاتے ہیں۔ وہی کمالات اس صنف کے قریب قریب دوسرے فرد میں بھی آپ پائیں گے۔ مثلاً مرغیوں کی سینکڑوں نسلیں ہیں۔ ہر نسل چند خاص خصوصیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ مشاہدہ کی بات ہے کہ ان نسلی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس نسل کے افراد میں بھی گو کچھ نہ کچھ تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اتنا کم کہ اس کا ہونا، نہ ہونا، دونوں گویا کچھ برابر ہی برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان جانوروں کی ہر نسل کے افراد کی معاشی ضرورتیں تقریباً یکساں ہوتی ہیں۔ کھانے میں، پینے میں، رہنے سہنے کی عادتوں میں۔ سب کی معاشی سطح قریب قریب برابر ہی رہتی ہے۔ لیکن اسی کے مقابلے میں آدمی اور اس نوع کے افراد پر غور کیجئے، جس کا نام انسان ہے اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ اور مختلف نسلوں میں آدمی بھی نبٹا ہوا ہے۔ لیکن حال یہ ہے کہ دو نسلوں یا دو قسموں کو تو جانے دیجئے، ایک ہی ماں باپ کے دو بچے ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں میں پیدا شدہ صفات و کمالات کے اعتبار سے تفاوت اور اتنا تفاوت ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ دیکھا گیا ہے اور روز دیکھا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک کو اگر انسان کہا جاسکتا ہے تو دوسرے پر شاید حیوان کے لفظ کا اطلاق بھی مشکل ہی سے صحیح ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر دونوں ہی پر انسانوں ہی کی کھال چڑھی رہتی ہے۔ دونوں پر انسانی ہی چہرے مڑھے ہوتے ہیں۔ لیکن ذہنی، دماغی، جسمانی، اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی کمالات و صفات کے اعتبار سے آئے دن دیکھا جاتا ہے کہ ایک بھائی اگر آسمان پر ہے تو دوسرا ٹھیک اس کے بالمقابل تحت اثری یا پاتال میں ہے۔ ایک خوب صورت ہے، اتنا خوب صورت کہ دیکھنے والوں کی ٹکٹکی بندھ جائے۔ دوسرا اتنا زشت رو، کریمہ المنظر، مجدی شکل کا پیدا ہوتا ہے کہ دیکھ کر جی متلانے لگے، ایک غبی ہے، دوسرا ذہین۔ ایک چست و چالاک ہے۔ دوسرا پیدائشی کاہل و سست، ایک فرشتہ خصلت ہے۔ دوسرا شیطان سیرت، کسی کو شاعری سے لگاؤ ہے تو دوسرے کو ریاضی سے، کسی کا جی بیوپار اور کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ تو دوسرا کتبوں کا کٹر نظر آتا ہے۔ اور ٹھیک جیسے حیوانی اصناف میں سے ہر صنف اور ہر قسم کے افراد میں صفاتی تفاوت کی کمی نے ان کی زندگیوں کی سطح میں ایسا محسوس تفاوت پیدا ہونے نہیں دیا۔ جسے قابل لحاظ سمجھا جائے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اسی وجہ سے ہر ایک کی معاشی ضرورتوں کی نوعیت کم و کیفیہ تقریباً ایک ہی طرز کی ہوتی ہے، اسی کے مقابلے میں افراد انسانی میں اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی اعتبار سے کمالات و صفات، اور ان کی

قدر و قیمت میں جو تفاوت پایا جاتا ہے۔ اسی نے زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے اندر مدارج کا اتنا اختلاف پیدا کر دیا ہے کہ انسان کے سوا مدارج و مراتب کے اس اختلاف کی نظر مشکل ہی سے کسی دوسری حیوانی نوز یا صنف یا نسل میں مل سکتی ہے۔ چوں کہ مدارج و مراتب کا یہ تفاوت افراد انسانی میں ان کمالات و صفات ہی کے تفاوت کا نتیجہ ہے۔ جو اکتسابی نہیں۔ بلکہ عموماً اکثر و بیشتر پیدائشی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ کسب و اکتساب سے بھی کمالات و صفات کی کمی و بیشی ان ہی رجحانات و میلانات اور ان ہی مناسبتوں اور صلاحیتوں کے تابع ہوتی ہے، جنہیں ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ شاعری کی صلاحیتوں کو محنت و کوشش تعلیم و تربیت، اصلاح و نگرانی سے آدمی ترقی دے سکتا ہے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ شاعری سے جسے قدرتی مناسبت فطرتاً نہ ہو، زور و ظلم سے کوئی اسے شاعر بنا دے۔ حالانکہ اسی کا دوسرا بھائی بے سیکھے سکھائے قصیدوں پر قصیدے، غزلوں پر غزلیں ڈھالتا چلا جاتا ہے آج تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بچوں کی طبعی مناسبتوں اور نفسیاتی رجحانوں کو سب سے زیادہ اہمیت جو دی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ اکتسابی نشوونما، ترقی و بالیدگی کی توقع ان ہی صفات کے متعلق کی جاسکتی ہے جنہیں مادرِ شکم سے بچہ اپنے ساتھ لایا ہو، اور یوں بھی تو سوچیے ایک ہی استاد سے ایک ہی کمرے میں ایک ہی نصاب کی تعلیم ہر جماعت کے طلبہ کو دی جاتی ہے۔ لیکن سب پر اس تعلیم کا نتیجہ ایک ہی کیوں مرتب نہیں ہوتا۔ بہر حال صفات و کمالات کے اسی تفاوت اور اس تفاوت سے مدارج و مراتب کا اختلاف، نسل انسانی کے افراد میں جو پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن نے مذکورہ بالا آیتوں میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہی وہ دوسری خصوصیت نوز انسانی کی ہے جس سے انسانی زندگی کا نظام متاثر ہوا ہے۔ معاشی زندگی کی وہ ہمواری جو گدھوں اور کتوں، بلیوں اور چوہوں اور ان جیسے مختلف حیوانی انواع اور نسلوں میں پائی جاتی ہے۔ بنی آدم کی زندگی کا معاشی نظام اس سے بالکل مختلف ہے اور اس اختلاف کو یعنی فطری کمالات کی کمی و بیشی کی وجہ سے معاشی زندگی میں جو نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی اونچا نظر آتا ہے اور کوئی نیچا۔ اس قصہ کے ختم کرنے کی صرف یہی تدبیر ہو سکتی ہے کہ پیدا ہونے والے بچوں کے اندر اسی وقت کوئی تبدیلی پیدا کی جائے جب رحم مادر میں مختلف جذبات و رجحانات کی صلاحیتوں اور مناسبتوں کو وہ فراہم کرتے ہیں اور ان کا تو میں نہیں کہتا۔ لیکن قرآن میں کائناتی حوادث کے اساسی کلیات میں جن چند چیزوں کو داخل کیا گیا ہے ان میں

۱۔ مطلب یہ ہے کہ افراد انسانی میں کمالات و صفات ہی کا صرف تفاوت نہیں پایا جاتا۔ بلکہ تدریج کے لحاظ سے مختلف انسانی صفات و کمالات میں قدر و قیمت کا بھی تفاوت قدرتی ہے۔ آخر بتایا جائے کہ کسی قوم میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے۔ اور بہت زور لگانے کے بعد یہ کام کرتا ہے کہ لوگوں کو میری بنا بنا کر دیتا ہے، یعنی بڑھی یا بنجار ہے۔ اسی قوم میں ایک اور فرد پیدا ہوتا ہے جو لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا اپنی قوم کو مالک بنا دیتا ہے۔ یا اپنی قوم کو دوسری غاصب قوموں سے نجات عطا کرتا ہے۔ کیا ثانی الذکر کی صلاحیت جو قیمت رکھتی ہے۔ اول الذکر کا کمال بھی کیا اسی قدر اس قیمت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ کمالات و صفات میں بھی قدر و قیمت کا تفاوت ہوتا ہے، اس کا یہی مطلب ہے ۱۲

ويعلم ما في الاصحاح
اور جانتا ہے (خدا) اس چیز کو جو رحموں
میں ہوتی ہے۔

بھی ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ماؤں نے کن صلاحیتوں کے بچوں کو اپنے ارحام میں محفوظ کیا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد آئندہ وہ کیا ہونے والے ہیں، اسکندر و تیمور، افلاطون و ارسطو، یا ہینقار عرب، فسانہ عجائب کا خوجی؟ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ وہی جان سکتا ہے جو "ما رہین" کہے یا "نطقہ" میں انسانی کمالات بھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن میں فضلنا بعضہ علی بعض کے ذریعہ سے اس کا اعلان فرمادیا گیا کہ افراد انسانی میں صفات و کمالات کا یہ تفاوت کسی دوسرے کا نہیں۔ بلکہ براہ راست قدرت کا کام ہے۔ اور جس طرح یہ قدرت کا کارنامہ ہے۔ اسی طرح تفاوت صفات کی وجہ سے افراد انسانی میں مدارج و مراتب کا جو فرق پیدا ہو گیا ہے، یہ بھی کسی دوسرے کا نہیں، بلکہ صاف لفظوں میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ

مرفعنا بعضہم فوق بعض درجات
اور ہم ہی نے اونچا کر دیا ہے تم میں بعض کو
بعض پر مدارج کے اعتبار سے۔

یعنی کسی کو ایسی صفت دی گئی جو نتیجے کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اور کسی کو ایسا کمال عطا کیا گیا ہے جو اپنے ثمرات و آثار کے لحاظ سے اہم و قیمتی ہے۔ اور اسی لئے دونوں کو اپنی اپنی صفات کی قیمت برابر نہ ملی۔ ایک کا درجہ دوسرے سے بلند ہو گیا تو یہ بھی قدرتی دین ہی کا نتیجہ ہے۔

اپنے کمالات و اوصاف کی زیادہ قیمت پالنے والا اگر معاشی لحاظ سے اپنے آپ کو بسط اور کشادگی حالت میں پاتا ہے۔ اور جن کے کمالات و صفات اتنی قیمت نہ پاسکے، اور اس کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی میں بجائے فراخی و کشادگی کے ضیق و تنگی پائی جاتی ہے، تو لازماً یہ دونوں حالتیں بھی اسی قدرت کی طرف منسوب ہوں گی، جس نے انسانوں کے سوا دوسرے حیوانات پرندوں، چرندوں، درندوں، دونوں کے افراد میں کمالات و صفاتی تقارب و تساوی پیدا کر کے ایک طرف اگر ان میں سے ہر صنف کے افراد کی معاشی سطح کو قریب قریب برابر کر دیا ہے۔ تو دوسری طرف انسانی افراد کو صفاتی تفاوت کے قانون کے تحت پیدا کر کے باہم معاشی اعتبار سے انہیں مختلف کر دیا ہے۔ ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اسی حقیقت اور اسی واقعہ کا اعلان

واللہ یبسط الرزق لمن یشاء
و یقدر۔
(روزی کو)
خدا ہی ہے جو کشادگی عطا کرتا ہے روزی میں
کسی کو اور تنگی دیتا ہے۔ کسی کی

کے الفاظ میں قرآن مسلسل کرتا چلا گیا ہے۔ بلکہ صفاتی و کمالاتی تفاوت کا جو قانون انسانی افراد کے درمیان

۱۔ عرب کی ایک مشائی ہستی کا نام کہا جاتا ہے کہ ہینقار تھا۔ اتنا احمق اور خائب و داغ آدمی تھا کہ گلی میں ٹوٹے جو توں کا ہار لٹکائے رہتا تھا، پوچھا جاتا کہ یہ کیا ہے تو کہتا کہ اسی علامت اپنے آپ کو میں پہچانتا ہوں کہ میں ہی ہوں! اردو میں ہینقار اسی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے ۱۲

پایا جاتا ہے، اس کو تو قرآن نے صرف

فضلنا بعضہم علی بعض - اور ہم ہی نے اونچا کر دیا ہے تم میں بعض کو بعض پر

کے اطلاقی پیرایہ میں ادا کیا ہے، یعنی صرف یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ بعض افراد کو بعض پر ہم ہی نے برتری اور فضیلت بخشی ہے۔ لیکن یہ بات کہ کن باتوں میں فضیلت بخشی ہے۔ اسے ابہام و اطلاق ہی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ اور ہے بھی یہی بات کہ وہ اتنے مختلف الجہات و وجوہ ہیں کہ ان کی تفصیل میں غیر ضروری طوالت ہو جاتی، صرف تفاوت صفات کے اس قانون پر تنبیہ کرنے کے لئے اتنے الفاظ کافی ہیں، آدمی اس کے بعد ان کی تفصیلاً کو مشاہدہ اور تجربہ کی روشنی میں خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ مگر صفاتی و کمالاتی تفاوت کے اس قدرتی قانون کے زیر اثر انسانوں کے بعض افراد کو بعض پر نتیجہً جو معاشی فضیلت اور برتری حاصل ہو گئی ہے اور ہو جاتی ہے بجائے اطلاق و ابہام کے

و اللہ فضل بعضکم علی بعض اور خدا ہی نے برتری عطا کی ہے تم میں

بعض کو بعض پر "الرزق" یعنی روزی میں۔

فی الرزق -

کی آیت میں "فی الرزق" کی جو تصریح کر دی گئی ہے۔ یہ ظاہر اسے اگر اس کا اشارہ سمجھا جائے کہ صفاتی و کمالاتی تفاوت کے قانون سے ایک بڑی غرض قدرت کی یہ ہے کہ "الرزق" یا معاشی لحاظ سے انسانی افراد میں ارجح فرق پیدا ہو جائے، یعنی قصداً و ارادہً اسی رزقی فرق مراتب کو پیدا کرنے کے لئے نوع انسانی کے افراد میں صفاتی و کمالاتی تفاوت کے قانون کو قدرت نے نافذ کیا ہے۔ ورنہ انسانی افراد کی معاشی سطح کو ہم سطح اور برابر رکھنے کا ارادہ اگر کیا جاتا تو جس قدرت نے ہزار ہا ہزار جانوروں کی معاشی سطح کو تفاوت کے اس

۱۵ بلکہ آیت کے ان ہی الفاظ کے بعد یہ جو فرمایا گیا ہے کہ فما الذین فضلوا برزقہم علی ما ملکت ایمانہم (یعنی جنہیں رزق میں برتری بخشی گئی ہے، وہ اپنے رزق کو نہیں واپس کرنے والے ہیں، ان لوگوں پر جو ان کے زیر دست ہیں) لوگ اس کا مطلب جو بھی لیتے ہوں لیکن ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ رزقی برتری چونکہ صفاتی و کمالاتی برتری کا نتیجہ ہوتی ہے اسلئے اپنے کمالات کی بنیاد پر رزق کا زیادہ حصہ جن لوگوں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ وہ اس حصہ کو اپنے کمالات کی قدرتی قیمت سمجھتے ہیں، اور اس کا اپنے آپ کو جائزہ یقین کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایسا کوئی نہیں ہے جسے اپنے کمالات کی قیمت کی صورت میں رزق کا زائد حصہ زیر دستوں کے اعتبار سے اگر ملا ہو تو یہ خیال کر کے کہ یہ جو کچھ مجھے ملا ہے میرا نہیں ہے۔ اپنے زیر دستوں کو واپس کر دے یعنی اس حصہ کا اپنے آپ کو حق دار نہ قرار دے کہ واپس تو کوئی نہیں کرتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اپنا جائز حق قرار دینے کے بعد دوسروں کو وہ عطا کر دے، دیدے۔ لوگ رد اور عطا میں فرق نہیں کرتے۔ اس لئے طرح طرح کے مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اگر وہ اس پر غور کریں کہ رد کے معنی واپس کرنے کے ہیں۔ پس رد اور واپسی تو اس چیز کی ہوتی ہے جس کا آدمی مالک ہی نہیں ہوا، اور عطا یعنی دینے کا مطلب یہ ہے کہ چیز تو میری ہے۔ میں اسے نہیں پیہ کر تا ہوں۔ قرآن میں نفی رد کی گئی ہے۔ نہ کہ ہبہ اور عطا کی اور نہ ہبہ و عطا کی نفی کیسے صحیح ہوگی۔ جبکہ رات دن مالداروں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنا مال دوسروں کو عطا کرتے ہیں، البتہ یہ کوئی نہیں کرتا کہ جو قیمت اپنے کمال یا مہارت کی کسی کو ملی ہو، اسے یہ کہہ کر واپس کر دے کہ اس کا میں حقدار ہی نہیں ہوں، پھر لوں کیسے ۱۲

قانون سے علیحدہ رکھ کر برابر کر دیا ہے۔ وہی قدرت صرف نوع انسان ہی کے افراد میں اس مساوات کے پیدا کرنے سے کیا مجبور تھی؟ بہر حال اب کچھ ہی ہو، نوع انسان کی دوسری قرآنی خصوصیت جس کا انسان کے ”معاشی مسئلہ سے گہرا اور بہت زیادہ گہرا تعلق ہے۔ وہ صفات و کمالات کے تفاوت کا یہی قدرتی قانون ہے، قرآن بھی بنی نوع انسانی کے افراد کا اسے قدرتی قانون قرار دیتا ہے۔ اور مشاہدہ بھی اس کی تصدیق کر رہا ہے۔

(۳) تیسری خصوصیت اسی سلسلہ کی وہ ہے جس کی طرف میرے خیال میں آیت قرآنی

۱۲۱ انسان خلق مملوعاً قطعاً آدمی لالچی اور بے صبر بنا کر پیدا کیا گیا۔

میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مملوع عربی زبان کا ایک لفظ ہے۔ انسانی نفسیات کی اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ جسے قاضی بیضاوی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

۱۱۱ شدید الحرص قليل الصبر یعنی سخت لالچی اور بہت کم صبر رکھنے والا۔

غالباً صحاح کی مشہور روایت

لو كان لابن آدم واديان من مال

اگر آدم کے بچے کو دو وادی بھر مال دیا جائے

لا يتبغى واديا ثالثاً۔

تو چاہے گا وہ تیسری وادی کو۔

قرآن کے اسی لفظ مملوع کی یہ توضیح و تفسیر ہے۔ بعض صحابہؓ نے اسی بنیاد پر یعنی مملوع کے لفظ کا چوں کہ یہی اصل ہے۔ اسی لئے اس حدیث کو انہوں نے قرآن ہی کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کجیہ حدیث کے یہ الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ مقصد وہی ہے کہ قرآن کے لفظ مملوع کا یہ مفاد ہے۔ اسی طرح سورہ والعادیات میں یہ فرمانے کے بعد کہ

۱۲۲ انسان لربہ لکنود۔ قطعاً آدمی اپنے رب کا ناشکر ہے۔

یعنی آدمی کی یہ عام عادت ہے کہ حاصل شدہ نعمتوں کی قدر و قیمت سے تو غافل ہو جاتا ہے۔ ان کے متعلق کسی قسم کے احساس شکر کو اپنے اندر بیدار نہیں کرتا، نعمتیں زائل ہو کر اپنی قیمت جب تک آدمی پر ثابت نہیں کرتیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ اسے ملا ہی نہیں۔ اور ان ”یافتہ“ سہولتوں سے بے پروا ہو کر دیکھا جاتا ہے کہ ہمیشہ ”نایافتہ“ تمناؤں اور آرزوؤں میں الجھا رہتا ہے۔ صرف بنیائی ہی کی ایک نعمت ہے۔ روپیہ رکھتے ہوئے مشکل ہی سے ایسا کوئی آدمی ہوگا جو سب کچھ دے کر اسی بنیائی کو خریدنے پر اس وقت آمادہ نہ ہو جاتا ہو۔ جب خدا نخواستہ اس کے ضائع ہونے کا خطرہ دھکی دینے لگے، اسی پر دوسری نعمتوں کو قیاس کرنا چاہیے۔ مگر جب تک نعمتیں اس سے چھنتی نہیں ہیں، انہیں گویا وہ آنکھ بھی نہیں لگاتا۔ اور ان سب کے ہوتے ہوئے ان چیزوں کی فکر میں جو ابھی حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ مگر چاہتا ہے کہ وہ حاصل ہوں، پریشان ادھر سے ادھر مارا مارا پھرتا ہے چہرے پر ایسی حالت طاری کرتا ہے کہ گویا اس وقت تک قدرت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا اس حرام نصیب کو کبھی موقعہ ہی نہیں ملا، امیر ہوں یا غریب، اس باب میں سب کا عام حال یہی ہے، بہر حال فطرت انسانی کی اسی عام کنودیت (ناشکری) کا ذکر کرنے کے بعد اسی موقعہ پر قرآن میں

۱۲۳ لعل الخیر لشدید۔ اور آدمی ”الخیر“ کی محبت میں انتہا پسند واقع ہوا ہے۔

جو فرمایا گیا ہے، یہ بھی اگر غور کیا جائے تو اسی لفظ ہلوع ہی کے مفاد کی دوسری وسیع تعبیر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہلوع کے لفظ سے تو صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی حد سے زیادہ لالچی ہے اور کسی نقطہ پر اس کے دل کو قرار نہیں ہوتا، جو کچھ مل جاتا ہے، اسے تو ملا ہی ہوا سمجھ کر ان چیزوں کی فکر میں ڈوب جاتا ہے جو ابھی نہیں ملی ہیں، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں کھودنے والے نے کوئی ایسی عمیق اندھی کھائی کھودی ہے، جو کسی طرح بھرنے کو آتی ہی نہیں۔ اور، کے بعد اور، کا مطالبہ مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پوری شدت کے ساتھ زندگی بھر اس پر مستطاب رہتا ہے۔ پھر اس مطالبہ کا رخ اگر ایک ہی قسم کی کسی چیز کی طرف ہوتا تو غنیمت تھا۔ اس دوسری آیت میں یہ فرما کر کہ ایک دو چیزوں ہی کی حد تک اس کا یہ مطالبہ محدود نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جس پر انسانی فطرت کے لحاظ سے الخیر کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے، یعنی ہر وہ چیز جو آدمی کو بحالی معلوم ہو۔ الخیر کی ان تمام قسموں کے ساتھ آدمی کی فطرت کا ہلوعی تعلق ہے۔ اور ان کی چاہ میں وہ شدید یعنی انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ الخیر کے چند امتیازی افراد کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ قرآن ہی میں دوسری جگہ بایں الفاظ کیا گیا ہے جس کا کسی دوسری جگہ بھی ذکر آچکا ہے، یعنی

نارین للناس حباً لشهوات	آراستہ کی گئی ہیں لوگوں کے لئے خواہشیں عورتوں
من النساء والبنین والقناطر	(زینہ اولاد یعنی) بیٹوں کی اور سونے چاندی کے
المقنطرات من الذہب والفضة	ڈھیر کے ڈھیر اور گھوڑے نشان زدہ خوبصورت
والخیل المسومة والالعام والحراث	اور مویشیاں اور کھیتی۔

چھوٹے ہوں یا بڑے، مشرقی ہوں، یا مغربی، عہد قدیم کے تاریک قرون والے ہوں یا بجلی کے روشن دنوں میں زندگی گزارنے والے، ان تمام چیزوں کی ہلوعیت اور حب شدید ہر ایک کی فطرت میں راسخ ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا آدمی "الخیر" کا والد دیوانہ ہے، اسی الخیر کی چند اساسی افراد کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے بھی یہی تھا اب بھی یہی ہے۔ تبدیلیاں اگر ہوتی چلی آئی ہیں۔ تو ان چیزوں کے قابلوں میں مثلاً پہلے آدمی اگر اچھے اچھے خوبصورت اخیل منہانے والے گھوڑوں کا شیدائی تھا تو اب ان کی جگہ حسین دیدہ زیب موٹروں، سائیکلوں، موٹر سائیکلوں کا دیوانہ ہے۔ نہ ہونے کی اور بات ہے، ورنہ آج بھی قدرت والوں کو دیکھا جاتا ہے کہ موٹروں پر موٹریں خریدتے چلے جاتے ہیں، بلکہ کارخانے والے ہر سال موٹروں کی قطع اور بہت رنگ وغیرہ کو جو بدلتے ہیں ان کا بھروسہ درحقیقت ہوتا تو ہے آدمی کی اسی فطری ہلوعیت ہی پر لیکن عقل شاید یہ مشورہ دے کہ جب موٹر موجود ہی ہے تو دوسری موٹر کے خریدنے کی کیا حاجت ہے۔ اسی عقلی مطالبہ کو رد کرنے کے لئے شکل و صورت کی جدت کو جواب کی شکل میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ہلوعیت کے لئے اتنی بات جو از خریداری کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔ سواری کے سوا اور جن ہلوعی تعلقات کا قرآن میں ذکر ہے۔ ان میں تو شاید قالب کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ لوگوں کو پرانے بادشاہوں کے ان واقعات پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک ایک آدمی ان میں چار چار سو پانچ پانچ سو عورتیں رکھتا تھا۔ لیکن جب سے جدید تمدن نے جمہوری حکومتوں کے ہر باشندے کو مشرقی بادشاہوں درجہ عطا کر دیا ہے۔ اس وقت سے مغرب کے ان جدید بادشاہوں نے نسائی ہلوعیت کا جو مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے سامنے تو ان پرانے شخصی بادشاہوں کے کارنامے بھی گرد ہو کر رہ گئے ۱۲

اور یہ تھی اسلام کے معاشی نظام کی میرے خیال میں پہلی بنیاد۔ لیکن یہ تو معاشی پیداواروں سے استفادہ کرنے والے یعنی نوع انسانی کی فطری خصوصیات کے متعلق قرآن کے وہ اشارے تھے، جن سے آدمی کی اس جدوجہد کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ جسے حصولِ رزق اور کسبِ معیشت کی راہوں میں وہ اختیار کرتا ہے۔

معاشی ذخیرے | مگر اب سوال استفادہ کرنے والے سے نہیں، بلکہ جن پیداواروں سے اپنی اس جدوجہد کی نوعیت، میں فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ہم یہ پتہ چلانا چاہتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے ان پیداواروں کی واقعی نوعیت کیا ہے۔ قرآن میں اس کے متعلق جو علم عطا کیا گیا ہے۔ اسی کو اب پیش کروں گا۔ اور یہی وہ دوسری بنیاد ہے جس پر اسلام کا معاشی نظام میرے خیال میں مبنی ہے۔

کچھ دیر پہلے قرآن ہی کے حوالے سے بھی یہ بات گذر چکی ہے، اور یہی مشاہدہ بھی ہے کہ قدرتِ پیداواروں پر قبضہ کر کے بعض لوگ تو ہم میں رزقی حیثیت سے بسطی حالت میں ہیں۔ اور بعض قدری زندگی میں مبتلا ہیں۔ لیکن بسط و قدر کی یہ حالت تو افراد کے حساب سے ہے۔ مگر اسی سوال کو اگر اس طریقہ سے اٹھایا جائے یعنی پوچھا جائے کہ ان قدرتی پیداواروں کی نوعیت افراد انسانی کی مجموعی حیثیت کی نسبت سے کیا ہے؟ تو قرآن کی مشہور آیت

لَوْ سِيطَرْنَا اللَّهُ الرِّزْقَ لَعَبَادَهُ

اگر کھول دے اللہ روزی کر اپنے بندوں

لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ -

کے لئے تو بغاوت اختیار لیں گے زمین پر۔

کا جو فحوی ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان پیداواروں کو جس پیمانہ پر قدرت پیدا کر رہی ہے، قرآن کا بیان ہے کہ یہ ایسا پیمانہ ہے جس سے بہ حیثیت مجموعی العباد (یعنی خدا کے بندے) بسط کی حالت میں نہیں آسکتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں ہر ایک شخص اگر یہ چاہے کہ موجود زندگی میں ایسی آمدنی پر اسے اقتدار حاصل ہو کہ خرچ کے بعد ہم میں سے ہر ایک کے پاس کچھ پس ماندہ بھی رہ جائے تو مذکورہ بالا آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم حیات کے جس دور سے آدمی اس وقت گذر رہا ہے اس میں تو اس کا امکان نہیں ہے، معاشی پیداواروں کو جو پیدا کر رہا ہے۔ قصداً و ارادۃً اس نے یہی چاہا کہ اس قسم کا بے نہ پیدا ہو، ایسا کیوں چاہا گیا، گو اس کا جواب اسی آیت میں مذکور ہے، لیکن اس وقت میری بحث کے دائرے سے یہ مسئلہ خارج ہے کہ اس وقت تو صرف مجموعی حیثیت سے معاشی پیداواروں کے متعلق اس پیمانہ کو صرف دریافت کرنا ہے، جس پیمانہ پر یہ چیزیں اس دنیا میں پیدا ہو رہی ہیں۔ مذکورہ بالا آیت سے اس پیمانے کی یہ تو سبلی صفت معلوم ہوئی۔ یعنی مجموعی طور پر بسط کی حالت ان سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی کے بعد یہ الفاظ ہیں

وَلَكِنْ نُنَزِّلْهُ بِقَدَرٍ مَا يَشَاءُ

لیکن نازل کرتے ہیں ہم (اس رزق کو)

اس پیمانے پر جس پر چاہتے ہیں۔

گویا سبلی صفت کے بعد پیدائش کے اسی پیمانہ کی یہ ایک ایجابی و اثباتی صفت کی طرف اشارہ ہے، یعنی قدرت کے نزدیک کوئی خاص پیمانہ مقرر ہے، اسی مقررہ پیمانہ کے مطابق پیدائش کا یہ سلسلہ جاری ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ الرزق یعنی معاشی پیداواروں کے متعلق بظاہر کبھی جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوب پیدا ہوئیں، اور کسی

سال محسوس ہوتا ہے کہ پیدائش میں کمی ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی پیدائش کا کوئی قانون نہیں ہے گویا اللہ ٹپ جزا فی طور پر کام چل رہا ہے۔ یہ نتیجہ قطعاً غلط ہے۔ بلکہ پیدا کرنے والے کے سامنے کوئی خاص پیمانہ ہے، اور تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے وہ اسی مقررہ پیمانے پر ان کو پیدا کرتے ہوئے چلا آ رہا ہے۔ باقی یہ سوال کہ قدرت کے اس مقررہ چاہے ہوئے پیمانے کی نوعیت کیا ہے؟ اس منفی صفت کے سوا یعنی مجموعی حیثیت سے بسط کی حالت کی توقع اس سے نہیں کی جاسکتی سورۃ الحج میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد یعنی

وَأَن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ

وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ۔

ہیں ہم ان کو لیکن ایک مقررہ معلوم پیمانے پر۔

جس میں گویا اسی مضمون کا اعادہ فرمایا گیا ہے، جو

لَكِن نُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ

مگر ہم نازل کرتے رہتے ہیں اس کو اس

پیمانے پر جس پر ہم چاہتے ہیں۔

کا مفاد ہے۔ یعنی وہی بات کہ پیدائش کا پیمانہ جانا بوجھا، مقرر کیا ہوا ہے بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے اس کے بعد یہ جو الفاظ ہیں

وَجَعَلْنَا لَكُم فِيهَا مَعَالِشَ

اور زمین میں ہم نے تمہارے جیسے کاساں

وَمِن لَّسْتُمْ لَهُ بَرِزْقِينَ۔

کر دیا ہے۔ اور ان چیزوں کے جیسے کاسی

جس کے روزی پہنچانے والے تم نہیں ہو۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس میں اسی ”مقررہ“ اور ”معلومہ پیمانے“ کی ایک مزید ایجابی صفت

کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ”معاش“ کا جو لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ان ہی

ذرائع اور وسائل کی تعبیر ہے، جن کے بل بوتے پر موجودہ زندگی گذر رہی ہے۔ گویا ”معاش“ ”الرزق“ ہی کی

دوسری قرآنی تعبیر ہے، حاصل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نہ صرف ہمارے ہی لئے یعنی بنی نوع انسانی ہی کے لئے بلکہ

ان کے لئے بھی جن کی روزی کا متکفل انسان نہیں ہے، سب ہی کے لئے، ایسے پیمانہ پر یہاں چیزیں پیدا ہو رہی

ہیں، جن سے آدمی کی بھی زندگی گذر رہی ہے، اور جو آدمی کے زیر پرورش نہیں ہیں، ان کی بھی۔ اور یہی معاشی

پیداواروں کے معلومہ و مقررہ پیمانے کی میرے نزدیک دوسری ایجابی صفت ہے جس کا سرخ قرآن سے ملتا ہے

اب خلاصہ یہ ٹھیکہ کہ جن معاشی پیداواروں سے آدمی استفادہ کر رہا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا

ہے کہ مجموعی حیثیت سے ان میں بسط کی کیفیت کو قصداً و عمدہ قدرت چاہتی ہے کہ نہ پیدا ہو، لیکن باایں ہمہ

ایک ایسے مقررہ و معلومہ پیمانہ پر ان کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہے کہ آدمی اور جو آدمی کے زیر پرورش نہیں ہیں

ہر ایک کے لئے ”معاش“ (یعنی وہ وسائل جن پر زندگی موقوف ہے) مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ یہی اس پیمانے کی

ایجابی صفت ہے، ایسی صفت کہ خشکی و تری، بجز و بر، جہاں کہیں بھی جو جی رہا ہے۔ اس کے لئے اسی کے مطابق

روزی یا معاش مہیا ہو رہے ہیں، بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے، جب تک ”معاش“ اور ”رزق“ کے یہ

ذرائع اس کے لئے فراہم ہوتے رہتے ہیں۔

بہر حال جن معاشی ذخیروں اور پیداواروں پر اس خاک دان ارضی کی زندگی گزر رہی ہے۔ قرآن سے ان کے سببی و ایجابی صفات جو معلوم ہوتے ہیں، وہ تو یہی ہیں، باقی عہدِ حاضر کی عذبا فیوں، عقل لایوں کے بھروسہ پر جو نتائج پیدا کئے جا رہے ہیں۔ شہروں شہروں، دیہاتوں دیہاتوں کے ایک ایک مرد، ایک ایک عورت ایک ایک بچہ کی خوراک ان کے لباس، ان کی دیگر ضروریات حیات کے سختے بنا بنا کر روئے زمین کے کھیتوں، کارخانوں، فیکٹریوں کی پیداواروں سے مقابلہ کر کے کبھی رجائی اور کبھی قنوطی خیالات کو اپنے اوپر لوگ جو مسلط کر رہے ہیں، پھر کبھی ہنستے ہیں، اور کبھی روتے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اپنے ان استخراجی نتائج پر اتنا بھروسہ لوگوں کو کیسے پیدا ہو جاتا ہے کہ ان ہی نتائج سے متاثر ہو کر مصنوعی طور پر نہیں، بلکہ واقع میں یہ رو بھی دیتے ہیں، اور ہنس بھی سکتے ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ وثوق و اعتماد میں نتائج ہمیشہ ان مقدمات کے تابع ہوتے ہیں، جن کو مرتب کر کے نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ دقیقہ سنجیوں کی انتہائی کوششوں سے کامل احتیاط کو کام میں لاتے ہوئے بھی آدمی جن مقدمات سے اس مہم میں نتیجے حاصل کر رہا ہے یا کر سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ وہ اسی عالم محسوس یا عالم شہادت ہی کے معلومات ہو سکتے ہیں۔ لیکن قرآن میں ”الغیب“ کی پانچ کنجیوں (مفاتیح) کا ذکر ان الفاظ میں جو کیا گیا ہے

اور خدا ہی کے سامنے ہیں، الساعت (آخری	وعندہ علم الساعة وينزل الغيث	غیب کی پانچ کنجیاں
گھڑی) کا علم، اور وہی برساتا ہے بارش کو،	ويعلم ما فی الارحام وما تدری	
اور جانتا ہے جو کچھ ہوتا ہے ارحام ماؤں	نفس ما ذاکسب غذا وما تدری	
کی بچہ دانیوں میں) اور نہیں جانتا ہے کوئی کہ	نفس بائی ارضی تموت۔	

کل وہ کیا کرے گا۔ اور نہیں جانتا ہے کوئی کہ کس سرزمین میں مرے گا۔

ان پانچ کنجیوں میں سے اوروں کو جانے دیجئے۔ صرف ایک بات جس کا ہمارے ”معاش“ یا ”الرزق“ سے بہت زیادہ قریب کا تعلق ہے۔ یعنی ”الغیث“ (بارش) جو ہر سال تقریباً دنیا کے عام حصوں میں برستی رہتی ہے اور مہینوں برستی ہے۔ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے اس کے برسنے کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن گزرنے والے سال کے بعد آنے والے سال کے متعلق یہ بات کہ کب کب، کہاں کہاں، کتنی کتنی مقدار میں برے گی؟ کیا غریب انسان ان سوالوں کا کوئی قطعی جواب اپنے پاس رکھتا ہے۔ حالانکہ ہمارے ”رزقی نظام“ کا زیادہ تر دار و مدار اسی ”بارش“ کے مسئلہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اسی کے علم سے آدمی جب جاہل ہے تو جہل سے جو علمی نتائج پیدا کئے گئے ہیں کیا واقعی وہ علمی نتائج کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں، خیر ہمیں دوسروں سے کیا بحث، کیا کروں لاکھ چاہتا ہوں کہ صرف اپنی کہوں، قرآن میں جو کچھ ہے، پیغمبر اسلام کے اقوال میں جو کچھ پایا جاتا ہے۔ اسی کو

پیش کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلوں۔ لیکن درمیان میں بعض باتوں کا خیال آہی جاتا ہے، اسی لئے آجاتا ہے کہ قرآن ہی میں ان خیالات کے متعلق کچھ اشارے ملتے ہیں، جی نہیں مانتا کہ اسے یوں ہی چھوڑ دوں۔

ضمانتِ رزق کا مطلب، قرآن سے ان کی سبلی صفت تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ مجموعی حیثیت سے بسط کی کیفیت ان سے پیدا نہیں ہو سکتی، پیدا کرنے والے کی یہی مشیت اور یہی اس کا طے شدہ ارادہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی یہ بھی یقین دلاتا ہے کہ باوجود اس طے شدہ ارادے کے یہ بھی قطعی ہے کہ اتنا بہر حال پیدا ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ جس سے آدمی اور آدمی کے سوا دوسرے زندگی گزارنے والوں کو معاش فراہم ہوتے رہیں گے اس وقت تک فراہم ہوتے رہیں گے۔ جب تک قدرت انہیں زندہ رکھنا چاہتی ہے یہی مطلب ہے ضمانتِ رزق کی ان مشہور آیتوں کا، یعنی

وما من دابة الا على الله
سرزقها يعلم مستقرها و
مستودعها۔
جائے گا اس کو بھی۔

اور نہیں ہے کوئی چلنے والا (زمین پر) مگر اس
کی روزی کی ذمہ داری خدا پر ہے۔ جانتا ہے
اس کی قیام گاہ کو بھی اور جہاں سوینا

یا دوسری جگہ ارشاد ہے

وكان من دابة لا تحمل رزقها
الله يرزقكم وایاكم وهو
السمیع العلیم۔

اور کتنے چلنے والے ہیں کہ نہیں لادے پھرتے
ہیں اپنی روزی کو، اللہ ہی روزی پہنچاتا ہے
ان کو بھی اور تم کو بھی۔ وہی شنوا ہی دانا ہے

آل اولاد کے بارے میں آپ کو ہلکا رکھنے کے لئے جاہلیت میں "عزل" (یعنی ضبط تولید) بلکہ قتل اولاد بھی ایک بڑا معاشی حل باور کیا جاتا تھا۔ قرآن نے قتل اولاد کے اس سفاکانہ فعل سے روکتے ہوئے اسی کا اعلان کیا تھا یعنی

ولا تقتلوا اولادکم خشية اطلاق
نخن نوزقکم وایاھم۔

اور نہ مارا کرو اپنی اولاد کو محتاجی کے ڈر سے، تم ہی
تمہیں روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

بہ کثرت حدیثوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قرآنی حقیقت کا اظہار مختلف الفاظ میں فرمایا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا کافی ذخیرہ موجود ہے، حاصل سب کا وہی ہے کہ خزائن اللہ یا چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ قدرتی موازنہ (بجٹ) میں اتنی گنجائش قطعاً رکھی جاتی ہے جس کی بدولت جینے کی مقررہ مدت ہر جینے والے کی پوری ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ خدا کے انکار سے جن کے دماغ ماؤف ہیں، ان عقلی سودائیوں سے تو بحث نہیں، لیکن واقع میں عالم کے اس جیتے جاگتے نظام کو لامحدود قدرت والی قوت جو چلا رہی ہے سوچنے والے اس کے متعلق اس کے سوا اور سوچ ہی کیا سکتے ہیں۔ باوجود عدم گنجائش کے نوکروں تک کا تقرر ظاہر ہے کہ دیوانوں کے سوا جب معمولی ہوش و حواس رکھنے والا آدمی بھی نہیں کر سکتا تو اسی فعل کے انستاب کی

جرات الیہا ذی اللہ، خدا کے حقیقی و قیوم، دانا و بینا، توانا کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔

بہر حال، اپنی موجودہ زندگی میں آدمی جن معاشی پیداواروں سے مستفید ہو رہا ہے، ان پیداواروں کی پیدائش کا صحیح اور قدرتی پیمانہ کیا ہے، ایک تو یہ بات، اور خود استفادہ کرنے والے، یعنی بنی آدم کے وہ فطری خصوصیات جن سے ان کی معاشی جدوجہد، یا حصولِ رزق، کسبِ معیشت کی کوششیں متاثر ہو رہی ہیں۔ میرے نزدیک "انسانی معاشیات" کی یہی وہ دو اساسی بنیادیں ہیں، جن کا قرآن میں سراغ ملتا ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ آدمی اپنی معاشی زندگی میں جن حالات سے زمین کے اس کرہ پر دوچار ہے، اگر غور کیا جائے تو تحلیل و تجزیہ کے بعد ہر سوچنے والے کو نظر آئے گا کہ ان ہی دو بنیادی حقائق کے یہ قدرتی نتائج ہیں، بات اگرچہ طویل ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اختصار سے اگر کام لیتا ہوں جو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں، اندیشہ ہے کہ اکثر لوگ کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی میرا مطلب یہ ہے کہ استفادہ کرنے والے یعنی انسان اور جس سے استفادہ حاصل کیا جا رہا ہے، یعنی کائنات کی قدرتی پیداواریں، ان کے جن خصوصیات و صفات کو قرآن سے انتخاب کر کے آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ان سے قطع نظر کر لیا جائے اس کے بعد سوچا جائے کہ صورتِ حال کیا دہی رہتی جو اس وقت ہے۔ یہ آسانی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حصولِ رزق یا فراہمیِ معاش کے وہی ذرائع اگر آدمی کو بھی میسر جاتے جو اس کے سوا زندگی گزارنے والی دوسری ہستیوں کو زمین کے اسی کرہ پر قدرتی طور پر حاصل ہیں، یعنی وہی بسات و ذرائع جن کے بل بوتے پر ان میں سے تقریباً ہر ایک ایک قسم کی خود اکتفا کی زندگی سے بہرہ یاب ہے۔ اگر آدمی میں بھی یہی باتیں پائی جاتیں، تو یہ بے چارہ ایک ایک ضرورت کے لئے اپنے اپنے جنس کے بے شمار افراد کی رعایتوں کا جو آج دستِ نگر ہے، کیا یہ حال اس کا اس وقت بھی باقی رہ سکتا تھا؟ یا ان ذرائع سے محروم ہونے کے باوجود بھی اگر یہی ہوتا کہ جیسے سب اپنی اپنی ضرورتوں کی ایک خاص مقدار کے حاصل ہو جانے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں۔ سیری کی اسی کیفیت سے انسان کی فطرت بھی سرفراز ہوتی، لیکن ایک طرف تو بے سرو سامانی و بے نوائی کے ان حالات میں وہ پیدا کیا جاتا ہے، جن کی طرف میرے خیال میں قرآن نے مطلق ضعف اور ضعفِ سابق و لاحق کے ذریعہ سے اشارہ کیا ہے، اور دوسری طرف ماں کے پیٹ سے ہر وہ شخص جو آدمی بن کر اس دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ الخیر کے حبِ شدید اور ہلو عیت کے اس اندھے کوئیں کو اپنے ساتھ لاتا ہے جسے جتنا زیادہ بھرا جاتا ہے، اسی قدر وہ اور خالی ہو جاتا ہے۔

پھر یہی عارضہ جب آدمی کی فطرت کو لگا ہی دیا گیا تھا۔ توصلِ من مزید کے اس جہنی مطالبہ کی تکمیل ہی کا کوئی سامان یہاں کیا جاتا۔ لیکن قرآن نے یہ اعلان کر کے کہ جس پیمانہ پر قدرت یہاں "معاش" کے ذخیروں کو پیدا کر رہی ہے۔ قصدِ ارادۃً ان کو ایسے حال میں رکھا گیا ہے اور ہمیشہ رکھا جائے گا جس پر فراخی اور بسط کا نتیجہ مجموعی حیثیت سے کبھی مرتب نہیں ہو سکتا جس کے یہی معنی ہیں کہ موجودہ زندگی کے متعلق یہ امکان بھی ختم ہو گیا کہ آج نہیں تو شاید کل کسی زمانے میں سہی پیاس سے کو اپنی پیاس کے مطابق یہاں پانی میسر آ جائے گا حالانکہ بالفرض "کل" اگر اس کا کوئی "حل" ہماری آئندہ نسلوں کے سامنے آ بھی جائے تو اس سے ہم آج کے گذرنے والوں کی مشکلات پر کیا اثر پڑتا ہے؟

اور خیر سب کچھ اگر ہوا تھا، تو کم از کم اس کے ساتھ ہی کر دیا جاتا کہ جیسے آدمی کے سوا تمام دوسرے حیوانی انواع و اقسام کے افراد میں مدارج و مراتب کا فرق نہیں پیدا کیا گیا ہے، نوع انسانی کے افراد بھی ایک ہی حال پر پیدا کئے جاتے، لیکن رجحانات و میلانات یا قدرتی صلاحیتوں و مناسبتوں کے شدید اختلاف کی بدولت کمالات و صفات کے اعتبار سے انسانی افراد میں جو تفاوت پیدا ہو گیا ہے، اور کمالات و صفاتی تفاوت کا یہی اٹل قدرتی قانون مدارج و مراتب کے نشیب و فراز کے تماشے کو بسا اوقات ایک ہی ماں باپ کے دو بچوں میں ہر ملک، ہر شہر، ہر گاؤں بلکہ ہر گھر خاندان میں جو پیش کرتا رہتا ہے، ظاہر ہے کہ معاشی پیچیدگیوں کے درد و کرب کے سمندر کے لئے مستقل تازیانہ کی شکل تماشے کی یہ نوعیت بھی اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہی آدمی ہے، سینکڑوں کمالات و صفات ایسے ہیں، جن سے یہ محروم ہے، مثلاً اڑنے ہی کے ایک کمال کو لیجئے، مجتھر اور مکھیاں بھی اس کمال سے سرفراز ہیں، لیکن چونکہ یہ دوسری نسلوں یا انواع کے افراد کا کمال ہے، اس کمال سے محرومی کا گلہ کسی آدمی میں نہیں پایا جاتا۔ لیکن منسبت تو یہی ہے کہ باوجود انسان ہونے کے اپنے ایک بھائی کو آدمی جب بلندیوں پر پاتا ہے۔ تو قدرتی طور پر اپنی پستیوں کا احساس کا نشانہ بن کر اس کے دل میں چبھنے لگتا ہے، بلکہ عموماً جس سے جتنا زیادہ قریبی تعلق ہوتا ہے اسی کی بلندی، پستی میں رہنے والوں کے لئے زیادہ تکلیف دہ بنی ہوئی ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ انسان اور انسانی افراد کو جس نے پیدا کیا ہے، ان ہی حالات میں پیدا کیا ہے۔ اور بہر حال آدمی ان ہی حالات میں پیدا ہو چکا ہے۔ پس اب سوال یہ ہے کہ مشکلات کے ان شکنجوں سے جو خود نکلتا چاہتے ہیں۔ یا دوسروں کو نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے صحیح راہ عمل کیا ہو سکتی ہے؟ کیا قدرت کے ان قوانین سے جنگ کا اعلان کر دیا جائے؟ کہتے تو سب یہی ہیں کہ قدرتی قوانین سے جنگ کا انجام شکست و ہزیمت کے سوا نہ پہلے کچھ نکلا ہے، زائندہ نکل سکتا ہے، زندگی کا ہر تجربہ اسی کی تعلیم دیتا ہے، قدم قدم پر اسی کی شہادت اُسے دن آدمی کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہے۔ لیکن زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے تو مرد مجھے بحث نہیں، پر معاشی مشکلات سے نجات کی راہوں میں یہ عجیب بات ہے کہ کہنے کی حد تک تو کہنے والے جو کچھ بھی کہتے ہوں، لیکن کہنے والوں نے جب کبھی کچھ کرنا چاہا ہے تو عموماً کچھ ایسی صورتیں اسفول نے اختیار کی ہیں جن کے متعلق چاہا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ قدرت کے ان قوانین سے وہ جنگ کرنا چاہتے ہیں تفصیل کا موقع تو نہیں ہے، اور جیسا کہ مسلسل کہتا چلا آ رہا ہوں دوسروں کے عمل سے اپنے اس مضمون میں مجھے بحث بھی نہیں۔

بعض مذاہب کے | لیکن مثلاً چند چیزوں کے ذکر سے رکنا بھی نہیں جاتا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذہب معاشی نظریے | یا فلسفہ کے نام سے مختلف قرون و ادوار میں بعضوں کی طرف سے جو اس قسم کی مہمیں جاری ہوئیں جن کا حاصل یہ تھا کہ آرزوؤں اور تمناؤں سے اپنے قلوب کو خالی کر لینا انسانیت کی سب سے بڑی سعادت ہے مہمان بدھ کی جانب منسوب کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت کو مدعاؤں سے خالی کر لینا، یہی زوانا کا سب سے بڑا مقدس نصب العین ہے۔ یا یونان کے کلبی اسکول کے فلاسفہ

آپجہ مادر کارداریم اکثرش در کار نیست

کا پرچار علمی و عملی مثالوں سے جو کرتے پھرتے تھے، اس عہد کے سب سے بڑے بادشاہ کے آگے، اسی مکتب خیال کے امام الائمہ دیوجانس نے "نانگ کیا مانگتا ہے" کے شاہی فرمان کے جواب میں "دھوپ چھوڑ دیجئے" اس کے سوا ہمارا آپ سے کوئی مطالبہ نہیں ہے۔" اسی کے متعلق اسی قسم کے اور لطائف جو تاریخوں میں ملتے ہیں، یا ان ہی کی دوسری تعبیروں کا نام رہبانیت یا جوگیت وغیرہ مختلف زبانوں میں جو رکھا گیا، تو ان ساری باتوں کی تہ میں کیا تھا؟ یقیناً بلوغیت کے اسی اندھے کوئٹس کے مطالبوں سے پریشان ہو کر سوچنے والوں نے یہ تدبیریں سوچی تھیں کہ جو کنواں بھر نہیں سکتا، پھر اس کے منہ ہی کو کیوں نہ بند کر دیا جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے لامدعاہیت کا یہ سارا فلسفہ گویا ایک ڈاٹ تھی۔ جسے انسانی فطرت کے اس دہانے پر چاہا گیا تھا کہ کسی ترکیب سے کس دیا جائے۔ جو ظاہر ہے کہ قدرت ہی سے مقابلہ کی ایک شکل تھی، جبراً قہراً غیر فطری دباؤ سے کام لے کر اس ڈاٹ کے دبانے میں ممکن ہے کچھ لوگ کچھ دن کے لئے یہ ظاہر کامیاب ہوئے ہوں۔ لیکن واقعات شاہد ہیں کہ معمولی سی غفلت کے بعد ہی جیسے بوتل سے کاگ اڑ جاتی ہے۔ ہمیشہ یہ ڈاٹ بھی انسان کی فطرت سے نکل کر دور جا پڑی اور وہ کو جانے دیجئے، کلیسا کے زیر اثر خود یورپ کے باشندوں کو بھی تو چاہا گیا تھا کہ رہبانیت ہی کے دباؤ کے نیچے رکھا جائے۔ لیکن اسی ملک میں رد عمل کا جب دور شروع ہوا تو لاپچی انسان حرص و آرز کے جن شرناک حالات کے ساتھ اس ملک میں نمایاں ہوا۔ اس "دیدہ" کے لئے تو "شہیدہ" کی بھی ضرورت نہیں۔ کلیسا کے باغیوں نے کلیسا پر الزام لگایا اور یقیناً یہ الزام بیجا نہ تھا کہ اس نے آدمی کو آدمی نہیں، پتھر فرض کر لیا تھا کہ آرزو اور تمناؤں سے دست برداری کی توقع پتھروں ہی سے کی جاسکتی ہے، ان ہی کے سینے ارمائوں اور خواہشوں سے خالی ہو سکتے ہیں۔

معاشیات انسانی کے | لیکن معاشی مشکلات سے نجات کی پھر راہ کیا ہے؟ شاید اسی کا جواب ہے جو رہبانیت بعض عقلی نظریے | رجحانات کے مقابلہ میں جیسا کہ سنا جاتا ہے کہ راجر سن بکین یا حکیم ڈیکارٹ وغیرہ وغیرہ جیسے فلاسفہ نے نظریہ قوت و افادہ کا علم بند کیا، قوت والوں کو اپنی اپنی قوتوں میں بے روک ٹوک اضافہ پر اضافہ کرتے چلا جانا چاہیے۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، انسانیت کے قدرتی ضعف کے مقابلہ ہی میں کوشش کی یہ تدبیر تجویز کی گئی تھی، اسی طرح معاشی پیداواروں کے افادی پہلوؤں پر افادے کے غیر مختتم اضافہ کا مطالبہ شاید ان پیداواروں کی اس محدودیت کا توڑ تھا۔ مجموعی حیثیت سے بسط و فراخی کے نتائج جن پر مرتب نہیں ہو رہے ہیں۔ گویا "معاش" کے جس نظام کو قدرت غیر مبسوط حال میں قصداً و ارادہ رکھنا چاہتی ہے۔ چاہا گیا کہ ان کو اس ترکیب سے مبسوط بنا کر چھوڑا جائے؟ لیکن انسانی اجتماعیت کے سامنے ان کے بعد سرمایہ داری کا نظام جس مہیب اور گھناؤنی شکل میں نمایاں ہوا، قدرتی قوانین سے اسی جنگ کا نتیجہ اسے ٹھیرایا جائے تو واقعات سے اس کی کیا تائید نہیں ہو رہی ہے۔ نظریہ قوت اور افادہ کے علم برداروں نے کیا کیا؟ سرمایہ کی قوت رکھنے والوں نے انفرادی محنتوں کو توسیع افادہ کے نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے اجتماعی محنتوں کی شکل میں بدل دیا۔ لیکن اس طور پر بدلا کہ اجتماعی محنتوں کے ان منافع کے

۵۱
 واحد چارہ دار سرمایہ داروں کی انفرادی شخصیتیں باقی رہیں، اپنے زور میں زور کا اضافہ کرنے کے لئے کمزوروں کو زور والوں نے نگلنا شروع کیا، اور اس بری طرح نگلنا شروع کیا کہ وہی آدمی جسے کلیسا والوں نے پتھر بنانا چاہا تھا، یا متناؤں سے دست برداری کے سلسلے میں جنہیں تلقین کی گئی تھی کہ کرتا مانگنے والوں کو پابجائے بھی حوالے کر دو، ایک گال کے پتھر کا جو مطالبہ کرے اُس کے آگے دوسرا گال بھی بخوشی پیش کر دو، کراسٹ کی یہی بھیڑیں بھیڑے جنگل کے بھیڑیے بن کر رہ گئے، جہاں آدمی بستا تھا وہیں جنگل کا قانون نافذ ہو گیا، اور جو آدم زاد تھا، طے کر دیا گیا کہ وہ آدم زاد نہیں ہے۔ مگر سچ پر جھوٹ کا لبادہ کب تک پڑا رہتا۔

اشتراکی نظریہ | آخر انسانیت کے فہم عمومی نے جنگل کے اس قانون کا انکار کیا۔ لیکن قدرتی قانون سے جنگ کا جو ارادہ تھا۔ وہ اپنے حال پر باقی رہا۔ اس جنگ میں فتح کی تجویزیں پھر سوچی جانے لگیں۔ پہلوں نے انسان کے قدرتی صنعت، اور معاشی پیداواروں کی محدودیت و عدم مبسوطیت کے قدرتی قانون سے ٹکڑی تھی۔ پچھلوں نے اس نقطہ سے ہٹ کر مدارج و مراتب کے اس اختلاف کو اپنی حربی کارروائیوں کا نشانہ بنایا، جو بنی نوع انسانی کے مختلف افراد کے صفاتی و کمالاتی تفاوت اور ان کی قیمتوں کی باہمی تفاوت کا ناگزیر و لازمی نتیجہ تھا، قدرتی کمالات و صفات کی قیمتوں کے اس تفاوت کا انکار کیا گیا۔ طے کیا گیا کہ جن جوتیوں سے ہر شکل چند مہینے ایک اور صرف ایک ہی شخص نفع اٹھا سکتا ہے۔ ان کے بنانے والوں کی محنت کی اجرت اور ایسی کتابوں کے لکھنے والوں کا معاوضہ جن سے صدیوں نسلوں کی نسلیں نفع اٹھاتی ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ دونوں میں کوئی فرق کیا جائے۔ آج دانقوں کو کھینچ کھینچ کر باقوں کے بنانے والے خواہ کچھ ہی کہیں، لیکن جنگ کرنے والوں نے جب جنگ کا پروگرام بنایا تھا تو یقیناً طے کر لیا تھا کہ

۵۲
 ۱۔ اشتراکی معاشیوں نے سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد اسی واقعہ کو بتلایا ہے۔ فریڈرک نیگلر کا قول ہے۔ پیدائش ایک اجتماعی فعل ہو چکا لیکن مبادلہ اور استعمال بدستور انفرادی ہے (سوشلزم مترجہ باری) ص ۶۲۔ اجتماعی پیدائش کے سارے منافع انفرادی سرمایہ دار لے رہا ہے۔ بنیادی اختلاف یہ ہے۔ ص ۶۳ لیکن ایسا کیوں ہوا۔ پیدائش کو کیرسپانڈ پر اجتماعی محنتوں سے لانے کے لئے سرمایہ دار کی جس کثیر مقدار کی ضرورت تھی، نادار بے سرمایہ فرد اور اس مقدار کو مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی ساک پر سودی قرضہ دینے والے دارے اس کو سرمایہ دے سکتے ہوں۔ انفرادی طور پر انفرادی محنت سے جو چیزیں پہلے وہ بناتا تھا۔ کیرسپانڈ پر پیدا ہونے والی چیزوں کے مقابلہ میں ان کا دام اتنا زیادہ پڑتا تھا کہ بازار میں اس کے انفرادی مصنوعات بک نہیں سکتے تھے۔ ہاتھ سے بن کر کپڑے بنائے ہوئے اسی بجائے اپنے کپڑوں کو نہیں بیچ سکتے تھے جس ارزاں قیمت پر پیمانہ کیر کے بنے ہوئے کپڑے بک رہے تھے، اور بک رہے ہیں، لازماً اس کو سرمایہ دار کا مزدور ہی بن کر روزی حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مزدور مجبور اور سرمایہ دار جو اپنے سرمایہ کی ساک پر سودی قرض کے اداروں سے پیارے سرمایہ حاصل کر کے پیدائش کے پیمانہ کو جتنا چاہے بڑا بنا تا چلا جاسکتا تھا۔ سرمایہ دار مختار، مزدور مجبور، دونوں کی اسی حیثیت نے بالآخر اس نظام کو پیدا کر دیا جس نے ورم دولت کے عارضہ میں کرہ زمین کے ہر معاشرہ کو مبتلا کر دیا۔ حاصل یہی نکلا کہ بالآخر تحلیل اور تجزیہ کے بعد سرمایہ داری کی اس بھیانک مہیب شکل کی انتہا سود خواری کے رواج پر ہوتی ہے۔ اس کو ختم کر دو، معاشرہ اپنی طبعی صحت کی حالت میں معاشی حیثیت سے واپس آجائے گا ۱۲

”دماغی اور جسمانی محنت کی اجرت یکساں ہونی چاہئے“۔ ص ۲۷۔ اصول معاشیات۔

قانون نافذ کیا گیا کہ

”عمال حکومت کی اجرت ایک کاریگر سے زیادہ نہ ہونی چاہئے“۔ ص ۲۸۔ اصول معاشیات۔

قدرت اور قدرت کے قانونوں سے چوٹ کھا کھا کر چوٹ کھانے والے اب کیا کہہ رہے ہیں یا آئندہ کیا کہیں گے! اس وقت مجھے اس سے قطعاً بحث نہیں ہے۔ لیکن اترنے والے اس جنگ کے لئے جب میدان میں اترے تھے، تو اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ یہی کہتے تھے اور یہی کہلواتے تھے کہ ایک جڑی جوتی بنانے والا موجی جو کچھ پائے گا، وہی مزدوری کتاب لکھنے والے مصنف کو بھی دی جائے گی۔ لکڑی کے ایک میز بنانے والا بڑھئی کو جو صند اس کی میز بنانے کی محنت کا ملے گا، لکڑی کی وہی میز جس سے ایک یا بہ مشکل دو آدمی مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہی صلہ حکومت کے اس وزیر اعظم کو بھی دیا جائے گا۔ جس کی ایک ایک سوجھ اور ایک ایک تدبیر سے صدیوں کے لئے حکومت دشمنوں کے دستبرد سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

اشتراکیت اور رہبانیت | حقیقت تو یہ ہے کہ کہنے کی حد تک ہر وہ شخص جو منہ میں زبان رکھتا ہے اور ہاتھ میں قلم رکھتا ہے جو کچھ چاہے کہہ سکتا ہے۔ جو چاہے لکھ سکتا ہے، لیکن اگر فکر معقول سے کام لیا جائے تو سمجھا جاسکتا ہے کہ نموں نے بالآخر قدرتی قوانین سے جنگ کی اس مہم میں وہی کہا ہے اور وہی کیا ہے، جو پیرائوں نے کہا اور کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے اگلوں نے جیسے چاہا تھا کہ اخیر کے حب شدہ کا جو جذبہ آدمی میں پایا جاتا ہے۔ یعنی وہی اھلوعیت یا عدم سیری کا جو اندھا کنواں انسان کی فطرت میں کھدا ہوا ہے۔ کوشش کی گئی تھی کہ جب اندر سے وہ بھر نہیں سکتا، تو باہر سے اس میں لامدعا نیت اور آرزوؤں سے دست برداری کی ڈاٹ ٹھونس دی جائے۔ سچ پوچھئے تو ہر پھر کر پچھلوں کی ساری ہنگامہ آرائیوں کی آخری تان اسی پرانی تجویز ہی پر آکر ٹوٹتی ہے۔ آخر کیا مطلب ہے اس بات کا کہ جیسے بکریاں مینڈھے، چوہے، کوئے، چلیں وغیرہ ضروریات زندگی کی ایک خاص مقدار کے مہیا ہو جانے کے بعد مطمئن ہو جاتی ہیں، اسی طرح جو یہ چاہا جاتا ہے کہ نسل انسانی کے ہر فرد کو بھی وہی دیا جائے جو دوسروں کو دیا جاتا ہے، ان میں بھی ہر ایک کو ضروریات حیات کی اسی مقدار سے مطمئن ہونے پر بذور شمشیر جو مجبور کیا جا رہا ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جو کچھ جسے دیا جائے، اسی مقدار پر صبر کر کے وہ اپنی ان آرزوؤں سے دست بردار ہو جائے جن کا طوفان ہر اس شخص میں ابلتا اور قطعاً ابلتا رہتا ہے جو انسان بن کر اس دنیا میں قدم رکھتا ہے، کیا انسانی فطرت کے ساتھ وہی بالجبر تشدد جسے اگلوں نے روا رکھا تھا، دوسرے الفاظ میں اسی تشدد کو کچھ بھی نہیں دہرا رہے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگلوں کا بالجبر تشدد صرف زبان اور قلم ہی کے تشدد تک محدود تھا لیکن پچھلوں نے تو چھاتیوں پر چڑھ چڑھ کر تلواروں کی دھار سے اپنے اسی غیر فطری فعل میں کامیاب ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ صحیح سمجھا جائے یا غلط، لیکن دنیا میں آرزوؤں سے دست برداری کی دعوت دیتے ہوئے کسی نہ کسی شکل میں آئندہ زندگی ہی میں سہی، اگلوں نے ان ہی آرزوؤں کی تکمیل کا وعدہ بھی کیا تھا، مگر دست برداری کی اس پچھلی کوشش میں تو کوشش کر نیوالوں نے اس وعدہ کی مسرت کو بھی خواہ وہ خیالی ہی مسرت کیوں نہ ہو، اس سے بھی محروم کر دیا۔

اور میری سمجھ میں تو اب تک یہ بھی نہیں آیا ہے کہ قدرتی قوانین کی جس جنگ نے بالآخر سرمایہ داری کی جہنم میں نسل انسانی کو ڈھکیل دیا تھا۔ اس میں اور یہ جنگ جو اب صفاتی و کمالاتی تفاوت سے پیدا ہونے والے مراتب و مدارج کے اختلاف سے جوڑی جا رہی ہے، ان دونوں میں نتیجہ کے اعتبار سے فرق کیا ہے؟ سرمایہ داروں کا تو صرف یہی ظلم تھا کہ سب کو نہیں بلکہ اولاد آدم کے صرف ایک حصہ کو غربت کی زندگی گزارنے پر اسخوں نے مجبور کر دیا تھا۔ لیکن جنھوں نے یہ دیکھ کر کہ سب چونکہ امیر نہیں بن سکتے اس لئے سب کو غریب بن جانا چاہیے۔ اس اصول کو طے کر کے اسخوں نے تو بجائے بعض کے بزور شمشیر سب ہی کو غریب بنانے کا تہیہ کر لیا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظام میں غریب بن کر جینے کا موقعہ آدم کے جن بچوں کو حاصل تھا، سرمایہ دشمنی کے اس نظام میں تو ان بد نصیبوں کو جینے کے اس حق سے بھی محروم کر دینے کی آج دھکیاں جا رہی ہیں، یا ہو سکتا ہے کہ کہیں محروم کرنے کا یہ منحوس کاروبار شروع بھی ہو گیا ہو، اور میدان جنگ کا جو نقشہ بنایا گیا ہے۔ اس کا تو یہ لازمی نتیجہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بنانے والے نے برابر برابر کر کے جن انگلیوں کو نہیں بنایا تھا، ان ہی غیر یکساں انگشت کو یکساں بنانے کی جبری کوشش جب ان لوگوں کی طرف سے ہو گی جو ان کے بنانے والے نہیں ہیں تو اس کا قدرتی انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ توڑ مروڑ کھینچ کھا بچ کر یکساں پیدا کرنے میں جس وقت کامیابی ہو گی، ٹھیک اسی وقت یہ دیکھا جائے گا کہ برابر برابر ہونے کی حد تک تو انگلیاں برابر ہو گئیں لیکن برابر ہونے کے بعد یہ وہ انگلیاں باقی نہ رہیں، یعنی وہی انگلیاں جن کے چھوٹے بڑے ہونے ہی پر ہاتھ کا سارا کام مبنی تھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں، قدرتی قوانین سے جنگ کی ان تمام کوششوں میں کیسی عجیب بات ہے کہ

۱۔ مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی احتیاج کے مطابق ہی دینا چاہیے۔ اور ہر شخص سے بقدر استطاعت کام لینا چاہیے (اصول معاشیات ٹاسک ص ۱۳۲) یعنی خدمت اور کام کی نوعیت پر نہیں۔ بلکہ معاوضہ یا اجرت کی بنیاد جب ہر شخص کے ذاتی احتیاج پر رکھی جائے گی۔ اور جس سے جو کام ممکن ہو، بقدر استطاعت وہی کام اس سے لینا چاہیے، گویا گھوڑوں سے گھوڑوں کا کام، بیلوں سے بیلوں کا کام لیا جائے۔ اور ہر ایک کو ان کی ضرورت کے مطابق وقت پر دانہ چارہ کے تقسیم کر دینے کا نظم کر دیا جائے قائم کرنے والوں نے اس اصول کو جب قائم کیا تو معاشرہ کے ان افراد کا سوال حیلان کے سامنے پیش ہوا کہ جو بے کئے دھرے کھانا چاہتے ہیں یا کسی زمانے میں ایسوں کی کمی نہیں رہی ہے۔ سرمایہ داری کے نظام میں تو ان کو غربت کی قدرتی سزا بھگتنی پڑتی تھی لیکن سرمایہ دشمنی کے عہد میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے جب یہ پوچھا گیا تو اسی اصول معاشیات میں اس کا حل یہ لکھا ہے کہ لالہ بالی، اپاہج کاہل الوجود افراد کے متعلق پہلے تو اصلاح کی کوشش کی جائے گی، کام کو ممکنہ حد تک خوشگوار لذیذ بنا کر انھیں پر دیا جائے گا۔ اگر اس کا اثر بھی ان پر مرتب نہ ہو تو لکھا ہے کہ ان کو نظر بند کیا جاسکتا ہے۔ نسل بڑھانے سے ان کو روکا جاسکتا ہے۔ لیکن ان تدبیروں کے بعد بھی اگر وہ ناقابل اصلاح ثابت ہوں تو انھیں چپکے سے بلا تکلیف ختم کر دیا جاسکتا ہے (اصول معاشیات ص ۶۹۲ ج ۲) از ڈاکٹر ڈیوٹا سگ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر ہاروڈ یونیورسٹی (مترجمہ دارالترجمہ سرکار عالی) ۱۲

جس کے لئے یہ سارے پاؤں پیلے جا رہے ہیں، یعنی انسانی نسل، وہ انسان باقی نہیں رہتی، معاشی مشکلات کے حل کی ان ساری تدبیروں میں یہی جوہری نقص ہے جو ہر حال میں جنگ کے ہر نقشہ کی صورت میں باقی رہتا ہے، اور یوں ہی باقی رہے گا۔ جو پھندا بھی کھولا جائے گا۔ انسانیت کے حلقوم کے لئے وہی دوسرے نئے پھندوں کی شکل اختیار کرنا چلا جائے گا۔ سلجھانے والے مسلسل یوں ہی نت نئی گتھیوں میں الجھتے چلے جائیں گے، جو پیدا کیا گیا ہے، وہ اپنے پیدا کرنے والے سے الجھ کر قسم ہے اسی پیدا کرنے والے کی کہ قطعاً سلجھ نہیں سکتا۔ صدیوں کی تاریخ اسی کی شہادت پیش کر رہی ہے، اور اس جنگ کو بدلنے والے جب تک صلح سے بدلیں گے شہادتوں اور تجربوں کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔

۱۔ علمو ۲۔ نکر غیر معجزی ۳۔ اللہ اور جان لو کہ تم خدا کو ہر انہیں سکتے۔ ناشکروں کو اللہ ۲۔ معجزی الحاضریں۔ اللہ قطعاً رسوا کرنے والا ہے۔

صلح کا مطلب | میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دیکھنے والوں اور تجربہ کرنے والوں نے لڑکر جنگ کی تمام شکلوں اور تمام نقشوں اور ان کے مہیب نتائج، لائیکل عواقب کو جب دیکھ لیا، تجربہ کر لیا۔ تو کیوں نہیں تصادم اور مقابلہ کی اس پُر خار وادی کو چھوڑ کر صلح کی اس راہ پر غور کرتے ہیں۔ جسے اسلام نے زندگی کے کسی خاص شعبہ ہی میں نہیں، بلکہ میرا جہاں تک خیال ہے، ہر اس شعبہ میں اختیار کیا ہے جس میں قدرتی قوانین سے لڑکر دنیا کو ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔ ”اسلامی نوامیس“ کا یہ ایک بڑا اہم گریہ ہے، جس سے مسلمانوں نے عملاً یوں تو ہمیشہ نفع اٹھا ہے، لیکن علمی طور پر اس کے سمجھنے کی توفیق شاید چند خاص ہی نفوس کو میسر آئی ہے۔ مسئلہ کی اہمیت ذرا تفصیل چاہتی ہے۔

ازالہ یا مالہ | مطلب یہ ہے کہ جن قوانین پر دنیا اور دنیا میں رہنے والوں کا نظام قائم ہے، یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ ان کا پیدا کرنے والا اور ان کو نافذ کرنے والا علم و حکمت کے ساتھ رحم و کرم کا بھی لامحدود سرچشمہ ہی ایک ایسے عالم الغیوب ارحم الراحمین کے متعلق کیا ایک لمحہ کے لئے یہ تصور کرنے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے کہ اس نے کوئی غلط قانون بنایا، ایسا غلط قانون جس کی وجہ سے اس کے بندے دکھ درد، رنج و کلفت میں مبتلا ہو گئے مسلمان ہو، یا غیر مسلمان، ہر وہ شخص جو خدا کو مانتا ہے، یقیناً اس تصور کی ہمت نہیں کر سکتا؟ پھر انسان کے اندر ہویا انسان سے یا ہر اصطلاحی الفاظ میں چاہیے تو کہئے کہ انفس میں ہویا اتفاق میں، ان چیزوں کا مشاہدہ کیوں ہو رہا ہے جو برتری ہیں اور نتائج کے لحاظ سے جن کے شر ہونے کا فیصلہ عقل نے بھی کیا ہے اور مذہب نے بھی۔ آخر آدمی کے اندر ہی لیجئے، بیسیوں صفات خود اسی کے اندر ایسے پائے جاتے ہیں، اور ان ہی صفات کو لے کر وہ پیدا ہوتا ہے، جن سے دنیا بھی بیزار ہے اور مذہب نے بھی جن پر لعنتیں کی ہیں، یہ حسد یہ بغض یہ بخل یہ خود غرضی اور اس قسم کے سارے رذائل جو عموماً فطری طور پر لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اس کے سوا کس کی ہو سکتی ہیں، جس نے انسان اور انسان کی فطرت کو پیدا کیا؟ اور یہی حال اتفاقی کائنات یا ماوراء انسانی موجودات کے ان پہلوؤں کا ہے۔ جن سے آدمی کو دکھ پہنچ رہا ہے۔

انسانی مجاہدات اور اس کے مساعی پر اگر غور کیا جائے تو ایک بڑے حصہ کا تعلق معلوم ہوگا کہ اندر اور باہر کے ان ہی شرور اور ان ہی برائیوں سے ہو، جن کی بدولت آدمی کی موجودہ زندگی انتہائی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ان ہی پیچیدگیوں کی حل کی راہوں میں کش مکشوں کا ایک لامحدود سلسلہ جاری ہے، ہمارے علوم و فنون کا ایک بڑا دفتر ان ہی کے مباحث سے مملو اور معمور ہے۔

بات طویل ہو جائے گی، قصہ مختصر یہ ہے کہ عموماً کش مکش کی ان راہوں میں ایک گروہ تو ان کا ہے جنہوں نے ان شرور اور برائیوں کے ازالہ و استیصال کو اپنا نصب العین بنا کر چاہا ہے کہ اسی سے زندگی کی پیچیدگیوں کا حل پیدا کیا جائے۔ اسی راہ کے وہ مشورے ہیں، جن میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ مثلاً حسد نہ کرو، بغض نہ کرو، خود غرضی سے باز آ جاؤ، اور معاشی مشکلات کے حل کے سلسلہ میں گزشتہ تدبیروں کا جو ذکر کیا گیا تھا، دراصل اسی کلیہ کا وہ بھی ایک جزئیہ ہے۔ یعنی معاشی پیداواریں جس پیمانے پر پیدا ہو رہی ہیں، اس پیمانہ کی قدرتی خصوصیت (یعنی مجموعی حیثیت سے ان کا غیر مبسوط ہونا) کبھی تو اس خصوصیت کے متعلق ارادہ کیا گیا کہ اس کو ختم کر دیا جائے، یا ان معاشی پیداواروں سے جو مستفید ہو رہا ہے، یعنی انسانی فطرت کی ان خصوصیات کا ازالہ کر دیا جائے جن سے رزقی بدو جہد کی الجھنوں کا تعلق ہے، یہ تفصیل عرض کر چکا ہوں کہ متناؤں سے دستبرداری کا مشورہ، یا صفاتی و کمالاتی تفاوت کی وجہ سے افراد انسانی اور ان کی قیمتوں میں مراتب و مدارج کا جو قدرتی اختلاف ہے، چاہا جا رہا ہے کہ اس اختلاف کو مٹا دیا جائے۔ حاصل دونوں کا وہی ازالہ ہے۔ اخلاقیات (ایتھکس) کی ضخیم ضخیم کتابوں کا دنیا کی زبانوں میں جو انبار لگا ہوا ہے، خلاصہ سب کا یہی نکلے گا کہ جن صفات و غرائز کو لے کر آدمی شکم مادر سے پیدا ہوتا ہے، ان میں ردائل کے نام سے جو موسوم کئے گئے ہیں، یعنی وہی نخل حسد، کینہ وغیرہ، ان سب کے ازالہ کی کوشش یہی انسانی سعادت کی راہ ہے، زندگی کی تلخیوں، اور سماج کی الجھنوں کا واحد علاج ازالہ کی ان ہی تدبیروں کو قرار دیا گیا ہے، تدبیروں کے طریقے یہ ممکن ہے کہ مختلف ہوں۔ لیکن آخری خاتمہ سب کا اسی "قانون ازالہ" کے مشورہ پر منتہی ہوتا ہے۔

اسلام کی راہ | میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ دنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان میں یہ چیز پائی جاتی ہے یا نہیں، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ علاج کے جس اصول کو اب میں پیش کر رہا ہوں ذاتی حد تک یہ چیز مجھے اسلام ہی میں ملی، اسلام کی آسمانی کتاب و اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی سے یہ روشنی میں نے حاصل کی ہے۔

اسی مسئلہ پر کہ آدمی کے باہر ہو، یا اندر یہاں جو کچھ ہے، سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے، غلطی ہو یا ظلم، جس کی ذات اس کے شائبہ سے بھی بدتر و پاک ہے، اس کی پیدا کی ہوئی چیز قطعاً غلط نہیں ہو سکتی، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسی دینی و عقلی مسئلہ کی بنیاد پر افاق و انفس کی ہر قدرتی صفت کو قدرت کی پیدا کی ہوئی ایک چیز ہونے کی حیثیت سے اسلام خیر اور قطعاً صحیح و درست بھی قرار دیتا ہے، اور چاہتا ہے کہ مسلمان جو اسلام کو خدا کا پیغام یقین کرتے ہیں، وہ بھی یہی قرار دے دیں اور یہی باور کریں، اور اس لحاظ سے آدمی کے اندر ہو یا باہر، قدرتی کار فرمایوں کے کسی اثر کے ازالہ کا سوال ہی اسلام میں پیدا نہیں ہوتا خواہ دنیا نے اس کا کچھ ہی نام رکھا ہو، اور جن الفاظ سے چاہا ہے اسے بدنام کیا ہو۔ رہے وہ نتائج جو ان

قدرتی آثار و قوانین سے پیدا ہو کر انسانیت کے لئے تکلیف دہ اور زندگی کو تلخ بنا رہے ہیں۔ بجائے ازالہ کے اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ان آثار و قوانین کے صحیح استعمال کی راہیں پیدا کی جائیں، ازالہ کے مقابلہ میں استعمال کی صحیح راہوں کا دریافت کرنا اور ان ہی کے مطابق عمل کرنا اسی کا نام قانونِ امانہ رکھا گیا ہے۔ اور اسی کو میں اسلامی تعلیمات کی ایک بڑی اہم خصوصیت خیال کرتا ہوں۔

یوں کہنے کو تو مثلاً مسلمانوں نے بھی "اخلاقیات" پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ اور ان میں انسانی غرائز و صفات کو فضائل و رذائل اعلیٰ، ادنیٰ، اوسط وغیرہ اقسام و مدارج میں تقسیم کر کے نکتہ نواز یوں کے دریا بہا دیئے گئے ہیں، لیکن اسے جبراً تبیحا اگر نہ قرار دیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں زیادہ تر غیر اسلامی مکاتب کے افکار کی بلا وجہ تقلید کرنے اور بزورِ جبر اسلامی وثائق و شواہد پر ان کو منطبق کرنے کی لا حاصل بلکہ ناکام کوشش کی گئی ہے، اخلاقی مسائل جن کا بالکل عمل اور صرف عمل سے تعلق تھا انہیں فلسفہ کی بھول بھلیوں میں کچھ اس طرح گم کر دیا گیا ہے کہ عمل کے لئے مشکل ہی سے ایک عامی آدمی ان کتابوں کی روشنی میں کسی لائحہ عمل کا انتخاب کر سکتا ہے، اور اسی لئے ذاتی حد تک میں ان ہی اسلامی مصنفین کا ہم نوا ہوں، جنہوں نے اخلاقی و منزلی یا (معاشی) و سیاسی مسائل کے متعلق بغیر کسی جھجھک کے اپنے اس فیصلہ کا اعلان فرما دیا ہے۔

۱۲ الشریعة المصطفویة
۱۲ الغراء و الملة المحمدية البیضاء
قد قضت الوطرح عنہا۔
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن شریعت اور
ان کی تائید ملت نے ان ضرورتوں کی تکمیل
کر دی ہے (اسلام کے سوا کسی دوسرے فکری

مکتب خیال سے ان امور میں مشورہ لینے کی مسلمانوں کو حاجت نہیں)

ان مصنفین اسلام کا یہ استغنائی تغافل اگرچہ بہتوں پر گراں گذرا ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ قومی یا علمی استکبار نہیں بلکہ درحقیقت ایک واقعہ کا اظہار ہے، آخر استکبار ہی اگر اس کی بنیاد ہوتی تو علم ہی کے دوسرے شعبوں میں ان ہی مصنفین نے غیر اسلامی دوائر کی چیزوں کو کیوں قبول کیا۔ علم کی دنیا میں پچھلوں کے پاس آج اگلوں کا جو موروثی ترکہ ہے، سب جانتے ہیں کہ ان ہی مصنفین اسلام کا وہ صدقہ ہے۔ خیر میں کیا کہنے لگا بات یہ ہو رہی تھی کہ بجائے ازالہ کے اس قسم کے تمام مسائل میں اسلام نے امانہ کے قانون پر اپنی بنیاد رکھی ہے اور یہ اتنی مختصر، سیدھی صاف راہ ہے کہ ازالہ والوں نے جن مسائل کو مجملات میں بیان کیا ہے بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ اسلام نے ایک ایک فقرہ میں ان کو ختم کیا ہے یہی اخلاق انسانی کے رذائل کا مسئلہ ہے صحابہؓ کے حالات بیان کرتے ہوئے تصحیح اخلاق کا
۱۲ شد ۱۲ علی ۱۲ الکفار
۱۲ صاع بینہم۔
کافروں پر وہ سخت ہیں۔ اور باہم
ایک دوسرے پر مہربان۔
اسلامی طریقہ

۱۲ جیسے ازالہ کے معنی ہیں کسی چیز کا زائل کر دینا۔ اسی طرح امانہ کے معنی ہیں کسی چیز کے رخ کو پھیر دینا۔ طب میں یہ اصطلاح مروج ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ مثلاً نزلہ جو آنکھ پر گرنے والا تھا اس کا امانہ بالوں یا دانتوں کی طرف کر دیا گیا ۱۲

چند لفظوں کا ایک مختصر سا جملہ قرآن میں ہے۔ مگر فطرت انسانی کے وہ سارے صفات جن کی شدت و صلابت سے دنیا چیخ اٹھی ہے۔ غصہ، بغض و عداوت، حسد، الغرض وہ سب کچھ جن سے دوسروں کو دکھ پہنچتا ہے بجائے اس بات کے کہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا جاتا کہ اپنے نفس سے ان رذائل کو مٹانے کی کوشش کریں، یعنی ان کے ازالہ کا حکم دیا جاتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کفر کی طرف ان کے رخ کو پھر کر شدت کے ان ہی صفات کو، اسلام نے کتنا کارآمد اور قیمتی بنا دیا۔ کفر کس چیز کا نام ہے، ان ہی چیزوں کا تو جنہیں اختیار کر کے اپنے ہاتھوں آدمی خود اپنے آپ کو اپنی توانائیوں کو خطرناک انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ کیسی عجیب بات! جن صفات کی سختیوں سے انسانیت جاں بہ لب تھی۔ صرف ایک اشارے میں قرآن نے ان ہی کو ذریعہ بنا دیا جس و خاشاک کے اس انبار کی صفائی کا جس کا قرآن کی اصطلاح میں کفر نام ہے، جن سے رحمت ہو رہی تھی وہی بنی آدم کی خدمت کے وسائل بن گئے، اسی طرح

۱۲ الشیطان لکم عدو فاحذروہ
دشمن بناؤ۔

۱۳ ان الشیطان لکم عدو فاحذروہ

عدو ۱۲۔

اللہ اکبر ایک مذہبی اور اعلیٰ اخلاقی کتاب میں "عداوت" جیسے رذیلہ کے اقتضار کی تکمیل کا مطالبہ امر کے الفاظ میں کیا جا رہا ہے، "دشمنی کرو" نیکی کے مبلغ مذہب کے منہ پر یہ بات کیسی عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن جس کی طرف عداوت اور دشمنی کے رخ کو پھر کر یہ حکم دیا گیا ہے۔ جب آدمی اس پر غور کرتا ہے تو نظر آتا ہے کہ بلاشبہ اس مصیبت سے جس کا نام "الشیطان" ہے۔ انسانیت نجات پا نہیں سکتی تھی۔ اگر عداوت کے اس جذبہ کا تخم آدمی کی فطرت میں نہ بودیا جاتا، بلکہ ایک طرف اگر عداوت کے اس جذبہ کی قیمت اس کے صحیح استعمال سے واضح ہوتی ہے تو دوسری طرف تمام برائیوں کے آخری سرچشمہ یعنی وہی "الشیطان" کے وجود کی قیمت بھی اسی سے خود بخود ہمارے سامنے آجاتی ہے، معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لئے قدرت نے آدم کی اولاد کو درحقیقت "الشیطان" کی شکل میں ارتقار کا ایک زینہ عطا فرمایا ہے کہ اسی کی ٹکر آدمی کو ہر تختانی درجہ سے اٹھا کر فوقانی مراتب پر پہنچاتی چلی جا رہی ہے۔ آپ دیوار سے ٹکراتے ہیں۔ تو زمین پر گرتے ہیں۔ لیکن "الشیطان" سے جو ٹکراتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ براہ راست وہ رحمت حق کی آغوش میں گرتا ہے، اور یہی "الشیطان" کا اسلام میں صحیح استعمال ہے، اب بجائے ٹکرائے کے جو "الشیطان" سے بغل گیری میں مشغول ہو جائے اور اس کی یہی مشغولیت اس کے لئے وبال جان بنتی چلی جائے تو آپ ہی بتائیے کہ "الشیطان" کو غلط طور پر استعمال کرنے والوں کا یہ قصور ہے یا الشیطان کے پیدا کرنے والے پر اس کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اسلام کے مشہور شیرازی حکیم نے امالہ کی اسی عجیب و غریب اسلامی قانون کی تلخیص اپنے ان دو مصرعوں میں کتنی بلاغت سے کی ہے۔ فرماتے ہیں

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن
نہ گفتم کہ دیوار مسجد بہ کن

سعدیؒ

دینے والے نے بیشک آپ کو تیشہ دیا تھا، اور اس لئے دیا تھا کہ اپنی ضرورت کے لئے اس سے لکڑی بھاڑنا،

لیکن بجائے لکڑی کے مسجد کی دیوار جو اس تیشہ سے آپ کھودنے لگے۔ تو اس الزام کا ملزم کیا تیشہ دینے والے کو ٹھیرایا جاسکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ کسی طوفانی سیلاب کے مقابلہ میں اس قسم کی تدبیریں کہ آبادی کو چاروں طرف سے سنگ بست کر دیا جائے۔ یا یہ نہیں بلکہ تلاش کر کر کے ان سریشیوں ہی میں ڈاٹیں لگانے کی کوشش کی جائے جن سے اہل اہل کر پانی آرہا ہے، اور تباہی و بربادی کی دھکیاں آبادیوں کو دے رہا ہے۔ کہنے کی حد تک تو یہ بھی تدبیریں ہیں، اور بڑی محنت طلب، مشقت خواہ پر مصارف تدبیریں ہیں۔

لیکن ان دونوں گروہوں سے ہٹ کر جو آگے بڑھ گیا، اور کسی بلندی پر چڑھ کر کوئی بنجر میدان جو اسے نظر آیا۔ پھاؤڑا لے کر ہلکی سی ایک راہ پانی کے لئے اسی خشک غیر آباد بنجر میدان کی طرف اس نے پھیر دی۔ جس کے بعد راہ پا کر خود بخود سیلاب کا یہ پانی غرائے بھرتا ہوا اسی میدان کی طرف پل پڑا۔ خود ہی انصاف کیجئے کہ سیلابی طوفان سے مقابلہ کرنے والوں کے ان تینوں طبقوں میں نتیجہ کے لحاظ سے کس کی کامیابی کا یقین کیا جاسکتا ہے۔ دیکھنے والوں نے سنگین سے سنگین دیواروں کو سیلاب کے تھپڑوں سے پاش پاش ہوتے ہوئے جب دیکھا ہے اور آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ یا ایلنے والے پانی کے دہانوں پر جو ڈاٹیں کسی گئی ہیں۔ پانی کے زور سے ان کے اڑنے اور الگ ہو جانے کا جب روزمرہ تماشا دیکھا جاتا ہے، تو اسی سے پہلے دو طبقوں کی کامیابی و ناکامی کے یقین کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ابڑے بنجر میدانوں کے چکر کو پانی سے سیراب ہونے کا موقع جس نے دیا ہے۔ جو پانی غلط راہ پر جا رہا تھا، اس کی روانی کو غیر فطری طور پر روکنے کی جگہ صحیح راہ پر جس نے اس پانی کو لگا دیا ہے۔ یقیناً یہی وہ آدمی ہے جس نے ضائع ہو جانے والے پانی کو بھی بربادی سے بچالیا۔ اور یہی نہیں بلکہ پانی کے بغیر زمین کا جو حصہ ریگستان ریڑ میدان بنا ہوا تھا۔ اس کو بھی باغ و بہار اسی طوفانی پانی کے صحیح استعمال سے اس نے بنا دیا۔ اسی کی کامیابی یقینی ہے، اور اسی کی تدبیر وہ تدبیر ہے جس میں نہ ناکامی کا احتمال ہے۔ اور نہ نقصان کا خطرہ۔ امانہ کا قانون اسی قانون کا نام ہے۔ اسلام نے زندگی کے ہر اس شعبہ میں جیسا کہ میں نے عرض کیا، امانہ کے اسی قانون کو اختیار کیا ہے۔ جہاں قدرت کے کسی قانون کے غلط استعمال سے غلط نتائج پیدا ہو رہے تھے اور لوگ استعمال کی تصحیح سے غافل ہو کر بجائے امانہ کے قدرت کے اس قانون ہی کی ازالہ کی فکر وں میں الجھ گئے۔ جو درحقیقت قدرت کے قانون سے نہیں، بلکہ خود قدرت ہی سے جنگ کی ایک بے نتیجہ بلکہ خطرناک گستاخانہ شکل تھی، اور اب بھی ہے۔

معاشی راہ میں امانہ | خیر ازالہ اور امانہ کے قانون کی یہ تو عام تشریح تھی، میرا خیال ہے کہ جیسے دوسرے کی اسلامی تدبیر | شعبوں میں اسلام نے ایسے مواقع پر بجائے ازالہ کے امانہ کے قانون سے الجھنوں کو سلجھایا ہے، اسی طرح معاشی راہوں کے ان مشکلات کو جو قدرتی قوانین ہی کے نتائج ہیں۔ ان کو بھی امانہ ہی کی کارگر تدبیر سے اس نے حل کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ جب تک انسان ان ناگزیر حالات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اور بقول ایک مشہور معاشی فاضل کے

انسان کو اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لئے جن مادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ محدود ہیں۔ اور اس کی آرزوؤں کی کوئی حد و نہایت نہیں، قدرت نے اس کی فطرت میں

سیری نہیں دی، اس کا ذہن، اس کا دل ہمیشہ ہر وقت نئے نئے مقاصد، نئی نئی آرزوں کا مولد ہے۔

دام آرزو ہا آفرینی مگر کارے نہ داری اے دل اے دل

(ص ۷۰)۔ مقصد و منہاج ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعۃ الملکیہ

یعنی مطلب وہی ہے کہ مجموعی حیثیت سے غیر مبسوط کہئے یا محدود پیمانے پر معاشی پیداواروں کے پیدا ہونے کا جو سلسلہ جاری ہے۔ اور قرآن کے حوالہ سے گزر چکا کہ الحیوۃ الدنیا کی موجودہ زندگی میں رہتی دنیا تک یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا، اور جب تک آدم کی اولاد ان فطری خصوصیتوں کو لے کر پیدا ہوتی رہے گی، جن کا تفصیل سے قرآن کی روشنی میں ذکر ہو چکا، اس وقت تک ہمیں جو کچھ سوچنا ہے، ان ہی حالات میں رہ کر سوچنا ہے اور یہ طے کر کے سوچنا ہے کہ جن حالات و کیفیات عوامل و موثرات کی زنجیروں میں ہماری موجودہ زندگی جکڑی ہوئی ہے۔ ان زنجیروں کی کسی کڑی کے ازالہ اور جدا کرنے سے ہم قطعاً عاجز و مجبور ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مشہور قول میں یعنی

اذ اسمعتم بحبل نزال عن مکانہ
فصد قوۃ و اذ اسمعتم برجل تغیر
عن خلقہ فلا تصد قواہ فانہ
یصیر الی ما جہل علیہ
(رواہ احمد)

جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا، تو
اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ لیکن جب سنو کہ کسی
شخص کی جو پیدائشی خصلت ہے۔ وہ بدل
گئی، تو اس کی تصدیق نہ کیجئے۔ کیونکہ بالآخر اس کا
انجام اسی پر ہوگا جس پر اس کی جبلت پیدا ہوئی ہو

فرما کر اسی حقیقت کی توثیق فرمائی ہے، اسی نصب العین کو سامنے رکھ کر آئندہ کی جو تدبیریں اس راہ میں
سیری سمجھ میں آئی ہیں آپ کے آگے پیش کرتا ہوں۔

گزر چکا کہ معاشی پیداواروں سے استفادہ کرنے والے یعنی انسان کی بعض فطری خصوصیات اور خود
ان معاشی پیداواروں کی پیدائش کا وہ محدود پیمانہ یعنی اس کا مجموعی حیثیت سے ہمیشہ غیر مبسوط اور محدود ہونا،
ان ہی دونوں باتوں کی یا بھی آویزش سے وہ پیچیدگیوں پیدا ہوئی ہیں۔ جن کا نام معاشی پیچیدگیوں ہیں ہم پہلے
ذرا ترتیب کے ساتھ معاشی پیچیدگیوں کے ان اسباب کو پھر درج کر دیتے ہیں، جو یہ ہیں۔

(۱) جسدی طور پر آدمی کا دوسروں کے لحاظ سے ضعیف ہونا (خواہ ضعف سابق ہو یا لاحق)

۱۔ اس قسم کی ایک روایت بھی کتابوں میں ملتی ہے، ابو داؤد، ترمذی، مسند احمد سب ہی کے حوالہ سے مشکوٰۃ میں یہ روایت منقول ہے جس کا ترجمہ
ہے کہ آدمی کی پیدائش اس مشت خاک سے ہوئی ہے جسے خدا نے ساری زمین سے اٹھایا تھا۔ اس لئے زمین کی مناسبت سے سرخ، پیلا، کالا اور
ان کے درمیان والے رنگ مختلف افراد میں پائے جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے بعض گرم بعض سخت بعض پاکیزہ فطرت بعض خبیث نظر آتے ہیں آدمی
کی فطرت پر اس سرزمین کی خصوصیتوں کا اثر بھی پڑتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ یوں بھی یہ ایک تجربی مسئلہ ہے۔ پہاڑوں میں پیدا ہونے والے
پٹھانوں کی سختیاں اور کچڑ بانی کے درمیان پیدا ہونے والے بنگالیوں کی مزاجی نرمیاں اس کی مثالیں ہیں ۱۲

(۲) انجیر (یعنی ہر وہ چیز جو آدمی کو اچھی اور مصلیٰ معلوم ہوتی ہے) اس کے حب اور چاہ میں انسان کا شدید انتہا پسند ہونا جس کی دوسری بقیر قرآن ہی نے ہلوعیت سے بھی کی ہے۔ ایک طرف آدمی کی فطرت میں اس کا ارتکاز اور دوسری طرف معاشی پیداواروں کی مجموعی حیثیت سے عدم مبسوطیت یا محدودیت۔

(۳) صفاتی اور کمالاتی تفاوت کی وجہ سے افراد انسانی کا مدارج و مراتب کے اعتبار سے

باہم مختلف ہو جانا۔

ب تفصیل اس پر بحث ہو چکی ہے کہ معاشی مشکلات کے کئی اسباب یہی ہیں۔ اگر ان حالات سے آدمی دوچار نہ ہوتا تو جیسے زمین پر دوسرے جینے والوں کے گروہ درگروہ جی رہے ہیں، کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں۔ تناسل و تولید کے فرائض انجام دے رہے ہیں ہر قسم کے جھنجھٹوں اور کھٹکھٹوں سے آزاد ہو کر مزے کے ساتھ با من و اطمینان انجام دے رہے ہیں۔ راحت و سرور کی یہی قابل رشک زندگی انسان کو بھی میسر ہوتی۔

پھر ان ہی الجھنوں کے سلجھانے کے لئے ازالہ کی کوششیں مختلف قرون و ادوار میں جو کی گئیں، یا اب بھی کرنے والے جو کچھ اس سلسلے میں کر رہے ہیں۔ ا کا جو کچھ انجام ہوا یا ہو سکتا ہے اس کی داستان بھی آپ سن چکے۔

لیکن بجاے ازالہ کے امانہ کی جن تدبیروں کا قرآنی تعلیمات اور اسلامی ہدایات کی روشنی میں جو پتہ چلتا ہے، اب آئیے اور انھیں بھی دیکھئے، بات چوں کہ نئی ہے، اس لئے پڑھنے والوں سے فکر و صبر کی اگر میں توقع کروں تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

(۱)

پہلا سبب اس سلسلہ میں ہمارا فطری ضعف (سابق و لاحق) تھا، پہلے اسی پر غور کیجئے۔

آدمی کا جسمی حیثیت سے جیسا کہ گذر چکا ضعیف و کمزور ہونا ایک بدیہی مشاہداتی حقیقت ہے، کہنے والے انسان کو جو ضعیف البیان کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اسی بنیاد پر تو کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر کوئی شبہ نہیں کہ خاکدانِ ارضی کی زندگی اور زندگی کی ضروریات لکھنے والی دوسری ہستیوں کے مقابلہ میں ظاہر ہماری یہی سب سے بڑی کمزوری ہے، مقابلہ کر کے اس کا مفصل قصہ سنایا جا چکا ہے۔

لیکن یہ حال تو ہمارے بنیان (جسمانی بناوٹ) اور ظاہر وجود کا ہے۔ مگر باہر سے ہٹ کر اسی آدمی کی ذرا اندرونی صلاحیتوں پر غور کیجئے، جو باہر سے اتنا ناتواں، بے نوا و بے سروسامان معلوم ہوتا ہے۔ کیا اندر سے بھی وہی ہے جیسا باہر سے سمجھا جاتا ہے؟ جو واقعہ ہے۔ اگرچہ کم و بیش ہر جاننے والا اسے جانتا ہے۔ لیکن میرے سامنے اس وقت صرف قرآنی اشارات ہیں۔ اس سوال کا جواب بھی قرآن ہی کی راہنمائی میں دینا چاہتا ہوں۔

عجیب بات ہے، اسلام کی آسمانی کتاب کا سب سے پہلا حصہ جو دنیا میں نازل ہوا اس حصہ میں بھی اگر غور کیا جائے تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ میں غارِ حرا کی پہلی وحی کے اس آخری فقرے

علم الانسان ما لم يعلم اور سکھائیں خدا نے انسان کو وہ باتیں

جنہیں وہ نہیں جانتا۔

کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بہ ظاہر شاید یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنی لامحدود نعمتوں میں سے ان الفاظ کے ذریعے سے ایک خاص نعمت (علم) کو یاد دلا کر حق تعالیٰ نے بندوں پر اپنا احسان جتلیا ہے، ہاں یہ بھی بڑا احسان ہے اور مستحق ہے کہ محسن اپنے اس احسان کو جتلائے۔ لیکن یہ تو ایک عام بات ہوئی، غور کرنے کی چیز تو محل اور مقام کی خصوصیت، نیز وہ الفاظ ہیں جن سے اس نعمت کا اظہار فرمایا گیا ہے، طول کلامی کے الزام سے پھر ڈر رہا ہوں لیکن جو کہنا چاہتا ہوں، اگر الزام کے ڈر سے اسی کو چھوڑتا چلا جاؤں، تو پھر لکھنے کی اس درد سری کے خریدنے کی حاجت ہی کیا تھی، قرآن میں تو سب ہی کچھ لکھا ہوا ہے، خواہ اسے سمجھا اور سمجھایا جائے یا نہ سمجھا جائے نہ سمجھایا جائے۔

میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ قرآن کا نزول عربی زبان میں شروع ہوا تھا تاکہ عربی جن کی مادری زبان ہے، اُن کے لئے بھی، اور جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے، اُن کے لئے بھی۔ الغرض بنی آدم کے تمام گھرانوں، ہر ملک ہر قوم کے ہر ہر فرد کے لئے رہتی دنیا تک اس کو آخری پیغام بنایا جائے۔ اس پر کھلا ہوا سوال ہو سکتا تھا اور اسے ہونا ہی چاہئے کہ عربی جن کی زبان ہے ان کے لئے تو عربی میں اترنے والا یہ پیغام پیغام بن سکتا ہے، لیکن جن بیچاروں کی زبان عربی نہیں ہے، ان کو عربی زبان کا مخاطب بنانا کیا قرین انصاف ہو سکتا ہے۔ اسلام کے عمومی پیغام ہونے پر پہلا اعتراض یہی ہو سکتا تھا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اعتراض سے پہلے اسی کا جواب پہلی وحی کے اس فقرے میں دیدیا گیا ہے۔ توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان اور غیر انسانی انواع میں یہی تو فرق ہے کہ آدمی کے سوا جاننے والی علم و احسان رکھنے والی جتنی ہستیاں ہیں، ان کی یہ خصوصیت ہے کہ سیکھنے سکھانے یا اکتساب و تعلیم کے بغیر شکم مادر ہی سے چند خاص جلی اہامات کہیے یا احساسات یا معلومات اپنے ساتھ لاتے ہیں، ان میں جو جب تک جیتا ہے، اپنی پوری زندگی ان ہی چند گئے چٹے مقررہ اہامات و فطری احساسات ہی کے تحت گزارتا ہے، بطور بچہ انڈے سے نکلتا ہے، سکھانے والوں سے قطعاً کچھ سیکھے بغیر دیکھا جاتا ہے کہ پانی میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی تیرنے لگتا ہے، شنائوری یقیناً ایک علمی کمال ہے، جو بطن کے بچوں کو بخشنے والے کی طرف سے بخشا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ بطن کی ابتدا بھی اسی کمال سے ہوتی ہے۔ اور بوڑھی ہو کر جب کوئی بطن مرتی ہے، تو اس وہی کمال کے سوا اس کی پوری زندگی میں کسی اکتسابی کمال کا قطعاً بال برابر بھی اضافہ نہیں ہوتا، اور بطحاً تو ایک مثال ہے، ماوراء انسان جانداروں اور علم و احساس رکھنے والے حیوانوں میں سب کا ہر ایک کا یہی حال اور قطعاً یہی حال ہی، ان کے لئے قدرت کا یہی قانون ہے جس چیز کے عالم بنا کر وہ پیدا کئے جاتے ہیں، خواہ وہ علم جتنا بھی دقیق، جتنا بھی پیچیدہ ہو، ان مہندسانہ چابکدستیوں ہی کا علم کیوں نہ ہو شہد کی مکھیاں جس کی مدد سے ان چھتوں اور محالوں کو بناتی ہیں، جن کی اقلیدسی نادرہ کاریوں کو دیکھ دیکھ کر ریاضیاتی عقول والے بھی چکرار ہے ہیں، بیا جیسی چڑیا، یا جونک جیسے کیڑوں کے وہ فطری حسابات

ہی کیوں نہ ہوں، جن کی بدولت پیش آنے سے پہلے طوفانی ہواؤں یا سیلابوں کی نوعیت اور ان کے بہاؤ کی سمت کا ان پر انکشاف ہو جاتا ہے۔

مگر بائیں ہمہ ان میں ہر ایک کا علم ان ہی معلومات اور ان ہی احساسات تک محدود رہتا ہے قطعاً ان ہی تک محدود رہتا ہے جنہیں بھرنے والا پیدا ہونے سے پیشتر ہی ان کی جبلتوں میں بھر دیتا ہے اسی لئے جس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کا سرمایہ یہی ہوتا ہے اور جس دن مرتے ہیں، کسی قسم کا کوئی مزید اضافہ اس سرمایہ میں نہیں ہوتا۔

لیکن اسی کے مقابلے میں بنی آدم یا انسان کو دیکھئے، جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ پیدا تو ہوتا ہے بے سروسامانی جہل و نادانی کی انتہائی نقائص و عیوب میں لتھڑا ہوا، لیکن اسی کے ساتھ اس کی اس عجیب و غریب حیرت انگیز صلاحیت و قابلیت کا کون انکار کر سکتا ہے، جو نہ جانی ہوئی چیزوں کے جان لینے اور سیکھ لینے کی اس میں قدرتی طور پر پائی جاتی ہے۔ بلاشبہ وہ جس وقت شکم مادر سے نکلتا ہے، شاید اس وقت کچھ نہیں جانتا، یا جو کچھ جانتا ہے۔ وہ نہ جاننے کے برابر ہوتا ہے۔ مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے، جانتا چلا جاتا ہے، سیکھتا چلا جاتا ہے، ان ہی باتوں کو جانتا چلا جاتا ہے۔ سیکھتا چلا جاتا ہے، جنہیں وہ نہیں جانتا تھا، قطعاً نہیں جانتا تھا، عالم بعلم (جسے انسان نہیں جانتا) ان ہی کے متعلق علم (سکھاتا ہے اس کو) کے عمل کے قبول کرنے کی جو فطری صلاحیت آدمی میں پائی جاتی ہے، قرآنی آیت علم الانسان ما لم يعلم میں جہاں تک میرا خیال ہے اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور یہی جواب ہے اس سوال کا کہ جو عربی نہیں جانتے ہیں وہ بھی عربی زبان میں اتر نیوالے پیغام کی صحیح مخاطب اور اس کے سمجھنے، اس پر عمل کرنے کے مکلف کیسے بنائے جاسکتے ہیں، نہ جانی ہوئی چیزوں کے سیکھنے اور جاننے کی صلاحیت ہی جس کی فطرت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ کیا اپنی اس عجیب و غریب تعلیمی قابلیت پر متنبہ ہونے کے بعد اس بیجا سوال کی جرأت وہ کر سکتا ہے؟

خیر یہ تو ایک ذیلی بحث تھی، اس مسئلہ کے خصوصی تفصیلات کا مقام دوسری جگہ ہے، یہاں تو صرف اتنا بتانا ہے کہ باہر سے جو ضعف اور کمزوریوں، انتہائی کمزوریوں کے حال میں پیدا ہوتا ہے۔ تعلم و اکتساب علم یا نہ جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی صلاحیت ہی کی بدولت دیکھا جا رہا ہے کہ سارے زور آوروں کو اپنے آگے بے زور بنائے ہوئے ہے۔ ہاتھوں کو جھکائے ہوئے ہے، اونٹوں کو دبائے ہوئے، سانڈوں کو سدھائے ہوئے ہے، بیڑوں کو پھنسائے ہوئے ہے، دھیلوں کا شکار کر رہا ہے، گیتندوں کو لٹکا رہا ہے، اور یہاں کون ہے جو اس کی دہائی نہیں پکا رہا ہے۔

پس کوئی شبہ نہیں کہ پیدا ہونے کی حد تک تو آدمی زادہ عقل و خرد پوش و تیز سے بیگانہ ہو کر پیدا ہوتا ہے، اس کی حیثیت یقیناً گوشت کے ایک زندہ مضافہ اور ناتریشہ کندے ہی کی ہوتی ہے لیکن جب مرتا ہے، تو ان ہونے والوں میں کب نہیں دیکھا گیا اور کیا اب نہیں دیکھا جا رہا ہے، روزمرہ آئے دن دیکھا جا رہا ہے، ہر جگہ دیکھا جا رہا ہے کہ ان میں کتنے علماء و حکیم، ڈاکٹر و طبیب، جبر و خیر ہو کر رہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ انسان کی ساری متخیری کرشمہ سازیاں کائنات کے گوشہ گوشہ میں خاک و آب و آتش و باد کے ہر طبقہ میں جو نظر آرہی ہیں، یہ سارا تماشا یا ساری تفسیر قرآن کی آیت

علم الانسان ما لم يعلم سکھائیں انسان کو وہ باتیں جنہیں

وہ نہیں جانتا۔

ہی کے چند لفظی فقرے کی ہی ”نادانستہ کو دانستہ“ بنانے کا یہی باطنی سلیقہ ہی تو آدمی کا ہے جس میں اس کی ساری اختراعی کار فرمایوں، اور ایجادیں نادرہ نمایوں کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

علم آدم الا سماء کلمہ سکھایا آدم کو الاسماء (یعنی ساری چیزوں کے نام)

کے تعلیمی عمل کے بعد الاسماء کے بتانے کا مطالبہ کر کے اور آدم سے جواب سنوا کر فرشتوں کو جو ملزم ٹھہرایا گیا تھا، تو دلوں میں یہ وسوسہ ہوا کہ بتانے کے بعد امتحان امتحان کب باقی رہا۔ حالانکہ یہی تو سمجھنے کی بات تھی، آدم یا انسان میں تعلیم کے قبول کرنے، نہ جانی ہوئی باتوں کو سکھانے کے بعد سیکھ لینے کی جو صلاحیت ہے اسی کی تو نمائش مقصود تھی، وہ سکھایا گیا اور اس نے سیکھ لیا، سیکھنے کے بعد سیکھی ہوئی بات کو اس نے بتا دیا، یہی تو آدمی کا کمال ہے، ایسا کمال ہے، جو صرف اسی کا کمال ہے، آدمی کے سوا اخفش ہی کا بڑے کیوں نہ ہو، چونکہ وہ بڑے آدمی نہیں ہے اس لئے اخفش جیسے معلم کی تعلیم بھی اس میں علم منتقل نہ کر سکی۔ اس قرآنی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب غور کیجئے، اس پر غور کیجئے کہ بنیانی ضعف اور جسدی بے نواہیوں کے جس حال میں آدمی پیدا کیا جا رہا ہے۔ اگر اس حال میں وہ نہ پیدا ہوتا، بلکہ بجائے اس کے آدم زاد بھی دنیا میں اس شان کے ساتھ داخل ہوتا جس کی ایک مشہور معاشی فاضل نے ان الفاظ میں تمنا کی ہے۔

اگر آج دنیا میں ہر شخص کو بازی گر کا وہ لٹکا ہاتھ آجائے جس سے وہ اپنے

ٹکے کے اندر یا ٹوکڑے کے نیچے سے جو چاہتا ہے نکال لیتا ہے۔“ (ص ۹۹)

مقصد و منہاج۔ ارڈاکٹر ذاکر حسین خاں)

یعنی خواہش، مجرد خواہش، کے ساتھ جو چاہا جاتا وہی پورا ہوتا رہتا، انسان ایسی قوت لے کر اگر دنیا میں قدم رکھتا۔ تو اس میں شک نہیں کہ دنیا بجائے دنیا ہونے کے بنی بنائی گویا جنت ہی ہو جاتی، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن انسانی کمالات کی تماشا گاہ آج یہ غیر بہشتی دنیا بنی ہوئی ہے، کیا بن سکتی تھی، واقعہ تو یہ ہے کہ کہنے کی حد تک تو اس کا نام بھی شاید دنیا ہی ہوتا، اور مذاہب میں بیان بھی کیا گیا ہے کہ انسان ہی کے آگے زندگی کے کسی آئندہ دور میں ایک ایسا عالم بھی پیش ہوگا، جہاں وہی ہوگا، جو چاہا جائے گا، وہی ملے گا جو مانگا جائے گا، لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ انسان اور انسانی کمالات کی نمائش نہیں، بلکہ دینے والے کی قدرتوں اور قوتوں کا ظہور ہوگا، پر ایسی دنیا جہاں ہے

سفال آفریدی ایاغ آفریدم

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

بیابان و گہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدیم

من آثم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آثم کہ از زر ہر نو شینہ سازم (اقبال مرحوم)

کے دو متقابل کمالات کا مظاہرہ مسلسل ہو رہا ہو، ہوتا چلا جا رہا ہو، اس کا تماشا تو اسی دُنیا میں ہو سکتا تھا، جہاں بیچارگیوں میں چارہ سازیوں، مجبوریوں میں مختاریوں کی نمائش کا موقعہ انسان کو مل رہا ہے۔ اگرچہ سچ تو یہی ہے کہ خُدا کی کسی مخلوق کے کمالات کا ظہور یا لائحہ خُدا ہی کے کمالات کا ظہور بن جاتا ہے، انسانی کمالات بھی خُدا کی کمالات ہی کی آئینہ برداری کا کام انجام دے رہے ہیں، مگر اس طور پر کہ آیت قرآنی

لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْوَلَدِ وَالْبَحْرِ

میں نے عزت عطا کی آدم کے بچوں کو اور

سوار کیا میں نے ان کو خشکی و تری میں۔

فی البر والبحر۔

کی تفسیر بھی ساتھ ساتھ ہوتی چلی جا رہی ہے، انہی کمالات کے ساتھ ساتھ انسان کے تکریمی مقامات کا راز بھی مسلسل بے نقاب ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اور یہ ہے آدمی کے بنیانی صنعت اور جسدی بے سرو سامانی کے عیب و نقص کی تکمیل کی وہ قدرتی شکل کہ اسی کی بدولت انسان کا یہی نقص، اس کی یہی کوتاہیاں بشری کمالات کے ظہور و بروز کے ذرائع بنی ہوئی ہیں، پس کوئی شبہ نہیں کہ پیدا ہونے اور رہنے کی حد تک تو یہاں سب ہی پیدا ہو رہے ہیں، سب ہی رہ رہے ہیں، قوی ہیکل، بڑے بڑے تن و توش والے، چنگلوں والے، کھروں والے، پروں والے، اور کیا کیا والے، لیکن آپ نے دیکھ لیا جو جس حال میں پیدا ہو رہا ہے اسی حال میں مر رہا ہے جس حال میں آ رہا ہے اُسی حال میں جا رہا ہے، لیکن ایک، صرف ایک آدم زاد ہے کہ جاہل پیدا ہوتا ہے ناقص پیدا ہوتا ہے، بے زور، بے نوا پیدا ہوتا ہے، لیکن جب مرتا ہے تو عالم ہو کر مرتا ہے، کامل ہو کر مرتا ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے تو یہ انسان کی اسی تعلیمی صلاحیت کا نتیجہ جس میں کوئی دوسرا اس کا سا جھی، شریک و ہمیم نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بنیانی صنعت کا احساس، اپنی بے سرو سامانی و بے نوائی کی کیفیتوں کا تاثر آدمی میں جتنا زیادہ بڑھتا جاتا ہے، تجربہ شاہد ہے، مشاہدہ بتا رہا ہے کہ اسی نسبت سے اس کی تعلیمی صلاحیتوں کا پہلو بھی زیادہ بیدار، زیادہ اجاگر ہوتا چلا جاتا ہے اور یہی ہے انسان کے جسدی صنعت اور بنیانی کمزوریوں، ناتوانیوں کے استعمال کی صحیح راہ یا ان کے امالہ کی صحیح تدبیر جس سے بجائے نقصان کے نت نئے منافع کے دروازے اس پر کھل سکتے ہیں، واقعات بتا رہے ہیں کہ جن قوموں میں اپنے اس صنعت کا احساس جس حد تک شدت پذیر ہوتا چلا گیا ہے، اسی حد تک اس قدرتی صنعت کی تلافی میں ان کی تعلیمی صلاحیتوں یا انجانی باتوں کے جاننے کا شوق تیز سے تیز تر ہوتا رہا ہے اور یوں ہمارے

ضعف دوسروں کی قوت و طاقت سے قیمتی کتنا زیادہ قیمتی بن جاتا ہے یقیناً وہ بڑائیاں جو نسل انسانی کو آج حاصل ہیں تعلیمی صلاحیت رکھنے کے باوجود بھی شاید ہی عرصہ ظہور پر جلوہ گر ہوتیں۔ اگر ہم بھی بجائے ضعف کے اسی طرح قوت لے کر پیدا ہوتے، جیسے انسان کے سوا دوسرے لے لے کر پیدا ہو رہے ہیں۔ دیکھا آپ نے امانہ کی اس ترکیب کی نادرہ نمائی کہ انسانی فطرت کی ساری کوتاہیاں اس کی حیرت انگیز اولوالعزمیوں کی گویا مقدمہ بن جاتی ہیں۔

(۲)

دوسری چیز اس سلسلہ کی رزقی سرمایہ کی محدودیت و عدم مبسوطیت کے ساتھ ہماری فطرت کی ہلوعیت یا التجر کے حب کی شدت و انتہا پسندی تھی، عرض کر چکا ہوں کہ موجودہ زندگی کی کلفتوں میں بڑا ہاتھ عدم انطباق کی اسی کیفیت کا ہے۔ انسانی فطرت صبر اور سیری کی صفت سے محروم بنا کر پیدا کی گئی ہے۔ اور معاشی سرمایہ جس پیمانہ پر یہاں پیدا ہو رہا ہے، خواہ دیکھنے میں وہ جتنا بھی نظر آئے۔ لیکن قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ مجموعی حیثیت سے بسط و فراخی کی کیفیت اس سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں کوئی ہو، ہر ایک یہی محسوس کر رہا ہے کہ اس کی چاہ پوری نہیں ہو رہی ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر ہماری اندرونی جھنجھلاہٹوں کا تعلق اسی صورت حال سے ہے، جسے دیکھئے، جہاں دیکھئے، جس طرف دیکھئے، یہی آواز آرہی ہے کہ

ہزاروں خوشنشین ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اسی چیز نے انسانی زندگی کو ایک طوفان بنا دیا ہے، ایسا طوفان کہ ہر جینے والا یہی کہتے ہوئے مر رہا ہے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ہمارے شاعروں نے اسی کی تصویر مختلف الفاظ میں کھینچی ہے۔ حیات کی یہ قیدان کو کبھی غم کا پھندا اور بند نظر آتا ہے۔ اسی لئے

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں

کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کبھی یہی غالب ”زندگی“ کو ”سوز“ اور ”سوز“ کو ”زندگی“ بتاتے ہوئے بالآخر اس حقیقت کے اعلان پر کہ

غم ہستی کا اسد گس سے ہو خبر مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر مہونے تک

اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ ”زندگی“ کسی قالب اور کسی رنگ میں ہو، غالب کی نگاہوں میں وہ جلتی ہوئی ایک شمع ہے۔ کسی رنگ کی چمنی اس پر چڑھائی جائے۔ سبز ہو یا سرخ، لیکن جب تک روشن ہے جلے گی۔ اور جب تک جلتی رہے گی اسی وقت تک وہ روشن ہے، شیراز کے عارف کو تو کھل کر یہ کہنا پڑا کہ

نہ گل از داغ غمت رست نہ بلبل در باغ
ہمہ را غرہ زناں جامہ دال می داری (حافظ)

الغرض بے چینی اور اضطراب، کرب و تکلیف کی اس کیفیت کا احساس موجودہ زندگی میں سب ہی کو ہو رہا ہے۔ انفرادی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس میں استثنائیں بھی ہو، جیسے ہر کلیہ میں استثنائیں ہیں لیکن اضطراب بے چینی، کرب و تکلیف کے عام ہنگاموں میں ٹوٹنے والوں کو عموماً یہی کاٹا چھپا یا چھپا ہوا نظر آیا ہے کہ سب، سب کچھ چاہتے ہیں لیکن چاہنے والوں کی چاہ کو پوری کرنے کے لئے جو سرمایہ یہاں پیدا ہو رہا ہے، وہ ایک ایسے مقررہ محدود پیمانہ پر پیدا ہو رہا ہے جس سے

سب کی یہ چاہ پوری نہیں ہو سکتی، اگر مرحوم نے فرمایا تھا

یہ بات ہے صاف مجھ سے سن لے، کتاب میں اس کو کیا پڑھیکا

حدود فطرت کے ہیں مقرر، جو یہ گھٹے گا، تو وہ بڑھے گا

لامحدود خواہشوں والی فطرت کا رخ ایسے محدود سرمائے کی طرف پھیر دیا گیا ہے، جسے دنیا کی کوئی طاقت

لامحدود بنا نہیں سکتی، محدود پر لامحدود کا انطباق چونکہ نہیں ہو رہا ہے، اور نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ خواہشوں

کے جس محدود حصہ کو تکمیل کا موقع مل جاتا ہے اس وقت تو آدمی مسرور ہوتا ہے۔ لیکن نہ پورے ہونے والے ارمانوں کا

جو قافلہ عدم کی راہ لے رہا ہے، اسی کا ماتم ہے جس کے غم میں اولادِ آدم سو گوار ہے۔ بسکین شاعر نے

کتنے دردناک پیرایہ میں کہا تھا،

ہوئے ہیں دفن مرے ساتھ سنیکڑوں ارماں

پھر کیا کیا جائے؟ کیا چھوڑ دیا جائے، اسی حال میں آدمی کو تڑپتا پھرتا چھوڑ دیا جائے، یہ سمجھاتے ہوئے چھوڑ دیا جائے کہ

جنت بنا سکے گا، ہرگز نہ کوئی اس کو

اگر یونہی چلی ہے دنیا یوں ہی چلے گی

کہتے ہیں کہ ”الیاس احدی الواحین“ قنوط و مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہی ہے، اسی قسم کی راحت جو ارمانوں اور

امیدوں کے پوری ہونے سے ہوتی ہے، شعر کی دنیا میں ہو سکتا ہے کہ سن بھی لیا جائے لیکن کامیابی کی مسرت اور

ناکامی کی خاموش کھسیا ہٹ حقیقت بینیوں کی نگاہ میں ایک نہیں ہو سکتی۔ اگر راحت کی یہ دونوں شکلیں ایک ہی ہیں

تو تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے ایک کو دوسرے سے بدلنے کے لئے کیا کوئی تیار ہو سکتا ہے؟

یہ نہیں تو طفلِ ستی کی وہ جھوٹی شکل کیا انسان کی غیر مطمئن فطرت کو واقع میں مطمئن بنانے میں کامیاب ہو سکتی

ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ موجودہ نسلوں کو اس کی تحقیکیاں دے دے کہ کیا ہم چین کے ساتھ سلا سکتے ہیں کہ زمین

کے اسی کرہ پر ”آج“ نہیں، ”توکل“ ہماری آئندہ نسلوں کو ایسی زندگی میسر آنے والی ہے، جس میں چاہنے والے جو

کچھ چاہیں گے وہی پائیں گے۔ ایسے میکائیکی آلات نئے نئے ایجادات و اکتشافات کا ظہور ہونے والا ہے کہ اس

کے بعد محرومی کا یہ گلہ آدم کی اولاد کو باقی نہ رہے گا۔

ایسا ہو گا بھی یا نہیں اسے تو جانے دیجئے۔ کم از کم جو قرآن کو خدا کا کلام مان چکے ہیں، ان کے لئے تو

۱۵ سورۃ البلد کی مشہور آیت ہے لقد خلقنا الانسان فی کبد (قطعاً ہم نے پیدا کیا ہے آدمی کو دردِ جگر میں) پھر اس سے پہلے

کہ مغلطہ کی اور مکہ مغلطہ کے بھی اس زمانے کی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں زندگی گزار رہے تھے قسم کھائی گئی ہے۔ اس کے بعد دوسری

قسم ہے ووالدین ووالدین کی (یعنی اور قسم ہے والد کی اور جو پیدا ہوا) قرآن کی قسمیں اس دعویٰ کی جس کا ذکر قسموں کے بعد ہوتا ہے عموماً لطمین

ہوتی ہیں۔ آدمی کی موجودہ زندگی جگر خواری کی زندگی ہے۔ اس کے لئے یقیناً وادیِ غیر ذی زرع شہر مکہ کی زندگی ایک بہترین مثال ہے پھر انسان کی فطرت

پر تجربہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی مکہ میں زندگی دو بھر کر دی گئی۔ اس سے بھی موجودہ زندگی کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے خصوصاً اپنے سب سے

بڑے محبوب شہر اور محبوب پیغمبر کو بھی جب اس قسم کی زندگی دی گئی تو اس سے دوسرے سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ زندگی کی کیا حقیقت ہے۔ پھر یہ آدمی کا پیدا ہونا

گہر ہونے تک اس قطرہ کا حلقہ لے صد کا انہنگ سے گذرنا اور ابھی یہ تجربہ ختم بھی نہیں ہو پاتے کہ صاحبزادے پھر گہر ہونے کے لئے قطرے کی شکل میں نمودار ہوتے

ہیں۔ بابائوں میں بیٹوں کی جو محبت فطرتاً رکھی گئی ہے وہ زندگی کو پھر تلخ بناتی چلی جاتی ہے۔ لاقائمی سلسلہ ہے۔ ایک کے بعد دوسری کڑی نمودار ہو جاتی ہے۔

اس امکان کے تصور کی جیسا کہ گذر چکا یہاں قطعاً گنجائش نہیں، الرزق کی جن پیداواروں کے متعلق قدرت فیصلہ کر چکی ہے کہ عام بسط کی حالت جس سے پیدا ہو، اس پیمانے پر ان کی پیدائش یہاں نہ ہوگی۔ پھر پیدا کرنے والا جس سرمایہ کو محدود رکھنا چاہتا ہے، اسی کو وہ غیر محدود کیسے بنا سکتے ہیں، جنہوں نے نہ دنیا پیدا کی ہے، نہ دنیا والوں کو پیدا کیا ہے۔ اور بالفرض مان بھی لیا جائے کہ ”آج“ انہیں تو ”کل“ ایسا ہو کر بھی اگر رہے گا تو آنے والی نسلوں کے مطمئن ہو جانے سے یہ بتایا جائے کہ موجودہ نسلوں کی غیر تشفی یافتہ خواہشوں کو کیسے اطمینان بخشا جاسکتا ہے، زید کے تندرست ہو جانے سے غریب عمر د کی بیماری کیسے اچھی ہو جائے گی۔ مستقبل کی ان بشارتوں میں آپ ہی بتائیے کہ حال والوں یا ان کے لئے جو کڑھتے اور جھینکتے، چلاتے اور کراتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اب تک مرتے چلے گئے، مر رہے ہیں مرتے چلے جائیں گے ان مسکینوں کا تشکین کے ان مغالطوں میں کیا حصہ ہے؟

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کے رہنے والوں کے مشکلات کا صحیح حل اگر یہ واقعہ نہیں ہو سکتا کہ امریکہ یا ارجنٹائن، برازیل یا ٹمبکٹو کے باشندے ان مشکلات میں مبتلا نہیں ہیں، پھر جیسے ایک جگہ کے رہنے والوں کی خوش حالیوں سے دوسرے مقام والوں کی بد حالیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی تو ایک عہد کی نسلوں کی تلخیوں کا علاج آپ آئے والے دوسرے عہد کی نسلوں کی شیریں کامیوں یا شیریں کامیوں کے وعدوں صرف وعدوں سے کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ جہنم میں رہنے والوں کو یہ سنا کر کیا خوش کرتے ہیں کہ ان کے پوتے ”جنت“ میں پیدا ہوں گے اور دوسروں کی مسرتوں ہی سے اگر ہم اپنی کلفتوں کے ازالہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو مستقبل کے مشکوک بے بنیاد ادوہامی وعدوں کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ہی کے سامنے اسی زمانے میں ہر جگہ، ہر علاقہ اور ہر خطہ میں تشفی یافتہ فطرتوں کی کیا کمی ہے، بتا چکا ہوں کہ انسان سکنت و طمانیت کی جس کیفیت کے لئے ٹرپ رہا ہے یہ موہم تو ان تمام زندہ ہستیوں کو مفت بغیر کسی کد و کاوش، درد سری اور محنت کے حاصل ہے جو انسان بن کر دنیا میں نہیں پیدا ہوئے ہیں، دوسروں کا اطمینان ہی اگر آپ کو مطمئن کر سکتا ہے تو شاخساروں پر چھپھانے والی چڑیوں، جو بُاروں میں تیرنے والی مچھلیوں، اور مُرغ آبیوں، مرغزاروں میں کیلیں بھرنے والے ہرنوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے آئندہ نسلوں کے ادھار وعدوں کے اطمینان کی اس نقد دولت کو کیوں حاصل نہیں کرتے مستقبل کے ”شندہ“ مواعید سے آپ کی فطرت اگر خنکی حاصل کر سکتی ہے تو انسان کے سوا ہر دوسری زندہ ہستی ”دیہ“ کی شکل میں آپ کے سامنے اسی وقت اسی کیفیت کو تقسیم کر رہی ہے، جب دوسروں ہی کا سکون آپ کا سکون بن سکتا ہے تو پھر دوسروں میں خصوصیت پیدا کرنے کے کیا معنی؟

خیر کہاں تک کہتا چلا جاؤں۔ اور جنہوں نے قرآنی صداقتوں کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد نہیں کیا ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ میرا ان سے خطاب بھی نہیں ہے۔ فضا میں جو مغالطے پھیلا دیئے گئے ہیں، شعوری یا غیر شعوری طور پر دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی ان کے جراثیم کسی نہ کسی طرح پیوست ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس لئے جہاں تک کہہ سکتا ہوں، کہہ دیتا ہوں، ورنہ ایک سید سے سادھے مسلمان کے لئے یہی کافی ہے کہ الرزق یا انسان کے معاشی ذخیروں کی پیدائش کا پیمانہ قرآن کی رو سے اس دنیا میں غیر مہربان

غیر محدود شکل اختیار نہیں کر سکتا، اس کی عدم مبسوطیت اور محدودیت کا جو حال آج ہے وہی کل بھی رہے گا اور جب تک یہ حال ہے۔ اخیر کے حب شدید کے روگی اور ہلوعیت و عدم سیری و بے صبری کے عارضہ میں اس مبتلا انسان کی بے چین فطرت، اپنی لامحدود خواہشوں کو معاشی پیداواروں کے محدود سرمائے پر منطبق نہ پا کر ہمیشہ بے کلی اور بے چینی کی اسی حال میں تڑپتی پھڑکتی رہے گی۔

قانون از آلہ کی راہوں سے علاج کرنے والوں نے آپ دیکھ چکے کہ معاشی زندگی کی اس پیچیدگی کو کتنی اہمیت دے رکھی ہے۔ زور آزمائیوں کی ساری تدبیروں کو وہ ختم کر چکے، اور جو باقی ہیں، انہیں بھی ختم کر رہے ہیں۔

لیکن اسلام نے بجائے از آلہ کے امالہ کی جو راہ اس سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے۔ وہ کتنی سادہ، کتنی آسان، کتنی سہل الوصول ہے، ایسی راہ کہ سننے کے بعد ممکن ہے کہ کہنے والے کو اٹھیں کہ یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی، ایسی بات جس سے کون ناواقف ہے، اور یہی میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آسانیوں کو غلط کاروں اور غلط فہموں نے کیوں دشوار بنالیا، قدرت ظالم نہیں ہے۔ اپنے بندوں کے لئے وہ رحم اور صرف رحم ہی رحم ہے، کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے، کہ سب سے زیادہ مکرم و محترم بنا کر جو پیدا کیا گیا ہے۔ تمام تقویوں میں سب سے احسن سب سے اچھی تقویم میں جو ڈھالا گیا، امانت اور خلافت کی خلعت سے جو سرفراز کیا گیا، ایک لمحہ کے لئے کوئی باور کر سکتا ہے کہ قصداً ارادہً ایک ایسی زندگی اسی کے گلے میں لٹکا دی گئی ہو جہنم بن کر اسے پیٹ گئی، ایسی جہنم جس میں وہ جھلس رہا ہے، تڑپ رہا ہے، جل رہا ہے، بھن رہا ہے۔ اور اس طور پر جل بھن رہا ہے کہ علاج کی ساری تدبیریں اس عذاب سے نکلنے اور نکلانے میں بے کار ثابت ہو رہی ہیں۔ ذہنی ارتقا، اور عقلی عروج کا انتہائی زمانہ جس عہد کو انسانیت کے لئے ٹھہرایا جا رہا ہے، اس عہد میں بھی آئندہ نسلوں کے متعلق استقبالی و عدوی کی جھوٹی طفل تسلیوں کے سوا علاج کی کوئی دوسری تدبیر اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اور نہ آنے کی امید ہے بہر حال بجائے از آلہ کے امالہ کی جس عجیب و غریب تدبیر کو میں اسلام کی طرف جو منسوب کر رہا ہوں آپ نے سمجھا؟ میں کیا کہہ رہا ہوں، کیا کہنا چاہتا ہوں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ میں الدین یا مذہب کے نظام ہی کو اسی امالہ کی واحد بے خطا تدبیر سمجھتا ہوں خود ہی سوچ لیجئے، مذہب کس چیز کا نام ہے؟ یہی ناکہ زندگی کے موجودہ دور کو جس کا نام قرآنی اصطلاح میں الحیوة الدنیا ہے۔ اسی الحیوة الدنیا کو لامحدود قدرت و قوت رکھنے والے خالق کی مرضی کے مطابق اس لئے گزارنا، تاکہ خالق کی لامحدود قوتیں بھی انسانی مرضی کے مطابق ہو جائیں، یعنی وہی مرضی اللہ عنہم و رضوانہ راضی ہو گیا اللہ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ سے۔

جس کا قرآنی خلاصہ ہے جن لوگوں سے زیادہ اعتماد انسانیت کی تاریخ میں کسی کو حاصل نہیں ہوا یعنی حضرات رسل علیہم السلام ان ہی کی اعتمادی حقیقتوں کو ذریعہ بنا کر ہر ملک اور ہر قرن میں جو چیز مذہب کے نام سے

پیش ہوتی رہی ہے، کون نہیں جانتا کہ اس کا حاصل یہی ہے، مذہب جس چیز کا نام ہے یہ تو اس کا حاصل ہوا لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ لامحدود خواہشوں سے لب زیر فطرت کے ساتھ مذہب کے اس پیغام کو جوڑنے کا نتیجہ کیا نکلا؟

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ لیکن ہوا یہی کہ دنیا کی معاشی پیداواروں کی محدودیت و عدم مبسوطیت کی وجہ سے لامحدود مطالبوں والی انسانی فطرت میں بے چینی اور بے اطمینانی کے جوانگارے دمک رہے تھے، مذہب کے اس پرزے کو جوڑنے کے ساتھ ہی محدود سے ہٹ کر انسانی فطرت کا رخ لامحدود کی طرف اچانک پھر گیا، انسانی فطرت کے مطالبے نہ پوری ہونے والی تمناؤں کی شکل اختیار کر کے آدمی کو جوڑ پیا رہے تھے، شاداب بڑھتی ہوئی امیدوں، اور اربانوں کے پھول بن بن کر وہیں جہاں آگ صرف آگ بھری ہوئی تھی، شگفتہ و تروتازہ تختوں سے بھرا ہوا باغ بن گیا جس سے زیادہ بھروسہ کسی دوسرے پر نہیں کیا جاسکتا، حتیٰ کہ خود اپنی آنکھوں اپنے کالوں پر بھی نہیں، ان ہی غیر مشکوک قطعی علمی ذرائع (رسل اللہ) کی راہوں سے انسانی فطرت اور اس کے لامحدود مطالبوں کا امالہ ایک ایسی عجیب و غریب شکل میں مذہب کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری بیچینیاں، چین کی، اور ساری پریشانیاں، سکون و عافیت کی سیڑھیاں، بن جاتی ہیں، فطرت کے ان لامحدود مطالبوں کے استعمال کی صحیح قدرتی راہ یہی ہے، ان مطالبوں کو ہمارے اندر بھرنے والے نے اسی استعمال کے لئے بھرا تھا۔ پھر جو ہاتھ سے پاؤں کا، اور پاؤں سے ہاتھ کا کام لے کر دکھ اور اذیت محسوس کرتا ہے۔ اس کا الزام استعمال کے غلط طریقوں کو اختیار کرنے والوں پر ہے، نہ کہ اس پر جس نے ہاتھ اور پاؤں کی نعمتوں سے ہمیں سرفراز فرمایا ہے۔ مذہب اسی امالہ کا ذریعہ اور صحیح آسمانی مشورہ ہے۔ یوں تو یہ بالکل ایک واضح اور کھلی ہوئی بات ہے۔ لیکن بدیہات پر بھی کبھی تنبیہ کی جاتی ہے، قرآن پڑھیے، ان تبلیہوں کے اشارے بھی اس میں آپ کو ملیں گے؛

قرآن مجید کی وہی آیت کریمہ جس کا پہلے بھی ذکر کر چکا ہے، یعنی الشہوات کے حُب و گوارائی کو قدرت ہی نے انسانی فطرت کے لئے مزین و آراستہ کیا ہے۔ اسی سلسلے میں بعض اہم خواہشوں کی آیت میں تفصیل بھی دی گئی ہے۔ یعنی النساء (عورت) البنین (اولاد زمین) الذہب والفضة (سونے چاندی) کے لقنا طیر المظنرة (انباء) الخیل المسومة (اصیل نشان زدہ حسین گھوڑے) الانعام (مویشیاں) الحرات (کھیتی باڑی)

تو جہاں ان کا ذکر ہے۔ وہیں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اخیر کی طالب انسان کی ہلوعی فطرت دنیا کے اس محدود سرمایہ اور قلیل متاع سے تشفی یافتہ نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ آل عمران کی اسی آیت کے بعد ارشاد ہے

قل اذنبکم بخیر من ذلکم
للذین اتقوا عند ربهم جنات

بولئے کیا خبر دوں تمہیں اس چیز کی جو بہتر
اور خیر ہے اس سے (وہ چیز ہے) یعنی

تجرى من تحتها الانهار خالد بن
 فيها وزواج مطهرة ورضوان
 من الله والله بصير بالعباد -
 (آل عمران ع ۱ پارہ ۳)
 جنہوں نے پارسائی اختیار کی، ان کے
 مالک کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے
 نہریں جاری ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہیں
 (ان باغوں میں وہ) اور (تمام عیوب و

نقص سے صاف و پاک جوڑے، اور اللہ کی رضامندی، اور اللہ اپنے بندوں کا مینا ہے۔
 انسانی فطرت کے لئے حقیقی الخیر دراصل وہی "رضوان من اللہ" یا "اللہ کی رضامندی" ہے، یعنی
 لامحدود قدرت و طاقت والے کا انسانی فطرت کے لامحدود احساسات اور خواہشوں کے ساتھ کامل موافقت
 و تطابق تام، اسی کا نام "رضوان من اللہ" یا خدا کا راضی ہو جانا ہے، اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ
 میں یوں بھی کی گئی ہے۔

لکم فیہا ما تشتہی أنفسکم و
 لکم فیہا ما قدعون -
 (الخیر والی اس زندگی میں) تمہارے لئے
 وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو گے اور وہ سب
 کچھ جو تم مانگو گے، (کہ لامحدود قوتوں اور قدرتوں والا، لامحدود طلب رکھنے والے سے راضی
 ہو چکا ہے، پس اب یہ جو چاہے گا، وہ اسی کو پورا کرے گا)

الجنات، ازواج مطہرات، یا اسی قسم کی اور چیزیں دراصل اسی اجمال کی بعض تفصیلی تمثیلی شکلیں
 ہیں، بلکہ حب الشہوات والی آیت کے بعد الخیر کی جن جن شکلوں کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے، بہ ظاہر اس کا مطلب
 یہی ہے کہ موجودہ زندگی میں انسانی فطرت کے اندر لامحدود تمناؤں کی جو بھٹی جوڑی گئی ہے، اور محدود
 شکلوں میں بعض آرزوئیں یہاں آدمی کی جو پوری ہو جاتی ہیں، تو غرض اس سے یہی ہے کہ آئندہ کی
 لامحدود طلب کا جذبہ آدمی میں پیدا ہو، پیاس بھی ہے اور پیاس سے کو پانی کے چند گھونٹ پلا بھی دیئے گئے
 ہیں، پینے کی اس لذت سے مانوس ہونے، بلکہ پیاس کے بھڑک اٹھنے کے بعد اس وقت تک جب تک
 اس پیاس کی کامل تسکین کا سامان نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ پیاس سے کو نہ قرار مل سکتا ہے اور نہ اسے
 ملنا چاہئے۔ پس آرزوؤں اور تمناؤں کے گلا گھوٹنے کی راہبانا نہ جو گیا نہ تدبیریں فطرت کے قانون سے
 جیسا کہ گذر چکا کھلا ہوا مقابلہ ہے۔ صحیح راہ یہی ہے کہ بجائے دبانے اور بچھانے کے ان آرزوؤں کو صحیح
 رُخ پر لگانے کی کوشش کی جائے، جس کی عملی صورت یہی ہے، اور یہی ہو بھی سکتی ہے کہ اپنی نہ ختم ہونے
 والی لامحدود تمناؤں اور آرزوؤں کے متعلق ایک طرف تو یہ قطعی فیصلہ کر لینا چاہیے کہ متاع الدنیا کے
 محدود سرمایہ سے ان کی تسکین ناممکن ہے، اور دوسری طرف نکل جانا چاہیے۔ آدمی کو اس قوت و قدرت
 کے لار وال سرچشمہ کی تلاش میں جس کی لامحدود دیت کی شہادت کا سناتی حقائق کا ذرہ ذرہ اپنے لامحدود
 کمالات کے مظاہرہ سے ادا کر رہا ہے۔

دل من مسافر من کہ خداش یار بادا،
 قرآن ہی میں ایک موقع پر الآخرة کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے پہلے تو یہ فرمایا گیا کہ

یعنی (الآخرۃ کی ہمیشتی اور فردوسی زندگی)

لا یبغون عنها حولا -

سے لوگ منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔

اسی کے بعد مشہور آیت ہے

قل لو کان البحر مداداً

لکلمات سراجی لنفد البحر

قبل ان تنفد کلمات ربی ولو

جئنا بمثلہ مداداً

بتادو کہ اگر سمندر بھی روشنائی بن جائے

میرے رب کے کلمات (کے لکھنے کے لئے)

تو سمندر (کا پانی) تھر جائے گا، قبل اس

کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگرچہ

ہم اس سمندر کے مانند دوسرے سمندر کو بھی لائیں۔

پڑھنے والے پڑھتے ہیں، لیکن مقدم الذکر اور مؤخر الذکر دونوں آیتوں میں ربط کیا ہے، شاید اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، حالانکہ یہاں بھی اسی مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے میں بیان کر رہا ہوں، مطلب یہ ہے کہ فردوسی زندگی سے لوگ منتقل اسی لئے ہونا نہیں چاہیں گے کہ اُس زندگی میں لامحدود کمالات رکھنے والی ذات اپنے ان ہی لامحدود کمالات کو لامحدود کلمات کے ذریعہ سے ظاہر کرتی رہے گی، انسانی احساسات اپنے ارد گرد، پس و پیش، اندر و باہر ہر لمحہ، ہر لحظہ ایسے نت نئے تجلیات کو مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پاتے چلے جائیں گے، جن کی نہ کوئی حد ہوگی نہ انتہا، اوریوں لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطالبات سے متمتع اور لذت گیر ہونے کا موقعہ ابد الابد تک ملتا جائے گا، اس وقت تک جس کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا کوئی اختتامی نقطہ نہیں ہے اوریوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسان کی جدت پسند فطرت نوبہ نوشکلوں میں اپنے اس جذبے کی تسکین کا سامان حاصل کرتی چلی جائے گی، گویا یہ

ہر لحظہ جمال خود نوع دگر آرائی شور دگر انگیزی، شوق دگر افسرائی

کا ایک نہ ختم ہونے والا تماشا ہوگا، عجیب تماشا!! اور یہ سب دراصل ”رضوان من اللہ“ کے حصول میں کامیابی ہی کی تفصیلات ہوں گی جو ”مفلحون“ (کامیاب ہونے والوں) کے سامنے لامحدود شکلوں میں پیش ہوتے رہیں گے۔ پس یہ ہے ہلو عیبت یا اس جذبہ کی شدت کے امالہ کی صحیح تدبیر جو الخیر کے حب و طلب کے متعلق آدم زادوں کی فطرت میں قصد و ارادۃ ان ہی اغراض کی تکمیل کے لئے ودیعت کی گئی ہے، یہی اس کی صحیح قیمت، اور یہی اس جذبہ کا صحیح استعمال ہے واللہ یہ مدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

معاشی مشکلات کے بنیادی اسباب کی آخری چیز رزقی مدارج و مراتب کا وہ اختلاف رہ جاتا ہے، جو افراد انسانی کے کمالاتی و صفاتی تفاوت کا قدرتی نتیجہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ

۱۔ کلمات کلمہ کی جمع ہے یہ قرآن کی اصطلاح ہے تخلیقی کاروبار جس ذریعہ سے انجام پاتا ہے، اُسی کا نام کلمہ یعنی بات بھی ہے، اور اسی کلمہ یا بات کو قرآن نے کبھی ”کُن“ کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے ۱۲

کوفت اور دکھ کے اس احساس کا بجائے مادی حالات و واقعات کے زیادہ تر اس کا تعلق انسان کے نفسیاتی کیفیات سے ہے، مثلاً ہم اسے یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد آدمیوں کی جو آج پائی جا رہی ہے، اگر صورت حال یہ نہ ہوتی، بلکہ کسی فرد واحد میں نوع انسانی کا ظہور منحصر و محدود ہو کر رہ جاتا، یعنی دنیا میں تنہا ایک ہی آدمی آگر پیدا ہوتا، اور اسی حال میں یہاں رکھا جاتا جس حال کو ہم غربت و فلاکت کی انتہائی شکل اس وقت قرار دے رہے ہیں، مثلاً غریبی حرارت جن بدنی اجزاء کو فنا کرتی رہتی ہے، صرف ان ہی تحلیل یافتہ اجزاء کا بدل جس قسم کی خوراک اور خوراک کی جس مقدار سے مہیا ہو سکتا ہو، اس سے زیادہ کھانے کے لئے اسے کچھ نہ ملتا۔ اسی طرح موسمی حالات گرمی و سردی سے مقابلہ کرنے کے لئے اس کے پاس بس اتنا ہی سامان ہوتا جس سے صرف جان کا جسم سے تعلق باقی رہ سکتا ہو، ظاہر ہے کہ معاشی ذرائع کا یہ وہ پیمانہ ہے جس سے ہر وہ شخص مستفید و متمتع ہو رہا ہے جسے اس دنیا میں جینے کا موقع مل رہا ہے، بلکہ جینے کا موقع ملتا ہی اس وجہ سے ہے کہ ان چیزوں سے وہ مستفید و متمتع ہو رہا ہے خود سوچئے کہ غربت کے ان حالات کے ساتھ اگر آدمی دوسروں کے ساتھ نہیں بلکہ اکیلا تنہا اس زمین پر آتا تو آج مدارج کے اختلاف کی وجہ سے پست زندگی والوں میں کوفت کی کیفیت بلند معیار والوں کی زندگیوں کو دیکھ دیکھ کر جو پیدا ہو رہی ہے۔ کیا پیدا ہو سکتی تھی؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ سارا کوفت اور ذہنی دکھ محض اس پیمائش کا نتیجہ ہے جو ہم ایک کی دوسرے کے مقابلے میں کرنا چاہتے ہیں، پیمائش کے اسی عمل کے بعد ہم میں کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا ہو جاتا ہے، اور اسی کے بعد چھوٹوں میں بڑوں کو دیکھ کر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اس حال میں قطعاً پیدا نہ ہوتی اور نہ ہو سکتی تھی، جب پیمائش کا میدان ہی ہمارے سامنے نہ ہوتا۔

مطلب یہی ہوا کہ کوفت و قلق کی یہ کیفیت صرف اصنافی انتسابات کا ایک ذہنی اثر و اثر ہے، فی نفسہ واقعات سے اس کا بہت کم تعلق ہے۔

آخریوں بھی تو غور کیجئے کہ طبعی عمر (مثلاً ساٹھ ستر سال) کی عمر تک پہنچنے کا موقع ہم میں جب امیروں ہی کو نہیں، غریبوں کو بھی مل رہا ہے، اسی طرح طبعی عمر سے پہلے مر جانے کا حادثہ اگر غریبوں کے ساتھ پیش آتا ہے تو امیروں میں بھی اس کی نظیروں کی کمی نہیں ہے، عمر کی جس جس منزل میں ناگہانی اموات سے غریبوں کو کبھی کبھی دوچار ہونا پڑتا ہے، یقیناً ان ہی منزلوں پر امیروں کی لاشیں بھی آپ کو بہ کثرت نظر آ سکتی ہیں، ایک دن بلکہ ایک گھنٹہ کی زندگی سے سو ستو سال تک زندہ رہنے کے نظائر و امثال دونوں طبقوں میں برابر اور مسلسل ہر قوم ہر ملک ہر آبادی میں ڈھونڈھنے والوں کو ملتے چلے جاسکتے ہیں، جس کا مطلب یہی ہوا کہ شکل و صورت، رنگ و بو، ذائقہ و مزہ وغیرہ کے اعتبار سے باہر کا حال کچھ ہی کیوں نہ ہو، مگر آنکھ ہو، یا کان، جگر ہو یا پھیپڑا، الغرض رئیسہ اعضا ہوں، یا مرد و سہ حرارت غریبی فنا ہونے والے اجزاء کا بدل جب غریبوں کے لئے بھی یہاں مہیا ہو رہا ہے اور امیروں کے لئے بھی، تو والد و تناسل کا کام جیسے امیروں میں جاری ہے، غریبوں میں بھی یہ قصہ رکا ہوا نہیں ہے، حتیٰ کہ چوبیس گھنٹوں میں مسرت و خوشی کے جتنے اوقات امیروں کو ملتے ہیں، جھوٹ بات ہوگی، اگر سمجھا جائے کہ غریبوں کی خوشی و مسرت کے اوقات ان سے کم ہوتے ہیں، غم و الم، فکر و تردد کی

جتنی گھڑیاں غریبوں کی ہوتی ہیں، یہ واقعات کا انکار ہوگا، اگر کہنے والا یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ امیروں کے چوبیس گھنٹوں میں غم کی گھڑیوں کا واسطہ ان سے کم ہے۔ پس واقعاتی نقطہ نظر سے جس پہلو سے بھی دیکھا جائے آخری نتائج کے لحاظ سے رزقی مدارج و مراتب کے ان اختلافات کا درحقیقت زندگی کے ٹھوس حالات و کیفیات سے چنداں تعلق نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر اضافی انتسابات یا پیمائشی تصورات سے آدمی خود بخود اس کو فتنہ خریدتا ہے، ناپنے کے عارضہ کو ترک کر کے تجربہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد بھی اس وہی دکھ کا کاٹھا آدمی کے دل میں کیا باقی رہتا ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ یہی آدمی دوسروں کے جامہ دار اور حسرت کی شیر و انیاں دیکھ دیکھ کر اپنی کھادی کی قمیص پر جب ٹھوسے بہانے لگتا ہے، تو طاؤس کے قدرتی خلعت رنگا و عیار بوقلموں کو دیکھ کر وہ کیوں نہیں جلتا، موٹروں پر پھرنے والوں کی سواریاں جس طرح پیادہ یا جوتیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے والوں کو حسد کے شعلوں میں جھلساتی رہتی ہیں، یہی جلنے والے، کڑھنے والے آخر چوڑیاں بھرنے والے ہر نوں اور چھلانگ مار کر جست کرنے والے میروں کو دیکھ دیکھ کر کیوں نہیں جلتے کیوں نہیں کڑھتے۔ ان ہی کے سامنے تو گدھوں اور چیلوں کو فضا آسمانی میں تیرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے خاک اور دھول سے قطعاً بے تعلق ہو کر صاف ستھری سطح ہوا میں ان پرندوں کی سیر کا یہ تماشا ان کے سینوں کا بوجھ کیوں نہیں بنتا، یہ نظارے اپنی چھاتیوں کے پیٹنے پر اٹھیں کیوں مضطرب و مجبور نہیں کرتے، حالاں کہ یہ کمالات حیوانی طبقات کے ایسے کمالات ہیں جہاں تک ہزار ہا سال کی کدو کوشش کے باوجود بھی جیسا کہ گذر چکا انسانوں میں امیروں کا طبقہ بھی نہیں پہنچ سکا ہے تا بغیر بارہ چہرہ رسد۔

زندگی کی کسی ایسی کمالی سہولت سے محرومی جو کسی دوسرے کو میسر ہو، اگر محرومی کا صرف یہی واقعہ مدارج و مراتب کے اختلاف سے پیدا ہونے والی کوفت کا سبب ہوتا تو مذکورہ بالا تمام صورتوں میں یہی بات پائی جا رہی ہے، لیکن اس واقعہ کے باوجود (محض اس لئے کہ) جن دوسروں کو یہ کمالات میسر ہیں۔ وہ ہمارے ابتائے جنس سے تعلق نہیں رکھتے، یعنی وہ آدمی نہیں طاؤس ہیں، درندے ہیں، چمڑے ہیں، پرندے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ فرق قطعاً ایک غیر منطقی فرق ہے، دوسرا کوئی ہو۔ وہ بہر حال دوسرا ہی ہے، خواہ اس کی شکل آدمیوں کی سی نہ ہو، پس غیر انسانی شکل و صورت رکھنے والے دوسروں کے متعلق کمالات و صفاتی تفاوت کے اس اختلاف کو ہم جب مہنسی خوشی کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں، اور برداشت کے لفظ کا اطلاق تو اس وقت صحیح ہو سکتا تھا کہ ان دوسروں کے کمالات کے مقابلہ میں اپنی بے کمالی یا ان کمالات سے محرومی کا ہمیں احساس بھی ہوتا، سوا احساس کیا معنی، یہ واقعہ ہے کہ ہم انسانوں میں کسی کے اندر اپنی اس محرومی کا خطرہ بھی تو پیدا نہیں ہوتا، ایک طے شدہ فیصلہ کی شکل میں ہم بھی گذر رہے ہیں، وہ بھی گذر رہے ہیں، اپنے حالات میں ہم بھی مگن ہیں، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ دوسرے بھی ہم سے اور ہمارے صفات و کمالات سے بے تعلق ہو کر اپنے اپنے حال میں سب مست ہیں۔

بہر حال دوسروں کو طا اور ہم محروم ہیں، مطلقاً اس کا گلہ تو کسی میں نہیں پایا جاتا، اور جو چیز پائی جا رہی ہے۔ وہ ایک حد تک اس کے برعکس ہے۔ یعنی جن دوسروں کے متعلق اپنے ہونے کا خیال آدمی

قائم کر لیتا ہے، جس حد تک "اپنا سیت" کا یہ تعلق قریب تر ہوتا جاتا ہے، کمی و بیشی، ترجیح و تفضیل کی شکایت و حکایت اسی نسبت سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان ہی کے کمالات و صفات کو دیکھ دیکھ کر آدمی زیادہ کڑھتا اور جلتا ہے، جنہیں وہ اپنی ذات سے زیادہ قریب پاتا ہے جس کی طرف میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے!

یہ ساری علامتیں کس بات کی ہیں؟ اسی حقیقت کی کہ مدارج و مراتب کے اختلاف کی جانب جن بے چینیوں دکھوں اور تکلیفوں کو منسوب کر کر کے دنیا میں آج ہنگامے برپا کئے جا رہے ہیں، منہ ر ضی من گھڑت، یک طرفہ داستانیں بنا بنا کر عصبی امراض کے بیماروں کو ہول دل میں لوگ مبتلا کر رہے ہیں۔ یک چشمی شعراء میدانوں میں اتر پڑے ہیں، ان کی شاعری مبالغہ اور اغراق، غلو و افراط کے انتہائی نمونوں کو پیش کر کر کے ان مسکینوں کو جو صرف دوسروں کی اگلی ہوئی باتوں کی جگالی کر سکتے ہیں، یعنی بد ملغ خود و عقل خویش جو کچھ سوچ نہیں سکتے، ان ہی بیچاروں کو آئہ کار کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں، یہ اور اس قسم کے سارے عصری مہیمات جن سے کام لینے والے اس زمانہ میں کام لے رہے ہیں، بجائے واقعات کے حقیقت میں نگاہوں میں ان کا زیادہ تر تعلق ذہنی احساسات اور وہی تاثرات سے ہے، کیسی عجیب بات ہے کہ دوسروں کے ساتھ قدرت کے ترجیحی سلوک اور برتاؤ کا مشاہدہ تو ہم سارے جذبات میں کسی قسم کی کوئی جنبش نہیں پیدا کرتا، یعنی وہی قدرتی کمالات جو پرندوں کو درندوں کو درندوں کو عطا ہوئے ہیں اور نوع انسانی کے افراد ان سے محروم ہیں، جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے ان ترجیحی کمالات کی فہرست مختصر نہیں ہے مگر احتجاج و اعتراض تو کجا، سچ پوچھئے تو کسی کی ان پر نظر بھی نہیں پڑتی، اس کا خطرہ بھی نہیں گذرتا کہ جن کمالات و صفات سے ہمیں محروم رکھا گیا ہے، دوسروں کو ان ہی سے کیوں سرفراز کیا گیا ہے۔ لیکن بجائے ان کے اگر خود ہمارے اپنا جنس کے ساتھ قدرت اسی قسم کا کوئی ترجیحی سلوک کرتی ہے تو ہم اپنے بال نوچنے لگتے ہیں، چھاتیاں پیٹتے ہیں، اور اب تو اس سے بھی آگے بڑھ کر ہمیں دوسروں کو نوچنے کھسوٹنے پر بھی اکسانے والے اکسارے ہیں۔ لوٹ و کھسوٹ کی ان حرکتوں ہی کو جائز قانونی افعال کی حیثیت چاہا جا رہا ہے کہ دے دیا جائے بلکہ بعض ممالک میں دیا جا چکا ہے، حالانکہ بجائے اپنوں کے دوسروں کے ساتھ قدرت کا یہ معاملہ ہمارے غیظ و غضب کے جذبات کا نشانہ بننے کا زیادہ مستحق اور زیادہ صلاحیت رکھتا تھا، آخر اپنوں کے کمالات و فضائل کو تو ایک حد تک ہم اپنی طرف منسوب کر کے گونہ تسلی بھی حاصل کر سکتے ہیں، ہمیں اگر کوئی چیز میسر نہ آسکی تو یہی کیا کم ہے کہ ہمارے بھائی کو اس سے استفادہ کا موقعہ عطا کیا گیا ہے، ہم اگر پیدل چلنے پر مجبور ہیں تو ہماری تشکین کے لئے یہی امتساب کافی ہو سکتا تھا کہ ہماری انسانی برادری کے کسی فرد کو موٹر اور ہوائی جہاز پر سیر کرنے کی صورت فراہم ہو گئی ہے، چیلوں اور کرگسوں کی فضائی سیر کے مقابلہ میں اسی سیر کا کسی انسان کو میرا جانا چاہیے تھا کہ ہماری بے شامت اور مسرت کا باعث ہوتا۔ واقعہ کا تقاضا اگر کچھ ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا۔

لیکن اس عقلی فیصلہ کے خلاف نتائج و آثار کا ظہور جب اس کے برخلاف معکوس شکلوں میں ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں اس کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ باہم افراد انسانی میں ترجیحی سلوک و مدارج و

اسلامی معاشیات
مراتب کے اختلاف کو دیکھ کر غم و غصے کی جواہریں دلوں میں پیدا ہو رہی ہیں، یہ عقل کا نہیں، وہم کا،
اور صحیح منطقی فکر کا نہیں بلکہ مغالطوں اور صرف مغالطوں کی کرشمہ پرداز یوں کا نتیجہ ہے، میں تو سمجھتا
ہوں کہ آیت قرآنی

ولا تسموا ما فضل الله به بعضکم علی بعض۔
اور نہ آرزو کیا کرو ان چیزوں کی جن کی وجہ

برتری بخشی ہے خدا نے بعض کو تم میں بعض پر۔

میں جہاں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ بعض کی بعض پر برتری خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں، وہیں برتری
اور ترجیحی سلوک کے ان قصوں میں آرزو آفرینیوں سے حق تعالیٰ نے منع فرما کر یہی چاہا ہے کہ پائشی مغالطوں
سے پیدا ہونے والے خواہ مخواہ کی اس غیر ضروری کوفت سے مسلمانوں کو نجات عطا فرمائی جائے، حاصل
یہی ہے کہ اپنی اپنی واقعی ضرورتوں، اور حاجتوں کی حد تک سوچنا اور اسی کے مطابق جدوجہد کرنا یہ اور
بات ہے، اور فیتے لگا لگا کر اپنے آپ کو دوسروں سے ناپ ناپ کر بیٹھے بٹھائے لوگ جو غم نزاری پر بھر
کے عارضہ میں خود اپنے ہی ہاتھوں مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ قطعاً دوسری چیز ہے، سعی و عمل کے تو ہم مکلف
ہیں، اسلام میں اس کی جواہریت ہے آغاز بحث میں اس کی تفصیل گزر چکی، لیکن ناپا ناپی کے ان قصوں
میں مبتلا ہو کر لوگ جو ہانپ رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، اور اسی کا نام انھوں نے دنیاوی فکری اور
معاشی تردد رکھ چھوڑا ہے، کسب معاش کی سٹھوس، مادی ضرورتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہر
یہ ایک خود ساختہ غم، خود پرداختہ الم ہے جس میں اپنی سبک مغزی کی وجہ سے وہی مبتلا ہو جاتے ہیں،
جن میں زندگی کے واقعی اور غیر واقعی حقیقتوں میں تمیز کا سلیقہ نہیں ہوتا،

خلاصہ یہ ہے کہ مدارج و مراتب کے اختلاف کے جس قصہ کو آج اتنی بلند آہنگیوں سے جوا چھالا
گیا ہے، اتنا شور برپا کیا گیا ہے کہ زمین کا پینے لگی ہے، آسمان تھرا رہا ہے، اور اسی کو معاشی گتھیوں میں
سب سے زیادہ ”انجھی ہوئی گتھی“ قرار دے دے کر اس کے سلجھانے میں ایٹمی سے چوٹی تک کا زور
لگایا جا رہا ہے، اور ایک سلجھی ہوئی صاف بات کو خواہ مخواہ ابجھا کر خود بھی لوگ الجھ رہے ہیں،
دوسروں کو بھی الجھا رہے ہیں۔ ایک خود آفریدہ پھندے کے کھولنے کے لئے بلاوجہ پھندوں پر پھندوں کا
اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک سیدھی بات کو بیسیوں الٹی تدبیروں سے الٹ رہے ہیں سینکڑوں
بلکہ سچ یہ ہے کہ لاکھوں لاکھ سال کے تجربات نے نسل انسانی کو زندگی کے جن سٹھوس نتیجوں تک پہنچایا
تھا، اسی لا حاصل سعی کے درپے ہو کر بیک گردن قلم سب کو غلط اور مہمل ٹھیرا دیا گیا، جو آسمان تھا اسے
زمین اور جو زمین تھی اسے آسمان بنا دیا گیا، ایک فرضی زخم کو اچھا کرنے کے لئے نئے آپریشنوں سے
معاثرہ کے جسد کو چھلنی کر دیا گیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں، منطقی تجزیہ و تحلیل کی معمولی کارروائی کے بعد
ان ساری مغزی شورشوں کی تہ میں چند دور انداز کار اوہام بے معنی، اور بے بنیاد وساوس کے
سوا کیا اور بھی کچھ نکلا؟

زیادہ سے زیادہ کہنے والے اس سلسلہ میں اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ مدارج

مراتب کے ان اختلافات سے جس اندرونی کوفت کو آدمی محسوس کرتا ہے، مان لیا جائے کہ واقعی نقطہ نظر سے اس کی تہہ میں کچھ نہ ہو، لیکن اتنا تو بہر حال تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اپنے اپنے جنس کی بلندیوں اور برتریوں کو دیکھ دیکھ کر یستیوں میں زندگی گزارنے والوں کے دلوں میں بجا ہو، یا بے جا، بلا وجہ ہو، یا با وجہ، لیکن کوفت اور غلش پیدا ضرور ہوتی ہے، کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اسے جانے دیجئے، لیکن جب پیدا ہوتی ہے، ہوتی رہتی ہے تو ایسی صورت میں یہی سمجھا جائے گا کہ بنانے والے نے انسان کی فطرت کو بنایا ہی ہے اس نہج اور اقتاد پر، کہ غیروں کی نہیں بلکہ اپنوں کی اپنے بنائے جنس کی برتریاں اس سے دیکھی نہیں جاتیں۔ ”ایپنائٹ“ کا یہ رشتہ جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے، کوفت کے اس احساس کی شدت بھی اسی نسبت سے تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے جس لئے ہوتی ہے، وہ واقعہ نہ ہو، لیکن بجائے خود یہ کوفت انسانی فطرت کا تو ایک واقعہ ناقابل انکار واقعہ ہے۔ منطوق لاکھ ثابت کرتی رہے کہ تڑپنے والوں کی یہ تڑپ بے معنی ہے۔ غیروں کی نہیں بلکہ اپنوں کی خوش حالیوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے مسرور ہونے کے بد حال ہونا بد عقلی کی بات ہی سفہا نہ فعل ہے، فرومایگی، اور انتہائی کمینہ حرکت ہے، یہ حسد ہے، حسد کا وہ پتھر ہے جو بجائے محسود کے پلٹ کر حاسد ہی کے سر کو لہو لہان اور اسی کی کھوپڑی کو چکنا چور کرتا ہے، اپنی سلگائی ہوئی آگ میں حاسد کو خود ہی جھلسنا اور جلنا پڑتا ہے۔

مگر سب کچھ سن لینے، سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی دیکھا یہی جاتا ہے کہ بستی و بلندی و فراز و نشیب کے اس تماشے سے آدمی کی فطرت عموماً وہی اثر لیتی ہے جسے عقلاً و اخلاقاً نہ لینا چاہئے تھا، فطری جذبے کا زور عقلی پسند ناموں کے اوراق کو اڑا اڑا کر تر بتر کر کے رکھ دیتا ہے سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی پالنے والے اپنے اندر جب پاتے ہیں تو کوفت کی اسی کیفیت کو پاتے ہیں، جسے چاہئے تھا کہ وہی پاتے جنھوں نے نہیں سمجھا ہے۔

یقیناً یہ سوال ہے، ایسا سوال ہے جو توجہ کا مستحق ہے۔ اس سے بے اعتنائی درحقیقت انسانی فطرت کے ایک واقعہ سے بے اعتنائی ہوگی۔ کم از کم قرآن کا جو طرز عمل اس باب میں ہے اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے، بلاشبہ اس نے ان ترجیحی سلوکوں کے متعلق ”فیتہ بازی“ کی بدعات سے جیسا کہ ابھی گذرا روکا ہے، لیکن دوسروں کی بلندیوں کو دیکھ کر بستی میں رہنے والوں کے اندر ان بلندیوں کی آرزو کا پیدا ہونا، اس آرزو کی نہ پوری ہونے کی صورت میں آدمی کا جھنجھلانا اور گڑگڑانا، قلق اور بے چینی میں مبتلا ہونا۔ چوں کہ یہ بھی انسانی جبلت کا اقتضا ہے، ایسا اقتضا جسے جبلت سے نکالا نہیں جاسکتا، ابھی پیغمبر کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹایا جاسکتا ہے۔ لیکن جبلت میں جو کچھ ہے اسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ اور یہی راز ہے کہ بجائے ازالہ کی فضول کوشش کے ازالہ کی اسی پرانی ترکیب سے اسلام نے اس مسئلہ میں بھی کام لیا ہے۔ اور اسی کا ذکر اس مقام پر میرا اصل مقصود ہے۔

مختلف طریقوں سے یہ سمجھاتا چلا آ رہا ہوں کہ انسانی معاشرہ میں مدارج و مراتب کا اختلاف حقیقت افراد کے صفاتی و کمالاتی تفاوت کا ایک ناگزیر نتیجہ ہے، اب یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں، اور قرآن ہی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے۔ ضمناً پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ مدارج و مراتب کے اس اختلاف کا ایک سلسلہ تو وہ ہے، جس کا تعلق زندگی کے غیر معاشی شعبوں سے ہے۔ مثلاً ہم میں کسی کا حسین ہونا، کسی کا زشت رو، کریمہ المنظر ہونا، کسی کی طبیعت کا لگاؤ شعر شاعری سے ہے، اور دوسرا ریاضی و حساب کی باریکیوں سے دلچسپی رکھتا ہے، کوئی ہم میں صنعت و حرفت کا دلدادہ ہے اسی میں اس کا جی لگتا ہے، اور کسی کو مابعد الطبیعیاتی مسائل و کلیات کے سلجھانے میں مزہ ملتا ہے، ترجیح و تفضیل یا قرآنی الفاظ میں فضلنا بعضهم علی بعض کے اس سلسلہ کے تفضیلات لامحدود ہیں۔

اسی کے مقابلہ میں ترجیح و تفضیل، برتری و کمتری، بلندی و پستی کا دوسرا مستقل سلسلہ وہ ہے جس کا تعلق زندگی کے خاص معاشی حالات سے ہے، قرآنی اصطلاح میں یوں کہیے کہ الرزق کے لحاظ سے انسانوں کے بعض افراد کو بعض پر جو برتری و فضیلت بخشی گئی ہے۔ نتیجتاً جس کی وجہ سے ہم میں بعض فراخی و فراغت کی حالت میں نظر آتے ہیں، قرآن میں جس کی تعبیر بسط سے کی گئی ہے۔ اور بعض لوگ ضیق معاش اور تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں، قرآن نے رزق کی اسی حالت اور کیفیت کا نام قدر رکھا ہے۔ بسط و قدر کی قرآنی اصطلاح کی تشریح | بات یہ ہے کہ الرزق یا روزی بعضوں کو تو بقدر ضرورت ملتی ہے، بالفاظ دیگر جن کا دخل بہ مقدار خرچ اور آمدنی بالکل ٹھیک ضرورت کے مطابق پنی ملی حالت میں اس طور پر ہوتی ہے کہ ضرورت میں خرچ ہونے کے بعد بچ کر کوئی پس انداز سرمایہ انھیں ہاتھ نہیں آتا۔ لغت میں قدر کا یہی مفہوم ہے، یعنی واقع میں جو چیز جیسی ہو، ٹھیک اسی کے مطابق اندازہ قائم کرنا یہی قدر کے لغوی معنی ہیں، اور اسی لغوی معنی کو پیش نظر رکھ کر ایسی آمدنی جو بالکل خرچ کے برابر برابر، ایک دم بالکلیہ اس کے مطابق ہو، اسی کا نام رزق مقدور ہے۔ یعنی ضرورت کے مطابق پنی ملی روزی، اور اسی رزق مقدور کے مقابلہ میں بعضوں کی آمدنی کا پیمانہ ایسا ہوتا ہے کہ ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد بھی ان کے پاس بچ رہتا ہے۔ رزق کے اسی پیمانے کا نام بسطی پیمانہ ہے۔ اور جو رزق اس پیمانہ پر ملتا ہے، اس کا نام رزق بسوط ہے۔ کیونکہ بسط کے معنی پھیلاؤ کے ہیں۔ گویا آمدنی کی یہ ایک ایسی شکل ہے جس کا دامن خرچ کے حدود سے وسیع اور آگے نکل کر پھیلا ہوا ہے۔

بہر حال مدارج و مراتب کے اعتبار سے ترجیح و تفضیل کی یہ دو مستقل صورتیں ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کم و بیش ہر دو حالات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جنہیں برتری عطا کی جاتی ہے، ان کو دیکھ دیکھ کر نہ پالنے والوں اور محروم رہ جانے والوں میں ترجیح و تفضیل کی ان دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی حد تک اپنی محرومی کا احساس عموماً پیدا ہوتا ہے، اور یہی احساس سوز اور کوفت کی شکل بھی بسا اوقات اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جہاں تک تجربہ اور مشاہدہ کا تعلق ہے۔ خاص معاشی شعبہ میں بعضوں کی بعضوں پر برتری، یعنی الرزق کے لحاظ سے کسی کا بسط کی حالت میں ہونا اور کسی کا قدر کی حالت میں ہونا قدر والوں کیلئے زیادہ جانگزا

اور سوہان روح کا زیادہ سبب بن جاتا ہے۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ گو ضرورت تو امالہ کی ترکیب کی ترجیح و برتری کی دونوں صورتوں میں ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے قرآن نے اس مسئلہ میں جتنی توجہ معاشی شعبہ کی طرف امالہ کی تدبیروں میں کی ہے، اتنی توجہ غیر معاشی سلسلہ کی طرف نہیں کی گئی ہے، اور ہے بھی یہی بات کہ اس شعبہ میں مدارج و مراتب کے اختلاف اور اس کے نتائج کے آثار کو جتنی اہمیت ہر زمانہ میں حاصل رہی ہے۔ اتنی اہمیت اسی اختلاف کے دوسرے ابواب کو شاید کبھی نہیں دی گئی، اس زمانے میں بجائے امالہ کے تفاوت و اختلاف کے اس قصہ کے ازالہ یا بالکل ختم کر دینے پر جو زور دیا جا رہا ہے، زیادہ تر اس کا تعلق بھی اسی تفاوت و اختلاف سے ہے جو رزق اور معاش کے لحاظ سے انسانی معاشرہ کے افراد میں پایا جاتا ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ امالہ کی ان ہی تدبیروں کو جو معاشی شعبہ کے اختلاف مراتب کے سلسلہ میں قرآن میں پائی جاتی ہیں، ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دوں۔

مطلب یہ ہے کہ معاشی لحاظ سے جو قدر و تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں، بسطی رزق و معاش رکھنے والوں کے لحاظ سے ان کے اندر شکوہ و شکایت غم و غصہ کے جو جذبات متلاطم ہوتے رہتے ہیں اگرچہ بظاہر ان کا تعلق ان ہی لوگوں سے معلوم ہوتا ہے، جو باوجود ان ہی جیسے انسان ہونے، ان ہی کے ہم مثل، ہم قوم بلکہ بسا اوقات ہم خاندان ہم چشم ہونے کے ایسی آمدنیوں سے متمتع ہوتے رہتے ہیں کہ خرچ کرنے کے بعد بھی ان کے پاس بچ رہتا ہے۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں غریب قدری رزق پانے والا بچائے گا تو کیا، بسا اوقات اپنی آمدنی کے منہ کو گزرنے والے سال یا مہینہ یا ہفتہ یا دن کے مصارف سے ملانے میں دشواری اور سخت دشواری محسوس کرتا ہے، اور یہی حال اسے ان اندرونی سوزشوں، اور فکری لکڑکڑیوں میں مبتلا رکھتا ہے، جن کا نام دنیا میں معاشی پریشانیوں و رزقی حیرانیاں ہیں، ایسی صورت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدری رزق والوں کے جذبات غیظ و غضب گلو حکایت شکوہ و شکایت کا ایک رخ اگرچہ بسطی رزق والوں ہی کی طرف ہوتا ہے، لیکن شعوری یا غیر شعوری دانستہ یا نادانستہ طور پر سب میں نہ سہی۔ لیکن اکثریت میں ایک رخ ان ہی جذبات کا محسوس یا نامحسوس شکلوں میں خود اس ذات کی طرف بھی کسی نہ کسی شکل میں ضرور رہتا ہے، جس کے متعلق آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اسی نے تقسیم رزق کے اس اختلاف کو قائم کر کے ہمیں ان حالات میں مبتلا کر دیا ہے، خواہ ادبایا اس خوف سے کہ قدری پیمانے پر بھی جو رزق مل رہا ہے، کہیں وہ بھی بند نہ ہو جائے زبانوں پر حرف شکایت نہ آتا ہو، بلکہ شکوہ و شکایت کی جگہ شکر و حمد ہی میں لوگوں کو کیوں مشغول نہ پایا جاتا ہو، بلکہ سچ یہ ہے کہ ذات حق جیسی بدیہی ہستی جس کے متعلق قرآن نے

۱۲ فی اللہ شک فاطر السموات

کیا اللہ میں شک ہے آسمانوں اور زمین

۱۲ الامراض۔ کے پیدا کرنے والے ہیں؟

کا استعجابی و استبعادی سوال شکوں سے اسی بدیہت اور کامل و صوح ہی کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ دراصل

شک کے یہ مدعی اگر غور کریں گے تو وہ پائیں گے کہ خدا سے ”روٹھ“ کی جو کیفیت کسی وجہ سے ان میں پیدا ہو گئی ہے۔ درحقیقت ”روٹھ“ کی اسی کیفیت کی غلط تعبیر وہ شک سے کر رہے ہیں، اور زیادہ تر بندوں میں اپنے خدا سے روٹھ کا یہ احساس جہاں تک میں نے دیکھا ہے ان ہی معاشی ترجیح و تفضیل کے قصوں ہی سے اس کے دامن کو بندھا پایا ہے۔ اندر ہی اندر لوگوں میں یہ یا اسی قسم کے وسوسوں کا بھپھارا اٹھتا رہتا ہے کہ آخر ہم بھی جب خدا ہی کے بندے ہیں تو ہمیں محروم رکھ کر یا ہمیں قدر کی حالت میں رکھ کر دوسروں کو بچائے قدر کے قانون بسط کے تحت کیوں دیا جا رہا ہے، خصوصاً شکایت کا احساس اس وقت ذرا زیادہ تیز ہو جاتا ہے، جب بسطیوں کے مقابلہ میں قدریوں کو اپنے اندر کسی کمال کے پائے جانے کا احساس غلط یا صحیح کسی طور پر پیدا ہو گیا ہو، کچھ بے دینی اور الحاد کے ان ہی دنوں میں نہیں جن سے دنیا آج گزر رہی ہے، بلکہ اُس زمانے میں بھی جس کا نام مذہبیت اور دینیت کا زمانہ ہے، کہنے والے یہ کہتے چلے آئے ہیں، بچپن میں ہم جب مختصر المعانی پڑھتے تھے تو عربی کے یہ دو شعر سن کر وہ سال پڑانے کسی عربی شاعر کے ہیں، پڑھایا گیا تھا۔

وجاہل غافل فی الارض موزوقا

کم عامل عالم اعیت مذہبہ

وصیر العالم التحسیر سر مندیقا

هذ الذی ترک لادھام حائرة

جس کا مطلب وہی ہے کہ ”کتنے علم و دانش عمل و کردار والوں کو زندگی کی راہوں نے تھکا تھکا مارا ہے اور کتنے نادان اُن پڑھ جاہل بے عمل غافلوں کو دیکھا جاتا ہے، جنہیں زمین پر روزی پہنچائی جا رہی ہے۔ یہی واقعہ ہے جس نے انسانی سمجھ کو حیرت میں ڈال رکھا ہے، اور بڑے بڑے جلیل فاضلوں کو اسی نے زندیق اور بے دین بنا کر چھوڑ دیا۔“ شاید اسی کا ترجمہ حافظؒ نے اپنے ان مشہور شعروں میں کیا ہے۔

قوت دانا ہم از خون جگر می بسیم

ابلہاں را ہم شربت ز گلاب و قدست

طوق زریں ہم در گردن خرمی بسیم

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان

ظاہر ہے کہ شاعر کا بہر حال یہ شعر ہی ہے جس کا بالکل یہ واقعہ کے مطابق ہونا ضروری نہیں، شاعری شاعری ہی کب باقی رہتی ہے۔ جب وہی کہا جائے جو ہے، آخر شاعر کا یہ دعویٰ کہ زمین پر صرف جاہلوں اور غافلوں ہی کو روزی پہنچائی جا رہی ہے۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ زندگی گزارنے والوں میں کوئی ایسا طبقہ بھی ہو جسے رزق سے بالکل محروم رکھا جاتا ہے۔ بھلا رزق سے محرومی کے بعد کوئی جی ہی کب سکتا ہے پس واقعہ تو یہی ہے کہ جو بھی یہاں جی رہے ہیں یا جن کو خدا کی اس زمین پر جتنے دن تک بھی جینے کا موقع عطا کیا جاتا ہے، اس وقت تک کے لئے الرزق کے جس مقدار کی حقیقی اور واقعی ضرورت ہے وہ تو سب ہی کو پہنچ رہی ہے۔ اگر وہ نہ پہنچتی تو شکوہ کرنے کے لئے شایکوں کا یہ گروہ جیتا ہی کیسے؟ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ رئیسہ اعضا ہوں یا مرؤسہ ہر ایک کے تحلیل یا ذہ اجزاء کا بدل سب ہی کے لئے مہیا ہو رہا ہے۔ مافات کی تلا فی کا عمل سب ہی میں جاری ہے۔ آنکھوں میں نور، دلوں میں شعور، بازوؤں میں زور تو سب ہی کے بھرا جا رہا ہے، فرق جو کچھ ہے وہ صرف باہر میں ہے۔ یعنی جن چیزوں سے توانائیوں کے یہ ذخیرے

مختلف افراد میں تقسیم ہو رہے ہیں، رنگ و بو، شکل و صورت، ذائقہ اور مزے کے لحاظ سے اختلاف اگر کچھ پایا جاتا ہے تو ان ہی بیرونی صفات میں پایا جاتا ہے۔ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ توانائیوں کے یہی ذخیرے کسی کے لئے پلاؤ فورے سے مثلاً مہیا ہو رہے ہیں اور کسی میں نان جویں اور نمک ہی سے سہی۔ لیکن ”باہر“ کی منزلوں کو طے کرنے کے بعد جب وہ اندر پہنچ جاتے ہیں تو پھر ان میں مشکل ہی سے امتیاز باقی رہتا ہے، امجد نے سچ کہا ہے ع پیٹ میں لقمہ تر، نان جویں یکساں ہے۔ سب ہی دیکھتے ہیں، سب ہی سنتے ہیں، سب ہی چلتے ہیں، پھرتے ہیں، الغرض جن توانائیوں کا ظہور ایک سے ہوتا ہے۔ ان ہی کا ظہور دوسرے سے بھی ہو رہا ہے، بلکہ قوت و طاقت کے مظاہر کی کثرت کن میں زیادہ پائی جاتی ہے، اگر یہ بحث چھیڑ دی جائے۔ تو شاید کچھ بات اس سے بھی آگے بڑھ سکتی ہے۔ لیکن اسی نقطہ پر بحث اگر ختم بھی کر دی جائے، جب بھی ہر حال میں شاعر کو جھٹلا کر قرآنی آیت

وَمِنْ دَآيَةِ الْاَعْلٰی اللّٰہ

اور نہیں ہے کوئی چلنے والا، مگر اس کی

روزی کی ذمہ داری خدا پر ہے۔

ساز قہا۔

کے مشاہدہ ہی کی تصدیق ہر اس شخص کو کر نی پڑتی ہے جو بجائے ”شعر“ کے واقعات کو واقعات ہی کے رنگ میں دیکھ رہا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس حد تک تو شاعر کا بیان اگرچہ شعر ہے، اس نے مبالغہ اور غلو کا رنگ جس واقعہ میں بھرا ہے، دراصل یہ ترجیحی اور تفضیلی سلوک ہی کا واقعہ ہے جو مختلف افراد انسانی میں پایا جا رہا ہے بسطیوں کو دیکھ کر قدریوں کو گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت کے وہ مرزوق ہی نہیں ہیں، باوجود پالنے اور بہت کچھ پالنے کے مقابلہ کے بعد گویا باور کرنے لگتے ہیں کہ انھوں نے کچھ نہیں پایا ہے۔ اور یہی چیز خدا اور خالق کے متعلق ان کے دلوں میں اعتراض و احتجاج کی اس کیفیت کو پیدا کرتی ہے جس کا نام میں نے ”روٹھ“ رکھا ہے۔ کمزور ا عصاب والے اپنی اسی روٹھ کو غیظ و غضب کی شدت میں جھٹلا کر کبھی کبھی ”شک“ بھی کہہ دیتے ہیں، یا ممکن ہے کہ شک کی صورت میں اس کیفیت کو بدل دیتے ہوں، لیکن لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں عام حالات میں اس کی ابتداء ہوتی ہے روٹھ ہی کی اس کیفیت سے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ شک نہیں بلکہ اپنے پیدا کرنے والے سے ایک قسم کا مخفی احتجاج اور غم و غصہ کی ایک مستور شکل ہوتی ہے۔ یہیں بھی وہی سب کچھ کیوں نہیں دیا گیا جو دوسروں کو دیا گیا، اگر وہ بھی آپ کے بندے ہیں تو ہم کیا کسی دوسرے کی مخلوق ہیں، مبہم غیر مبہم، واضح غیر واضح شکلوں میں اسی قسم کی بھنبھناہٹ، کڑکڑاہٹ لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وارستہ مزاج شاعر نے جو یہ کہا تھا ہے

زندگی اپنی کہ جس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

تو اس کی تہ میں آپ ہی بتائیے کہ شکایت کے اس باطنی احساس کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ البرزق یا معاشی لحاظ سے مدارج و مراتب کے اختلاف کی بنیاد پر قانون قدرت کے تحت روزی پالنے والوں میں غم و غصہ کی کیفیت ایک، تو ان لوگوں کے لحاظ سے پیدا ہوتی رہتی ہے جن کے

متعلق سمجھا جاتا ہے کہ بسطی پیمانہ پر رزق پارہے ہیں۔ ان ہی کو سامنے رکھ رکھ کر قدریوں کا یہ طبقہ اپنے آپ کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں کو مثلاً مکان، سواری، لباس، خوراک وغیرہ کو ناپتا رہتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اسی کے ساتھ دوسری طرف اسی احساس کا ایک رخ دانستہ یا نادانستہ گفتہ یا ناگفتہ شکلوں میں خود پیدا کرنے والے خالق کی طرف بھی ہوتا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ الرزق اور معاش میں یہ ترجیحی عمل اور فضلنا بعضہم علی بعض فی الرزق کا یہ متاثر بہر حال تقسیم رزق کے حُدا کی قانون ہی کا نتیجہ ہے۔ کم از کم جن قوموں میں کھل کر ابھی خدا کے انکار کی جرأت نہیں پیدا ہوئی ہے، ان کے اس احساس کا ایک رخ بہر حال خدا کی طرف بھی ضرور ہوتا ہے۔ اب خواہ ان تاثرات کا حقیقی مادی واقعات سے تعلق ہو یا نہ ہو، لیکن اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بالآخر ان احساسات کی انتہا انسان کی اسی جبلت، اور ان کی آخری تان ان ہی اقتضات پر ٹوٹتی ہے۔ یعنی پیدا کرنے والے نے جن پر انسان کو پیدا کیا ہے۔

اور جہاں تک میرا خیال ہے، یہی وجہ ہے اس بات کی کہ قرآن میں اس سلسلہ کے تاثرات و احساسات کے ان دونوں رخوں کے امالہ کی الگ الگ تدبیریں پائی جاتی ہیں، اور اب آپ کے سامنے امالہ کی ان ہی قرآنی تدبیروں کو دو الگ عنوانوں کے نیچے درج کرتا ہوں۔

پہلی صورت یعنی خود اپنے ابنائے جنس کے لحاظ سے غم و غصہ کی یہ کیفیت جو دلوں میں پائی جاتی ہے، اس کے رخ کو پلٹنے کے لئے میرے خیال کے مطابق فطرت انسانی کے ایک دوسرے جبلت اور فطری جذبے ہی کو ابھار کر قرآن نے امالہ کی صورت پیدا کرنا چاہی ہے، مطلب یہ ہے کہ بجائے اختلاف و تفاوت، نشیب و فراز کے معاشی حیثیت سے تمام افراد انسانی کو ہم سطح اور برابر برابر کر دیا جائے۔ اس مطالبہ کے معنی کیا ہوں گے؟ یہی ناکہ جس طرح خدا کی اسی زمین پر جی اور جان رکھنے والی ہستیوں کی حیوانی طبقات میں اپنی خود اکتفائی زندگیوں کی بدولت ایک دوسرے سے الگ تھلگ اس طریقہ سے جو زندگی بسر ہو رہی ہے کہ اس کو نہ اس کی ضرورت ہے نہ اس کی اُس کو، الف تبے سے بے نیاز ہے۔ اور بے الف سے گویا چاہا جاتا ہے کہ بنی نوع انسانی کے افراد کو بھی اسی قانون کے تحت زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے آخر حیوانی طبقات کو خود اکتفائیت کی اس بے نیازانہ زندگی سے متمتع ہونے کا موقعہ جو یہاں مل گیا ہے تو رزقی اور معاشی مساوات کے قانون کے سوا اس کی وجہ، بتایا جائے کہ اور کیا ہے؟ یہی بات کہ اپنی اپنی ضرورت اور حاجت کے مطابق دانہ گھاس آب و خورد دوسرے کی امداد کے بغیر چوں کہ ان میں ہر ایک کو میسر آ رہا ہے، اور اس طور پر میسر آ رہا ہے کہ ہر جنس اور ہر صنف کے ایک فرد کو کچھ ملتا ہے۔ وہی دوسرے کو مل رہا ہے، اس لئے ان میں ہر ایک تشفی یافتہ زندگی گزار رہا ہے۔ اور اسی لئے کسی کسی کی حاجت نہیں ہے۔ اب سوچنا چاہیے کہ بنی نوع انسانی کے افراد کو بھی معاشی اعتبار سے ہم سطحیت و مساوات کے اسی قانون کے تحت اگر رکھا جاتا تو اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ جیسے بکروں، بیلوں، گھوڑوں، گدھوں، وغیرہ حیوانی انواع اور نسلوں کے افراد قطعاً ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر

جی رہے ہیں، یہی حال انسانی افراد کا بھی ہو جاتا۔

یہی مقام ہے اس فطرت کے متعلق غور و خوض کا جس کا سب سے بڑا امتیاز یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ مدنی الطبع ہے یعنی باہمی میل جول، اتحاد و اتفاق، ہمدردی و غم خواری مواساة و موانست، جس کی زندگی کا سب سے قیمتی ترین سرمایہ ہے۔ اسی سرمایہ کی حفاظت و نگرانی کے لئے کافر سنوں کے پنڈالوں، مجالس کے ایٹھجوں، مساجد کے ممبروں سے مواعظ و نصائح کا ایک طوفان جاری ہے۔ ”اتفاق“ ”اتفاق“ ”ہمدردی“ ”ہمدردی“ ”یک جہتی“ ”ویک دلی“ کی آوازوں سے دنیا گونج رہی ہے۔ اب یہی سوچنے کی بات ہے کہ ایسی صورت میں کیا زندگی کا وہ منحوس نقشہ جس میں بجائے جوڑنے کے آدمی کو آدمی سے توڑا جائے، افتراق و انشقاق، بے تعلقی و جدائی، علیحدگی و بے نیازی کا یہ وحشت ناک منظر کیا انسانی فطرت کے لئے قابل برداشت ہوگا؟

رزقی و معاشی حیثیت سے مراتب و مدارج کا جو اختلاف نسل انسانی کے افراد میں پایا جاتا ہے قرآن میں اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے

نَحْنُ قَسَمًا مَعِيشَتِهِمْ فِي الْحَيَاةِ
۱۔ لَدُنَّا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ
بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ
بَعْضًا سَخِرَ بِهَا۔

ہم ہی نے بانٹ دی ہے الحیوۃ الدنیا
(پست زندگی) میں ان کی معیشت کو ان
کے درمیان، اور اونچا کر دیا ہے ہم نے
بعض کو بعض سے مدارج و مراتب کے لحاظ

سے (یہ اس لئے کیا گیا ہے) تاکہ انسانوں میں بعض بعض سے کام لیں۔

اس کا مطلب آج ہی نہیں، صدیوں پہلے مشہور مفسر قرآن القاضی البیضاوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

۲۔ لِيَسْتَعْمَلَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فِي
حَوَائِجِهِمْ فَيَحْصِلَ بَيْنَهُمْ تَأَلُّفٌ
وَقَضَامٌ يَنْتَظِمُ بَيْنَ ذَلِكَ نِظَامٌ
۳۔ الْعَالَمِ (ص ۱۸۱ ج ۲)

یعنی انسانوں میں بعض بعض سے اپنی حاجتوں
میں کام لیں اور اسی ذریعہ سے باہم انسانوں
میں باہمی الفت پیدا ہوتی ہے۔ اور بعض
بعض کے ساتھ مل گئے ہیں۔ عالم کے

نظام کا انتظام اسی پر قائم ہے۔

حاصل اس کا کیا ہوا؟ یہی کہ نوع انسانی جن کے افراد فطرۃً و طبعاً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں، ان ہی کو بجائے توڑنے اور ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کے قصد و ارادۃً خود پیدا کر نیوالے نے مدارج و مراتب کا یہ اختلاف پیدا کر کے یعنی معاشی لحاظ سے بعضوں کو بعض پر برتری عطا کر کے وحدت و وفاق کا ایسا نظام قائم فرما دیا ہے کہ ساری انسانی برادری گویا زنجیر کی کڑیوں کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئی زندگی بسر کر رہی ہے، کیسی عجیب بات ہے، مراتب و مدارج کا وہی معاشی نشیب و فراز ان کی وہی رزقی بلندی و پستی جسے گمید کرید کر آج ابھارا جا رہا ہے اور اسی اختلاف کو دکھا دکھا کر فساد و جدال، فتنہ و فساد کی جہنم انسانی بستیوں میں بھڑکانے والے بھڑکار رہے ہیں۔

آپ نے دیکھا امانہ کی ایک ہلکی سی تدبیر سے اسی اختلاف کو قرآن نے اتحاد و اتفاق کا کتنا مستحکم و استوار ذریعہ اچانک بنا دیا۔ دوسرے جس سے جدائی اور فصل کی فصل کاٹنا چاہتے ہیں، بلکہ کاٹ رہے ہیں، اسلام نے اسی کو میل ملاپ اور وصل کے سدا بہار پھول پیدا کرنے کی تدبیر سے بدل دیا، ایسی تدبیر کہ صرف ذہنی تصورات کے رخ کی ہلکی سی تصحیح اس کے لئے کافی و کافی ہے، غلط نقطہ نظر قائم کر کے جس واقعہ کو لوگوں نے اپنے اور اپنے بعد ساری انسانیت کے دکھ کا ذریعہ بنایا تھا اب اسی میں راحت و آسائش کی ضمانت بلاشبہ نظر آرہی ہے۔

اب کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اور بات ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ احتیاجی تعلقات (جو قانون تفصیل بعض علی بعض) کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ان ہی تعلقات کی بنیاد پر کسی آبادی کے افراد میں اس قسم کی وابستگیوں اور پیوستگیوں کا جو تماشا نظر آتا ہے کہ دھوبی کمہار کا برتنوں میں محتاج ہے، اور کمہار اپنے کپڑوں کے دھلانے میں دھوبی کا، حجام زرگر کا، زرگر حجام کا، عالم طبیب کا، طبیب عالم کا، کیمیا والے طبعیات والوں کے، طبعیات والے کیمیا والوں کے، اور اس طویل زنجیرے کی تفصیل کا بجائے کتابوں کے ہر ملک اور ہر ملک کی ہر آبادی کے اوراق پر چلتی پھرتی تصویروں کی شکل میں ہر جگہ آپ باسانی مطالعہ اور مشاہدہ کر سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سارا تماشا، اسی تقسیم معیشت اور مصرف و انصاف علی بعض کے اسی شجرہ طیبہ یا مقدس درخت ہی کا تو ثمرہ ہے، جس کی مختلف شاخوں پر ہر آبادی کے مختلف افراد بیٹھے ہوتے ہیں، یا انسانیت کی زنجیر کے حلقوں کی شکل ہر ایک اختیار کئے ہوئے ہے۔

الحاصل سب کو سب کچھ دے دیا جاتا، بجائے اس کے قدرت نے یہ طریقہ بنی نوع انسانی کے ساتھ جو اختیار کیا ہے کہ کچھ نہ کچھ سب کو دے کر ہر ایک کو دوسرے کا دست نگر بنا دیا ہے، اگرچہ قدر و قیمت کے اعتبار سے باہمی احتیاج کی یہ کیفیتیں بیسیوں شکلوں میں منقسم ہیں، لیکن افراد کی باہمی پیوستگی کا یہ نظام ہے تو اسی تفصیل بعض علی بعض کے قانون کا نتیجہ، یعنی بعض کو بعض پر صفات و کمالات، عواطف و رجحانات کے حساب سے جو برتری عطا کی گئی ہے۔ اسی نے ہماری آبادی کو گویا اینٹوں کی اس دیوار کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ پر قائم اور اسی سے سہارا لئے ہوئے ہے، انسانیت کا یہ مایہ ناز افتخار کہ ہے

جو عضوے بدر آورد روزگار دگر عضوہا را نماند مترار

اگر سوچا جائے تو اس میں فطری انجذاب کے ساتھ ساتھ احتیاجی تعلقات کے ان مادی اسباب کا ہاتھ بھی یقیناً نظر آئے گا۔ اور اسی کا اثر ہے کہ باہم اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ کبھی الجھ بھی جاتے ہیں۔ تو بالآخر عموماً طبیعت غالب آکر اس غیر طبعی کیفیت کا ازالہ کر کے تعلقات کو پھر سلجھا دیتی ہے، بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں مختلف پیداواروں کی پیدا کرنے کی صلاحیت جو قدرت نے پیدا کی ہے، نظری وسعت و کشادگی سے اگر کچھ کام لیا جائے تو شاید اس قرآنی آیت

اور زمین ہیں باہم لے جے قطعات
ہیں، اور باغ ہیں انگوروں کے
اور کھیت ہیں، درخت ہیں،
چند تنے والے اور ایک تنے والے
سیچے جاتے ہیں ایک ہی پانی سے
اور برتری بخشے ہیں بعض کو

وفي الارض قطع متجاورات
وحبات من اعناب وشرع
ونخيل صنوان وغير صنوان
يسقي بماء واحد ونفضل
بعضها على بعض في الاكل
(الرعد)

بعض پر پھلوں میں۔

سے بھی ذہنوں کو چاہا جائے تو اسی واقعہ کی طرف منتقل کیا جاسکتا ہے، یعنی سب کچھ ہر ملک اور ہر ملک کے ہر علاقہ اور قطعہ میں جو نہیں پیدا ہوتا، بلکہ ضرورت کی مختلف چیزوں کو قدرت نے مختلف ممالک اور ان ممالک کے مختلف قطعات کے ساتھ جو مختص کر دیا ہے، کسی کو معدنیات، کسی کو زرعیات، کسی کو مصنوعات، اسی طرح مختلف حاجتوں کا مختلف اقالیم اور کشوروں کے ساتھ خصوصی تعلق جو نظر آتا ہے میرے خیال میں تو یہ بھی وہی "تفضیل بعض علی بعض" ہی کی یہ ایک وسیع شکل ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ اس ذریعہ سے کسی آبادی ہی کے افراد کو نہیں، بلکہ مختلف بلاد و امصار میں بکھری ہوئی انسانی برادری کو بھی باہم مربوط رکھنے کا کام قدرت لینا چاہتی ہے، اور لینا چاہتی ہے کیا معنی؟ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے دور دراز ممالک کے رہنے والوں میں مختلف قسم کے تعلقات جو نظر آتے ہیں۔ مواصلات کی جو آسانیاں آج مہیا ہیں جس زمانے میں ان کا پتہ بھی نہ تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ملک کے تاجر دوسرے ملکوں میں ہندوستان میں، سندھ والے ایران میں، ایران والے عرب کے سواحل پر، عرب کے باشندے بحر روم کے کناروں پر فنیقیہ والے وینس اور یورپ کے دوسرے شہروں میں جو گھومتے پھرتے تھے۔ بتایا جائے کہ بحر اسی احتیاجی رشتہ کے اور کونسی چیز تھی جس نے کرہ زمین کے بعد المشرقین پر رہنے والوں کو یوں جوڑے رکھا یقیناً یہی قدرتی رشتہ تھا جس میں مشرق بعید کے بعید تر نقاط مثلاً جاپان و چین کے باشندے اور مغربی آبادیوں کی آخری حدود تک کے رہنے والے اور جوان کے درمیانی علاقوں میں آباد تھے، سب کے سب سیاح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے اور پھولوں کے ہار کے مانند ایک دوسرے کے ساتھ گتھے ہوئے تھے۔ ہر علاقہ کا آدمی دوسرے علاقہ میں گھومتا رہتا تھا، قافلوں کا ایک سلسلہ تھا، جو روانہ تھا، دو ان تھا، ہر ملک کے باشندے دوسرے ملک کی پیداواروں کے لئے چشم براہ رہتے تھے، ہندوستان کے رہنے والے استنبول کے قالین، کاشان کے مخمل، چین کے ظروف کو فخریہ استعمال کرتے تھے۔ عرب کے رہنے والے سیف مرہند یا تیغ ہندی کے بھروسہ پر اپنی زندگی کے دن کاٹتے تھے، اور میں کہاں تک تفصیل کروں کہ کہاں کہاں کے باشندوں کو کن کن ممالک کے جہازوں کا تری کی راہوں سے، اور کن کن علاقوں کے قافلوں کا خشکی کی راہوں سے انتظار رہتا تھا۔ جزیروں والوں کو دیکھا جاتا تھا کہ اپنے اپنے جزیروں کی پیداواروں کو لئے سمندر کی طرف جھانک رہے ہیں کہ ان کی ضرورت کی چیزوں کو بدلنے والے کب آتے ہیں۔

حتیٰ کہ ہمارے ملک ہندوستان میں مصری اور چینی کے الفاظ اسی زمانے کی تاریخی یادگار ہیں۔
شکر کی خاص قسم کا نام مصری اس لئے رکھ دیا گیا تھا کہ مصر سے وہ ہندوستان آتی تھی، اور چینی کو بھی چینی
اسی لئے کہتے تھے کہ چین سے وہ دساور ہوتی تھی، انتہا یہ ہے کہ علاج و معالجہ جیسی اہم ضرورت میں بھی ایک
ملک بغیر کسی وغدغہ کے دوسرے ملکوں پر بھروسہ کرتا تھا۔ قدیم یونانی طب کے نسخوں میں روم کی مصطکی
آرمینہ کی گل (مٹی) کشمیر کا بنفشہ خطا (چینی ترکستان) کی بادیاں، اور کیا کیا بتاؤں کن کن ملکوں کی پیدا
شدہ دوائیں کہاں کہاں استعمال ہوتی تھیں۔ بلکہ آثار قدیمہ والے دور دراز ممالک کے سکوں کو مختلف
علاقوں میں پاپا کر آج جو متحیر ہو رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بغداد کا سگہ سائیریا میں بلکہ ہندوستان کے ڈھلے
ہوئے پیسے اور روپے میکسیکو (امریکہ) تک میں جو نکل رہے ہیں اگر ان قصوں کو بھی

نحن قسمنا بینہم معیشتہم فی
الحیوة الدنیا ورفعنا بعضہم
فوق بعض درجات لیخذ
بعضہم من بعضہم
ہم ہی نے بانٹ دی ہے الحیوة الدنیا
(سپت زندگی) میں ان کی معیشت کو
ان کے درمیان، اور اونچا کر دیا ہے ہم
نے بعض کو بعض سے مدارج و مراتب کے

محاط سے، (یہ من لئے کیا گیا ہے) تاکہ انسانوں میں بعض بعض سے کام لیں۔

کے قرآنی اشارے کی وسیع پیمانے پر تفسیر ہی سمجھا جائے تو اس کے انکار کی کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے مگر خدا
بی جانتا ہے کہ کس جرم کی پاداش میں اچانک یورپ کی سرزمین سے وطنیت کے بھوت نے سرنکالا، وہی بھوت
انسانیت پر سوار ہو گیا۔ جھوٹی غیرت، جاہلی حمیت کے غلط جذبات کو بھڑکا کر ان ہی کو جو ملے ہوئے
تاریخ کے نامعلوم قرون سے ملے ہوئے تھے۔ خود اکتفاؤں کے مغالطی مہتھوڑوں سے اچانک توڑ پھوڑ کر
جد کر دیا گیا۔ دوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنی اپنی ضرورتوں کو ہر ملک خود مہیا کرے، اسی افراقی و
انشقاقی نظریہ کا غوغا بلند کیا گیا، اپنی اپنی منڈلیوں میں اپنے اپنے راگ الاپنے کے لئے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹوں
کی مسجدوں کی تعمیر کا انتظام ہر جگہ درست ہونے لگا ابتدا میں یورپ اور ایشیا جیسے وسیع علاقوں ہی کی حد تک خود
اکتفاؤں کی یہ تحریک محدود تھی۔ لیکن جس اساسی نقطہ پر اس تحریک کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ
یہ تھا کہ بات ان وسیع علاقوں ہی تک محدود نہ رہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ہر ہر اقلیم مختلف ملکوں میں اور ہر
ملک مختلف صوبوں میں ہر صوبہ مختلف اضلاع میں، ہر ضلع مختلف تعلقوں میں، ہر تعلقہ مختلف دیہاتوں
کی شکل میں مختلف سہولتوں کی وجہ سے بٹا ہوا تھا اور ہے۔ ہر جگہ کے رہنے والے بجائے دوسروں کے اپنی
ضرورت خود پوری کریں۔ خود اکتفاؤں کے قانون کی جب یہی تعبیر تھی اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتی ہے
تو ملکوں سے آگے بڑھ کر صوبوں میں اور صوبوں سے بھی متجاوز ہو کر اضلاع کے رہنے والوں تک پر خود
اکتفاؤں کے مہتھوڑے اگر پڑنے لگے ہیں، تو جو بویا گیا تھا، یہ تو اسی کی اُگی ہوئی فصل ہے، جسے بہر حال
بنی آدم کو کاٹنا ہی پڑے گی، بلکہ کیا تعجب ہے کہ اضلاعی حدود کو توڑ کر تعلقوں بلکہ گاولوں تک میں یہ عارضہ پھیل جائے۔
آبادیوں کی بیگانگی جس رفتار سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ ظاہر اس کا انجام تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن خیر دوسرے ملکوں کا رنگ تو ابھی ہلکا ہے عصمت کے دائرے سے بیچاریگی، بی بی کو باہر نکلنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہی ہے۔ چاہنے والے اگر چاہتے بھی ہیں، تو جو نہیں چاہتے ہیں وہ ان کی چاہ کو کب پوری ہونے دیتے ہیں۔ لیکن وطنیت اور وطنیت کے ساتھ ساتھ خود اکتفائیت کے معلم اول غریب یورپ ہی کو اپنے ہاتھوں کی اس بھڑکانی جہنم میں خود کو دنا پڑا ہے، بے گانگی نے عداوت کی آگ سلگائی، اب اسی آگ میں ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے خود یورپ کو بھی بھننا پڑتا ہے۔ اور یورپ کے ساتھ ان مسکینوں کو بھی بالآخر اس جلن میں حصہ لینا ہی پڑا جنہیں مختلف ترکیبوں سے یورپ والوں نے اپنا طفیلی بنا لیا ہے۔

اب سوچنے والوں کی آنکھیں کھلی ہیں، چاہا جا رہا ہے کہ اس ٹوٹی ہوئی دنیا کو اور ٹوٹی ہوئی تو غلط تعبیر ہے، وہ تو جٹی ہوئی تھی، بلکہ صحیح یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھوں کی توڑی ہوئی اس دنیا کو پھر جوڑا جائے، تب عصبۃ الاقوام (لیگ آف نیشنس) یا تحفیف اسلحہ اور ازیں قبیل بیسیوں ناموں سے بیسیوں تجویزیں بچاری جا رہی ہیں، تاکہ جوالگ کئے گئے ہیں، باہم انہیں پھر ملا دیا جائے۔ حالانکہ دور کی ان کوڑیوں کے لانے میں وقت ضائع کرنے سے کتنا آسان تھا اب بھی ہے ہمیشہ رہے گا کہ خود اکتفائیت کے اس حیوانی جنط کو دماغوں سے نکال کر پھر بنی آدم کے گھرانوں کو لیتھن بعنہم بعدنما سخریا۔ کے اسی قدر ترقی قانون کے ماتحت چھوڑ دیا جائے، آزاد چھوڑ دیا جائے، تاکہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے جس حال پر ان کے احتیاجی و معاشی تعلقات قائم تھے، اسی حال پر پھر وہ واپس ہو جائیں۔

الغرض سب کو سب کچھ پیدا کرنے کی تلقین کی جگہ ہر ملک کو ان ہی چیزوں کے پیدا کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے جنہیں اپنے اپنے ماحول اور موسمی و مقامی خصوصیات کے لحاظ سے باسانی بہتر شکلوں میں وہاں کے باشندے پیدا کر سکتے ہیں، اگر ایک ملک کی آبادیوں کو دوسرے ممالک کی آبادیوں سے پیوستہ و وابستہ کر دیا جائے تو یوں بھی یہ بات خود اکتفائیت کے حیوانی اصول کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہو سکتی ہے، کیوں کہ گر پڑ کر بقول شخصے

”ملک جیا برے احوال“

کی شکل میں مثلاً صنعتی ممالک کو جبراً دقہرا کسی نہ کسی طرح مصنوعی ذرائع سے کام لے کر غیر فطری طور پر اگرچہ زرعی ملک میں بدل دیا جاسکتا ہے، یوں ہی زرعی علاقوں میں بھی صنعتی کاروبار پھیلا یا جاسکتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ واقع میں جو زرعی علاقے ہیں، زرعی پیداواریں جتنی عمدہ شکلوں میں وہاں مہیا ہو سکتی ہیں۔ بالآخر زرعی بنائے ہوئے خطوں کی پیداواریں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، یہی حال مصنوعات اور ضروریات حیات کی دوسری چیزوں کا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر چاہا جائے تو انگور یا انار نہیں پیدا ہو سکتے، یقیناً ہو سکتے ہیں اور جب کوشش کی گئی تو سنا کیا دیکھا گیا کہ یہاں انگور پیدا ہوئے، لیکن کابل یا کشمیر کے انگوروں یا اناروں کا مقابلہ کیا وہ کر سکتے ہیں۔ جب ہندوستان کے آموں کو بیج کر ہم کابل کے انگور کھا سکتے ہیں، قندھار کے انار سے کام و دہن کو لذت پہنچا سکتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے ملک کی قدرتی

پیداواروں کا دوسرے ممالک کی قدرتی پیداواروں سے جب باسانی تبادلہ کر سکتے ہیں، تو خواہ مخواہ ایک فرضی خیال کہ یہ ہندوستان ہی کا پیدا کیا ہوا انگور چوں کہ ہے، اس لئے بدمزہ ہی کیوں نہ ہو کابل کشمیر کے انگوروں پر ہمیں اسے ترجیح دینا چاہیے، و سواس اور وہی احساس کے سوا یہ چیزیں اور کیا ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ممالک اقوام کی ان معاشی وابستگیوں سے چاہنے والے اگر چاہیں تو لیگ آف نیشنس (جنیوا والی) یا مجلس اقوام (میگ والی) وغیرہ کے مقاصد کو ایک حد تک اس ذریعہ سے بھی حاصل کر سکتے ہیں، یہی ہٹلری جنگ جو ابھی بڑی گئی خود اسی کے تجربات بتا رہے ہیں کہ زندگی کی معمولی معمولی سہولتوں مثلاً مٹی کے تیل جیسی چیزوں تک نے جنگ سے لوگوں کو بے زار بنا رکھا ہے، اُف! کونین کی کمیا بیوں نے پیریا کے مریضوں کو جتنا پریشان کیا ہے، کیا ان لوگوں میں اس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ جس ملک سے کونین برآمد ہوتی تھی۔ اس سے جنگ کا ارادہ کریں، آپ اقوام کی مجلسوں میں اسی جنگ کو روکنے کے لئے قوموں کو اس پر تو مجبور کرنا عقل کا اقتضار سمجھتے ہیں کہ باوجود استطاعت کے آئندہ وہ جنگی جہازوں کی تعداد معینہ مقدار سے نہ بڑھائیں یا سرے سے حربی آلات و اسلحہ کے کارخانے ہی بند کر دیئے جائیں۔ کیا جنگ کے ان ہی خطرات کے انسداد کی ایک صورت یہ بھی نہیں ہو سکتی ہے کہ زندگی کی ضرورتوں میں ایک ملک کو دوسرے ملک کا کچھ اس طرح محتاج بنا دیا جائے کہ ایک کا کام دوسرے کے بغیر چل ہی نہ سکے، یعنی وہی قدرت کا جو قانون ہے، اسی پر دنیا کو واپس ہو جانے کی اجازت دیدی جائے۔ تو بالکل تہ نہیں، ایک بڑا سبب قوموں کی پنچہ آزمائیوں کے روکنے کا کیا یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا ہے کہ لڑائی کی صورت میں ان چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا۔ جن کی برآمد کا دار و مدار اسی قوم پر ہے جس سے ہم لڑنا چاہتے ہیں۔ کچھ نہیں تو انسدادِ جنگ کے اسباب میں ایک مؤثر سبب کی حیثیت سے یقیناً یہ ایک بڑی بات ہو سکتی ہے، بشرطیکہ قومیت کا آسیب قوموں کے سروں پر جو کھیل رہا ہے، اس بھوت کے اتارنے میں پہلے کامیابی حاصل ہو جائے۔

اور یوں بھی تجربہ کی ایک بات یہ بھی ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے جس ملک میں جن پیداواروں کی تیاری کا دستور اس ملک کی خصوصیات کی بنیاد پر جو چلا آ رہا تھا، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس ملک کے باشندوں کو عموماً ایک فطری مناسبت ان ہی چیزوں سے ہو جاتی تھی۔ مہارت و کارکردگی میں دوسرے ممالک ان کا مقابلہ مشکل ہی سے کر سکتے تھے۔ یہ تجربہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ ہر ملک میں ہر قسم کی چیزوں کی پیدا کرنے کی کوشش پر خود اکتفا ئیت کے نظریہ کے زیر اثر ابھارنا یوں بھی چنداں مفید نہیں، اسی طرح مفید نہیں جیسے اس زمانے میں دنیا کے اس قدیم اصول کو جو توڑا گیا ہے۔ یعنی عموماً قاعدہ تھا کہ حصولِ معاش کا جس خاندان میں جو ذریعہ پشتینی طور پر چلا آ رہا تھا، لوگ ادھر ادھر دیکھے بغیر اسی پیشہ کو اختیار کرتے ہوئے سلا بعد نسل چلے آ رہے تھے، جس کا اس فائدہ کے سوا کہ نسبتاً معاشی افکار میں لوگ اس لئے کم مبتلا ہوتے تھے کہ اپنی معاش کا ذریعہ ان کے نزدیک متعین ہوتا تھا۔ ایک دھوبی کا بڑا پیدا ہونے کے بعد مطمئن رہتا تھا، سمجھتا تھا کہ روزی کمانے کے لئے مجھے وہی کرنا ہے جو میرا باپ کر رہا ہے، دھوبیوں کی اولاد اگر بڑھ رہی تھی، تو ظاہر ہے کہ دھلانے والوں کی نسلوں میں بھی اسی نسبت سے

اضافہ ہو رہا تھا، یہی وجہ تھی کہ کبھی کسی زمانہ میں میں نہیں جانتا کہ کسی پیشہ ور کو اس کی شکایت پیدا ہوئی ہو، کہ باپ کے جس پیشے کو اس نے اختیار کیا تھا اس کی مانگ نہیں ہو رہی ہے، الا ماشاء اللہ اور گفتگو کا تعلق عام حالات ہی سے ہے۔

بہر حال اس فائدے کے سوا بڑا فائدہ اس کا وہی تھا کہ بچپن سے ہر پیشہ ور کا پیشہ چوں کہ طے شدہ ہوتا تھا، اس لئے ہر بیٹا اسی وقت سے جب سے ہوش سنبھالتا تھا، باپ سے اپنے پیشہ کے گردوں کو سیکھتا رہتا تھا، مسلسل عملی مشق وقت آنے تک اس فن میں اس کو ماہر بنا دیتی تھی۔ اور یوں بھی موروٹی موثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ہندوستان ہی میں دیکھئے، تعلیم و تعلم کا جدید مغربی اصول پچھڑے صدی سے اس ملک میں رواج ہے، ہر صوبہ میں بیسیوں کالج بلکہ یونیورسٹیاں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں مدارس قائم ہیں، لیکن اس ملک کے جن خاندانوں کا موروٹی پیشہ تعلیم اور تعلم اور دماغی کاروبار تھا، مثلاً برہمن یا کاستھ، جدید تعلیم کے سلسلہ میں کیا ان کا کوئی مد مقابل ہے؟ بنگال کے بنگالی، کہا جاتا ہے کہ تعلیم جدید میں بہت آگے نکل گئے ہیں، لیکن اس پر کوئی غور نہیں کرتا کہ آگے نکلنے والوں میں اکثریت کبیرہ کن لوگوں کی ہے؟ پوچھ لیجئے، دیکھ لیجئے، وہی چڑھی، بنرجی، مکر جی وغیرہ برہمن یا مترا، گہوش وغیرہ کاستھ خاندان کے افراد آگے بڑھے ہوئے ہیں، یعنی وہی لوگ جن کے آباؤ اجداد ہزار سال سے تعلیم میں آگے بڑھے ہوئے تھے، یہی حال مدراس، مرہٹہ، وغیرہ کے ان علاقوں کا ہے، جہاں سمجھا جاتا ہے کہ جدید تعلیم نے اچھے اور ممتاز افراد پیدا کئے ہیں، بہر حال جو حال افراد کا ہے، وہی اقوام کا ہے، جن پیداواروں کا جس جس ملک سے قدرتی تعلق مدت دراز سے رہا ہے، میرا تو یہ خیال ہے کہ ان ہی ملکوں سے ان پیداواروں کے متعلق اچھی فہم کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ ان کی کارکردگی کی صلاحیتوں کو بجائے ابھارنے اور ترقی دینے کے مردہ کرنے کی کوشش خاص اغراض کے تحت نہ کی جائے اور ممالک کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا اپنے ملک ہندوستان میں تو دیکھ رہا ہوں کہ موروٹی پیشوں سے لوگوں کو ہٹا ہٹا کر جب سے دوسرے شعبوں کی طرف دعوت دینے میں ہمت افزائیوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں کچھ لوگوں کو نفع محسوس ہوا ہو، لیکن تعلیم یافتہ طبقہ میں ”شکم“ کا سوال تمام سوالوں سے زیادہ اہم جو اس وقت بنا ہوا ہے، مرنے سے پہلے لوگوں کو موت کا مزہ چکھنا پڑ رہا ہے تو اس میں بڑا دخل ان ہی غلط ہمت افزائیوں کو ہے، پہلے اپنے باپ کے موروٹی پیشے اور اس پیشے کی آمدنی پر لوگ قانع تھے، ہزار ہا ہزار سال سے ایک خاص قسم کی مطمئن زندگی عموماً سب کو میسر تھی، لیکن آج ان ہی غریبوں کو گم کردہ نشیمن پرندوں کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے کہ ادھر سے ادھر مارے پھرتے ہیں، معاش کا جو آبائی ذریعہ تھا وہ بھی کھو بیٹھے اور دوسرا نیا ذریعہ رزق کامل نہیں رہا ہے، اور ملے بھی تو زندگی کا جو آبائی معیار تھا وہ نظر سے پوشیدہ ہو گیا، اب کوئی ”معیار“ ان کے سامنے ایسا نہیں ہے جس پر پہنچ کر اطمینان کا سانس وہ لے سکتے ہوں۔

”ایں ہم رفت، آں ہم رفت“

خیر میں کہ نہ نکل گیا، دماغ میں بات تھی، موقعہ اظہار کا آگیا، جی نہ چاہا کہ کترا کر نکل جاؤں، اب پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاشی مراتب و مدارج کے اختلافات اور ان ہی اختلافات سے پیدا ہونے والی پستی و بلندی کو اہمیت دے دے کہ اس زمانے میں ہر ملک و قوم کے حق میں اس مسئلہ کو ایک مستقل ”شعلہ جوالہ“ کی شکل جو عطا کی گئی ہے۔ ایسا ”شعلہ جوالہ“ کہ تقریباً ہر ملک کے باشندے کا نپ رہے ہیں، ڈر رہے ہیں کہ دیکھیے اس شعلہ میں ہمیں کب جھونکا جاتا ہے۔ خانہ جنگی اور طبقاتی معرکہ آرائیوں کا ذریعہ اسی مسئلہ کو بنانے والے اس ملک میں کب بناتے ہیں۔

اب کسی کو مجھ سے اتفاق ہو، یا نہ ہو، لیکن میرا خیال تو یہی ہے کہ قرآن نے فکری تصحیح سے کام لے کر اسی مسئلہ کو جس سے بداندیشیوں نے چاہا ہے کہ انسانی برادری کو ہر ملک اور قوم میں ٹکرا دیں، بجائے ٹکرا لے کے اسی کو بچھڑے ہوؤں کے ملانے کا ذریعہ اتنی آسانی سے بنا دیا ہے کہ نقطہ نظر کو قرآنی مشورہ کے مطابق بدلنے کے ساتھ ہی وہ کانٹا ہی درمیان سے نکل جاتا ہے، جسے چبھا چبھا کر بیٹھے بٹھائے آدم کی اولاد کو لوگوں نے بے چینی اور بلا وجہ کی کلفت و قلق میں مبتلا کر رکھا ہے، اور بچہ بچہ کے قصہ کو دیکھ دیکھ کر سماج کے بعض افراد کے قلوب میں دوسرے افراد سے جو گرائیاں پیدا کرانی جا رہی ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ قرآن نے جو نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ توڑنے کی جگہ جوڑنے کا ذریعہ اسی قصہ کو اس نے امالہ کے جس طریقہ سے بنا دیا ہے۔ انصاف سے غور کرنے والوں کے لئے اس میں انشاء اللہ تسلی و سکینت کا بڑا سرمایہ ہاتھ آ سکتا ہے۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ امالہ کی اس تدبیر سے اس چیمین اور خلش کو تو ہم مٹا سکتے ہیں جو باہم افراد انسانی میں معاشی مدارج و مراتب کے اختلاف سے پیدا ہوتی ہے، مگر باہمی احتیاجات کا یہ تیج و نتیجہ زنجیرہ جس میں تقسیم معیشت اور تفضیل بعض علی بعض کے قانون کے تحت آدم کی اولاد جکڑی ہوئی ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ معیشت کے اس نظام میں رزقی اعتبار سے کسی کا بلند مقام پر قابض ہو جانا اور کسی کا پست جگہ پر رہ جانا ناگزیر ہے، آخر جب سب کچھ سب کو نہیں دیا گیا ہے، بلکہ صلاحیتوں اور سلیقوں کے مختلف ملکات اور کمالات و صفات کے مختلف حصوں کے مختلف افراد حصہ دار ہیں، اور ہر کمال ہر صفت اپنے نتائج کی قدر و قیمت کی وجہ سے برابر نہیں ہے، خصوصاً معاشی برتری جن کمالات و صفات کے بل بوتے پر لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے، چوں کہ ان کی تعداد ہر آبادی میں تقویری ہوتی ہے، اس لئے باسانی ان کا بدل ضرورت مندوں کو میسر نہیں آتا، بخلاف ان لوگوں کے جو ان معاشی برتری رکھنے والے افراد کے محتاج ہوتے ہیں کہ کثرت تعداد کی وجہ سے ان کا بدل ہر جگہ باسانی مل جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ کسی امیر یا تاجر کا ملازم تو ڈرتا رہتا ہے کہ اگر میں ان کے پاس سے چلا جاؤں گا، تو وہی کام جو میں انجام دیتا ہوں اسی کام کے کرنے والے بیسیوں ان کو مل سکتے ہیں لیکن نوکری چھوڑ کر میں اگر علیحدہ ہو گیا تو میرے کام سے استفادہ کر کے اجرت دینے والے دنیا میں چونکہ کم ہیں، اس لئے ایسا آدمی جس کی مجھے ضرورت ہو اس کا تلاش کرنا میرے لئے آسان نہ ہو گا، یہ ایک واقعہ ہے جس کا تعلق روزمرہ کے مشاہدے سے ہے۔

قانونِ بسط کے تحت رزق حاصل کرنے کا ذریعہ قدرت جن کے لئے فراہم کرتی ہے، درحقیقت ان کی برتری کا راز یہی واقعہ ہے، یعنی ہونے کو تو وہ بھی دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن جن کے یہ محتاج ہوتے ہیں، ان بیچاروں کا بدل تو انھیں باسانی مل سکتا ہے اور مل جاتا ہے، بخلاف ان کے جو ان کے محتاج ہوتے ہیں کہ ان کو عموماً ایسے افراد کے پالنے میں دشواری پیش آتی ہے جو ان کا اور ان کے کام کا محتاج ہو۔

یہی وہ نقطہ بحث ہے، جہاں پر اس معاشی زنجیر کے ان حلقوں کو جو اپنے آپ کو رزقی حیثیت سے پستی میں پاتے ہیں۔ یعنی وہی لوگ جو بجائے بسط کے قانون قدر کے تحت روزی پاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں بسطی رزق والوں سے اگر شکایت نہ بھی پیدا ہو۔ لیکن خود پیدا کرنے والے کی طرف سے ان کے قلوب میں اگر یہ سوال اٹھے کہ بجائے دوسروں کے زنجیر کے اس حلقے میں مجھے ایسی جگہ کیوں دی گئی جہاں پر رہنے والوں کو قدری معیشت گزارنی پڑتی ہے۔ آخر قانون قدر کے نشانہ ہم ہی کیوں بنے۔ بسطیوں کا جو پیدا کرنے والا ہے، خالق میرا بھی تو وہی ہے، پھر ان کو اتنا دیا گیا، دیا جا رہا ہے کہ خرچ کرنے، خوب اچھی طرح دل کھول کر بھی خرچ کرنے کے بعد پس ماند کرنے کا ان کو موقع مل جاتا ہے، اور ہمارا حال یہ ہے کہ آج کھانے کو اگر مل گیا تو

پھر خوردبامداد سرزندم

کی فکر اسی وقت اندر اندر ہماری جان کھائے جاتی ہے، سرچھپاتے ہیں تو پاؤں کھلتا ہے اور پاؤں کپڑا ڈالتے ہیں تو سر ننگا رہ جاتا ہے۔

قدری پیمانے پر رزق پالنے والوں کے دلوں کا یہی احساس (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اس مسئلہ کا وہ رخ ہے جس کا تعلق بجائے مخلوقات یا اپنے ابناء جنس کے خالق تعالیٰ کی ذات کی طرف ہے اس سوال کا یہ جواب کہ بنی نوع انسانی کے بکھرے ہوئے افراد کی تنظیم اور باہم ان میں پیوستگی و وابستگی کے تعلقات کو پیدا کرنے کے لئے کسی کا اوپر اور کسی کا نیچے ہونا ضروری تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ سب ہی اگر انجن ہی بن جائیں گے تو ڈیہ اور بوگی آخر گاڑی کا کون حصہ بنے گا، اور گاڑی میں جب ڈیہ یا بوگی ہی نہ ہوں گے تو ظاہر ہے کہ صرف انجن سے کیا کام چلے گا۔ خواہ ساری گاڑی کی روح روان انجن ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح جسد انسانی میں ہر ہر عضو کو دل و دماغ ہی کا مقام اگر عطا کیا جائے گا، تو پھر ہاتھوں، ٹانگوں، انگلیوں کے وظائف کون ادا کرے گا۔ واقعات کی حد تک بلاشبہ یہ ایک معقول جواب ہے، یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جمادات کی طرف سے اگر یہ مطالبہ پیش ہو کہ نباتات کی صفات سے ان کو کیوں محروم رکھا گیا۔ یا نباتات کی جانب سے احتجاج کی یہ آواز بلند ہو کر حیوانی کمالات سے محروم کر کے سلسلہ وجود میں ان کا درجہ پست کیوں کر دیا گیا، اسی طرح حیوانات اگر چلائے لگیں کہ آدم کی اولاد جن صوری و معنوی قوتوں سے سرفراز ہے، وہی قوتیں جن کی بدولت ساری کائنات پر انسان کی حکومت قائم ہے سب پر وہ مالکانہ اقتدار جائے ہوئے جس قسم کا تصرف چاہتا ہے کرتا ہے، ان سے وہ کیوں محروم ہیں

الغرض متفاوت صفات و کمالات رکھنے والی اس دنیا کے ہر طبقہ کی طرف سے پستی و بلندی، فراز و نشیب کے اسی سوال کو اگر اٹھایا جائے تو بتایا جائے کہ مذکورہ بالا جواب کے سوا کہنے والے اور کیا کہہ سکتے ہیں، خدا کی مخلوق ہونے میں (جمادات و نباتات، حیوانات و انسان) جب سب برابر ہیں، تو کسی کو کم کسی کو زیادہ جو دیا گیا ہے، اس کی توجیہ میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس مطالبہ کے معنی تو یہی ہوئے کہ گونا گوں بو قلموں، موجودات سے بھری ہوئی یہ دنیا گویا صرف ایک ہی ہستی کی شکل میں بدل دی جائے یعنی وہی بات کہ سب کو انجن ہی انجن بنا دیا جائے جس کا دوسرا مطلب یہی ہوگا کہ ریل گاڑی اور اس کے منافع و فوائد کے سارے قصہ ہی کو ختم کر دیا جائے۔ مگر باایں ہمہ انصاف کی بات یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی عقل اس جواب سے اطمینان حاصل کرنے کے باوجود جب انفرادی طور پر قدری زندگی کی کش مکشوں میں مبتلا ہوتی ہے۔ تو اس وقت تفاوت صفات کا یہ فلسفہ اور اس فلسفہ کے مصالح و مایوس سے عموماً غائب ہو جاتے ہیں، سب جانتے ہیں، روزمرہ کے ان تجربات کو سب مانتے ہیں کہ "انسانی معاشرہ" کا سارا دار و مدار صفات و کمالات اور ان سے پیدا ہونے والے مدارج و مراتب کے اسی اختلاف و تفاوت ہی پر قائم ہے۔ اس کو ختم کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ احتیاجی تعلقات کا وہ رشتہ جو اس وقت ہم میں ایک کو دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے، اسی وقت ختم ہو جائے گا، اسی طرح ختم ہو جائے گا جیسے خود اختلافی زندگی رکھنے والے حیوانات میں ان روابط کے فقدان کی وجہ اختلاف و تفاوت کا یہی فقدان بنا ہوا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ بیلوں کی قطار سے کوئی بیل، یا گھوڑوں کے اصطلیل سے کوئی گھوڑا، بکریوں کے مندوں سے کوئی بکری اگر غائب ہو جاتی ہے۔ تو ان میں کسی کو "گاؤ" کہ خرافت کے اس قصہ کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بڑی تو بڑی "انسانی آبادی" کا کوئی معمولی رکن، مثلاً کوئی حجام، کوئی دھوبی، یہی کچھ دن کے لئے اگر کہیں چلا جاتا ہے تو لوگوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے، حد تو یہ ہے کہ حلال خوروں یا جنگیوں تک کی اسٹرائک بڑے بڑے شہروں میں قیامت برپا کر دیتی ہے۔

سوال یہی ہے کہ ان تین مشاہدات، کھلے کھلے تجربات کے باوجود قدری پیمانہ پر رزق پانیا والوں میں شکایت کا یہ احساس آخر کیوں پایا جاتا ہے؟

عام طور پر "تقدیر" کے مسئلہ کو بھی چاہا جاتا ہے کہ اس شکایت کے ازالہ کا ذریعہ بنایا جائے پڑھنے والے ان ہی مواقع پر پڑھ دیتے ہیں۔

کوئی پادشاہ و امیر ہے، کوئی بینوا و فقیر ہے جسے چاہا جیسا بنا دیا تری شان جل جلالہ

آخر معاشی نشیب و فراز، یا بسط و قدر کا یہ قصہ، ان صفات و کمالات، فطری ملکات و رجحانات ہی کے ساتھ جب وابستہ ہے، جن کے نتائج قدر و قیمت کے اعتبار سے قدرتا مختلف ہیں تو کھلی ہوئی بات ہے کہ انسانی فطرت کا جو پیدا کرنے والا ہے وہی فطرت کے ان جہتی لوازم و آثار کا بھی خالق ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کل شیء من القدر حتی العجز و الکس ہر چیز تقدیر ہی سے ہے حتیٰ کہ زندگی کے

کاروبار میں) بے چارگی و درماندگی اور دانائی و ہوشیاری (یہ بھی مقدر ہی سے ہے)

اور اسی بنیاد پر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں

واللہ یبسط الرزق لمن یشاء

اور اللہ جس کی روزی میں چاہتا ہے

بسط پیدا کر دیتا ہے۔ اور جس کی روزی

و یقدر۔

میں چاہتا ہے قدر پیدا کر دیتا ہے۔

کے الفاظ میں الرزق کے بسط و قدر کو حق تعالیٰ نے براہ راست اپنی مشیت ہی کی طرف منسوب فرمایا ہے اور جہاں تک میں جانتا ہوں امارت و غربت، یا بسط و قدر کے متعلق یہ آخری جواب ہے، جو عام مذاہب کی طرف سے دے کر بولنے والوں کی زبان بند کر دی جاتی ہے۔ لیکن قرآن بھی اسی جواب کو آخری جواب ٹھہراتے ہوئے خاموش ہو جانے پر لوگوں کو اگر مجبور کرتا تو اپنے دلائل اور اپنی محبتوں کے متعلق ”حجۃ بالغہ“ یعنی ایسی دلیل ہونے کا دعویٰ ہی وہ کیوں کرتا جو شکوک و شبہات کی انتہائی جڑوں تک پہنچ کر ان کی باریک سے باریک رگوں اور ریشیوں کو گہرائیوں سے نوچ نوچ کر اکھاڑ پھینکتی ہے۔

آئیے اور اس مسئلہ میں بھی قرآن کی ”حجۃ بالغہ“ کا تاشا کیجئے، کوئی طول طویل بات نہیں ہے، بلکہ وہی امالہ کی پرانی ترکیب سے کام لیتے ہوئے قرآن نے لوگوں کو جیسا کہ میں سمجھتا ہوں ادھر متوجہ کیا ہے کہ الرزق کی تقسیم بسط اور قدر کے ان دو مختلف پیمانوں پر قدرت جو کر رہی ہے، اس کے متعلق یہ سوال کہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب دینے کا واقعی استحقاق اسی کو حاصل ہے اور اس کے سوا اور کس کو ہو سکتا ہے جو قصد و ارادۃً ان دو مختلف پیمانوں پر الرزق کو اپنے پیدا کئے ہوئے بندوں میں بانٹ رہا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ خود بانٹنے والے اور تقسیم کرنے والے سے پوچھا جاتا، قرآن نے لوگوں کی اس حماقت پر مطلع کیا ہے کہ انھوں نے پیش قدمی کر کے بغیر کسی حق کے اپنی طرف سے اس سوال کے خود تراشیدہ بے بنیاد قطعاً بے بنیاد غلط جوابات گھڑائے اور ان ہی غلط جوابوں کو صحیح علم باور کر کے ادھر قدریوں نے بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو ایک ناشدہ اندرونی کوفت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور دوسری طرف اسی غلط علم اور غلط احساس کا نتیجہ بسطیوں پر یہ مرتب ہو رہا ہے کہ اپنے متعلق وہ الگ ایک بے جا خوش اعتقادی کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ غلط علم سے لوگوں نے اس مسئلہ میں بھی جو غلط نقطہ نظر قائم کر لیا ہے۔ اسی غلط علم کی تصحیح کر کے نقطہ نظر کا امالہ قرآن نے ایک ایسے اعجازی رنگ میں کر دیا ہے کہ جن شکوہوں اور شکایتوں یا کڑکڑاہٹوں اور جھنجھٹا ہٹوں سے آج آسمانوں کو سر پر اٹھایا گیا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس امالے کے بعد ان کے خطرے کی بھی قلوب میں گنجائش باقی رہ سکتی ہے، اگرچہ ایک سے زائد مقامات پر قرآن میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے، لیکن مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ جس توجہ کی یہ قرآنی آیتیں مستحق تھیں، اتنی توجہ ان کی طرف نہیں کی گئی۔ بہر حال توجہ کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو، قرآن میں تو موجود ہیں، اور ان ہی کو اب میں پیش کرتا ہوں، سب سے پہلی آیت اس سلسلہ کی تو وہی ہے جو سورۃ الفجر میں بایں الفاظ پائی جاتی ہے۔

و اما الانسان اذا ما ابتلاه
 ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی
 اکرم من و اما الانسان اذا
 ما ابتلاه ربہ فقد رعلیہ
 رزقہ فیقول ربی اهانن کلا
 جب اس کا مالک جا پختا ہے تب پنی تلی کر دیتا ہے روزی کو اس کے، تو کہنے لگتا ہے
 کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا۔ "ہرگز نہیں۔"

میں دوسروں کو کیا کہوں، خود اپنا حال بھی مدت تک اس آیت کے متعلق عجیب تھا۔ یعنی
 ابتدائے زندگی میں اس کا جو ترجمہ سمجھ میں آیا تھا، اس کی بنیاد پر یہ خیال گذرتا تھا کہ اللہ میاں نے
 جس بندے کو نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ وہ اگر یہ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے نعمت سے سرفراز فرمایا تو
 غلط کیا کہتا ہے، آخر وہ یہ نہ کہے تو کیا کہے۔ پھر اسی کو کلا کے تو بیخی لفظ سے ڈانٹنے کے کیا معنی؟ اسی
 طرح دوسرے جز کے متعلق بھی یہی وسوسہ ہوتا تھا کہ ضیق معاش میں مبتلا ہو کر جو بیچارہ اپنے ہم جنسوں
 میں ہلکا اور سبک ہو رہا ہے، اہانت و ذلت کی اس کیفیت کا اگر اظہار کرتا ہے تو ایک واقعہ کا اظہار
 کرتا ہے، اگرچہ اس پچھلی بات کے متعلق یہ بھی خیال گذرتا تھا کہ اس میں مالک کی شکایت کا پہلو چونکہ
 پیدا ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اسی کے متعلق تبنیہ کی گئی ہو، حافظ کا شعر یاد آ جاتا تھا۔
 گناہ گرچہ نہ بود اختیار ما حافظ
 تو در طریق ادب کوش گو گناہ من ست

لیکن خیر طریق ادب کے ذیل میں سربانی اهانن (میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا) کی شکایت کو تو داخل
 کیا جاسکتا ہے۔ مگر پہلے چیز میں تو اس کی بھی گنجائش نہ تھی بلکہ
 اما بنعمۃ ربک فحدث
 تو اپنے رب کی نعمت کا چرچا کر۔

یا اسی کے مفاد کو دہرائے والی یہ حدیث
 فلیروا ثمر نعمتہ علیہ
 پس چاہیے کہ دکھائے اللہ کی نعمت
 کے اثر کو اپنے اوپر۔

وغیرہ میں تو اسی کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ نعمت سے جو سرفراز ہو، چاہیے کہ وہ اس کا اعلان کرے، پھر
 جن پر اکرام کیا گیا اور جو نعمتوں سے نوازے گئے ہیں، وہی بیچارے سربانی اکرم من (میرے مالک نے
 میرا اکرام و اعزاز کیا) کے الفاظ کے ساتھ تحدت بالنعمة کے حکم کی تعمیل اگر کرتے ہیں، تو غلطی کیا کرتے
 ہیں۔ زجر و توبیخ کا مستحق ان کو اس مقام پر کیوں ٹھہرایا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ سا لہا سال تک اسی الجھن
 میں الجھتا رہا، کتابوں میں بھی دیکھتا تھا، لیکن ثر و لیدگی کا ازالہ نہیں ہوتا تھا۔

مدت کے بعد جو بات تھی جب وہ واضح ہوئی، تو صرف یہی نہیں کہ اس مقام کے متعلق جو شکوک
 تھے ان ہی کا ازالہ ہو گیا، بلکہ اس سوال کا یعنی الرزق کو بانٹنے والے نے بسط و قدر کے دو مختلف

پیمانوں پر کیوں تقسیم کیا ہے۔ صحیح علم کی روشنی میں اس کا جو واقعی جواب تھا، وہ بھی مل گیا، اور یہ معلوم ہوا کہ ان دو مختلف پیمانوں پر رزق پانے والوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی رزق کی نوعیت کے متعلق بغیر کسی استحقاق کے بے بنیاد غلط احساسات جو اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔ الرزق کے خود بانٹنے والے نے صحیح علم عطا کر کے ان غلط احساسات کو چاہا ہے کہ مٹا دیا جائے اور ہے بھی یہی بات، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ الرزق کی تقسیم میں یہ طریقہ کار بانٹنے والے نے کیوں اختیار کیا۔ اس کے صحیح جواب کا واقعی علم ظاہر ہے کہ رزق کے بانٹنے والے اور دینے والے ہی کو ہو سکتا ہے، دینے والا ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کیوں دے رہا ہے، لینے والے کیا بتا سکتے ہیں اور کیسے بتا سکتے ہیں کہ دینے والے نے اُس پیمانے پر نہیں اس پیمانے پر اُس شکل میں نہیں اس شکل میں انھیں کیوں دیا یا کیوں دے رہا ہے، علمی دیانت و امانت کا اقتضا، زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ اس کیوں کے جواب میں جہل کا اعتراف کر لیا جائے۔ جس چیز کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کہہ دیں کہ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں، اور جب تک دینے والا خود نہ بتا دے ہم کچھ جان بھی نہیں سکتے، قطعاً نہیں جان سکتے، حقائق و واقعات کے صحیح علم اور صادق تحقیق کی یہی اور صرف ایک ہی متعین راہ ہے۔ اس سے ہٹ کر کہنے والے جو کچھ بھی کہیں گے، یا جو کچھ انھوں نے کہا ہے، اس کی وقعت خود آفریدہ اور اہم اور خود تراشیدہ و سوسوں سے زیادہ، قطعاً زیادہ نہیں ہے، اب علم و تحقیق کے اس صحیح معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر غور کیجئے کہ بسط کے پیمانے پر جن لوگوں کو یہاں روزی مل رہی ہے، مذکورہ بالا علمی و تحقیقی معیار کی بنیاد پر کیا ان کے لئے یہ جائز ہو گا کہ روزی دینے والے سے علم پائے بغیر وہ خود بخود یہ نفاذ چٹنے لگیں کہ دوسروں کے مقابلے میں میرا انتخاب عزت و نعمت کے لئے کیا گیا ہے، اور دینے والے کا یہ مقصود ہے کہ اپنے اینائے جنس میں مجھے معزز و مفتخر کیا جائے، کیا جاننے سے پہلے کسی چیز کے جاننے کا یہ بے بنیاد دعویٰ نہیں ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ علمی امانت کے مقررہ حدود سے ہٹ کر عقلی ٹٹول سے کام لیتے ہوئے آدمی اگر کچھ خیال کر سکتا ہے تو یہی خیال کر سکتا ہے کہ دینے والے پر نہ تو میرا قرض باقی تھا، اس پر میں نے یا میرے باپ دادوں نے کسی قسم کا کوئی احسان بھی نہیں کیا تھا، میرا کوئی خاص رشتہ ناطہ بھی اس کے ساتھ نہیں ہے، ایسا رشتہ یا تعلق جو صرف میری ذات ہی کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ تعلق اس کے ساتھ اگر ہے بھی تو وہی تعلق جو اس کی ہر مخلوق اس کے ساتھ رکھتی ہے، الغرض ایسا ذاتی رشتہ نہیں جو خدا کا بیٹا ہوں، نہ بھتیجا، نہ میرا وہ مقروض ہے اور نہ ممنونِ کرم، ایسی صورت میں عقل اگر کچھ سوچ سکتی ہے تو یہی سوچ سکتی ہے کہ بلا وجہ مجھے امتیاز بخشے اور میرے ساتھ تہجیحی سلوک روار کھنے کا کوئی سبب جب نہیں ہے تو یہ خیال کہ دوسروں کے مقابلے میں میرا انتخاب کر کے خصوصیت کے ساتھ میری عزت افزائی کی گئی ہے، یعنی قرآن کے الفاظ میں

میرے مالک نے مجھے عزت بخشی۔

ساری احکام

کا دعویٰ بسطی معاش رکھنے والوں کی طرف سے خود ہی غور کرنا چاہئے کہ کتنا مضحک، بے بنیاد قطعاً ہے ہر پڑا

دعویٰ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ بسط کے پیمانے پر ان کو کیوں روزی مل رہی ہے؟ اولاً تو اس کیوں کے جواب میں صحیح منطق کی رو سے جہل کا اعتراف، یہی ان کا صحیح علمی مقام تھا، ثانیاً بجائے دینے والے کے ان پانے والوں کے لئے اگر کچھ نہ کچھ جواب تراش ہی لینا ضروری تھا، تو جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس کا اقتضا بھی یہ قطعاً نہ تھا کہ جواب میں وہ سربانی ۲ (میرے مالک نے مجھے عزت بخشی) کا ڈھنڈورا پیٹنے لگیں، لیکن کیا کیجئے کہ جاہل انسان کو ایسا اوقات اپنے جہل پر علم کا دھوکہ لگتا ہے۔ اس کے بعد دونوں میں ایسے خیالات، زبانوں پر ایسے مقالات جاری ہو جاتے ہیں، جن کے متعلق ادنیٰ تاہل سے بھی اگر کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ جس کے سوچنے کا انھیں کوئی حق نہ تھا، وہی وہ سوچ رہے ہیں اور بولنے کی جو بات نہ تھی وہی وہ بول رہے ہیں، یعنی جھوٹ سوچ رہے ہیں جھوٹ بول رہے ہیں!

اور جو حال اس سلسلہ میں بسطیوں کا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ قدری پیمانے پر رزق پانے والے بھی اسی غلطی کے شکار ہیں۔ وہی علمی بددیانتی کہ جس کے جاننے کا کوئی صحیح علمی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا اسی کے جاننے اور جان کر غلط قطعاً غلط احساسات کا اسی بے بنیاد وہم کو سبب بنائے بیٹھے ہوئے ہیں آخر ٹھیک خرچ کے مطابق نئی تلی شکل میں جنھیں دینے والا رزق عطا کر رہا ہے، یعنی قدری پیمانے پر جو رزق پارہے ہیں، ان کی طرف سے یہ اعلان کہ پیدا کرنے والے نے قدری رزق دے کر چاہا ہے کہ اپنے ہم جنسوں میں ہمیں رسوا اور ذلیل ہو کر جینا پڑے یعنی قرآنی تعمیر میں

سربانی ۲ اھانن میرے مالک نے مجھے رسوا اور ذلیل کر دیا۔

لے احساسات سے جو خود اپنے آپ کو بھی جلاتے رہتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو ان مغالطی و سوسوں میں مبتلا کرنے کے جرم کے مجرم ہو رہے ہیں کہ مذہب نے جس ذات کی رحمتوں اور افتوں کا اتنی بلند آہنگیوں سے چرچا پھیلا یا ہے۔ ذرہ ذرہ میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس کی مہربانیوں، کرم فرمائیوں کا مطالعہ کیا جائے رحم سے بھری ہوئی اس ذات نے بغیر کسی سابق تصور کے ان بیچاروں کو رسوائی کی اس جہنم اور ذلت کی اس دوزخ میں کیوں جھونک دیا ہے، آخر یہ فیصلہ کہ ذلیل و خوار ہی کرنے کے لئے قدریوں کے ساتھ قدرت یہ بتاؤ کرتی ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ تحقیق و علم نے قدری پیمانے پر رزق پانے والوں کو ایسے کون سے مقدمات دیئے ہیں، جن کی روشنی میں ان کے دماغوں نے سربانی ۱ اھانن (میرے مالک نے مجھے رسوا کر دیا) کے اس نتیجہ کو پیدا کیا ہے؟ دینے والے سے پوچھے بغیر خود پانے والوں کو اس فیصلے کا اختیار کیا دنیا کی کوئی منطق دے سکتی ہے؟ سوچا جائے تو یہاں بھی منطق سے کام لینے والوں نے الٹی منطق ہی سے کام لیا ہے، حالانکہ درحقیقت نہ سیدھی منطق ہی کا حق ان کو پہنچتا تھا، نہ الٹی منطق کا، بلکہ وہی بات یعنی اعتراف جہل، ان کا صحیح علم اگر کچھ ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا۔ مگر جب منطق ہی کے دامن کو انھوں نے پکڑا تھا، عقل ہی سے فیصلہ مانگتے پر مضطرب و مجبور تھے، تو اسی سے ان کو پوچھنا تھا کہ میں نہ تھا، پیدا کرنے والے نے مجھے پیدا کیا، ان کمالات و صفات کے ساتھ پیدا کیا، جن کا نام انسانی کمالات ہے، مجھے بینائی بخشی گئی، شنوائی بخشی گئی، فہم و فراست فکر و نظر کی قوتیں مجھ میں بھری گئیں، ایسی قوتیں بھری گئیں، جن میں ہر ایک بجائے خود انمول

نعمتیں ہیں۔ ان نعمتوں کی کوئی قیمت دینے والے کو میں نے ادا نہیں کی تھی، بغیر کسی معاوضہ اور مزدوری کے مجانا ان نعمتوں سے میں نوازا گیا، پھر کیا یہ عقل کا مشورہ ہو سکتا ہے کہ وہی جس نے میرے ساتھ یہ سب کچھ کیا، بلا وجہ کسی قصور و جرم کے بغیر میری رسوائی اور خواری کے درپے ہو جائے۔ ذلت کا طوق پہنا کر میرے بھائیوں کے درمیان بد سر بازار وہی میری رسوائیوں کے تماشے سے لذت گیر ہونے لگے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہی قصہ یعنی بتانے کا جو واقعی حقدار تھا، اس سے پوچھے بغیر یہ جو سربانی اہانت، سربانی اہانت یعنی (ہائے ہائے قدری رزق دے کر میرے مالک نے مجھے رسوا کر دیا) کے ساتھ قدری پیمانے پر رزق پانے والوں کا گروہ کوچہ و بازار میں جو چلا تا چیتا پھرتا ہے اور احساس ہانت کی دہکتی انگلیٹھی کو اپنے سینوں میں لئے ادھر ادھر جو مارا مارا پھرتا ہے، کسی حیثیت سے بھی ان کا یہ فیصلہ اور اس فیصلہ کا اثر احساس ہانت کیا علم کے صحیح معیار پر یا مسکین بدنام عقل ہی کی راہ نمائی میں ایک لمحہ کے لئے بھی قابل التفات یا مستحق توجہ ہو سکتا ہے؟

بہر حال تقسیم رزق کے ان دو مختلف پیمانوں کے متعلق بلا وجہ نہ جاننے والوں نے اپنے جس وہم کو علم باور کر لیا تھا، یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ ان کا یہ علم غلط تھا، ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو واقعہ ہے اس کے صرف ایک سلی اور منفی پہلو ہی کا یہ علم ہو سکتا ہے، یعنی ہم نے جو کچھ سمجھا تھا وہ صحیح نہیں ہے بلکہ یہ سوال کہ پھر صحیح واقعہ کیا ہے، انسان ہونے یا خدا کی مخلوق ہونے میں باوجودیکہ سب برابر ہیں۔ ایسی صورت میں ترجیحی وجوہ کے بغیر بعضوں کے لئے بسط کے پیمانے پر، اور بعضوں کو قدر کے پیمانے پر آخر درزی کیوں بانٹی جا رہی ہے؟ مانا کہ جاہل انسان نے جو وجہ تراش لی تھی وہ غلط تھی، لیکن صرف اس کے غلط ہونے کی واقفیت یہ تو نہیں بتاتی کہ قدرت کے اس طرز عمل کی صحیح اور واقعی وجہ کیا ہے؟ یعنی سلی پہلو سے واقف ہونے سے ظاہر ہے کہ مسئلہ کا جواب بجا بی پہلو ہے، پھر بھی آدمی کے لئے وہ مجہول ہی رہ جاتا ہے۔

کیا قرآن میں اس کا جواب نہیں دیا گیا ہے؟ کیسی عجیب بات ہے، قرآن کے گنے چنے وہی الفاظ جو سورۃ الفجر سے میں نے نقل کئے ہیں، ان ہی میں سلب کے ساتھ ایجاب کا بھی صحیح علم حالانکہ عطا کیا گیا تھا، لیکن عموماً خدا کے کلام کو بھی پڑھنے والے جب اسی طریقے سے پڑھتے ہیں، جیسے انسانی کلام پڑھا جاتا ہے، تو یہ دیکھا گیا ہے کہ قرآن جو کچھ دینا چاہتا ہے، جیسا کہ چاہیے۔ اس کے پانے سے لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔ زیادہ مطلب و معنی کے لئے عام طور پر چاہا جاتا ہے کہ الفاظ بھی اسی کی نسبت سے زیادہ ہوں۔ لیکن قرآن کے تجربہ کار ہی جانتے ہیں کہ اس کا رویہ اس باب میں بالکل مختلف ہے، اپنے ایک ایک لفظ میں عموماً معانی کے سمندروں کو وہ بند کرتا ہے، اور اگر ایسا نہ کیا جاتا، بلکہ معانی کے مطابق قرآن میں الفاظ کا بھی طوفان پیدا کر دیا جاتا، تو جس آسانی کے ساتھ مجمل ہونے کی وجہ سے آج اس کی حفاظت ہو رہی ہے۔ میں تو نہیں جانتا کہ ہر زمانے میں وہ اسی طرح ممکن ہوتا، جیسے آج ہو رہا ہے لیکن اسی مسئلہ میں دیکھیے۔ کچھ نہیں صرف ابتلا کا لفظ جسے مذکورہ بالا دو آیتوں میں فقط دو دفعہ دہرایا گیا ہے

غور کرنے والے اگر اس میں غور کریں گے تو مسئلہ کے ایجابی پہلو کے متعلق وہ جو کچھ بھی جاننا اور دریافت کرنا چاہتے ہیں یقین کیجئے کہ سب کچھ اسی ایک لفظ میں ان کو مل جاتا، پہلے ”ابتلا“ کے اس لفظ کے جو معنی ہیں، اسے سمجھ لیجئے، پھر جن مطالب پر وہ مشتمل ہے، خود بخود سمجھنے والوں کی سمجھ میں آئے لگیں گے۔

۲۔ ابتلا کے آخر میں لا کا جو حرف ہے، یہ تو ضمیر ہے اور انسان اس کا مرجع ہے، رہ جاتا ہے اب صرف ۲۔ ابتلا یہ ماضی کا صیغہ ہے، مصدر اس کی ابتلا رہے جو اردو میں بھی عموماً مستعمل ہے، امتحان یا آزمائش، جانچنا اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ تو اب ۲۔ ابتلا کا ترجمہ ہوا، آدمی کے رب نے آدمی کا امتحان لیا، یا آزمایا، جانچا، یہ تو اس لفظ کے لغوی معنی ہوئے، رہا مطلب سو غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ امتحان یا آزمائش جانچنے، کے الفاظ انسان کی طرف جب منسوب ہوتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ جس کا امتحان لیا جاتا ہے، اس کے ایسے حالات جن سے امتحان لینے والا ناواقف ہوتا ہے چاہتا ہے کہ امتحان کے ذریعہ سے ان ہی حالات کو جانے، مثلاً اس کے معلومات کیسے ہیں، فلاں علم میں اس کی استعداد کیسی ہے، یہ یا اسی قسم کے نامعلوم امور سے واقفیت امتحان لینے والے کی غرض ہوتی ہے۔ پھر خدا کی طرف بھی امتحان کے لفظ کو جب منسوب کیا جاتا ہے تو ایسا ذیابند اس کا بھی کیا ہی مطلب ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے یعنی خدا بندوں کے جن حالات سے ناواقف ہے، امتحان میں ڈال کر چاہتا ہے کہ ان ہی حالات کو وہ جانے، خدا کو سرے سے نہ ماننا یہ دوسری بات ہے، لیکن خدا کو خدا مان کر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کو اس مطلب کے انتساب کی جرات ہو سکتی ہے؟ پس سوال یہی ہے کہ کسی کا امتحان جب خدا لینا چاہتا ہے یا کسی کو آزمایا جاننا چاہتا ہے تو پھر اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ عام مذاہب وادیان میں عموماً، خصوصاً قرآن میں بکثرت ابتلا یا اسی کے ہم معنی الفاظ کا انتساب حق تعالیٰ کی طرف کیا گیا ہے؟ دریافت طلب یہی بات ہے کہ اس وقت اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ جب یہ مسلم ہے کہ خدا کی باتوں کو مخلوقات اور مخلوقات کے صفات و افعال کے مماثل قرار دینا مذہباً ناجائز ہے، کم از کم قرآن نے ایسے مسئلہ شئی (کوئی چیز خدا کے مانند نہیں ہے) کا اعلان کر کے مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا ہے کہ ذات میں ہو یا صفات میں، یا افعال میں، الغرض کسی اعتبار سے کسی چیز کو خدا کے مماثل نہ ٹھہرانا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ سماعت بصارت علم و حیات وغیرہ جیسے صفات قرآن میں جو خدا کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، سب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی نسبت سے ان کا وہ مطلب قطعاً نہیں ہے جو انسان کی طرف ان ہی صفات کو منسوب کرنے کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ مثلاً بصارت یعنی دیکھنے ہی کی ایک صفت ہے، آدمی کی طرف جس بصارت اور بینائی کے الفاظ کو ہم منسوب کرتے ہیں، تو اس وقت بینائی کی اس صفت سے مراد ایسی صفت ہے جو عمل کرنے میں رنگ اور روشنی کی محتاج ہوتی ہے اور بعد مفرد نہ ہو قرب مفرد نہ ہو۔ ان شروط کے ساتھ اس کے آثار کا ظہور مشروط و وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مجسمہ اسی بصارت کے لفظ کو خدا کی طرف جب منسوب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خدا دیکھتا ہے، تو ہم میں ہر ایک جانتا ہے کہ خدا کی یہ صفت نہ رنگ کی محتاج ہے نہ روشنی کی، نہ دوسرے شروط کی، بلکہ وہ دیکھتا ہے، ہر حال میں دیکھتا ہے، پھر دیکھنے کے

اس لفظ کا جو حال ہے، اگر جانچنے آزمائے امتحان لینے کے الفاظ کا بھی یہی حال ہو، یعنی انسان کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں اور معنی ہو، اور خدا کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں دوسرے معنی ہوں، تو آپ ہی بتائیے کہ اور ہوتا کیسا، یہ کتنی بڑی غلط بدگمانی ہے جو بعضوں سے میں نے سنی کہ ایسے مواقع پر اعتراض پٹرنے کے بعد اعتراض سے گریز کے لئے خدا کی طرف امتحان و ابتلاء کے منسوب ہونے والے الفاظ کے معنی کو مولوی بدل دیتے ہیں، حالانکہ آپ نے دیکھا کچھ اسی ابتلاء و امتحان کے لفظ کی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عام کلی قانون ہے۔ جو ذات و صفات و افعال وغیرہ وغیرہ سب ہی پر حاوی ہے۔ خدا اپنی تمام شانوں میں جیسے نرالا بے مثل بے نظیر ہے، اسی طرح ابتلاء و امتحان کا جو فعل خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ اس امتحان سے جو ایک مخلوق دوسری مخلوق کی لیتی ہے، قطعاً مختلف ہے اور اس کو مختلف ہونا ہی چاہیئے رہا یہ سوال کہ خدا کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں ابتلاء و امتحان یا آزمائے جانچنے کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہوتا ہے، یہ بھی ایسی بات نہیں ہے جو لوگوں کو معلوم نہ ہو، آخر کون نہیں جانتا کہ قرآن میں ایک جگہ نہیں، متعدد مقامات میں بار بار مختلف الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی خاص حالت و کیفیت ہی نہیں، بلکہ جس زندگی کو آدمی اس وقت زمین پر گزار رہا ہے، مستم اس کی یہ پوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان ہی کی زندگی ہے، ایسی آیتیں مثلاً

پیدا کیا خدا نے موت اور حیات کو تاکہ جانچے
تمہیں (یعنی یہ جانچے) کہ تم میں عمل ہیں

خلق الموت والحیات لیبْلُوکُمْ
ایکم احسن عملاً۔

سب سے اچھا کون ہے۔

یا

ہم نے پیدا کیا آدمی کو ایک لمبے جلمے لطف سے تاکہ
جانچیں ہم اس کو، پس بنایا ہم نے اسی

۱۲ فَاخْلُقْنَا ۱۲ اِلَآ اِنَّا نَسْأَلُكَ
۱۲ اَمْتًا ۱۲ نَبْتَلِيْكَ فَجْعَلْنَاكَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا

انسان کو شنوا اور بینا۔

ظاہر ہے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتوں کی کیا کمی ہے؟ حاصل جن کا یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو، کوئی خاص رُخ ہی نہیں، بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی امتحان و ابتلاء کی زندگی ہے، اور یہ کیا ہے، تمام آفاتِ کائنات کے مقابلہ میں بشری فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، دورا ہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے، درحقیقت فطرت کے اسی اقتضا کے صحیح استعمال کے مطابق یہ دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان کی زندگی ہے، خدا صریحاً ہوا کہ خدا کی طرف ابتلاء و امتحان کے الفاظ جو منسوب کئے جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا، امتحان لے کر ان ہی کو جاننا چاہتا ہے، بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے، اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطابق کا نام ابتلاء و امتحان ہے۔

اب آئیے، بسط و قدر کے دو مختلف پیمانوں پر رزق کی تقسیم کے متعلق خدائی اوہام اور غلط خیالات کی

تردید کے بعد قرآن میں جو ایجابی علم ابتلا کا کے لفظ سے دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب متعین کیجئے۔ جو باتیں اب تک آپ کو ابتلا و امتحان کے متعلق معلوم ہو چکی ہیں، ان ہی کو پیش نظر رکھ کر سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ اللہ اثبات کیا تھی اور غلط معلومات سے انسان کی فکری معکوسیت کن کن غلط نتیجوں کو پیدا کر رہی تھی، بسطی پیمانے پر رزق پالنے والے اپنے بافیدہ خیالات میں مگن ہو کر اکر رہے تھے، اتر رہے تھے کہ ان کا اکرام کیا گیا، اپنے ہم چشموں، ہم جنسوں میں ان کا سراونچا کیا گیا ہے۔ گویا دوسرے قدرت کے چہیتوں اور پیاروں میں ہیں، یوں ہی ضرورت کے مطابق قدر کے پیمانے پر جن کی روزیاں مہیا ہو رہی ہیں، خود اپنے دماغ کے بھپھاروں سے گرم گرم ہو کر کڑھ رہے تھے، کڑھ کر اتر رہے تھے کہ ہمیں پیدا کر کے رسوا کیا گیا، یہی ایک رونا تھا، جس کے ساتھ وہ رو رہے تھے، غم کے آنسوؤں سے اپنے چہروں کو دھو رہے تھے، مگر یہ تو خود تراشیدہ خیالات، غلط معلومات سے نکالے ہوئے غلط نتائج تھے، ظاہر ہے کہ ابتلا کا کا خدائی اعلان اب جس حقیقت کو واشگاف کر رہا ہے، یعنی ناواقفوں، جاہلوں کو واقف بنایا جا رہا ہے کہ تقسیم رزق کی دونوں شکلوں اور دونوں پیمانوں میں بانٹنے والے اور تقسیم کرنے والے کی غرض یہ ہے کہ جس کسی کو جس پیمانے پر بھی بسط کے پیمانے پر ہو یا قدر کے پیمانے پر جو کچھ بھی جس شکل میں دیا جا رہا ہے، ہر ایک سے دینے والے کا یہ مطالبہ ہے کہ جو کچھ انھیں دیا جا رہا ہے اس کے استعمال کئے صحیح اور غلط طریقوں میں سے جو صحیح طریقہ ہے اسی کو اختیار کریں، جس کے دوسرے معنی یہی ہوئے کہ معیشت کے ان دونوں حالوں (بسط و قدر) دونوں میں بظاہر یہ جو معلوم ہوتا تھا کہ دیا گیا ہے، واقعہ کے صحیح علم کی روشنی میں اب سوچ رہا ہے کہ درحقیقت ہر ایک سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سچ پوچھو تو مانگا گیا ہے۔ اسی لئے تو سمجھا جاتا ہے کہ رزق میں جو یہاں بڑھائے گئے ہیں نہ جاننے کے وجہ سے اپنے اپنے دلوں میں خواہ وہ کسی قسم کے خیالات پکار رہے ہوں، لیکن جو واقعہ ہے اس کے جان لینے کے بعد یہی کہنا پڑتا ہے کہ دراصل ان کی ذمہ داریاں بڑھائی گئی ہیں، اور الرزق جن کا گھٹایا گیا ہے، ناواقفیت کی وجہ سے اپنے متعلق خواہ جس قسم کا بھی غلط خیال وہ قائم کر لیں۔ لیکن سچی بات حقیقت کے مطابق یہی ہے کہ دراصل ان کی ذمہ داریاں گھٹائی گئی ہیں، جانتے والے سے جو واقعہ ہے اس کا صحیح علم پانے کے بعد سمجھنے والوں نے یہی سمجھا ہے۔ بلکہ اس کے سوا وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے یہاں تو خیر اجمال سے بھی کام لیا گیا ہے۔ سورۃ "الانعام" کو ختم کرتے ہوئے اسی اجمال کی تفصیل خود قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے،

اور خدا ہی ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا
جانشین (خلیفہ) بنایا اور تم میں بعض کو بعض
سے درجوں میں اونچا کر دیا (یہ اس لئے
کیا گیا ہے) کہ جانچے خدا تمہیں ان چیزوں
کے متعلق جو تمہیں اس نے دی ہیں قطعاً

وہو الذی جعلکم خلائف فی
الارض و رفع بعضکم فوق بعض
درجات لیسوکم فیما افاکم ان
مر یک سرایع العقاب وانہ
لغفور رحیم۔

تمہارا مالک زود انتقام بھی ہے اور قطعاً بلاشبہ وہی بہت بڑا بخشے والا اور بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ زمین اور زمین کی پیداواروں پر قابو عطا کر کے مدارج و مراتب کا جو اختلاف نسل انسانی کے افراد میں پیدا کر دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دینے والے نے جس کسی کو جو کچھ دیا ہے، اسی لئے دیا ہے تاکہ وہ جانچے اور آزمائے، گویا الفجر میں جو بات مجمل تھی وہی یہاں مفصل ہے، اسی طرح الاولاد کے ساتھ "الاموال" کو فتنہ کا نام قرآن میں جو دیا گیا ہے تو اسی حقیقت اور اسی واقعہ سے ان الفاظ کے ذریعہ قرآن پر وہ اٹھانا چاہتا ہے، معاشی زندگی کے ان درجاتی اختلافات کے متعلق جہل نے جو تاریکیاں پھیلائی ہیں، قرآن کا قاعدہ ہے کہ علم کی روشنی دے کر پہلے ان تاریکیوں کا ازالہ کر لیتا ہے، اور اس کے بعد اسی علم کے مطابق عمل کا نظام پیش کر کے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہر ایک اپنے علم کو صحیح علم کے مطابق بنانے کی کوشش کرے اور طبعی طریقہ عملی زندگی کی تصحیح کا یہی اور صرف یہی ہے، علم کی تصحیح سے پہلے عمل کے اصلاح و درستگی کا جو لوگ ارادہ کرتے ہیں، یقیناً مانئے کہ چلنے کی حد تک تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی چل رہے ہیں، لیکن چلنے والے ہی جانتے ہیں کہ قدم قدم پر جہل کی آیتیں بیڑیاں کس طرح ان کے لئے روک بنتی چلی جا رہی ہیں، اسی مسئلہ میں خیال کیجئے، تقسیم رزق کے ان دو بیانیوں سے پیدا ہونے والے مشکلات سے آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو نجات بخشی جائے، لیکن تقسیم رزق کے اس دورنگے نظام کا جن واقعات سے تعلق ہے، ان واقعات کے متعلق علم اور تحقیق کے صحیح ذرائع سے صادق معلومات جو درحقیقت واقعات کے مطابق ہوں۔ ان معلومات کے حاصل کئے بغیر مشکلات، معاشی مشکلات "مدارج و مراتب کے اختلاف و تفاوت سے پیدا ہونے والے مشکلات" ان ہی الفاظ، صرف الفاظ کو اگر آپ رٹتے رہیں گے تو دوسروں کو جانے دیجئے، اپنے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچیے، تشفی و اطمینان کی خنکیوں کا کوئی اثر آپ اپنے اندر محسوس فرما رہے ہیں، ہر عملی اقدام جو صحیح علم کی روشنی میں نہ ہو، اسی کا نام تو غیر حکیمانہ اقدام اور ان سائنٹفک طرز عمل ہے! اسی مسئلہ میں کیا ہوا یا کیا ہو رہا ہے؟ مسئلہ چھڑ دیا گیا، سوال اٹھا دیا گیا، لیکن اللہ کے بندوں میں کوئی نہیں جو یہ پوچھے کہ جھگڑنے والو! باہم ایک دوسرے پر پھیرنے والو! اس عملی پیچیدگی سے پہلے طے کرنے کی باتیں تو یہ ہیں کہ رزق کی تقسیم کا تعلق کس ذات کے ساتھ ہے؟ وہ خدا کی ذات ہے یا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟ اور خود اس سوال سے پہلے تنقیح طلب سوال یہی ہے کہ جھگڑنے والے مرے سے خدا کو مانتے بھی ہیں یا نہیں، اگر مانتے ہیں تو سب مانتے ہیں، یا کوئی پارٹی بہت کرنے والوں کی صرف خدا کو مانتی ہے یا کوئی نہیں مانتی، کھلی ہوئی بات ہے کہ جو حق تعالیٰ کو مانتے ہیں اور مومن ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا رسول بویقین کر چکے ہیں، اس یقین میں، دنیٰ ترین شک بھی ان کی فطرت کے لئے ناقابل برداشت بن چکا ہے، ان کا اور ان لوگوں کا طریقہ بحث و تحقیق ایک کیسے ہو سکتا ہے جو سرے سے العیاذ باللہ حق تعالیٰ کے وجود ہی کو جھٹلاتے ہیں، یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صادق دعویٰ کے انکار پر ان کو اصرار ہے۔ فکر و نظر کی راہ دونوں کی ایک، کیسے ہو سکتی ہے؟ اور یہ سارے مسائل کیا ہیں۔ علم ہی سے تو ان کا تعلق ہے، واقعہ کیا ہے؟ خدا ہے یا نہیں۔ ہے، خدا کے رسول

خدا کے رسول واقع میں تھے بھی یا (استغفر اللہ استغفر اللہ) اس میں ابھی کچھ دبدبا اور تردد ہے، ٹھیک ٹھیک واقعات کے مطابق ان سوالوں کے جوابات کا صحیح صحیح علم طے شدہ فیصلوں کی صورت میں جب تک بحث و تحقیق کرنے والے حاصل نہ کر لیں گے کیا فکر و نظر کی کوئی منطق اس مسئلہ پر ان کو گفتگو کرنے کی اجازت دے سکتی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ خواہ مخواہ اثبات ہی میں جواب کا علم حاصل کیا جائے۔ بندگانِ خدا حاصل اگر کر سکتے ہو تو نفی و انکار ہی کے متعلق آخری فیصلہ، ایسا فیصلہ حاصل کر لو جس میں شبہ اور شک کی پھر گنجائش، کسی قسم کی گنجائش باقی نہ رہے۔ مگر نفی ہو یا اثبات دونوں سے قطع نظر کہ صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کے کیا معنی؟ آخر اس قسم کے مباحث میں آج یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہاں خدا کو یا مذہب کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب کیا یہی نہیں ہوا کہ صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے صحیح علوم کو درمیان میں لانے کی کیا حاجت ہے، خدا کا نام یا مذہب کا نام ایسے مواقع پر اگر لیا جاتا ہے تو غرض اس سے یہی تو ہوتی ہے کہ خدا نے جو علم اس مسئلہ میں دیا ہے، یا مذہب میں جو معلومات اس کے متعلق پائے جاتے ہیں پیش کرنے والے ان ہی کو تو خدا کے یا مذہب کے نام سے پیش کرتے ہیں، ہم تو جہاں تک جانتے ہیں، یہی جانتے ہیں، ایسا مذہب جس کے ماننے والے اسے سچا مذہب بھی مانتے ہوں، جو معلومات اس میں ملتے ہوں انہیں خدا داد علوم بھی یقین کرتے ہوں لیکن مذہب کے ان معلومات اور خدا کے عطا کردہ ان علوم کا زندگی کے جن مسائل سے تعلق ہو، ان ہی کے متعلق جب ٹھیک واقعات کے مطابق فکر و تحقیق، بحث و تمحیص کا قصہ چھڑے، تو ان معلومات اور ان علوم سے خطرہ ہو کہ ان کی راہ نمائی میں ہم غلط نتائج تک پہنچ جائیں گے، دیوانہ ہی ہو گا جو ایسے علوم اور معلومات کو اپنا مذہب یقین کر لے، اور ایسی باتوں کو سمجھے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں، اس عقلی انتشارِ دہنی پر انگدگی کی کوئی انتہا بھی ہے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ یہ ثباتِ عقل و ہوش اس قسم کے متناقضات ایک دوسرے کی تعلیط کرنے والی یا ہم دو متضاد چیزوں کو اپنے دماغ اور دل میں کوئی کیسے جگہ دے سکتا ہے، لعنت ہے ایسے مذہب پر اور اس کے معلومات پر جو عمل کے وقت بجائے صحیح راہ نمائی کے غلط راہنمائی اور بجائے راستی کی جنت کے جھوٹ کی جہنم میں آدمی کو ڈھکیل دے۔

بہر حال ہم مسلمانوں کے نزدیک مذہب معلومات کے اس مجموعہ کا نام ہے جن کا تعلق علم محیط کے لازوال سرچشمہ سے ہے۔ علم کا وہی ابدی سرچشمہ جس سے نہ غائب پوشیدہ ہے اور نہ حاضر مستقبل میں بھی جو کچھ پیش آنے والا ہے، پیش آنے سے پہلے وہ جانا ہوا ہے، ظاہر میں جو کچھ ہے اس پر بھی اور باطن کی گہرائیوں میں جو کچھ پوشیدہ ہے اس پر بھی علم کی یہ لازوال قوت حاوی ہے اور اس طور پر حاوی ہے جس سے کسی شئی اور کسی مسئلہ کا کوئی پہلو پوشیدہ نہیں ہے، جس کے جھٹلانے کی قوت ہمارے قلوب سے سلب ہو چکی ہے، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کا یقین ہمیں دلایا ہے۔ اسی یقین کے ساتھ ہم جینا بھی چاہتے ہیں، اور اسی طرح ہم میں ہر ایک مسلمان قطعی فیصلہ کی صورت میں یہ طے کئے ہوئے ہے کہ اسی پر وہ مرے گا بھی، مذہب کا یہی مطلب ہمیں سمجھایا گیا ہے، اس کے سوا

ہم کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتے، جن مذاہب کی صداقتوں میں جھوٹ کے عناصر تحلیل پا چکے ہیں۔ اگر ان کے ماننے والوں میں مذہب کسی مصلحت آمیز دروغ کا نام ہے تو شاید وہ مجبور بھی ہیں۔ وہ کسی مذہب کی طرف انتساب کی قیمت اگر صرف یہی سمجھتے ہیں کہ پرانے اباؤ اجداد کی وہ ایک مردہ یادگار ہے۔ عملی زندگی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، تو ان پر کون ملامت کر سکتا ہے، جب ان کا علم ہی غلط ہو چکا ہے تو غلط علم سے صحیح عمل اور صحیح عمل کے صحیح نتائج کی توقع اگر وہ نہیں کر رہے ہیں، تو انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کے سوا وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے، لیکن مسلمانوں میں اپنے پیغمبر کے ساتھ جن کا لفظی تعلق نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے مذہب کے صحیح معلومات کو جاننا چاہتے ہیں، اور ان ہی کے لئے مندرجہ ذیل معلومات پیش کئے جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمام حیوانی طبقات کے مقابلہ میں آدم کی اولاد کے ساتھ رزق کی تقسیم میں دو رنگی کا یہ طریقہ جو قدرت کی طرف سے اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح مقصد صحیح علم کی روشنی میں کیا معلوم ہوتا ہے، بسط کے پیمانہ پر ہو یا قدر کے جس پیمانے پر بھی جنہیں رزق دیا گیا ہے، دینے والا ان سے کیا چاہتا ہے؟ جیسا کہ میرا التزام ہے، اسلامی مستندات سے اس کا جواب بھی ان ہی الفاظ میں درج کروں گا جو ان میں پائے جاتے ہیں، اور یہ بات کہ ان مطاببات کی تکمیل و تعمیل پر کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں، اور جو خلاف ورزی کریں گے انہیں کن خمیازوں کو آخرت ہی میں نہیں دنیا میں بھی کیا بھگتنے پڑیں گے، قرآن میں چونکہ ان تمام امور کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، اس لئے اپنی معاشی کی حد تک ان کا بھی ذکر کروں گا۔

بلکہ سچ پوچھیے تو ان سارے طول طویل مباحث کی تہہ میں درحقیقت جس چیز کا تذکرہ مقصود ہے وہ یہی آخری بات ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کے مرضیات کی پروا نہ کر کے اپنی معاشی زندگی جو گزار رہے ہیں، ان کی معادی اور آئندہ پیش آنے والی زندگی ہی نہیں بلکہ موجودہ معاشی زندگی کو بھی قدرت کس طرح تلخ بنا کر چھوڑتی ہے، یاد ہو گا کہ اس سوال کے جواب میں بحث کا آغاز ہوا تھا یعنی دعویٰ کیا گیا تھا کہ جو سکھ کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے متعین راہ یہی اور صرف یہی ہے کہ پیدا کرنے والے ہی کو اپنا الہ المعاد اور الہ المعاش بنا کر پوجتے چلے جائیں۔ اب آئندہ جو چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی وہ اسی بات کی تفصیل ہوگی یعنی حق تعالیٰ کو الہ المعاد بنانے کے ساتھ الہ المعاش بنا کر پوجنے کی کیا شکل ہے۔ اس راہ پر چلنے کے نتائج آئندہ زندگی ہی میں نہیں بلکہ موجودہ زندگی میں بھی کن شکلوں میں سامنے آتے ہیں اور اس راہ سے ہٹ کر بغاوت و انحراف کی زندگی بسر کرنے والوں کے متعلق مرنے کے بعد ہی نہیں مرنے سے پہلے ہی قرآن کن خمیازوں کی دھکیاں دیتا ہے اور تجربہ ان کی کس حد تک توثیق و تصدیق کر رہا ہے لیکن بحث شروع کرنے سے پہلے ایک مسئلہ پر تبنیہ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ بسط و قدر کے دو مختلف پیمانوں پر تقسیم رزق کا جو سلسلہ دنیا میں جاری ہے ایک طرف تو اس کا یہ حال ہے کہ کوئی آبادی یا بستی ایسی نہ ہوگی جس میں اپنے ماحول اور مقامی خصوصیات کے لحاظ سے رزق پانچے والوں کی یہ دونوں قسمیں نہ پائی جاتی ہوں یعنی دوسروں کے اعتبار سے اس آبادی کے عام باشندوں کو آپ خواہ کچھ ہی قرار دیں بسطی یا قدری لیکن خود آبادی کے باشندوں کو دیکھا جاتا ہے کہ اپنی

جماعت میں بعضوں کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ وہ بسط کی حالت میں ہیں۔ اسی طرح دوسروں کو ان کے مقابلے میں سمجھتے ہیں کہ وہ قدر کی زندگی رکھتے ہیں، لیکن دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ ایسا آدمی جو کسی آبادی میں بسطی معاش والا سمجھا جاتا ہے، بسا اوقات وہی اس سستی کے باہر رہنے والوں کے مقابلے میں قدری قرار پاتا ہے، وجہ اس کی وہی ہے کہ رزق کی یہ دونوں حالتیں (بسط و قدر) درحقیقت معاشی مدارج کی اضافی و نسبی شکلیں ہیں، یہی نہیں کہ ایک آدمی کسی آبادی میں تو بسطی سمجھا جاتا ہو، اور آبادی کے باہر دوسروں کے اعتبار سے خود وہی اپنے آپ کو قدر کی حالت میں پاتا ہو، بلکہ ایک ہی آدمی مختلف اوقات میں اپنے آپ کو کبھی بسط کبھی قدر کی حالت میں پاتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں معاشی زندگی ہی کے بعض شعبوں میں یہ بالکل ممکن ہے کہ اپنے آپ کو بسط کے حال میں پائے اور دوسرے شعبہ میں وہی قدر کی کیفیت محسوس کرے، رزق کی ان دونوں کیفیتوں کی اضافی ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ صحیح طور پر افراد کی تعیین و مشاور ہے۔ عمل کی صحیح راہ ایسی صورت میں یہ ہے کہ آدمی بسط کی حالت میں جب اپنے آپ کو پائے سمجھے کہ یہ بسطی ہدایات کے عمل کا وقت ہے، اور جب قدر کی حالت میں اپنے آپ کو دیکھے تو اس وقت ان ہدایتوں کی راہ نمائی حاصل کرے جن کا تعلق قدریوں سے ہے۔

بہر حال یہ سوال کہ جب سب خدا ہی کے بندے اور اسی کے آفریدہ ہیں، تو تقسیم رزق کے سلسلہ میں کسی کو بسط کے پیمانے پر دے کر امیر اور دوسروں کو قدر کے پیمانے پر دے کر غریب کیوں بنا دیا گیا ہے امیروں کے ساتھ قدرت کا ایسا کونسا انوکھا رشتہ ہے جو عزت و نعمت سے وہ نوازے جا رہے ہیں اور غریبوں نے خدا کا کیا بگاڑا تھا کہ افلاس و غربت کا طوق پہنا کر ان کو رسوا اور ذلیل کیا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ اس سوال کی بنیاد تو اس پر قائم تھی یعنی واقعہ اگر یہ ہوتا کہ دینے والے کی طرف سے سمجھا جائے کہ لوگوں کو دیا جاتا ہے، صرف دیا جاتا ہے۔ دے دیا جاتا ہے۔

لیکن جب صورت حال یہ نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہاں مانگا گیا ہے اور جسے جتنا زیادہ دیا گیا ہے۔ اسی قدر اس سے زیادہ مانگا گیا ہے، خود دینے والا جب یہی اعلان کر رہا ہے اور اپنے دینے کی غرض یہی بتا رہا ہے تو جو دینے والے نہیں ہیں، ان کے دوسووں کی کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے۔

کیسی عجیب بات ہے جو نہیں جانتے تھے اور جاننے کا حق نہیں رکھتے تھے، بے جانے ہوئے وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، قطعاً وہ بات الٹ گئی، اب تو اسی کو زیادہ دینا پڑے گا جسے زیادہ دیا گیا ہے اور وہی ہلکا پھلکا ہے، جسے زیادہ دیا گیا ہے نہ اس سے زیادہ مانگا جائے گا۔ اور شاید رحمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ اکثریت و عمومیت کو زیادہ تر قدری پیمانے پر رزق غالباً اسی لئے بانٹا جاتا ہے کہ خدا ان کی ذمہ داریوں کو کم اور ان کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے، آخر ایسی ذمہ داریاں اور ایسا بوجھ جن سے نہ ہر شخص باسانی عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور نہ ہر ایک میں اس بوجھ کے لادنے کی صلاحیت ہی ہوتی ہے۔ اگر اکثریت کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے تو خدا کی مہربانی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جائے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہر آبادی میں محدود سے چند افراد کو بسط کے پیمانے پر دے کر بسطی ذمہ داریاں عائد بھی کی جاتی ہیں تو اس طور پر

اسلامی معاشیات
کہ خود اپنی خواہش اور رضامندی سے وہ ان ذمہ داریوں کو لینے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ آخر بسطی
پیمانے پر رزق پانے والوں میں ایسا کون ہے جو خود تو قدری رزق کا طالب تھا۔ لیکن قدرت نے اس پر
بسطی رزق کا بوجھ لا دیا ہو، عام طور پر دیکھا تو یہی جاتا ہے کہ بسطی رزق کے حاصل کرنے میں ہر ایک
کوشش کی انتہائی شکلوں کو ختم کر دیتا ہے، بلکہ حاصل کر لینے کے بعد بھی اس کی بقا بلکہ ارتقاء کی ممکنہ
صورتوں کے مہیا کرنے میں قطعاً کسی قسم کی کوتاہی کو کسی حال میں روا نہیں رکھتا۔ ان میں شاید ہی کوئی
ایسا ہو گا جو اپنے رزق کے اس بسطی پیمانے کو قدری پیمانے سے بدلنے پر دل سے راضی ہو سکتا ہو، پس
یہ بھی جو کچھ ہوتا ہے۔ خود لا دیتے والے کی خواہش اور مرضی سے ہوتا ہے اور یہ بات کہ ان ہی سے زیادہ
مانگا جاتا ہے جنہیں زیادہ دیا جاتا ہے، یہ بھی ایک ایسا فطری مطالبہ ہے کہ مذہب تو خیر مذہب ہی ہے،
بغیر کسی استثناء کے دنیا کے تمام ملل و ادیان میں بسطیوں کی ذمہ داریوں کی فہرست طویل ہوتی ہے، ہم تو
دیکھتے ہیں کہ غیر مذہبی دائروں میں بھی مطالبوں کا سارا نزلہ اسی طبقہ پر نازل ہوتا ہے، جو نسبتاً بسطی پیمانے پر
رزق پاتے ہیں، مذاہب میں خیر و خیرات، صدقات و زکوٰۃ، صلہ رحمی و مواسات وغیرہ مختلف ناموں
سے ان پر اگر ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں تو ٹیکس، ریونیو، سس باج، خراج اور کیا کیا بتایا جائے کہ کن
کن ناموں سے حکومتیں بھی اگر مانگتی ہیں تو ان ہی سے مانگتی ہیں۔ اسی طرح چندہ فنڈ بھری، امداد و اعانت
وغیرہ اسماء مختلفہ سے قومی کارکنوں کا حملہ اگر ہوتا ہے تو ان ہی پر ہوتا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ اپنی ذاتی
ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد جس کے پاس کچھ پس ماندہ رہ جاتا ہو، ظاہر ہے کہ مانگا اگر جائے گا تو اسی
سے مانگا جائے گا، اور یہ بات جیسا کہ گذر چکی ان ہی لوگوں کو میسر آ سکتی ہے، جنہیں قانون بسطی پر روزی مل
رہی ہے، باقی جن لوگوں کی آمدنی خرچ کے ساتھ نپ تل کر ملتی ہو، یعنی قدر کے پیمانے پر رزق جو پار ہے ہیں،
ان سے مانگنے والے آخر کیا مانگیں گے، ان کے پاس باسی ہی کب بچتا ہے، جس کے لئے کھانے والوں کو
ڈھونڈھنے کی ضرورت محسوس ہو، اور سچ تو یہ ہے کہ فطری نقطہ سے ہٹے ہوئے ایسے انحراف یا فتنہ قلوب جن کا
ذکر قرآن میں بایں الفاظ فرمایا گیا ہے کہ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمہیں جو روزی عطا کی ہے اس سے خرچ کرو، تو انکار کرنے والے ماننے والوں سے کہتے ہیں، کیا ہم اس میں کھلاؤں جنہیں خدا چاہتا تو کھلا سکتا تھا۔ نہیں ہر لوگ

(یعنی جو لوگ غریبوں کی امداد کا مطالبہ امیروں سے کرتے ہیں) لیکن کھلی گمراہی میں۔

فطرت کے ان بیماروں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، تو عام حالات میں خود بسطیوں کا طبقہ خود بھی اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے جن کا بسط کی حالت میں مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اور اسی لئے الرزق کے بسطی پیمانے کے متعلق قرآن نے ابتلائی و امتحانی ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے، میرے نزدیک تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے

جس کی تصدیق ہر اس شخص کی فطرت کرتی ہے جو خدا نخواستہ کسی شدید غیر فطری عارضہ کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ لیکن بسطی پیمانے کے ساتھ ساتھ الرزق کے قدری پیمانے کو بھی ابتلائی و امتحانی فترار دیتے ہوئے قرآن میں جو یہ ارشاد ہے کہ

وَمَا يَذِلُّهَا بِلَا فَتْرٍ
عليه سرزقہ۔
لیکن انسان ہی کو خدا جب جانچتا ہے
اور (اس جانچنے کے سلسلے میں) پنی تلی
کر دیتا ہے اس کی روزی کو۔

یعنی قدری پیمانے پر بھی رزق جنھیں دیا جاتا ہے۔ ان کا بھی ابتلا ہی مقصود ہے، دوسرے الفاظ میں اس کا یہی مطلب ہوا کہ ان کو بھی جو کچھ دیا جاتا ہے۔ لیکن ہی کیلئے دیا جاتا ہے۔ یہ ظاہر یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے عام احساس اس سلسلہ میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ قدر کے پیمانے پر جو لوگ روزی پاتے ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ روزی کے حساب سے ان کا قدر اور تنگی کی حالت میں ہونا، یہی کافی ہے، اب مزید ذمہ داری ان پر کیا عائد ہوگی؟

لیکن دوسرے مذاہب و ادیان کے متعلق تو میں نہیں کہتا، قرآن میں ایک طرف ذمہ داریوں کا ایک سلسلہ اگر ایسا پایا جاتا ہے جن کا تعلق بسطیوں سے ہے تو دوسری طرف ذمہ داریوں ہی کی ایک فہرست ایسی بھی ہے، جن کے متعلق لوگوں کا خیال خواہ کچھ ہی ہو، لیکن میرے نزدیک براہ راست ان کا رخ ان ہی لوگوں کی طرف ہے جو قدری پیمانے پر یہاں رزق پا رہے ہیں، اور اسی بنیاد پر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا جیسے مکلف بسطیوں کا طبقہ ہے، بجنسہ اسی طرح قدریوں کے گروہ کو بھی قرآن نے ذمہ دار بنایا ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ دونوں طبقات کی فتر آنی ذمہ داریوں کو الگ الگ درجہ کر دوں۔

بسطی رزق کی | جیسا کہ ابھی یہ بات گذری کہ بسطی پیمانے پر رزق پانے والوں کی ذمہ داریاں تو اتنی بدیہی
ذمہ داریاں | ہیں کہ نہ صرف دوسرے بلکہ خود بھی اپنے آپ کو یہ طبقہ ذمہ دار محسوس کرتا ہے۔ اسلام کے مطالبات بھی ان سے وہی ہیں، جن کا عام نام خیر و خیرات، انفاق فی سبیل اللہ ہے، اسی عام مطالبہ کی ایک منظم قانونی شکل الزکوٰۃ ہے جس کی تفصیل قانونی ابواب کے ذیل میں کی جائے گی۔ قرآن میں اسی مطالبہ کا ذکر اجمالاً و تفصیلاً کیا گیا ہے۔ خود اسی موقع پر یعنی سورۃ الفجر کی اسی آیت میں جس میں بسطی رزق کے متعلق اکرامی نظریہ کی تردید کلا (ہرگز نہیں) کے لفظ سے فرمانے کے بعد یہ جو ارشاد ہوا ہے

بَلْ لَا تَكْرَهُونَ ۖ لَيْسَ لَكُمْ بِالتَّحَاوُنِ
علي طعام الله کین۔
بلکہ تم یتیموں کا اکرام نہیں کرتے اور الیکین
کھا۔ نے پر لوگوں کو آمادہ نہیں کرتے۔

اس میں بھی بسطیوں ہی کی ذمہ داریوں کا اظہار اجمالی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ قرآن اپنے مطالبات کو عائد کرتے ہوئے کتنی نازک منطقیانہ تعبیر میں ان کو پیش کرتا ہے۔ بطور نمونے کے ان الفاظ کی کچھ تشریح اگر کر دی جائے تو غالباً نامناسب نہ ہوگا مطلب یہ ہے کہ نعمت و عزت پانے کے بعد پانیوالوں میں

جو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ میرا اکرام کیا گیا ہے، اور مجھے عزت بخشی گئی ہے، قرآن نے کلا کے لفظ سے تو چاہا ہے کہ لوگ اس خیال کو اپنے اندر سے نکال دیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نعمت و عزت پانے والا تو خیر اپنے اندر سے اس خیال کو نکال بھی دے سکتا ہے، لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ نعمت و دولت عزت و ثروت سے جو یہاں سرفراز ہوتے ہیں انہیں بہر حال دوسرے لوگ معزز اور بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں، کسی کے پاس کچھ نہ ہو، علم نہ ہو، فضل نہ ہو، فضائل و کمالات کے جتنے سلسلے ہیں سب ہی سے خالی ہو، لیکن اگر کسی جاگیر پر وہ قابض ہے، کسی فرم کا وہ مالک ہے، تو لوگ باوجود کچھ نہ ہونے کے محض اسی دولت و ثروت کی وجہ سے اسے اینٹوں میں بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں، عموماً آبادیوں کے بڑے آدمی کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں الرزق اسے بسطی پیمانہ پر میسر آ رہا ہے۔ پھر قرآن کلا (ہرگز نہیں) کے لفظ سے تردید جو کر رہا ہے۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نعمت و عزت کو صرف اپنے اعزاز اور اپنے بڑا پاک ذریعہ بنالینا، قرآن نے دراصل لوگوں کو اس سے روکا ہے، روک کر پھر اسی عزت و شرف سے جو فطرۃً دولت و ثروت رکھنے والوں کو حاصل ہو جاتی ہے، اس کے استعمال کے صحیح ذریعہ کی طرف ان آیتوں میں راہنمائی فرمائی گئی ہے، مقصد یہ ہے کہ جو عزت و دولت مندوں کو حاصل ہوتی ہے، چاہا یا جاتا ہے کہ اس عزت اور بڑائی کو ان لوگوں کی عزت اور بڑائی کا ذریعہ بنایا جائے، جنہیں دنیا بلا وجہ اپنی آنکھوں سے گردیتی ہے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت ان بچوں کی ہوتی ہے جو اپنے باپ کے سائے سے محروم ہو جاتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ تقریبوں میں، شادیوں میں، تہواروں اور عیدوں کے مواقع پر کہ باپ رکھنے والے بچے اچھے اچھے کپڑوں میں اپنے اپنے یاپوں کے ساتھ خوش خوش اچھلتے کودتے ناز و خرم کرتے آ رہے ہیں، دل میں جس چیز کے خریدنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، ابا جی کہہ کر باپ کی فطری محبت کو ابھارا بھار کر کام نکال رہے ہیں، لیکن ان ہی مجلسوں میں وہ بچے بھی ہوتے ہیں جن کے باپ مرچکے ہیں وہ اپنے دل کی آرزو کس سے کہیں، ابا جی فلاں چیز یک رہی ہے، لے دیجئے، کس سے کہیں۔ ان کے ناز و خرم اٹھانے والا اس پورے مجمع میں کوئی نہیں ہوتا، جو ان کی طاقت تھی وہ سپرد خاک ہو چکی، دل ہلا دینے والی کیفیت ہوتی ہے، جب مجمع میں کوئی بچہ اس شان کے ساتھ شریک ہوتا ہے، یہی وقت ہے ان لوگوں کی آزمائش کا جنہیں بڑائی بخشی گئی ہے، اور عزت عطا کی گئی ہے کہ اپنی بڑائی اور اپنی عزت سے کام لیتے ہو سو سائٹی کے اس معصوم کس پر اس ہستی کو بڑائی عطا کریں، ایک ایسا تعلق اس کے ساتھ پیدا کریں کہ ان کی بڑائی کی وجہ سے ان بچوں کی بھی عام نگاہوں میں بڑائی پیدا ہو جائے، گویا ان کی عزت کی وجہ سے لوگ ان بچوں کی بھی عزت کرنے لگیں، اگر آپ یتیم کا یہی مطلب ہے۔

اور یہ حال تو ان بچوں کا ہے جن میں انسانی کمالات و قویٰ کی بھی نشو و نما نہیں ہوتی ہے۔ لیکن ان ہی کے ساتھ ہر مجمع، ہر آبادی میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ وہ بھی پایا جاتا ہے جن کی قوتیں ارتقائی مدارج کو طے کرنے کے بعد کسی وجہ سے ساکن اور معطل ہو گئیں، اور اسی وجہ سے بسا اوقات معمولی کھانے کی ضرورت بھی وہ اپنے دست و بازو سے پوری نہیں کر سکتے، ان ہی کو قرآن کی اصطلاح میں

المسکین کہا گیا ہے، ان لوگوں کو جنہیں بسطی پیمانہ پر روزی ملتی ہے۔ یعنی ضروریاتِ زندگی میں خرچ کرنے کے بعد جن کے پاس پس ماند ہو جاتا ہے، ان ہی لوگوں کو آمادہ کیا گیا ہے کہ یہ پس ماند دولت اس لئے تمہیں نہیں دی گئی ہے کہ صرف اپنے ہم جنسوں، ہم چشموں میں اپنی بڑائی کا آلہ اس کو بناؤ، بلکہ تمہارے ابنائے جنس میں کسب و سعی کی قوتیں جن کی ٹھنڈی پڑ گئی ہیں، صرف یہی نہیں کہ ان کو کھلاؤ، بلکہ مذکورہ بالا آیت میں تخصیصوں کا لفظ فرمایا گیا ہے جس کا مصدر محاضہ ہے۔ محاضہ کے معنی ہیں باہم مل کر لوگوں کو آمادہ کرنا، تو اب مطلب یہ ہوا کہ اربابِ ثروت کو ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے جس کی وجہ سے نہ صرف خود بلکہ دوسرے دولتمندوں میں بھی مسکینوں کی امداد و اعانت کا جذبہ پیدا ہو، گویا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ لوگ امداد مسکین میں ایک دوسرے پر سبقت چاہنے لگیں۔ اور یہ تعلیم اس عام قاعدے پر مبنی ہے کہ عموماً ہر سو سائنٹی اور ہر سماج زیادہ تر اپنے طریقہ کار میں دولت مندوں ہی کو نمونہ بتاتی ہے، جس ملک کے دولت مند اپنی دولت کو کھیلوں، تماشوں، عیاشیوں، فضول خرچیوں میں صرف کرتے ہیں۔ دیکھا دیکھی دوسرے بھی ان ہی بیہودہ مشاغل میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور جہاں دولت مندوں میں نیکیوں، غربا پروریوں، مساکین نوازیوں کی رسم جاری ہو جاتی ہے، تو دوسرے بھی ان کو دیکھ کر خیر کے ان ہی ابواب میں اپنی پس ماندہ دولت کو صرف کرتے ہیں۔

الحاصل قرآن کے اشارے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت و نعمت، عزت و آبرو جنہیں دی جاتی ہے، اسی لئے دی جاتی ہے۔ اور یہی اس بڑائی اور اکرام کا صحیح استعمال ہے جو نعمت و عزت کی وجہ سے آدمی کو حاصل ہوتا ہے، قرآنی آیت

۱۔ حسن کہا ۲۔ حسن اللہ ۳۔ الیک نیکی کر جیسے خدا نے تیرے ساتھ نیکی کی۔

میں بھی اس حسن سلوک کا جو قدرت کسی کے ساتھ کرتی ہے۔ یہی صحیح استعمال بتایا گیا ہے اور میرا تو خیال ہے کہ ”الشکر“ کے لفظ سے مذہب میں جس چیز کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس کا ایک بڑا اور اہم پہلو خداداد نعمتوں کا یہی استعمال ہے، بلکہ اس عام قاعدے کی بنیاد پر جس پر عموماً اسلامی تعلیمات مبنی ہیں، یعنی عمل کی تصحیح کا طریقہ اسلام میں یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے لوگوں کے علم کی تصحیح کر دی جائے، علم جب درست ہو جاتا ہے تو قدرتی طور پر عملی اصلاح پر آدمی خود بخود آمادہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ صحیح علم سے خود بخود صحیح عمل پیدا ہونے لگتا ہے۔ آپ قرآن میں عملوا الصالحات سے پہلے عموماً ۱۔ امنوا کا لفظ جو پاتے ہیں تو اس کا منشاء بھی یہی ہے، ایمان دراصل عملی تصحیح ہی کا دوسرا اصطلاحی نام ہے، جسے پیغمبر کے توسط سے اہل ایمان حاصل کرتے ہیں۔

بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی قرآنی آیتیں مثلاً سورہ کہف میں بارغ اور کاشت رکھنے والے آدمی کو یعنی بسطی پیمانے پر جسے رزق دی گئی تھی۔ اسی کے متعلق کہنے والوں کی

زبان سے یہ فقرہ جو کہلوا یا گیا ہے

لولا اذ دخلت جنك قلت
ما شاء الله لا قوة الا بالله

اور کیوں نہ ہوا ایسا کہ جب تو اپنے باغ
میں داخل ہوا تو کہا ہوتا کہ جو کچھ ہے سب

اللہ کا چاہا ہے۔ نہیں ہے قوت لیکن اللہ ہی سے۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ نعمتوں کو پالنے کے بعد آدمی کو چاہیے کہ واقعہ کے مطابق ان کے متعلق جو صحیح دانش اور علم ہو، اس کو اپنے سامنے سے اوجھل ہونے نہ دے، مثلاً باغ والے کے سامنے اس کا باغ تھا، حکم دیا گیا کہ اس باغ میں جب جایا کرو تو دو باتیں سوچا کرو، ایک تو یہ کہ جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اور دوسری بات یہ کہ قوت اور طاقت جو کچھ بھی جس کسی میں ہے، اس کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات مبارک ہے، ظاہر ہے کہ پہلی بات کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جن شکلوں میں نعمتوں کا ظہور ہوا ہو ان کو دیکھ کر چاہیے کہ اس واقعہ کے احساس کو ہم اپنے اندر پیدا کرتے رہیں کہ ان کی آفرینش اور پیدائش سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ قدرت کی کار فرمایوں کا نتیجہ و اثر ہے، باغ ہی کو دیکھیے، باغ کی زمین، باغ کے درخت، درختوں کی شاخیں، پتے، پھول، پھل اسی طرح وہ سارے اسباب جنہیں باغ کی نشوونما بار آوری میں دخل ہے، ان میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جسے آدمی پیدا کرتا ہے، باغ تو خیر باغ ہی ہے۔ ایسی چیزیں جنہیں ہم انسانی مصنوعات خیال کرتے ہیں، بلکہ جن مصنوعات کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلاں کی ایجاد ہے، مثلاً ریل گاڑی اور اس کے انجن ہی کو لیجئے، سوچئے انجن کے اجزاء لوہا تانبا پیتل، انجن کے فلزاتی و ہیرمی عناصر اور اس کے سوا جو چیزیں اس کے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک چیز کے پیدا کرنے والے ہم ہیں، اسی طرح انجن جن چیزوں سے چلتا ہے، بتائیے کہ آگ ہو یا پانی، کیا آدمی ان کا پیدا کرنے والا ہے، پانی کو آگ پر چڑھانے سے اسٹیم پیدا ہوتی ہے، کیا پانی اور آگ میں یہ خاصیت آدمی کی رکھی ہوئی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ بھی قدرت ہی کا ایک بنایا ہوا قانون ہے، اسٹیم میں حرکت پیدا کرنے کی قوت ہے، کیا اس قوت کو آدمی نے پیدا کیا ہے؟ سوچتے چلے جائیے، اگر آپ حقیقت پر نظر جاتے ہوئے سوچیں گے، تو بالآخر ہر سوال کے جواب میں آپ کو وہی ما شاء اللہ کہنا پڑے گا، یعنی سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اور اسی کی قدرت کی یہ کرشمہ پردازیاں ہیں، یہ تو پہلے فقرے ما شاء اللہ کا مطلب ہوا، رہی دوسری بات یعنی

۱۷ یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جن ایجادات و اکتشافات کو ہم اپنی اپنی دماغی قابلیتوں، فکر و غور کی محنتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیا واقعی وہ ہمارے فکری نتائج ہوتے ہیں، میں آپ کے سامنے دو چیزیں پیش کرتا ہوں، ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جدید مصنوعات و ایجادات یا اکتشافات، جن لوگوں کی طرف منسوب ہیں، زیادہ تر میرا خیال ہے کہ اگر صد فی صد نہیں تو ۹۰ فی صدی یہ وہی لوگ ہیں جنہیں باضابطہ تعلیم کا یا تو سرے سے موقع ہی نہیں ملا، یا کچھ تھوڑی بہت ابتدائی تعلیم کسی نے حاصل بھی کی ہے۔ یا تو عام طور پر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات کے مقابلہ میں ان کی تعلیم صفر کی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

”لا قوۃ الا باللہ“ یہ اس وسوسہ کے ازالہ کی طرف اشارہ ہے جو عموماً ایسے موقع پر دلوں میں پیدا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے، خیال یہ گذرتا ہے کہ میں تو یہ سب کچھ قدرتی پیداواریں، اور قدرتی قوانین ہی کے نتائج، لیکن انسان جب تک ان قوانین کا علم نہ حاصل کرے اور علم حاصل کرنے کے بعد اپنی محنت و توجہ کو ان پر صرف نہ کرے، عقل کی ترکیبوں اور ذہن کی تجویزوں کو ان میں نہ لگائے، انجن کا وجود نہیں ہو سکتا، اور انجن ہی کیا، باغ میں جب تک باغبانی کے قواعد و قوانین کی پابندی نہ کی جائے گی اس وقت تک جیسا کہ چاہئے اس کے پھلنے پھولنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے اور اتنا حصہ ان چیزوں میں یقیناً آدمی کا ہے، اسی وجہ سے ان چیزوں کو انسانی مصنوعات و ایجادات میں لوگ شمار کرتے ہیں، ورنہ اتنا احمق کون ہو گا جو سمجھتا ہو کہ انجن کے لوہے یا اس میں جو آگ جلتی ہے، جو پانی خرچ ہوتا ہے، ان چیزوں کا ایجاد کرنے والا اور پیدا کرنے والا آدمی ہے۔

در اصل اسی کے متعلق اس دوسرے فقرے میں چاہا گیا ہے کہ ٹھیک ٹھیک حقیقت اور واقعہ کے بالکل مطابق اپنے علم کو کر لیا جائے، یعنی یہ سوچنا چاہیے کہ بلاشبہ ان امور کے ظہور میں انسانی ترکیبوں اور تدبیروں کو دخل ہے۔ لیکن ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ ان ترکیبوں اور تدبیروں کا تعلق انسان کی جن علمی و عقلی قوتوں سے ہے، خود ان قوتوں کا پیدا کرنے والا کون ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ہم جب خود اپنے پیدا کرنے والے نہیں ہیں تو ان قوتوں کے پیدا کرنے والے ہم کیسے ہو سکتے ہیں جو ہمارے اندر پائی جاتی ہیں، بلکہ جو ہمارا پیدا کرنے والا ہے، ظاہر ہے کہ اسی کے ارادہ و مشیت سے ہماری ان قوتوں کا بھی تعلق ہے ”لا قوۃ الا باللہ“ در اصل اسی واقعہ کی یافت کا نام ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری بیسویں صدی کے موجد اعظم ایڈسین ہی کو لیجئے، اس پرے موجد کی سوانح عمری سے کون واقف نہیں۔ سوال یہی ہے کہ اگر آدمی کی فکری و عقلی قوتوں کے نتائج یہ ایجادات ہیں تو چاہیے کہ عقلی قوتوں کی تربیت کا جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم کا ہوں میں موقع ملایا جاتا رہتا ہے۔ ان کا دماغ ایجاد کرنے میں سبقت کرتا۔ لیکن جب واقعہ یہ نہیں ہے تو غور کرنے کی بات ہے کہ ان انکشافات و ایجادات کو ہم کس چیز کا نتیجہ قرار دیں، دوسری بات اسی کے ساتھ جسے میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے، شاید دوسرے بھی جانتے ہوں کہ ان ایجادات و انکشافات کے متعلق ایک عجیب انکشاف یہ بھی ہے کہ عموماً کسی ایک ایجاد کا خیال کسی ملک میں کسی شخص کے دماغ میں خب آیا تو ٹھیک ان ہی دنوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بالکل دور دراز ممالک کے رہنے والوں میں سے بھی کسی کے دماغ میں بھی ٹھیک ان ہی دنوں میں اس ایجاد کا خیال آیا۔ مقرر کے مشہور عیسائی مجلہ آئہلال کی اشاعت ۱۹۲۶ء نومبر میں ایک مقالہ میں اسی ”توارد“ کے متعلق شائع ہوا ہے۔ استقراء و تتبع سے مقالہ نگار نے عہد حاضر کی (۱۲۳) ایجادوں کے متعلق ثابت کیا ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو مختلف ملکوں کے باشندوں کو ان کا توارد ہوتا رہا ہے۔ مثلاً امریکہ میں ایک بات کسی کی سمجھ میں آئی، ٹھیک اسی ہفتہ میں دیکھا گیا کہ انگلستان کا ایک آدمی بھی اپنے دماغ میں اسی خیال کو پارہا ہے، آخر بتایا جائے کہ اس توارد کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے ۱۲

خلاصہ یہ ہے کہ شکر کے سلسلے میں سبھی حقائق و واقعات کے مطابق اپنے علم کی تصحیح کرنی جائے اور اس سلسلہ میں واقعہ جب یہ ٹھہرا کہ نعمتوں کی شکل میں جو کچھ ہم سے باہر ہے وہ تو "بإشارة اللہ" کا اور جو کچھ ہمارے اندر ہے وہ "لا قوۃ الا باللہ" کا مظاہرہ ہے، اور نعمت ہی کیا، یوں بھی ہر شخص کے لحاظ سے یہ سارا عالم بجز "بإشارة اللہ" کے یعنی جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اس کے سوا اور کیا ہے، یہ تو باہر کا حال ہے، اسی طرح ہر شخص کے اندر جس قسم کی قوتیں، طاقتیں، کمالات و صفات پائے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ "لا قوۃ الا باللہ" ہی کی تو نمائش ہے، گویا ان ہی دو فقروں میں سارا عالم آفاقی ہوا یا نفسی یعنی آدمی کے باہر ہوا یا اندر، دونوں کا صحیح علم سمٹ کر آ گیا ہے، سوچنے والے جتنا زیادہ سوچتے چلے جائیں گے، اسی حد تک اس علم کی واقعیت ان پر واضح ہوتی چلی جائے گی، اور جو اپنے علم کو اس طریقہ سے واقعات کے مطابق کر لے گا، ظاہر ہے کہ اب اس کے بعد جس صحیح راہ عمل کا مطالبہ سبلی پیمانے پر رزق پانے والوں سے کیا گیا ہے، وہ خود بخود ان کے علم کا ایک منطقی نتیجہ کی حیثیت اختیار کر لے گا یعنی یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ نعمتیں اور جن قوتوں سے ان نعمتوں کو آدمی حاصل کرتا ہے، دونوں میری نہیں، بلکہ براہِ راست حق تعالیٰ ہی کی ہیں، تو خدا کی چیزوں کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق طریقہ عمل اختیار کرنے میں اسے کیا دشواری پیش آئے گی، ہاں جنہوں نے اپنے علم کو واقعات کے مطابق کرنے کی کوشش نہ کی ہو، یا علم تو ان کا درست ہو چکا ہو، مگر یقین کی کیفیت جیسی کہ چاہیے اسے حاصل نہ ہوئی ہو، وقت اگر کچھ ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے تو ان ہی کو ہوگی یا ہو سکتی ہے۔ بلکہ اسی علم کو مستحکم اور قلوب میں پوری قوت کے ساتھ جاگزیں کرنے کے لئے ہم دیکھتے ہیں کہ علاوہ باطنی احساس کے اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ زبان سے، ظاہری اعضاء بھی شکر ادا کرنا چاہیے، کیونکہ عموماً آدمی کا باطن ظاہر سے متاثر ہوتا ہے، حدیثوں میں ہے، بخاری کی روایت ہے "جب کوئی پانی پیتا ہے، کھانا کھاتا ہے تو خدا پسند کرتا ہے کہ کھانے والے اور پینے والے اس کی تعریف کریں ورنہ گناہ"۔

نیز کھانے، پینے، پہننے، الغرض نعمتوں کے حصول کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعائیہ نمونوں کو مسلمانوں کے لئے چھوڑا ہے، سب کا مطلب وہی ہے کہ جس طرح ممکن ہو، مسلمان اپنے اندر نعمتوں کے متعلق جو صحیح علم ہے، اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں کہ عمل کو آسان کرنے کی یہی تجربی و نفسیاتی راہ ہے، نہ صرف زبان بلکہ روایتوں میں جو یہ آتا ہے کہ تمام نعمتوں میں جو سب سے بڑی نعمت خدا کے کسی بندے کے لئے ہو سکتی ہے یعنی "مغفرت" جب قرآن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بشارت حق تعالیٰ کی طرف سے سنائی گئی تو منازوں کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشتغال اور زیادہ بڑھ گیا۔ پوچھنے والوں نے جب پوچھا تو فرمایا:

۱۔ فلا اکون عبداً ۲۔ شکویراً ۳۔ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان ہی نہیں بلکہ دوسرے اعضاء و جوارح سے بھی شکر کی مشق کر کے اپنے باطنی احساس کو ابھارتے رہنا چاہیے۔

بہر حال مقصود اصلی سب کا آخر میں وہی عمل کی تصحیح ہے جس کے لئے علم کی تصحیح کرائی جاتی ہے۔

اور علمی احساس کو مسلسل زندہ و بیدار رکھنے کے لئے مذہب نے علاوہ دل کے چاہا ہے کہ لوگ زبان سے بھی اعضاء سے بھی الغرض ہر اس ذریعہ سے جس سے اس احساس کی بیداری میں مدد سے کام لینا چاہیے، تاکہ بسطی رزق کی صورت میں ضروریات میں صرف ہونے کے بعد آدمی کا جو حصہ لوگوں کے پاس پس ماند رہ جاتا ہے، اس کے صحیح استعمال میں آسانی ہو، یہی رزق مبسوط کی ذمہ داری ہے، اور اس کا وہ ابتلاء و امتحان ہے جس سے بسطیوں کو عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے، اجمالاً اس سارے کاروبار کا نام خواہ علمی شکل میں ہو یا علمی، پھر زبان سے ہو، یا جوارح سے اس کا تعلق ہو، سب کا نام ”شکر“ ہے۔ قرآن میں بسطیوں سے بار بار مختلف الفاظ میں اس کا مطالبہ کیا گیا ہے، اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے کہ پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام جنہیں حق تعالیٰ نے بسطی زندگی عطا فرمائی تھی، بارگاہِ الہی میں التجا فرماتے کہ

مراب ۲ و مرعنی ۱ ان ۲ شکو نعمتک
التي ۲ الغمت علی۔
میرے پروردگار! میرے دل میں یہ بات
ڈالے کہ جس نعمت سے آپ نے مجھے

سرفراز فرمایا ہے، اس کا شکرا ادا کروں۔

قرآن میں اس کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے، خصوصیت کے ساتھ قاذن کا لفظ اعلان کرتے ہوئے استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ منادی کر دی گئی ہے، یعنی اسی شکر کے متعلق فرمایا گیا ہے،
و ۲ قاذن مرابکم لان شکوتم
لازمید نکم۔
اور جب منادی کی تمہارے مالک نے
کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں قطعاً تمہیں

بڑھاتا ہی چلا جاؤں گا۔

اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ دینے والے کی مرضی کے مطابق جو طریقہ عمل اس کی دی ہوئی چیز کے متعلق آدمی اختیار کرتا ہے۔ اسی پر بھروسہ کیا جاتا ہے، جتنا زیادہ اس عمل میں وہ امانت داری کا اظہار کرے گا، اسی قدر زیادہ اس کے سپرد بھی کیا جائے گا۔ لیکن بجائے اس کے اگر دینے والے کی مرضی کے خلاف خیانت سے کام لے گا تو قرآن میں اسی مطالبہ شکر کے بعد یہ دھمکی دی گئی ہے۔

ولئن كفرتم لئأن عذابی
اور اگر تم ناشکری کرو گے (تو یاد رکھو) کہ

لشدید۔
میرا عذاب بہت سخت ہے۔

جس کا تفصیلی قصہ ان شاء اللہ عنقریب سنایا جائے گا۔

بہر حال بسطی رزق کی حقیقی ذمہ داری درحقیقت یہی فریضہ شکر ہے۔ اس کے سوا اور جو کچھ بھی ہو وہ اسی فریضہ شکر کی ادائیگی کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے اب ان ذمہ داریوں کی تھوڑی بہت تفصیل کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق قدری رزق سے ہے۔

قدری رزق کی ذمہ داریاں لے جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ ”قدری رزق“ کے متعلق عام خیال لوگوں کا کچھ ایسا ہے کہ رزق کی تنگی یا معاشی ضیق، بالفاظِ دیگر جس کی تعبیر غربت و

فلاکت سے کی جاتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ رزق کا یہ حال بجائے خود ایک ابتلا اور ایسا ابتلا ہے جس میں مبتلا ہونے والے کے لئے یہی ابتلا کافی و کافی ہے، ایسی حالت میں ان پر مزید ذمہ داریوں کے اضافہ کی گنجائش ہی کیا ہے؟ مشہور ہے کہ

خداوند روزی بحق مشغول

یعنی روزی میں جو کجائش و ویعت رکھتے ہیں، ان کو تو خدا اور خدا کے احکام کی تعمیل کا موقع حاصل ہے، اسی لئے مذہب نے ان پر اگر ذمہ داریاں عائد کی ہیں تو وہ اس کے مستحق ہیں، لیکن غریب قدری رزق رکھنے والا جس کا عمومی حال یہ ہو کہ سر چھپاتا ہے تو پاؤں کھلتے ہیں، ایک جگہ کو سیتا ہے تو دوسری جگہ ادھر جاتی ہے، جس کی معاشی زندگی اس اُدھڑ بن کی شکار ہو، ظاہر ہے کہ ایسے پراگندہ روزی، پراگندہ دل

آدمی سے مزید اور کس بات کی توقع کی جاسکتی ہے؟

بہ ظاہر یہ ایک لگتی ہوئی بات بھی معلوم ہوتی ہے، بقول ایک دل جے انگریز کے، اسی غربت فلاکت کا ذکر کرتے ہوئے جھنجھلا کر اس نے لکھا تھا

غربت کی کشمکش کرنے سے قلب کی صفائی ہوتی ہے، یہ بعض لوگ کہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس مستم کے لوگوں کو اس کشمکش سے سابقہ نہیں پڑا ہے ورنہ تمام کشمکشوں میں جن میں کسی انسان کو پھنسا یا جاسکتا ہے۔ یہ (غربت و افلاس) سب سے زیادہ پست اور ذلیل کرنیوالی کشمکش ہے۔ (داستان دہقان ص ۳۲۷ مصنف ڈارلنگ)

سعدی نے بھی مختلف پیرایوں میں اسی خیال کو ادا کیا ہے، ان کا زبان زہام شر

اسی سلسلے کا یہ بھی ہے

شب چو عقد نماز می بندم چہ خورد با بداد سر زندم
اور گو محدثین کے اصول پر ان مشہور اقوال کا آثارِ نبوت سے ہونا مشتبہ ہے۔ لیکن بہر حال مسلمانوں میں مشہور ہے اور اسلامی بزرگوں نے اپنی کتابوں، اپنی گفتگوؤں میں انہیں عموماً استعمال کیا ہے، مثلاً
کا دۃ الفقر ۲ ان یکون کفر ۲ قریب ہے کہ ناداری اور محتاجی کفر بن جا

یا
۲ الفقر سواد الوجه فی الدارین محتاجی اور ناداری دونوں جہان کی

روسیا ہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو دعائیں اسنادِ صحیح کے ساتھ منسوب ہیں، ان دعاؤں میں سے ایک دعا میں یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں یعنی ۲ اللھم ۲ فی ۲ عوذیک من فتنۃ الفقر (اے اللہ میں فقر و محتاجی کے فتنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں) بعض دعاؤں میں یہ بھی ہے کہ آپ فرماتے۔

۱۲ قرض عینی ۲ الدین و ۲ غننی

مجھ سے میرے قرض کے بار کو اتروائیے اور

محتاجی سے مجھے بے نیاز کیجئے۔

من ۲ الفقرا۔

سچ پوچھیے تو قدری رزق کے ان ہی حالات کی طرف مذکورہ بالا اقوال اور حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے جن کے متعلق اس انگریز نے غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدری رزق کے بعض مدارج ایسے ہولناک جاں گسل روح فرسا ہوتے ہیں کہ اس وقت کسی قسم کی کوئی نصیحت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

قدری رزق کے دراصل یہی ہوش رُبا حالات ہیں جن کی ذمہ داریاں بجائے قدریوں کے اسلام نے ان لوگوں پر عائد کی ہیں، جو بسط کے پیمانے پر قدرت کی طرف سے روزی پارہے ہیں، ہر ملک اور ہر آبادی کے ان طبقات کو جو بسطی معاش سے سرفراز ہیں، ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ ان سے لیا جائے گا اور ان لوگوں میں تقسیم کیا جائے گا، جو ان ہی کے ساتھ ان ہی آبادیوں میں قدری زندگی گزار رہے ہیں اسلام کو اپنے اصول پر اتنا اصرار ہے کہ قدریوں کے اسی حق کو بسطیوں سے حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ میں تلوار تک اٹھائی، الزکوٰۃ کے نام سے بسطی آمدنی رکھنے والوں پر باضابطہ قانون کی شکل میں ایک ایسا فرض (زکوٰۃ) عائد کیا گیا ہے جسے سب جانتے ہیں کہ اسلام کے چار اہم ارکان میں وہ ایک بڑا اہم رکن ہے۔ اسی قسم کا اہم رکن کہ عہد صدیقی میں باضابطہ اعلان جنگ ان لوگوں کو دے دیا گیا تھا جو قدریوں کے اس حق سے گریز کرنا چاہتے تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلیفہ اکبر نے حکم دیا تھا کہ ایک ڈوری بھی اس حق کی اگر دہالی جائے گی، تو ان پر قتال اور ان سے جہاد کیا جائے گا۔

اور صرف الزکوٰۃ ہی نہیں، ہر آبادی کے ارباب بسط پر صدقۃ الفطر کے نام سے جو صدقہ واجب کیا گیا ہے اور اس طور پر واجب کیا گیا ہے کہ صرف اپنی ذات ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک کی طرف سے یہ صدقہ نکالا جائے جن کا آدمی کفیل ہوتا ہے، ہر سال تقریباً کروڑ ہا کروڑ روپے کی شکل میں دُنیا کے مسلمان اس صدقہ کو ادا کرتے ہیں، اور گو مقصود بالذات شربانی سے صدقہ نہیں ہے، لیکن شران میں

اور کھلاؤ (قربانی سے) مصیبت زدہ

۱۲ اطعموا ۲ الباس ۲ الفقیر

محتاج کو۔

کا جو حکم قربانی ہی کے متعلق پایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک بڑا مقصد قربانی کا یہ بھی ہے کہ قدری رزق رکھنے والوں کو بسطیوں سے امداد دلائی جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الزکوٰۃ کی مستقل مد کے سوا قدریوں کی امداد کی اور بھی اسلام نے مختلف صورتیں پیدا کی ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ پھر آنحضرت

۱۲ فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ

صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی وہ آیت تلاوت کی

ثم تلاون تنالوا البر حتی تنفقوا

جس کا ترجمہ ہے۔ ”نیکی کو ہرگز نہ پاسکو گے

ما تحبون۔

جب تک وہ نہ خرچ کرے جسے تم چاہتے ہو۔

اور اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول یعنی

۱۲ دیت سر کو تک فقد قضیت تم نے جب زکوٰۃ ادا کر دی، تو تم پر جو حق

تھا، اسے پورا کر دیا۔

ما علیک۔

یہ صرف حکومت کے اس مطالبہ سے تعلق رکھتا ہے جسے امیروں سے غریبوں کے لئے وصول کرنا اسلام نے

واجب ٹھہرایا ہے، یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد حکومت اب امیروں سے مطالبہ نہیں کر سکتی، خود قرآنی آیت

۱۱ ان تبدوا الصدقات فنعما ان تبدوا صدقات کھلے بندوں ادا کرو تو یہ بھی

اچھا ہے، اور اگر اسے چھپاؤ اور دونا دارو

۱۲ الفقراء فهو خیر لکم ویکفر کو، تو یہ بہتر ہے تمہارے لئے اور زائل

عنکم سیتا تم۔ کرے گی یہ پوشیدہ خیرات تمہاری برائیوں کو۔

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صدقات کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جسے علانیہ کھلے بندوں دیا جائے، اور یہ

بات اسی صدقہ میں پائی جاسکتی ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اور دوسری قسم ”الصدقات“ کی وہ

ہے جسے چاہئے کہ آدمی چھپا کر ادا کرے، قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے کہ ان باتوں کا ازالہ اس خفیہ صدقہ

سے ہوتا ہے جو آدمی کو بری معلوم ہوتی ہوں کہ ”السیات“ بری باتوں ہی کو کہتے ہیں، ان حدیثوں سے

بھی یہی معلوم ہوتا ہے جن میں خیر دی گئی ہے کہ بلاؤں کو صدقہ کے ذریعہ سے ٹالا جاسکتا ہے یا صدقہ

خدا کے غصے کو بچھا دیتا ہے، غالباً یہ خاصیت خفیہ صدقات ہی کی بیان کی گئی ہے۔ تجربہ بھی اسی کا

شاہد ہے۔ صدقات کی اسی قسم کے متعلق غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ انہیں اس طریقہ

سے لوگوں کو دیا کرو کہ داہنے ہاتھ کی خبر بائیں کو نہ ہو، صرف یہی نہیں بلکہ آئندہ قانونی ابواب میں آپ

پائیں گے کہ عام خیر و خیرات صدقات کے سوا اسلام نے قرض کو بھی نیکی کی ایک بڑی اہم مدد قرار دی ہے

اتنی اہم کہ قرض چاہنے والوں کی طرف سے قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر خدا نے خود

قرض کا مطالبہ فرمایا ہے

کون اللہ کو اچھا قرض دیتا ہے، تو

من یقرض اللہ قرضاً حسناً

بڑھائے گا اللہ اس کو۔

فیضاعف له۔

قرآن میں تو صرف قرض ہی کی حد تک یہ فرمایا گیا ہے، لیکن مشہور حدیث جس میں بیماروں اور عام حاجت

مندوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ مشہور روایت ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ اپنے بندوں سے فرمائیں گے۔

اے آدم کے بچے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا

یا ابن آدم! استطعتک فلم

تو تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا، بندہ کہے گا مالک

تطعمنی قال یا رب کیف اطعمک

میں آپ کو کیسے کھلا سکتا تھا، آپ تو خود

وانت مرأب العالمین قال اما

علمت ۱۰ نہ استطعمک عبدی
فلان فلم تطعمہ ۲ ما علمت
۲ ن لو اطعمتہ لوجہ دات
ذلک عندی۔

سارے جہان کے پالنے والے ہیں، تب
خداوند تعالیٰ فرمائیں گے، تجھے کیا اس کی
خبر نہ تھی کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے
کھانا طلب کیا تو تو نے اسے نہ کھلایا

کیا تو نہیں جانتا تھا کہ اگر اس شخص کو تو کھلاتا تو پاتا تو اس کھانے کو میرے پاس۔

اسی طرح پیاسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو ان حاجت مندوں کی جگہ قائم فرما کر
پلانے کا مطالبہ کیا ہے سمجھا جاسکتا ہے کہ ان ذمہ اریوں کو جو قدریوں کی طرف سے بسطیوں پر عائد ہوتی ہیں، کتنی اہمیت عطا
فرمادی ہے، غالب مرحوم نے شاید اسی حدیث کے مطلب کو اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
بما شائے اہل کرم دیکھتے ہیں

اور قدری رزق کی پیچیدگیوں کے حل کی صرف یہی صورتیں اسلام نے اختیار نہیں کی ہیں، بلکہ میں تو سمجھتا
ہوں کہ باوجود قدرت و اقتدار کے پیغمبر اور پیغمبر کے جانشینوں (صلوات اللہ علیہم و سلم) نے زندگی
کے جس نمونے کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، کھانے، پینے، پہننے، رہنے، سہنے کا جو معیار قصداً اختیار
فرمایا گیا تھا، اس کی ایک مصلحت اگر یہ سمجھی جائے کہ غریبوں یعنی قدری معیشت رکھنے والوں کی دل دہی
اور تسکین خاطر بھی اس طرز عمل سے مقصود تھی، تو ایسا سمجھنے کے کافی وجوہ موجود ہیں، آخر خود ہی غور
کرنا چاہئے کہ جس کا دعویٰ ہو کہ اوتیت مفاہیم خزانۃ الاسرار (بخاری) مجھے زمین کے خزانوں
کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں، اوریوں بھی خدا کی طرف سے ہر قسم کی روحانی اور مادی قوتوں سے جو ہستی
سرفراز تھی، کیا اسی کے متعلق مجبوری اور معذوری کا ہلکا سا دوسوہ بھی ہو سکتا ہے؟ جن مسلمانوں کو
خبر دی گئی ہے کہ زمین کو سونا بنانے کا اختیار بھی آپ کو سپرد کیا گیا تھا اُحد پہاڑ نے چاہا تھا کہ اپنی
تمام چٹانوں کے ساتھ زر خالص کی شکل آپ کے لئے اختیار کر لے، اور جو مسلمان نہیں ہیں، کم از کم اتنا
تو سب ہی کو ماننا ہی چاہئے کہ جس پیوند دوز کبیل اور کھجوروں کی شاخوں سے چھائے ہوئے مکان میں
پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات جس وقت ہوئی تھی، اس وقت اگر وہ چاہتے تو دس لاکھ مربع میل
کے بادشاہ کی حیثیت کا لباس اور مکان بھی رکھ سکتے تھے۔ مگر آخر وقت تک نہ خود اس اقتدار سے فائدہ
اٹھایا، اور نہ اپنے خاندان والوں کو اس سے استفادہ کا موقع عطا فرمایا، ان کی چہیتی صاحبزادی بھی

۱۰ اسکی نے قاضی عیاض کے حوالے سے اندس کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ طلیطلہ کا رہنے والا ایک شخص صالح نامی تھا۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس نے دعویٰ کیا کہ ان نہ ہد لہ لم یکن قصداً ولو قدر علی الطیبات لا کھا
(یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زاہدانہ زندگی قصداً اختیار کا نتیجہ نہ تھی، آپ میں اگر اچھے کھانوں کے کھانے کی قدرت ہوتی
تو ضرور کھاتے) گویا فقر کو وہ مجبوری و معذوری کا نتیجہ قرار دیتا تھا، لکھا ہے کہ اس زمانے کے علماء و اندس نے اس کے
قتل کا فتویٰ دیا اور وہ سولی پر چڑھایا گیا (دیکھو کتاب نظام الحکومتہ البنیویہ لکثانی ص ۸۹ ج ۲)

چکی ہی پیستی رہیں اور شکیں بھرتی رہیں، سوال یہی ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا تھا؟ مؤطا امام مالک کی روایت

ان ملصا بئی لتغزو المسلمین میری مصیبتیں تمام مسلمانوں کی مصیبتوں
فی مصائبهم۔ کے وقت تسلی کرتی رہیں گی۔

میں اگر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب مستور ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ پیغمبر اور پیغمبر کے گھرانے والوں کی زندگی کا یہ معیار قدری معیشت رکھنے والوں میں سے کتنے خستہ دلوں کے لئے مرہم کا کام کرتا رہا ہے، اور قیامت تک کرتا رہے گا، بلکہ اسی کو نمونہ بنا کر اگر امرا اپنی زندگی کے معیار کی نگرانی کرتے رہیں۔ ایسے تکلفات سے حتیٰ الوسع پرہیز کریں جن کے میسر نہ آنے کی وجہ سے خواہ مخواہ غریبوں کو بے جا ضرر کے انگاروں پر لوٹنا پڑتا ہے تو یقیناً غریبوں کی دل دہی کا یہ بھی ایک بڑا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء نے (باوجود سب کچھ رکھنے کے) جس قسم کی زندگی گزاری اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جسے جتنی زیادہ بلندی عطا کی جائے پستی میں رہنے والوں کی خاطر سے چاہیے کہ حتیٰ الوسع وہ اپنی زندگی کے معیار کو زیادہ بلند ہونے نہ دے، حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ عتبہ بن فرقد جو کسی صوبہ کے عامل تھے، خدمت والا میں حاضر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت کھانا کھانا کھا رہے تھے، ان کو اندر ہی بلا لیا حضرت عمرؓ کی موٹی جھوٹی غذا کو دیکھ کر عتبہ نے کہا۔

هل لك من طعام يقال له آپ کیا ایسی خوراک استعمال نہیں

الحواصری۔ کرتے جس کا نام میدہ ہے۔

جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو عتبہ کو خطاب کر کے پوچھا،

یا ابن فرقد هل تری احدًا ابن فرقد! سرزمین عرب میں مجھ سے بھی

من العرب احد رهنی۔ بڑی مقدرت والا اس وقت کوئی ہے؟

عتبہ نے جواب میں وہی کہا جو کہا جاسکتا تھا، یعنی آپ سے زیادہ مقدرت رکھنے والا کون ہے؟ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سوال و جواب کے بعد پوچھا،

ویلک یسع ذلک المسلمین ابن فرقد! کیا سارے مسلمانوں کو میدہ کا

قال لا۔ یہ آٹا میسر آسکتا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔

اس طرز زندگی کا جو اصل مقصد تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

بئس الوالیٰ انما کلت طیبها میں بہت ہی برا حاکم ہوں گا کہ اچھا اچھا

واطعمت الناس کرا دیشہا۔ تو خود کھاؤں اور لوگوں کو بڑی خراب

(ص ۵۴ محب طبری) خستہ چیزیں کھلاؤں۔

عام زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دنیا کے امیروں کے لئے جو نمونے چھوڑے ہیں، آج ان نمونوں سے سلجھانے والے چاہیں تو دنیا کی بہت سی الجھی ہوئی معاشی گتھیاں سلجھ سکتے ہیں۔

تفصیل کے لئے تو ان کی سوانح عمری ہی پڑھنی چاہیے، کیسی عجیب بات ہے، خلافِ عادت آپ کو محض غریبوں کے خیال سے ایسی غذا اختیار کرنی پڑی جو ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہوتی تھی، کھانے کے بعد پیٹ بولتا تھا آپ پیٹ پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے

۱۰ شئت قرقر و ۱۰ شئت
لا تقر مالک عندی ۱۰ حتی
يفتح الله للمسلمين -
(محب طبری ص ۲۵۳ ج ۲)

تیراجی چاہے تو گرگڑا، اور تیراجی چاہے
تو گرگڑا، مگر تیرے لئے میرے پاس سائیں
اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ قحط
کی موجودہ مصیبت مسلمانوں کے سر سے

ٹل نہ جائے۔

آپ ہی کے زمانے کا واقعہ ہے حمص کے والی نے ایک علیہ (اٹاری) بنوائی تھی جس پر خود رہتے تھے حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی۔ بارگاہِ خلافت میں طلب ہوئے، حضرت عمرؓ سامنے بلا کر ڈانٹ کر پوچھ رہے تھے۔

بنیت العلیہ و اشرفیت برہا
علی المسلمین و الاسرملہ
و الیتیم -
(محب طبری ص ۵۵ ج ۲)

تم نے اٹاری (بالا خانہ) بنوایا ہے،
اور عام مسلمانوں، بیواؤں، یتیم پر
اسی کے ذریعے سے شرافت و بلندی
حاصل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو پیوند روز کیڑوں میں دیکھ کر اس زمانے میں جب مسلمانوں کے آپ امیر اور خلیفہ تھے، دیکھنے والے نے دیکھ کر کہا۔

لم ترقع قميصک
جواب میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا۔

لانه یخشع القلب و یقتدی بہ
المومنین (طبری ص ۲۲۰ ج ۲)

اس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ اور
مسلمان اس کو نمونہ بنا سکتے ہیں۔

بلاشبہ فقر کی یہی وہ روح پرور، حوصلہ افزا شکل ہے، جس پر اس کے اختیار کرنے والے جتنا چاہیں فخر کر سکتے ہیں، اور ارادی مسکنت کی یہی شان رفیع ہے، جس کے لئے خلق خدا کے سچے ہمدردوں نے دعائیں مانگی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بسط پر مقتدر ہونے کے باوجود قدریوں کی تسلی کے لئے قدری زندگی کے معیار کو اختیار کرنے والوں ہی کو ان ذمہ داریوں کی تکمیل کا باآسانی موقع مل سکتا ہے۔ جو قدری معیشت رکھنے والوں کی

۱۱ اور یہی حل ہے اس شبہ کا جو اس موقع پر عموماً دلوں میں پیدا ہوتا ہے، یعنی ابھی کچھ دیر پیشتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کا ذکر گذرا جن میں فقر سے بے نیازی کی خواہش آپؐ نے کیا دوسری دعا جس میں محتاجی و فقر کے فتنے سے آپؐ نے پناہ مانگی ہے سوال ہوتا ہے کہ باوجود اسکے پھر پیغمبرؐ نے اپنی زندگی فقر کی کیوں رکھی، بلکہ بعض دعاؤں میں آپؐ نے خدا سے درخواست کی کہ مجھے مسکین زندہ رکھئے الخ حل یہی ہے کہ اضطراری فقر اور محتاجی جو باعثِ فتنہ بن جاتی ہے اس سے پناہ مانگی گئی ہو اور جس فقر کو آپؐ نے اختیار فرمایا یہی دعا کرتے تھے وہ یہی اختیاری فقر و مسکنت ہے ۱۲

اسلامی معاشیات
چکی ہی پستی رہیں اور شکیں بھرتی رہیں، سوال یہی ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا تھا؟ مؤطا امام مالک
کی روایت

ان مصائبی لتعزوا المسلمین
میری مصیبتیں تمام مسلمانوں کی مصیبتوں
کے وقت تسلی کرتی رہیں گی۔
فی مصائبهم۔

میں اگر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب دستور ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ پیغمبر اور پیغمبر کے گھرانے والوں کی
زندگی کا یہ معیار قدری معیشت رکھنے والوں میں سے کتنے خستہ دلوں کے لئے مرہم کا کام کرتا رہا ہے،
اور قیامت تک کرتا رہے گا، بلکہ اسی کو نمونہ بنا کر اگر امراء اپنی زندگی کے معیار کی نگرانی کرتے رہیں۔
ایسے تکلفات سے حتیٰ الوسع پرہیز کریں جن کے میسر نہ آنے کی وجہ سے خواہ مخواہ غریبوں کو بے جا خسروں
کے انگاروں پر لوٹنا پڑتا ہے تو یقیناً غریبوں کی دل دہی کا یہ بھی ایک بڑا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء نے (باوجود سب کچھ رکھنے کے) جس قسم کی زندگی گزاری، اس سے
بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جسے جتنی زیادہ بلندی عطا کی جائے پستی میں رہنے والوں کی خاطر
سے چاہیے کہ حتیٰ الوسع وہ اپنی زندگی کے معیار کو زیادہ بلند ہونے نہ دے، حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ
ہے کہ عتبہ بن فرقد جو کسی صوبہ کے عامل تھے، خدمت والا میں حاضر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
اس وقت کھانا کھانا کھا رہے تھے، ان کو اندر ہی بلا لیا حضرت عمرؓ کی موٹی جھوٹی غذا کو دیکھ کر عتبہ نے کہا۔

هل لك من طعام يقال له
آپ کیا ایسی خوراک استعمال نہیں
کرتے جس کا نام میدہ ہے۔

الحواری۔
جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو عتبہ کو خطاب کر کے پوچھا،

یا ابن فرقد هل ترى احدا
ابن فرقد! سرزمین عرب میں مجھ سے بھی
من العرب احد رصنی۔
بڑی قدرت والا اس وقت کوئی ہے؟

عتبہ نے جواب میں وہی کہا جو کہا جاسکتا تھا، یعنی آپ سے زیادہ قدرت رکھنے والا کون ہے؟ تب حضرت
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سوال و جواب کے بعد پوچھا،

ويلك يسع ذلک المسلمین
ابن فرقد! کیا سارے مسلمانوں کو میدہ کا
قال لا۔
یہ آٹا میسر آ سکتا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔

اس طرز زندگی کا جو اصل مقصد تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

بئس الوالی انما کلت طیبھا
میں بہت ہی برا حاکم ہوں گا کہ اچھا اچھا
واطعمت الناس کرا دیشہا۔
تو خود کھاؤں اور لوگوں کو بُری خراب

(ص ۵۴ محب طبری)
خستہ چیزیں کھلاؤں۔

عام روادہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دنیا کے امیروں کے لئے جو نمونے چھوڑے
ہیں، آج ان نمونوں سے سلجھانے والے چاہیں تو دنیا کی بہت سی الجھی ہوئی معاشی گتھیاں سلجھا سکتے ہیں

تفصیل کے لئے تو ان کی سوانح عمری ہی پڑھنی چاہیے کیسی عجیب بات ہے، خلافِ عادت آپ کو محض غریبوں کے خیال سے ایسی غذا اختیار کرنی پڑی جو ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہوتی تھی، کھانے کے بعد پیٹ بولتا تھا آپ پیٹ پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے

۱۲ شئت قرقر و ۱۲ شئت
لا تقر مالک عندی ۱۲ دم حتی
يفتح الله للمسلمين -
(محب طبری ص ۲۵۳ ج ۲)

تیرا جی چاہے تو گر گڑا، اور تیرا جی چاہے
تو نہ گر گڑا، مگر تیرے لئے میرے پاس سائیں
اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ قحط
کی موجودہ مصیبت مسلمانوں کے سر سے

ٹل نہ جائے۔

آپ ہی کے زمانے کا واقعہ ہے حمص کے والی نے ایک علیہ (اٹاری) بنوائی تھی جس پر خود رہتے تھے حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی۔ بارگاہِ خلافت میں طلب ہوئے، حضرت عمرؓ سامنے بلا کر ڈانٹ کر پوچھ رہے تھے۔

بنیت العلیہ و ۱۲ شرفت برہا
علیٰ المسلمین و ۱۲ امر صلیہ
و ۱۲ یتیم -
(محب طبری ص ۵۵ ج ۲)

تم نے اٹاری (بالا خانہ) بنوایا ہے،
اور عام مسلمانوں، بیواؤں، یتیم پر
اسی کے ذریعے سے شرافت و بلندی
حاصل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو پیوند روز پڑوں میں دیکھ کر اس زمانے میں جب مسلمانوں کے آپ امیر اور خلیفہ تھے، دیکھنے والے نے دیکھ کر کہا۔

لم ترقع قميصک
جواب میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا۔

لانه یخشع القلب و یقتدی به
المومنین (طبری ص ۲۲۰ ج ۲)

اس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ اور
مسلمان اس کو نمونہ بنا سکتے ہیں۔

بلاشبہ فقر کی یہی وہ روح پرور، حوصلہ افزا شکل ہے، جس پر اس کے اختیار کرنے والے جتنا چاہیں فخر کر سکتے ہیں، اور ارادی مسکنت کی یہی شان رفیع ہے، جس کے لئے خلق خدا کے سچے ہمدردوں نے دعائیں مانگی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بسط پر مقتدر ہونے کے باوجود قدریوں کی تسلی کے لئے قدری زندگی کے معیار کو اختیار کرنے والوں ہی کو ان ذمہ داریوں کی تکمیل کا باآسانی موقع مل سکتا ہے۔ جو قدری معیشت رکھنے والوں کی

۱۵ اور یہی حل ہے اس شبہ کا جو اس موقع پر عموماً دلوں میں پیدا ہوتا ہے، یعنی ابھی کچھ دیر پیشتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کا ذکر گذرا جن میں فقر سے بے نیازی کی خواہش آپؐ کی، یا دوسری دعا جس میں محتاجی و فقر کے فتنے سے آپؐ نے پناہ مانگی ہے۔ سوال ہوتا ہے کہ باوجود اسکے پھر پیغمبرؐ نے اپنی زندگی فقر کی کیوں رکھی، بلکہ بعض دعاؤں میں آپؐ نے خدا سے درخواست کی کہ مجھے مسکین زندہ رکھے الخ حل یہی ہے کہ اضطراری فقر اور محتاجی جو باعثِ فتنہ بن جاتی ہے اس سے پناہ مانگی گئی ہو اور جس فقر کو آپؐ نے اختیار فرمایا یہی دعا کرتے تھے وہ یہی اختیاری فقر و مسکنت ہے ۱۲

طرف سے مذہب نے ان پر عائد کیا ہے۔

بہر حال قدری معیشت کی دشواریوں کو سہولتوں سے بدلنے کے لئے یہ تو اسلامی ہدایتوں کا وہ سلسلہ تھا، جن کا خطاب بجائے قدریوں کے بسطیوں سے ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ جن جاں فرسا پیچیدگیوں اور کشمکشوں میں قدری زندگی آدمی کو مبتلا کر دیتی ہے، ان کے حل کے لئے اسلامی دستور کے یہی قوانین کافی ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ عمل کرنے والے جیسا کہ چاہیے ان پر عمل بھی کریں، اور قدرت نے جو ذمہ داریاں ان کے سپرد کی ہیں ان سے عہدہ بردار ہونے کو بسطی پیمانے پر روزی پالنے والے طبقات اپنا فرض خیال کریں، قدریوں کے جو حقوق بسطیوں کی آمدنیوں میں اسلام نے قائم کئے ہیں، حکومتیں ان حقوق کو حاصل کر کے حقداروں تک پہنچانے کا یا ضابطہ نظم اگر قائم کر دیں، اور یہی براہ راست جو مطالبات اس سلسلہ میں بسطیوں سے کئے گئے ہیں، ان مطالبات کی تکمیل ہوتی رہے جنہیں معاشی بلندی عطا کی گئی ہے، پستی میں رہنے والوں کے خیال سے وہ بھی اپنی زندگی کے معیار کو حتیٰ الوسع پست ہی رکھنے کی کوشش کرتے رہیں، میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ قدری معیشت کی جن تلخیوں کا دُنیا کو شکوہ ہے۔ بہت کچھ اس کے ازالے کی صورت یوں ہی نکل آ سکتی ہے۔

لیکن اسلام کا مل دین ہی کیوں ہوتا، اگر اسی نقطہ پر اپنی تعلیم کو ختم کر دیتا، آپ دیکھیے ایک طرف بسطیوں کو خطاب کر کے قدری زندگی کی الجھنوں کے سلجھانے کی جو تدبیریں اس نے اختیار کی ہیں، وہی کیا کم محقق، لیکن دوسری طرف براہ راست قدری معیشت رکھنے والوں کو بھی جو ہدایتیں دی گئی ہیں، کاش! ان ہدایتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جاتی تو غریبوں کے طبقات کو اس کا تجربہ ہو سکتا تھا کہ اپنی جن معاشی بے چینیوں اور قلبی کلفتوں میں وہ بسطیوں کے بہ ظاہر دستِ نگر نظر آتے ہیں، بجائے دوسروں کے بہت کچھ ان کے ازالہ کا سامان وہ خود بھی کر سکتے ہیں اور اب میں ان ہی چیزوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

قانون مدو عدے یہ میری ایک اصطلاح ہے، اور قرآن سے ماخوذ ہے۔ مذ کے قانون سے میرا اشارہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَلَا تَمْدَن عَيْنُكَ إِلَىٰ مَا
مَتَعَنَّا بِهِ ۚ نَرْوَاهُ جَا مَنۡهَم
نَرٰهُوَ ۚ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا
لَنفۡتَنَنَّهُمۡ فِيۡهٖ (ط)
تاکہ ہم امتحان لیں ان کا اس میں۔

اور نہ اٹھائو! اپنی دو آنکھوں کو ان کی
طرف جنہیں جوڑے جوڑے کی شکل میں
ہم نے نعمتیں بخشی ہیں۔ یہ پست زندگی کی
تازگی ہے (اس لئے ان کو دی گئی ہیں)

بعض الفاظ کی کمی و بیشی سے اس حکم کا اعادہ دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

وَلَا تَمْدَن عَيْنُكَ إِلَىٰ مَا
مَتَعَنَّا بِهِ ۚ نَرْوَاهُ جَا مَنۡهَم
اور نہ اٹھانا اپنی دونوں آنکھوں کو
ان چیزوں کی طرف جن سے جوڑے جوڑے کی

ولا تخزن علیہم (کہتے)

شکل میں ہم نے لوگوں کو سرفراز کیا ہے

اور نہ اس پر غم کھانا!

ان دونوں آیات میں مدح سے منع کیا گیا ہے، تمد کے معنی کھینچنے اور بلند کرنے کے ہیں اور عین کے معنی آنکھ۔ مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو ان کی طرف اٹھانے سے منع کیا گیا ہے، جنہیں گویا بسطی پیمانے پر روزی عطا کی گئی ہے۔ اردو میں مد نظر کا لفظ بھی قریب قریب اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے جو مدح عین کا مفہوم ہے، خیر یہ تو الفاظ کا سرسری حاصل ہوا، بسطی طبقات کی تعبیر جن الفاظ سے یہاں کی گئی ہے، غور کرنے کی یہی چیز ہے، پہلے اسے سمجھ لینا چاہیے۔

(۱) پہلی بات اس سلسلے کی "ازواجاً" کا لفظ ہے، بسطی طبقات کی ایک خاص خصوصیت کی طرف اس میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اشارہ کیا گیا ہے، مشاہدہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے، یعنی دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ آمدنیوں پر جن لوگوں کو یہاں اقتدار بخشا جاتا ہے عموماً ان کے قلوب میں ایک عجیب جذبہ اس بات کا پیدا ہو جاتا ہے کہ ضرورت کی ایک ہی چیز مثلاً سواری، لباس، پوشاک، مکان وغیرہ ہر ایک میں ان کی تشفی کسی ایک شکل سے نہیں ہوتی، باوجودیکہ ان کے پاس مثلاً موٹر موجود ہوتی ہے۔ لیکن ایک موٹر سے ان کا جی نہیں بھرتا، دل دوسری موٹر کے لئے بے چین رہتا ہے۔ پھر شکل و صورت، رنگ روپ کا معمولی فرق بھی کسی دوسری موٹر کی ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے یہی حال زندگی کی دوسری ضرورتوں میں ان کا ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان امیروں کے کمروں میں جب آپ داخل ہوں گے تو عموماً ایک طرف قطار در قطار مختلف شکلوں، صورتوں کے جوتے نظر آئیں گے دوسری طرف کسی کونے میں دیکھئے تو صرف چھڑیوں کا ایک بوجھا ٹھیک اس شکل میں جیسے ترکش میں تیرتے ہیں۔ ان کی چھڑی دایلوں میں رکھا نظر آئے گا، اور یہ تو ان کا حال ہے جن کا شمار نسبتاً متوسط طبقات بلکہ کہئے تو عوام کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ چھٹ بھٹیوں میں جو گئے جاتے ہیں، ازواجی مذاق میں ان کی کیفیت ہے، باقی ان میں جو بڑے ہیں، ان کو تو دیکھا جاتا ہے کہ ایک بلڈنگ کے بعد دوسری بلڈنگ، اور ایک محل کے بعد دوسرے محل کا شوق کسی طرح ختم ہونے ہی کو نہیں آتا، ہر چیز میں زوج اور جوڑے کے ذوق نے اس حد تک ان لوگوں کو پہنچا دیا ہے کہ کسی عمارت کے ایک پہلو میں اتفاق سے اگر کوئی مسجد آگئی ہے تو صرف "ازواجیت" اور جوڑا بنانے کے ذوق کی تکمیل کے لئے سنا ہی نہیں گیا ہے بلکہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد کے بمقابلہ دوسری سمت میں ٹھیک مسجد ہی کی شکل و صورت رکھنے والی عمارت بنوائی گئی، چونکہ قبلہ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس دوسری مجازی مسجد کا کعبہ کی سمت واقع نہیں ہو سکتا تھا! اس لئے واقع میں تو وہ مسجد نہ ہو سکی، لیکن دیکھنے والوں کو اگر مغالطہ ہو جائے اور شکل و شبہا بہت سے دھوکہ کھا کر اس میں نماز پڑھنے لگیں تو کچھ تعجب نہیں!

(۲) دوسری چیز "زہرۃ الحیوة الدنیا" کے الفاظ ہیں "الحیوة الدنیا" تو ظاہر ہے کہ انسان کی موجود

پست زندگی کی تعبیر ہے، رہا زہرہ سولخت میں اس کے معنی تازگی اور شادابی کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ

ایک تو انسان کی موجودہ زندگی کے واقعی ضروریات ہیں، یعنی ایسی ضرورتیں جن کے بغیر اپنی زندگی کو بھام دی گذار نہیں سکتا، معاشی اصطلاح میں جنہیں NECESSARY کہتے ہیں، اور دوسری چیزیں وہ ہیں جن کا اصطلاحی (LUXURY) ہے، سچ پوچھیے تو زہرۃ الحیوۃ الدنیا زندگی کے ثانی الذکر لوازم کی قرآنی تعبیر ہے، دوسرے مقام پر اسی کو کبھی ”زینۃ الحیوۃ الدنیا“ بھی کہا گیا ہے، یعنی زندگی کے آرائش و زیبائش سے ان کا تعلق ہر ان امور کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب مذکورہ بالا آیات کے مفہوم کو سمجھنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ بسطی طبقات کی طرف نگاہ اٹھانے سے جب ان آیتوں میں منع کیا گیا ہے تو یہی قرینہ ہے اس بات کا کہ براہ راست ان آیتوں کے خطاب کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہو سکتا ہے جو معاشی لحاظ سے بسطی نہیں بلکہ قدری زندگی رکھتے ہوں، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ بسط و قدر انسان کے معاشی مدارج کی اضافی شکلیں ہیں، اس لئے ان کے استعمال میں بھی چاہیے کہ کسی خاص طبقہ کو متعین کر کے محدود نہ کر دیا جائے۔ بلکہ وہی بات کہ اپنے آپ سے بالاتر طبقات کے حساب سے جو لوگ یہ پاتے ہوں کہ معاشی لحاظ سے وہ قدر اور تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں، وہی ان آیتوں کا اپنے آپ کو مخاطب قرار دے کر ان ہدایتوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں جن کی طرف حق تعالیٰ نے راہنمائی فرمائی ہے۔ مقصود تو ان آیتوں سے یہی ہے کہ ہر شخص کو معاشی جدوجہد میں اپنی حقیقی ضرورتوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ دوسروں کے ساتھ ناپ ناپ کر اپنے اندر کمتری اور کم مانگی کا خواہ مخواہ احساس پیدا کر کے اپنے ہاتھوں خود اپنے آپ کو ذہنی کلفتوں میں لوگ مبتلا نہ کریں، گویا دوسرے الفاظ میں وہی بات جس کی طرف قرآن ہی کی آیت

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ

اور نہ آرزو کیا کرو اس چیز کی جس کی وجہ سے

بعضکم علی بعض۔

خدا نے بعض کو بعض پر برتری عطا کی ہے۔

میں توجہ دلائی گئی ہے، میں نے بھی کہیں لکھا ہے کہ زندگی کی حقیقی ضرورتوں کی پوری ہونے کے باوجود دوسروں کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو ناپ ناپ کر کڑھتے اور جلتے رہتے ہیں، وہ دنیا میں اگر تنہا پیدا ہوتے، اور ان کے ساتھ ان کا ہم جنس کوئی دوسرا نہ ہوتا، تو کھلی ہوئی بات ہے کہ دوسروں سے ناپنے کا موقع ہی ان کو نہ ملتا، پھر اس وقت جیسے اپنی زندگی سے آدمی مسرور ہوتا، کیوں نہیں آج بھی دوسروں سے قطع نظر کر کے اپنی زندگی ہم گذاریں، تجربہ بتا دے گا کہ جن کلفتوں اور الجھنوں کو آدمی قدری معیشت کی طرف منسوب کرتا ہے، ان کا اکثر و بیشتر حصہ اس عمل کے بعد ثابت ہوگا کہ قطعاً وہی اور خود تراشیدہ تھا۔ لیکن قرآن نے اسی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ مذکورہ بالا آیات کے جن الفاظ کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے ان پر غور کیجئے نظر آئے گا کہ ان الفاظ کا اضافہ بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے آخر سوچئے کہ بسطیوں کے جن حالات کو دیکھ دیکھ کر قدریوں کا گروہ محزون و مغموم رہتا ہے۔ تجربہ کے بعد ان کی حقیقت کیا وہی نہیں ہے کہ زیادہ تر ان میں وہی ازواجی مذاق یعنی ہر چیز کو جوڑے کی شکل میں رکھنے، اور ہر شئی کے مد مقابل کے مہیا کرنے کے شوق سے ان کا تعلق ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک قسم کی

اہلہی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جاسکتا ہے، تاجروں اور کاریگروں، کارخانہ داروں سے پوچھیے، وہی امیرانہ چونچلوں کے اس راز سے خوب واقف ہیں، اسی لئے ایک ہی چیز کو مختلف شکلوں اور قالبوں میں ڈھال ڈھال کر وہ ان کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں، اور ان بیچاروں کی ماؤں ذہنیت سے جواز و اجیت کے ذوق کی عموماً مرہض ہوتی ہے فائدہ اٹھاتے ہیں، بسطیوں کو جو کچھ دیا گیا ہے جو اس کی اس واقعی حقیقت پر متنبہ ہو جائے گا جس کی طرف قرآن نے ”ازواجاً“ کے لفظ سے اشارہ کیا ہے، ظاہر ہے کہ حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اسی اہلہی کی ہوس اپنے اندر کیوں پیدا کرے گا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مشہور حدیث

من حسن اسلام المرء ترک
آدمی کے اسلام کی خوبی کی یہ دلیل ہے کہ
صلاً یعنیہ۔
لاحاصل اور بے نتیجہ باتوں کو ترک کر دے۔

کا ایک مصداق آدمی کا یہ طرز عمل بھی ہے، بلکہ حدیثوں میں جو آیا ہے۔

یکفیک من الدنیا ماسد
دُنیا سے تیرے لئے یہ کافی ہے جس سے
جو عتک و داری عوسر تک
تیری بھوک کا ازالہ ہو جائے اور جس سے
وان کان شیء یظلم فذاک
تیری ستر پوشی ہو جائے۔ اور ان ہی کے ساتھ
وان کان لک دابة فبنح۔
اگر کوئی ایسی چیز بھی تجھے مل گئی جس کے
ساے میں تو رہے (یعنی کسی شتم کا گھر) تو
(کنز العمال)

پھر یہ تو ہے ہی، اسی کے ساتھ اگر کوئی سواری بھی تجھے مل جائے تو پھر کیا کہنے۔

اس میں بھی اسی حقیقت کی یافت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اب اس کے بعد ”زہرة الحیوة الدنیا“ کے الفاظ پر غور کیجئے، میں نے عرض کیا تھا کہ اسی کی دوسری تعبیر قرآن ہی میں ”زینۃ الحیوة الدنیا“ سے بھی کی گئی ہے، یعنی جن سرمایوں کو بسطیوں کا سرمایہ سمجھا جاتا ہے قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ اس کا تعلق بھی زندگی کی ضرورت سے نہیں، بلکہ زینت سے ہے، جن لوگوں کو حیاتِ دُنیا کی زینت دی گئی ہے، اس زینت کے استعمال سے تو ان کو منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ منع کرتے والوں کو ڈانٹا گیا ہے، جس کا ذکر اپنے مقام پر آچکا ہے، لیکن سوال ان لوگوں کے متعلق ہے جو حیاتِ دُنیا کی اس زینت یا زہرہ سے محروم ہیں، کیا ان کی محرومی اس قابل ہے کہ اس پر حزن کیا جائے، اور اس حُزن و ملال کو مٹانے کے لئے زینت ہی کو اپنی زندگیوں کا مقصود بنا لیا جائے؟ قرآن میں سخت تہدیدیں لہجہ میں یہ فرماتے ہوئے

ترید منینۃ الحیوة الدنیا
کیا اس پست زندگی کی زینت کو تم

اپنا مقصود بناتے ہو۔

حیاتِ دُنیا کی زینت کو مقصود بنانے سے روکا گیا ہے۔ کیوں روکا گیا ہے؟ کیا خدا کا اس میں فائدہ ہے، آخر حیاتِ دُنیا کی زینت سے جو سرفراز کئے گئے ہیں، انہیں اس کے استعمال سے جب منع نہیں کیا گیا ہے تو زینت کا استعمال ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ناراضی کا سبب کیسے ہو سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں خطاب

ان لوگوں سے ہے جن کی معاشی زندگی زینت کے اسباب سے خالی ہے، ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ مخواہ بلا وجہ زینت کو اپنا مطلوب بنا کر وقت کو رائیگاں نہ کریں۔ جب ضرورت پوری ہو رہی ہے تو غیر ضروری چیزوں کی طلب میں اپنے آپ کو دکھ میں آدمی کیوں مبتلا کرے۔ بلکہ تدعین والی آیتوں میں سے ایک آیت جو سورہ طہ میں پائی جاتی ہے اس کے آخر میں جو یہ الفاظ ہیں

وَمِنْ رِزْقِ رَبِّكَ خَيْرٌ وَابْقٰی
تیرے مالک کی روزی تیرے لئے خیر بھی
اور زیادہ باقی رہنے والی بھی۔

اگر غور کیا جائے تو حیات دنیا کی زینت کو مطلوب بنانے سے روکنے کے دوسرے وجوہ بھی اسی سے سمجھ میں آسکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ زینت سے ہٹ کر اگر آدمی ان ہی ضروریات پر قناعت کرے جن کی بدولت اس کی زندگی گذرتی رہتی ہے، قرآن نے جس کا نام ”رزق رب“ رکھا ہے تو زینت کی لو کو دل سے نکالنے کے ساتھ ہی رب کی یہی روزی آدمی کے لئے خیر کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، خیر کے معنی وہی ہیں کہ وہی اس کی فطرت کے لئے بہتر اور خوش گوار بن جاتی ہے اور یہ حاصل تو خیر کے لفظ کا ہوا، رہا دوسرا لفظ البقی کا جو اس کے بعد ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ آدمی جب تک جیتا ہے، اس وقت تک ضروریات حیات بہر حال اس کے لئے مہیا ہوتے ہی رہتے ہیں، بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے جب تک قدرت ان ضرورتوں کو اس کے لئے مہیا کرتی رہتی ہے جن پر اس کی زندگی مبنی ہے، اس لئے جب تک زندگی ہے اس وقت تک ان ضرورتوں کی فراہمی بھی ضروری ہے۔ اور جب تک یہ ضرورتیں فراہم ہوتی رہتی ہیں، اسی وقت تک زندگی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ زندگی اور زندگی کی ان ضرورتوں کو ایک دوسرے سے کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا بخلاف ان چیزوں کے جن کا تعلق حیات دنیا کی زینتوں سے ہے، کہ زندگی کے ساتھ ان کی بقا کی ذمہ داری کوئی نہیں لے سکتا، آئے دن لوگوں کو یہ ملتی بھی رہتی ہے اور چھپتی بھی رہتی ہے، کتنے زینت والے ہیں جو جیتے رہتے ہیں، اور حیات دنیا کی ان زینتوں کے بغیر جیتے رہتے ہیں جن سے کسی زمانہ میں وہ مالا مال تھے ”زینۃ الحیۃ الدنیا“ کو مطلوب مقصود بنانے سے منع کر لے گا یہ دوسرا فائدہ ہے جس کی طرف ”البقی“ کے لفظ سے میرے خیال میں قرآن میں ایسا کیا گیا ہے، اور غالباً یہی مطلب اس حدیث کا بھی ہے۔

ما قن وکفی خیر مما کثر و ا لھی
ایسی چیز جو کم ہو، لیکن کافی ہو، وہ بہتر ہے

(ضیائی المختار)
اس چیز سے جو ہو تو بہت، لیکن آدمی کو

غفلت میں مبتلا کر دے (یعنی زندگی کے حقیقی نصب العین سے غافل بنا دے)!

اور یہ مطلب تو ”مَدّ“ کا ہوا، باقی اسی قانون کا دوسرا جز جسے ”عَدّ“ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح بھی قرآن ہی کے الفاظ سے ماخوذ ہے

مقصود یہ ہے کہ قدری معیشت رکھنے والوں کو ایک تو سبلی حکم یہ دیا گیا ہے کہ طرح طرح کی نعمتوں اور حیات دنیا کی تروتازگی زیب و زینت سے جو لوگ سرفراز ہیں، ان کی طرف تدعین نہ کرنا چاہئے یعنی ان کی طرف ٹٹکی باندھنے یا لو لگانے سے منع کیا گیا ہے، اب اسی کے ساتھ قرآن ہی کے دوسرے

ایجابی حکم کو ملایا جائے، یعنی اس قسم کی آیتوں کو جن میں سے ایک مشہور آیت یہ ہے،
 وَان تَعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا اور اگر اللہ کی نعمت کو تم گنو، تو نہ گن
 پاؤ گے اس کو۔

مذکورہ بالا آیت میں نعمتوں کے عدد (شمار) کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اسی لئے جو قانون اس سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام عد کی مناسبت سے عد رکھ دیا گیا ہے۔ مذکورہ قانون تو سبلی حکم پر مشتمل ہے یعنی مد عین سے روکا گیا ہے، اور عد و الا قانون ایجابی و اثباتی ہے۔ یعنی جن نعمتوں میں آدمی زندگی کے ہر لمحہ میں ڈوبا ہوا ہے، ان ہی کے گنے کا مطالبہ کیا گیا ہے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانون مد کی تعمیل کرتے ہوئے نایافتہ نعمتوں سے نگاہوں کو ہٹا کر یا فتنہ نعمتوں کو اگر آدمی شمار کرنے لگے، تو بسطیوں کی طرف آنکھ اٹھانے، ان کے معاشی حال سے اپنے معاشی حال کو ناپنے کی وجہ سے قلوب میں شکوے شکایت کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، صرف ان کا ہی ازالہ نہیں ہو جائے گا بلکہ یا فتنہ نعمتوں کے شمار کرنے یعنی قانون عد پر عمل کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہو گا کہ جذباتِ شکر کی مسرتوں سے دل بھر جائیں گے، بخاری مسلم وغیرہ میں جو یہ حدیث پائی جاتی ہے، یعنی

تم میں سے جس کی نظر ایسے آدمی پر پڑے
 جسے مال و دولت میں اس پر برتری عطا
 کی گئی ہو، تو چاہیے کہ دیکھے اس وقت
 ان لوگوں کو جو مال و دولت کے

قال ابنی صلی اللہ علیہ وسلم
 اذا نظر احدکم الى من
 فضل فی المال فلینظر
 الى ما هو اسفل منه۔

(حساب سے) اس سے نیچے ہیں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ قانون عد ہی کی تعمیل کی یہ ایک عملی شکل ہے، مطلب وہی ہے کہ بسطیوں کی دولت و ثروت ابھرتی و شوکت کو دیکھ دیکھ کر اپنی قدری معیشت سے جو لوگ غیر مطمئن ہو جاتے ہیں، اور نایافتہ کی حسرتیں ان کو بے چین کرتی رہتی ہیں، ان کو چاہیے کہ ان نعمتوں کو شمار کریں جو انھیں حاصل ہیں اور ان حاصل شدہ نعمتوں کے شمار کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایسے آدمی کو چاہیے ان لوگوں کو دیکھے جو نعمتوں کے حساب سے اس سے بھی فروتر درجہ میں ہیں، سعدی نے جس کی مثال دی ہے کہ بغیر جوتے کے ایک دن راہ چلنے کا مجھے اتفاق ہوا، اپنے افلاس کا دل میں شکوہ پیدا ہوا تھا کہ سامنے ایک آدمی پر نظر پڑی جس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے، اس حال کو دیکھ کر

سپاس نعمت حق بجا آدم و بہ بے کفشی
 اللہ کی نعمت کا شکر بجا لایا، اور جوتے کے
 نہ ہونے پر دل کو صبر ہو گیا۔

صبر کر دم۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ قدری معیشت کی طرف جن جن تکلیفوں کو منسوب کیا جاتا ہے، ان کا ایک بڑا حصہ اس ترکیب پر عمل پیرا ہونے کے بعد صرف زائل ہی نہیں بلکہ زحماتیں و راحتوں سے بدل جاتی ہیں، مذکورہ بالا حدیث کے راویوں میں عوف بن عبد اللہ بن عتبہ بھی ہیں، صاحب جمع الفوائد نے ان کا یہ

ذاتی تجربہ نقل کیا ہے، یعنی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔

کنت ۱ صاحب ۱ الاغنیاء
کان ۱ اکثرھما منی کنت ۱ اری
د۱ ب۱ خیر ۱ امن ۱ د۱ بتی ۱ وثوباً
خیراً ۱ امن ۱ ثوبی ۱ فلما سمعت
ہذا ۱ الحدیث ۱ صحبت ۱ الفقراء
و ۱ سترحت۔

میں پہلے امیروں کی صحبت میں زندگی گزارا
کرتا تھا، اس زمانے میں مجھ سے زیادہ غم و
الم والا آدمی کوئی نہ ہوگا۔ میں دیکھتا کہ
دوسروں کی سواری میری سواری سے اچھی
ہے، اور دوسروں کے کپڑے میرے کپڑوں
سے اچھے ہیں۔ لیکن جب سے مذکورہ بالا حدیث
میں نے سنی، میں نے فقیروں کی صحبت

(مجمع الفوائد ص ۱۵۲ ج ۱)

اختیار کی، پس اس دن سے چین میں ہوں۔

قدری معیشت | اور اب سمجھا جاسکتا ہے کہ اس صبر کا کیا مطلب ہے؟ جس کا مطالبہ اگرچہ ان تمام
اور قانون صبر کشکشوں، پریشانیوں، پیچیدگیوں میں کیا گیا ہے، جو موجودہ زندگی کے کسی شعبہ میں پیش
آتی ہیں یا آسکتی ہیں۔ لیکن ان ہی پریشانیوں میں قدری معیشت کی پریشانیاں بھی ہیں جن کے متعلق قرآن
میں اسی صبر کے قانون سے استعانت اور امداد حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، صبر سے جن جن مقامات
میں کام لینا چاہیے ان میں "اموال کے نقص" کا بھی قرآن نے تذکرہ کیا ہے، اور جو لوگ قدری معیشت کی
پریشانیوں میں صبر سے کام لیتے ہیں

۱ الصابرین فی ۱ الباساء

وہی جو جنگی مصائب اور معاشی تکلیفوں
کے وقت صبر کرنے والے ہیں۔

و ۱ لضر ۱ ۶۲۔

کے ذیل میں شمار کر کے ان کی تعریف کی گئی ہے؛

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "مدوعدہ کے قانون" کو سمجھ لینے کے بعد قدری معیشت رکھنے والوں کے
لئے "صبر" کے مطالبہ کی تکمیل میں غور کرنا چاہیے، کیا اب بھی دشواری پیش آسکتی ہے؟ آخر "صبر" کا کیا مطلب
ہے، شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے صبر کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے، یعنی
حبس ۱ النفس عن ۱ الشکوی (ج ۴ ص ۲۱۶) اپنے جی کو شکوہ و گلہ سے روکے رکھنا۔

ظاہر ہے کہ "مدوعدہ کے قانون" کا علم جن الفاظ میں قرآن نے عطا کیا ہے، جس کی تشریح گذر چکی، اس علم کی
روشنی میں "صبر" کے مقام تک آدمی قدرتی طور پر پہنچ جاتا ہے، میں بتا چکا ہوں کہ ان قوانین سے علم کی تصحیح
کے بعد شکوہ شکایت کا ازالہ خود بخود ہو جاتا ہے، بلکہ بجائے اس کے دل کو شکریوں کے جذبات سے
معمور بنایا جاسکتا ہے۔ "صبر" غریب کا جن لوگوں نے "داروئے تلخ" نام رکھ چھوڑا ہے، حتیٰ کہ بعضوں نے
تو صبر کے اس لفظ تک کو عربی زبان کے لفظ "صبر" سے ماخوذ قرار دیا ہے، جو ایلو جیسی تلخ چیز کا نام
ہے۔ پھر اس تلخی کو مٹانے کے لئے مختلف قسم کی تدبیروں سے دنیا کے اکثر ادبیات میں کام لیا گیا ہے۔
لیکن تعلیم و تربیت کا اسلام نے جو طبعی طریقہ کار اختیار کیا ہے، یعنی عمل کی تصحیح کے لئے علم کی تصحیح یہاں بھی

اسی طریقہ کار کو اختیار کرنے کے بعد آپ نے دیکھا کہ صبر کا عمل اس علم کا ایک لازمی منطقی نتیجہ بن جاتا ہے، جو مذہب و عدل کی آیتوں سے ہمیں بخشا گیا ہے، یعنی بسطی معیشت والوں کی دولت و ثروت کو دیکھ دیکھ کر قدری معیشت والوں کو جو کوفت اور دکھ ہوتا رہتا ہے، دکھ کا یہ کاٹنا نکل جاتا ہے، ایک سکون میسر آتا ہے، ایسا سکون، جو لوگوں کے سامنے اپنے افلاس اپنی تنگ دستی کے اظہار سے آدمی کو بے نیاز بنا دیتا ہے، یہی لے دے کہ صبر کا مطلب ہے۔ ورنہ جو چیزیں آدمی کو میسر نہیں ہیں، ان کے لئے جدوجہد کرنا خواہ جزئی اسباب کی راہ سے سعی و کوشش کی جائے یا کائناتی پیداوار جس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ دوسرا نام جس کا سبب الاسباب ہے اس کے آگے عرض و معروض کر کے ان چیزوں کے حصول کی تدبیر اختیار کی جائے یعنی دعا کی جائے، صبر کے منافی نہ وہ ہے نہ یہ ہے، سعی و عمل کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا پہلے کہہ چکا ہوں، رہی دوسری تدبیر یعنی مسبب الاسباب ہی سے براہ راست ان کو مانگنا اور طلب کرنا سو اس کا حکم تو قرآن ہی میں ہے، اسی آیت کے بعد جس میں مدعیین سے منع کیا گیا ہے، یہ ارشاد ہے

و الصبر لعبادۃ منہن نرزقک
و العاقبة للمتقوی۔

اور اپنے مالک کی عبادت پر ڈٹا رہا، ہم
تجھے روزی پہنچائیں گے، اور اچھا انجام

تو پرہیزگاری کا ہے۔

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ارباب ثروت و دولت کی طرف ٹکٹکی باندھنے سے تو کوئی فائدہ نہیں، بلکہ ان کو دیکھ دیکھ کر اور اپنے آپ کو ان سے ناپ ناپ کر لوگ اپنے ہاتھوں خود کو ذہنی لکڑ کو ب اور دماغی کوفت میں مبتلا کر لیتے ہیں، بلکہ بجائے اس کے قرآن حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر ڈٹے رہو، عبادت کی تشریح کرتے ہوئے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے ۱ الدعاء صحیح العبادۃ (عبادت کا مغز دعا ہے) بلکہ بعض روایتوں میں تو ہے کہ ۲ الدعاء هو العبادۃ (دعا ہی عبادت ہے) پس عبادت پر ڈٹے رہنے کا مطلب یہی ہوا کہ دعا پر ڈٹے رہو، آگے وعدہ کیا گیا ہے کہ

منہن نرزقک

ہم تمہیں روزی پہنچاتے رہیں گے۔

گویا دعا کے راز سے واقف ہونے کے بعد جو اس پر ڈٹا ہوا ہے، وہ روزی کے اس سرچشمہ پر جا کر کھڑا ہو گیا ہے کہ جس کسی کو جو کچھ مل رہا ہے وہیں سے مل رہا ہے، پس صبر کی تلقین سے مقصود یہی ہے کہ غیروں کے سامنے ذلیل ہونے سے اللہ کے بندوں کو بچایا جائے، ورنہ حق تعالیٰ سے مانگنا اس کے آگے اپنی ضرورتوں کے لئے گڑ گڑانا، یہ تو بندوں کی زندگی کے نصب العین کی تکمیل ہے، اسی لئے شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ

۱ الصبر عندنا حدہ حبس

۲ النفس عن الشکوی لا ۲ فی اللہ

(فتوحات ص ۲۱۶ ج ۲)

صبر کی حقیقت ہمارے یہاں یہ ہے کہ اپنے

جی کو آدمی شکوہ شکایت سے روکے رکھے

لیکن خدا کے آگے نہیں۔

یعنی خدا کے سامنے اپنی ضرورتوں کا پیش کرنا یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ ترمذی کی جو یہ حدیث ہے کہ

قال ابنی صلی اللہ علیہ وسلم
من نزلت به فاقه فانزلها
بالناس لم يمسد فاقته
ونزلت به فاقه فانزلها بالله
فيوشك الله يرسق عاجل
۲ وعاجل۔

جس شخص پر فاقہ کی مصیبت نازل ہو اگر
اپنی اس حاجت کو لوگوں پر وہ پیش
کرے گا، تو اس کی حاجت پوری نہ
ہوگی، مگر وہ جس پر فاقہ کی مصیبت نازل
ہوئی اور اپنی اس حاجت کو اس نے
خدا کے سامنے پیش کیا۔ تو قریب ہے کہ

دیر یا سویر اس کے پاس روزی پہنچ کر رہے گی۔

الحاصل ”الرزق“ کا جو حقیقی مالک و مختار ہے، اس کے آگے اپنی ضرورت کو پیش کرنا، پیش کرتے رہنا اور
اس ضرورت کی تکمیل کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دینا اسی کا اصطلاحی نام ”توکل“ ہے، قرآن میں
سبب المشرق والمغرب لا اله الا هو۔

پالنے والا مشرق کا اور مغرب کا نہیں
ہے الہ کوئی اس کے سوا۔

کا علم عطا فرمانے کے بعد

فاتخذ ذكلا

پس بنا لے تو اسی کو اپنا ذکیل۔

کے فرمان میں اسی ”توکل“ کا امر اور حکم دیا گیا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ قدری معیشت کی کشمکشوں میں صبر کی راہ کھول کر
اور صبر کے دامن کو ”دعا و توکل“ سے جوڑ کر زندگی کے ایک ایسے طریقہ کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے کہ معیشت
کی قدرت اور تنگی خواہ کسی حال میں پہنچ گئی ہو، لیکن عمل کرنے والے ان قاعدوں پر عمل کر کے چاہیں تو
ہمیشہ اپنے آپ کو خوش رکھ سکتے ہیں، بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ سورہ کہف کی آیت

واصبر نفسك مع الذين يدعون
ربهم بالغداة واصبر مع
هم في الازمنة ولا تقعد
عيناك عنهم ترميد نارينة
الحياة الدنيا ولا تقعد من
غفلنا قلبه عن ذكرنا
وايقع هو ۲۰ وكان ۲۱ صرا
فرطا۔

اور رو کے رکھو اپنے آپ کو ان لوگوں
کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے مالک کو صبح
و شام، مقصود بنایا ہے ان لوگوں نے
اللہ کے وجہ کو، اور نہ ہٹائیں اپنی دونوں
آنکھوں کو ان سے، کیا مقصود بنانا چاہتے
ہو، تم پست زندگی کے بناؤ سنگار کو اور
ن اطاعت کرنا ان لوگوں کی جن کے دل کو
ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے

اور پیچھے لگ گیا ہے وہ اپنی ہوا (من ماله خیالات) کا اور ہے بات اس کی حد سے گزری ہوئی

اس میں بھی صبر کی تلخیوں کے مٹانے کی ایک تدبیر بتائی گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی عمل کے اختیار کرنے میں
آدمی کو اگر دشواری محسوس ہو تو عام قاعدہ ہے کہ نمونوں اور مثالوں سے پست ہمتوں میں بلندی پیدا

ہو جاتی ہے، اگر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ مسلمانوں کو مذکورہ بالا آیت میں اسی کی ہدایت کی گئی ہے، حاصل یہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وجہ اللہ کو اپنے وجود کا نصب العین بنا کر جینا، یعنی یہ سمجھنا کہ حق تعالیٰ اور اس کی مرضیات کے مطابق زندگی بسر کرنا، یہی مسلمان کی ہستی کا مقصد ہے، ظاہر ہے کہ اسلام کا آخری خلاصہ یہی ہے، پس حکم دیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے وجہ اللہ کو اپنا مقصود اور اپنے وجود کا نصب العین ٹھہرا لیا ہے، ان کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑے رکھو، زندہ ہوں تو ان ہی کے صحبت میں رہو، نشست و برخاست ان ہی کے ساتھ رکھو، اسی طرح جو اس دنیا کی زندگی ختم کر کے دوسرے عالم میں جا چکے ہیں، ان کے حالات و سوانح کا پڑھنا، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ان ہی لوگوں کی صحبت میں اپنے آپ کو روکے رکھنے کا ایک طریقہ ہے، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ تنہا صبر کے مقام پر اگر کسی کا پاؤں نہ جھتا ہو تو ایسے مسلمانوں کو چاہیے کہ اسلامی نصب العین رکھنے والے بزرگوں کے نمونوں سے فائدہ اٹھائیں جو زندہ ہیں ان کو دیکھیں، جو مر چکے ہیں، ان کے حالات کتابوں میں پڑھیں اور اپنے نصب العین میں کامیاب ہونے کے لئے جو طریقہ عمل ان کا تھا، یعنی وجہ اللہ کو اپنا مقصود بنانے والے جیسا کہ چاہیے زیادہ وقت اللہ ہی کے ذکر و فکر میں گزارتے ہیں، اسی طرح ان نمونوں سے فائدہ اٹھانے والوں کو بھی چاہیے کہ ذکر و فکر میں ان ہی کا طریقہ اختیار کریں، آخر میں یہ فرما کر کہ

ولا تعد عیناک عنہم اور نہ ہٹائیو اپنی دونوں آنکھوں کو ان سے

سے گویا اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ جیسے حیات دنیا کی زینت والوں کی طرف ٹکٹکی باندھنے اور نظر اٹھانے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی کے بالمقابل چاہیے کہ ان نمونوں پر نگاہ جمائے رکھو، ان کو دیکھ دیکھ کر تسلی حاصل ہوتی رہے گی۔ آگے پھر اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے جس کا مدعین کے قانون میں ذکر گذر چکا ہے، یعنی جن لوگوں نے اپنے وجود کا نصب العین یہ قرار دے رکھا ہے کہ اس پست زندگی کی زیب و زینت اور آرائشوں، آسائشوں کے حاصل کرنے میں اپنی آخری سانس پوری کریں گے قرآن ہی میں ایسوں کے متعلق اس قانون کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ

من کان یرید الحیوة الدنیا اور جو مقصود بنا لیتا ہے اسی پست

ویرینتھا لوف الیہم اعمالہم زندگی اور اس کے زینت (بناؤ سنگار)

فیہا وہم فیہا لا ینجسون۔ کو، پورا کرتے ہیں ان اعمال کو اس میں

اور نہیں کمی کی جاتی ہے دینے میں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حیات دنیا اور اس کی زینت کے حاصل کرنے کو جو لوگ اپنے جینے کا واحد نصب العین ٹھہرا لیتے ہیں، اور اسی راہ میں سعی و عمل کی ساری توانائیوں کو خرچ کرتے رہتے ہیں ان کو اپنے عمل کے نتیجوں سے محروم نہیں کیا جاتا، بلکہ جدوجہد سعی و عمل کے مطابق نتائج سے قدرت ان کو سرفراز کرتی ہے، قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، آج اس کی تفسیر ان ممالک کے باشندوں کے طرز عمل سے

ہو رہی ہے۔ جنہوں نے اسی حیات دنیا کی زینت بناؤ سنگار کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے، اور اپنے اپنے عمل کے مطابق اس کے نتائج بھی ان کے سامنے آ رہے ہیں۔ اور ان کی یہی کامیابیاں بالآخر اس مقام تک پہنچا دیتی ہیں، جن کا آیت کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کو ان کی پیروی سے منع کرتے ہوئے ان کے خصوصی صفات یہ بیان کئے گئے ہیں کہ ان کے قلوب پر قدرت غفلت کا پردہ ڈال دیتی ہے۔ اپنے رب کو وہ بھول جاتے ہیں، اپنے جینے کا مطلب ان کے نزدیک صرف یہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ جو خواہش دل میں پیدا ہو، اس کے پیچھے روانہ ہو جائیں، اور جس طرح بن بٹھے اس خواہش کو پورا کریں۔ اسی لئے قدرت کے جو مقررہ حدود ہیں، ان ہی حدود پر ٹھہر نہیں سکتے، ان کی زندگی صرف زیادتیوں سے معمور ہو جاتی ہے اور اس کی تصدیق بھی ان ہی ممالک کے باشندوں کی زندگیوں سے ہو رہی ہے جو *مناينة الحيوة الدنيا* کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر اپنی سعی و عمل کے نتائج سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

۱۰ جو اپنے وجود کا مقصد حیات دنیا کو بنائے ہوئے ہیں، ان ہی کے متعلق قرآن میں دوسری جگہ ایک اور آیت ہے فرمایا گیا ہے *من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها ما نشاء لمن نريد* (اور جو مقصود بنا تا ہے اس عاجلہ (جلد ملنے والی چیز یعنی دنیا) کو تو جلد عطا کر دیں اس میں جتنا ہم چاہتے ہیں جس کے لئے) جس کا مطلب یہ ظاہر بھی معلوم ہوتا ہے کہ ”العاجلہ“ یعنی جلدی پیش آنے والی زندگی جو اسی حیات دنیا کی دوسری قرآنی تعبیر ہے، جو اسی کو اپنا مقصود بنا لیتے ہیں، ان کو اسی دنیا میں دیا جاتا ہے لیکن سب کو دیدیا جاتا، بجائے اس کے فرمایا گیا ہے، جتنا ہم جسے چاہتے ہیں، اسی دنیا میں دیدیتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ دنیا خواہوں میں ہر ایک کی ہر آرزو پورا ہونا ضروری نہیں ہے اور یہ بھی مشاہدہ کی بات ہے لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ سورہ ہود کی جس آیت کو اصل عبارت میں میں نے نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو پورا پورا دے دیا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ ظاہر دونوں میں کچھ تضاد سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ سورہ ہود والی آیت میں سعی و عمل کے نتائج کے متعلق قانون بنایا گیا ہے یعنی محنت و کوشش کسی کی راگیاں نہیں جاتی *نوف اليهم اعمالهم فيها* (پورا کرتے ہیں ان کے اعمال کو) سے مراد اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ عمل پر ————— نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ بخلاف اس آیت کے جس کا ذکر بنی اسرائیل کی سورہ میں ہے یعنی حاشیہ میں جو نقل کی گئی ہے، اس میں صرف ان لوگوں کا حال ہے جو آرزو کرتے ہیں، اور دنیا خواہوں میں بلاشبہ ایک بڑی جماعت ایسوں کی بھی ہے جس نے دنیا ہی کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ لیکن محنت و جفاکشی ان سے نہیں ہو سکتی۔ ان ہی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جتنا چاہتے ہیں ہم دیتے ہیں۔ الغرض سورہ ہود میں عمل کے نتائج سے لوگوں کو محروم نہیں کیا جاتا، دنیا میں بھی یہی قانون ہے اور آخرت کا بھی یہی ہے۔ اسی بنی اسرائیل والی آیت کے بعد ہے *من اسر۲ د۲ الاحرة وسعی لها سعيها وهو مؤمن فاوئذک کان سعيهم مشکور۲* (یعنی جو آخرت کی زندگی کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے۔ اور اسی نصب العین کے مطابق سعی و عمل میں سرگرمی دکھاتا ہے۔ تو ان کی کوشش بھی مشکور ہوتی ہے) بالفاظ دیگر نتائج سے ان کے عمل کو محروم نہیں کیا جاتا۔ البتہ آخرت کے نتائج عمل و سعی پر اسی وقت مرتب ہوتے ہیں جب عمل کرنے والا مومن ہو، ایمان کے بغیر آخرت کے مساعی بار آور نہیں ہوتے ۱۲

اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ گودینا میں تو ان کے اعمال کے نتائج بغیر کسی کمی کے ان کے سامنے آجاتے ہیں، لیکن آخرت کی ابدی زندگی میں ان ہی کے متعلق یہ بھی اعلان کیا گیا ہے

۱ ولئنک لیس لھم فی ۲ الاخرۃ یہی وہ لوگ ہیں کہ نہیں ہے آخرت میں

۲ الا ۲ النار وھبط ما صنعوا ان کے لئے مگر صرف آگ اور تہیں نہیں

فیہا و بطل ما كانوا یعملون۔ ہو کر رہ گیا جو کچھ کیا دھڑا تھا انھوں نے

دُنیا میں، اور بے نتیجہ ہو کر رہ گیا جو کچھ انھوں نے کیا تھا۔

مسلمانوں کو ان کی اطاعت اور پیروی سے منع کیا گیا ہے، اسی لئے منع کیا گیا ہے کہ ان کی راہوں کو اگر تم بھی اختیار کرو گے تو وجہ ۲ اللہ والا اسلامی نصب العین تمہاری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جائیگا اور اس کی توثیق بھی مشاہدہ و تجربہ سے ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں جنہوں نے ان قوموں کی راہ اختیار کی، خواہ وہ ہند میں ہوں یا ترک میں، مصر میں ہوں یا مراکش میں، جس نسبت سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں، وجہ اللہ کے نصب العین سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور کھلی ہوئی بات ہے کہ اس نصب العین سے محروم ہو جانے کے بعد آدمی اور کچھ باقی رہتا ہو یا نہ رہتا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان تو قطعاً باقی نہیں رہ سکتا۔ بہر حال صبر کی داروئے تلخ کو خوشگوار بنانے کے لئے یہ تو وہ تدبیریں تھیں جو اسلامی و ثائق میں پائی جاتی ہیں، لیکن قرآن نے ان ہی تدبیروں پر معاملہ کو ختم نہیں کر دیا ہے، بلکہ منینۃ الحیوۃ الدنیا کے نصب العین والوں کے سامنے ان کی سعی و عمل کے نتائج جیسے آتے ہیں، اسی طرح قرآن نے صبر کو بھی ایک مستقل عمل قرار دے کر اس پر مرتب ہونے والے نتائج کی بھی تفصیل کی ہے، پہلا نتیجہ تو اس عمل کا یہی ہے جسے ایک سے زائد مقام پر

۱ ان ۲ اللہ مع ۲ الصابرین قطعاً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔

کے الفاظ میں ادا کیا ہے، قدری معیشت کے سلسلے میں جس صبر کی تلقین قدریوں کو کی گئی ہے وہ چاہیں تو اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جن نایافتہ نعمتوں کی محرومی انھیں محروم رکھتی ہے، اگر بجائے اس حزن کے صبر کے عمل سے اس موقع پر امداد حاصل کریں گے، تو پائیں گے کہ ان نایافتہ نعمتوں کی جگہ خود حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کی معیت و رفاقت کی دولت انھیں ملی ہوئی ہے جو بجائے خود ایک ایسی دولت ہے جس کا معاوضہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہو سکتا اور خدا ہی جس کے ساتھ ہو جائے سوچا جاسکتا ہے کہ اس نے کیا کچھ نہیں پایا۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ صبر کرنے والوں کے متعلق قرآن میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ انھیں یہ بشارت سنادی جائے کہ

۱ ولئنک علیہم صلوات من ربہم یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی

وسر حمد و ۲ ولئنک لھم طوفان سے صلوات نازل ہوتے ہیں، اور

۲ ملہم تدون۔ رحمت اور یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے

راہ پائی۔

تو یہ سب کچھ حق تعالیٰ کی اس معیت ہی کے نتائج ہیں جو قبر کی بدولت آدمی کو میسر آتی ہے، آخر خدا ہی جس کے ساتھ ہو گیا ہو، اگر خدا کی طرف سے اس پر صلوات کا نزول ہو، خدا کی نعمتوں سے وہ مالا مال ہو جائے اور سیدھی راہ زندگی کی اس کے سامنے آجائے، تو آپ ہی بتائیے کہ اس کے سوا اور کسی دوسری بات کا امکان ہی کیا ہے۔ پھر منہ مینۃ الحیوۃ الدنیا کو نصب العین بنانے والوں کے سامنے جیسے ان کے اعمال کے نتائج آتے ہیں، اسی طرح صبر کے اس عجیب و غریب عمل کے متعلق قرآن میں اگر یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

۱۰ نما یوفی الصابرون اجرهم
بغیر حساب۔

اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں ہے
کہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر کسی

حساب کے دیا جاتا ہے۔

تو لوگوں کو اس پر حیرت کیوں ہوتی ہے جس عمل کی بدولت لامحدود طاقتوں والے خدا کی معیت میسر آتی ہے، صلوات اور خدا کی رحمتوں سے جو عمل آدمی کو ڈھانک دیتا ہو، جس کی روشنی میں سیدھی راہ پر عمل کرنے والے پڑ جاتے ہوں، یقیناً ان کا غیر محدود اجر ہی تو ہے جو ان شکلوں میں ان کے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔

بہر حال موجودہ زندگی کے مصائب کا مقابلہ صبر سے کرنا، اور صبر کو خوش گوار بنانے کے لئے مذکورہ بالا قرآنی تدبیروں سے فائدہ اٹھانا، جن نتائج کا وعدہ اس عمل پر کیا گیا ہے اس سے قلب کو قوی رکھنا، اسلامی دماغوں کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کسی زمانے میں ایک فطری احساس کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا، گویا مسلمانوں کے دماغ کی منطق ٹھیک قرآنی منطق بن گئی تھی۔ یہی مضمون جسے طول طویل الفاظ میں مجھے بیان کرنے کی ضرورت ہوئی، اور پھر بھی مطمئن نہیں ہوں کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ کہہ بھی سکا یا نہیں، لیکن دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مشہور قول پر غور کیجئے فرمایا کرتے تھے

ما ابتلیت ببلۃ الاکان علی
فیہا اربع نغم، اذ الم تکن
فی دینی، و اذ الم تکن اعظم
منہا و اذ الم کن احرم الرضی
و اذ ارجو الثواب فیہا۔

نہ مبتلا ہوا میں کسی مصیبت میں کہ میں اپنے
لئے اس میں ان چار نعمتوں کو نہ پاتا ہوں
یعنی مصیبت میرے دین میں نہیں ہے (تو
کیا پروا) جب اس سے بڑی مصیبت ہو
ہو سکتی تھی وہ نہ تھی۔ اور جب حق کی رضا مندی

سے اس مصیبت کی وجہ سے میں محروم
(ازالۃ الخفا وغیرہ)

نہ ہوا، اور جب ثواب کی امید اس مصیبت پر لگاتا ہوں،

ہر مصیبت میں معاً چار نعمتوں کا احساس فرماتے ہیں کہ میرے دل میں بیدار ہو جاتا ہے، اور وہ نعمتیں کیا ہیں، وہی بات کہ اسلامی نصب العین جس کی بغیر آپ نے دین سے کی یعنی وہ محفوظ رہ گیا، دوسری بات وہی ہے جس کا ذکر نعمتوں کے شمار یعنی قانونِ حد کے ذکر میں گزر چکا، اور تیسری بات حدودِ اللہ سے متجاوز

ہونے کے جرم میں بجائے اس مصیبت کے مبتلا نہ ہوا، چوتھی بات ان ہی نتائج کی طرف اشارہ ہے جن کا عمل صبر پر قرآن مرتب ہونا ضروری ہے، ایک ایک مصیبت سے چار چار نعمتوں کو کھینچ کھینچ کر نزول مصیبت کے ساتھ ہی نکال لینا، اس حیرت انگیز اثر کی دلیل ہے، جو قرآن نے اپنے ماننے والوں میں پیدا کیا تھا، لیکن اب تو قرآن کے پڑھنے والے ہی کہتے ہیں، اور جو ہیں بھی وہ قرآن سے اپنی موجودہ زندگی کی دشواریوں کے حل کا کام ہی کب لینا چاہتے ہیں، خود میرا یہ طرز عمل کہ قرآن سے ان چیزوں کو نکال نکال کر مسلمانوں کے آگے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ ان سے فائدہ اٹھائیں، جہاں تک سمجھ رہا ہوں عام مذاق کے لحاظ سے یہی نہیں کہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں لی جائے گی، بلکہ اکثر لوگ پر میری یہ باتیں شاید گراں گذر رہی ہیں، لیکن میں کیا کروں، مجھے کچھ سمجھایا گیا ہے، چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی کاش! اس کے سمجھنے میں میرا ساتھ دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قدری معیشت کے مشکلات کے حل کی جو ذمہ داریاں بسطی معیشت رکھنے والوں پر عائد کی گئی ہیں۔ اپنی ان ذمہ داریوں کو اگر وہ نہ بھی محسوس کریں، حکومتوں پر جو فرائض قدریوں کے ان حقوق کی پابجائی کے سلسلے میں اسلام کی طرف سے متوجہ ہوتے ہیں، ان حقوق کے حاصل کرنے میں حکومتیں لاپرواہی سے بھی کام لیں، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ دوسروں پر اگر اختیار نہیں ہے تو اپنے آپ پر تو قدری معیشت رکھنے والوں کو اختیار ہے، میں تو خیال کرتا ہوں کہ جن تدبیروں پر عمل کرنے کا مطالبہ براہ راست خود قدریوں سے کیا گیا ہے، دوسروں سے قطع نظر کہ صرف ان ہی مطالبات کی تکمیل پر اپنے آپ کو اگر یہ آمادہ کر لیں تو تجربہ ان کو بتائے گا کہ اپنی دشواریوں کے حل کا اقتدار بجائے دوسروں کے زیادہ تر خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے، وہ چاہیں تو قدری معیشت کی اکثر و بیشتر کلفتوں کا ازالہ اسلام کی ان ہی تدبیروں کی امداد سے بہ سہولت تمام کر سکتے ہیں؛ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا جو اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتا، ایسوں کو تو صحیح معنوں میں دوسروں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانے کی ہمت بھی نہیں کرنی چاہیئے، اپنی ذات کے متعلق جن سہولتوں کو ہم خود مہیا کر سکتے ہیں، جب ان ہی کے مہیا کرنے کی توفیق ہمیں نہیں ہوتی، تو ہماری جو سہولتیں دوسروں کے ہاتھ میں ہیں، ان کے مطالبہ کا آخر ہمیں حق ہی کیا پہنچتا ہے۔

ایک ضروری تنبیہ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا اسباب پیش آئے، لیکن دیکھا یہی جاتا ہے کہ فقراء کے جو حقوق امراء کے اموال میں ہیں، بلکہ قدری معیشت رکھنے والوں کے ساتھ مختلف شکلوں میں عام حسن سلوک کے جو احکام اسلام نے بسطی طبقات کو دیئے ہیں۔ ان کا شمار تو فرائض و واجبات میں کیا جاتا ہے، اسی لئے فرائض و واجبات میں ان کو شمار کیا جاتا ہے کہ ان مطالبات کو جن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے ان کا اقتضائے یہ ہے، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ قدری معیشت کے متعلق عملی تدبیروں کا مطالبہ خود قدریوں سے بھی تو الفاظ کے ان ہی قابضوں میں کیا گیا ہے جن کا اثر وہی وجوب و فرضیت ہے

لیکن عام طور پر ان مطالبات کو اہمیت کیوں نہیں دی گئی؟ زیادہ سے زیادہ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کے ان احکام کو کچھ نیک مشوروں کی حیثیت سے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدری معیشت کے مصائب کا احساس لوگوں کو جب ہوتا ہے تو ان کا دھیان بھی ان قرآنی احکام کی طرف نہیں جاتا، جن پر عمل پیرا ہونا ایسی حالت میں ان پر فرض کیا گیا ہے۔ آخر زہرۃ الحیوۃ الدنیا والوں کی گونا گوں نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھانے سے قرآن نے جن الفاظ میں منع کیا ہے، کیا وہ معمولی الفاظ ہیں۔ "لا تمدن" ہی کے لفظ پر غور کیجئے، صرف یہی نہیں کہ بصیغہ نہی اس فعل سے روکا گیا ہے جس کی خلاف ورزی قطعاً حرام ہو جاتی ہے، بلکہ آخر میں مشدد نون کے اضافہ نے اس حکم میں جتنی قوت بھر دی ہے، اس سے معمولی عربی صرف کا جاننے والا بھی واقف ہے، لیکن اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایسے سخت تاکید فرمائے الہی کے متعلق ہمارے احساسات کیا ہیں اور وقت پر اس حکم کی تعمیل کی توفیق کتنوں کو ہوتی ہے اور جو حال مدعین کے اس قانون کا ہے، یہی حال نعمتوں کے عدو والے قانون کا بھی ہے۔ یہی حال ان دفعات کا بھی ہے جن میں صبر اور صبر کے متعلق احکام نافذ کئے گئے ہیں۔

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ قدری معیشت کی ان ذمہ داریوں کے متعلق جو الفاظ مسلمانوں میں آج مروج ہیں معنوی حیثیت سے خواہ ان کا مال وہی کیوں نہ ہو جو قرآنی الفاظ کا مال ہو لیکن نہ معلوم کیوں قرآنی محاوروں کو ترک کر کے دوسرے الفاظ کو ان کا قائم مقام بنا کر پھیلا دیا گیا ہے مثلاً ایسے مواقع میں لوگوں کو قناعت کی تعلیم دی جاتی ہے، لالچ اور حرص سے روکا جاتا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان الفاظ کا مقصد بھی اگرچہ قریب قریب وہی ہے جو قرآنی الفاظ کا مفاد ہے، لیکن قرآنی تعبیروں کو چھوڑ دینے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ان غیر قرآنی اصطلاحات کو قرآن میں نہ پا کر شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ اس قسم کا احساس قائم ہو گیا ہے کہ یہ قرآنی مطالبات ہی نہیں ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بدگمانوں کا ایک گردہ ہم میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو سمجھتا ہے کہ شاید غیر قوموں سے مسلمانوں میں قناعت و کم طلبی وغیرہ کے جذبات منتقل ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ ان مغالطوں میں جو خود مبتلا ہو گئے ہیں یا دوسروں کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں زیادہ تا ئید ان لوگوں کو قرآنی تعبیرات کے ترک ہی سے حاصل ہو رہی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غیر قرآنی الفاظ کی اشاعت ہی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس سلسلے کے قرآنی بیانات کے متعلق صحیح طور پر پہیٹے نہیں ہوئے ہیں کہ ان کا تعلق معیشت کے کس خاص کیفیت سے ہے؟ یعنی جن قرآنی آیات کا تعلق قدری معیشت اور اس کی دشواریوں کے حل سے ہے، ان کے متعلق عام مسلمانوں میں جہاں تک میں جانتا ہوں اس قسم کا کوئی خیال نہیں ہے، عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان کا خطاب ہر شخص سے ہے، خواہ وہ قدری معیشت رکھتا ہو، یا سبلی، یا یہی وجہ ہے کہ جن خاص مواقع پر ان قرآنی احکام اور مشوروں کو استعمال کرنا چاہئے، عام طور پر ان موقعوں پر لوگ ان کے استعمال کرنے کے عادی نہیں ہیں، اس لئے مسلمانوں کو ان آیتوں سے جو منافع پہنچنے چاہئیں جیسا کہ چاہیے

نہیں پہنچ رہے ہیں۔ ضرورت جب پیش آتی ہے تو لوگوں کے سامنے عموماً ان اشعار اور مقولوں کو پیش کر دیا جاتا ہے جن میں غیر قرآنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر براہ راست قرآنی آیتوں کے استعمال کا رواج مسلمانوں میں باقی رہتا، تو یقیناً اس کے آثار و نتائج موجودہ حال سے مختلف ہوتے۔

بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، آپ کے سامنے معیشت کی دونوں سمتوں اور ہر قسم کے متعلق اسلام نے مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے ہیں براہ راست قرآنی الفاظ ہی میں پیش کر دیئے گئے ہیں، حدیثوں کا استعمال بھی صرف تشریح و تفصیل کی حیثیت سے کیا گیا ہے، اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے

قل الحق من ربك فمن شاء

فليؤمن ومن شاء فليكفر^{۱۵}

اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

سچی بات بول دے جو تیرے رب سے

تجھ تک پہنچی ہے، پھر جس کا جی چاہے مانے

کی اس آیت کریمہ کو تلاوت کر کے چپ ہو جاتا ہوں۔ یہاں تک تو ان ذمہ داریوں کا ذکر تھا جو رزق کی بسطی و قدری حالتوں میں قرآن نے عائد کی ہیں، اب وقت آ گیا ہے کہ ان ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے جن نتائج پر قرآن نے تنبیہ کی ہے اس کی تفصیل پیش کر دی جائے، جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ بحث کا حقیقی حاصل مضمون کا یہی حصہ ہے اسی میں اس شبہ کا جواب آپ کو مل سکتا ہے جس کا ذکر ابتداء مضمون میں کیا گیا تھا، یعنی معاشی زندگی میں خدا کو الہ المعاش بنانے سے جو گریز کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کم از کم موجودہ زندگی میں اس کے نتائج سے انھیں دوچار ہونا نہیں پڑتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے باشندوں کی باغیانہ زندگی ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔ اسی خیال کی تردید واقعات کی روشنی میں اب آپ کے سامنے ہو گی۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلہ میں قرآن کی ساری معاشی دھکیاں صرف دھکیاں نہیں ہیں، بلکہ زندگی کے وہ حقیقی و مشاہداتی حقائق ہیں، ویاللہ التوفیق۔

اجمالاً پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے، درحقیقت اسی کی تفصیل اب مقصود ہے، قرآن میں "معیشت" کا ذکر کر کے ایک خاص قانون کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے، یعنی

ومن اعرض عن ذكرى فان

له معيشة ضنكا۔

اور جو کترا یا میری یاد سے تو یقیناً اس کے لئے ہے ایسی معیشت جو ضیق اور تنگی سے بھری ہے۔

ضیق اور تنگی، یہی "ضنک" کے لغوی معنی ہیں، حاصل اس کا یہی ہوا کہ حق تعالیٰ اور اس کی عائد کردہ

۱۵ یہ بات خاص طور پر سوچنے کی ہے کہ مندرجہ بالا آیت قرآن میں اسی موقع پر آئی ہے، جہاں قدری معیشت کی الجھنوں کا عملی

علاج یہ بتایا گیا ہے کہ وجہ اللہ کو غضب العین بنا کر جینے والوں کی صحبت پر صبر کرو، اور ان ہی پر اپنی نگاہوں کو جائے رکھو ۱۲

ذمہ داریوں کو جو یاد نہیں کرنا چاہتا، قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس کی معیشت میں قدرت
تنگی اور ضیق پیدا کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ قانون زندگی کے ہر حال اور ہر پہلو کو حاوی ہے، اسی لئے سمجھنا چاہیے کہ رزق کے حساب سے خواہ آدمی بسط کی حالت میں ہو، یا قدر کے، جو اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے اعراض و گریز کرے گا، اس کی معیشت تنگی اور ضیق کی شکار ہو جائے گی، اگرچہ یہ بالکل ایک تجربی چیز ہے، اسی لئے علماء نے اس کی تفصیل کی طرف کم توجہ کی، یعنی یہ بات کہ ایسی حالت میں ضیق اور تنگی کی کیفیت معیشت میں کیوں پیدا ہو جاتی ہے اسے چھوڑ دیا گیا ہے کہ تجربہ ہی اس کا بہترین جواب ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، قرآن ہی کی متفرق آیتوں کے مضمون پر اگر غور کیا جائے تو علاوہ تجربہ کے یوں بھی اس کے اسباب اور ان اسباب سے پیدا ہونے والے آثار کو بیان کیا جاسکتا ہے، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس باب میں اپنے خیالات عرض کرتا ہوں۔

بسطی معیشت کی ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے نتائج

کھلی ہوئی بات ہے کہ معیشت میں بسط کی خواہش اسی لئے کی جاتی ہے کہ بسطی معیشت سے زندگی میں سہولت اور آسانی پیدا ہوتی ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مال و دولت کی غرض یہی سمجھی جاتی ہے کہ خواہشوں کی تکمیل اور ضرورتوں کی فراہمی میں ان سے امداد ملتی ہے، لیکن بسطی معیشت کا یہ مقصد کیا ہر حال میں پورا ہوتا ہے قرآن ہی کی آیت ہے۔

و اما من اعطی و تقی و
 تو جس نے دیا، اور ڈرا، اور نقدیق کی

صدق بالمحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ اس نے المحسنیٰ کی یعنی اچھی باتوں کی تو

قریب ہے کہ ہم آسان کریں اس پر سہولت کی زندگی کو۔

جس کا مطلب یہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "الیسری" یعنی آسانوں اور سہولتوں والی زندگی کی راہ
ان ہی لوگوں کے لئے آسان کی جاتی ہے، جو دیتے ہیں، دینے کا مقصد یہی ہے کہ جو ذمہ داریاں ان
کے مال پر عائد کی گئی ہیں، ان ذمہ داریوں کو پوری کرتے ہیں، آگے و اتقی و صدق بالחסنی (یعنی
ڈرا اور اچھی باتوں کی تصدیق کی) یہ ان اسباب کی تشریح ہے جو ذمہ داریوں کے ادا کرنے پر آدمی کو آمادہ
کرتے ہیں، یعنی خدا سے جو ڈرتا ہے اور اچھی باتیں جنہیں خدا پسند کرتا ہے، اس میں وہ مانتا ہے، ظاہر ہے
خدا کی ذمہ داریوں کا خیال ایسے آدمی کو نہ ہوگا تو کیسے ہوگا۔

بہر حال قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ الیسری (آسان زندگی) کے حاصل کرنے کی راہ یہ ہے کہ خدا کے خوف سے خدا کی مرضی کے مطابق حق داروں تک ان کے حقوق پہنچائے جائیں، رہی یہ بات کہ ایسا ہوتا ہے بھی یا نہیں، یعنی ایسوں پر ان کی زندگی آسان ہوتی ہے یا نہیں، سو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ بالکل ایک تجربہ کی بات ہے اور جہاں تک میرے غور و فکر کا تعلق ہے، اس باب میں اس سے زیادہ شاید اور کچھ کہا بھی نہیں سکتا۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اس راہ سے ہٹ کر زندگی گزارتے ہیں یعنی وہی بات کہ اس معاملہ میں خدا اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو یاد کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے

ذکر سے اعراض کرتے ہوئے، مثلاً اس اصول کو اختیار کرتے ہیں، جس کا ذکر اسی الیسیری والی آیت کے بعد ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

و اما من بخل و استغنی و
اور جو بخیل بنا اور بے نیاز بنا اور اچھی
باتوں کو جس نے جھٹلایا،
کذب بالحسنی۔

یعنی جو لوگ بجائے اعطاء (داد و دہش) کے بخل کا رویہ اختیار کرتے ہیں، کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اسی کی طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں آگے کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے، یعنی مال و دولت روپیہ پیسے میں ان کو یہ خاصیت محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں سے آدمی کو یہ بے نیاز کر دیتے ہیں، اور بظاہر روپے میں کچھ یہ خصوصیت نظر بھی آتی ہے، ایک غریب آدمی آج کی ضرورتوں کی پوری ہو جانے کے بعد پریشان رہتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ اپنی ضرورتوں کے لئے کس کس کے پاس جانا پڑے گا۔ کس کس سے کہنا ہوگا، لیکن اسی کے مقابلہ میں جس کا سرمایہ فرض کیجئے کہ کسی بینک میں جمع ہے۔ وہ ہر حال میں چہ غم رہتا ہے۔ ہر ضرورت جو پیش آ سکتی ہے، اس کے متعلق مطمئن رہتا ہے کہ قاضی الحاجات ہمارے پاس موجود ہے جس کھانے کی خواہش دل میں پیدا ہوگی اسے کھا سکتا ہوں، جس لباس کے پہننے کو جی چاہے گا، بنوا سکتا ہوں، جہاں جانے کی ضرورت ہوگی، جا سکتا ہوں، حتیٰ کہ جس ڈاکٹر کو چاہوں گا بیمار پڑنے کی صورت میں بلوا سکتا ہوں، جس دوا کی طبیعت ضرورت ظاہر کرے گا منگو سکتا ہوں، روپے کے متعلق ”استغنا“ یا ”عنا بخشی“ کا یہی نظریہ ہے جو ارباب بخل بہ مسلط ہوتا ہے اور جیسا کہ میں نے کہا یہ ظاہر یہ ایک عقل کی بات بھی معلوم ہوتی ہے، روپے کے متعلق یہی احساس ایسوں کو اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیاز بناتا چلا جاتا ہے، نہ صرف انسانوں سے ہی، بلکہ بہ تدریج ایک کیفیت قلب میں ان کے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی کیفیت جس کا امتحان ممکن ہے شعور بھی نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ روپے کی استغنائیت ان کو خدا سے بھی بالآخر بے تعلق بنا کر رہتی ہے اور ہے بھی یہی بات کہ خدا کی ضرورت تو اسی بیچارے کو ہوتی ہے جو اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہو، اور سرمایہ دار خواہ واقعہ میں کتنا ہی بے سہارا ہو، لیکن روپے کا ایک نشہ ہوتا ہے، جو بے سہارا ہونے کے احساس کو اس کے اندر پیدا ہونے نہیں دیتا، اور یہ تو خیر اس کے نفس کی ایک باطنی کیفیت ہوتی ہے، لیکن دوسرا جملہ و کذب بالحسنی (جھٹلاتا ہے وہ اچھی باتوں کو) یہی چیز اس باطنی کیفیت کے راز کو فاش کرتی رہتی ہے، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ الحسنی (یعنی ہر ایسی بات جو اچھی سمجھی جاتی ہے) قدرتا بخل زدہ انسان امتحان جھٹلاتا ہے، اس کے دل سے انسانیت کی ہمدردی نکل جاتی ہے، صلہ رحمی، غربا پروری، حسن سلوک الغرض تمام اخلاقی خوبیاں، کردار کی بلندیاں، اس کی نگاہوں میں حماقت اور نادانی بن جاتی ہیں، آخر ان باتوں کی پروا وہ کیوں کرے؟ آدمی ان چیزوں کی پابندی یا خدا کے ڈر سے کرتا ہے یا مخلوق خدا کے خیال سے، لیکن جس پر اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیازی و استغنا کا احساس مسلط ہو، وہ کسی کا خیال ہی کیوں کرنے لگا، اپنی تمام بے مروتیوں، بداخلاقیوں کے متعلق دل میں وہ ایک ہی جواب کہتا ہے کہ

کوئی میرا کیا کر لے گا؟ اس تکذیب بالحق کے ردِ عمل میں اگرچہ اسے ہر قسم کی رسوائیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، عمومیت اس سے بے نیاز رہتی ہے، محفلوں میں مجلسوں میں لوگ اس کی دانتوں، جہانتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بنی آدم کے عام قلوب میں اس قسم کے لوگوں کے متعلق جو ایک قسم کی عداوت پائی جاتی ہے اور خلق اللہ کی ساری لعنتوں اور ملامتوں کی تہ میں عداوت کا یہی مخفی جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اسی عداوت کا یہ پرتو نہیں ہوتا جس کے متعلق بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ ”بخل خدا کا دشمن ہے“ مگر باوجود ان تمام باتوں کے اس کے قلب کا استغناء اس کے آگے کوئی میرا کیا کر لے گا، اسی جواب کو دہراتا رہتا ہے، اور ہے بھی یہی بات کہ بیچارے عوام اس کا کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن کیسی عجیب بات ہے جو اس کے بعد اسی آیت کے آخر میں ہے، یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں

فَسَيَسِّرُ اللَّهُ الْعُسْرَىٰ - پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے

اس کے لئے ”العسری“ کو یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو۔

معلوم نہیں قرآن کے ان الفاظ کا مطلب دوسرے کیا سمجھتے ہیں، لیکن مجھ پر تو یہی کھولا گیا ہے، یعنی عوام ظاہر ہے کہ ایسوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن جس نے اسے یہ دولت دی ہے، کیا اس کے بچہ اقتدار سے بھی وہ نکل جاتا ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا چاہے تو اس دولت کو اس سے چھین لے یا دولت ہی کیا، وہ تو قادر ہے کہ زندگی اور زندگی کے جن احساسات پر یہ بولیاں وہ بولتا رہتا ہے اسی زندگی سے جب چاہے اسے محروم کر دے، یہ تو خیر عام بات ہے، اور رات دن یہ ہوتا ہی رہتا ہے مذکورہ بالا قرآنی الفاظ میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ اس سے الگ بات ہے، یعنی سب کچھ کو اس کے قبضہ اقتدار میں دیتے ہوئے، قدرت کی یہ عجیب مخفی تدبیر ہے کہ جس دولت و ثروت روپے پیسے کو آدمی زندگی کی سہولتوں کے لئے حاصل کرتا ہے، اور غالباً بخل زدہ آدمی بھی مال اندازی کی راہ میں ابتداءً جب قدم رکھتا ہے تو اسی عام خیال کے زیر اثر ہی رکھتا ہے۔ لیکن قدرت کی قہاریت کا یہ کیسا عجیب نظارہ ہے کہ جب روپے پیسے پر اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، تو بجائے ”اليسرى“ (آسان زندگی) کے ”العسرى“ (سخت دشواریوں سے بھری زندگی) اس پر آسان کر دی جاتی ہے، وہ سب کچھ کھا سکتا ہے۔ لیکن کچھ کھا نہیں سکتا۔ سب کچھ پہن سکتا ہے، لیکن کچھ پہن نہیں سکتا، الغرض اپنے اپنے دائرے کے اعتبار سے آرام و عیش کی جن صورتوں کو وہ مہیا کر سکتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک سے وہ محروم کر دیا گیا ہے، اتنا محروم کہ غربت، انتہائی غربت کی زندگی رکھنے والوں کو بھی جو سہولتیں میسر آتی ہیں عموماً بخل کے ان روگیوں کو وہ بھی نصیب نہیں ہوتیں، سچ پوچھئے تو ایسوں کو دیکھ کر بے ساختہ

اس طرف متاثر ہوں لب تشنہ بآب اندر

کا مصرعہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے، گویا بہتی ہوئی خنک ریز موجوں کے نیچے حالانکہ اسے بٹھایا جاتا ہے، موجوں پر موجیں گذرتی رہتی ہیں، اسی پر سے گذرتی رہتی ہیں، لیکن اس کو رنجت کو رنجیب کی

تشنہ لبی اور محرومی اپنے حال پر باقی رہتی ہے، بہر حال حق تعالیٰ کی ذمہ داریوں سے انحراف و اعراض کر کے سُجُل کی راہ جو اختیار کرتے ہیں، ان کے متعلق قرآنی آیت

فَسَنِيَسِرْكَا لِّلْعَصْرِ ۝۱
پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے

اس کے لئے العصری کو (یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو)

کا مشاہدہ ایک ایسا تفسیری مشاہدہ ہے جس کی زندہ مثالیں دنیا کی آیا دیوں میں جہاں ڈھونڈھیے آپ کو مل سکتی ہیں، ہر قسم کی سہولتوں پر قابو یافتہ ہونے کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ زندگی کی دشواری ترین شکلوں کو اپنے آپ پر اس قسم کا آدمی کتنا آسان بنائے ہوئے ہیں، اور جیسے ان مثالوں کی کمی نہیں ہے، قرآنی الفاظ

كَذٰبٍ بِالْحَسَنٰی۔
جھٹلاتا ہے وہ ”الحسنی“ کو (یعنی جو

باتیں اچھی سمجھی جاتی ہیں)

کے لئے بھی بجائے کتابوں کے کسی سُجُل زدہ فطرت کی زندگی کا مطالعہ ہی کافی ہو سکتا ہے، اس سلسلہ میں جن واقعات کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ میرے نزدیک تو قرآن فہمی کے لئے وہی بس کرتے ہیں، کسی کو زیادہ شوق ہو تو جا حظ کی مشہور کتاب ”البعلاء“ کے مطالعہ سے اپنے شوق کو وہ پورا کر سکتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ”الحسنی“ کی تکذیب کے متعلق تو کوئی میرا کیا کر لے گا؟ یہ جواب بھی وہ رکھتا ہے۔ اس تکذیب کے ردِ عمل کا ظہور جن شکلوں میں ہوتا ہے، ان کے متعلق بھی یہ سمجھ کر کہ حاسدوں کو بکنے دو، وہ میرا بگاڑ ہی کیا سکتے ہیں، شاید اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہو، اگرچہ سچ تو یہ ہے کہ معشیت کی تنگی و ضیق کے لئے اس کی یہی رسوائیاں کافی ہو سکتی ہیں، اور میں نہیں جانتا کہ انسانی احساسات کھتے ہوئے یہ کیسے یاد رکھا جاسکتا ہے کہ خلق اللہ کی لعنتوں اور ملامتوں کی چوٹ اس کے دل پر نہیں پڑتی مال کا ایک بڑا مصرف جیسا کہ حضرت حسین علیہ السلام سے مروی ہے، عزت اور آبرو ہی کا بچا نا ہے لیکن قدرت کا یہ بھی انتقام ہی ہے کہ اسی مال سے رسوائیوں اور بے عزتیوں کے خریدنے پر وہ مجبور کیا جاتا ہے، تاہم جو اذیت اپنی بے عزتی بے آبروئی سے آدمی کی ہوتی ہے۔ چوں کہ قلب کی یہ ایک مخفی کیفیت ہے جس پر گزرتی ہے وہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے، دوسروں کے مشاہدہ کی یہ چیز نہیں ہے۔

مگر دوسری سزا یعنی ”العصری“ کی تفسیر یعنی دشواری اور کٹھن زندگی جو اس پر آسان کر دی جاتی ہے اور سزا کے اس سلسلہ میں باب اندر رہ کر جس ”تشنہ لبی“ کا تماشا یہ طبقہ دکھاتا چلا آ رہا ہے، یہ تو کوئی دھنکی چھپی بات نہیں ہے، سہولتوں اور آسائشوں کے لئے جو چیز حاصل کی جاتی ہے، مغالطوں میں مبتلا ہو کر اسی کو اپنی دشواریوں اور سختیوں کا وہ ذریعہ بنا لیتا ہے اور یہ ہے،

مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَانْ لَّهٗ
جو کترا یا میری یاد سے تو قطعاً ہے اس کے

مَعِيشَةٌ ضَنْكًا۔
لئے زندگی ضیق اور تنگی سے بھری ہوئی۔

کی مشاہداتی باتیں اور کھلی ہوئی تفسیر، مرنے سے پہلے جسے ان لوگوں کو دیکھنی پڑتی ہے جو خدا اور اس کی

ذمہ داریوں کے یاد کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

باقی مغالطوں میں مبتلا ہونے کا جو ذکر میں نے کیا، اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے پاڑے جو اس مسکین کو بیلنے پڑتے ہیں، جیسا کہ قرآن ہی میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کی بنیاد وہی "استغنی" کا راز ہے، یعنی دوسروں سے بے نیاز بنانے کی جو صلاحیت دولت میں نظر آتی ہے۔ یہی بات کراتی ہے، ان لوگوں سے جو کچھ کراتی ہے، لیکن کیا واقعہ بھی یہی ہے، اب میں لوگوں سے کیا کہوں، صبح و شام ہر شہر ہر بستی و آبادی میں

ما ۲ غنی عنہ مالہ و ما کسب نہ کام آیا اسے مال ہی اس کا اور نہ

وہ جو کچھ کمایا اس نے۔

کی قرآنی آیت کا تجربہ لوگوں کو کرایا جا رہا ہو، صرف اسی وقت نہیں، جیسا کہ قرآن ہی میں اسی سورہ "واللیل" کے اندر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ما یغنی عنہ مالہ اذا تردی نہیں کام آتا ہے مال اس کا جب برباد

ہوتا ہے وہ۔

خواہ یہ تباہی اور بربادی مال کی بربادی کی شکل میں ظاہر ہو، یا جو صاحب مال کی کہ یہ تو خیر ایک کھلی ہوئی بات ہے، بکثرت قرآن ہی میں آپ کو اس مضمون کی آیتیں ملتی چلی جائیں گی۔

۱ فلم یسیروا فی الارض فینظروا کیا وہ چلتے پھرتے نہیں زمین میں، پھر
کیف کان عاقبة الذین دیکھتے وہ کیا حال ہوا ان کا جو ان سے
من قبلہم کانوا اکثر منہم پہلے تھے، ان سے قوت میں بھی، اور
واشد قوتہ و اشاسا فی زمین پر آثار (عمارتیں اور دوسرے آثار)
۲ الارض فمما ۲ غنی عنہم کہ چھوڑنے میں یہ گزرے ہوئے لوگ
ما کانوا یکسبون زیادہ بھی تھے اور شدید بھی تھے۔ پر نہ

کام دے سکا ان کو وہ سب کچھ جو کمایا تھا انہوں نے۔

دولت و امارت، سلطنت و حکومت، شوکت و قوت کی غنا بخشیوں کے مغالطہ کا ازالہ ہر تھوڑے تھوڑے دن پر قدرت صحیفہ عالم پر کرتی رہتی ہے، آج ہی دنیا میں حدودی کثرتوں اور حربی و جنگی قوتوں، حیرت انگیز اختراعی و ابتدائی ایجادوں سے استغناء حاصل کرنے والی قوموں پر جو گزر رہی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، انہوں نے زمین کو اٹا پٹا، اور کیا کیا چیزیں نہیں نکالیں، شورہ نکالا، گندھک نکالا، زغال کے معدنوں کا پتہ چلایا، پٹرول کے خزانوں کا سراغ لگایا اور زمین کی ان ہی ودیعتوں سے کیا کیا کام نہیں نکالے، لیکن

فما ۲ غنی عنہم ما کانوا نہ کام دے سکا ان کو وہ سب کچھ

یکسبون جو کمایا تھا انہوں نے۔

کا ترجمہ ان میں کتنے کرچکے اور جو باقی ہیں انہیں آج نہیں توکل بہر حال اس کا ترجمہ کرنا ہی پڑے گا، یہاں بھی کرنا پڑے گا، اور وہاں بھی جہاں کہنے والوں سے کہلایا جائے گا۔

ما۲ غنی عندہ مالیہ ہلک

نہ کام آیا (آج) مجھے میرا مال، تباہ ہو گیا

میرا سارا غلبہ (اقتدار)

عنی سلطانیہ۔

لیکن یہ تو بڑے پیمانوں کی باتیں ہیں، زیادہ تر ان آیتوں کا تعلق اقوام و امم سے ہے، میں تو اشخاص و افراد تک کے متعلق دیکھ رہا ہوں کہ صاحب مال زندہ بھی ہیں، مال ان ہی کا مال ہے، دوسروں کی نگاہوں میں وہ خوش حال بھی ہیں، سب کچھ ہے لیکن باوجود اس کے

ما۲ غنی عندہ مالہ و ما کسب

نہ کام دے سکا اس کو مال اس کا

اور جو کچھ کما یا تھا وہ۔

کی تفسیر بھی کر رہے ہیں، اس راہ کے خورد کوں، اور مرد کوں کو تو چھوڑیے، میں آپ کے سامنے بیسویں صدی کے سب سے بڑے انفرادی دولت مند کو پیش کرتا ہوں جو کسی خاص صوبہ یا ملک نہیں، بلکہ ہفت اقلیم کے امیروں میں کبھی سب سے بڑا امیر گنا گیا، اسی کی شہادت اسی کی زبانی سن لیجئے میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں اس کا حساب بھی نہیں کر سکتا، کہا جاتا ہے کہ میری جائداد ۵ کروڑ پونڈ (۵ کروڑ روپے) سے زائد کی ہے۔

دیکھا آپ نے! پچھتر کروڑ روپے سے زائد کی دولت موجود ہے، اس پر اقتدار کئی حاصل ہے، ابھی وہ مرا بھی نہیں ہے، زندہ ہے، لیکن غنا بخشوں کی ضمانت العیاذ باللہ جس قاضی الحاجات کے اندر پوشیدہ سمجھی جاتی ہے، اسی کے متعلق اعلان کرتا ہے،

میں ساری جائداد کو دے ڈالنے کو بخوشی تیار ہوں، اگر ایک وقت بھی

پیٹ بھر کھانا کھا سکوں۔

مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی اپنے اخبار سچ مورخہ ۱۹۲۷ء میں ملک البرول (یعنی گھاس لیٹ کے بادشاہ) سٹراک فیلر آنجنہانی کی اس ذاتی شہادت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”اس کی (راک فیلر جو زندہ تھا) عمر ۸۵ سال کی ہو چکی ہے، ابتداء ہی سے سوء

ہضمی کی اس کو بیماری ہے، حال یہ ہے کہ بجز دودھ اور بسکٹوں کے ایک قلیل

مقدار کے وہ دن بھر کچھ کھا نہیں سکتا۔“

مولانا عبد الماجد نے کسی انگریزی وثیقہ سے یہ خبر نقل کی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ بیچارہ راک فیلر اس میدان کا تہا آدمی نہیں ہے، جو اس خبر کی تحقیق و تلاش میں خواہ مخواہ وقت ضائع کیا جائے دولت کے اعتبار سے آپ کو راک فیلر جیسے سرمایہ دار ممکن ہے کہ دنیا میں نہ ملیں۔ لیکن ابتداء سے سوء ہضمی کی شکایت ”پیٹ بھر کھانا کھانے کی“ نہ پوری ہونے والی تناؤں میں تو اس راہ کے انتی پچاسی فی صدی راہ رو آپ کو ہر گلی کو چے میں مل سکتے ہیں۔ جناب راک فیلر آنجنہانی کے دوسرے

”ہم چشم ہم قدم جوا بھی اس جہانی ہیں، میری مراد ہنری فورڈ صاحب شاہ موٹران سے ہے، اسی اخبار سچ میں ان کے متعلق بھی یہ خبر شائع ہوئی تھی۔“

”وہ (ہنری فورڈ) ایک نحیف الجثہ لاغر اندام دائم المرض بزرگ ہیں، جن بیمارے نے اپنی زندگی کی خاطر سالہا سال سے اپنے اوپر ہر قسم کی لذت اور پر تکلف غذاؤں کو حرام کر رکھا ہے، ڈاکٹروں کی ایک جماعت ہر وقت ان کی نگرانی کرتی رہتی ہے کہ کسی وقت کھانے میں بد پرہیزی نہ کر بیٹھیں۔“

اور یہ واقعہ تو چند ہی دن ہوئے دنیا کے اخباروں میں چھپا تھا کہ یہی ہنری فورڈ صاحب جنہیں عربی اخباروں اور رسالوں میں ”اغنیٰ اغنیاء العالم“ یعنی ”سارے عالم کے امیروں کا سب سے بڑا امیر“ کے خطاب سے ہمیشہ یاد کرتے ہیں۔ ان کے اکلوتے نورِ نظر پر بیمار ہی کا حملہ ہوا۔ سب کچھ کیا گیا، جو ہنری فورڈ جیسے باپ سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے ممکن ہو سکتا تھا۔ لیکن دولت کے متعلق ”غنا بخشی“ کا انسانی نظریہ غلط ثابت ہوا، اور خدا کی بات

مَا يَغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى۔ اور نہیں کام دیتا ہے مال اُس کا

جب گرتا ہے وہ۔

پوری ہوئی۔ لیکن قدرت کی مجازاتی کار فرمایاں کیا اسی حد پر ختم ہو جاتی ہیں؟ بالفاظِ دیگر اعراضی زندگی کو ”معیشۃ ضنک“ یعنی تلخیوں اور تنگیوں سے ایسوں کی معیشت جو بھری جاتی ہے۔ اس کے تلخ بنانے کی کیا صرف ایک یہی صورت ہے؟ قرآن کی ایک پوری سورۃ جس کا سورہ ہمزہ نام ہے۔ عم یتسألون ہی کے پارے کی مشہور سورۃ ہے۔ اس میں بھی صرف ایک اس معاشی مسئلہ کے ایک خاص پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال پہلے پوری سورۃ کو ترجمہ کے ساتھ لکھ دیتا ہوں۔

وَبَلِّ لِّكُلِّ هُمْزَةٍ لُّزَّتِ ۚ الَّذِي جَمَعَ	تَف ہے ہر چشمک مارنے والے عیب چینی
مَالًا وَعَدَدًا يُحْسِبُ ۚ اِنَّ	کرنے والے کے لئے جو جمع کرتا ہے مال کو
مَالَهُ اَخْلَدَ ۚ كَلَّا لِيَنْبِذَنَّ	اور گنتا رہتا ہے اس کو خیال کرتا ہے کہ
فِي الْحَطْمَةِ ۚ وَمَا اَدْرَاكَ	دوام بخشا ہے مال اس کا، ہرگز نہیں،
مَا الْحَطْمَةُ ۚ نَارُ اللَّهِ اَلْمَوْقِدَةِ	وہ جھونک دیا جاتا ہے الحطمة میں اور کس نے
الَّتِي تَطْلُعُ عَلٰی ۚ لَا فُتْدَ ۚ اِنَّهَا	تجھے بتایا کہ الحطمة کیا چیز ہے، آگ ہے اللہ کی
عَلَيْهِمْ مَّوَصَّةٌ فِی عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ	سداگئی ہوئی، چڑھ جاتی ہے دونوں پر

اس آگ کے پٹ بند ہیں لمبے لمبے کھبوں میں۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے واللہ میں مال اور سرمایہ کے متعلق ”نظریۃ غنا بخشی“ اور جن آثار و نتائج تک یہ نظریہ آدمی کو پہنچاتا ہے، بیان کیا گیا تھا، اسی طرح مذکورہ بالا سورۃ یعنی سورہ ہمزہ میں

اسی مال اور سرمایہ کی بابت ایک دوسرا عام خیال جو پایا جاتا ہے، اسی کی تعبیر
محسب ان مالہ ۲ اخلدہ خیال کرتا ہے کہ دوام بخشا ہے اس کو
مال اس کا۔

کے الفاظ میں کی گئی ہے، یعنی یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ زندگی کی راحتوں اور سہولتوں کو دیر پا بنانے
کی یا قرآنی اصطلاح کی رو سے "خلود بخشی" کی کیفیت مال میں پائی جاتی ہے اور اسی بنیاد پر یہ خیال
کیا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ کا ذخیرہ جتنا زیادہ بڑھایا جائے گا، راحتوں اور سہولتوں کی دیر پائی اور
خلود کی ضمانت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جاتی ہے۔ مثلاً دو سو روپے ماہوار کے خرچ سے زندگی کا
جو معیار قائم ہوتا ہے، اس معیار کو وہی برقرار رکھ سکتا ہے جو اس آمدنی کو قائم رکھے، اور اس معیار کو
جو بلند کرنا چاہتا ہے، چاہیے کہ اپنی آمدنی کو بھی بڑھائے۔

مال کے متعلق "خلود بخشی" کا یہی نظریہ ہے جو صرف "جمع مال" کے سمیٹنے ہی پر نہیں، بلکہ ان
گونا گوں پیچیدہ تدبیروں اور ترکیبوں پر آدمی کو آمادہ کرتا ہے، قرآن میں جس کی طرف عددہ
کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر یہ ایک لفظ معلوم ہوتا ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، یہی
ایک لفظ ان تمام جوابی چکروں کو حاوی ہے، جن کی عامیانہ تعبیر "تناؤ سے کھینچنے کی جاتی ہے"
بلکہ اگر وسعت نظری سے کام لیا جائے تو اکاؤنٹ اور فینانس وغیرہ کے پُر شوکت الفاظ سے
موجودہ زمانے میں مالی کاروبار کے جن شعبوں کو موسوم کیا جاتا ہے ان پر بھی "عددہ" کے قرآنی
لفظ کو ہم منطبق کر سکتے ہیں۔

آگے قرآن میں "کَلَّا" کا لفظ ہے، جو ایک تردیدی کلمہ ہے، جس کا اردو ترجمہ "ہرگز نہیں"
کیا گیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ "جمع وعدہ" کی یہ ہنگامہ آرائیاں، خلود اور دیر پائی کے
جس مقصد کے لئے لوگ برپا کئے ہوئے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ سرمایہ کے متعلق "جمع وعدہ" کی یہ
یہ تدبیریں خلودی نصب العین کے حاصل کرنے میں انھیں کامیاب بنائیں گی، قطعاً غلط ہے، اس
کے بعد جو یہ الفاظ ہیں

لنبدن فی المحطمة وما	قطعاً جھوٹک دیا جاتا ہے وہ المحطمة
ادساک ما المحطمة فاسر الله	میں اور کس نے بتایا تجھے کہ المحطمة کیا چیز
الموقدة التي تطلع علی الاقدار	ہے، آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی
ما علیہم موصدة فی	جو چڑھ جاتی ہے دلوں پر، اس آگ کے پٹ
عمد حمدا دہ	بند ہیں ان لوگوں پر لمبے لمبے کھبوں میں۔

لفظی ترجمہ تو قرآنی الفاظ کے سامنے لکھ دیا گیا ہے، لیکن مطلب اس کا کیا ہے؟ موجودہ زندگی کے
بعد جو دوسری زندگی آنے والی ہے۔ کیا ان کیفیات و حالات سے اس زندگی میں ان لوگوں کو ڈوبنا
ہونا پڑے گا یا آئندہ زندگی کے سوا موجودہ زندگی میں بھی ہم ان کیفیتوں کو ان لوگوں کے اندر پاسکتے ہیں

جن کی طرف جمع وعدہ کے ان آثار اور نتائج کو منسوب کیا گیا ہے، سورۃ کے ابتدائی الفاظ
 ویل لکل ہمنۃ لہمزۃ۔
 نقص ہے ہر چشمک مارنے والے عیب بینی
 کرنے والے کے لئے۔

کو پہلے سمجھ لینا چاہیے، ممکن ہے کہ اسی سے اس سوال کا جواب بھی نکل آئے۔
 ہمزہ کا مادہ ہمزہ ہے اور لہمزہ کا مادہ لہمزہ ہے۔ ہمزہ کے معنی کچھ کے لگانے کے ہیں۔ ہمزہ کا
 لفظ اردو میں بھی اسی ہمزہ سے بنا ہے۔ سوار اپنے جو لوگوں میں لوہے کی کیل جیسی چیز اس لئے لگاتے ہیں
 کہ گھوڑے کو ایڑ لگانے کی ضرورت جب ہوتی ہے تو کچھ کے لگانے کا کام اسی کیل سے لیتے ہیں، قریب
 قریب لہمزہ کا مفہوم بھی یہی ہے، منجملہ اور معانی کے منتہی الارب میں زدن و سوختن یعنی مارنا اور جلانا بھی
 لہمزہ کا ترجمہ کیا گیا ہے، یہ تو ان الفاظ کے ابتدائی معانی تھے، بعد کو یہ معاورہ ہو گیا کہ جن کے اقوال و
 افعال سے دل مجروح و زخمی ہوتے ہوں، اور اپنی گفتار و رفتار سے لوگوں کو جو جلاتے ہوں، ان ہی کو
 ہمزہ لہمزہ کے نام سے موسوم کرنے لگے، اسی لئے عامہ مفسرین نے چشمک زنی کرنے والے، فقرے
 کہنے والوں کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کرنے والے نقل بنانے والے غیبت کرنے والے وغیرہ الفاظ میں
 ہمزہ لہمزہ کی تشریح کی ہے، اب غور کرنے کی بات یہی ہے کہ مال کے متعلق جمع وعدہ کے گورکھ دھندوں
 میں جو لوگ شب و روز منہمک و مشغول رہتے ہیں، ان کا ہمزہ و لہمزہ کے ان صفات سے کیا تعلق ہے؟
 بات یہ ہے کہ ”خلود بخشی“ اور ”دیر پائی“ کی ضمانت مال اور سرمایہ میں محسوس کر کے جمع وعدہ کی
 اس مہم میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کرنے والوں کو یوں تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، لیکن حاصل سب کا
 یہی ہوتا ہے، کہ جو اچکا ہے۔ اس سرمایہ کے ایک ایک پیسہ کی نگرانی کی جائے، اور جو ابھی نہیں آیا ہے
 اس کے آنے کے ممکنہ ذرائع کو کسی طرح ضائع ہونے نہ دیا جائے۔ اب اسی کے ساتھ اگر مرحوم کی اس
 حقیقت طرازی کو بھی سامنے رکھ لیجئے جو انہوں نے فرمایا ہے۔

یہ بات ہے صاف مجھ سے سُن لے کتاب میں اس کو کیا پڑھے گا
 حدود فطرت کے ہیں مقرر جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

اور یہی بات اس سرمایہ پر بھی صادق آتی ہے جو زندگی گزارنے کے لئے دنیا میں آدمی کو دیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ سرمایہ پر
 جو لوگ جمع وعدہ کا عمل شروع کرتے ہیں تو لازماً ان کے سامنے دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں، اگر اپنے سرمائے کے
 بڑھانے میں کامیاب ہوئے تو قدرتاً دوسروں کا سرمایہ گھٹ جائے گا۔ اور اگر ناکام ہوئے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ
 دوسروں کا سرمایہ بڑھ گیا اور ان کا گھٹ گیا، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں جمع وعدہ کی مہم کا یہی وہ نقطہ ہے جو
 مقابلہ کے اس میدان میں آدمی کو بہر حال گھسیٹ کر لے ہی آتا ہے جس کی طرف قرآن ہی دوسری جگہ
 الحکمۃ التکاثر حتی نہ رستم غفلت میں ڈال دیا تم کو التکاثر نے (یعنی
 الملقا بر۔ دولت کے بڑھانے میں باہمی مقابلہ نے)
 حتی کہ زیارت کی تم لئے قبروں کی۔

کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے "التکاثر" کا مادہ کثرت ہے، یہی کثرت جب "تکاثر" کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو کثرت طلبی میں مقابلہ اور COMPETITION کا مفہوم اس سے سمجھا جاتا ہے، یہ التکاثر کا خبط ایک ایسا خبط ہے کہ وہی آدمی جو صرف زندگی کی حقیقی ضرورتوں کی تکمیل کے ارادے سے معاشی جدوجہد کی راہوں میں ابتداء قدم رکھتا ہے، اگر کہیں ننانوے کے پھر میں پڑ کر "التکاثر" کے میدان مقابلہ میں کود جاتا ہے تو آئے دن یہ دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت کا سوال ایسوں کے سامنے سے ہٹ گیا اور صرف مقابلہ کا بھوت سر پر سوار ہو گیا، جیسے جیسے آگے بڑھنے کے مواقع مقابلہ کے اس میدان میں لوگوں کو ملتے چلے جاتے ہیں۔ اس مقابلہ کا دائرہ بھی بدلتا جاتا ہے، ابتداء میں کسی گاؤں کے باشندوں سے مقابلہ تھا، تو گاؤں سے آگے بڑھ کر اب کسی علاقہ کے سرمایہ داروں کو اپنا ہم چشم بنایا جاتا ہے، یونہی علاقہ سے آگے بڑھ کر ضلع ضلع کے دائرے کو چھوڑ کر صوبہ، صوبہ سے نکل کر ملک، اور ملک کے دائرے کو بھی توڑ کر ساری دنیا میں چاہتا ہے کہ اسی کا گھوڑا اس راہ میں سب سے آگے نکل جائے، بلکہ ممکن ہے کہ بعضوں میں انسانیت کی ساری تاریخ میں بھی اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا جذبہ "التکاثر" کی راہ میں مسلط ہو جائے ۱ لھاکہ (غفلت میں ڈال دیا تم کو) کے الفاظ سے قرآن نے اس دماغی خبط کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں "التکاثر" کے بیمار مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ مسلسل مقابلہ کے اسی میدان میں آئے دن ان کو یہ دکھایا جاتا ہے کہ ان ہی کے ساتھ چلنے والوں میں کتنے ہیں جو گرتے جاتے ہیں، ٹپکتے جاتے ہیں، قبروں میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ لیکن "التکاثر" کے خبطیوں کے کان پر جوں بھی نہیں رنگتی، اور یہی مطلب ہے قرآن کے الفاظ

حتیٰ نہ رستم ۲ طعتا بر۔ حتیٰ کہ زیارت کر چکے تم قبروں کی۔

کا یعنی ایک دو قبروں ہی نہیں بلکہ "المقابر" جو "قبر" کی جمع ہی نہیں بلکہ منتهی المجموع یعنی جمع کی انتہائی شکل کا صیغہ ہے، ان "المقابر" کی زیارت بھی مقابلہ کے ان دیوانوں میں چونک پیدا نہیں کرتی، اور کبھی دوسروں کی قبروں کو دیکھ کر اپنے قبری انجام کا خیال ان کے سامنے آتا بھی ہے تو فوراً اپنی تسلی اور اس دماغی خبط کی تصحیح کے لئے اپنے سامنے اپنی آئندہ نسلوں کو یہ لے آتے ہیں، گویا توجیہ یہ کر لی جاتی ہے کہ مقابلہ کے میدان کے ان نتائج سے اگر مجھے تمتع اور استفادہ کا موقعہ قبرنہ دے سکے گی تو کیا ہوگا، میری آئندہ نسلیں تو اس سے مستفید ہوتی رہیں گی۔ یوں "المقابر" کی زیارت جس تہیہ کو ان میں بیدار کر سکتی تھی، توجیہ کی اسی لوری کو سنا کر اسے بھی یہ سلا دیتے ہیں، اور ہر طرف سے بے خوف ہو کر "التکاثر" کے اس میدان میں اپنا نصب العین اسی مقصد کو بنا لیتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں ان الفاظ میں اسے بیان کیا گیا ہے، یعنی

وَقَدْ كَلَّمْنَا الْوَرَاثَ ۲ اَكْلًا لَّمَا

اور اتر آت کو تم کھا رہے ہو سمیٹ کر

کھانے کی شکل میں۔

آیت کریمہ میں "التراث" کا لفظ "وراث" کی بدلی ہوئی شکل ہے، عربی زبان میں اس وزن اور اس

شکل کے الفاظ اشتراک کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں، گویا پہلی نسلوں کے ساتھ کچھلی نسلیں جس سرمایہ میں شریک ہوں، ان ہی کو "التراث" کہتے ہیں۔ دوسرا جز اسی آیت میں "اکل لم" کا ہے، اکل کے معنی تو کھانے کے ہیں، رہا تم کا لفظ، تو عربی زبان میں "رجل ملم" اس شخص کو کہتے ہیں جو قوم کے بکھرے ہوئے افراد کو سمیٹ کر کسی نقطہ پر جمع کرنے والا ہو، منتهی الارب میں ہے "رجل لم" (جمع کنندہ قوم یا عشیرہ پر آگندہ را) لغت کی اسی کتاب میں مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ اسی بنیاد پر یہ کیا گیا ہے:

تا کلون التراث ۲ کلاطما ۲
نضیبکم ونضیب صاحبکم
تم کھا رہے ہو التراث کو اکل لم کی شکل میں
یعنی اپنا حصہ بھی اور اپنے ساتھی کا حصہ
بھی کھا جاتے ہو۔

حاصل اس کا یہی ہوا کہ سرمایہ اور دولت سے استفادہ کی یہ شکل کہ پہلی نسلوں سے کچھلی نسلوں تک وہ بایں شکل منتقل ہوتی چلی جائے کہ دوسروں تک قطعاً اس سرمایہ کا کوئی حصہ نہ پہنچ سکے، بلکہ جو کچھ ہو دانہ دانہ، رتی رتی، سب ایک ہی خاندان خاص نسل اور خاص طبقہ ہی تک پوری طاقت کے ساتھ اس طور پر اس کو محدود رکھنے کی کوشش کی جائے کہ کسی غیر کے منہ میں اس کی کوئی کھیل بھی اڑ کر نہ پہنچ سکے گویا وہی بات جس کے اسناد کے لئے صلیحی فتوحات کے مقبوضات اور آمدنیوں کے متعلق قرآن میں

لکھلا یكون دولة بین الاغنیاء
تاکہ نہ بن جائے ایسی دولت جو تمہارے
سرمایہ داروں ہی کے درمیان (گھومتی رہے)
منکم۔

کا قانون نافذ کیا گیا ہے، ٹھیک اسی کے توڑ پر یہ "اکل لم" سرمایہ داروں کا ایک خاص شیوہ ہی میسٹر ڈارلنگ نے امریکہ و یورپ کے موجودہ نظام سرمایہ داری کی تعریف کرتے ہوئے یہ الفاظ جو لکھے ہیں:

"یہ قبضہ میں رکھنے والوں اور تعاقب کرنے والوں کی محض اجتماعی صورتیں ہیں" (داستان دہقان ص ۳۳۸)

میں تو سمجھتا ہوں کہ قرآنی الفاظ "اکل لم" ہی کی گویا تفسیر ہے، اور اسی کے بعد وہ حالت اس راہ کے چلنے والوں کی ہو جاتی ہے جس کی طرف بخاری کی مشہور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ یعنی

کالذی یا کل ولا یشبع
اس شخص کی حالت جو کھاتا جاتا ہے
اور سیر نہیں ہوتا۔

میں ایسا فرمایا ہے، بلکہ قرآن کا وہ تمثیلی بیان گویا ان ہی لوگوں کی ایک زندہ تصویر ہے۔ یعنی اس مثالی شخص کا ذکر کرتے ہوئے جو زمین کی مٹی پکڑ کر بیٹھ گیا تھا، یا قرآنی الفاظ میں

۱ خلد ۲ الی الارض وابتع ھو ۲
ہمیشہ کے لئے گمراہ زمین میں اور پیچھے

چل پڑا اپنی خواہش کے۔

کی کیفیت جس پر مسلط ہو گئی تھی، اسی کے متعلق ارشاد ہے۔

تو اس کی مثال اُس کتے جیسی ہے کہ اگر

اسے دھتکارو جب بھی ہانپنے لگے گا

فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل

علیہ یلہث او تترکہ یلہث۔

نہ دھتکارو جب بھی ہانپنے لگے گا۔

سرمایہ کے متعلق یہ خیال کہ زندگی کی ضروریات و حاجات کی تکمیل کا وہ ذریعہ ہے، یہ چیز تو اس کے سامنے سے ہٹ جاتی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے سرمایہ "اور مال" بذاتِ خود اس کا مقصود و مطلوب بن جاتا ہے اسی لئے ہر حال میں "جمع و جمع" کا یہ مریض ہانپتا ہی رہتا ہے، ملے جب بھی، نہ ملے جب بھی کتوں کی طرح زبان نکالے اپنے اوپر حرص کی ایک ایسی کیفیت طاری کئے رہتا ہے کہ گویا اسے اب تک کچھ ملا ہی نہیں ہے، "جمع کرتا جائے، گنتا چلا جائے" اس کا کام اب فقط یہی رہ جاتا ہے، قرآن ہی میں

و تخبون المال حبا جمًا اور چاہتے ہو مال کو "حب جم" کے ساتھ۔

جو فرمایا گیا ہے، اگرچہ میں اپنے خاص نقطہ نظر کی بنیاد پر جس کا ذکر آئندہ آئے گا، بجائے مبسوط الرزق طبقات کے یہ زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ اس آیت کا تعلق قدری رزق پانے والوں کے اس گروہ سے سمجھا جائے، جو رزق کے اس قدری پیمانے کو اپنی اہانت و ذلت کا سبب ٹھہرا لیتے ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر اس کو عام رکھا جائے۔ کیونکہ سرمایہ داروں کا یہ گروہ بھی یقیناً مال سے اسی قسم کا عشق مضطرب پیدا کر لیتا ہے، یعنی ہر چیز سے ٹوٹ کر صرف مال ہی کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے شب و روز وہ "جمع و جمع" ہی کے ادھیڑ بن میں مبتلا رہتا ہے، اپنی ساری عقلی اور ذہنی قوتوں کی جولانیوں کی آماجگاہ "جمع و جمع" کے مقابلہ کے اسی میدان کو قرار دے لیتا ہے، اسی میں رات دن وہ "التکاثر" والے مقابلہ میں مشغول و منہمک رہتا ہے، اور یہی چیز اس میں اس خیال کو پیدا کر دیتی ہے، کہ جو کچھ بھی اس کے پاس جمع ہو گیا ہے یہ اس کی عددی کمیتوں اور معاشی مہارتوں کا نتیجہ ہے، قرآن کے سب سے بڑے تاریخی سرمایہ دار (قارون) کے حوالہ سے یہ فقرہ جو منقول ہے، یعنی وہ کہتا تھا کہ

انما اوتیتہ علی علم عندی اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ مجھے

یہ دولت جو دی گئی ہے، یہ میرے اس علم کا نتیجہ ہے جو میرے پاس ہے۔

وہ اسی خیال کی ترجمانی ہے، جس کا پیدا ہونا اس قسم کے لوگوں میں ان کے اعمال و افعال کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ اسی بنیاد پر ان کی زبانوں پر اس قسم کے فقرے جو جاری ہوتے ہیں

لن تبید هذا ۲ بد ۲ قطعاً اب (میرا قائم کیا ہوا یہ نظام آمدنی)

برباد نہیں ہو سکتا۔

یا اسی کے قریب قریب متعدد مقامات پر قرآن ہی میں ان کی طرف جو الفاظ منسوب کئے گئے ہیں تو وہ اسی زعمِ باطل کا نتیجہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قبضہ اقتدار میں جو کچھ بھی آیا ہے، یہ ان کی حسابی اور عددی چالاکیوں اور فینانشل چابکدستیوں کا ثمرہ ہے۔

اور یہی مقام ہے جس پر پہنچنے والوں کا ہمز و تہز کے ان امراض میں مبتلا ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے

جن کا قرآن کی مذکورہ بالا سورہ ہمزہ میں ذکر کیا گیا ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایسا آدمی جو رزق کی کسبی حالت میں ہو یا قدری میں، دونوں کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ دونوں رزق کے قدرتی پیمانے ہیں، ظاہر ہے کہ کسی حال میں ہو، ایسے آدمی کی نگاہ رزق کے معاملہ میں قدرت اور اس کی مشیت ہی پر جمی رہتی ہے، لیکن جو

۲۰ تیتہ علی علم عندی دیا گیا ہے مجھے میرے اس علم کی بنا پر

جو میرے پاس ہے۔

کے مغالطہ میں الجھ گیا یا الجھا دیا گیا ہو، وہ ان لوگوں کو بھی جو مقابلہ کے میدان میں اس سے پیچھے رہ گئے ہوں اور ان کو بھی جو آگے بڑھ گئے ہوں، دونوں ہی کے دونوں حالتوں کا ذمہ دار خود ان ہی کو قرار دینا اور دے گا کیا معنی تجربہ شاہد ہے کہ قرار دیتا ہے، ایسی صورت میں یہ دیکھا گیا ہے، اور دیکھا جاتا ہے کہ "جمع و عقد" کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانے والوں پر تو وہ حماقت و سفاہت، ناعاقبت اندیشی اور اسی قسم کے بیسیوں عیوب کے ساتھ حملہ کرتا ہے، اور یہ حملہ شدت کی صورت عموماً اس لئے بھی اختیار کرتا ہے کہ "جمع و عقد" کی مہم میں عموماً نا کام زیادہ تر وہی بیچارے رہ جاتے ہیں جو اپنی آمدنی کو زندگی کی سہولتوں اور راحتوں میں خرچ کرتے ہیں، خواہ خود اپنی ذات سے اس کا تعلق ہو یا اپنے بال بچوں اعزہ و اقرباء اور دوسرے مستحقین پر انھوں نے خرچ کیا ہو، اب کھلی ہوئی بات ہے کہ خرچ کرنے والوں کو جو راحت و آرام رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے وغیرہ میں نصیب ہو سکتا ہے یہ بات اس کم نجب کم نصیب کو کیسے میرا سکتی ہے جس نے اپنے ہر پیسے پر پہرا بٹھا دیا ہو اور "جمع و عقد" کی اس مہم میں جو ہر وقت اسی فکر میں غلطاں پیچاں ہو کہ جو آچکا ہے وہ جانے نہ پائے اور جو آ سکتا ہے، اس کے آنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، ظاہر ہے کہ دولت اور سرمایہ میں جو اس سے فروتر ہیں، ان کی رفاہیت، اور خوش باشی کو دیکھ دیکھ کر اگر اس میں رشک و حسد کی آگ جل اٹھے تو تعجب نہ ہونا چاہیے، جس کے پاس سب کچھ ہے وہ تو اگلوں اور جھٹکلوں پر مارا مارا یا جوتیاں ہی چٹخا رہا بازاروں میں گھومتا پھرے، اور جس کے پاس کچھ نہیں ہے وہ موٹروں اور جوڑیوں پر اڑا پھرے۔ اس حال کو دیکھ کر بے چین ہو جانا ایک قدرتی بات ہوتی ہے، اور اسی باطنی سوزش پر پانی ڈالنے کے لئے وہ ان خرچ کرنے والوں پر ہنری کلمات کے ساتھ برسے لگتا ہے، خصوصاً اگر اس خرچ کرنے والے غیر سرمایہ دار انسان کو کسی وقت سرمایہ دار صاحب سے کچھ لینے کی ضرورت پیش آ جائے، خواہ وہ قرض ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو، لیکن مطالبہ کی تکمیل کا معاملہ تو بعد کا ہے، سب سے پہلے اس بیچارہ کو ان شعلوں میں دیر تک جھلسنا پڑتا ہے، جن کی صورت تو بہ ظاہر نصیحت اور خیر خواہی کی ہوتی ہے، لیکن درحقیقت حقیقی محرک اس کی تہ میں وہی آگ ہوتی ہے، جو ان سرمایہ داروں کے دلوں میں چھپی ہوتی ہے۔ چونکہ ان ظالموں کو اس قسم کے بے سرمایہ لوگوں سے خوف بھی نہیں ہوتا، اسی لئے جلی کٹی جو بھی سنائی ہوتی ہے، عموماً ان کے منہ پر سنائی جاتی ہے، قرآن ہی میں ایک جگہ

ان ہی سرمایہ داروں کے متعلق یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں

الذین ینجلون ویامرون الناس
بالبحل ویکتمون ما ۲ تاہم ۲ اللہ
من فضلہ۔
وہی جو بخل اختیار کرتے ہیں، اور حکم دیتے
ہیں لوگوں کو بخل کے اختیار کرنے کا اور
چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اپنے فضل سے

اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا ہے۔

تو ایک پہلو اس کا یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اسی قسم کے مواقع پر پہلے تو خرچ کرنے والوں کو یہ کہنا بیت شعاری عاقبت بینی وغیرہ کے الفاظ میں بخل کی تعلیم دیتے ہیں، اور اسی کے ساتھ جب سب کچھ سنالینے کے بعد مطلب پر آتے ہیں تو بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہ کتمان فضل سے کام لیتے ہیں یعنی کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو خود کچھ نہیں ہے، خیر یہ صورت تو ان کے ساتھ پیش آتی ہے، جو میدان مقابلہ میں پیچھے رہ جاتے ہیں، باقی آگے نکلنے والوں کے منہ پر تو ممکن ہے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑے لیکن پس پشت یہ شکست خوردہ میدان مقابلہ میں ہارنے والا سرمایہ دار ہر گفتنی و ناگفتنی کو اس کی طرف منسوب کرتا ہے، اور ان ہی باتوں کو اس کی کامیابی اور اپنی ناکامی کی وجہ قرار دیتا ہے، اس نے بے ایمانی کی، دھوکہ دیا، فریب سے کام لیا، یہ کیا، وہ کیا، حالانکہ یہ بھی جو کچھ ہوتا ہے، اسی حسد کی آگ کے ظہور کی ایک شکل ہوتی ہے جس میں ”جمع وعد“ کا یہ ماہر سرمایہ دار جلتا بھنتا رہتا ہے۔ بعض علماء نے ہمزہ لمزہ کے ان دو لفظوں کی تفسیر کرتے ہوئے یہ جو لکھا ہے،

الغیب فی الوجه لمن و فی
الغیب هنر و قیل عکس ذلک
و یدخل فیہ ۲ السخریہ
والاستخفاء ۲ والمحا کاۃ۔
سامنے منہ پر کسی کو برا بھلا کہنا یہ تو لڑ
ہے، اور پیچھے پیچھے کہنا ہنر ہے بعض ان
دونوں الفاظ کی تشریح بالعکس اس کے
کرتے ہیں۔ بہر حال مسخر اپن کسی کے ساتھ

کرنا، کسی کا ٹھٹھا اڑانا، کسی کی نقل بنانی ہمزہ لمزہ کے نیچے یہ ساری باتیں داخل ہیں۔

تو اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے میں اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمزہ اور لمزہ کے ان دو قرآنی الفاظ میں سے ایک کا تعلق اگر ان لوگوں سے رکھا جائے جو ”جمع وعد“ کی مہم میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور دوسرے کے متعلق یہ قرار دیا جائے کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اس مہم میں آگے بڑھ جاتے ہیں، تو اس مشہور علمی قاعدے کی بنیاد پر یعنی تجدید سے تاسیس بہتر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دو لفظوں کا ایک ہی مصداق قرار دینا، اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ دو کو دو مختلف معانی پر محمول کیا جائے، اگر ایسا کیا جائے تو یہ زیادہ مناسب ہے۔

اب خیال کیجئے، اس شخص کے نفسی کیفیات، اور باطنی واردات کا جو مال میں خلود بخشی کی کرامتوں کو پوشیدہ قرار دے کر ”جمع وعد“ کے گھن چکر میں مبتلا ہو گیا ہو، اور اسی اندرونی گردش نے بالآخر اس کو ہمزہ لمزہ کے مقام تک پہنچا دیا ہو، وہ ان سے بھی بگڑا ہوا ہے، جو اس سے پیچھے رہ گئے ہیں،

اور ان سے بھی روٹھا ہوا ہے جو آگے نکلے ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ ہر آئے ہوئے پیسے کے متعلق جو طے کئے ہوئے ہو کہ اسے نکلنے نہ دیا جائے گا، اور ہر وہ پیسہ جو ابھی نہیں آیا ہے۔ لیکن اس کے آنے کا کچھ بھی امکان ہے، اس کے متعلق بھی یہ فیصلہ کر چکا ہو کہ بہر حال اس کو آنا ہی چاہیے، خود ہی سوچنا چاہئے کہ باہر سے ایسا آدمی خواہ کچھ ہی نظر آتا ہو، لیکن اندر جھانک کر دیکھئے، بجز آگ ہی آگ کے اس میں اور بھی کچھ ہو سکتا ہے، خصوصاً زندگی کی ناگزیر ضروریات میں آئے ہوئے پیسوں میں سے کچھ پیسوں کا خرچ ہو تا رہنا چونکہ بہر حال یقینی ہے، اسی طرح جن آمدنیوں کے حصول کا امکان پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں ان کا حاصل ہونا کب ضروری ہے۔ پھر کون اندازہ کر سکتا ہے اس چوٹ کا جو نکل نکل کر ہر پیسہ اس کے دل پر لگا تا رہتا ہے، اسی طرح جس کے آنے کا امکان تھا۔ جب اس آمدنی سے اسے محروم ہونا پڑتا ہے، اس کے قلق اور بے چینی کی صحیح روئداد وہی دے سکتا ہے، جس پر گذرتی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایسوں کے لئے خرچ ہونے ہی کی صورت میں نہیں بلکہ خرچ ہو جانے، یا جمع شدہ سرمایہ کے ضائع ہو جانے کے خطرات بھی جن بھیانک صورتوں میں انہیں ڈراتے اور دھمکاتے رہتے ہیں۔ اور مختلف اندیشے اور احتمالات جن جن شکلوں میں انہیں کھپاتے رہتے ہیں، بجائے خود بھیہ ایک مستقل بلائے جان کی صورت میں اس کے اندر تھلک مچاتے رہتے ہیں جس سے نجات کی کوئی صورت اس کے پاس نہیں ہوتی، آخر اس راہ کے بعض تجربہ کاروں سے کتابوں میں اس قسم کے اعترافات جو ملتے ہیں، مثلاً امریکہ کے مشہور کروڑ پتی کاریگی کا یہ زبان زد عام فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا،

لاکھ پتی (ملینیر) کبھی مسکرا نہیں سکتا (منقول از ہلال مصری سنی ۱۹۲۵ء)

یا اسی قارون آباد کے دوسرے شاہ دولت راک فیلر آنجنہانی کے متعلق یہ لطیفہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ کسی مجلس میں گامیابی کے عنوان پر بحث ہو رہی تھی، راک فیلر نے اٹھ کر اس وقت تقویٰ کی۔ گمایا ان کی مراد گامیابی سے مال و دولت کمانا ہے، کیا اسی کا نام گامیابی ہے؟ میں کہتا ہوں، اور مجھے کہنے کا حق ہے کہ سب سے بڑا مغلس وہی ہے جس کے پاس مال کے سوا اور کچھ نہ ہو، میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے ابتدا ہی میں اس کا اختیار دیا جاتا کہ کس قسم کی زندگی چاہتا ہوں، تو میں اپنے لئے یہ اختیار کرتا کہ میرے پاس کچھ نہ ہو، یا ہو تو بہت تھوڑا، بقدر ضرورت ہو، لیکن اسی کے ساتھ مجھے بتا دیا جائے کہ میرے جینے کا مقصد کیا ہے؟ (الہلال مصری جون ۱۹۲۲ء)

ان اعترافات کی تہہ میں بجز ان نفسیاتی کیفیات و حالات کے اور کونسی چیز چھپی ہوئی ہے، اور آپ پڑھیے اس کے بعد سورہ ہمزہ کے ترجمہ کا یہ ٹکڑا۔

وہ جو مال جمع کرتا اور گنتا ہے، اسے خیال کرتا ہے کہ مال اسے غلہ اور زیر پانی عطا کرتا ہے، ہرگز نہیں، قطعاً وہ جھونک دیا جاتا ہے (المطہ یعنی)

چور چور کر دینے والی میں) اور یہ الحکمہ کیا چیز ہے؟ آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی، چڑھ جاتی ہے دلوں پر اور اس آگ (کے پٹ) بند کر دیئے جاتے ہیں (اس پر) جو لمبے لمبے ستونوں پر کھڑی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حقیقی رنگ میں یہ کیفیت تو ان کے سامنے اسی وقت پیش آئے گی، جب ہر حقیقت اپنی اصلی رنگ میں نمایاں ہوگی، لیکن جو کل ہونے والا ہے، دیکھنے والے چاہیں تو آج بھی اس آتشیں مکان کا تماشا کر سکتے ہیں، جس کی دیواریں بھی آگ ہی کی ہیں، اور جس کی چھت بھی آگ ہی کی ہے ایسی چھت جو لمبے لمبے ستونوں پر قائم ہے، اور اسی آتشیں مکان میں اسے جھونک کر پٹ بند کر دیا گیا ہے، نکلنے کی راہیں چاروں طرف سے مسدود ہیں، آخر قرآن ہی میں تو

و ان جہنم لمحیطۃ بالکافرین اور قطعاً جہنم گھرے ہوئے کافروں کو فرمایا گیا ہے، کم از کم

احاطہ سورہ ۲۰ قصہ اس جہنم کے سراپہ دوں نے ان کا احاطہ کر لیا ہے۔

اس کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جو چیز آج اندر ہے، وہی تو کل باہر نکل آئے گی اجساد کا تروح اور ارواح کا تجسّد اور باب حقائق کا مسئلہ ہے، اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ جمع وعد کے مجرموں کے متعلق سورہ ہمزہ کی جس سزا کو صرف ادھار ہی ادھار سمجھا جا رہا ہے، اگر غور کیا جائے تو اسی سورہ کے الفاظ میں نقد کی جھلک بھی ان لوگوں کو نظر آ سکتی ہے جو مال و سرمایہ کے ساتھ انسانی نفسیات کے تعلقات کا مطالعہ ان قرآنی آیات کی روشنی میں کریں گے، یقیناً سوچنے والوں اس آتشیں گرداب کی کچھ موجیں آج بھی محسوس ہو سکتی ہیں جس میں پھنس کر جمع وعد کے ان مجرموں کو ہر حال میں چکراتے ہی رہنا پڑتا ہے، یہی جذبہ قدرت کی سلگائی ہوئی آگ کی شکل اختیار کر کے ان کی چھاتیوں پر چڑھ کر مونگ دلتی رہتی ہے، باہر سے دیکھنے والوں کو یہ بیچارے نظر آتے ہیں کہ ان کے اوپر بھی روپیہ ہے اور نیچے بھی روپیہ ہے، وہ رویوں ہی میں جاگتے اور اسی میں سونے ہیں، لیکن جس کی نظر اندر کا کچھ بھی اندازہ کر سکتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ قرآنی اشارات کی تصدیق میں وہ شک کر سکتا ہے، بلکہ ہمزہ و تکر کے جو شعبے ان کی زبانوں سے نکلتے رہتے ہیں، سچ پوچھئے تو جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے، وہی ان شکلوں میں ان کی زبانوں کی راہ سے باہر نکلتا رہتا ہے۔ گویا باطن کی شہادت ظاہر کی یہ حالت ہوتی ہے۔ بلکہ سورہ ہمزہ کی یہی آیت یعنی

یحسب ان مالہ ۲۰ اخلد ۲۰ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے

دوام بخشتا ہے۔

نے میرے ذہن کو ایک عجیب مسئلہ کی طرف منتقل کر دیا ہے، میں نہیں کہتا کہ قرآنی الفاظ کی یہ تفسیر ہے، بلکہ میرا صرف یہ ایک ذہنی انتقال ہے، غور کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دیتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصبے میں جس "الشجرہ" کا ذکر ہے، اگرچہ کتابوں میں اس کے متعلق بیسیوں اقوال پائے جاتے ہیں، اور ان ہی اقوال میں سے عوام میں ایک قول یعنی یہ بات کہ وہ گیہوں کا درخت تھا، جس کے قریب جانے سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی صحیح روایت سے نہ یہ ثابت ہے اور نہ دوسرے اقوال کی تائید کسی صحیح حدیث سے ہوتی ہے، اسی لئے علامہ شہاب محمود آلوی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھ دیا ہے کہ

الاولی عدم القطع بہا زیادہ بہتر ہے کہ کسی قول کے متعلق

قطعی فیصد نہ کیا جائے۔

اسی لئے میرا عقیدہ بھی اگرچہ یہی ہے کہ جس چیز کو خدا نے مبہم چھوڑ دیا، ہم خواہ مخواہ اس کی تعین میں کیوں سرکھپائیں، خصوصاً جب اس کا کوئی نفع بھی نہ ہو، آخر اگر یہ متعین بھی ہو جائے کہ وہ گیہوں یا انگور، یا عقل یا حیات ہی کا درخت تھا تو اس سے کوئی خاص علمی یا عملی نتیجہ کیا حاصل ہوتا، لیکن اگر حضرت آدم کے اس قصہ کو صرف قصہ کی حیثیت سے نہ پڑھا جائے، بلکہ اولاد آدم کی موجودہ زندگی میں اس قصہ کے اجزاء سے نفع اٹھانے کا ارادہ کیا جائے، تو اس وقت دوسرے اجزاء سے قطع نظر کرتے ہوئے میں "الشجرہ" کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی میں جب یہ موجود ہے کہ بہکاتے ہوئے "الشیطان" نے حضرت آدم کو کہا کہ

ھل ادلک الی شجرة الخلد کیا راہ نمائی کروں تمہاری ہمیشگی کے

درخت کی طرف۔

اور دوسری جگہ اسی کی شرح کرتے ہوئے شیطان ہی کی زبان سے یہ اداکرایا گیا ہے کہ اس نے آدم و حوا کو یہ سمجھایا تھا کہ خدا نے اس "الشجرہ" سے تم دونوں کو اس لئے روکا ہے کہ اس "الشجرہ" کے استعمال کے بعد تم دونوں کو "خلود" حاصل ہو جائے گا، یعنی تلوونا من الخلدین (ہو جاؤ گے تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں میں) کا جو حاصل ہے۔

اب ایک طرف اس مسئلے کو سامنے رکھ لیجئے، اور دوسری طرف سورہ ہمزہ کے اس مضمون پر غور کیجئے کہ آدمی مال اور سرمایہ ہی کے متعلق خیال کرتا ہے کہ اس میں "خلود بخشی" کی کیفیت پائی جاتی ہے، اس کے بعد اگر یہ سمجھا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس عالم میں اس وقت تھے، اس وقت ان کے سامنے خواہ کسی صورت میں وہ چیز پیش ہوئی ہو، لیکن آدم کی اولاد کے سامنے وہی آج مال اور سرمایہ کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ہے، تو جہاں تک قرآن کا اقتضا ہے، یہ خیال چندال بعید نہیں قرار دیا جاسکتا، آخر ان امور پر غور کیجئے۔

(۱) حضرت آدم اور ان کی بیوی حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ
کلا منها سرا عدا حیث شئتما دونوں کھاؤ اس باغ میں جی بھر کر

ولا تقربا ہذا ۲۰ الشجرة
فتكونا من ۲ الظالمين۔

جہاں سے جی چاہے۔ اور نہ قریب بچکنا
اس درخت کے، کیونکہ تب ہو جاؤ گے

تم اپنی حد سے نکلنے والے، یعنی ظالموں میں ہو جاؤ گے۔

آج یہی دیکھا جاتا ہے کہ اولاد آدم کے سوا زندگی کی تمام ضرورتوں کی محتاج ہستیاں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اس طور پر زندگی گزار رہی ہیں کہ صبح سے شام تک خوب کھاتی پیتی چرتی چلتی رہتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی اپنی ضرورتوں کے متعلق خلود اور دیر پائی کی ضمانت میں سرگرداں نہیں ہے۔ ان سب میں صرف ایک آدم زاد ہے جو آج کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد کل کے متعلق ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے۔ عدم اطمینان کی اسی کیفیت کے ازالہ کے لئے وہ اس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کے متعلق خلود بخشی کا خیال اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی مال اور سرمایہ گویا آج جو مل رہا ہے، کل وہی ملتا رہے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ضمانت مال اور سرمایہ ہی میں مستور ہے، جیسا کہ بتفصیل اس پر بحث ہو چکی۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ شجرة الخلد کے چکھنے کے ساتھ ہی ان کے سوا (چھپانے کی چیزیں) کھل گئیں، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے، بلکہ قرآن ہی کے حوالہ سے گزر چکا کہ مال کی محبت میں جب بخل کی راہ آدمی اختیار کرتا ہے تو الحسنى یعنی اچھی باتوں کی تکذیب شروع کر دیتا ہے، گویا یوں مال اور سرمایہ کی محبت اس کے عیوب کو کھول دیتی ہے۔

(۳) اسی الشجرة کے چکھنے کا نتیجہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ان کو ہبوط اور اتر جانے کا حکم دیا گیا۔ حق تعالیٰ کی درگاہ میں قرب کا جو مقام ان کو حاصل تھا اسی سے وہ اتار دیئے گئے، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے سارے احتیاجی تعلقات اسی مال کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ بند اور خدا کے درمیان جو احتیاجی تعلق رہنا چاہیے، وہ تعلق باقی نہیں رہتا۔ قرآن میں بھی جیسا کہ گزر چکا من بخل واستغنى کے الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

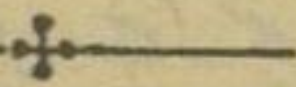
(۴) مال میں جیسے غنا بخشی کی کیفیت بہ ظاہر لوگوں کو محسوس ہوتی ہے، گویا عدم احتیاج کا جو ایک پہلو فرشتوں میں پایا جاتا ہے، اسی ملکوتی پہلو کی تکمیل کی ایک شکل مال میں پائی جاتی ہے۔ حضرت آدم کو بھی شیطان نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ اس الشجرة کے استعمال سے چوں کہ ملک (فرشتہ) بن سکتے ہو، اس لئے خدا نے تم کو اس سے روکا ہے۔

(۵) شیطان نے اس شجرة الخلد کی ایک صفت ملک لایبلی بھی بیان کی تھی، یعنی یہ ایک ایسی چیز ہے جو پرانی اور کہنہ نہیں ہوتی، معاشیات کے ماہرین اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ فرسودگی اور کہنگی دنیا کی دوسری چیزوں پر جلد طاری ہو جاتی ہے، لیکن سونا اور چاندی میں یہ بات نہیں پائی جاتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ ہی ایک ایسی چیز ہے کہ کسی کو قرض میں اگر آج دیا جائے اور سو سال بعد واپس لیا جائے۔ تو نہ دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ سو سال کی اس مدت میں تمہارے روپے پر آنے

اور فرسودہ ہو گئے، اور نہ لینے والا واپس لیتے ہوئے یہ خیال کر سکتا ہے، بلکہ جس تروتازہ حال میں روپیہ دیا جاتا ہے، خواہ کتنی ہی مدت بعد واپس ہو، اسی حال میں واپس بھی لیا جاتا ہے، ایسی مملوکہ شے جو پرانی نہ ہو، میں تو خیال کرتا ہوں کہ دنیا میں روپے کے سوا شاید ہی کوئی دوسری چیز ہو۔

(۶) ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی ”شجرۃ الخلد“ کی سزائیں مہبوط اور نزول کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ ”تمہارے بعض بعض کے دشمن رہیں گے۔“ یعنی بعضکم لبعض عدو۔ آدم کی اولاد میں بھی آج جتنے جھگڑے رگڑے، جنگ و جدال چھوٹے پیمانوں پر ہوں یا بڑے پیمانوں پر، آخری چیز ان تمام لڑائیوں اور جھگڑوں کی تہ میں عموماً یہی مال و دولت ہی ہوتی ہے۔

میرے ذہنی انتقال کے اسباب یہی تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک صحیح ہے، صرف دماغ میں ایک بات آئی تھی، مدتوں سے کھٹک رہی تھی، اس کا اظہار کر دیا گیا۔ والعلم عند اللہ تعالیٰ وهو اعلم بمرادہ۔



بہر حال ان قرآنی بیانات کا تعلق تو ان سے تھا، جو مال کے ساتھ بخل اور جمع و عقد تعلق رکھتے ہیں، باقی ان ہی سرمایہ داروں میں بعضوں کو جو دیکھا جاتا ہے کہ ”العصری“ کی زندگی بسر کرتے کرتے اچانک کبھی کبھی کچھ دن کے لئے ایک ہی دن دو دن کے لئے سہی کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ بہ ظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اب ان پر گویا ”العصری“ کی زندگی آسان کی گئی ہے، مثلاً کسی تقریب کے موقع پر وہی شخص جس نے ساری عمر ایسی گزاری جس کا گذارنا شاید کسی ادنیٰ درجہ کے غریب قدری معیشت رکھنے والے کے لئے بھی دشوار ہو، لیکن یہی غریبوں سے بھی غریب تر زندگی رکھنے والا چند دنوں کے لئے امیر بننے کا مظاہرہ کرتا ہے، یا وہی جو جمع و عقد کے جالوں اور چالوں سے کام لے لے کر تمام عمر غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنے کا ذریعہ اپنے سرمائے کو بنائے رکھتا ہے۔ ایک ایک روپے کو غریبوں کی جیبوں میں پہنچا کر میسرڈوں اور ہزاروں روپے وصول کرتا رہتا ہے، اس طور پر وصول کرتا رہتا ہے کہ وصولی کی اس مہم میں کسی غریب کی غربت کسی لاچار کی لاچاری پر لمحہ بھر کے لئے بھی اس کا دل ترس نہیں کھاتا، لیکن ناگاہ دیکھا جاتا ہے کہ شہر کے کسی موٹر اور چوراسے پر یا کسی پٹر اوپاسٹیشن کے سامنے ”ڈھرم“ کے نام سے کسی بلند و بالا اونچی عمارت کی تعمیر میں وہی اس لئے مصروف ہے کہ تھکے ماندوں کو آرام ملے گا، مسافر اس میں بیٹھائے جائیں گے، یا ازیں قبیل چیرٹی CHARITY اور خیرات خانے کے نام سے کسی بڑی رقم کا اعلان اس احساس کے ادعا کے ساتھ کرتا ہے کہ اس کا دل آدم کی بے سرمایہ اولاد کے لئے روتا رہتا ہے۔ مفلوک الحالوں کے لئے اس کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے، انسانی ہمدردی کے ان ہی خریفانہ جذبات سے بے کل ہو کر کبھی ہسپتال کھولتا ہے، کبھی محتاجوں کے لئے مشہور کرتا ہے کہ اس نے سدا برت جاری کیا ہے، غریبوں میں خلد تقسیم کرتا ہے، حالاں کہ یہ واقعات لے دن دنیا میں پیش آتے ہیں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ دنوں میں یہ سوال کیوں پیدا نہیں ہوتا کہ

نظریہ ابتلائیّت کے انکار کے بعد کرنے والے یہ سب کچھ جو کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں، خدا اور خدا کی ذمہ داریاں ہی اگر انھیں یاد رہیں تو سرمایہ کے جمع کرنے میں وہ خدا کی مرضیات سے بے پروائی ہی کیوں برتتے، یہ نہیں تو کیا واقعہ غریبوں کی غربت پر واقعی کیا ان کا دل دکھا ہے؟ انسانی برادری کے متعلق ان کے دل میں کیا رحم کا کوئی جذبہ حقیقتہً متلاطم ہوا ہے؟ جن کی مالی فراہمی سراسر غریبوں کے خون ہی کے چوسنے سے پیدا ہوئی ہے، کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ ان کا دل غریبوں کی غربت پر ٹڑپ سکتا ہے، افلاس پھیلا پھیلا کر ملک کے عام باشندوں سے امراض کے مقابلہ و مقاومت کی قوت جن کے کرتوتوں کی بدولت سلب ہوئی ہو، کیا ان ہی بے زردوں کو ان بیماریوں کی بیماریوں سے بھی کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے؟ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے جب وہ خرچ کرتے ہیں، تو یقیناً سوال ہوتا ہے کہ کیوں کرتے ہیں؟ آئیے سنئے، قرآن کی آیتیں سنئے، آپ خود نہیں سوچتے تو قرآن جو کچھ کہتا ہے خدا را اسے تو سوچا کیجئے، ارشاد ہے،

كَالَّذِي يَنْفِقُ مَالَهُ سِرًّا
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ -

(احسان کرنے کے بعد احسان جتلائیوالوں
کی مثال) اس شخص کے جیسی ہے جو خرچ
کرتا ہے اپنے مال کو لوگوں کو دکھانے کے

لئے، اور نہ مانتا ہے وہ اللہ کو اور نہ پچھلے دن کو (یعنی قیامت کے دن جو بدلہ کا دن ہے
اس کے یقین سے بھی وہ محروم ہوتا ہے)

جس سے معلوم ہوا کہ خرچ کرنے والے صرف اسی لئے خرچ نہیں کرتے کہ خدا ان کے اس خرچ سے خوش ہوگا یا خدا کی مخلوق کو اس سے فائدہ پہنچے گا، بلکہ خرچ کی ایک صورت وہ بھی ہوتی ہے، جس میں نہ مقصود ہوتا ہے نہ وہ بلکہ سیر یا ع الناس (لوگوں کو دکھانا) یہی ان کے مصارف کا نصب العین ہوتا ہے اور یہ بھی یہی بات کہ دیکھنے اور دکھانے کا تعلق خدا سے جو توڑ چکا ہے اب وہ دکھائے بھی تو آخر کسے دکھائے، جن کو غریب بنا کر وہ اپنی امیری پیدا کرتا ہے، ان ہی غریبوں کی آنکھ میں اپنے دھرم سالوں اپنے ہسپتالوں سے، سچ پوچھیے تو سرمایہ داروں کا یہ طبقہ خاک جھونکنا چاہتا ہے۔ "تکذیب بالحق" سے پیدا ہونے والی لغتوں کو اس تدبیر سے چاہتا ہے کہ لوگوں کی ستائشوں اور مدح سرائیوں سے بدلہ دے اور اسی لئے سیکڑوں چوہوں کی نگلنے والی یہ تلی دراصل "ج" کے لئے کمر کستی ہے، بلکہ سب نہیں تو ایک بڑا اگر وہ ان میں ایسے بد باطنوں، سیاہ سینوں کا بھی ہوتا ہے جو "یا اے الناس" کی اس کمان سے بھی غریبوں کے قلوب کو ہمز و ملز کے تیروں اور برچھیوں سے گھائل کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ دوسروں کی تسلی ہو، جیسے اس خیال سے باوجود قدرت و اختیار کے اللہ کے خاص بندے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں غربت کی زندگی گزارتے ہیں، ٹھیک اسی کے مقابلہ میں دوسروں کو تمللانے اور جلانے کے لئے اپنے مالی زور اور سرمایہ کی قوت کا یہ مظاہرہ کرتے ہیں اور جن کی نیت یہ نہ بھی ہوتی ہو، لیکن "نظریہ ابتلائیّت" سے ہٹ کر خرچ کرنے والوں کے سامنے یہ بات تو ضرور ہوتی ہے کہ دوسروں پر ان کی دولت مندی کا

رعب قائم ہو، ان کی بڑائیوں کا دنیا میں چرچا ہو، وہ کتنا بڑا آدمی ہے، محفلوں اور مجلسوں میں اس کا تذکرہ کیا جائے۔

بہر حال اب یہ ہو، یا وہ ہو، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عمر بھر کی عزت کی زندگی کے بعد چند دنوں کی امیری کے اس مظاہرے سے جو اغراض ان کے پیش نظر ہوتے ہیں، ان میں کہاں تک کامیاب ہونے کا موقعہ ان کو دیا جاتا ہے، قرآن نے ایک مثالی بیان سے بایں الفاظ اس کو واضح کیا ہے

فمثلہ کمثل صفوان علیہ تراب
فما صابہ وابل فترکہ صلدًا
لا یقدر ورن علی شئ مما کسبوا
واللہ لایہدی القوم الکافرین
تو اس کی (یعنی ریاکارانہ) کے لئے خرچ
کرنے والوں کی) مثال ایسی ہے جیسے کوئی
چٹان ہو، اس پر گر دجی ہے، تو برسی اس پر
بارش، بس چھوڑ دیا اس کو (یعنی گرد
بھی ہوئی چٹان) کو سپاٹ، نہیں ہاتھ لگتی ان کو اپنی کمائی، اور اللہ نہیں راہ نمائی
فرماتا ہے ناشکروں کی۔

ایک مطلب تو اس کا وہی ہو سکتا ہے، جس کا ذکر قرآن ہی کی دوسری آیتوں میں آیا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی ان کا سارا کیا کر یا برباد ہو جاتا ہے، اس طور پر برباد ہو جاتا ہے کہ ان مصارف کا کوئی ثمرہ ان کے ساتھ نہیں جاتا، آخر خدا کو دکھانے کے لئے جو خرچ نہیں کرتا، تو اس وقت جب خدا ہی سے بدلہ پانے کی گھڑی سامنے آئے گی، اسے کیا مل سکتا ہے، جن لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے، ظاہر ہے کہ قیامت کے دن وہ تو بدلہ دے نہیں سکتے، اور جو بدلہ اس وقت تقسیم کرے گا اسے دکھایا نہیں گیا تھا، قرآن کی اس قسم کی آیتیں مثلاً

مثل ما ینفقون فی ہذہ
الحیوۃ الدنیا کمثل سراج فیہا
صرا صابت حرث قوم ظلموا
انفسہم فاہلکتہ وصا
ظلمہم اللہ ولکن کانوا
انفسہم یظلمون۔

مثال اس کی جو خرچ کرتے ہیں اس بہت
زندگی میں اس ہوا کے مانند ہے جس میں
پالا (مارنے والی ٹھنڈک تھی) پہنچی یہی
پالا مارنے والی ہوا ان لوگوں کی کھیتی پر
جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔ پس
برباد کر دیا اسی ہوا نے اس کھیتی کو،

اور نہ ظلم کیا خدا نے ان پر، لیکن اپنے آپ پر وہ خود ظلم کرتے رہتے ہیں۔

یا

فسینفقونہا ثم تکون علیہم
حسرة۔

پس وہ خرچ کرتے ہیں، پھر بن جاتا ہے یہی
خرچ ان کے قلوب کی حسرت۔

ظاہر ہے کہ غیر ابتلائی انفاق کے یہ وہ نتائج ہیں جو مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ان کے سامنے پیش آئیں گے۔

لیکن صفوان یعنی چٹان والی مثال جو دی گئی ہے، جس پر گرد جی ہوئی ہو، پانی کی ایک بوچھاڑ آتی ہے اور دھو دھا کر پھر اسے صاف ستھرا سپاٹ بنا دیتی ہے، اس مثال پر اگر غور کیا جائے تو ریا والوں والے مصارف یعنی بجائے خدا کے لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرنے والے جو خرچ کرتے ہیں، اور جس جس قسم کے اغراض شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ ان سارے اغراض پر موجودہ زندگی ہی کے حساب سے یہ مثال صادق آتی ہے، آخر میں پوچھتا ہوں کہ پبلک کی آنکھوں میں دھرم سالوں اور ہسپتالوں کی خاک جھرتکئے والے سود خواروں کو یا وجود یہ سب کچھ کرنے کے و نیانے کیا کبھی اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے؟ ممکن ہے کہ وقتی طور پر سپاس اور شکر کے الفاظ پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہو جاتے ہوں، لیکن تشکر و امتنان کی یہ گرد لوگوں کے قلوب پر کتنی دیر تک جمی رہتی ہے، جوں ہی کہ ان دھرم سالے بنائے والوں ہسپتال کھولنے والوں کے متعلق یہ خبر شہر میں پھیلتی ہے کہ ہزار روپے دیکر آج فلاں بیچارے کی لاکھ روپے کی کوٹھی نیلام کر دی گئی، اس کا یہ سارا کیا کرایا کیا دھل کر نہیں رہ جاتا؟ میں پوچھتا ہوں کہ وہ حکومتیں بھی تو جگہ جگہ ہسپتال قائم کرتی پھرتی ہیں، سڑکیں بناتی ہیں، پل بھی تعمیر کرتی ہیں، جن کے ظالمانہ مطالبوں، بھاری بھاری محصولوں کے ذکر سے دنیا چیخ اٹھی ہے، عدالت انصاف تعلیم اور ذرائع تعلیم کے ان سوداگروں کے متعلق آخر دلوں میں کیوں رواداری نہیں پیدا ہوتی؟ جم جم کر آخر وہ گرد کیوں دھل دھل جاتی ہے، جسے بنی آدم کے قلوب پر مختلف ترکیبوں اور تدبیروں سے اس قسم کی چالاک حکومتیں بچھاتی رہتی ہیں، کیا یہ دلیل نہیں ہے اس بات کی کہ ”ریا والوں“ کے مصارف کا اثر قائم بھی ہوتا ہے تو بہت جلد زائل ہو جاتا ہے، دلوں کی گہرائیوں میں جو خیالات ان کے متعلق جاگزیں رہتے ہیں، دب جانے کے بعد وہی ابھر کر ان پر مسلط ہو جاتے ہیں، اسی طرح ریا والوں کے جس خرچ میں آنکھوں کا دکھانا اور دلوں کا دکھانا مقصود ہو، یا دکھانا نہ سہی، اپنے مالی جلال اور سرمایہ کی قوت کا رعب جمانا مقصود ہو، خود ہی خیال کیجئے کہ دکھانے یا جمانے کے ان دونوں عمل کے اثر کی عمر بھی کتنی ہو سکتی ہے، اپنے بچوں کے عقیقوں میں، ختنوں میں، شادیوں میں، محفے ٹولے، بھائی برادری والوں کو دکھانے کے لئے مشرق میں جو مصارف کئے جاتے ہیں، اور غریب مشرق کی آتش بازیوں، پٹاخوں، دھو باجوں، رقص و سرود کی محفلوں پر ہنسنے والے، یورپ و امریکہ کے باشندوں کے متعلق ان ہی ممالک کے اخباروں کی زبانی جو یہ خبریں سنی جاتی ہیں کہ معمولی روزمرہ دوست اجاب کی دعوتوں میں اڑانے والوں نے برازیل اور پیرو سے منگائے ہوئے رنگ رنگ کے پتنگوں کو کھانا کھلانے کے بعد یہ کہتے ہوئے اڑایا کہ صرف اسی دعوت کے لئے ہزار ہا روپے خرچ کر کے یہ پتنگے زندہ حالت میں ان ملکوں سے منگوائے گئے تھے، (دیکھو الہدال مصری مئی ۱۹۲۵ء) یا پھول کے گلدستوں کی جگہ ہر مہمان کے ہاتھ موتیوں سے بھرا ہوا ایک ایک صدف صادق رخصت کے وقت دیا گیا، یا سگریٹ پینے کے لئے مہمانوں کے سامنے جو کاغذ تقسیم کیا گیا، وہ توتو روپیہ نوٹ والا کاغذ تھا۔ یہ اور اسی قسم کے ریا والوں کے آثار و نتائج آپ ہی بتائیے کہ

لیکن ان کے متعلق تو سمجھا جاسکتا تھا کہ عقلی ارتقاء کے میدان میں ان کی دماغی سطح حیوانیت کے قریب تھی، اس لئے اس قسم کی حماقتوں کا ارتکاب کرتے تھے، لیکن ارتقاء کی آخری منزلوں پر براجنے کے مدعی دماغوں کو بھی جب دیکھا جا رہا ہے کہ ٹرک کے ہر موڑ پر اسٹیچو کھڑا کر رہے ہیں، پارکوں اور سبزہ زاروں کے بیچ میں پتھر کی مورتیاں بٹھا رہے ہیں، ان پر بھی اور ان میناروں، ٹاوروں پر بھی جن کے اندر نہ گرمی ہی سے کسی کو پناہ مل سکتی ہے، اور نہ سردی ہی میں وہ کسی کو امن دے سکتے ہیں لاکھوں لاکھ روپے ہر سال خرچ ہو رہے ہیں، ان ہی لوگوں سے چھین چھین کر خرچ ہو رہے ہیں جنہیں سر چھپانے کے لئے گھاس کا چھتر بھی بہ مشکل میسر آتا ہے، فٹ پاتھوں پر بھی لیٹنے کے لئے جن کے پاس بسترے نہیں ہیں، اخباروں کے سوا اوڑھنے کے لئے بھی جو بیچارے اپنے پاس کوئی سامان نہیں رکھتے۔ "انسان" کے دکھانے کے لئے آپ ہر سال غریبوں کی کمائی ہوئی آمدنیوں کو اس طرح جو پھونک رہے ہیں، اپنے روشن دماغ اور ترقی یافتہ عقل سے کبھی آپ نے پوچھا بھی کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے؟ جو مرچکے ہیں کیا پتھروں میں ان کی بنا ہتھوں کے قائم کر دینے سے جو مرچکے ہیں کیا واقعی وہ جی اٹھتے ہیں، چمکا ڈروں کے سوا جن گنبدوں اور میناروں میں اور کوئی بس نہ سکتا ہو، ان کو ڈھاکر ڈھاکر روپوں سے تعمیر ہونے والے میناروں اور گنبدوں میں واقعی یہ خاصیت ہے کہ جو واقعہ گزر چکا ہے، اسے نہ گزرنے دے مرنے والا جو مرچکا ہے اسے نہ مرنے دے؟

واللہ لایہدی القوم الکافرین اور اللہ تعالیٰ راہ نہیں دکھاتا ناشکروں کو۔

کے سوا آپ خوب غور کیجئے، اچھی طرح سوچئے، اس کا کوئی اور جواب آپ کو کسی حیثیت سے کبھی بھی مل سکتا ہے ڈوب مرنے کی بات ہے کہ جیتی جاگتی صورتوں کو تو بھوکوں مارا جائے، اور مردہ تصویروں اسٹیچوں کے متعلق دعویٰ کیا جائے کہ ان سے فنون لطیفہ میں زندگی پیدا ہوتی ہے، آرٹ زندہ ہوتا ہے جن کار کی روح تازہ ہوتی ہے،

افساکم ولما لقبدون نف ہے تم پر اور ان چیزوں پر جنہیں

تم پوجتے ہو،

رہا ان ہی خرچ کرنے والوں میں ایک طبقہ جو ان لوگوں کا ہے جن کے "سرمایہ" میں ابتدائی ذمہ داریوں کے متعلق تو ایک جہ بھی نہیں ہوتا، لیکن خود اسی "سرمایہ" کو ممکنہ خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں، قرآن میں ایک عجیب اشارہ ان لوگوں کے متعلق بھی پایا جاتا ہے، سورۃ البلد میں جن کی طرف اہلک مالاً لبد ۲۔

کھپایا ہے میں نے مال ڈھروں۔

کے دعویٰ کو منسوب کیا گیا ہے، وہیں ایک فقرہ بالکل اسی کے متصل یہ بھی ہے، یعنی

۲ بحسب ان لن یقدر علیہ احد کیا وہ خیال کرتا ہے کہ بس نہ چلے گا اس پر کسی کا۔

دوسروں سے مجھے بحث نہیں، لیکن میرے خیال میں اس آیت کے متعلق جوابات آتی ہے اسے عرض کرتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ مال اور سرمایہ میں خلود بخشی کی قوت پاکر جمع وعدہ کی تدبیروں پر عمل کرنے والوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ صرف یہی نہیں کہ ان کا یہ خیال غلط ہے، بلکہ ننانوے کے اس پھیر میں الجھ جانے والوں کو اسی وقت بھر کس نکال دینے والی ”الحطہ“ اور ایک ایسی نفسیاتی کیفیت میں جھونک دیا جاتا ہے جو اپنی اندرونی لکد کو ب سے اس میں چور چور کرتی رہتی ہے اور وہ بیچارے باطن کے ان ہی آتشیں کیفیات میں الٹے پلٹے رہتے ہیں، اسی طرح خرچ کرنے کے متعلق یہ خیال کہ وہ خطرات سے محفوظ کر کے آدمی کو اطمینان زندگی بسر کرنے کا موقعہ عطا کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا سوال یعنی ”وہ کیا خیال کرتا ہے کہ بس نہ چلے گا اس پر کسی کا“ اس میں بھی گویا چونکا یا گیا ہے کہ خطرات سے محفوظ ہو جانے کے مقصد میں وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام ہوا ہے۔ اس کے پتہ چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سوال کو اپنے دل میں اٹھائے اور سوچے کہ دولت کی خواہ جتنی بڑی سے بڑی مقدار اس مقصد کے لئے خرچ کی جائے، پھر بھی آدمی کیا اپنے آپ کو اور اپنے سرمایہ کو خطرات سے محفوظ پاتا ہے؟ یعنی بس نہ چلے گا اب اس پر کسی کا، اسی سوال کو اٹھا کر دیکھیے اس کے دل کا اس کے دماغ کا احساس کیا ہے؟ بلاشبہ عجب سوال ہے، وہی نہیں جو بیچارے اسناد خطرات کی راہ میں دس بیس ماہوار خرچ کرتے ہیں، بلکہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کروڑ ہا کروڑ حتیٰ کہ آج تو ارب ہا ارب کے خرچ کرنے والوں کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ خرچ کرنے کی حد تک تو وہ خرچ کرتے رہتے ہیں، خوب خرچ کرتے رہتے ہیں، لاکھوں لاکھ تعداد والی فوجیں رکھتے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ ہتھیار اور اسلحہ تیار کرتے ہیں، نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا تقریباً اکثر و بیشتر حصہ اسی راہ میں بہاتے رہتے ہیں، عوام کی ہمدردیوں کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پیٹ کو نہ سہی، پاؤں ہی کو آرام پہنچانے کے لئے ریلیں بناتے ہیں، سڑکیں تعمیر کرتے ہیں عوام کا کام نکلتا ہو یا نہ نکلتا ہو، لیکن کہتے یہی ہیں کہ ان ہی کو روشن دماغ بنانے کے لئے تعلیم گا ہیں کھولتے ہیں، یونیورسٹیاں قائم کرتے ہیں، لیکن باوجود سب کچھ کرنے کے دوسرے ہی نہیں وہ خود بھی جانتے ہیں کہ قرآنی سوال،

۱ بحسب ان لن یقدر علیہ احد ۲ کیا خیال کرتا ہے وہ کہ اب بس نہ چلے گا

اس پر کسی کا۔

کے جواب میں ”نہیں“ کے سوا ان اربوں اور کھربوں کے خرچ کرنے والوں کی طرف سے بھی کم از کم اس وقت تک تو کوئی دوسرا جواب نہیں ملا ہے، ایک خطرہ ملتا ہے، تو دین خطرات دانت نکالے پورپ سے کچھ سے دھن سے اتر سے جھانکنے لگتے ہیں، ہر تھوڑے سے عرصہ کے بعد ”سرمایہ“ کی بڑی سے بڑی مقدار ان ہی نہ نکالنے والے خطرات کی راہوں میں آگ اور دھواں بن بن کر قرآنی آیت

حطوا صنعوا فیہا و باطل ما کانوا یعلون ۳ تہیں نہیں ہو کر رہ گیا جو کچھ کیا دھڑا تھا

انہوں نے اور بے نتیجہ ہو کر رہ گیا جو کچھ وہ کرتے تھے۔

کامتا شاعرت پذیر نگاہوں کے سامنے پیش کرتی رہتی ہے، خرچ کر کے چھوٹے دائروں کے خطرات سے اس قسم کے خرچ کرنے والے پاتے ہیں کہ وہ محفوظ ہو گئے کہ اچانک اس سے بڑے خطرے کو دیکھتے ہیں کہ سر پر کھڑا دھمکا رہا ہے، آدمی کیا کرے کتنا خرچ کرے، تاریخ جن جن خرچ کرنے والوں کے قصے سناتی ہے، سناتی جاتی ہے، بتاتی جاتی ہے کہ خرچ کے ہر پیمانے پر خطروں کا لوگوں کو شکار ہونا پڑا کتنے دن کی بات ہے، ابھی ابھی گزری ہے۔ آدھی دنیا اور اس کی پیداواروں کا شخصی مالک زرا جس کے ذاتی مصارف کی فہرست تیار کرنے والوں نے یہ تیار کی ہے کہ۔

جو ٹوپی پہنتا تھا وہ مسلم ایک جگہ جگہ کر کے والا گویا ایک شعلہ تھا ایک نہیں، دو بڑے بڑے موتیوں کے ہار اس پر لپٹے ہوئے تھے، سامنے سب سے اوپر ایک لعل تھا، جس پر الماس کی ایک صلیب چڑھائی گئی تھی ہاتھ میں ملکہ کھڑا ان کا وہ عصا تھا جو صرف زرخا لصل سے ڈھالا گیا تھا، جس کے اوپر رنگ رنگ کے اموں جو اہر بڑے ہوئے تھے، عصا کے سر پر ایک لٹو تھا الماس کا، اور اس کے سوا بھی وقت فوقتاً استعمال کے لئے اس کے خزانے میں جو جواہرات رہتے تھے، جن میں الماس، زمرد، یا قوت وغیرہ سب ہی طرح کی چیزیں تھیں۔ جن کی مجموعی قیمت کا اندازہ اسٹی ملین پونڈ (ایک ارب بیس کروڑ روپے) سے کی جاتی تھی، اور جن میں بعض جواہر کی تاریخ ہزار ہزار سال سے بھی متجاوز تھی۔ اہلال دسمبر ۱۹۲۲ء۔

لیکن وہ بھی جب واقعہ نے ثابت کر دیا کہ لون یقہ رعلیہ ۲ حد (نہیں قابو چل سکتا ہے کسی کا اس کے مقام تک نہ پہنچ سکا، اور بہ ہزار بے کسی و بے بسی وہ بھی اس کے بچے بھی۔ اس کی محبوبہ بیوی بھی اسی کے سامنے تڑپا تڑپا کر ذبح کئے گئے، تو جن مسکینوں نے خود اپنا اور اپنے عزیزوں، اپنے رشتہ داروں اور دوسرے حق داروں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر ہزار یا لاکھ وغیرہ اعداد کی صورت میں کچھ سرمایہ جمع کر لیا ہے، کس بنیاد پر ان غریبوں سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ ہر ایک کے قابو سے باہر ہو جانے کا دعویٰ کر کے خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر سکیں؟

خلاصہ یہی ہے کہ اپنی بسطی معیشت میں اللہ اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں سے انحراف و اعراض کرنے والوں کو نہ تو سرمایہ کے جمع ہی کرنے میں چین کی صورت میسر آتی ہے اور نہ خرچ ہی کرنے میں سکون کا کوئی حصہ انھیں نصیب ہوتا ہے، دیکھا ہی جا رہا ہے، اور قرآن میں جو کچھ سنا گیا ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اضطراب اور بے چینی، تڑپ اور قلق، خلش اور تپش، سوز اور جلن، درد اور کرب گھٹن اور کڑھن کی سانس ان کے اندر بھی جاتی ہے اور وہی باہر بھی آتی ہے، ان ہی بدبو آئین گرم گرم سانسوں کے ساتھ یہ جیتے بھی ہیں، اور جس دن مرتے ہیں تو آخری سانس بھی ان کی باطن کی ان ہی متعفن گندری کیفیتوں میں ٹوٹتی ہے، مرنے سے پہلے ہی قدرت کا انتقام ان کے معاشی جرائم کی

سزا ان دردناک خمیازوں کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اور اب میں تلاوت کرنا چاہتا ہوں قرآن کی اس عجیب و غریب آیت کو جس میں عالم کے ایک مشہور تاریخی سرمایہ دار کو خطاب کر کے کہنے والے یہ عجیب بات

ولا تفسد نصیبک من الدنیا اور نہ بھول تیرا حصہ جو دنیا میں ہے، کہتے تھے، قارون جس کے خزانے تھیں، بلکہ قرآن ہی میں ہے کہ اس کے خزانے کی کنجیاں قوت اور زور والوں کا جتنا بے مشقت لاد کر لے چلتا تھا، اسی قارون کو یہ مشورہ دیا جاتا تھا، جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین تو خیر دین ہی ہے، دنیا میں جو تیرا نصیب اور حصہ ہے، اسے تو نہ بھول، اس سے تو لاپرواہی نہ برت، جواز سرتاپا روپیہ ہی روپیہ تھا، روپیہ ہی میں ڈوبا ہوا تھا۔ روپیہ ہی میں سوتا اور اسی میں جاگتا تھا، دین میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی اس کا جو حصہ تھا، اسے بھول گیا تھا۔ کم از کم اس آیت پر جب کبھی میرا گزر ہوا، حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ کیا ہے؟ جس کے اندر دنیا اور دنیا کی دولت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسی کے متعلق یہ کیسے باور کیا جائے کہ اسی کے حافظہ سے دنیا اور دنیا میں اس کا جو حصہ تھا وہی چسپل کر باہر نکل پڑا تھا، لیکن قرآن ہی کی روشنی میں جو کچھ اس سلسلہ میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے کیا اس کو پڑھنے کے بعد بھی اب کسی کو اس حقیقت کے متعلق خواہ وہ جتنی بھی حیرتوں اور انجوبوں سے بھری حقیقت ہو اس کی واقعیت میں شک کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے، جس کے پاس سب کچھ ہے، اسی کے پاس کچھ نہیں ہے، سب کچھ دے دیا گیا اور کچھ نہیں دیا گیا، یہی تو قدرت کا مخفی داؤ اور مکر اللہ کے طلسمی مظاہر ہیں کہ ہوتا کچھ ہے اور سمجھا جاتا کچھ ہے، دراصل اس ساری طول و طویل بحث کا مقصد سچ پوچھیے تو اسی قارون کی تماشے کی نمائش تھی،

وفی ذلک ذکری لمن کان له

قلب او لقی لسمع وهو

اپنی شنوائی، اس حال میں کہ وہ حاضر ہے،

شہید۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں جس جرم کی پکڑ اتنی سخت ہو، اگر آخرت میں قدرت کی یہی مخفی گرفت مجرموں کے سر پر اتر دہوں اور سانپوں کی شکل میں آئے، اپنے مال ہی کی مختلف بھیسوں سے اسے کچلا جائے اور روندنا جائے، جیسا کہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے، تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے، بلکہ حدیثوں میں جو کچھ آیا ہے۔ میرے نزدیک تو وہ بھی قرآنی آیت

ولا یحسبن الذین

یغفلون بما اتاہم

اللہ من فضله هو

خیر لهم بل هو شر

لهم سیطون

اور ہرگز ہرگز نہ خیال کریں وہ لوگ جو

بخالت کرتے ہیں ان چیزوں میں جو

دے رکھی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے

فضل سے کہ یہ بات (یعنی بخالت) بہتر ہے

ان کے لئے بلکہ برتر ہے یہ ان کے لئے

بما بخلوا به يوم القيمة

قریب ہے طوق ڈالا جائے ان کو ان

چیزوں کا جس کے ساتھ وہ بنی لت

(آل عمران)

کرتے تھے قیامت کے دن۔

کے آخری جز "سیطوقون" یا بخلوا به يوم القيمة (یعنی جس چیز کے ساتھ انہوں نے بخل کیا تھا، اسی کا طوق ان کے گلوں میں ڈالا جائے) کے تفصیلات اور اخروی تشکلات ہیں۔ میرے سامنے چوں کہ اس وقت اخروی انتقام اور ان کی تفصیلات نہیں ہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ ان حدیثوں کا مطالعہ کتابوں میں کر لیا جائے۔ جن کے ترجمے بھی اردو زبان میں ہو چکے ہیں۔ اس وقت تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ دنیا ہی میں جس جرم کے نتائج ان بھیانک شکلوں میں سامنے آتے ہوں، اندازہ کرنے والوں کو اندازہ کرنا چاہیے کہ آخرت میں ان کا حال کیا ہوگا، اللہ کے پیغمبروں، بنی آدم کے خیر خواہوں، بلکہ درحقیقت خود ارحم الراحمین نے کتنا بڑا کرم اور احسان کیا ہے کہ واقع ہونے سے پہلے لوگوں کو نتائج و عواقب سے آگاہ کر دیا گیا ہے تاکہ چونکے والے چونک جائیں، ایسا نہ ہو کہ ان کو بھی وہی کہنا پڑے جو بالآخر کہنے والوں کو بہر حال وہی کہنا پڑتا ہے، جیسا کہ قرآن ہی میں ہے،

تا آں کہ جب آگئی ان پر موت تو

کہا کہ میرے پروردگار! کیوں نہ مہلت

دی آپ نے کسی قریب زمانے تک

تو پھر میں صدقہ کرتا اور ہو جاتا میں

حتى اذا جاء احدهم الموت

قال رب لولا اخرجتني الى اجل

قریب فاصدق و اكن

من الصالحين۔

سلیجئے والوں میں۔

مدت ہوئی اجبار سچ میں چھپا تھا۔ اٹالیہ کے مشہور کر وڑپتی گوٹسپ لوگیا نی کے متعلق کہ دولت کے متعلق جمع و کی تدبیروں پر عمل کرنے کے بعد کر وڑوں روپے کا جب وہ مالک ہو گیا، اور کو موٹا می جھیل کے کنارے ایک رشک ارم کوٹھی بنا کر چاہا تھا کہ اب اطمینان کی سانس اپنی اس فردوسی کوٹھی میں لے۔ لیکن اچانک

۱۵ صحیح بخاری و مسلم نیز صحاح ستہ کی صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ جنت و دوزخ میں جانے سے پہلے میدانِ حشر کے اس اجتماعِ عظیم میں اپنے سرمایہ کے متعلق ابتدائی ذمہ داریوں کے ادا کرنے سے گریز کرنے والے اپنے آپ کو پائیں گے کہ "مالہ شجاع اقرع لہ زیتان یطوقہ يوم القيمة یاخذ بہنقیہ یعنی شقیہ ثم یقول انا مالک لانا کنزک" (ان کا مال ایک ایسے سانپ کی شکل میں ہوگا جس کا سر بالکل چکنا ہوگا اور جس کے چہرہ پر دو سیاہ سیاہ نشان ہونگے۔ پیٹ پڑیگا ان ہی بخیلوں کی گردنوں سے اور ان کے دونوں جڑوں کو پکڑے گا کہے گا میں ہوں تیرا مال میں ہوں تیرا دوزخ خانا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما کر اس آیت کو تلاوت فرماتے جس کا میں نے ذکر کیا۔ انھی حدیثوں میں ہر کہ اونٹوں اور دوسرے مویشیوں کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں پر قیامت کے دن ان ہی جانوروں سے انھیں رونداجاؤں گا۔ یہ بھی ہے کہ سونے اور چاندی کی تختیاں آگ میں تپائی جائیں گی اور ان ہی لوگوں کے پہلو اور پیشانیوں، ان کی میٹھیں ان ہی تپائی ہوئی تختیوں سے داغی جائیں گی۔ یہ مدت ان لوگوں کو اتنی دراز محسوس ہوگی کہ موجودہ دنیا کے وقت کا جو بیمانہ ہے اس کے حساب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس ہزار سال اس کی تدبیر بیان کی ہے۔ اعاذنا اللہ و المسلمین منہ ۱۲

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اسی کوٹھی کی ایک چھت میں پھانسی پڑی ہوئی، اس کی لاش لٹکی ہوئی ہے! اور لاش کے نیچے اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ رقعہ پڑا ہوا ہے، جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

مجھے اپنی طویل زندگی میں تجربہ ہو گیا کہ راحت کی تلاش اگر ہے تو روپے کے ڈھیروں میں وہ نہیں ملتی، میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں، اس لئے کہ تنہائی اور افسردگی سے میں عاجز آ گیا ہوں۔ جس وقت نیویارک میں میں معمولی مزدور تھا۔ اس وقت مجھے مسرت حاصل تھی۔ لیکن آج کروڑوں کا مالک ہوں، مگر میری افسردگی کی انتہا نہیں، اور ایسی زندگی پر میں موت کو ترجیح دیتا ہوں۔“

اور یہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے ”کارینگی“ امریکہ کے ارب پتی کا یہ قول گزر چکا کہ لاکھ پتی آدمی مسکرا نہیں سکتا“

راک فیلر کے بیان کا بھی کہیں ذکر آیا تھا کہ ”سب سے بڑا مفلس وہی ہے جسے روپے کے سوا اور کچھ نہ دیا جائے۔“ اسی اخبار سچ ہی میں یہ خبر بھی شائع ہوئی تھی، جیمس وہارٹ نامی انگلستان کے نامور رئیس تھے، مولینا عبد الماجد صاحب دریا آبادی (مدیر سچ) نے ان کا تعارف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ملک (انگلستان) کے نامور امراء میں ان کا شمار تھا، بڑے ذہین اور طبائع مشہور تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ کا لوگ لوہا مانتے تھے، حالت یہ تھی کہ آج ایک تھیٹر کھول کر لاکھوں لاکھ کا ڈھیر لگا دیا۔ کل روٹی کے کارخانے جاری کر کے روپے کا انبار لگا دیا، پیرسوں گھوڑ دوڑ کی بازیوں میں بازی لگا کر لاکھوں لاکھ جیت لیا۔ ایک روز ربر کے ٹائمر کی فیکٹری کے مالک ہو گئے، دولت و ثروت فہم و فراست کے ساتھ سوسائٹی میں گھلنے ملنے کا بھی بڑا شوق رکھتے تھے، شاہی خالوادے تک رسائی تھی۔ الغرض جمع ہی نہیں بلکہ عدا و ملاک یعنی اس راہ کے ہر سلسلے کے ماہر و شاطر تھے، لیکن ہوا کیا؟ مولینا ہی ارقام فرماتے ہیں، ایک دن جب انگلستان میں ٹھیک سورج گرہن کا میلہ لوگ منا رہے تھے۔ دیکھا گیا کہ بند کمرے میں سائنس سے خالی ان کی لاش پڑی ہوئی ہے، ہر خانے ایک تحریر بھی تھی جس میں لکھا تھا۔

(ترجمہ یہ ہے)

”موت کے دروازے پر قدم رکھتے وقت اپنے آخری مضمون میں اس شخص کے نقطہ نظر سے موجودہ تمدنی زندگی پر تبصرہ کروں گا جو سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہے، میں نے بادشاہوں تک کی میزبانی کی ہے۔ بڑے بڑے امراء اور وائیان ریاست سے میری بے تکلفی کا یا رانہ رہا ہے، سیاسیات کے حلقے میں بھی رہا ہوں، ایک تھیٹر کا مالک بھی رہا ہوں، ایک ایک دن میں ساڑھے سات سات لاکھ پونڈ (گویا ایک کروڑ بیس لاکھ) کی

دولت کمائی ہے، اخبارات کا حصہ دار رہا ہوں، گھوڑ دوڑ کی بازی میں ایک ایک لاکھ پونڈ جیتتا رہا ہوں، مانچسٹر تک اپنی اسپیشل ٹرین پر گیا ہوں، اس لئے موجودہ تمدنی زندگی پر رائے دینے کا حق رکھتا ہوں۔

آج میں اپنی زندگی کے آخری دن جب کہ ماضی کے سارے نقشے جلدی جلدی میرے پیش نظر ہو رہے ہیں، مجھے نظر آ رہا ہے:

موجودہ تمدن بجز حرص و خواہش نفسانی حبت جاہ کے اکھاڑے کے اور کچھ نہیں ہے، جذباتِ عالیہ اور قناعت اب خواب و خیال میں ہیں، اور ان کی بجائے ایک نفرت انگیز مہنگامہ برپا ہے، ایک طرف شہوتِ جاہ، شہوتِ زر، شہوتِ زن کا زور ہے، دوسری طرف بولشویک دنیا تخلیقِ جدید کے جنط میں مبتلا ہے، ہر شخص پر دھن سوار ہے کہ محنت کم کرے اور روپیہ زیادہ ملے اور گلچھرے خوب اڑانے کو ملیں، زر پرستی کی اس شدت کو دیکھ کر روح لرز اٹھتی ہے دل دھڑک رہا ہے، میں خدا کے آگے جھکتا ہوں، میں اسی سے لو لگاتا ہوں، میں قمار بازی کی معصیت میں مبتلا رہا ہوں۔ اس کی سزا مجھے ملنی چاہیے۔ (سچ ۳۔ جولائی ۱۹۲۷ء بحوالہ سنڈے اکسپرس)

میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ کے سامنے اب تک پیش کیا جا چکا ہے یہ آیتِ قرآنی ومن اعرض عن ذکری فان له اور جو کترایا میری یاد سے تو اس کے لئے معیشتہ ضنکا۔ ضیق اور تنگی سے بھری ہوئی معیشت

کی مشاہداتی اور تجربی تفسیر کے لئے کافی ہے، سچ تو یہ ہے کہ ذکرِ اللہ سے انحرافی زندگی جس نقد انتقام کے تجربات کو آئے دن پیش کرتی رہتی ہے، جس پر گزرتی ہے وہی نہیں، بلکہ دوسروں کو بھی اندرونی کش مکش کے ان نتائج و آثار کے مشاہدہ کرنے کا بسا اوقات موقع ملتا رہتا ہے جن میں بظاہر سکھ اور درحقیقت سراسر دکھ بھری زندگی رکھنے والے لوگ مبتلا رہتے ہیں، وہی جنہیں اونچے اونچے بنگلوں، طرح طرح کے گملوں، پر شوکت سوار یوں کے درمیان خدم و حشم کے جھڑپوں میں بھی زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

یا

غضب کی الجھنیں ہیں زندگی بس بس میں باز آیا باطنیان دم لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی اور اسی قسم کے اشعار پر سرد دھنٹے پایا گیا ہے، جن کی نگاہوں میں غالب شاعروں میں صرف اس لئے بڑا شاعر ہے کہ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یاہ

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر موئے تک
جیسے اشعار میں وہی بات کہہ دی ہے جو ان کے دل میں تھی، اگر مرحوم کے ایسے اشعار مثلاً
غریب اگر کے گرد کیوں ہیں، جناب واعظ سے کوئی کہہ
اسے ڈراتے ہو موت سے کیا، وہ زندگی ہی سے ڈر چکا ہے

یاہ

اپنی مرضی کے مطابق دہر کو کیونکر کروں مجھ کو بے حد غصہ آتا ہے مگر کس پر کروں
سن کر ہمیشہ ٹپتے اور پھڑکتے ہی دیکھا گیا ہے، جس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے
کہ جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے۔ اسی کی غمازی یہ اشعار کر رہے ہیں۔ آج بھی کسی کو شوق ہو
نظریۂ ابتلائیّت سے لاپرواہ ہو کر بسطی معیشت رکھنے والوں کا تجربہ ان اشعار کو سنا کر وہ کر سکتا ہے
کسی مجلس میں جہاں اس طبقہ کے لوگ جمع ہوں، آپ مذکورہ بالا اشعار یا اسی مفہوم کو دوسرے
شاعروں نے بکثرت اپنے شعروں میں ادا کیا ہے۔ انہیں سنائیے اور پھر دیکھیے تماشا۔ دیکھیے کہ
اپنے دل کے حالات کا آئینہ ان حرکات و سکنات کو کس طرح بنا رہے ہیں جو ان اشعار کے
سننے کے بعد ان پر طاری ہوتے ہیں۔

البتہ یہاں ایک سوال ہوتا ہے اور بجا سوال ہے کہ قدرت کے ان نقد خیا زوں کو
بھگتنے اور بھگتتے رہنے کے باوجود پھر یہ کیا ہے کہ ان میں کوئی بھی بسطی معیشت سے بھی دستبردار
ہونے کو تیار نہیں ہے، اور نہ اخرا فی طریقہ عمل کو ترک کر کے بازگشت پر کوئی آمادہ نظر آتا ہے
اگر واقعی ان ہی کلفتوں اور سوزشوں میں ان کی زندگیاں جلتی اور مہنتی رہتی ہیں۔ تو ایسی کونسی
چیز ہے جو انہیں اندر ہی اندر پکڑے رہتی ہے، سب کچھ کہتے ہیں، سب کچھ سنتے ہیں، عقل رکھتے ہیں، ہوش
رکھتے ہیں، حواس رکھتے ہیں، جب چاہیں پلٹ سکتے ہیں، پھر سکتے ہیں، پھر وہ کیوں نہیں
پلٹتے، کیوں نہیں پھرتے؟

اب میں اس کا جواب کیا دوں، حالانکہ پڑھا جاتا تو قرآن ہی میں اس کا جواب
بھی مل سکتا تھا، لیکن مصیبت یہ ہے خصوصاً اس زمانے کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ
جن ان دیکھے اسباب و علل کو بتانے کے لئے پیغمبر آئے تھے، ان ہی ان دیکھی باتوں کو دلیل
بنا کر پیغمبروں کی پیغمبری اور انبیاء کی نبوتوں میں شک اندازی کی جا رہی ہے، طبیب کے پاس مریض
اسی لئے تو جاتا ہے کہ مرض کے جن اسباب کا پتہ اسے نہیں چل رہا ہے، طبیب سے ان کا علم
حاصل کرے اور اسی کے مطابق طریقہ علاج اختیار کرے۔ لیکن مرض کے جن مخفی اسباب کی طبیب
نشان دہی کر رہا ہو، مریض اگر ان ہی مخفی اسباب کو دلیل بنا کر طبیب کی طبابت ہی کا انکار کرنے لگے
کہنے لگے کہ اپنے مرض کے جن اسباب کو میں جانتا ہوں چوں کہ ان اسباب کی تم نشان دہی نہیں

کر رہے ہو، یعنی جو کچھ میں جانتا ہوں وہی چونکہ تم نہیں بتا رہے ہو، اسی لئے تمہارے طبیب ہی مرنے پر مجھے بھروسہ نہیں، بتائیے کہ اس قسم کے مالی خولیا رکھنے والے مریضوں کا علاج دنیا کا کوئی طبیب کر سکتا ہے؟

حواس اور عقل کی راہوں سے جن چیزوں تک آدمی کی رسائی ممکن نہ تھی، ان ہی چیزوں کے بتانے اور ان ہی کا علم دینے کے لئے تو خدا نے نبوت اور وحی کی نئی راہ کھولی تھی، لیکن کہنے والوں اگر اس پر اصرار ہو کہ ہم وہی اور صرف وہی مانیں گے جسے ہم پہلے سے جانتے ہیں، تو آپ ہی بتائیے کہ ایسے ذہنی انحطاط کے مریضوں کے لئے پیغمبروں کی پیغمبری اور نبیوں کی نبوت ہی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

یہی سوال ہے، کتنا اچھا، کتنا معقول سوال ہے، دکھ اور دکھ کے اسباب سے انسان فطرتاً بھاگتا ہے، انحرافی زندگی اگر دکھ ہے تو چاہیے تھا کہ آدمی اس سے بھاگتا، لیکن بھاگنے کا کیا، دیکھا تو یہ جاتا ہے کہ بڑھنے والوں کا غلو دن بہ دن اس میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے بتوں کے حلقوں میں جکڑنے والے کوشاں رہتے ہیں کہ ہزار حلقوں والی زنجیریں ان پر چڑھا دی جائیں یوں ہی ہزار والے لاکھ کی اور لاکھ والے جہاں تک جاسکتے ہیں، جانے میں قطعاً کمی نہیں کرتے یہ بھی کہتے ہیں کہ لکھ پتی کبھی مسکرا نہیں سکتا، لیکن جو لکھ پتی ہیں وہ کروڑ پتی بننے کے لئے اور کروڑ پتی ارب پتی بننے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں، پھر یہ قصہ کیا ہے؟

اب آپ مانئے یا نہ مانئے۔ لیکن قرآن ہی میں اسی ذکر اللہ سے انحراف کی پاداش میں اس دوسری مخفی سزا کا جو ذکر کیا گیا ہے، یعنی ارشاد ہے،

وَمَنْ يَعْشَ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ حُمَاسٌ

نَفِيسٌ لَهُ شَيْطَانٌ فَهَوْلَهُ قَرِينٌ

(زخرف ۳۷)

اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمن کی یاد سے

تو پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے ایک

شیطان کو، پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے

اور یہ ہے درحقیقت ”فنیکی معیشت“ اور تلخ زندگی کے پھل کا وہ مخفی غیر مرئی درخت جس کے پھل کا مزہ تو ان میں سے ہر ایک کو چکھنا ہی پڑتا ہے۔ جن کی زندگی، ذکر اللہ سے کٹ کر گذرتی ہے، اب آپ ہی بتائیے کہ درخت ہی جب تک اکھاڑا نہ جائے گا، پھل کے پھلنے کو کون روک سکتا ہے، کیسے روک سکتا ہے، اور انسانی فطرت کے جگر میں جڑ قائم کرنے والا یہی وہ درخت ہے جس کے اکھاڑنے اور نکالنے کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ جس چیز کی حرارت سے وہ مرجھاتا ہے، مرجھا کر گرتا ہے، گرنے کے بعد خود بخود اس کی جڑ نکل جاتی ہے، اسی حرارت کے مہیا کرنے کا سامان کیا جائے۔

جو نہیں جانتے کہ خود میں کیا ہوں، وہی پوچھتے ہیں کہ یہ ”الشیطان“ آخر کیا بلا ہے، خدا جانے دینے والے اس کا کیا جواب دیتے ہیں، لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ بیچارہ کچھ نہیں ہے، صرف قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے، پیدا کرنے والے نے انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لئے زمین کے

اس کمرہ پر بسایا ہے۔ جو جس حد تک اس قدرتی نصب العین سے ہٹتا ہے۔ نہ رکنے والے کوڑے کی شکل میں وہی ان پر برستا ہے، برستا چلا جاتا ہے، ٹھیک جیسے بل سے نکلنے والے چوہے کو بلی دبوچ لیتی ہے، اپنے نصب العین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے، اس کو اسی لئے بنایا گیا ہے، یہی اس کا کام ہے، ایک جگہ نہیں قرآن میں مختلف مقامات میں

۱۲ ان عبادی لیس علیہم سلطان
کے اعلان کے ساتھ اس کو حکم دیا گیا ہے۔
واجب علیہم بخیلک و جملک
وشارکھم فی الاموال
والاولاد وعدہم وما
یعدہم الشیطان
الا غر و سرا۔
میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں۔
اور چڑھ جا ان پر (آدم کی اولاد پر)
اپنے سوار اور پیادوں کے ساتھ اور
ساجھی بن جا ان کے اموال اور اولاد
میں، اور وعدوں (کے سبز باغ دکھا)
ان کو، اور نہیں وعدے کرتا ہے ان
شیطان مگر صرف فریب۔

”اولاد“ کے ساتھ ”الاموال“ میں جن لوگوں کے وہ ساجھی اور شریک بن جاتا ہے، یقین مانئے کہ ان ہی مسکینوں کو ”دخل“ کی شکل میں ہو، یا ”خرچ“ کی راہوں میں، ہر حال میں ان ہی مغالطی احساسات میں مبتلا کرتے ہوئے وہ گھسیٹے لئے چلا جاتا ہے۔ جن کی تفصیل قرآن کے حوالہ سے گزر چکی، ان خسروانی زندگی گزارنے والوں کو اس حال میں جو دیکھا جاتا ہے کہ چیختے بھی جاتے ہیں، چلاتے بھی جاتے ہیں، جلتے بھی جاتے ہیں اور گھٹتے بھی جاتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ بڑھتے بھی جاتے ہیں چڑھتے بھی جاتے ہیں، تو درحقیقت وہ خود نہیں بڑھتے، خود نہیں چڑھتے، قرآن کی روشنی میں دیکھیے اس شیطان کو جو انہیں دبوچے ہوئے بڑھاتا اور چڑھاتا جاتا ہے۔ اسی موقع پر شیطان کی زبانی قرآن میں یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ اس نے آدم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا لا محنتک ذریتہ (میں ڈھائی لگاؤں گا اس کی اولاد کو) گدھوں اور گھوڑوں کے منہ پر بجائے لگام کے لوگ رستی باندھ کر کبھی کھینچتے ہیں، اسی کو اردو میں ڈھائی لگانا اور عربی میں احتناک کہتے ہیں، بہار میں ٹھری لگانا کہتے ہیں۔ یعنی جیسے گدھوں اور گھوڑوں کو ٹھری لگا کر لوگ لے چلتے ہیں جو گدھوں اور گھوڑوں کی تذلیل کی شکل ہے۔ شیطان نے بھی دعویٰ کیا کہ انہیں گھسیٹوں گا اور ذلت کے ساتھ گھسیٹوں گا! گھسٹنے والوں کا یہ تماشا کتنا دردناک ہے، گویا وہی مثل ان پر صادق آتی ہے کہ کتل کو یہ نہیں چھوڑتے، ... بلکہ کتل ہی انہیں نہیں چھوڑنا چاہتا۔ جب تک کہ وہی پڑھ کر اس پر نہ پھونکا

جائے جس کے سوا دنیا کے کسی جھاڑ اور پھونک کو وہ نہیں سنتا، صحیح حدیثوں میں آیا ہے،
 ۱ ذکر اللہ خمس
 جب آدمی اللہ کو یاد کرتا ہے تب
 ہی وہ پیچھے سرک جاتا ہے۔

ورنہ جب تک یہ نہیں ہے، اس کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں درحقیقت غنا بخشی کی قوت نہیں ہے
 باور کرائے کہ وہی آدمی کو غنی بناتی ہے، خلود بخشی کی خاصیت سے جو واقع میں محروم ہے، دھوکہ
 دیتا رہے کہ وہی خلود بخشی ہے۔ جن اعمال و افعال کا بالآخر کوئی نتیجہ نہیں، باور کراتا رہتا ہے کہ
 وہی نتیجہ خیز ہیں، جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا، سکھاتا رہتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا
 ہے، الغرض جو ہے، شیطانی تسلیط کے بعد نظر آتا ہے کہ وہی نہیں ہے، اور جو نہیں ہے، عجیب بات
 ہے کہ آدمی دیکھتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ وہی ہے، یہی ترجمہ ہے، آیت کریمہ قرآنیہ
 وما یعدہم الشیطان الا عذرا
 اور نہیں وعدہ کرتا ہے ان سے شیطان
 لیکن صرف فریب اور دھوکہ۔

کا، اور اب سمجھ میں آتا ہے اس کا مطلب کہ وہی قرآن وہی اسلام جس کی تعلیم ہے کہ زمین اور زمین میں جو کچھ
 ہے، بلکہ آسمان و زمین اور اس کے درمیان جو کچھ ہے، خدا نے سب کو انسان ہی کے لئے بنایا
 ہے، اسی قرآن میں

وما الحیوة الدنیا الا
 متاع الغرور
 اور نہیں ہے یہ پست زندگی، لیکن
 صرف سرمایہ فریب۔

اور ان جیسی آیتوں کو بھی جو پایا جاتا ہے تو ان کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ یہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا
 ہے کہ ان آیتوں میں اسی نظریہ کو دہرایا گیا ہے، جس کے ماننے والوں نے دنیا اور دنیا کی چیزوں کو
 مایا اور مایا کا جنجال قرار دیا ہے، بہتوں کو دونوں نظریوں میں تناقض نظر آتا ہے، بلکہ دیکھا جاتا
 ہے کہ اسلام کی تشریح و تفصیل کرنے والوں میں دوستوں کے وہ پیدا ہو گئے ہیں جو اسلام کو دنیا کا بھی
 ایک معاشی نظام قرار دینا چاہتے ہیں، وہ تو اس قسم کی آیتوں، حدیثوں کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں

۱۱ مسلمانوں میں بعض چیزیں کچھ ایسے طریقے سے مشہور ہیں کہ ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ علاج اور
 علاج کے طریقوں کا تو سب ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ یہ علاج ہے کس مرض کا۔ اس سے بہت کم لوگ
 واقف ہیں، یہی ذکر اللہ کا مسئلہ ہے۔ اسلامی تقویٰ کا سارا دار مدار اسی کثرت ذکر پر ہے۔ صوفی کہتے ہی
 اس کو ہیں جو کسی حال میں ذکر اللہ سے غافل نہ ہو، اور اسی دوام ذکر کی کیفیت کو حاصل کرنے کے
 ارباب تقویٰ نے بے شمار طریقے ایجاد کئے ہیں، لیکن یہ سوال کہ ہر وقت ہر حال میں خدا کے ذکر کی آدمی کو
 ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کی طرف کم توجہ کی جاتی ہے۔ حالانکہ دوسرے فوائد کے سوا ذکر اللہ کا سب سے بڑا
 فائدہ اسی تسلیط شیطان کے مرض کا ازالہ ہے، اس کا واحد علاج ہی یہ ہے ۱۲

اور جن پر دینی جذبہ کا غلبہ ہے وہ ان ہی آیتوں کو پیش کر کر کے ان کے خیال کی تردید کرتے ہیں، حالانکہ نہ وہ غلط ہے اور نہ یہ غلط ہے، لینے والوں میں دنیا اور دنیا کی پیداواروں کو جو ابتلائی ذمہ داریوں کے ساتھ لیتے ہیں، اور ٹھیک وہی مثال جو پیغمبر سے بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں مروی ہے اسی کو اپنی بسطی زندگی میں دستور العمل بناتے ہیں، ان کی یہی دنیا آخرت کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس حدیث کے ایک جز کا پہلے بھی ذکر آیا ہے، یہاں پوری حدیث نقل کی جاتی ہے، ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں،

جلس ۲ النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر و جلسنا حوله فقال ان ہما اخاف علیکم بعدی ما یفتح اللہ علیکم من زہرة الدنیا وینتہا فقال رجل ۲ ویا تیا الخیر بالشر یا رسول اللہ فسکت عنه فقالو اما شانک تکلم رسول اللہ ولا یکلمک و امرینا انه ینزل علیہ فافاق یسم ۲ لخصاء قال ۲ ین السائل ۲ انفا ۲ ان الخیر لا یاتی الا بالخیر و ان ہذا المال خضرة حلوة و ان صابینبت ۲ الربیع ما تقبل حبطا ۲ و یلم ۲ الا اکلہ ۲ الخضر فانہا اکلت حتی ۲ اذ ۲ امتدت خاضرها ۲ استقبلت عین ۲ الشمس فثلطت و بالث شم ۲ ارتعت و ۲ ان ہذا المال حلوة من ۲ اخذہ بحقہ و وضعہ فی حقہ فغم ۲ المعونة ہو و غم صاحب المال هو لمن ۲ عطی منه المسکین

تشریف لائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر اور ہم لوگ آپ کے ارد گرد بیٹھ گئے تب اللہ کے پیغمبر نے کہنا شروع کیا، بلاشبہ میں جس چیز سے ڈر رہا ہوں اپنے بعد، وہ وہی چیزیں ہیں جنہیں فتح کر اے گا اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لئے دنیا کی ترقی و تازگی سے اور اس کی زینت بناؤ سنگار سے (یعنی آئندہ اسلامی فتوحات کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا تھا) تب کہا ایک آدمی اے اللہ کے رسول کیا خیر اور بھلائی کے بعد شر اور برائی آئے گی؟ (یعنی بھلائی سے کیا برائی کا نتیجہ پیدا ہوگا؟) تب چپ ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو لوگوں نے کہنا شروع کیا، رسول اللہ تو ایک بات فرما رہے تھے تجھ سے تو نہیں بول رہے تھے (جو تو نے خواہ مخواہ سوال کیا) اسی حال میں دیکھا یا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے لگی (یعنی نزول وحی کے وقت جو ایک خاص حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوتا تھا وہی کیفیت شروع ہوئی) پھر اس حال سے افاقہ ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پسینہ پونچھ رہے تھے اور فرمایا کہ

والتیم و ابن السبیل
و کما قال صلی اللہ علیہ
وسلم و ان من یاخذ بغیر
حقہ کالذی یا کل ولا یشبع
و یكون علیم شہید
یوم القیمہ -

(رواہ البخاری و مسلم و النسائی)

ابھی جس نے سوال کیا تھا وہ کہاں ہے؟
پھر فرمایا کہ اچھی چیز نہیں پیدا کرتی لیکن
اچھے ہی نتائج کو (مگر جب اس کا استعمال
صحیح طور پر کیا جائے) پھر فرمایا کہ دیکھو!
یہ مال اور سرمایہ ہر یا لی میٹھی چیز ہے لیکن
برساتی پرناؤں کے کنارے جو ہر یا لی
اگتی ہے (حالانکہ اچھی چیز ہے لیکن اس کو

جب کوئی جانور زیادہ مقدار میں کھا جاتا ہے تو) وہی مار ڈالتی ہے یا قریب موت کے
پہنچا دیتی ہے، مگر ایسی مویشیاں جو صرف ہری ہری دوب کو چرتی ہیں کہ وہ انہیں کھاتی
ہیں، پھر جب ان کے دونوں پہلو برابر ہو جاتے ہیں، تو آفتاب کے سامنے دھوپ
میں جا کر بیٹھتی ہیں، پھر گوبر کرتی ہیں، اور پیشاب کرتی ہیں، پھر جا کر چسرتی ہیں،
(اس مثال کو بیان کر کے فرمایا) پس یہی حال مال کا ہے، بڑا میٹھا ہے
جب لینے والا اس کو حق کے ساتھ لے، اور حق ہی میں اسے خرچ کرے، تو پھر یہ بہترین امداد
ہے، اور ایسا سرمایہ دار بہت اچھا آدمی ہے، یہ اپنے اس مال سے مسکین یتیم مسافر کو دیتا ہے
بہر حال یہی الفاظ یا جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور فرمایا کہ جو اس مال کو
اس کے حق کی راہ سے نہیں لیتا، اس کی مثال ایسی ہے کہ کھائے جاتا ہے لیکن پیٹ اس کا
نہیں بھرتا اور قیامت کے دن یہی مال اس کے خلاف گواہ بن جائے گا۔

آپ نے دیکھا اسلام کے نقطہ نظر کو، وہی مال اور وہی سرمایہ جس سے عموماً مذہبی مزاج والوں نے ہمیشہ
نفرت ہی کا اظہار کیا ہے۔ تو مقرر کا دین حالانکہ سمجھا جاتا ہے کہ روشن خیالی کا دین تھا۔ لیکن چونکہ
بہر حال وہ دین ہی تھا، اس لئے ”ٹھٹھ گدھوں“ کے خطاب سے زیادہ لو مقرر کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ
کسی اور نام سے ان دولتمندوں کو موسوم کرے جن کے متعلق انجیل میں خبر دی گئی تھی کہ سوئی کے ناکے
سے اونٹ کا گزرنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ آسمانی بادشاہت میں دولتمندوں کو گھسنے کی اجازت
دی جائے۔ لیکن اسلام اسی دولت اسی سرمایہ اور مال کو خیر کہتا ہے اور یہ کہ بجائے خود وہ قطعاً شر
نہیں ہے، البتہ شریعوں کا غلط استعمال اس کو شر بنا دیتا ہے، یہی حاصل ہے مذکورہ بالا حدیث کا
بلکہ سچ پوچھیے تو جو کہتے ہیں کہ سب کچھ یہیں ہے، یہاں کے سوا کہیں بھی کچھ نہیں ہے، قرآن میں
لم یرد الا الحیوة الدنیا
نہ مقصود بنایا اس لئے لیکن صرف اسی

پست زندگی کو۔

یا

یا کھوئی ان کی سرگرمیاں اسی پست زندگی میں

ضل سعیہم فی الحیوة الدنیا

وغیرہ الفاظ میں جس مسلک کی تعبیر کی گئی ہے، یعنی وہی مسلک جو آج مغربی اقوام و ملل اور ان کے طفیلیوں کی اکثریت پر مسلط ہے، یعنی پیٹ اور روٹی والا خالص مادی نظریہ اور ٹھیک اسی کے بالمقابل جو یہ کہتے ہیں کہ ”کچھ بھی یہاں نہیں ہے“ یا جو کچھ بھی ہے بھوگنے کے لئے نہیں بلکہ بھاگنے اور مرنے بھاگنے کے لئے ہے، جس کا ذکر جیسا کہ گذر چکا، قرآن میں

سہبانیۃ ۲ بتدعوہا صا
رہبانیت کا مسلک جسے ہم نے ان پر
کبتنا ہم علیہم۔
واجب نہیں ٹھہرایا تھا۔

کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ الغرض مادیت اور روحانیت ان دونوں افراطی و تفریطی متناقض نظریات کے درمیان حسب دستور بجائے ازالہ کے اپنی پرانی تدبیرِ آئینہ سے کام لے کر اسلام نے انسانی فطرت کو اس کی وہ کھوئی ہوئی چیز عطا کر دی، جسے پیغمبروں کی تعلیم سے ہٹنے کے بعد وہ ہمیشہ کھو بیٹھتی ہے، الخیر لا یاتی الا بالخیر (اچھی چیز نہیں پیدا کرتی، لیکن اچھے ہی نتائج کو) یہی وہ پیغمبرانہ فقرہ ہے جس میں وہ سارا مضمون سمٹ کر آ گیا ہے جسے اب تک بسطی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کی تفصیل میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے، دولت اور سرمایہ سے جب غلط نتائج کا تجربہ لوگوں کو ہونے لگا اور تاریخ کا کونسا دور ہے جس میں سرمایہ اور مال کے ان تلخ نتائج کی تلخیاں لوگوں کو نہ چکھنی پڑی ہیں، آج بھی یہی ہوا ہے، ہو رہا ہے، اور کل بھی یہی ہوا تھا، ہوتا چلا آیا ہے، چھیننے والے جب چھیننے لگے، اور ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دنیا کو اس راہ میں چھینا ہی پڑا ہے تو عطا یوں نے خدے کو دیکھ کر مریض کے واویلا کو مندے ہی کی طرف منسوب کر دیا۔ سرمایہ اور مال دولت اور ثروت کے نام سے ترہ بازیاں شروع ہو گئیں، اسی پر لغتوں کے تیر، نفرتوں کی گولیوں کی بارش شروع ہو گئی، ان ہی لغتوں اور نفرتوں نے کبھی رہبانیت و کلیتیت کی شکل اختیار کی کسی ملک میں مزدوریت کا چولا پہن کر اسی نے سراٹھایا، اور آج وہی اشتراکیت و اشتمالیت اور ازیں قبیل مختلف ”یتوں“ کے بھیس میں سرمایہ داروں کو دھمکا رہی ہیں، مالداروں کو ڈرا رہی ہیں۔

لیکن انسانیت کی تصحیح و علاج کے لئے جن طبیعوں کو قدرت پیدا کرتی ہے، ان قدرتی اطباء نے سرمایہ کو نہیں بلکہ ان کو ٹوٹا جو سرمایہ کو غلط طریقہ سے استعمال کر رہے تھے، ان کو سلجھایا جنھوں نے خود الجھ کر دولت سے کام لینے کے فطری طریقوں کو الجھا دیا تھا، ”قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو اور قسم ہے اس کی جس نے نر و مادہ (مرد و عورت) پیدا کئے۔“

قرآن مجید میں ان ہی عجیب و غریب قسموں اور تاریخی انقلابات کے عمیق اشاروں مردوں اور عورتوں اور باہم ان کے تعلقات سے پیدا ہونے والے نتیجوں کے کنائی ذکر کے بعد

ان سعيکم لشتی۔
قطعاً تمہاری کوششیں (عملی سرگرمیاں)

طرح طرح کی ہیں۔

فرما کر

فاما من اعطی و اتقی
و صدق بالحسنیٰ فسنیسرہ
للیسرہ۔
پس جس نے دیا اور ڈرا اور الحسنیٰ
(اچھی باتوں) کی تصدیق کی تو ہم قریب
ہے کہ آسان کریں گے اس پر آسان

زندگی کو۔

میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو اس سلسلہ میں اب تک کہا گیا ہے یا کہا جا رہا ہے یا کہا جا سکتا ہے، ”ایسری“ (آسان زندگی) کی ضمانت لی گئی ہے، ان لوگوں کے لئے جو عطائی مشوروں سے ہٹ کر قدرتی طبیعوں کے اس علاج کو اختیار کرنا چاہتے ہیں، چوں کہ ان قرآنی آیات کے متعلق جو کچھ کہنا تھا پہلے کہا جا چکا ہے، پڑھنے والوں کو چاہیے کہ پھر اسی کو پڑھیں، غور سے پڑھیں، علاج کا یہی لازوال فطری طریقہ ہے۔ فطرت کی راہوں سے ہٹ کر جو بھی چلنا چاہے گا، دکھ کے ساتھ اسے واپس ہی ہونا پڑے گا، آج نہیں تو کل اسے پچھتا نا ہی پڑے گا، ایک کانٹا اگر نکلے گا تو دس کانٹے چبھیں گے، اگر ایک گڑھ کھلے گی تو کھل کر وہی بیسیوں گڑھوں کی شکل اختیار کر لے گی، عارف رومی نے اپنے تمثیلی بیان میں اسی مضمون کو کتنے اچھے پیرایہ میں ادا فرمایا ہے، مثنوی میں ہے:

کس بزرگ دم خرد خار سے نہد
ایک آدمی کسی گدھے کی دم کے نیچے کاٹا چبھاتا ہے
خرد نہ داند دفع او بر می جہد
گدھا کانٹے نکالنے کی تدبیر سے چونکہ ناواقف ہے اس لئے
کو دتا پھاندتا ہے۔

می جہد آل خار محکم تر زند
کو دتا پھاندتا ہے اور کانٹا اور زیادہ مضبوطی سے چبھتا چلا جاتا،
خرد بہر دفع خار از سوز و درد
گدھا کانٹے کو نکالنے کے لئے مارے جلن اور درد کے
اور آج دنیا اسی حال میں مبتلا ہے، انسانیت کے جسم میں جو کانٹا چبھ گیا ہے، اس کانٹے کے نکالنے کا صحیح طریقہ جن بزرگوں کو معلوم ہے، اللہ کے ان پیغمبروں سے تو بغاوت اختیار کی گئی ہے، اور کوشش کی جا رہی ہے کہ ان سے بے تعلق رہ کر اس کانٹے کے نکالنے میں کامیابی حاصل کی جائے گی، لیکن مسکین گدھے کو کون سمجھائے کہ خار بر آری کی اس کوشش میں بجائے نکلنے کے کانٹا اور اندر دھنستا چلا جائے گا، ہر وہ رگڑ جو اس کانٹے کو نکالنے کے لئے گدھا لگائے گا بیسیوں نئے زخم اپنے اندر پیدا کر لے گا، بقول اکبر مرحوم

جتنا پھڑ کو جال کے اندر
جال گھسے گا کھال کے اندر

اور یہ سبھی بسطی معیشت کی ذمہ داریوں سے انحراف کے وہ نتائج جن کا ظہور علاوہ اخروی زندگی کے

اسی معیشت اور زندگی میں از روئے قرآن و حدیث اسی دنیا میں ہوتا ہے۔

قدری معیشت اور اس کی ذمہ داریوں | اب میں چاہتا ہوں کہ قدری معیشت کی ذمہ داریوں سے انحراف کے نتائج سے گریز کرنے والوں کے ان نتائج کی تفصیل کروں جن کا

ذکر اسلامی وثائق و لصوص میں کیا گیا ہے، تو بات یہ ہے کہ

من اعراض عن ذکرى فان له معيشة ضنكا۔ جو کترایا میری یاد سے پس اس کے لئے معیشت ہے ضیق اور تنگیوں سے بھری ہوئی۔

کی قرآنی آیت میں جس جرم کی پاداش میں زندگی کو تلخ و پر اگندہ بنا دینے کی دھمکی دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ جس طرح اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو بسطی پیمانے پر رزق پاتے ہیں، اسی طرح اس کے دائرے میں وہ بھی شریک ہیں جنہیں قدری پیمانے پر روزی مل رہی ہے کیونکہ متن کا لفظ عام ہے اور ہر اس شخص کو حاوی ہے جو ذکر اللہ سے ہٹ کر اور کٹ کر جینا چاہتا ہے، الغرض معیشت خواہ بسطی ہو یا قدری جب معلوم ہو چکا کہ ”الرزق“ کا ہر حال خاص قسم کی خدائی ذمہ داریوں کا طالب ہے، تو جو ان ذمہ داریوں کو پوری کرے گا، ان کے نتائج بھی ان کے سامنے آئیں گے اور جو ان سے لاپرواہی اختیار کرے گا، قدرت کے انتقامی خمیازوں سے اپنے آپ کو وہ بچا نہیں سکتا، اسی طرح

من لعیش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطانا فہولہ قرین۔ اور جو آنکھیں چراتا ہے الرحمن کی یاد سے، پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے

شیطان کو، پس وہ ہو جاتا ہے اس کا ساتھی۔

کا قانون جیسے بسطیوں کے لئے ہے اور ذکر الرحمن سے اعراض کی سزا شیطانی تسلیط کی شکل میں جیسے انہیں بھگتنی پڑتی ہے۔ اسی طرح اس جرم کا ارتکاب اگر قدری معیشت والوں کی طرف سے ہوگا تو اس قدرتی تازیانے کی مار سے وہ اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں، بلکہ

الشیطان یعدکم بالفقر ویامرکم بالفحشاء۔ الشیطان دھمکاتا ہے تمہیں افلاس سے اور حکم دیتا ہے بھیاٹی کی باتوں کا۔

کی آیت جب میری تلاوت میں گزرتی ہے، تو ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ جن بیچاروں کی آمدنی ٹھیک خرچ کے مطابق بالکل اس کے برابر برابر ہوتی ہے، یعنی خرچ کرنے کے بعد جن کے پاس کچھ پس ماند نہیں رہ سکتا، ایسوں کے لئے معیشت کے اسی رنگ کو پیش کر کے ہر گزرنے والے دن کو دماغ سے نکال کر الشیطان آنے والے دن کی ضرورتوں کے اندیشوں کو پیدا کر کے ان کے کلیجوں کو مستی اور فردا کی فکر میں ڈال کر ”امروز“ کی لذتوں کو بھی ان غریبوں کے لئے تلخ بنا تا چلا جاتا ہے اور یہی مطلب ہے الشیطان یعدکم بالفقر کا (یعنی شیطان تمہیں محتاجی اور ناداری کی دھمکی دیتا رہتا ہے، لیکن بسطی معیشت رکھنے والوں میں اس خیال سے ڈرانے کی گنجائش چونکہ نہیں پاتا، اس لئے عموماً

”الفحشاء“ اور بے حیائیوں پر الشیطان ان لوگوں کو اکساتا رہتا ہے جو سبیل معیشت رکھتے ہیں، دیکھتا ہے کہ فقر کی دھکی تو ان پر کارگر نہ ہوگی، تو آوارگی اور بد چلنی کی راہوں پر ان کو ڈالتا ہے، عام طور پر نوابوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں کا جو حال ہے کہ اپنی سبیل معیشت کی ابتلائی ذمہ داریوں سے جب وہ بے پروا ہو جاتے ہیں، تو ان کی آمدنیوں کا بڑا مصرف بھی ”الفحشاء“ رہ جاتا ہے۔

بہر حال یہ تو اجمال ہے، قرآن میں اسی اجمال کے جو تفصیلات پائے جاتے ہیں، اب میں ان ہی کو پیش کرنا چاہتا ہوں، لیکن ان تفصیلات کے ذکر سے پہلے میں پھر اسی مسئلہ پر تینہ ضروری خیال کرتا ہوں جن کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ قدری معیشت والوں کو جن معاشی پریشانیوں میں عام طور پر مبتلا پایا جاتا ہے، ان کا ایک حصہ تو وہ ہے، جن کی ذمہ داری بالکلیہ ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو سبیل معیشت رکھتے ہیں۔ لیکن اکلِ لم کے عارضہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے قدریوں کے ان جائز حقوق کو نہیں ادا کرتے، نہیں ادا کرنا چاہتے، جو دینے والے کی طرف سے ان کے سرمایہ میں مقرر کیا گیا ہے۔

اور اکلِ لم کا استسقاءی روگ ہے بھی ایسا ناپاک روگ کہ جن پر اس کا دورہ پڑ جاتا ہے، وہ صرف یہی نہیں کہ جو آچکا ہے اسی کو پوری طاقت سے اس طور پر پکڑے رہتے ہیں کہ ایک کھیل بھی چاہتے ہیں کہ دوسروں کے منہ میں اڑ کر نہ جانے پائے، بلکہ دوسروں کے منہ کے نعمتوں کو بھی چھین چھین کر چاہتے ہیں کہ ننگتے چلے جائیں، خود ان ہی کے ملک ان ہی کی قوم ان ہی لوگوں پر جن میں وہ رہتے رہتے ہیں کچھ بھی گزر جائے۔ لیکن اکلِ لم کے ان روگیوں کے کان پر جوں بھی نہیں رنگتی، خصوصاً جن ممالک میں آئینی پشت پناہیاں بھی اکلِ لم کے ان آسیب زدوں کو میسر آ جاتی ہیں تو پھر ان کے بے پناہ مظالم کا کیا ٹھکانہ ہے، آج جن کے تماشے ان ممالک میں نظر آ رہے ہیں، جہاں دولت کا طوفان برپا ہے، فی کس ”اوسط آمدنی“ کی طلسمی تعبیروں کا جو کھیل جہاں ملک کے سادہ لوح عام باشندوں کو خوش کرنے کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔ سنایا جاتا ہے اور ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف پیرایوں میں اعلان کرایا جاتا ہے کہ مثلاً ہمارے ملک کی اوسط آمدنی فی کس

”گیارہ سو اسی روپے ہیں“

اوسط نکالنے کے وقت تو اس آمدنی کو فی کس پر بٹھایا جاتا ہے، لیکن بجائے اوسط کے واقعی جو اوسط نہیں بلکہ دولت ہے، ثروت ہے، اس کی تقسیم کا وقت جب آتا ہے تو اسی گیارہ سو اسی روپیہ فی کس آمدنی رکھنے والے ملک کے عام باشندوں کے متعلق یہ خبریں بھی معلوم ہوتی رہتی ہیں کہ

”ملک میں بے روزگاروں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔“

یہ قارئین کی زمین امریکہ کا حال ہے (دیکھو رسالہ جامعہ دہلی اپریل ۱۹۲۳ء)

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ انگلستان میں ہر سال آمدنی کی ان گنت راہوں سے انسانوں کا کمایا ہوا روپیہ جو داخل ہوتا ہے، اس روپے میں سے تقریباً چودہ آنے "اکل لم" کے زور سے کل ان ہی پانچ ساڑھے پانچ سو آبادکاروں کی جیب میں گھوم گھوم کر رہ جاتے ہیں، ان کی جیبوں سے چرنے اور چکنے کے لئے یہ ملک سے باہر نکلتے ہیں اور اپنے بچوں، بچوں کے بچوں، پوتوں، پوتوں کے ساتھ پھر ان ہی کی جیبوں میں جا کر دفن ہو جاتے ہیں، یہی چکر ہے، صد ہا سال سے اس ملک میں جس کے اندر وہاں کی دولت گھوم رہی ہے، باقی ملک کی عام آبادی پر وہی فی کس والا اوسط جس طریقہ سے تقسیم ہوتا ہے، اس کا اندازہ بھی آپ کو اسی ملک کی معاشی روئدادوں سے ہو سکتا ہے۔ جنگِ عظیم اول سے پہلے جب ہر طرف امن و امان ہی کا دور دورہ تھا، آمدنی ہی آمدنی تھی۔ آگ اور سمندر نے اس ملک کے رہنے والوں اور ان کی کمائیوں کو ننگے کے لئے اپنا منہ نہیں کھولا تھا، اس وقت کا حال چھپوانے والوں نے اخبار میں یہ چھپوایا تھا،

آج ہمارے ملک انگلستان کی یہ حالت ہے کہ ہر تیس آدمیوں میں ایک آدمی ایسا ضرور ہے جو اپنی قوتِ بازو سے اپنی گذر بسر نہیں کر سکتا۔

ایک کماتا ہے، دس کھاتے ہیں، بدبخت ہندوستان اس عارضہ میں بدنام تھا، لیکن بدنام کرنے والوں کی نیک نامیاں کیا اس سے کم ہیں۔ اور یہ حال تو جنگِ عظیم اول سے پہلے تھا۔ جنگ کے بعد ۱۹۲۶ء میں گنتے والوں نے اپنی گنتیوں کو ان الفاظ میں مشتہر کیا تھا،

آخری مردم شماری کے اعداد کے لحاظ سے ہمارے ملک انگلستان میں ایک کروڑ (یعنی تقریباً چوتھائی آبادی) ایسی ہے جو ناداری میں بسر کر رہی ہے، اور دوسرے ایک کروڑ کی تعداد ایسی ہے جو نیم فاقہ کشی کی حالت میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہے جو آرام و آسائش کے نام سے بھی واقف نہیں اور جس کی سسکتی ہوئی زندگی جو ہر لمحہ گویا ختم ہی ہونے کو آمادہ ہے۔

جہاں کے عوام پر خود عوام کی حکومت ہے، جمہوریت کا سبق جو ملک سارے جہاں کو پڑھاتا پھرتا اور دنیا بھر میں اس کے برکات بانٹتا پھرتا ہے، اس کی نصف آبادی سسکتی ہوئی زندگی جو ہر لمحہ گویا ختم ہی ہونے کو آمادہ ہے، گذار رہی تھی، اس کے نتیجہ کا آخری فقرہ یہ تھا

یعنی ہر چار آدمیوں میں ایک آدمی ایسی حالت میں گذار رہا ہے جس میں کوئی کاشتکار اپنے مولشی کو بھی رکھنا گوارا نہ کرے۔

۱۹۲۶ء اخبار سچ میں انگلستان ہی کے مختلف اخباروں سے یہ معلومات فراہم کر کے اس وقت شائع کئے گئے تھے، جب تک باہر کے دشمنوں نے اس جزیرے کے باشندوں پر نہ بم برسائے تھے، نہ ان کے گھروں کو کھنڈر بنا کر خندقوں میں شبِ باشی پر مجبور کیا تھا، اف اس وقت بھی ہر چار آدمی میں خود ان ہی کا بیان ہے،

ہم میں ایک آدمی کا حال ایسا ہے کہ گویا کوئی دھو بی اپنے گدھے کو، کوئی تیلی اپنے کو لٹھو کے پیل کو بھی رکھنا پسند نہیں کر سکتا۔

چار کروڑ انسانوں میں پانچ ساڑھے پانچ سو انسانوں کا لاکھ پتی ہونا اور اس کے بعد اسی چار کروڑ کی بقیہ آبادی میں ہر چار میں سے ایک کو مویشیوں، گائے بیلوں، بیٹروں اور بکریوں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر کس نے مجبور کیا تھا؟ یا ہر کے بمب افکنوں، اور آتش باروں نے؟ یا اندر کے پانچ سو ساڑھے پانچ سو لاکھ پتیوں کے اکل لم نے؟ کتنا دلچسپ ہے فی کس کے اوسط کا یہ افسانہ جسے سنا سنا کر غریب ہندوستان ہمیشہ اپنے لیڈروں کی زبانوں سے دھتکارا گیا، اور در درایا گیا ہے،

یاد پڑتا ہے ان ہی دنوں میں عوام کے مطالبوں سے مجبور ہو کر انگلستان کی حکومت نے بھی اپنے بیت المال میں ایک حد تک ”الفقراء والمساکین“ کے حقوق کا جب اعتراف کیا، غریبوں کو کچھ امداد شاہی کہیے، یا سرمایہ داری کے خزانے سے ملنے لگی تو لقمہ دوختہ ہونٹوں کو دیکھ کر کسی مراسلہ نگار نے لکھا، اب ملک میں افلاس کی وہ حالت نہیں ہے۔“

ڈیلی ہیرالڈ نے جو ان ہی لقمہ دوختوں کا اجراء ہے، اس اعلان کی اشاعت پر پھر کر لکھا تھا، ہم دریافت کرتے ہیں کہ مراسلہ نگار کو کتنے گھروں کے اندر جانے کا اتفاق ہوا ہے، اسے کچھ بھی اندازہ ہے کہ اب بھی (تقسیم خیرات کے بعد بھی) کتنے گھرانے ایسے ہیں جن کا گزر زیادہ تر محض روٹی اور چار پر ہے، بجائے مکھن کے جو چربی پر بسر کرتے ہیں، جنھیں گوشت اور سبزی (بجز آلو) کے کبھی دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی۔“

ڈیلی ہیرالڈ کا یہ بیان اس وقت کا نہیں ہے جب انگلستان میں رات باندی کا نفاذ ہو چکا تھا۔ جنگ عظیم ثانی سے پہلے کا یہ قصہ ہارنے والے جرمنی کا نہیں، جیتنے والے، بلکہ مقبوضات بڑھانے والے انگلستان کا ہے، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ تین پیسے یا کچھ کم اسی قسم کے چند بیسوں کی اوسط آمدنی رکھنے والے ہندوستان کو کس بنیاد پر شرماتے، اور ان دلاتے تھے، جھوٹروں والا ہندوستان سن لے کیسل اور پیلس والے انگلستان کا حال ایک

”شہر گلا سگو میں چودہ ہزار مکانات ایسے ہیں جو صرف ایک کوٹھڑی پر شامل ہیں، اور ہر کوٹھڑی میں چار چار پانچ پانچ چھ آدمی رہتے ہیں، تیس ہزار مکانات دو دو کوٹھڑیوں پر شامل ہیں، اور ان میں سات سے بارہ تک گزر کرتے ہیں۔“

یہ بیان دیا تھا، جناب مسٹر لارڈ جارج صاحب سابق وزیر اعظم دولت انگلیشہ آکسفورڈ میں پہنچ کر اس لئے یہ اعداد و شمار فراہم کئے تھے کہ دوٹوں کی تعداد میں اضافہ ان ہی اعداد کے پیش کرنے ہی سے ہو سکتا تھا اور گلا سگو تو بہر حال گلا سگو ہے، بلا دال دنیا کی ملکہ، لندن ہی کا حال جب

یہ تھا، مسٹر لائڈ جارج ہی کا بیان۔

”اُس شہر لندن کی کل آبادی کا پانچ ڈربوں جیسے مکانوں میں بسر کرتی ہے۔“
پھر لندن اور لندن والے جن ملکوں اور جن شہروں پر حکومت کرتے ہیں، اگر وہاں کے باشندوں کو
رہنے کے لئے مرغی کے یہ ڈربے بھی نصیب نہ ہوں تو لوگوں کو اس پر حیرت کیوں ہے؟
ان ہی دنوں میں جب یہ خبریں ایک کالم میں شائع ہوتی تھیں تو دوسرے کالموں میں
اس قسم کی خبروں کی بھی کبھی کبھی محسوس نہیں کی گئی ہے۔ اور آج بھی یہ دونوں سلسلے ایک ساتھ ایک
ہی رفتار سے جاری و ساری ہیں، مثلاً انگلستان ہی کے متعلق

”چار ارب چوتھڑ کروڑ روپے کی صرف شراب لٹھا لی گئی“ (سیچ ۵۔ فروری ۱۹۲۶ء)
اور امریکہ کے متعلق

”عورتوں نے اپنے چہروں (صرف چہروں) کی آرائش کے لئے غارہ پوڈر
وغیرہ پر چونتیس کروڑ روپوں سے زائد خرچ کئے (ویسٹ منسٹر گزٹ
۱۶۔ مارچ ۱۹۲۶ء)

اور یہ ہیں

تاکلون ۲ لٹراٹ ۲ کلا لہما
کھا رہے ہو (موروثی سرمایہ کو)
اکل لم کے ساتھ۔

کی وہ زندہ تفسیریں جن کی بدولت چار کروڑ کی آبادی میں سے دو کروڑ انسانوں کو تو سکتے،
ایڑیاں رگڑتے ہوئے مویشیوں کے مانند مرغیوں کے ڈربوں میں پایا گیا، لیکن اسی ملک میں
لٹھا لانے والے چوتھڑ کروڑ ہی نہیں بلکہ چوتھڑ چار ارب کی سالانہ شراہیں بھی لٹھا رہے
تھے۔ اللہ اللہ رے ”اکل لم“ کا زور کہ رخساروں پر چونتیس چونتیس کروڑ کی دولت مل کر ہر سال
رکھ دی جائے، لیکن لاکھوں اور کروڑوں باشندوں کے بھوکے پیٹ اور ننگے اجسام کے لئے
ان کے پاس کچھ نہ ہو، اور اس پر بھی دنیا کے کان کو اس قسم کے دعووں مسلسل دعووں سے بہرا
بنایا جا رہا ہو کہ اشخاص سے چھین کر ملک کے عام باشندوں تک دولت اور حکومت کے پہنچانے
میں ہم ہی نے پیش قدمی کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے جہاں بھی گزرے جو بھی گزرے، چور تھے،
بٹ مارتے، اپنے اور اپنے بال بچوں کے سوا ان کے خزانوں میں ملک کے عام باشندوں کے لئے
کچھ نہ تھا، دنیا ہی انصاف کر سکتی ہے کہ جس ملک میں ایک طرف تو یہ حال ہے کہ پینے والوں نے
سال بھر میں چار چار ارب اور چوتھڑ چوتھڑ کروڑ روپے کی شراب لٹھا ڈالی ہو، لیکن اسی ملک
میں شراب ہی کے متعلق نذیروں کے ایسے طبقات بھی پائے جاتے ہیں، وہی ۱۹۲۷ء جس میں شراب
کی بجٹ کے یہ اعداد ہیں، اسی سنہ چوبیس میں ڈیلی میل اخبار نے یہ خبر بھی شائع کی تھی،
”گلاسگو میں دھسکی کے تین ٹکے اتفاقاً شراب کی لاری سے لڑھک کر زمین پر گر پڑے“

سڑک پر شراب بہتے لگی، ہزار کے اوپر عوام کا ہجوم تھا جو صراحیوں اور بوتلیں لئے ٹوٹ پڑا، اور بعض ترسی ہوئی روحوں نے تو کمال ہی کر دیا کہ سڑک پر اوندھے لیٹ کر نالی میں بہتی ہوئی شراب کو پینا شروع کیا اور بعضوں نے اس میں کپڑے ڈبو ڈبو کر پھر انھیں بوتلوں میں بچوڑ لیا (ماخوذ از سچ ۳۔ مئی ۱۹۲۷ء)

اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرمایہ داری کا جو ظالمانہ نظام آج یورپ و امریکہ میں قائم ہے، اسی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے ممالک میں بسطی معیشت رکھنے والوں نے قدری رزق والوں کو محرومی و مفلسی کے کس آخری نقطہ تک پہنچا دیا ہے، گندی نالیوں میں بہتے والی شراب جس کے پینے پر شاید کتا بھی باسانی تیار نہیں ہو سکتا، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کے غریب افراد کتنی مسرت کے ساتھ اس نعمت غیر مترقبہ کو اوندھے ہو ہو کر نالیوں میں منہ ڈالے اسی کو پی رہے تھے۔

اسی لئے قدری معیشت کی وہ دردناک حالت جو بسطی معیشت والوں کے اکل کم یا انتہائی خود خواری و خود نوشی کے جذبات کے تسلط کا نتیجہ ہے، اس کی اصلاح و تصحیح کے قصہ کو تو اسی قدرت کے حوالہ کرنا چاہیے جس نے ان ظالمانہ چہرہ دستیوں کے چنگلوں سے نجات دے دے کہ تاریخ کے موجودہ دور تک نسل انسانی کو پہنچا یا ہے، قرآن کا وہی خدا جس نے اپنے متعلق ان سربک لبالمہر صساد اور تیرار بگھات میں ہے۔

کا اعلان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ قدرت کی مخفی نگرانی اندازہ کرتی رہتی ہے، تا انیکہ فاکثرو فیہا الفساد جب بگاڑ اور فساد کو بڑھا دیتے ہیں (سردھار اور اصلاح پر)

کے درجہ تک ظلم و تعدی کا یہ پارہ چڑھ کر جب پہنچ جاتا ہے تو معا اسی کے ساتھ فصب علیہم سربک سوط بس برسا دیتا ہے ان پر تیرار ب عذاب کا کوڑا۔

عذاب کا تجربہ کرہ زمین کے باشندوں کو ہمیشہ کرنا پڑا ہے اور آج بھی ”معاشرتی توازن“ کے جس قصہ کو ناہمواری کے جن حدود تک پہنچا دیا گیا ہے، مرصاد (گھات) والے رب کے سوط عذاب (تازیانہ عذاب) کا لوگوں کو انتظار کرنا چاہیے، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید قدرت کی اس مخفی بے آواز والی لاسٹھی کی مار کے آثار کا ظہور شروع ہو چکا ہے، آخر قرآن ہی میں یہ جو فرمایا گیا ہے، یعنی

وذرنی واطکذ بین وادی النعمۃ
وہلہم قلیلا ن لدینا
۲ نکالو و جیسا و طعاما
چھوڑ دو مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو
جو نعمت والے ہیں اور مہلت دو ان کو
تھوڑی، قطعاً ہمارے پاس ہیں بیڑیاں،

ذۡنُ غَصَّةٍ وَعَذَابًا لِّیْمًا اور آگ کا ڈھیر اور کھانا ایسا جو گلے میں

اٹک جائے اور دکھ بھرا عذاب۔

نعمت کہیے یا "سرمایہ" اسی کو پالنے کے بعد اپنی متعلقہ ذمہ داریوں کو جنھوں نے جھٹلایا تھا، کچھ دن کی ڈھیل کے بعد ان ہی کے حلقوم میں آج "اشتراکیت" و "اشتالیت" اور اسی قسم کے مختلف لقمے جو اٹکے نظر آ رہے ہیں، ایسے لقمے جنھیں نگلنے والے نہ نگل سکتے ہیں نہ اگل سکتے ہیں، سرمایہ، محنت، مزدوری اور اسی قسم کے دوسرے معاشی مسائل کچھ ایسی بھیانک شکلوں میں جو دانت دکھا رہے ہیں کہ موجودہ عہد کا ہر صاحب نعمت اپنی اپنی نعمتوں یا اپنے اپنے سرمایہ کے حساب سے بدخواہیوں میں مبتلا ہے، کیا ان کو دیکھ کر بھی اس کا انکار کیا جاسکتا ہے کہ مرصاد والے رب کا "سوط عذاب" اور "غینی کوڑا" غیب سے سر نکال کر شہادت میں رہنے والوں کی پیٹھوں پر نہیں برسنے لگا ہے؟

اشتراکیت معاشی نظام نہیں | بہر حال قدری معیشت کا یہ پہلو زیر دستوں کی زیر دستیوں کا چونکہ بلکہ قدرت کا انتقام ہے | نتیجہ ہوتا ہے، اس لئے ان زیر دستوں کا مقابلہ تو وہی کر سکتا ہے جس کا ہاتھ سب سے اونچا ہے اور آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے زیر دستوں کو زیر دستوں پر چڑھاتا رہا ہے۔ بڑے بڑے گھروں کو کنکریوں سے دیکھا گیا ہے کہ اس نے پھوڑ دیا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ توڑ پھوڑ کے اس سلسلہ کا آغاز ہو چکا ہے، پھر جب آغاز ہو چکا ہے تو کسی نتیجہ تک بہر حال اس آغاز کا انجام پہنچ ہی کی رہے گا، غلطی میں مبتلا ہونے والوں کو غلطی جو کچھ بھی لگ رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ "انتقام" کو وہ واقعی انسان کا کوئی "معاشی نظام" سمجھ رہے ہیں، لیکن واقعات خود اس کی شہادت پیش کرتے چلے جائیں گے کہ انتقام صرف انتقام تھا، وہ دنیا کا کوئی واقعی نظام نہ تھا، اور نہ ہو سکتا ہے، انتقام کے دن جب پورے ہو جائیں گے، تب بنی آدم کی معیشت کا جو فطری نظام ہے وہ خود بخود قائم ہو جائے گا، یہی ہوتا رہا ہے اور دنیا کی عمر کی مدت اگر ابھی کچھ باقی ہے تو اللہ کی اسی سنت کا ظہور یقیناً ہو کر رہے گا۔ وَلَیْسَ بِجَدِّ لَسْتَهُ ۙ اللَّهُ بَیْدُ یَلَا۔

پس قدری معیشت کے اس پہلو کو چھوڑ کر میں اسی معیشت کی صرف اس شکل سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو بنی آدم کے صفات و کمالات کے قدرتی تفاوت کا لازمی نتیجہ ہے، اور شران میں جیسا کہ بار بار گزر چکا

اللہ یبسط الرزق لمن یشاء اللہ ہی کشادہ کرتا ہے جس پر چاہتا ہے

و یقدر۔ روزی کو اور وہی پنی تلی کر دیتا ہے

جس کی روزی کو چاہتا ہے۔

کے الفاظ میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ انسانی اعمال کی مصنوعی کوششوں کا نہیں بلکہ معاشی مدارج و مراتب کا یہ اختلاف حق تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ اور ارادہ باہرہ کا پیدا کیا ہوا قصداً و ارادۃً پیدا کیا ہوا ہے

جس کے مٹانے کی کوشش میں کامیابی اسی وقت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسانوں کے پیدا کرنے کا اختیار خود ہم انسانوں ہی کو مل جائے اور اس کے بعد آئندہ جتنے بچے بھی پیدا کئے جائیں، وہ اپنے تمام اندرونی و بیرونی صفات کے لحاظ سے برابر کر کے پیدا کئے جائیں، لیکن جب تک مختلف صلاحیتوں اور مناسبتوں کو ملے لے کر لوگوں کے پیدا ہونے کا یہ سلسلہ جاری ہے، معاشی طبقات کے تفاوت کے اس سلسلہ کو بھی کوئی روک نہیں سکتا۔ بہر حال معیشت کی اس قدرتی کیفیت میں زندگی گزارنے کے قرآن میں جو چند گروہ بتائے گئے تھے ان کا ذکر تو گزر چکا، اب دیکھیے کہ ان قرآنی ہدایات کو ٹھکرائے والوں کو جو ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں، وہ کیا ہیں، ٹھیک بسطی معیشت کی ذمہ داریوں سے لاپرواہی برتنے والوں کے متعلق قرآن میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے پیچھے شیطان لگا دیا جاتا ہے اور وہی شیطان آدمی کے صحیح احساسات کو زیر و زبر کر کے بالآخر ”معیشت ضنک“ اور تلخ زندگی انہیں شکار بنا دیتا ہے، یقین کیجئے کہ یہی حال ان لوگوں پر بھی طاری ہوتا ہے اور اسی کو طاری ہونا چاہیے جو قدری معیشت میں مبتلا ہونے کے بعد ان ہدایتوں سے استفادہ نہیں کرتے جس کی طرف رزق کے اس خاص حال میں راہ نمائی کی گئی ہے۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ۔

من اعرض عن ذکرى فان له معیشتہ ضنکا
جو کتر یا میری یاد سے تو قطعاً اس کے لئے ہی
معیشت (زندگی) ضنک ورتنگی سے بھری ہوئی

۱۔ بلکہ بغیر کسی جدوجہد کے جیسے معاشی مراتب مدارج کے اختلافات کا قصہ حیوانات وغیرہ میں ختم شدہ ہے، بنی نوع انسانی میں یہ جھگڑا بغیر کسی کوشش تقریر و تحریر، تحریک و انقلاب کے ختم ہو جائے گا، اب میں لوگوں کو کیا کہوں، اخباروں میں روز پڑھتے ہیں، اس قسم کی خبریں روز پڑھتے ہیں، مثلاً ایک دفعہ ڈاکٹر رائے نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”علی پور (کلکتہ کی عدالتوں کا محلہ) کی بار میں اس وقت نو سو پچاس وکیل وکالت کر رہے ہیں، جن میں صرف دس فیصدی ایسے ہیں جن کی آمدنی اوسط درجہ کی ہے اور بار سیال میں وکلاء کی آمدنی کا اوسط پندرہ بیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں، اور نہ معلوم کتنے وکلاء وکالت کی ڈگریاں رکھنے والے ایسے ہیں جو ایک ایک دانہ کو ترستے ہیں۔“ (سج ۳ - مارچ ۱۹۳۷ء)

یہ اس زمانہ کی رپورٹ بنگال ہی کی ہے جب اسی علی پور اسی کلکتہ اسی بنگال میں سی آر۔ داس جیسے وکلاء کی اوسط آمدنی اسی وکالت کی راہ سے جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے، تقریباً پچاس پچاس ہزار روپے تک پہنچ جاتی تھی۔

وکالت ظاہر ہے کہ ایک آزاد پیشہ ہے، اس میں محروم رکھنے اور پیچھے ڈھکیلنے کا الزام افسرانِ بالادست پر بھی تو نہیں لگایا جاسکتا، بلکہ کھلا ہوا قسمت آزمائی کا میدان ہے، ہر ایک ان میں گریجوٹ ہی ہوتے ہیں، وکالت اور قانون کی سند رکھتے ہیں، ان قدرتی صلاحیتوں کی کمی بیشی کے سوا آمدنی کے اس عظیم تفاوت کی توجیہ اور کیا ہو سکتی ہے جو باہم فطری طور پر افراد انسانی میں پائی جاتی ہیں اور بالآخر ان صلاحیتوں ہی کے تفاوت کا نتیجہ معاشی فرق مراتب کے نتائج کی شکل میں رونما ہوتا ہے ۱۲

اور

من لعیش عن ذکر الرحمن فیض له

اور جو آنکھیں چراتا ہے الرحمن کی یاد سے

شیطانا فصولہ قرین۔

پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے شیطان کو

پس ہو جاتا ہے وہ اس کا ساتھی۔

جیسا کہ بتا چکا ہوں، دونوں میں صحن (جو) کا لفظ عام ہے، جیسے بسطی معیشت والوں کو حاوی ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی یہی قاعدے منطبق ہوں گے جو اپنی قدری معیشت میں خدائی ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر زندگی گزارتے ہیں، باقی احساسات کے بگاڑنے کا یہ سلسلہ شیطان کس طرح شروع کرتا ہے، جہاں تک قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے ابتدا اس کی اس کیفیت سے ہوتی ہے جسے سورۃ الفجر ہی کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، یعنی

واما الانسان ذمما ابتلاه

اور انسان سو جب جانچتا ہے اس کو

سربہ فقد سر علیہ (سرقہ

اس کا مالک پس نپی تلی کہہ دیتا ہے اس پر

فیقول سربى اهانن۔

اس کی روزی کو تو کہتا ہے وہ کہ میرے

مالک نے مجھے رسوا اور ذلیل کر دیا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ اپنی قدری زندگی کے متعلق بجائے یہ خیال کرنے کے کہ یہ بھی ابتلائی اور امتحانی زندگی ہی کی ایک شکل ہے، اور جو ذمہ داریاں ایسی حالت میں آدمی کے سپرد کی گئی ہیں، ان کی تکمیل کی کوشش کرے، وہ یہ غلط خیال اپنے اندر قائم کر لیتا ہے کہ میرے پیدا کرنے والے نے قدری معیشت کی اس حالت میں مجھے مبتلا کر کے ذلیل اور رسوا کر دیا۔ اپنی قدری زندگی کے متعلق اہانت کا یہی خیال یقین کیجئے کہ شیطان کا وہ پہلا عمل ہے جسے مسلط ہونے کے بعد اپنے معمولوں پر وہ شروع کر دیتا ہے۔

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے عام حالات میں اگر غور کیا جائے تو غربت کی زندگی یعنی قرآن کی اصطلاح میں جس کا قدری معیشت نام ہے، یہ خیال کرنا کہ میری رسوائی اور ذلت کی وجہ بنی ہوئی ہے، واقعہ سے بہت کم تعلق رکھتا ہے، آخر ہم میں ہر ایک کو سوچنا چاہیے کہ اس کے سامنے ہر وقت ہر گلی کوچہ میں لاکھوں لاکھ تعداد میں غریب مرد و عورت جو گذرتے رہتے ہیں، کیا محض اس لئے کہ وہ بیمار غریب ہیں، یعنی ان کی آمدنی ان کی حاجت و ضرورت کے مطابق ہے، صرف اس لئے کون کس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، یہاں حال تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حالات ہی میں متفرق رہتا ہے، دوسروں کے سوچنے کا موقع ہی کسی کو کب ملتا ہے، اور اگر کسی کے حال کی طرف کسی وجہ سے توجہ بھی ہوتی ہے تو جہاں تک میں جانتا ہوں کسی کی قدری معیشت کا حال سن کر لوگ عموماً رحم ہی کھاتے ہیں، ان کے ذلیل و خوار ہونے کا خیال بھی کسی کو نہیں گذرتا۔ آخر غربت و فلاکت کی وجہ سے آدمی کا دوسروں کی نگاہوں میں رسوا اور ذلیل ہونا اگر ضروری ہوتا، تو آج دنیا کے بڑے بڑے

مذہبی پیشواؤں، یا علمی حلقوں کی سربر آوردہ ہستیاں جن میں عموماً قدری معیشت رکھنے والوں ہی کی اکثریت ہے، ان کی عظمت و احترام سے لوگوں کے قلوب کیوں معمور ہوتے۔

اور بعض دماغوں میں غریبوں کے متعلق اگر اس قسم کا کوئی گندہ خیال پایا بھی جاتا ہو، تو خود غریبوں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، کسی پاکباز، عفت مآب خاتون کو کوئی بد نظر خبیث الفطرت آدمی اگر بری نگاہوں سے دیکھتا ہے تو یہ گندگی دیکھنے والے کی ہے، یا اس عقیفہ خاتون کی جسے بری نگاہ سے دیکھا گیا، سعدی کا مشہور فقرہ

”الحمد للہ کہ مصیبتے گرفتارم نہ بہ معصیتے“

اس میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ افلاس و غربت اگر کوئی مصیبت بھی ہے، تو وہ صرف مصیبت ہے۔ کوئی معصیت یا کردار کی خرابی تو نہیں ہے، جس کی وجہ سے آدمی ذلیل خیال کیا جائے واقعہ تو یہی ہے کہ غریب آدمی کو ذلیل خیال کرنے والا دراصل خود ذلیل ہوتا ہے جس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ غریبوں کو ذلیل خیال کرنے والے علانیہ اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کر سکتے، اسی لئے نہیں کر سکتے اور نہیں کرتے کہ وہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ میرے اس خیال کو جو بھی سنے گا، بجائے غریبوں کے مجھ کو وہ ذلیل خیال کرے گا۔

پس حقیقت تو جو کچھ ہے وہ یہی ہے، لیکن قدری معیشت کی ذمہ داریوں سے جو منحرف ہو کر زندگی گزارتے ہیں، دیکھا یہی جاتا ہے کہ خواہ اس میں کوئی ذلیل خیال کرے یا نہ کرے لیکن وہ چوبیس گھنٹے اسی احساس اور خیال میں گھٹتے رہتے ہیں کہ میں اولادِ آدم کا ایک ذلیل ترین فرد ہوں، وہ بے چارہ تو یہ خیال کرتا ہے کہ میرا یہ احساس خود میری طبیعت کا احساس ہے اور ایک واقعہ کا احساس ہے، لیکن اب اس مسکین کو یہ کون بتائے کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے، اور جو واقعہ نہیں ہے بلا وجہ واقعہ کا رنگ دے کر اس کے سامنے وہ پیش کر رہا ہے اور شیطان کا سب سے بڑا کریم یہی تسویل و تزویر ہے۔ اور بات اسی نقطہ پر کب ختم ہوتی ہے، عزت و ذلت بلندی و پستی کا سارا معیار جس کے سامنے صرف روپیہ رہ گیا ہو، ایسا آدمی اگر ہر چیز سے الگ ہو کر صرف عزت و جلال کے اسی معیار و حید کے عشق میں ڈوب جائے تو جس غلط خیال کا وہ شکار ہو گیا ہو اس کا تو یہ ایک لازمی نتیجہ ہے، بسطی و قدری معیشت دونوں کو ابتلائی حالات قرار دیتے ہوئے سورۃ الفجر کی آیتوں کے بعد آخر میں دو فقرے جو پائے جاتے ہیں جن کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے، یعنی

وَقَالُوا لَا تَنْفَعُ الْثَرَاثُ ۚ كَلَّا لَمَّا وَ

مَجْئَیْهِمُ الْغَنَاءُ ۚ كَلَّا لَمَّا لَمَسُوا

میں نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ جیسے پہلے فقرے یعنی وَقَالُوا لَا تَنْفَعُ الْثَرَاثُ ۚ كَلَّا لَمَّا لَمَسُوا کا تعلق بسطیوں سے ہے، اسی طرح اگر دوسرا فقرہ یعنی وَمَجْئَیْهِمُ الْغَنَاءُ ۚ كَلَّا لَمَّا لَمَسُوا کا تعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ اس کا تعلق قدریوں سے ہے تو جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نظریہ ابتلائییت کے انکار کے بعد جیسے بسطیوں کا گروہ پانے کے بعد چاہتا ہے کہ مال دولت کے جس حصہ پر اس کا اقتدار قائم ہو گیا ہے، وہ اس کے اور اس کی نسلی دائرہ سے باہر نکلنے نہ پائے، قرآن نے جس کی تعبیر "تاکلون التراث اکلاماً" سے کی ہے، اسی طرح جو لوگ بسط کی اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، یعنی قدری رزق پاتے ہیں۔ ضروریات حیات میں صرف ہو جانے کے بعد جو سرمایہ کے کسی جز کو پس ماند نہیں کر سکتے۔ ان کا مال و دولت سے وہی تعلق پیدا ہو جاتا ہے، جو درد فراق، غم ہجر میں مبتلا ہونے والے عاشق مہجور و مسکین کو اپنے پچھڑے ہوئے معشوق سے ہوتا ہے، ایام ہجر میں عشق کا جذبہ جیسے عاشق مہجور کو ہر چیز سے توڑ کر صرف بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

کے مشغلہ میں غرق کر دیتا ہے۔ چونکہ "حب جم" کے معنی بھی یہی ہیں، یعنی ہر چیز سے الگ ہو کر کسی شے کے ساتھ لو لگانا یہی اس کے لغوی معنی ہیں، عربی محاورہ ہے کہ ہر طرف سے سمٹ کر جب پانی کسی گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے۔ جم الگسا کہ تالاب وغیرہ کے کسی ایسے حصہ میں جو سب سے زیادہ گہرا ہو اور اسی میں تالاب کا سارا پانی آخر میں جمع ہو جاتا ہو تو اس کو جہۃ الماء اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ پس قرآن کی یہ بیان کردہ کیفیت کہ "چاہتے ہو تم مال کو حب جم کی چاہ کے ساتھ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ وہی کیفیت ہے جس میں عموماً قدری معیشت رکھنے والے اس وقت مبتلا ہو جاتے ہیں جب بجائے امتحان و ابتلا کے وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ساری شرافتوں اور بلندیوں کا دار و مدار روپے ہی پر ہے، وہی باعزت ہے جو روپیہ والا ہے، اور بے عزت وہی ہے جو روپے سے خالی ہو، مشہور فارسی شعر

خوک باش و خرس باش و یاسگِ مردار باش ہرچہ باشی باش، لیکن اندکے زردار باش
کی ذہنیت جب کسی فرد یا قوم اور ملک پر مسلط ہو جاتی ہے تو اندکے زردار باش کے مشورے کی تعمیل کا موقعہ جن لوگوں کو نہیں ملتا، قدرتی طور پر ہر چیز سے الگ ہو کر اسی "زردار باشی" کو وہ اپنے وجود کا آخری نصب العین بنا لیتے ہیں، ٹھیک آج موجودہ مغربی تمدن نے جس حال کو دنیا میں پیدا کیا ہے ایسا حال کہ شاید تاریخ میں اس کی نظیر مشکل ہی مل سکتی ہے۔ کیونکہ "عشق مال و سرمایہ" اگرچہ کوئی نیا حادثہ نہیں ہے، قدری معیشت کو جس زمانہ میں بھی محسوس کرنے والوں نے اپنی اہانت کا ذریعہ محسوس کیا ہے۔ قدرتاً اس عشق کی آگ ان کو اپنے قلوب میں سلگانی اور بھڑکانی ہی پڑی ہے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں دل کے اس کیفیت کے اظہار کی عموماً لوگوں کو جرات نہیں ہوتی تھی، یا ہوتی بھی تھی تو کچھ جیسے بے لفظوں میں ہوتی تھی، آدمی صرف مال اندوزی یا زر آفرینی کا آلہ ہے اس کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے۔ یاد دہانی کے لفظوں میں اسی کی تعبیر آج کرنے والے ان الفاظ میں جو کہہ رہے ہیں کہ آدمی صرف پیٹ ہے یا فقط وہ روٹی ہے۔ پیٹ ہی کے لئے وہ جیتا ہے اور پیٹ ہی کے لئے مرتا ہے، روٹی ہی کے لئے قدرت نے انسانی نسل کو پیدا کیا ہے۔ اسی کا حاصل کرنا اور اسی کو حاصل کرتے ہوئے اپنی آخری سانس پوری کر لینی، یہی فقط ہی اس کے وجود کا سبب بڑا نصب العین ہے

جن بلند آہنگیوں کے ساتھ بغیر کسی شرم و حیا کے آج یہ سب کچھ بے بانگ دہل نہ سہی بے بانگ ریڈیو یا میکروو جو کیا جا رہا ہے، تقریروں میں، تحریروں میں چیخنے والے صرف ان ہی آوازوں کے ساتھ جو چیخ رہے ہیں، گلے پھاڑ پھاڑ کر جو چلا رہے ہیں، انسانیت کی تاریخ کا کوئی مؤرخ کسی قوم کسی ملک کے کسی دور کا مؤرخ کیا بتا سکتا ہے کہ زمین کے کمرہ پر بنی آدم کے گھرانوں میں اتنی ڈھٹائیوں اور انتہائی بے حیائیوں کے ساتھ کانوں کو کبھی پہلے بھی سنانے والوں نے یہ سنایا تھا، یا زبانوں پر اس قسم کے الفاظ آئے تھے شاید یہ قرآنی الفاظ

تعبون المال حیاً جملاً اور چاہتے ہو مال کو تم حبم کے ساتھ

کی علانیہ تفسیر ہے، اسی لئے ان حالات میں جو کیفیت دلوں میں پیدا ہوتی تھی زبانوں سے بھی اس کا اقرار کر دیا گیا، اور اس طور پر اقرار کر لیا گیا کہ آج ان الفاظ کے انکار کرنے والوں کو ہی مطعون ٹھہرایا جا رہا ہے، وہی درد رائے اور دھتکارے جا رہے ہیں، جو انسان جیسی بلند ہستی کو اتنا پست قرار دینے سے ہچکچا رہے ہیں۔

بہر حال انسانیت کی بلندی و پستی کا یہ فقہ بجائے خود ایک الگ فقہ ہے، جو خوک (سور) خمس (لہجہ) یا سگ مردار بنا کر نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اسی کو انہی چندوں یا درندوں کے مقام تک اتارنے کی کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس وقت میرے سامنے یہ بحث نہیں ہے میرے پیش نظر اس وقت جو کچھ بھی ہے، وہ صرف یہی ہے کہ قرآن کے نظریۂ ابتلا کا انکار کہیے، یا خدا کی ذمہ داریوں سے انکار کہیے، اس انکار کے بعد انسانی احساسات میں قدری معیشت کے متعلق جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، قرآن کی روشنی میں اسے ان لوگوں کے آگے رکھ دوں جو قرآن کو سمجھنا اور سمجھ کر اسی کی روشنی میں چلنا چاہتے ہیں، آپ نے دیکھ لیا کہ پہلی افتاد انسانی فہم پر اس سلسلہ میں جو پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ قدری معیشت کو لوگ اپنی اہانت و ذلت کا ذریعہ یقین کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد قدرتاً خواری و ذلت کی اس حالت سے نکلنے کے لئے مال اور سرمایہ کے اس حب شدید یا "عشق مفرط" کی آگ اپنے اندر بھڑکا لیتے ہیں، جس کی تعبیر قرآن نے "حب جم" سے کی ہے گویا بسطی معیشت والے جیسے نظریۂ ابتلائییت کے انکار کے بعد سرمایہ کے متعلق "اکھل لم" میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اسی طرح قرآنی اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدری معیشت والوں کو مال کے حب جم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ یہی قرآن سے بھی سمجھا جاتا ہے اور واقعات بھی اسی کی توثیق دیتے کر رہے ہیں، لیکن بات کیا اسی منزل تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے؟ اگر ختم بھی ہو جاتی تو جنہیں اپنی انسانیت اور اس کی قدرتی بلندیوں پر ناز ہے ان کا ایک معمولی ذہنی انقلاب کے ہاتھوں اتنا نیچے گر جانا یا گرانے والے کا ان کو اتنا نیچے گر ادینا درحقیقت کچھ کم سزا نہ تھی، لیکن کہنے والے کہہ سکتے تھے بلکہ کہہ رہے ہیں کہ اپنی بلندی و برتری کا یہ خیال انسانوں کا خود ساختہ ایک وہی خیال ہے، زمین پر چہلنے والے سوروں، جنگلوں میں گھوم گھوم کر شکار کرنے والے ریکھوں، گیلوں اور

کوچوں میں در بدر مارے پھرنے والے کتوں سے آخر آدم کے بچوں کو بلند و بالا کیوں خیال کیا جائے، کیوں سمجھا جائے کہ کھانا، پینا، مرجانا اس حیوانی نصب العین سے زیادہ انسانی وجود اپنے ساتھ کوئی اور اونچی نصب العین بھی رکھتا ہے، جیسا کہ قاعدہ ہے کہ قرآنی حجت ہمیشہ ”بالغہ“ یعنی آخری دروازے تک پہنچانے والی حجت ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں بھی کم از کم میرے نزدیک یہی طرز عمل اس نے اختیار کیا ہے،

مطلب یہ ہے کہ ”مال کے حب جم“ اور سرمایہ کا ”عشق مفراط“ جب ان طبقات پر مسلط ہو جاتا ہے جنہیں قدری پیمانے پر یہاں روزی مل رہی ہے، تو پھر اسے عشق مجھے لے چل اسے عشق کہیں لے چل

کے دوروں سے ان بیچاروں کو کون بچا سکتا ہے جو اپنے آخری محبوب کے وصال کی تنہاؤں میں تڑپتے اور ایڑیاں رگڑتے رہتے ہیں، قدری معیشت کی دشواریوں کو آسان بنانے کے وہ سارے ذرائع جن کی مذاہب نے تعلیم دی ہے، عشق کی اس آگ میں جل جھن کر بھسم ہو جاتے ہیں، اور وہی پیرانا معاشی پھوٹا

۲ ان نفع فی اموالنا ما نشاء اپنے اموال اور سرمایوں کو جہم چاہیں کریں

کا دماغوں میں نمودار ہوتا ہے، صلوات کہیے یا مذہب و دین ایمان و دھرم کا ”معاشی جدوجہد“ کی راہوں سے رشتہ توڑ دیا جاتا ہے۔ مگر قانون، عدو، الا حکم، صبر و توکل، دعا، التفرائی، الادنی، ترک مالا یعنی، الغرض وہ ساری ذمہ داریاں جو قدری معیشت میں الرحمن کی طرف سے عائد کی گئی ہیں، وہ بھلا دی جاتی ہیں، اپنے عشقی مطالبات کی تکمیل میں بے روک ٹوک لوگ مشغول ہو جاتے ہیں، بے آئینی کی اس زندگی میں زمین پر جس قسم کا فساد بھی پھوٹا پڑے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، معاشی مسائل کے متعلق حضرت شعیب علیہ السلام کی تمثیلی قوم جس نے اپنے اندر مال کے اسی حب جم کو پیدا کیا تھا، اسی قوم کو خطاب کر کے اللہ کے منادی حضرت شعیب علیہ السلام کے جو اس قسم کے الفاظ قرآن میں محفوظ کئے گئے ہیں،

و تقعدون بكل صراط توعدون اور بیٹھتے ہو تم ہر راہ پر دھمکاتے ہو لوگوں کو۔

یا فرماتے

ولا تقسدا فی الارض بعد اور نہ بگاڑ پیدا کرو زمین میں اس کی اصلاح چھا۔

”شعیبی مواعظ“ کے ان فقرات کی تفسیر اگر کوئی پڑھنا چاہے، تو ان ممالک میں جا کر پڑھ سکتا ہے جو کہنے کی حد تک تو سب سے بڑے آئینی ممالک ہیں، بلکہ آج تو دنیا کی ”آئین گری“ اور ”آئین سازی“ کا کام وہی کر رہے ہیں، اور انسانی اخلاق کی تصحیح کا وہ بے خطا نسخہ جس کے متعلق یاد پڑتا ہے کہ

جاہل ہندوستان کا تذکرہ کرتے ہوئے سر ونسٹن چرچل نے لکھا تھا،
 ”میکالے جیسے مدیر نے یہ اعلان کیا کہ تعلیم چوں کہ بد امنی اور قانون شکنی کا
 بہترین اور یقینی علاج ہے۔ اس لئے انگریزی گورنمنٹ کے لئے قطعی ضروری تھا
 کہ وہ ہندوستان کے ذہنی خلاصی کی کوشش کرے۔“

بد امنی اور قانون شکنی کا یہی بہترین اور یقینی علاج تعلیم سے بھی جن ممالک کے کوچہ و برزن پٹے ہوئے
 ہیں، لیکن اور تو اور آئینیت اور تعلیمیت کے سب سے بڑے مرکز امریکہ میں قدری معیشت رکھنے
 والے جو کچھ کر رہے ہیں، ہر راہ پر بیٹھ کر ”مال کے جب جم“ کے تقاضوں کی تکمیل میں جن جن ہتھکنڈوں
 سے وہ کام لے رہے ہیں، کس دن کے اخبارات میں اس کی خبریں نہیں چھپتی ہیں، آج تو ان ممالک
 میں جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے۔ اسے تو جانے دیجئے۔ جب امن کے دن تھے،
 عافیت کا دور دورہ تھا، اخبار پانیر نے صرف امریکہ کے متعلق لکھا تھا کہ،

”امریکہ میں سالانہ اوسطاً ایک لاکھ ڈاکے پڑتے رہتے ہیں، پانچ لاکھ کے قریب
 چوریوں کی تعداد ہے،“ (پانیر الہ آباد۔ ۱۱۔ جنوری ۱۹۳۱ء)۔

یہ ۱۹۳۱ء کی رپورٹ ہے، اس کے بعد
 ”۱۹۳۱ء میں دیکر شیم کمیشن نے جو رپورٹ امریکہ کے متعلق حکومت کے
 آگے پیش کی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ چوریوں نقب زنیوں جعل سازیوں
 غبن وغیرہ جرائم کی تحقیقات کے سلسلہ میں حکومت پونے تین ارب روپے
 خرچ کرتی ہے۔“ (سیچ ۲۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء)

اور یہ تو خیر ایک ملک کا حال ہے، اسی اخبار سیچ میں ملک نہیں، صرف ایک شہر الموسوم بہ لندن کے
 متعلق یہ روئداد شائع ہوئی تھی،

”کھلے بندوں اس شہر (لندن) میں جو ڈاکے پڑے ۱۹۲۹ء میں ان کی تعداد
 ساٹھ اور ۱۹۳۰ء میں ستھتر تھی، اور ۱۹۲۹ء میں نقب زنی کے ذریعے سے
 دو ہزار پینتالیس اور ۱۹۳۰ء میں اسی طریقہ کو کام میں لا کر دو ہزار آٹھ سو بیسٹھ
 آدمیوں نے چوری کی، راہ گیروں کو ڈرا دھمکا کر جن لوگوں نے شہر لندن
 میں روپے وصول کئے ۱۹۲۹ء میں ان کی تعداد (۲۰) اور ۱۹۳۰ء میں (۴۳)
 تھی“ (سیچ ۱۸۔ ستمبر ۱۹۳۱ء)

اور یہ وہ واقعات ہیں جن کا سراغ پولیس نے لگایا، ورنہ پولیس کے دائرہ اطلاع سے باہر جو حوادث
 اس سلسلہ میں پیش آئے ہوں گے۔ ان کو اسی پر قیاس کیجئے، اور سیچ تو یہ ہے کہ جس لندن اور تہذیب نے
 مردوں سے آگے بڑھ کر عورتوں تک کو اتنا جبری بنا دیا ہو، جیسا کہ امریکہ کے ایک اخبار
 اینونگ گریفک نے لکھا تھا،

سارے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک تعلیم یافتہ حسین لڑکیوں
نے قزاقی اور راہ زنی کا پیشہ شروع کر دیا ہے..... روز روشن میں یہ
حسین ڈاکو ریا اور بندوق سے مسلح ہو کر موٹروں پر بیٹھ کر بینکوں کو لوٹنے
لگی ہیں، (اخبار سچ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء)

بہر حال قرآنی آیت

وَتَقْعَدُونَ بَيْنَ يَدَيْهِمْ حَتَّىٰ تَأْتِيَنَّهُم بَشِيرٌ أَوْ نَذِيرٌ

اور بیٹھتے ہو، ہر راہ پر دھمکاتے ہو۔

کی تفسیر جن نت نئی بلکہ بعض ناقابل تصور شکلوں میں آج دنیا کے ان ممالک میں ہو رہی ہے، جہاں
کے قدری معیشت رکھنے والوں میں ”مال کا حب جم“ خود ان ہی کے راہ نماؤں، اور حرص و طمع، زر طلبی،
کے اپدیشکوں نے پیدا کر دیا تھا، انھیں کون گن سکتا ہے، معصوم بچوں کو اڑا اڑا کر لے بھاگنا، اور
ان کی ماؤں اور باپوں سے یہ دھکی دے کہ بڑی بڑی رقمیں طلب کرنی کہ اگر روپیہ نہ دیا جائے گا
تو ان کا بچہ ذبح کر دیا جائے گا، پھر جن بد قسمت ماں باپوں نے ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی، بجائے
زندے بچے کے اپنی آنکھوں سے بچے کی سرکٹی لاش انھیں دیکھنی پڑی۔ اُسے دن جہاں یہ واقعات
شہروں اور قصبوں کے لئے اب نئے نہیں رہے ہیں، حیدر آباد کے پانگاہی امیر نواب ظہیر یار جنگ ہوا
نے اپنے سفر نامہ امریکہ و یورپ میں لکھا ہے کہ چنگا کو کے میئر بلدیہ نے خصوصیت کے ساتھ بلا کر ان پر
یہ اصرار کیا کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے چاہیے کہ کسی خفیہ آدمی کو مقرر کر لیں، ورنہ امریکہ کے ڈاکوؤں
سے ممکن ہے کہ ان کو گزند پہنچ جائے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے سیاہوؤں کے
لئے ایسا کرنا اپنی جان کی حفاظت کے لئے ضروری ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئین و قانون
تعلیم رکھنے والے اس ملک کی کیا حالت ہو چکی ہے، سالانہ اربوں کی رقم خرچ کرنے کے باوجود اس
ملک کی حکومت لوگوں کی جان و مال کی حفاظت سے معذور ہو چکی ہے۔ اور تعلیم جسے آئین شکنی کے
انسداد کا یقینی نسخہ باور کرایا گیا تھا، جہاں تک واقعات اور خبروں سے معلوم ہوتا ہے، وہی تعلیم
بد امنی اور قانون شکنی میں امداد پہنچا رہی ہے، ناولوں افسانوں کے ذریعہ لوگ نت نئے جرائم
کی تدبیروں کے نقشے پیش کر رہے ہیں، سینماؤں، اور متحرک تصاویر کی راہ سے ان ہی جرائم کو کر کے
دکھایا جاتا ہے، اور جو باتیں سوچی بھی نہیں جاسکتیں، بتایا جا رہا ہے کہ آدمی چاہے تو یہ بھی کر سکتا
ہے، فریب دہی کے سائنٹیفک طریقوں کا رواج اس ملک میں بڑھ رہا ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ جن ملکوں کے اہل قلم ارباب تصنیف و تالیف تک کے متعلق ایسی باتیں
سنی جاتی ہوں، اگرچہ واقعہ تو جزئی ہے۔ لیکن جزئیات ہی سے کلیات کا علم حاصل ہوتا ہے،
لندن کے اخبار نیو آف ورلڈ میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ چارلس گارڈن نامی ایک صاحب جن کا
شمار انگلستان کے ممتاز مصنفین میں ہے، متعدد مقبول عام کتابوں کے مؤلف ہیں، اپنی کتابوں سے
ہزار ہا روپے دو تین سال کے عرصہ میں انھوں نے اکٹھا کر لیا تھا، ان ہی مصنف صاحب کے متعلق

یہ واقعہ چھپا تھا کہ ایک دن جب سڑک پر سناٹا تھا، انگلستان کا یہ مصنف تعلیم یافتہ گھر سے باہر نکلا قسمت کی ماری ایک میم صاحبہ سڑک سے گزر رہی تھیں، گلے میں ان کے ایک ہار پڑا ہوا تھا، جس کی قیمت پندرہ سولہ ہزار روپے سے کم نہ تھی، اس قیمتی ہار والی میم صاحبہ کو تنہا پاکر جناب مصنف صاحب نے ہار پر ایک جھپٹا مارا، غریب عورت کیا کر سکتی تھی، وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، اور ہار کو گلے سے اتار، مصنف صاحب یہ جا وہ جا، گلیوں میں غائب ہو گئے، لیکن میم نے بھی پیچھا نہ چھوڑا ”چور چور، اچکا اچکا“ کہتے ہوئے وہ بھی ان کے پیچھے دوڑنے لگی، سامنے راہ گیر جو آرہے تھے، انھوں نے اس تعلیم یافتہ مصنف چور کو پکڑ لیا۔ اتنے میں پولیس آگئی، چور گرفتار ہو گیا۔ اچانک کر لے بھاگنے کے جرم میں ڈیڑھ سال کی سزا اس چور مصنف کو سبکدوشی پڑی (ماخوذ از میچ بحوالہ نیوز آف ورلڈ ۱۳- دسمبر ۱۹۳۱ء) بدقسمتی سے یہ چور مصنف صاحب پکڑے گئے، اس لئے بات کھل گئی۔ ورنہ خدا ہی جانتا ہے کہ ”مال کے حبِ جم“ کے عاشقوں سے بھرے ہوئے اس ملک میں آئین شکنی کا بے خطا اور یقینی علاج کن کن نتائج کو پیدا کر رہا ہے۔

اور یہ حال تو ان کا ہے جن میں جرائم کی ان راہوں پر بیٹھنے اور قسمت آزمائی کی ہمت پائی جاتی ہے، لیکن قدری معیشت رکھنے والوں میں ناکام عاشقوں کا وہ گردہ جو کرنا تو سب کچھ چاہتا ہے، لیکن کچھ کر نہیں سکتا، اس کے درد کا افسانہ کون سن سکتا ہے، کہتے ہیں، اور کہتے کیا ہیں خود قرآن میں ہے کہ اپنی جاہلیت کے دور میں عرب کی سرزمین کا یہ عام رواج تھا کہ محض معاشی دشواریوں کا غالب آنے، اور مال کے ”حبِ جم“ کے جذبہ کی تسکین کے لئے وہاں کے باشندے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھی ذبح کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے، قرآن کو اسی رواج بد کے انسداد کے لئے ایک سے زائد مقام پر

ولا تقتلو ۲۱ ولا دکم خشية اور نہ گردن مارو اپنی اولاد کی افلاس

کے اندیشے سے۔

۲ ملاق۔

کا حکم نافذ کرنا پڑا، اور جہاں تک عرب کی تاریخ کا تعلق ہے، قرآنی حکم کے بعد پھر سنگدلی اور قساوت قلبی کے

۱۵ عام طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ جاہلیت میں عرب والے صرف اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور اس لئے کر دیتے تھے کہ اپنی لڑکی کو کسی اجنبی مرد کی جو رو بننے پر ان کی غیرت اور جاہلی حمیت آباد نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ یہ ظلم اسی وجہ سے روار کھا گیا ہو۔ گو اس کا کوئی تاریخی ثبوت اب تک مجھے نہیں ملا ہے، لیکن لڑکیوں کے سوا لڑکوں یا عام اولاد لڑکے ہوں یا لڑکیاں ان کے قتل کے جاہلی دستور کا ذکر تو خود قرآن میں ایک سے زائد جگہ پر کیا گیا ہے، جہاں اس کا ذکر ہے وہیں قتل اولاد کو اس سفاکانہ رسم کی وجہ وہی اور صرف وہی بیان کی گئی ہے جسے آج برتھ کنٹرول کے جواز بلکہ وجوب کے سلسلہ میں عموماً پیش کیا جاتا ہے یعنی معاشی دشواریوں کے حل کا ایک ذریعہ قتل اولاد عرب کے جاہل اسی طریقہ سے قرار دیئے ہوئے تھے جیسے آج ضبط تولید کے رسم کو بھی دشواریوں کی اسی قسم کے حل کا ذریعہ ٹھہرایا جا رہا ہے۔ پڑھئے قرآن میں پڑھئے قتل اولاد کی ممانعت کا جہاں بھی ذکر ہے، وہاں اسی کے ساتھ من خشية ۲ ملاق (افلاس کے اندیشہ) کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے ۱۲

اس جانگداز فعل کو اس ملک میں اب تک تو دہرایا نہیں گیا ہے، لیکن یہ تو جاہل عرب اپنی جاہلیت کے دور میں کرتا تھا، آج تعلیم یافتہ یورپ و امریکہ میں پیدا ہونے کے بعد نہ سہی، پیدا ہونے سے پیشتر ہی بچوں کے گلے ماؤں کے پیٹ ہی میں برتھ کنٹرول وغیرہ کی مختلف تدبیروں سے جو گھونٹے جارہے ہیں، کیا اس کی وجہ اس کے سوا اور بھی کچھ ہے کہ دوسروں سے چھیننے کی ہمت جو اپنے اندر نہیں رکھتے "مائی سب جم" کے ان عاشقوں نے اپنے قدری سرمایہ کو بچانے کی یہ تدبیر پیدا کی ہے کہ قدری معیشت کی پریشانیوں میں جن سے اضافہ کا اندیشہ ہے اپنے ان بچوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی زندگی کے حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

اور قصہ کیا یہیں ختم ہو جاتا ہے، آج نہیں کہ آج تو "دشمن کشی" کے مشاغل میں یہ ممالک مشغول ہیں، لیکن ان ہی دنوں میں جب تک "دشمن کشی" کا یہ قصہ نہیں چھڑا تھا، کون نہیں جانتا کہ قدری معیشت ہی کے متعلق ان ممالک کے باشندوں کے غلط احساسات نے ان کے لئے "اولاد کشی" ہی نہیں کہ "اولاد" پھر بھی غیر ہی ہوتی ہے، بلکہ "خود کشی" کے فعل کو بھی ان کا ایک محبوب فعل بنا دیا تھا، ان ہی دنوں کے اخباروں کی یہ خبریں کن سے پوشیدہ ہیں کہ بعض علاقوں میں "خود کشی" کو آسان بنانے کے لئے باضابطہ انجمنیں اور کلب قائم تھے، رسالے نکلتے تھے جن میں لوگوں کو یہ بتایا جاتا تھا کہ یہ سہولت تمام اپنی زندگی کے قصہ کو وہ کس طرح ختم کر سکتے ہیں، پولینڈ، اسٹریا وغیرہ کا نام اس سلسلہ میں سب سے آگے تھا۔

۱۹۲۶ء - مارچ کی اشاعت میں سنڈے اکسپریس اخبار میں بریگیڈ ہیرو گارڈن کا ایک بیان "خود کشی کے واردات" کے متعلق شائع ہوا تھا، جس میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ ان کی رائے میں خود کشی کا سب سے بڑا سبب خانگی اور مالی دشواریاں ہیں" (سیچ ۱۱۔ اپریل ۱۹۲۶ء)

بچوں کہ ہیرو گارڈن کے مطالعہ کا خاص مضمون خود کشی کے واردات ہی تھے، اس لئے ان کے بیان کو بہت اہمیت دی جاتی تھی، اسی بیان میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ "ہر ہفتہ اوسطاً آٹھ آدمی زبانی یا تحریراً مجھے اپنے ارادہ خود کشی سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے جو خود کشی پر آمادہ رہتے ہیں مگر زبان سے اقرار نہیں کرتے ان کی تعداد انگلستان میں ہر سال پانچ ہزار تک پہنچتی ہے" (اخبار مذکور)

دیکھا آپ نے نظریہ ابتکائیٹ کا انکار قدری معیشت میں بھی بالآخر لوگوں کو کس چیز پر راضی ہونے کے لئے مجبور کرتا ہے انہوں نے اپنی قدری زندگی کا رشتہ جب خدا سے توڑا، تو اس رشتے کے توڑنے کے جو لازمی نتائج ہیں ان سے اپنے آپ کو وہ کیسے بچا سکتے تھے، یہی لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن میں پوچھا گیا ہے۔

ومن یظن ان لن ینصرہ اللہ
فی الدنیا والآخرۃ
فلیمد بسبب الی السماء
ثم لیقطع فلینظر هل ینھبن
کیدہ ما یغیظ۔
اور جو خیال کرتا ہے کہ نہیں مدد کرے گا
اللہ اس کی دنیا میں اور آخرت
میں تو تالنے وہ ڈوری کسی
بلند سی میں (پھر سچا منسی لگا کر اس کو
کاٹ دے اور دیکھے کہ یہ اس چال سے

کیا اپنے دل کے غم و غصہ کا ازالہ وہ کر پایا،
اس موقع پر ایک اور شخصی واقعہ کا ذکر شاید اس قرآنی اشارے کے سمجھنے میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے
مولینا عبد الماجد دریا آبادی نے ایک ”مغربی خاتون“ جس کا نام مسز کینسن تھا
اسی کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ

”یہ ایک حسین عورت تھی ۲۹ سال کی جوان عمر، شوہر موجود تھا۔ اولاد بھی
ہو چکی تھی، موجود تھی، شادی پر صرف پانچ سال گزرے تھے۔“

مولینا کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی اور عنفوان شباب کے زمانہ میں ”فلم اسٹار بننے کا موقع
بھی مل چکا تھا لیکن آخر چند سے ہٹ کر ایک کے ہو رہے تھے اس نے فیصلہ کیا تھا۔ اب اسباب کیا تھے
لیکن جیسا کہ دستور ہے، رزق جس پیمانہ پر اس کے لئے مقدر ہوا تھا وہ قدر کا پیمانہ تھا، سینما کی
زندگی کی رنگ رلیوں کے بعد قدری معیشت کا یہ حال اس کے لئے ناقابل برداشت بن گیا، جس تمدن
و تہذیب میں وہ پیدا ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ خدا اور اس کی نصرتوں سے مایوس تمدن اور مایوس تہذیب
تھی، ایسی حالت میں جو تحریری فیصلہ اس نے کیا اسی کو پیش کرنا میرا مقصود ہے۔ اس کی خود
نوشتہ تحریر کا ترجمہ ہے۔

”میں مالی مشکلات سے جن کا کوئی حل نہیں مجبور ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی
ہوں، میری آمدنی اتنی رہی جس سے خود میری اور میری بچی کی گذر ہو سکے،
شوہر سے میرا افتراق ہو چکا ہے۔ میری ایک اولاد کی وہ پرورش کر رہا ہے،
میرے دوست و احباب ایسے موجود ہیں جو مجھے مالی امداد دے سکتے ہیں، لیکن
اس کے بعد ان کے دلوں میں میری محبت اور قدر باقی نہ رہے گی۔“

اس تحریری فیصلہ کے بعد الہی اعانتوں اور خدائی نصرتوں سے اس مایوس تمدن میں پیدا ہونے والی
اس عورت نے کیسی عجیب بات ہے کہ جس کا قرآن میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی فلیمد بسبب الی السماء
(چاہئے کہ چھت میں رسی لٹکائے) ثم لیقطع (پھر اسے کاٹ دے) گویا اسی حکم کی تعمیل اور تجربہ کی
راہ بتاتے ہوئے اپنا اور اپنی بچی کا اس نے خاتمہ کر دیا، لیکن جیسا کہ قرآن میں پوچھا گیا ہے۔

فلینظر هل ینھبن کیدہ
ما یغیظ۔
پھر دیکھے کہ کیا اس چال نے بھی اس کے
دل کے غم و غصہ کا ازالہ کیا؟

اس کے دل میں بھی اس کا خیال آیا، مردہ صغیروں میں زندگی کے بعض جراثیم موجود ہوتے ہیں، خصوصاً موت کے وقت کسی نہ کسی حد تک ان زندہ جراثیم کی حرکت کا احساس ہوتا ہے، اسی احساس کو دبانے کے لئے اس عورت نے یہ بھی لکھا تھا،

”میں اپنی بچی کو بھی اپنے ساتھ ختم کئے دیتی ہوں، اس لئے بھی ختم کرتی ہوں کہ اگر وہ حسین نہ نکلی اور میرے خیال میں وہ حسین نہیں ہے۔ تو کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں، میں ہی اس بچی کو وجود میں لائی تھی، اور میں ہی اس کو ختم بھی کر دیتی ہوں،

جو سوالات اس کے دل میں اٹھ رہے تھے، معاذیر کے ان ہی پردوں کو ان پر ڈال رہی تھی، آخر میں اس نے یہ بھی لکھا تھا،

”مجھے یقین ہے کہ میں اپنی اور اپنی بچی کی جان لینے میں حق بجانب ہوں، اخباروں میں چھپتا رہتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے، خیر اس زیادتی سے بقدر دو عورتوں کے تو کمی ہو ہی جائے گی۔

لیکن ظاہر ہے کہ دم نکلنے کے بعد اس کی یہ ساری چالیں اور اس کا کید قطعاً اس کے لئے نفع بخش نہ ہوا نہ ہو سکتا تھا، جیسا کہ موت سے پہلے کی زندگی جو الرحمن کے ذکر سے الگ ہو کر گذر رہی تھی۔ اس کے متعلق اس نے لکھا تھا کہ ”میں نے زندگی کو اپنے حق میں ایک مصیبت پایا، میری زندگی کا کوئی حصہ چین سے نہ گذرا۔ میں نے مردوں کو زندہ پایا، کوئی مرد اپنی غرض کے بغیر مجھے پوچھتا بھی نہیں، اس لئے اس بچی کو میں اس مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی!

من اعرض عن ذكرى
فان له معيشة ضنكا۔

اور جو کترا یا میری یاد سے اس کے لئے ہی
میشیت ضیق اور تنگیوں سے بھری ہوئی۔

کی یہ کتنی کھلی تفسیر اور اس کی تصدیق کی کتنی واضح شہادت ہے۔

حقیقت تو یہی ہے کہ بجائے ابتلا و امتحان کے موجودہ زندگی اور اسی کی راحتوں اور نعمتوں کو اول و آخر یا ان کر خدائی ذمہ داریوں سے بے پروا ہو کر جو جیتے ہیں، اگر چہ بہ ظاہر وہ بھی جیتے ہیں، لیکن سچ پوچھیے تو وہ ہر وقت موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہتے ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں ایک جوان او حسین عورت کو جوانی اور بہار کے دن جس نے ہر قسم کے قیود سے آزاد ہو کر گزارے، سینما کے افق پر ستارہ بن بن کر چمکتی رہی، لیکن وہی اقرار کرتی ہے کہ

میں نے زندگی کو اپنے حق میں مصیبت پایا، میری زندگی کا کوئی حصہ چین سے نہیں گذرا۔

۱۵ اشارہ قرآن کی مشہور آیت کی طرف یعنی بل الا انسان علی نفسه بصيرة ولو القى معاذیرہ (بلکہ آدمی اپنے آپ کا دیکھنے والا ہے خواہ اس پر عذروں کے پردے ہی کیوں نہ اڑھاتا چلا جائے ۱۲

کوئی حصہ کا لفظ قابل غور ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ بسطی اور قدری معیشت کے دونوں حالات میں معیشت فنک اور تلخ زندگی ہی وہ گزارتی رہی، یہی اس کا اعتراف ہے اور اس کی زندگی کے دونوں کے تجربہ کا یہ آخری نتیجہ ہے۔ آخر دونوں کو دنیاوی دولت و ثروت کے ساتھ جب اس طرح جوڑ دیا جائے کہ وہی سب کچھ بن کر رہ جائے، نہ ہونے کی صورت میں ہونے کے ولولے اور جذبات اور ہونے کی صورت میں زوالی لغت کے اندیشے اور خطرات اس قسم کے نفوس کے لئے جس طرح سوہان روح بنے رہتے ہیں، ان کا اندازہ بہ نسبت دوسروں کے خود ان ہی کو زیادہ ہو سکتا ہے اخبار سچ ہی ہیں ایک دفعہ دنیا کے سب سے بڑے ہنسوڑ، خود ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے والے نقال چارلی چاپلن کے متعلق یہ خبر امریکن ویورپین اخبارات کے حوالے سے چھپی تھی۔ مولینا عبدالماجد صاحب نے لکھا تھا۔

”پچھلے دنوں انگلستان و امریکہ کے جتنے اخبار موصول ہوئے۔ سب میں غم کا یہ افسانہ موجود تھا، یعنی چارلی چاپلن کی لیڈی صاحبہ مسز چاپلن نے اپنے شوہر نامدار پر دعویٰ دائر کر دیا جو ہر طرح کے گفتہ و ناگفتہ الزامات پر شامل ہے، اور جس کی بنا پر چارلی چاپلن کی برسوں کی کمائی، لکھو کھارویہ کی جائداد خطرے میں ہے۔“

مولینا نے اس کے بعد جذبات لکھی تھی وہی مستحق ہے کہ ذرا دیدہ عبرت و بصیرت سے اسے پڑھا جائے، لکھا تھا، ان راویوں کے بیان کے بموجب اب چارلی کے جسم پر بہ تکلف لباس کی جگہ چیتھڑے لگے ہوئے ہیں، چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں، صورت پر وحشت برسنے لگی ہے، پیرانہ سالی کے آثار اس پر طاری ہو گئے، صورت اتنی بدل گئی کہ پہچاننا دشوار ہے۔

آخر میں نیوز آف ورلڈ لندن کے حوالے سے مولینا نے نقل کیا تھا،

”کل جو دنیا کا زندہ ترین دل تھا، وہ آج دنیا کا مردہ ترین شخص ہے (سچ ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء)“

اللہ اللہ جو اپنے چہرے اور اس کی کیفیات کو دل کے حالات سے جدا رکھنے کی عمر بھر مشق کرتا رہا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مال کے حب جم اور سرمایہ کے ”عشق مفرط“ نے اس کو کتنا متاثر کیا تھا کہ مصنوعی حالات کے طاری کرنے کی بھی ساری مہارت غائب ہو گئی اور جو آگ اس کے دل میں بھری ہوئی تھی اسی کے شعلوں نے چہرے کی ساری مصنوعی بشاشتوں کو جلا کر خاک سیاہ بنا دیا، اور یہ قدری معیشت میں مبتلا ہو جانے کے خطرے، صرف خطرے کے احساس کا اثر تھا، پھر اسی سے اندازہ کیجئے ان مسکینوں کی نفسیاتی کیفیتوں کا جو واقعی ان ممالک میں قدری زندگی گزار رہے ہیں اور گزارنے پر مجبور ہیں، نظریہ ابتلائییت کا انکار کر کے ان کے مفکرین اور راہ نمائوں نے جن ذہنی اور فکری انگاروں، دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹنے کے لئے ان کو چھوڑ دیا ہے، معاذ اللہ اس کی سوزش و تیش کا کوئی ٹھکانہ ہو سکتا ہے

باہر کی دوزخ کا انکار یقین کیجئے کہ ایسوں کے لئے خود ان کے اندر دوزخ بن کر بھڑک اٹھتا ہے، بنانے والے نے آدمی کی فطرت یوں ہی بنائی ہے، ان ہی خصوصیتوں کے ساتھ بنائی ہے، قدری معیشت کا وہ حال جس میں انسان کا خدا اور خدا کی مشیت خدائی رحمت و نصرت سے رشتہ توڑ دیا گیا ہو، قدری زندگی کو بزور بسطی زندگی سے بدل دینے کا سارا اقتدار و اختیار جہاں خود انسان ہی کے سپرد کر دیا گیا ہو، وہی جس کی تعمیر اس زمانے میں یہ کی جاتی ہے کہ اپنی تقدیر کا معمار ہر شخص بذات خود ہے، کامرانوں کو تو اس وقت جانے دیجئے، میں ذکر ان لوگوں کا کر رہا ہوں جو یہ سب کچھ سیکھ کر سکھا کر پھر بھی اپنی تقدیر کی تعمیر میں ناکام رہتے ہیں، اور حالات ان کو ناکام رہنے پر مجبور کرتے ہیں وہی جن کے قلبی انگاروں اور باطنی جہنم کو ٹھنڈی کرنے کے لئے آج اشتراکیت کا جھنڈا اڑایا گیا ہے سرمایہ داری اور سرمایہ بے زاری کی اس کش مکش کا انجام کیا ہوگا، ابھی تو وہ سامنے نہیں ہے، لیکن سوال ان سے ہے جو اس وقت جل رہے ہیں، اور ان سے پہلے جل جل کر جن بیچاروں نے اپنی قدری زندگیوں کو دوزخ بنا کر گزاری ہے، ان کے ساتھ یقیناً ہی کیا گیا کہ دماغ سے دوزخ کا خیال نکال کر ان کے دلوں میں دوزخ بھر دی گئی، اس وقت تک بھری ہوئی ہے۔

حالانکہ میں سچ کہتا ہوں، پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہی قدری معیشت جو انسانیت کے لئے آج جہنم بنی ہوئی ہے۔ ابتلائی نظریہ کی راہ نمائی میں اسی زندگی کو جنہوں نے گزارا ہے اور آج بھی خدا کے فضل سے ایک بڑی تعداد زمین کے اس کرہ پر اسی زندگی کو گزار رہی ہے بخوشی و سکون گزار رہی ہے، اگر اپنی زندگی کو وہ جنت کی زندگی نہیں بنا سکے ہیں تو اتنی بات یقینی ہے کہ اس جہنم میں بھی انہیں جلنا نہیں پڑا ہے جس میں جہنم کے انکار کرنے والوں کو آج جلتے بھنتے کڑھتے اور کراہتے دانت پیستے دیکھا جا رہا ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو جس جنت کو آج خیال صرف خیال بٹھرایا جا رہا ہے، میں تو دیکھ رہا ہوں کہ اس جنت کے خیال نے بھی ان بہتوں کی زندگیوں کو جنت بنا دیا ہے، انسانی آبادیوں میں آج بھی اگر ڈھونڈھا جائے تو گو ان کی تعداد گھٹ چکی ہے اور گھٹائی چلی جا رہی ہے لیکن پھر بھی آپ کو ایسے افراد ان ہی انسانوں میں مل جائیں گے جن کی زندگی کو جنت کے اسی خیال ہاں صرف خیال نے جنت بنا رکھا ہے، دوسروں کو اختیار ہے خواہ وہ کچھ ہی سمجھیں، لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں اور ان لوگوں کو جب کبھی دیکھا ہے تو ہمیشہ یہی اثر دل میں پیدا ہوا ہے کہ جس کا خیال بھی جنتی زندگی بنانے کی ضمانت اپنے اندر رکھتا ہے، اسی جنت کی واقعی حقیقت اپنے اندر مسرت و نشاط کے کن سمندروں کو سمیٹے گی۔

لوگوں نے سمجھا نہیں ورنہ وہی الدین یا مذہب کا اور جس کے نتائج کا براہ راست تعلق الآخرۃ سے سمجھا جاتا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ مذہب اور مذہبی کاروبار کے نتائج کا حقیقی تعلق ہے بھی آخرت ہی کے ساتھ، لیکن اصلانہ سہی ذیلی طور پر اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دنیا کی زندگی میں بھی دین یقیناً انقلاب پیدا کرتا ہے۔ یہ دیکھا جا رہا ہے، انقلاب اور کیسا انقلاب!

تجربہ شاہد ہے کہ دین کی دوزخ کا خوف جس حد تک جس کی زندگی پر مسلط ہوتا چلا گیا ہے، اسی حد تک دنیا کی دوزخوں کا دکھ بھی اس کے لئے سکھ کی شکل اختیار کرتا چلا گیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا یہ فقرہ

من ۱ یقیناً صارت قون بہ
علینا مصائب ۲ الدنیا
اے پروردگار! اضافہ فرمائے میرے
یقین کی قوت میں جس کے ذریعہ سے دنیا
کی مصیبتیں ہلکی پڑتی چلی جاتی ہیں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا یہی مطلب ہے اور مجسہ یہی حال دین کی جنت کا بھی ہے کہ جس کا جتنا زیادہ اعتماد دین کی اس جنت پر بڑھتا چلا گیا ہے، دنیا ہی میں اس پر جنت کے دروازے کھلتے چلے گئے ہیں۔
اب لوگوں کو کیا کہیے وہ آدم کی اولاد سے نیکی اور نیک کرداری کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ان میں ہر ایک کو جو امانت بھی سپرد کی جائے بغیر کسی خیانت کے امانت کے فرائض کو وہ انجام دیتا چلا جائے ان غریبوں پر پیشانیوں چڑھائی جاتی ہیں جو حکومت کے محکموں میں رشوتیں لیتے ہیں، رعایا کو بھی لوٹتے ہیں اور جس حکومت کے ملازم ہوتے ہیں موقع ملنے پر اس کی آمدنیوں سے بھی نفع اٹھاتے ہیں ان مسکینوں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہے جو تجارت میں دھوکے دیتے ہیں، صنعتی دستکاریوں میں فریب سے کام لیتے ہیں، ان کے لئے قانون پر قانون بنائے جا رہے ہیں، تعزیری دفعات ڈھالے جا رہے ہیں، جیلوں کی دھکیاں دی جا رہی ہیں، سوسائٹی میں ان کو رسوا کیا جاتا ہے، لعنتوں اور ملامتوں سے ان کے قلوب کو لوگ چھلنی بنائے ہوئے ہیں، حالانکہ سوچنے کی بات یہ تھی کہ جہنم کا خوف جن کے دلوں سے نکال دیا گیا ہے اور نکال دینے کی مسلسل کوشش جاری ہے، کالجوں میں، اسکولوں میں، تصنیفوں میں، اخباروں میں، رسالوں میں، سینماؤں میں اور تماشگاہوں میں، مجلسوں میں اور کلبوں میں اور کچھ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، لیکن یہ بات کہ مرنے کے بعد بھی سزا یا جزا سے آدمی کو دوچار ہونا پڑے گا، اس کا مضحکہ ہر جگہ اڑایا جاتا ہے، یہ مذہب کا ڈھکوسلہ صرف ڈھکوسلہ ہے، ہر ایک کی قدر مشترک کوشش اسی کے باور کرانے پر مرکوز ہو گئی ہے، پھر جو آنے والی زندگی کی سزائوں سے نڈر بنائے گئے ہیں، جہاں ڈرنے ہو، پولیس کا ڈرنے ہو، عدالت کا ڈرنے ہو وہاں ان افعال کے ارتکاب سے آپ ہی بتائیے کہ وہ کیوں ڈریں، جن سے ڈرنے کا آپ ان سے خواہ مخواہ مطالبہ کر رہے ہیں، رشوت کی اس آمدنی سے وہ کیوں دست بردار ہوں، جس کی اطلاع حکومت کے دسترس سے باہر ہے وہ دھوکے کیوں نہ دیں جب جانتے ہوں کہ جسے دھوکہ دیا جا رہا ہے وہ دھوکہ کھا سکتا ہے۔ آخر لوگوں کو آپ یہ بھی سکھا رہے ہیں، آپ کے اساتذہ سکھا رہے ہیں، آپ کے ارباب تصنیف و تالیف سکھا رہے ہیں، شعراء گارہے ہیں، مقررین سنارہے ہیں، حتیٰ کہ بازیگروں کو تک دیکھا جا رہا ہے کہ باور کر رہے ہیں کہ جو کچھ یہاں اور اس زندگی میں کھویا جاتا ہے، پھر وہ کہیں پایا نہیں جاتا، صرف اسی کو ملا، جسے یہاں اور اس زندگی میں ملا، اس کے بعد زندگی ہی دہراؤ

کسی کو ملتی ہے اور نہ وہ چیزیں ملتی ہیں جن کی زندگی کو ضرورت ہے، آپ یہ بھی منواتے جاتے ہیں، اب میں آپ کو اور آپ کی عقل کو کیا کہوں کہ اسی کے ساتھ یہ بھی بڑھاتے جاتے ہیں کہ اس روپے کو ہاتھ مت لگانا جس کے لینے کی قانون اجازت نہیں دیتا، کیا قانون کے روکے ہوئے روپے کو چھوڑ دینے سے قانون پھر اس رقم کو مجھ تک پہنچا سکتا ہے، آپ نے انسان کی فطرت کا مطالعہ اگر کیا ہے تو کیا کیا ہے جس پر بغیر کسی خطرے کے قبضہ کیا جاسکتا ہے، ان پیسوں کو کوئی کیوں چھوڑے، جب تک یہ نہ یا ور کرایا جائے کہ ان پیسوں کے چھوڑنے والوں کو روپیہ دیا جائے گا لیکن روپیہ تو روپیہ ان چھوڑے ہوئے پیسوں کے معاوضہ میں کوڑی دینے کے لئے بھی آپ تیار نہیں، پھر یہ کتنا غیر فطری مطالبہ ہے کہ ان پیسوں کو چھوڑ دیا جائے، انہیں حرام سمجھا جائے صرف رشتہ پرستی، چورسی، خیانت، بددیانتی وغیرہ کے مذہبی الفاظ فقط الفاظ سے آپ کب تک فائدہ اٹھائیں گے، جب خود اپنے ہاتھوں اس دیوار کو ڈھا رہے ہیں جس پر ان الفاظ کے زور کی بنیاد قائم ہے، مولینا رومی نے سچ فرمایا ہے،

تانه بنید کود کے کوسیب ہست اوپیا زگندہ را نہ ہرزدست

اور کودک یا بچوں کی فطرت کا جو حال ہے کہ شری پیاز کو ہاتھ سے اسی وقت چھوڑ سکتے ہیں جب اس کی جگہ سبب انہیں پکڑا یا جائے، یہی فطرت جو انوں اور بوڑھوں میں بھی عمل کرتی رہتی ہے، تبدیلی جو کچھ بھی ہوتی ہے باہر میں ہوتی ہے۔ لیکن ”اندر“ ہر حال میں سب کا ایک ہی رہتا ہے، قرآن مجید کی آیت

اعلموا انما الحیوة الدنیا لعب ولهو و زینة و تفاخر بینکم و تکاثرفی الاموال و الاولاد۔

جانو اس بات کو، کچھ نہیں ہے یہ بےست زندگی لیکن لعب (کھیل) اور لہو (غفلت) اور زینت (بناؤ سنگار) اور باہم آپس میں تفاخر (ایک کا دوسرے کے مقابلہ میں

فخر کرنا) اور اموال (سرمایہ) اولاد کی کثرت میں مقابلہ۔

میں آدمی کی موجودہ بےست دنیاوی زندگی کو بظاہر پانچ ادوار میں جو تقسیم کیا گیا ہے، مشاہدہ سے بھی جس کی تصدیق ہو رہی ہے، یعنی پیدا ہونے کے بعد آدمی پر پہلا حال جو طاری ہوتا ہے اس کی تعبیر لعب سے کی گئی ہے، لعب کھیل کود کا نام ہے بالفاظ دیگر ایسے اعمال و افعال جو اپنے اندر کسی نتیجہ کو نہیں رکھتے۔ عام خیال یہی ہے کہ بچپن میں بچے مثلاً مٹی خاک دھول کے گھروندے بنانا کہ خوش ہوتے ہیں، حالانکہ نہ ان گھروں میں کوئی رہ سکتا ہے نہ ان سے اور کسی قسم کا فائدہ کوئی اٹھا سکتا ہے، اس قسم کا کام آدمی صرف ابتدائی زندگی ہی میں کرتا ہے، اس وقت تک کرتا رہتا ہے جب تک اس میں دنیا کے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہ دور گزر جاتا ہے تو اس کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے، شاید اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی، ایام طفولیت کے کسی

دور کے گزرنے کے بعد جو کچھ عام حالات میں کرنے والے کرتے ہیں، پہلے ان کی فہرست مرتب کر لینی چاہیئے۔ تب معلوم ہو سکتا ہے کہ اس عام خیال میں حقیقت کا حصہ کتنا شریک ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور لعب وائے کے گزرنے کے بعد یہ چار دور آدمی پر آتے ہیں۔

(۱) لہوی دور کے معنی غفلت کے ہیں، طفولیت کے ختم ہونے کے بعد جب ثنابی محرکات کا انسانی دماغ پر استیلا ہوتا ہے، وہی جس کا نام جو آتی دیو آتی رکھا گیا ہے، یہ غفلت اور سرمستی کا دور ہوتا ہے، ہر چیز سے غافل ہو کر عام حالات میں دیکھا ہی جاتا ہے کہ لوگ ان ہی جذبات اور ولولوں میں ڈوب جاتے ہیں جن کا تقاضا جوانی کے ان دنوں میں زور پکڑتا ہے۔

(۲) پھر اسی کے ساتھ ساتھ اور اسی کے پیچھے پیچھے بننے اور سنوڑنے کا جذبہ آدمی پر مسلط ہوتا ہے صورت شکل کیسی ہی کچھ کیوں نہ ہو، لیکن جسے بھی دیکھئے نظر آتا ہے کہ اپنے بالوں کے ساتھ کھیل کھیل رہا ہے، سر، داڑھی، مونچھ کو اپنا تختہ مشق بنائے ہوئے ہے، لباس میں، چال میں، ڈھال میں، الغرض اپنی اپنی بساط کے مطابق زیب و زینت میں عموماً لوگ مشغول ہو جاتے ہیں، اسی کا نام قرآن نے جیسا کہ میں سمجھتا ہوں ”زینت“ رکھا ہے، یہ فیشن اور بناؤ سنگار کا دور ہوتا ہے۔

(۳) یہ دور بھی بتدریج گزر جاتا ہے، گذرتا رہتا ہے کہ اپنے اپنے دائرے میں بعض بعض کو اپنا مقابل بنا کر اس کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ان مشغولوں میں مصروف ہیں جن کا قرآن نے تفاخر نام رکھا ہے۔ اپنے نسب پر اپنے کمالات و صفات پر، شکل پر صورت پر نظر آتا ہے کہ ہر ایک ناز کر رہا ہے اور کیسا ناز؟ کہ گویا اس کے مقابلہ میں دوسرا کچھ نہیں ہے۔

(۴) ان سب کے بعد آخری میدان جس میں بہر حال ہر ایک کو بالآخر قدم رکھنا ہی پڑتا ہے وہ وہی ہے جس کا نام لوگوں نے ”نعمل کا میدان“ رکھا ہے۔ دراصل ”عائلی زندگی“ یا گھر گھرستی کی زندگی ہی کا نام عمل کا میدان رکھا گیا ہے، اور زندگی کا یہی دور سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے، لیکن اس دور میں داخل ہو کر کرنے والے جو کچھ کرتے رہتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو وہی بات حقیقت معلوم ہوگی جسے قرآن میں

تکاثر فی الاموال والا اولاد الاموال اور الاولاد کی کثرت میں باہمی مقابلہ

کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے،

وہی بات یعنی ہر دائرے والے چند خاص افراد کو سامنے رکھ کر مقابلہ کا بازار گرم کرتے ہیں، عملی میدان کی اس زندگی میں پہلے تو دولت و ثروت کا مقابلہ لڑا جاتا ہے، تنخواہیں نا پنی جساتی ہیں آمدنیوں کا موازنہ کر کے اندر ہی اندر ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھ جانے کی فکر وں اور کوششوں میں منہمک رہتا ہے۔ ”الاموال“ کے بعد پھر ”الاولاد“ کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے، بیٹے گنے جاتے ہیں، بیٹیاں شمار ہوتی ہیں، اور موقع مل جاتا ہے تو مقابلہ کے اس میدان کو پوتوں اور پوتوں نبیروں اور نواسوں تک وسیع کر دیا جاتا ہے۔

ان اموال والاؤں کے نکاح کا یہی مشغلہ عموماً ہم میں اکثریوں کی زندگی کا آخری مشغلہ ہوتا ہے۔
دم توڑ دینے والے اسی نقطہ پر پہنچ کر دم توڑ دیتے ہیں، مشرق ہو یا مغرب، قدیم دینا ہو یا جدید ہر جگہ
یہی تماشا ہے جو بنی آدم کے گھرانوں میں کھیلا اور دیکھا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کے ان پانچ ادوار میں سے طفولیت کے پہلے دور کے مشاغل کی
نوعیت اگر لعب (کھیل کود) کی تھی، یعنی کرنے والے زندگی کے اس ابتدائی دور میں جو کچھ بھی کرتے
رہتے ہیں، وہ لا حاصل اور بے نتیجہ ہوتے ہیں، اسی لئے نگاہوں میں ان اعمال و افعال کی کوئی
قیمت نہیں ہوتی، تو چار دور جو اس کے بعد آتے ہیں، یعنی لہوئیت، زینت، تقاضا، الاموال والاؤں
میں نکاح، ان ادوار میں جو مشاغل انجام دیئے جاتے ہیں، اگر ان کو بھی اسی نقطہ نظر سے جانچ جائے
یعنی سوچا جائے کہ کوئی حاصل، کوئی نتیجہ ان کا بھی ہے یا نہیں، تو میں نہیں جانتا کہ فرق پیدا کرنے والے
بعض دور کے طفلانہ اعمال اور باقی چارگانہ ادوار کے اعمال و افعال میں کیا فرق پیدا کر سکتے ہیں؟ پھر سب
کچھ کرانے کے بعد غور کرنے والوں کو ایسا کونسا نتیجہ اور حاصل ہاتھ آتا ہے جسے واقعی حاصل اور نتیجہ
قرار دیا جاسکتا ہے، اسی کے بعد قرآن ہی میں جو مثال بیان کی گئی ہے، یعنی

کمثل غیث ۱ عجب ۱ الکفار
نباتہ شمیخ فترۃ مصفوا
شمیکون حطاما۔
مانند بارش کے کہ سرور کرتی ہو کسانوں کو
اس کی روئیدگی، پھر لہرائے لگتی ہیں (وہی
روئیدگیاں) پھر دیکھتے ہو کہ پیلی پڑ گئیں

وہی، پھر ہو جاتی ہیں وہی چور چور (یعنی بیلوں سے روند کر ان کو بھونسنہ وغیرہ بنا لیتے ہیں)

جس کا حاصل یہی ہے کہ بارش کا پانی آسمان سے زمین پر آتا ہے، روئیدگیوں کو یہی بارش اگاتی ہے۔
ہریالیاں اور کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، پھر وہ زرد پڑنے لگتی ہیں، بالآخر گھاس بھونسنہ بن کر ختم
ہو جاتی ہیں، جیسے یہ سارا تماشا بارش کا ہوتا ہے، یوں ہی زندگی کی نمائش انسانی اجساد میں سے
کسی جسد میں ہوتی ہے، زندگی اسی جسد کو طفولیت شباب اور شیخوخت (پیرانہ سالی) کے ادوار سے
گزارتے ہوئے اس نقطہ پر پہنچا دیتی ہے جس پر زندگی کی اس نمائش کا خاتمہ ہو جاتا ہے سوال یہ
ہے کہ بارش کے اس تماشے سے خود بارش کو جیسے کچھ ہاتھ نہیں آتا، انسانی جسد میں نمایاں ہو کر
مختلف ادوار سے گزرنے والی زندگی ان تمام ادوار اور ان کی تمام نمائشوں سے خود اپنے لئے
کس نتیجہ کو حاصل کرتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ بارش اور بناتی شکلوں میں بارش کی نمائشوں سے
بارش کا پانی جیسے کسی نتیجہ کو حاصل نہیں کرتا، بجائے یہی حال اس زندگی اور الحیوة الدنیا کا ہے جس کا
ظہور انسانی جسد میں ہوتا ہے اور ادوار بچکانہ سے گذر کر موت پر جس کا خاتمہ ہوتا ہے بجائے بارش
کے بارش کی بناتی نمائشوں سے الکفار (کسان) لذت گیر ہوتے ہیں، کچھ یہی حال ہمارا بھی ہے کہ ہم میں
ہر ایک کی زندگی اور زندگی کے ادوار و سروں کے لئے ایک تماشہ ہوئے ہیں، لیکن خود زندگی والے کو
اپنی زندگی اور اس کے ان ادوار سے کوئی نتیجہ ہاتھ نہیں آتا، یوں ہی لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں،

بچے بنتے ہیں، جوان ہوتے ہیں، بوڑھے بنتے ہیں اور مر جاتے ہیں، مرتے چلے جا رہے ہیں اور کاش! بات اسی پر ختم ہو جاتی، یعنی الحیوة الدنیا اور اس کی مختلف نمائشیں بے نتیجہ اور لا حاصل ہو ہو کر یونہی ختم ہوتی چلی جاتیں جیسے بارش اور اس کی نمائشیں خود بارش کے لحاظ سے بے نتیجہ بنتی چلی جاتی ہیں، لیکن قرآن میں آگے جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

وفي الآخرة عذاب شديد (اور اس پہلے تماشے حیوة دنیا کے بعد)

ومغفرة من الله ورضوان (بچھلی زندگی میں سخت مار ہے اور مغفرت

بھی اللہ کی طرف سے اور "رضوان" بھی ہے)

(یعنی حق تعالیٰ کی رضا مندی)

جس کا یہی مطلب ہوا کہ اپنی ان نمائشوں کو ختم کر کے انسانی زندگی ختم نہیں ہو جاتی، یعنی اس طور پر ختم نہیں ہو جاتی جیسے بارش کی بنیادی نمائشیں ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ بجائے ختم ہونے کے آدمی کی زندگی کو دو باتوں یعنی عذاب شدید (سخت مار) سے دوچار ہونا پڑتا ہے یا اس کے سامنے مغفرت کا وہ سرچشمہ آتا ہے جس میں غوطہ لگاتے والے ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہو کر اپنے تمام احساسات و جذبات کے مطابق دائرہ وجود کی اس مرکزی طاقت کو پالیتے ہیں جس کی کوئی حد اور تھاہ نہیں ہے، قرآنی اصطلاح میں جس کا نام "رضوان" اور "رضوان اللہ" ہے۔

الحیوة الدنیا کی پست زندگی اپنے ادوار کے ساتھ جب ختم ہو جاتی ہے تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ نفیاً یا اثباتاً جو اس کا جواب نہیں دے سکتے، نہ ان کے حواس دے سکتے ہیں اور نہ ان کی عقل دے سکتی ہے، وہ اپنے اس جہل سے ظاہر ہے کہ اس علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو پیروں کو غیب و شہادت کے جاننے والے نے عطا کیا ہے۔ پس پیغامبروں کو واقعی خدا کے پیغامبر جو لوگ مان چکے ہیں، وہ یہ جاننے پر مجبور ہیں کہ اس پست زندگی کے بعد دوسری زندگی میں ان دو واقعات میں سے کسی ایک کے ردیر وان کو بہر حال ہونا پڑے گا، اور جب واقعہ یہی ہے تو پھر ان ہولناک ابدی نہ ختم ہونے والے نتائج کے مقابلہ میں ہماری موجودہ "الحیوة الدنیا" اور یہ سارے بے حاصل ادوار اس کے سوا اور کیا رہ جاتے ہیں جو مذکورہ بالا آیات کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ

ما الحیوة الدنیا الا متاع (اور نہیں ہے یہ پست زندگی لیکن صرف

فریب کا ایک سرمایہ۔

الغرض۔

آئندہ پیش آنے والے اتنے اہم نتائج سے غافل بنا کر جس بے نتیجہ زندگی نے اپنے ان لا حاصل ادوار میں آدمی کو الجھا لیا ہو، خود ہی سوچنا چاہیے کہ "سرمایہ فریب" یا "متاع الغرور" کے سوا اس کا نام اور کیا رکھا جائے۔

خیر یہ تو ان آیات کا مطلب ہوا، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ لا حاصلی اور بے نتیجگی کی وجہ سے الحیوة الدنیا کا ابتدائی دور اگر لعبی دور ہے، طفولیت اور طفولیت کے سارے مشاغل اگر صرف

کھیل کود ہیں تو اس کے بعد آنے والے ادوار چار گانہ نہ سوچنے والوں کی نگاہوں میں خواہ جتنی بھی اہمیت رکھتے ہوں، لیکن اپنی بے ثمری و لاحاصلی کی وجہ سے ان کو بھی لعب یا کھیل کود کے سوا اور کوئی دوسری بات آخر کیوں سمجھی جائے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کبھی پوری "الحیوة الدنیا" ہی کو لہو و لعب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ مشاغل اور کاروبار کے لحاظ سے زندگی کے مختلف ادوار میں جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ صرف باہر میں ہوتی ہیں، ورنہ اندر کا نقطہ نظر ہر حال میں جوانی میں بھی بڑھاپے میں بھی لوگوں کا وہی رہتا ہے جو بچپن میں ہوتا ہے، یعنی نتیجہ سے بے پروا ہو کر صرف لذت و مسرت کے وقتی تقاضے کو سب ہی پورا کرتے رہتے ہیں، الایہ کہ اپنی الدنیا کا رشتہ پیغمبروں کی راہ نمائی میں جن لوگوں نے الدین کے ساتھ جوڑ دیا ہے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ دین سے رشتہ پیدا کر لینے کے بعد دنیا بھی بدل جاتی ہے، اس میں بھی انقلاب اور عظیم انقلاب پیدا ہو جاتا ہے، اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ سلجھانے والے دنیا کو بھی سلجھا نہیں سکتے، قطعاً سلجھا نہیں سکتے، جب تک وہ انسانیت کے دین کے سلجھانے میں کامیابی نہ حاصل کر لیں گے۔ دین کے بگاڑنے والوں کو آج نہیں محسوس ہوا ہے تو کل ماننا پڑے گا کہ انھوں نے انسان غریب انسان کے دین کو بگاڑ کر اس کی دنیا بھی بگاڑ دی، اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس بگاڑ کے ظہور کا سلسلہ شروع بھی ہو چکا ہے اور جو شروع ہو چکا ہے وہ بہر حال ختم ہو کر بھی رہے گا۔ تجربات یہی ثابت کرتے چلے جائیں گے، مشاہدات یہی بتاتے چلے جائیں گے، ہم ہوں گے باز نہ ہوں گے، لیکن اس وقت جو بھی ہوں گے ان کی آنکھیں دیکھیں گی، یقیناً دیکھیں گی، وہ سب کچھ دیکھیں گی جو اس وقت کہا جا رہا ہے، اللہ اللہ یہ سارے معاشی جھگڑے، معاشیاتی مقابلے جو افراد سے گذر کر اقوام تک کو میدان میں لے آئے ہیں، زمین انسانی رگوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے، آسمان آگ برسا رہا ہے، فتنہ اور فساد کے دھوئیں سے کائنات کی ساری فضا بھر گئی ہے، چیخنے والے چیخ رہے ہیں، چلاتے والے چلا رہے ہیں، ازالہ کی ساری کوششیں جو ان جھگڑوں لا جا صل اور بے نتیجہ جھگڑوں کے ختم کرنے کی راہوں میں ممکن تھیں، تجربہ ہر راہ کی ناکامی کا اعلان کر چکا ہے، لیکن عقول ازالہ کی جن کوششوں میں تھک تھک در ماندہ ہو چکے ہیں، اگر سوچا جائے انصاف کے ساتھ ہر قسم کی تنگ نظریوں سے الگ ہو کر سوچا جائے تو الدنیا کا الدین سے رشتہ جوڑ کر بجائے ازالہ کے صرف امالہ کی یہ ہلکی سی تدبیر کہ مقابلہ کے سارے جذبات کا رخ "الحیوة الدنیا" اور اس پست زندگی سے ہٹا کر "الحیوة الاخری" کی بلند و دوامی زندگی کی طرف پھیر دیا جائے اور امالہ کی اسی تدبیر پر زور دیا جائے۔ اسی قدر زور دیا جائے جتنا کہ اب تک ازالہ کے لا حاصل سعی میں دیا جا چکا ہے۔ اور بجائے الدنیا کے الاخرہ کو سامنے رکھ کر نسل انسانی کو دعوت دی جائے جیسا کہ قرآن نے اسی طریقہ عمل کو اختیار کر کے

پس چاہئے کہ مقابلہ کریں اسی میں مقابلہ کرنے والے

وفي ذلك فليتنافس المتنافسون

کی دعوت دی ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ ازالہ کی کوششوں کی راہوں سے جن مقاصد کے حصول میں دنیا ناکام قطعاً ناکام ہو چکی ہے اور ہوتی رہے گی، ان ہی مقاصد میں امالہ کی اس معمولی تدبیر سے کامیاب نہ ہو سکے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ امالہ ہی پر آمادہ نہ ہوں، یا زبان سے اقرار کر کے دل کے رنج کو ادھر نہ پھیریں جس کی طرف پھرنے کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا، لیکن منوالینے کے بعد تو ان مقاصد میں کامیابی اصول امالہ کی تسلیم کا ایک ایسا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے جس میں تخلف کا امکان ہی نہیں ہے، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ امالہ کے اس اصول پر اعتماد اسی حد تک بڑھتا جائے گا، جس حد تک مذہب پر انسانیت کے اعتماد کو آپ بڑھائیں گے، لیکن مذہبی اعتماد کے اضمحلال کا جب تک وہ حال ہے جس میں دنیا کو آج مبتلا کر دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ امالہ کی اس تدبیر کا ذکر مضحکہ کے سوا اور کیا ہے؟

اور یہ تھے اسلامی معاشیات کے وہ اصولی کلیات جن کا قرآن میں اب تک میری جستجو نے سراغ لگایا ہے، اس وقت تک توجو باتیں سمجھ میں آئی ہیں وہ یہی ہیں، آئندہ اور چیزیں بھی جو ملتی چلی جائیں گی، انشاء اللہ ان کا اضافہ کیا جائے گا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ہی نمونوں کو دیکھ کر دوسرے ارباب فکر و نظر قرآن ہی سے دوسری چیزیں بھی نکال سکتے ہیں، جن پر میری نظر اب تک نہ پہنچ سکی ہے۔

البتہ آخر میں ایک چیز قرآن ہی کی ایسی ہے کہ اس کا تذکرہ اگر نہ کر دیا جائے گا تو قرآن پڑھنے والے ممکن ہے کہ بعض وسوسوں میں مبتلا رہیں:

میرا مطلب یہ ہے کہ معاشی مدارج کے جس اختلاف کی تعمیر قرآنی اصطلاح کی رو سے میں نے بسطی و قدری معیشت سے کی ہے، جیسا کہ تفصیل بتا چکا ہوں کہ عام حالات میں معیشت کی یہ دونوں شکلیں ابتلائی رنگ ہی کی ہوتی ہیں، یعنی کسی کے ساتھ عمل کے نتیجہ کے طور پر رزق کی تقسیم ان دو پیمانوں پر نہیں ہوتی بلکہ الرزق کے یہ دونوں پیمانے امتحان اور ابتلا کی دو شکلیں ہیں، اور چونکہ دونوں امتحان ہیں یعنی ہر پیمانہ اپنے ساتھ کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے ان ہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش بھی ان میں ہر ایک کا نصب العین ہونا چاہیے، پھر جیسے ہر امتحان کا قاعدہ ہے کہ اس میں شریک ہونے والوں میں بعض کامیاب ہوتے ہیں بعض ناکام، یہی حال ان لوگوں کا ہے جو معیشت کے ان دو مختلف پیمانوں پر روزی پارہے ہیں، اسی سلسلہ میں جو کچھ مجھے کہنا تھا کہ چکا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس موجودہ پست زندگی (الحیوة الدنیا) میں جسے بھی جو کچھ دیا جاتا ہے کیا ہمیشہ ابتلائی حیثیت ہی سے دیا جاتا ہے؟ قرآن کے پڑھنے والے جانتے ہیں اور ان کو جانتا ہی چاہئے کہ اجتماعی طور پر اقوام و امم کی خوش حالیوں اور بد حالیوں کو مکافات اور مجازات کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے، قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کا جتنا حصہ قرآن میں محفوظ ہے۔ وہ یہی بتانے کے لئے محفوظ کیا گیا ہے کہ خدا اور اس کی مرضیات پر چلنے والوں سے خدا بھی راضی رہا اور خدا کے قوانین نے بھی ان سے

ہم نوائی کی، اور قدرت کے مقررہ قوانین پر چلنے سے جنہوں نے بغاوت کی یعنی شرعی قوانین سے تصادم کی راہ جن قوموں نے اختیار کی، ان سے خدا اور خدا کے تکوینی قوانین متصادم ہونے لگے، اور اسی تصادم کے بعد ان کے عروج کو زوال سے ترقی کو منزل سے بدل دیا گیا، جیسا کہ میں نے عرض کیا قرآن پڑھنے والوں کے لئے قرآن کا یہ دستور کوئی چھپی ڈھنکی بات نہیں ہے، بلکہ چند کلیات جن کے محور پر قرآنی تعلیمات گردش کرتی ہے ان میں سے قوموں کی حیات و ممات کا یہ ایک مسلمہ اور بدیہی کلیہ ہے جس کے شواہد و نظائر کے بھی پیش کرنے کی حاجت نہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ نظریۂ ابتلائیۃ یعنی معیشت کے بسطی و قدری پیمانوں کو قرآن میں ابتلا و امتحان کی جو دو شکلیں قرار دی گئی ہیں تو اس کا تعلق اقوام و اہم کے اجتماعی حالات سے نہیں ہے بلکہ اشخاص کی شخصی زندگیوں کا یہ قانون ہے، یہی وجہ ہے کہ اجتماعی طور پر عروج کی حالت میں کوئی قوم ہویا زوال کی، لیکن انفرادی حیثیت سے افراد میں روزی کی تقسیم کرنے کا یہ سلسلہ دونوں پیمانوں پر جاری رہتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اجتماعی اور قومی نقطہ نظر سے ان کا حال کچھ بھی ہو، مگر کسی نہ کسی رنگ میں بعض افراد ان کے امیر بھی نظر آتے ہیں اور بعض غریب بھی۔ یعنی بعضوں کی آمدنی قدر حاجت و ضرورت کے برابر اور اس کے ساتھ نپنی تلی ہوتی ہے، اور بعضوں کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ ضرورت و حاجت پر خرچ کرنے کے بعد وہ پس ماند بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، الغرض قدر و بسط کے ان دونوں پیمانوں پر افراد میں پھر بھی روزی تقسیم ہی ہوتی رہتی ہے، کم از کم انسانیت کی جو تاریخ اس وقت تک کی موجود ہے اور قوموں کو اس زمانہ میں بھی جن حالات میں پایا جاتا ہے ان کے افراد کی معیشت کی یہی کیفیت نظر آتی ہے، عروج یافتہ قوموں میں جیسے یہ نہیں دیکھا گیا کہ ان میں ہر ایک شخص بسطی رزق والا بن جاتا ہے، یعنی سب امیر ہی نہیں ہو جاتے بلکہ باوجود قومی عروج کے افراد کی بڑی اکثریت عین عروج و ارتقا کے ان ہی دنوں میں قدری پیمانے پر بھی روزی پاتی ہے، اسی طرح زوال و انحطاط کے دنوں میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد اسی نکبت زدہ قوم کے بسطی پیمانے پر رزق پا رہے ہیں؛

اور یہ پہلی بات تھی جو اس سلسلہ میں میں کہنا چاہتا تھا، یعنی اقوام و افراد میں جو فرق قرآن میں کیا گیا ہے اس پر لوگوں کو متنبہ کر دوں؛

دوسری بات اسی سلسلہ کی یہ ہے کہ انفرادی معیشتوں کا ابتلا و امتحان پر مبنی ہونا، اگرچہ معیشت کا عام قرآنی قانون یہی معلوم ہوتا ہے، بسط ہو یا قدر جس پیمانہ پر بھی یہاں افراد کو جو کچھ مل رہا ہے، یہی سمجھنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ہر پیمانے کی جو ذمہ داریاں ہیں، موجودہ زندگی میں ان ذمہ داریوں کی تکمیل یہی آدمی کا سب سے بڑا فریضہ ہے، نتائج کے بھوگنے یا خمیازوں کے بھگتنے کا وقت اس زندگی کے بعد آئندہ زندگی میں آئے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابتلا و امتحان کے سوا معیشت کی ان دونوں شکلوں میں اور کچھ نہیں ہوتا، سمجھنے والوں نے اگر ایسا سمجھ لیا تو

جو کچھ میں عرض کرتا چلا آیا ہوں، غالباً صحیح طور پر اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ میں نے بسطی اور قدری معیشت کے ان دونوں پیمانوں کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہوئے ان نتائج پر بھی جو متنبہ کرتا چلا آیا ہوں جن سے موجودہ زندگی ہی میں آدمی کو قرآن کے بیان کے بموجب ڈوچار ہونا پڑتا ہے تو اس کا مقصد یہی تھا کہ موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا اور سزا کا حقیقی مشہد اگرچہ مجازات و مکافات کی آئندہ زندگی ہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ بعض اعمال و افعال ایسے بھی ہیں جن کی سزا و جزا کا ظہور موجودہ زندگی ہی میں شروع ہو جاتا ہے اور معاشی ذمہ داریوں کے متعلقہ اعمال و افعال بھی جیسا کہ قرآن کے حوالہ سے مسلسل دکھاتا چلا آیا ہوں مجھے اس قبیلہ کی چیزیں نظر آتی ہیں اسی بنیاد پر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ الرزق یا معیشت کے یہ دونوں پیمانے ابتلائی بھی ہیں اور ابتلائی ہونے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات مجازاتی و مکافات بھی ہوتے ہیں، اسی سلسلہ میں جو چیزیں لکھی جا چکی ہیں ان کو پھر پڑھیے تو آپ کو یہی نظر آئے گا، مثلاً قرآن کی آیت

فاما من اعطى و تقى
و صدق بالحسنى فسنيسره
پس جس نے دیا اور ڈرا اور احسنی
(اچھی باتوں کی) تصدیق کی، تو ہم قریب
ہے کہ آسان بنائیں گے اس پر آسان زندگی کو
للیسرہ می۔

میں اعطاء (داد و دہش) جو تقویٰ اور الحسنى کی تصدیق پر مبنی ہو، فرمایا گیا ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں کے لئے "الیسری" کو آسان کر دیا جائے۔ "الیسری" (آسان زندگی) ایک عام اور مطلق لفظ ہے جو ہر قسم کی زندگی کو عام ہے، اگر یہ سمجھا جائے اور یہی سمجھا یا بھی گیا ہے کہ موجودہ زندگی ایسوں پر آسان کر دی جاتی ہے تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ قرآنی آیات اور حدیثوں کے حوالہ سے یہ بات جو گذر چکی ہے کہ مثلاً صدقہ سے ردِ بلا ہوتا ہے یا اسی قسم کی دوسری آسانیاں میسر آتی ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق موجودہ زندگی ہی سے ہے، بخاری کے حوالے سے میں نے کئی جگہ بتایا تھا کہ چٹان کے ڈھنک جانے کی وجہ سے جو لوگ غار میں بند ہو گئے تھے، اپنے عمل کے بدلہ سے انہوں نے اسی زندگی میں نفع اٹھایا تھا یا باغ کی آمدنی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے آبِ پاشی کے جو فوائد حاصل کرتا تھا، ان ساری روایتوں کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ خیر و خیرات و صدقات و مبرات وغیرہ کے نتائج سے موجودہ زندگی میں بھی کرنے والے کے لئے قدرت سہولت مہیا کرتی ہے، یعنی الیسری کو آسان کرتی ہے۔ اسی کے بالمقابل قرآن سے سورہ نون میں باغ والوں کا جو مشہور تیشلی قصہ بیان کیا گیا ہے کہ مسکینوں اور غریبوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لئے چاہا تھا کہ پھلوں کو صبح سویرے تڑکے توڑ کر نکل جائیں، لیکن قبل اس کے کہ وہ باغ پہنچیں قدرت کی طرف سے ان کا باغ اور اس کے پھل برباد ہو چکے تھے تو اس قصہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نیکی کے بدلہ کا ظہور اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے، اسی طرح معاشی سرمایہ کی بربادی پر بدی اور بدینتی کا بھی اثر پڑتا ہے۔

اسی طرح قرآن کے احسن القصص (قصہ حضرت یوسف علیہ السلام) حضرت والا کی مختلف

آزمائشوں کے تذکرے کے بعد جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شاہ مصر نے خزائن الارض (زمین کی آمدنیوں) کو ان کے سپرد کر کے سرزمین مصر کی حکومت ان کے حوالے کر دی تھی تو یہ ارشاد فرمانے کے بعد یعنی

كذلك مكننا لـيوسف في الارض
يتبع منها حيث يشاء -

یوں ہی اقتدار بخشا ہم نے یوسف کو
زمین (مصر) پر، ٹھکانہ بناتے تھے وہ

(یوسف علیہ السلام) جہاں چاہتے تھے۔

حق تعالیٰ نے عمومی رنگ میں جو یہ اعلان کیا ہے:

نصيب برحمتنا من نشاء
ولا نضيع اجرا للمحسنين -

پہنچاتے ہیں ہم اپنی رحمت جسے چاہتے
ہیں اور نہیں ضائع کرتے ہیں ہم مزدوری

ان لوگوں کی جو بھلائی کرنے والے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کریمہ قدسیہ میں اسی دولت و ثروت اقتدار و اختیار کو جو زمین مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو مل گیا تھا۔ ”رحمتنا“ (یعنی ہماری رحمت اور مہربانی) کے لفظ سے اس کی تعبیر کی گئی، جس کے یہی معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کی رحمتوں اور مہربانیوں کا ظہور کبھی دنیاوی دولت و ثروت کی شکل میں بھی ہوتا ہے اور آگے یہ فرما کر ہم محسنوں کی مزدوری کو ضائع نہیں کرتے، اس سے بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دنیاوی نعمت و عزت جو مصر میں ملی تھی، یہ ان کے احسانی اعمال و افعال کا بدلہ و اجر تھا، خود یوسف علیہ السلام کی زبان مبارک کا یہ فقرہ قرآن ہی میں جو محفوظ ہے یعنی مصر میں خُدا نے ان پر جو نوازشیں فرمائیں اور ان کا بچھڑا ہوا خاندان وطن سے چل کر مصر میں ان کے پاس جب آگیا تو آپ نے فرمایا،

قد من الله علينا ۲ من

ہم پر بڑا کرم کیا اللہ تعالیٰ نے جو ڈرتا

من يتق ويصبر فان الله

ہے اور صبر سے کام لیتا ہے تو قطعاً

لا يضيع اجرا للمحسنين -

اللہ تعالیٰ بھلائی کرنے والوں کے

اجر کو ضائع نہیں کرتے۔

تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ وہ اپنے احسانی اعمال و افعال کا صلہ ان آسائینوں اور سہولتوں کو قرار دے رہے تھے جو اس وقت ان کو مصر میں میسر آئی تھیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے اور یہی بات میرے اس مضمون کی سب سے زیادہ قابل توجہ بلکہ غالباً دل ہلا دینے والی بات ہے کہ الحیوة الدنیا کی یہی سہولتیں، یہی آسانیاں جنہیں ہم بسطی معیشت بھی کہہ سکتے ہیں، زندگی کی یہی شکل اقوام کے لئے بھی اور کہہ سکتا ہوں کہ افراد کے لئے بھی قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی عصیاں و متمرّد کا قدرتی انتقام بھی اختیار کر لیتا ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں وہی انتقام صلہ اور جزا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خود دینے والے کا

بیان ہے کہ درحقیقت وہ باطنی سزا کی خطرناک انتہائی خطرناک شکل ہوتی ہے۔ اقوام کے متعلق اسی عجیب و غریب قانون کا ذکر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ قوموں اور امتوں کو چونکانے کے لئے جب پیغمبر اور رسل بھیجے جاتے ہیں تو ابتداءً انکار و سرکشی اختیار کرنے والوں کو اباسار (جنگ وغیرہ کی سختیوں) اور انصاء (مخطوبہ وغیرہ کی مصیبتوں) میں مبتلا کر کے جھنجھوڑا جاتا ہے لیکن جن کے دل سخت، سینے سیاہ ہوتے ہیں، وہ قدرت کی ان تہیہوں کو مختلف تاویلوں کی راہ سے یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ تہیہ نہیں ہے، بلکہ دنیا کے عام حوادث و واقعات ہیں، انسانی اخلاق و کردار سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، ایک سے زائد مقامات پر قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی تاویلی ذہنیتیں رکھنے والی قوموں کے ساتھ قدرت کا عام دستور یہ ہے کہ کچھ دن کے لئے انہیں ڈھیل دی جاتی ہے، ڈھیل ہی نہیں بلکہ ان مواقع کی ایسی آیتیں مثلاً سورۃ الانعام میں ہے،

فلما نسوا ما ذکرنا بہ فتحنا علیہم ابواب کل شئ۔
جب وہ بھول گئے ان باتوں کو جن سے
چونکائے گئے تھے وہ تو کھول دیا ہم نے

ان پر ہر چیز کے دروازے۔

یا سورۃ الاعراف میں ہے،

ثم بدلنا مکان السیئة الحسنۃ حتیٰ عفوا۔
پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی کو بدل دیا
تا اینکه وہ لوگ خوب بڑھ گئے۔

وغیرہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ حالات سے بھی زیادہ آسائشوں کے دروازے ان پر کھولے جاتے ہیں اور ”کل شئ“ یعنی ہر قسم کی چیزوں کے اور زندگی کے تمام شعبوں کے ابواب و دروازے ان پر دیا ہو جاتے ہیں، السیئة (برائیوں) کو الحسنۃ (بھلائیوں) سے بدل دیا جاتا ہے، گویا مٹی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر ایسی حالت میں سونا بنتی چلی جاتی ہے، وہ بڑھتے ہیں، بڑھائے جاتے ہیں بڑھائے چلے جاتے ہیں، حتیٰ عفو کے یہی معنی ہیں کہ اس زمانہ میں ترقی و عروج ارتقاء و اعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر ان کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ گو اس کے بعد یہ فسر ما کر جیسا کہ الانعام کی آیت کے آخر میں ہے،

حتیٰ اذ فرحو بما آتوا
خذنا ہم بغتۃ فاذا ہم
مبلسون فقطع دابر القوم
الذین ظلموا والحمد للہ
سب اعلمین۔
جب اتر آئے اس چیز سے جو دیا گیا
ان کو تو پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک تب
وہ ایسی حالت میں رہ جاتے ہیں مایوس
ہو کر، پس کاٹ دی گئی جڑ ان لوگوں
کی جنہوں نے اپنے حدود سے تجاوز کیا

تھا اور ستائش (رہ گئی) صرف اللہ سارے جہان کے پالنے والے کی۔

یا الاعراف کی آیت کے آخر میں ہے،

جب وہ بڑھ گئے تو بولے کہ ہماری
گذشتہ نسلوں کو بھی دکھ اور سکھ
نے چھوا تھا۔ پس پکڑ لیا ہم نے ان کو
اچانک اس طور پر کہ ان کو اس کا شعور

حتیٰ عفوۃ قالوا قد مس
ابانا الضراء والسرء
فاخذناهم بغتۃ وهم
لا يشعرون۔

بھی نہ ہوا۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ ان ساری ترقیوں اور الغریبوں کے بعد قدرت کا مخفی ہاتھ اچانک ان کو
پکڑ لیتا ہے اور اس طور پر پکڑ لیتا ہے کہ ان کا سارا کیا کر یا برباد ہو کر رہ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ تو
ان کے آخری انجام کا مال ہے، لیکن سرکشی و طاعنی اقوام کے ساتھ قدرت کا یہ انتقامی برتاؤ،
جو یہ ظاہر سرفرازیوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، ان لوگوں کے لئے بڑا صبر آزما اور انتہائی خطرات کا
سبب بن جاتا ہے، جنہیں انجام سے پہلے انتقام کے اس عجیب و غریب عبوری دور میں زندگی
گزارنی پڑتی ہے اور جو حال اقوام کا ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ
افراد کے ساتھ بھی قدرت کبھی اسی قسم کا سلوک کرتی ہے، یعنی دیا تو جاتا ہے ان کو سزا و انتقاماً
ان کی غفلتوں مجرمانہ غفلتوں پر تاکہ غفلتوں کا اضافہ ہوتا چلا جائے، مقصود بسطی معیشت کی اس
ٹوپی کے اڑھانے سے یہی اور صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ اندھے بنائے جاتے ہیں اور دولت و ثروت
کی ڈاٹیں ان کے کانوں میں اسی لئے ٹھونسنی جاتی ہیں تاکہ پھر نیکی کی راہوں پر اب ان کی نظر نہ
پڑے اور سبلائیوں کے سننے سے یہ بہرے بن جائیں، لیکن اپنی جگہ وہ اس خیال میں گمن رہتے ہیں
کہ وہی قدرت کے پیارے اور ان لوگوں میں ہیں جنہیں پیدا ہی کیا گیا ہے خدائی نعمتوں سے استفادہ
کے لئے، قرآن میں ایسی آیتیں مثلاً

پس حیرت میں نہ ڈالے تجھے ان کے اموال
اور نہ ان کی اولاد اس کے سوا اور کوئی
دوسری بات نہیں ہے کہ خدا چاہتا ہے
کہ ان کو عذاب دے ان ہی چیزوں

فلا تعجبک اموالہم ولا اولادہم
انما يريد الله ليعذبهم
برها فی الحیوة الدنیا ویزھق
انفسہم وہم کافرون۔

سے (یعنی اموال و اولاد کی کثرت سے) اس پست زندگی میں اور فرسودہ ہو کر نکلے
ان کی جان اس حال میں وہ ناشکرے ہیں۔

”بسطی معیشت“ کی اسی مغالطی قالب کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کا حال کہیں لوگوں کے ایمان کو
نہ لرزادے، صاف لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ ”الاموال“ اور ”الاولاد“ کی یہ وہی قسم ہے جس سے
قدرت ان لوگوں کی سزا کرتی ہے اور اس سے غرض یہی ہوتی ہے کہ اسی ناشکری اور کفران
کی حالت میں بدن سے ان کی جان فرسودہ ہو کر نکل جائے، اس طور پر نکل جائے کہ چونکے اور
سنبھلنے کا پھر ان کو موقع نہ ملے۔

قوموں کی حد تک تو شاید سبسطی معیشت کا یہ سزائی قالب ایسا نہیں ہے جسے پہچانتے والے
 بآسانی پہچان نہیں سکتے، آخر دنیا کی ایسی قومیں جن کی زندگی کا ہر شعبہ خدا اور اس کے رسولوں کی تعلیم کی
 بغاوت صرف بغاوت پر مبنی ہو، لیکن اسی کے ساتھ ان کی ہر بغاوت ان کے سامنے ایسے دنوں کو
 لا رہی ہو، جن میں دیکھا جا رہا ہو کہ کسی نہ کسی خیر کا دروازہ ان پر کھولا گیا، اپنی ان ہی طغیانوں میں
 وہ جس حد تک آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، اسی حد تک ابواب کل شئی (ہر چیز کے دروازوں) کے
 کھلنے کا سلسلہ بھی زور باندھتا چلا جا رہا ہو، ایسوں کے متعلق ان لوگوں کی منطق جو اللہ اور اس
 کے رسولوں کو مانتے ہیں، مذاہب و دیانات کے نظام کو انسانی دماغ کا خود تراشیدہ اور خود بافیدہ
 نظام نہیں سمجھتے، بلکہ نسل انسانی کے جینے اور مرنے کا قدرتی اور لاہوتی دستور ان کے نزدیک مذہب
 ہے، ان کی منطق اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جس کی اطلاع قرآن میں دی گئی ہے۔ ایسی بات جس کے
 سوا کوئی دوسری بات سمجھی ہی نہیں جاسکتی، اگر قرآن وہی سمجھا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ قرآن کے
 کسی ایسے مسئلہ کے سمجھنے میں کسی کو کیا دشواری پیش آ سکتی ہے، البتہ اگر دشواری کچھ ہے تو ان کے
 لئے ہے، یعنی مسکینوں، عقل کے مسکینوں کا جو طبقہ ایک طرف تو خدا کو بھی مانتا ہے، اس کے رسولوں کو
 بھی سراہتا ہے، لیکن اللہ کے باغیوں اور رسولوں کے دشمنوں پر ابواب کل شئی کے فتح کا جو انتقامی سلسلہ
 شروع ہوا، اور ان کی السیئۃ (بری حالت) جب الحسنۃ (بھلی حالتوں) سے بدل گئی تو اس انتقام کو
 وہ انعام اور اس سزا کو وہ باور کرنے لگے کہ یہ ان کے عمل کی جزا اور ان کے کرتوتوں کا یہ صلہ ہے
 اس قسم کے دماغوں کی ذہنی وسعتوں کے سمجھنے سے کم از کم میں تو قطعاً قاصر ہوں، یہ ہو سکتا تھا کہ
 ان باغیوں کے ساتھ یہ بھی مذہب سے بغاوت کا اعلان کر دیتے، جیسے وہ مرتد ہیں، ارتداد کے
 اس اصول کو یہ بھی تسلیم کر لیتے تو جو کچھ کہا جا رہا ہے اگر اس وقت کہتے تو خیر اس کی گنجائش تھی، لیکن جس
 تناقض اور تضاد کا شکار موجودہ حالات میں ان کا دماغ ہے۔ میں تو اس کی توجیہ سے قطعاً عاجز ہوں
 اور دنیا کے اس عجیب و غریب گروہ سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو جہاں تک میں جانتا ہوں عام حالات
 میں لوگ وہی مان بھی رہے ہیں جو قرآن ان سے منوانا چاہتا ہے یا سرے سے انھوں نے بھی مذہب
 اور مذہبی زندگی کی واقعیت اور نتیجہ خیزی کا اسی طرح انکار کر دیا ہے جیسے خود اس قسم کی سزایافتہ
 قومیں اس کی منکر اور اس اصول سے باغی ہیں، مگر تاشے کی ذہنیت ان کی ہے جو نہ مذہب ہی سے
 منحرف ہو کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور نہ اسی فیصلہ سے وہ مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ باغی، مذہب
 سے باغی، اقوام کا یہ حال قدرت کا انتقام اور قدرتی عذاب ہی کی یہ ایک شکل ہے۔

بہر حال قوموں کی حد تک جیسا کہ میں نے عرض کیا کم از کم میرے نزدیک اس مسئلہ میں کوئی
 دشواری نہیں ہے، البتہ افراد کا مسئلہ ذرا مشکل ہے، لیکن اس میں بھی دشواری جو کچھ ہے وہ دوسروں
 کے اعتبار سے ہے، دوسروں کو دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں دور سے دیکھتے ہیں، باہر سے دیکھتے ہیں
 لیکن خود اپنے حالات و خیالات، اعمال و افعال ظاہر ہے کہ دوسروں پر نہیں تو خود اپنے آپ پر تو

پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ خود آگاہی کے اسی نفسیاتی قانون کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

بل الا انسان علی نفسه بصيرة

بلکہ آدمی اپنے نفس کے حالات سے

ولموا لقی معاذیرا۔

خود واقف ہے اگرچہ ان پر (نامعقول)

عذروں کا (پردہ) ہی کیوں نہ ڈالے۔

(القیامہ)

پس ان لوگوں کو جو بے بسی پیمانے پر رزق پا رہے ہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ خدا اور خدا کے مرضیات کے ساتھ ان کی زندگی کا کیا تعلق ہے۔ اگر ایسا حال ہے کہ جس حد تک خدا سے خدا کی مرضیات سے وہ ٹکراتے ہیں، اسی حد تک معیشت کے اس بے بسی پیمانہ میں کشادگی پیدا ہوتی جاتی ہے، مرد اور سرکشی کے میدانوں میں ان کا قدم جتنا آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہے اسی حد تک دنیا اور دنیاوی نعمتیں بھی ان کے قدم چومتی چلی جاتی ہیں تو ایسی حالت میں (ایما ذی اللہ) انہیں یہ یقین کرنا چاہیے کہ بے بسی نعمت و معیشت کی یہ ٹوپی ان کے سر پر اسی لئے مڑھی گئی ہے تاکہ وہ اندھے ہی ہو کر جئیں اور اندھے ہی بنے ہوئے وہ مر جائیں۔ ”الاموال“ اور ”الاولاد“ کی یہ کثرت نشانی ہے اس بات کی کہ قدرت ان سے انتقام لینا چاہتی ہے اور ایسا انتقام کہ چونکے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں، خدا نخواستہ باوجود مسلم و مؤمن ہونے کے کوئی سزا کے اس حال میں اگر گرفتار ہو گیا ہو تو چاہیے کہ آیت کریمہ قرآنہ

اور نہ حیرت میں ڈالیں تجھے ان کے اموال

ولا تعجبک اموالهم واولادهم

اور اولاد، اس کے سوا اور کوئی بات نہیں

انما یرید اللہ ان یعیذ بھم

ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ سزا دے ان کو

بہا فی الدنیا ویزھق انفسہم

ان ہی (اموال و اولاد سے) اور فرسودہ

وہم کافرون۔

ہو کر نکلے ان کی جان اس حال میں وہ ناشکرے تھے۔

کے درمیں مشغول ہو، یہ اسی قسم کا مغالطہ ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ایک نووارد غریب کا بلی بتلا ہو گیا تھا، زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے حلوائی کی دوکان سے مٹھائی اٹھا کر قیمت ادا کئے بغیر کھا گیا، پولیس نے گرفتار کر کے اس کی سزایہ تجویز کی کہ سرمنڈا کر گدھے پر سوار کر کے اسے شہر بدر کر دیا جائے، یہی کیا گیا، شہر کے رٹ کے گدھے پر سوار اس کا بلی کے پیچھے تالیاں پیٹتے جاتے تھے، اسی شکل میں وہ شہر سے باہر ہوا، کہتے ہیں کہ جب کا بلی اپنے وطن پہنچا، پوچھنے والوں نے پوچھا، ”آقا! در ہندوستان رفتہ بودی، چہ دیدی؟“ جواب میں اس نے جو بات کہی اس سے حضرت تقی نوئی قدس اللہ سرہ نے قرآن کی مذکورہ بالا آیت کے سمجھانے میں ایک دفعہ امداد حاصل کی تھی، کا بلی نے جواب میں اپنے ارباب وطن کے سامنے یہ رپورٹ پیش کی،

”ہندوستان خوب ملک است، حلوا خوردن مفت است، مو تراشیدن
مفت است، سواری خرمفت است، ڈن ڈن طفلان مفت است، ہندوستان
خوب ملک است۔“

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ تحقیر و توہین، بے عزتی و رسوائی کے سارے اسباب علامات کو جیسے اس جاہل کابلی کی ذہنیت نے اپنے اعزاز و اکرام کا ذریعہ باور کر لیا تھا، اسی طرح بسطی نعمت رکھنے والوں کا باغی گروہ بھی آج اپنی سزا کو جزا اور قدرت کے انتقام کو انعام سمجھ رہا ہے، لیکن حقیقت کی پیش گاہ میں پہنچ کر اس پر واضح ہو گا کہ ان میں ایک چیز بھی مفت نہ تھی، جیسے مغالطہ خوردہ کابلی کی طرح اس نے مفت سمجھ لیا تھا، ایسی سزا جو مسلسل دوسرے سزاؤں کی سزایا فتوں کو مستحق بناتی چلی جاتی ہو، سزا کی عام قسموں میں بدترین سزا ہو سکتی ہے ۱ عاذنا اللہ ۲ المسلمین عنہا۔

لیکن بسطی پیمانہ پر رزق پانے والوں کا حال اگر یہ نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ابتلائی نعمت ہوگی یا ابتلائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رحمت بھی ہوگی، خصوصاً بسطی معیشت کی ذمہ داریوں کی تکمیل کی راہ میں اگر اس کی وجہ سے رفتار میں اور زیادہ تیزی پیدا ہوتی چلی جائے، تو یقیناً نشانی ہے اس بات کی کہ اس کی یہ بسطی معیشت و امارت و ریاست و دولت سراسر رحمت ہے، وہی حال جس کی نشان دہی حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام کی زندگیوں میں قرآن مجید نے کی ہے، وہی مصر جس کی حکومت دماغوں میں فرعونیت پیدا کرنے کی سبب بنتی رہی، اور آج تک اس کا یہی حال ہے، لیکن جب یوسف علیہ السلام کو اسی فرعونی سرزمین پر اقتدار و اختیار عطا کیا گیا تو خدا کا یہ بندہ دینے والے کے قدموں پر سر جھکا کر آرزو کرتا ہے تو یہ کرتا ہے،

سراب قد ۲ تیتنی من ۲ الملک	میرے مالک! مجھے آپ نے ملک (حکومت)
وعلمتني من تاویل ۲ الاحادیث	عطا کی اور باتوں کو ٹھیک اس کے ٹھکانے پر
فاطر السموات ۲ والارض	پہنچانے کا سلیقہ عطا کیا، آپ ہی ہیں سمانوں
۲ انت ولی فی الدنیا والاخرۃ	کے پیدا کرنے والے اور زمین کے، آپ
توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین	ہی میری پشت پناہ اور دالی ہیں دنیا میں

بھی اور آخرت میں بھی، اٹھائیے گا (دنیا سے) مجھے مسلمان! اور ملا دیجئے گا مجھے نیکوں سے۔

اور یہی چیزیں آپ کو داؤد و سلیمان علیہما السلام کے تذکروں میں نظر آئے گی جن کا ایک حصہ قرآن میں محفوظ ہو گیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مذہبی دعوت کو بنی آدم کے لئے آخری ٹھوس دعوت بنانے کے لئے ابتدا ہی سے سیاسی قوت کا زور جب اس کی بنیادوں میں بھرا گیا اور اس کی وجہ سے بہتوں کو بسطی معیشت گزارنے کا موقعہ تاریخ میں مسلسل ملتا رہا، تو صرف ابتدا ہی میں نہیں، بلکہ زمانے کے مختلف ادوار و قرون میں ایسی ہستیاں معرض شہود پر برآتی رہیں، جن کی بسطی معیشت ان کے لئے رحمت بنی رہی، اس کے لئے تاریخ اسلام کی ورق گردانی کی ضرورت ہے، میرے لئے یہاں اس کی تفصیل کا

موقعہ نہیں، بلکہ قرآن کی سورہ کہف میں ذوالقرنین کے نام سے جس تمثیلی قصہ کا ذکر ہے، میرے نزدیک اس قصہ کے متعلق یہ سوال کہ ذوالقرنین کون تھے، کہاں تھے، کب تھے، بجائے ان غیر ضروری امور کی تحقیق کے اگر سوچا جاتا تو سمجھا جاسکتا تھا کہ ایک ایسی ہستی جسے زمین کے اتنے طول و عرض پر اقتدار بخشا گیا کہ گویا مغرب الشمس اور مطلع الشمس تک وہ پہنچ گئی تھی، اور اتنی بولیاں بولنے والوں پر اس کو حکومت بخشی گئی تھی جن کی بولی کو ان کی زبان سے کوئی مناسبت نہ تھی، وہ لوہے کی اینٹیں بنا بنا کر بجائے گارے کے رانگ کو گچھلا کر ان ہی اینٹوں کو ان سے جوڑ کر دیوار بناتے تھے، جس کے یہی معنی ہوئے کہ ایسے ایجادات و اختراعات پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی جسے سائنس و کیمیا کے اس عہد میں بھی حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اس سائنٹیفک دیوار کی تعمیر سے جب وہ فارغ ہوئے تو بجائے کسی کبر و ناز، تبختر و غرور کے جس میں عموماً ان حالتوں میں لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں، اسی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بندگی اور دینے والے کی خدائی کا اعتراف انھوں نے ان الفاظ میں کیا

ہذا رحمة من ربی
فاذا جاء وعد ربی
جعلہ دکاء وکان وعد
ربی حقاً۔
یہ ہے میرے مالک کی مہربانی، پھر جب
آئے گا فرمان میرے مالک کا تو
ہو جائے گی یہ ٹکڑے ٹکڑے اور ہے
وعدہ میرے مالک کا سچا۔

حالاں کہ اسی کے بالمقابل اسی سورہ میں اس شخص کی دماغی کیفیت جسے دُوبارغ اور ان کے درمیان کھیتیاں وغیرہ دی گئی تھیں اور درمیان میں بہنے والی نہروں سے جن کی سیرابی ہوتی تھی وہاں اپنے باغ میں داخل ہونے کے بعد بڑبڑاتا تھا تو یہ بڑبڑاتا تھا،

ما اظن ان تبید هذا بداً
میں نہیں خیال کرتا ہمارے یہ باغ کبھی

بھی برباد ہو سکتے ہیں۔

بسطی معیشت اور اس کی مختلف شکلوں کو جیسے ان شکلوں کے خصوصیات و علامات سے پہچانا جاسکتا ہے قدری معیشت میں بھی اسی قاعدے سے ہم کام لے سکتے ہیں، یعنی دوسروں کو اندازہ ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن جن پر گذرتی ہے وہ چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی معیشت کا قدری پیمانہ خدا نخواستہ دینے والے کے ساتھ کسی شوخی اور گستاخی کا نتیجہ تو نہیں ہے، وہی قرآن کی سورہ نون میں اور سورہ کہف کے قصہ یعنی باغ والوں کے باغ پر جو تباہی آئی تھی اور ان کی بسطی معیشت نے اچانک قدری رنگ جو اختیار کر لیا تھا، یعنی قدری معیشت کی وہ عتابی شکل تھی، سورہ کہف میں بھی ہے کہ باغ کی تباہی و بربادی کے بعد وہی گستاخ امیر خود اپنے اندر یہ احساس رکھتا تھا اور اس احساس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا تھا، قرآن ہی میں وہ منقول ہیں،

واحيط بثمره فاصبح يقلب كفيه
اور احاطہ کر لیا گیا اس کے باغ کی پیداوار کو

علیٰ ما اتفق فیہا وھما ویۃ
 علیٰ عر و شہا ویقول یا لیتنی
 لہما شرک برجی ۲ حد ۱۔
 (یعنی تباہ کر دی گئیں) تو وہ ملتا تھا اپنی
 ہتھیلیوں کو ان مصارف کو یاد کر کے جو
 باغ میں اس نے خرچ کئے تھے اور باغ

جو تھے وہ اپنی ٹھٹھریوں اور چھتوں پر اونڈھے پڑے تھے، کہتا تھا کہ اے کاش! ہم اپنے
 رب کے ساتھ کسی کو شریک اور سا جھی نہ بناتے۔

اسی طرح سورہ نون میں جن باغ والوں کا ذکر ہے، باغ کی تباہی اور اس کے متعلق بھائیوں میں
 جو گفتگو ہوئی اس کو نقل کرنے کے بعد خود ان ہی کی زبانوں سے قرآن نے اعتراف جرم کے جو الفاظ
 نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ

فا قبل بعضہم علی بعض
 یتلا و مومن قالوا یا ولینا
 ۲ انا کنا طاغین۔
 پھر ان میں بعض بعض کی طرف ملامت
 کرتے ہوئے متوجہ ہوئے اور بولے کہ
 افسوس ہے ہم پر ہم ہی لوگ سرکش تھے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پر گذرتی ہے وہ قدری معیشت کی اس انتقامی اور عتابی شکل کو خود
 پہچان لیتے ہیں اور ہوتا بھی ہے قدری معیشت کی اس شکل کا ظہور کچھ ایسے طریقہ سے کہ گرفت کے
 شعور کا دبانا مبتلا ہونے والوں کے لئے مشکل ہی ہوتا ہے، عہد بنی اسرائیل کے تین آدمیوں کا جو قصہ
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بخاری و مسلم کی جیسی صحیح حدیثوں کی کتابوں میں پایا جاتا ہے، جن میں

۱۵۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس شخص کا جو قصہ قرآن میں اوپر بیان کیا گیا ہے، اس میں کوئی جزا ایسا نہیں ہے
 جس سے معلوم ہو کہ شرک کا ارتکاب اس عام معنی کے لحاظ سے کیا تھا جسے عموماً لوگ شرک سمجھتے ہیں، یعنی خالق
 کے ساتھ کسی مخلوق کو اس لئے اپنا معبود بنالیا تھا اور خدا کے ساتھ خدا کی کسی مخلوق کو بھی وہ پوجتا تھا پھر
 سوال یہی ہے کہ کاش! اپنے مالک کے ساتھ میں کسی کو شریک نہ بناتا ان الفاظ سے وہ اپنے کس جرم کی طرف اشارہ
 کر رہا تھا، بات یہ ہے کہ شرک کی یہ تو بالکل چھپوری اور بھڑی شکل ہے جسے عام حالات میں لوگ شرک سمجھتے ہیں
 ممکن ہے کہ اس شرک میں وہ مبتلا نہ ہو، لیکن باغ میں داخل ہونے کے بعد اس کا یہ دعویٰ کہ اب یہ
 باغ اور اس کی کاشت کبھی تباہ نہیں ہو سکتے، دراصل یہ ان اسباب اور باغبانی و کشت کاری کے
 ان سامانوں کی طرف اشارہ تھا جن پر اعتماد کر کے مستقبل کے متعلق اتنا بڑا بول وہ بول رہا تھا اور ان چیزوں کو
 وہ اپنی دانائی و فرزانی، چستی و چالاکی، اپنی کارکردگی کی صلاحیتوں کا نتیجہ یقین کرتا تھا جس کے دوسرے
 معنی یہی ہوئے کہ خدا کے ساتھ بسطی معیشت کے ان مظاہر کی فراہمی میں وہ خود اپنے آپ کو بھی شریک
 کر رہا تھا اور اس کا یہی دعویٰ مشرکانہ دعویٰ تھا خود اس کو بھی اس کا احساس تھا، اسی مشرکانہ دعویٰ کے
 جرم میں وہ پکڑا گیا اور اس کی بسطی معیشت قدری معیشت سے بدلی گئی ہے۔ افسوس! کہ موجد ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود
 شرک کے اس خطرناک قرآنی جرم کی مسلمان بھی پرہیزگار نہیں کرتے ۱۲

ایک اندھا، ایک مبروص اور ایک گنجا تھا، تینوں کے امراض کا ازالہ بھی کیا گیا، اور غربت و افلاس کی جس قدری معیشت میں وہ گرفتار تھے ان سے بھی نجات عطا کی گئی اور جس قسم کا مال جو چاہتا تھا ہر ایک کو دیا گیا، بیان کیا گیا ہے کہ پھر ان میں ہر ایک کے پاس اسی شکل میں جس شکل میں وہ پہلے تھے، فقیہ کا بھی بنا کر خدا کا فرشتہ آیا، یعنی اندھے کے پاس اندھا، مبروص کے پاس مبروص، گنچے کے پاس گنچے کی شکل بنا کر فرشتہ آیا اور ان میں ہر ایک سے اس نے دستگیری کی التجا کی، جس کے جواب میں دونے (یعنی مبروص اور گنچے نے) تو جواب میں وہی بات کہی جو عموماً مانگنے والوں کو دینے والا طبقہ ایسے مواقع میں کہا کرتا ہے، یعنی دونے کہا

۱۔ الحقوق كثيرة۔ مجھ پر بہتوں کے حقوق ہیں (تمہیں)

(کہاں سے دوں)

روایت میں ہے کہ تب مانگنے والے نے مبروص سے کہا

کافی ۱ عرفک ۲ السم تکن
۱ مبرص یقدرک ۲ الناس
فقیر ۱ فاعطاک ۲ اللہ۔
اللہ تعالیٰ نے تجھے۔

اور یہی بات اس نے گنچے کو بھی یاد دلائی، یہ سن کر دونوں نے جواب میں کہا تھا
۱ نما و ترثت ہذا المال
کا برا عن کا بر۔
(یعنی پشتینی دولت ہے)

حدیث میں ہے کہ تب فرشتے نے دونوں کو یہ بد دعا دی کہ
۱ ان کنت کا ذبا فیصیرک ۲ اللہ
۱ لی ما کنت۔
(روایت میں ہے کہ وہی ہو گیا)

اور یہی مجھے کہنا تھا کہ ایسے مواقع پر اگر ان دونوں کی بسطی معیشت قدری معیشت سے بدل گئی ہو تو یہ کھلی ہوئی دلیل ہوگی اس بات کی کہ اس کی قدری معیشت قدرت کے انتقام اور عتاب کی شکل تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ معیشت کا بسطی رنگ دماغوں میں کبر و غرور کے بھپکار سے پیدا کر کے اگر بسطیوں کو طغیانی اور سرکشی پر آمادہ کرے تو یہ چنداں تعجب خیز نہیں ہے، قوت کا احساس اور اقتدار و اختیار کے دائرہ کی وسعت قدری دلوں میں فرح و استکبار کی کیفیت کو پیدا کرتی ہے اتراتے اور اکرٹتے ہوئے اگر ان کو دیکھا جائے تو حالات کے لحاظ سے یہ بعید نہیں لیکن قدری پیمانے پر روزی پالنے والوں کو بھی جب ان حالات میں مبتلا پایا جائے تو یقیناً بغاوت کی یہ کیفیت اس کی دلیل ہوگی کہ ایسوں کی قدری معیشت اسی قسم کی قدرتی بننا ہیستوں کو

دوسری سزاؤں کی مستحق بناتی چلی جاتی ہے، وہی جو حال بسطی معیشت کی سزائی قالب کا تھا۔ سمجھنا چاہیے کہ قدری معیشت کی یہ حالت بھی سزا ہی کا ایک قالب ہے، ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے قیامت کے دن جن سے حق تعالیٰ نہ خطاب فرمائیں گے اور نہ ان کا تذکرہ کیا جائے گا اور حق تعالیٰ کی نظر شفقت و کرم سے جو محروم رہیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح مسلم میں یہ حدیث مروی ہے کہ وہ حسب ذیل لوگ ہوں گے،

شیخ سزا۲۱ و ملک کذا۲۱ ب
بڈھا زانی، جھوٹا بادشاہ اور محتاج
و عائل مستکبر۔
اکڑ فونی دکھانے والا۔

مطلب حدیث کا وہی ہے کہ گناہ یوں تو بجائے خود گناہ ہی ہے، لیکن ایسوں سے اسی گناہ کا صدور جن سے اس گناہ کی توقع نہ ہو، ان کے گناہ کی شدت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے، اس وقت مجھے دوسروں سے بحث نہیں، بلکہ بتانا یہ ہے کہ امیری ہی نہیں، بلکہ کبھی کبھی غریبی بھی سزا کی بدترین شکل ہوتی ہے اور یہ وہی غریبی ہے جس کی طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے محتاج اکڑ فونی دکھانے والا۔

کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے لیکن جن کی قدری معیشت ان حالات سے دوچار نہیں ہے، عام حالات میں سمجھنا چاہیے کہ پھر وہ امتحان ہی کی ایک شکل اسی طریقہ سے ہے، جیسے عام حالات میں معیشت کا بسطی رنگ بھی عموماً ابتلا اور امتحان ہی کا ایک قدرتی اسلوب ہے، البتہ قدری معیشت کا ایک پاکیزہ ترین قدری رنگ وہ ہے جس سے سرفرازی کا استحقاق ہر بواہوس کی قسمت میں نہیں ہوتا اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہ چکا ہوں کہ معیشت کے اس قدری رنگ کو اختیار کرنے والے مختلف اغراض و وجوہ سے خود اختیار کرتے ہیں، سید الانبیاء و المرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ۲۱ الفقر فخری۔

کے جس فقرہ کو منسوب کیا جاتا ہے، محدثانہ تنقید کے معیار پر ممکن ہے کہ ان الفاظ کے انتساب کی صحت میں شک کیا جائے، لیکن پیغمبر اور پیغمبر کے گھرانے کی زندگی بلکہ پیغمبر کے جانشینوں نے عموماً معیشت کے جس نقشہ کو دنیا میں پیش کیا، سب اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے جو مذکورہ بالا فقرہ کا مفاد ہے، بلکہ صحاح کی ایسی حدیثیں مثلاً

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عرض علی ربی لیجعل لی بطحاء مکة
ذہبا فقلت لا یا رب ولكن اشبع
یوما و اجوع یوما فاذا جعبت
نضعت الیک و ذکر تک و اذا شبع
حمد تک و شکر تک۔
(رواہ الترمذی و احمد و ابن ماجہ و مشکوٰۃ)

میرے سامنے مکہ کی سنگریزوں والی سرزمین
پیش کی گئی کہ اسے سونا بنا دیا جائے تو میں نے
عرض کیا نہیں میرے رب! میں ایک دن
میر رہوں اور ایک دن بھوکا رہوں (یہ
چاہتا ہوں) تاکہ جب بھوکا رہوں تو ذکر گزاروں
آپ کھا گے اور یاد کروں آپ کو، اور جب
میر رہوں تو شکر کروں آپ کا۔

اور اس حدیث میں تو صرف بسطی معیشت سے ہی انکار فرمایا گیا ہے۔ اسی مشکوٰۃ میں ترمذی اور بیہقی وغیرہ کے حوالے سے یہ مشہور حدیث بھی مروی ہے، جس میں قدری معیشت کی اپنے لئے پیغمبر نے دعا فرمائی ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں،

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اللہم! حبیبی مسکینا و! متنی مسکینا و! حشرانی فی زمرۃ المساکین اٹھائیے مسکینوں کے گروہ میں۔

نہ صرف اپنے لئے بلکہ پہلے بھی کہیں ذکر گزر چکا ہے کہ اپنے گھرانے اور آل کے لئے بھی آپ یہی دعا فرماتے تھے۔

اللہم! جعل رزق ال محمد قوتا اے پروردگار محمد کے گھرانے والوں کو روزی صرف قوت (یعنی خوراک بھر دیجئے)

اور قدری معیشت کا یہ وہ قالب ہے جس کی روح تک نہ ہر شخص کی نظر پہنچ سکتی ہے اور نہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کوتاہ آستینوں کا وہ گروہ کر سکتا ہے جس کے تنگ سینوں، تنگ نگاہوں میں انسانی زندگی کی وہ وسعتیں سما سکتی ہیں جن کے اندر کائنات کا موجودہ محسوس نظام اور جو کچھ اس میں ہے چند حقیر تنکوں سے زیادہ وقت نہیں رکھتا، ہائے! ترمذی کی مشہور حدیث نبوی یعنی اللہ تعالیٰ نے (پیغمبر) سے فرمایا،

۱ غبطۃ اولیائی عندی لمومن
خفیف الحاذذ و حظ من
الصلوۃ ۲ احسن عبادۃ
سربہ و اطاعہ فی السر
و کان غامضا فی الناس
لا یشار الیہ بالاصابع
و کان سرزفہ کفنافا
فصبر علی ذلک۔

قابل رشک دوست میرا وہ مومن
بندہ ہے جو کم تباہ قلیل المعاش ہے
لیکن نماز میں اسے حصہ ملا ہے، اپنے
رب کی پوجا خوبصورتی سے کرتا ہے
اور (علانیہ ہی نہیں) پوشیدہ حالات
میں اسکی اطاعت کرتا ہے اور لوگوں
میں گم شدہ سارہا (یعنی اپنے آپ کو
نمایاں نہ کیا) اس کی طرف انگلیاں

نہیں اٹھائی جائیں، روزی اس کی بس ضرورت کے مطابق ہے اور اس پر صبر کئے رہا۔
اس کے بعد اللہ کے وہی رسول جو تلاش کرنے والوں کو اپنا پتہ بتاتے ہوئے کبھی فرماتے۔

۱ یغونی فی ضعفاء کم (ابوداؤد)
ڈھونڈا کرو مجھے ضعیفوں اور کمزوروں
یعنی غریبوں میں،

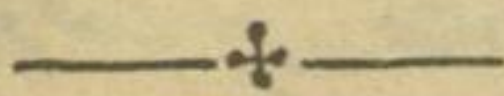
آخر میں اسی خفیف الحاذ (کم مایہ جز معاش) والے مومن کی طرف اپنی مبارک انگلیوں سے یہ اشارہ فرماتے ہوئے کہ بے پارہ کچھ دن دنیا میں جیا اور پھر آہ کہ

عجلت منته قلت بواکيه
 قتل تراشه -
 پھر جلدی آگئی موت اس کی، بہت کم
 تھیں اس پر رونے والیاں، ترک بھی
 چھوڑا اس نے کم ہی۔

قابل رشک زندگی کے اس بلند مینارے پر وہی قدم جما سکتا ہے جس پر آدم اور آدم کی
 اولاد کی یہ حقیقت واضح ہو چکی ہو کہ

ظاہر شس را پشه آرد بچرخ
 باطنش باشد محیط ہفت چرخ
 وہی یہ کہہ سکتا ہے اور اسی نے کہا بھی،
 مالی وللدنیا ما ۲ نا والدینا
 میرا اور دنیا سے کیا تعلق، میرا حال اور
 الا کراکب ۲ ستظل تحت
 دنیا کا حال تو ایسا ہے جیسے ایک سوار
 شجرة شمس ۲ ح و ترکھا۔
 ہو، چھاؤں میں کھڑا ہو کسی درخت کے
 (الترمذی فی جامعہ)
 پھر درخت اور اسکی چھاؤں کو چھوڑ کر چل دیا۔

صدق مولنا العزیز
 ان الدار الاخرة لھي الخیر
 اور پھلا گھر ہی ہے زندگی کا گھر۔



الجد الامین الفانی

السید مناظر احسن گیلانی غفر اللہ لہ ولمن ربہ
 گیلان (بہار) محراب ہدایت والارشاد "عرش جدید"

اسلامی معاشیات

کے

قانونی ابواب

اس وقت تک آپ کے سامنے اسلام کے معاشی
 کلیات جو زیادہ تر قرآن مجید کی آیات ہی سے ماخوذ ہیں
 پہلی جلد کی شکل میں پیش ہوئے ہیں۔ اب ان ہی کلیات کو
 پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام میں جو قوانین نافذ کئے ہیں
 فقہاء اسلام نے قرآن اور سنت کی روشنی میں جن خبریات کو
 پیدا کیا ہے ان کی تفصیل اس حصہ میں آپ کو ملے گی۔

مناظر احسن گیلانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی معاشیات

حصہ دوم

قانونی ابواب

صحاح کی مشہور حدیث ہے کہ بندے قیامت کے دن اس وقت تک اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہیں گے جب تک کہ چار باتوں کے جواب سے فارغ نہ ہوں، ان ہی چار گانہ سوالات میں ایک بڑا اہم سوال یہ بھی ہو گا کہ

عن مالہ من ایزاک تسبہ
وفیم انفقہ۔
آدمی سے پوچھا جائے گا اپنے مال سے
یعنی اس مال کو کن ذرائع سے اس نے

حاصل کیا اور کن راہوں پر خرچ کیا۔

سچ پوچھیے تو معاشیات کے قانونی یا فقہی مسائل کا تعلق ان ہی دو باتوں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں خیال کیجئے کہ دولت کے دخل و خرچ کے متعلق اسلام نے مسلمانوں کو جو عملی ضابطہ دیا ہے، اب آپ کے سامنے اس کی تفصیل پیش ہو گی، دولت عباسیہ کے پہلے قاضی القضاۃ قاضی ابویوسف نے بھی اپنی سیاسی و معاشی کتاب ”کتاب الخراج“ جو خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش سے لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی قاضی صاحب نے تمہید کلام میں اسی حدیث کو اسلامی معاشیات کی بنیاد قرار دیا ہے۔

اس ”معاشی ضابطہ“ کے اساسی قوانین کو پیش نظر رکھ کر فقہاء اسلام رحمہم اللہ اجمیع نے جزئیات کے متعلق، دفتر کے دفتر جو تیار کر دیئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس مختصر سی کتاب میں ان سب کا احاطہ ناممکن ہے

تاہم میں کوشش کروں گا کہ ایک خاص ترتیب سے اس سلسلہ کے اہم مسائل کو اپنی اپنی جگہ پر درج کر دوں، ہو سکتا ہے کہ راہ بن جانے کے بعد آئندہ کام کرنے والے اس پر اور اضافہ کریں۔

معاشیات کے دو اسکول

پہلا اسکول | واقعہ یہ ہے کہ مشاہدہ اور تجربے کے سوا خود قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے بنی آدم میں ایک طبقہ ان لوگوں کا پایا گیا ہے جو مالیات یا تحصیل دولت و صرف دولت دونوں کو ہر قسم کی اخلاقی و مذہبی پابندیوں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے "کمانا چاہے" خواہ کسی ذریعہ سے ہو "اڑانا چاہے" خواہ خرچ کی جو راہیں بھی ہوں۔

اس سلسلہ میں یہاں تک دیکھا گیا ہے اور اب بھی دیکھا جاتا ہے کہ جن کی زندگی بظاہر دینی اور شرعی ہوتی ہے، یعنی نماز، روزہ، حج و قربانی ان تمام امور کے وہ پابند ہوتے ہیں، لیکن یہی لوگ جو اس قسم کی مذہبی پابندیوں کو اپنے لئے لازم سمجھتے ہیں، مالیات کے مسئلہ میں ہر قسم کی بے قیدیوں کا دیدہ دلیری سے ارتکاب کرتے ہیں، اس مکتب خیال یا مسلک عمل کا تذکرہ قرآن نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے ذکر میں کیا ہے، یعنی حضرت شعیب نے جب ان پر معاشی قوانین کی پابندیوں کو عائد کرنا چاہا تو ان کو جواب دیا گیا کہ

قالوا یا شعیب ۱ اصلواتک
تاصرک ان نترک ما یعبد
۲ یا عبادنا وان لفعل فی ۲ موالنا
ما نشاء۔ (سورہ ہود ع ۹)

انہوں نے کہا شعیب! کیا تمہاری نمازیں
یہ حکم کرتی ہیں کہ جن معبودوں کو ہمارے
باپ دادا پوجتے تھے انہیں ہم چھوڑ بیٹھیں
اور یہ کہ ہم اپنے اموال (دولت) کے متعلق

جو چاہیں کریں (اس میں وہ رکاوٹ پیدا کرتی ہیں)

صرف یہی نہیں بلکہ قوم شعیب کے معاشی ماہرین نے ان کے طرز عمل پر اظہار تعجب کیا اور ان کی عقل و فہم جس کا ایک مدت سے تجربہ تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان روشن خیالوں نے طرز کے لہجہ میں کہا کہ

۱ انک لانت الحلیم الرشید
(سورہ ہود)

تم تو بڑے بھاری بھر کم باوقار و سوجھ بوجھ
کے آدمی ہو۔

بہر حال معاشیات کا یہ تو ایک آزاد مکتب خیال ہے تحصیل دولت کے ذرائع پر بہ ظاہر ان کے نزدیک کسی قسم کی قید عائد کرنا سوجھ بوجھ عقل و دانائی کے خلاف ہے بلکہ جس کو جس وقت جس ذریعہ سے بھی حصول دولت کا موقع ملے بد عقلی ہوگی کہ اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے یا روپیہ رہتے ہوئے اپنی خواہش خواہ جس بات کی ہو آدمی پوری نہ کرے۔ قرآن نے جن الفاظ میں ان کے اس معاشی نظریہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب جو عموماً لوگوں کے خیال میں پوجا پاٹ یا "صلوٰۃ" میں منحصر ہے۔ معاشی کاروبار میں اس کی دخل اندازیوں کو وہ ناپسند

کرتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے کہا کہ تمہاری نمازیں کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم اپنے اموال کے متعلق جو چاہیں کریں۔

دوسرا مکتب خیال | اسی کے مقابلہ میں معاشیات ہی کا ایک دوسرا اسکول بھی ہے جو دوسرے پہلوؤں کی طرح انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو بھی چند خاص حدود میں رکھنا چاہتا ہے، یعنی وہی بات جو حدیث میں آئی کہ من ۲ مین ۲ کتبہ و فی ما ۲ نفقہ (کہاں سے کمایا اور کس راہ میں خرچ کیا) دونوں پر نگرانی قائم کرنا چاہتا ہے، تقریباً ہر زمانے میں اس طبقہ کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔ عملی طور پر خواہ اس اصول کے ماننے والوں کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو، لیکن نظری حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اکثریت کم از کم زبان سے اس نگرانی کی ہمیشہ حامی رہی ہے۔ اسی لئے چوری، ڈاکہ، رشوت، خیانت، دھوکا وغیرہ ذرائع کسب کو اچھی سوسائٹیوں میں ہمیشہ بری نظروں سے دیکھا گیا ہے، غالباً اسی بنا پر دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک میں حد بندی عائد کرنے والے معاشی قوانین پائے جاتے ہیں، اسلام کا تعلق بھی ثانی الذکر طبقہ سے ہے اور اس وقت میں انھیں پابندیوں کی کئی حیثیت سے تفصیل کرنا چاہتا ہوں جو ان دونوں امور یعنی من ۲ مین ۲ کتبہ یا دوسرے لفظوں میں ”دخل“ اور ”نفقہ“ یا ”خرج“ اسلام نے عائد کئے ہیں، دونوں سوالوں پر دو مستقل عنوانوں کے نیچے بحث کی جائے گی۔

دخل

دخل یعنی مال و دولت کے کمانے اور ان سے استفادہ کے ذرائع پر اسلام نے جو قیود عائد کئے ہیں، اس کی تفصیل کے سمجھنے کے لئے چاہیے کہ ”اجمالاً پہلے دنیا کی چیزوں کی اس تقسیم کو سمجھ لیا جائے جو معاشی حیثیت سے اسلام میں اختیار کی گئی ہے۔“

اسلام میں اشیاء کی معاشی تقسیم | واقعہ یہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں اگرچہ مالی مسائل کو مختلف ابواب کے ذیل میں منتشر کر کے بیان کیا گیا ہے، لیکن تمام ابواب کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر منطقی طریقہ سے چاہیں تو ہم ان کو یوں تقسیم کر سکتے ہیں، یعنی ان چیزوں کا بنی آدم میں کوئی مالک ہے یا نہیں، اگر مالک نہیں ہے تو قبضہ کرنے کے بعد بھی آدمی ان کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں، اسی طرح جن چیزوں کا کوئی مالک ہے ان کی بھی دو صورتیں ہیں، مالک کی مرضی کے بغیر اسلام ان پر دوسروں کو قبضہ کرنے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں، اگر دیتا ہے تو اس کی کتنی صورتیں ہیں، اور نہیں دیتا ہے تو پھر ان چیزوں کے مالک ہونے کے قانونی ذرائع کیا ہیں اور اسلام ان قانونی پابندیوں کو ان چیزوں کے مالک ہونے کے لئے کیوں ضروری قرار دیتا ہے۔ چونکہ ان تمام منطقی شقوں کے نیچے کچھ نہ کچھ چیزیں داخل ہیں اس لئے میں ہر ایک پر الگ الگ بحث کرتا ہوں۔

ایسی چیزیں جن کا اسلامی نقطہ نظر سے کوئی مالک نہیں ہے ”ہدایہ میں ہے۔“

الانتقاع بسما ۲ بحسب سندر دریا کے پانی سے استفادہ کی

کالا انتفاع بالشمس والقمر

واللهو ۲۴ (کتاب الشرب ج ۴)

ان سے استفادہ کا عام حق حاصل ہے)

نوعیت وہی ہے جو آفتاب، ماہتاب اور
ہوا سے استفادہ کا حکم ہے (یعنی ہر شخص کو)

جس سے معلوم ہوا کہ سمندر دریا وغیرہ اور ان کا پانی اور آفتاب ماہتاب وغیرہ اور ان کی روشنی اسی طرح
ہوا اور فضا کا کوئی مالک نہیں ہے۔ اسی طرح ہوا کے پرندے جنگل کے جانور، سمندر کے حیوانات ان سب کا
کوئی مالک نہیں ہے اور یہی حال جنگل، پہاڑ وغیرہ کے درختوں اور دیگر نباتات کا ہے کہ نہ ان کا کوئی
مالک ہے اور نہ ان کے پھلوں کا بلکہ ہر شخص کے لئے وہ شرعاً مباح اور جائز ہیں، قاضی ابو یوسف
کتاب الخراج میں اخروٹ، بادام وغیرہ کے خورد و جنگلی درختوں اور شہد وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۲ اذکان فی اطمافوس

والجبال علی الاشجار او فی

الکھوت فلا شئ فیہ وهو

بمنزلة الثمار تکون فی

الجبال والاودية۔

جب یہ چیزیں صحرا اور پہاڑوں میں درختوں

میں یا پہاڑ کے غار میں ہوں تو ان پر

کچھ نہیں (یعنی حکومت ان پر کوئی محصول

عائد نہیں کر سکتی) اور ان کا حال ان

پھلوں کا ہی جو پہاڑوں اور وادیوں میں ہو

باقی اراضی یعنی زمین کی بھی اسلام میں چند قسمیں ہیں، صاحب بدائع نے ان اقسام کو اس طرح بیان کیا ہے۔

۲ الارض فی الارض اصل نوعان

مملوكة والارض من مباحة

غیر مملوكة والمملوكة نوعان

عامرة وخراب واطباحة

۲ ایضاً نوعان نوع هو من

مرفق ۲ البلد و محتطباتهم

ومرعی مو ۲ شیهم ونوع

لیس من مو ۲ فقها وهو

۲ طسعی بالموات۔

زمین کی دراصل دو قسمیں ہیں، زمین جو

کسی کی ملک ہو، ایک قسم، دوسری قسم

مباح یعنی کسی کی ملکیت میں نہ ہو، پھر

جو زمین کسی کی ملک ہے اس کی بھی دو

قسمیں ہیں آباد اور غیر آباد۔ اسی طرح

غیر مملوکہ مباح زمین کی بھی دو قسمیں

ہیں۔ ایک وہ جس کا شمار بلدہ (آبادی)

کی سہولت آفرینیوں سے ہو مثلاً لکڑی

حاصل کرنے کی جگہ ہے، مویشیوں کی

چراگاہ ہو، اور دوسری وہ جس کا شمار مرفق سہولت آفرین خطہ سے نہ ہو اسی کا نام

الموات ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ زمین کی بعض قسمیں غیر مملوک بھی ہوتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ان پر کسی کا قبضہ
نہیں تو ان کے مملوک ہونے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، سوال اس کے بعد ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے تملیک
کی کیا شکل ہے۔ عام طور سے ان چیزوں کے مالک ہونے کا طریقہ اسلام نے بھی وہی اختیار کیا ہے جو عموماً
دنیا میں مروج ہے، البوداؤد میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

جس پر کسی مسلمان کا پہلے قبضہ نہ ہو جو پہلی دفعہ قبضہ کر لے گا وہی اس کا زیادہ حقدار ہے

من سبق الی مالہ سبق
الیہ مسلم فهو احق بہ۔

فقہاء نے اس حدیث کی بناء پر یہ قانون پیدا کیا، جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔

یعنی پہلی دفعہ جس کا قبضہ اس پر ہوگا وہی اس کا مالک ہو جائے۔

من سبق ید یہ الیہ
ملکہ۔

مثلاً کہتے ہیں کہ

جنگل میں جو لکڑی کاٹ لے اور
شکار کر کو جو شکار کر لے وہ اسی کا
ہوگا۔

من احتطب احتطب فمقارۃ
فہولہ ومن اصطاد صیدا
فہولہ۔

لیکن باوجود اس عام قانون کے چند چیزیں ایسی ہیں جن کو اسلام میں بعض خاص شرائط کے ساتھ اس قانون سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزیں جن پر کسی کا قبضہ ہی نہیں ہو سکتا اور ان کو وہ اپنی حفاظت میں نہیں لے سکتا مثلاً آفتاب و مہتاب، ہوا وغیرہ ان کا تو ظاہر ہی ہے کہ آدمی مالک نہیں ہو سکتا، ہدایہ میں ہے کہ

آفتاب مہتاب ہوا سے فائدہ اٹھانے
سے کوئی روکا نہیں جاسکتا جس طرح چائے
ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔

الانتفاع بالشمس والقمر
والهواء فلا يمنع من الانتفاع
علیٰ وجہ شاع۔

اسی بناء پر فقہاء کا یہ مسئلہ ہے کہ دو منزلہ مکان کی پختی منزل کا کوئی اگر مالک ہو اور اوپر والی منزل کا کوئی اور پھر اوپر والی منزل اگر گر جائے تو اس فضا یا ہوا کو جس میں یہ اوپر والی منزل تھی اس کو کوئی بیچ نہیں سکتا ابن ہمام نے اس کی وجہ فتح القدیر میں یہ لکھی ہے کہ مکان کو بلند کرنے کا جو حق اس کو حاصل تھا وہ

ایک ایسا حق ہے جو ہوا کے ساتھ قائم
ہے اور ہوا کوئی مال نہیں ہے جسے بیچا جائے

حق متعلق بالهواء وليس الهواء
مالاً یباع (۲۴۱ مطبوعہ مصر ج ۵)

لیکن علاوہ ان چیزوں کے اور بھی چند امور ہیں جن پر خواہ کسی کا قبضہ ہی کیوں نہ ہو جائے پانی، آگ، گھاس | لیکن عام مفاد کے لئے اسلام نے یہ قرار دیا ہے کہ انفرادی طور پر قانوناً کوئی ان مالک نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انھیں عام پبلک پر اپرٹی قرار دینا چاہتا ہے، اس سلسلہ میں عموماً کتابوں میں اگرچہ تین ہی چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے یعنی مشہور حدیث ہے۔

لوگ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے
ساحبی اور شریک ہیں یعنی الماء (پانی)

الناس شرکاء فی الماء
والکلاء والنار (صحاح)
الکلاء (گھاس) النار (آگ) میں۔

اسی حدیث کی بناء پر پانی، گھاس، آگ میں "الناس" یعنی عام پبلک شریک سمجھی جاتی ہے۔

لیکن صرف ان ہی تین چیزوں تک اشتراک کے قانون کو محدود سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس ذیل میں اور بھی ایسی چیزیں ہیں جن کو انفرادی ملکیت قرار دینے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ

ملک ۱۔ احد بالاحتجار ملک
منعہ فضاق علی الناس
فان اخذ العوض عنه
۲۔ غلاۃ فخرج عن الموضع
الذی وضعہ اللہ من
تقسیم ذوی الحوائج من
غیر کلفة، (المغنی)
(ص ۱۵۷ ج ۲)

اگر احاطہ بندی کر کے کوئی اس کا مالک
ہو جائے گا تو لوگوں کو اس سے روکے گا
اور عوام ضیق تنگی میں مبتلا ہو جائیں گے
اور اگر اس کا معاوضہ لے گا تو اسے
گمراہ دے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق
تعالیٰ نے جس غرض کے لئے اس چیز کو
جو مقام عطا کیا تھا وہاں سے وہ چیز
ہٹ جائے گی یعنی عام حاجتمندوں

کی ضرورت بغیر کسی کلفت و مشقت کے پوری ہو رہی بات جاتی رہے گی۔

اسی لئے علامہ ابن قدامہ نے اس سلسلہ میں حسب ذیل چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔

المعادن ۱۔ الظاہرۃ وہی اللقی
یوصل ما فیہا من غیر صونۃ
ینتاجها الناس وینتفعون بها
کالطح واطماء واکبریت
والقیروالمومیاءوالنفث
والکحل والیاقوت ومقاطع
الطین واشباہ ذلک۔

ظاہری معادن ان کو کہتے ہیں جن تک
بغیر کسی محنت و مشقت کے رسائی حاصل
ہو سکے لوگوں کی اس پر آمد و رفت جاری
ہو، اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے
ہوں، مثلاً نمک، گندھک، تیک (ڈامر)
مومیائی، نفت (مٹی کا تیل) سرمہ، یا قوت
یا مٹی نکالنے کی جگہ ہو۔

علامہ لکھتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ چیزیں۔

لا تملک بالاحیاء ولا یجوز
۱۔ قطعہا لاحد من الناس
ولا احتجارها دون
۲۔ المسلمین لان فیہ ضرار
بالمسلمین وتضییق علیہم
پہنچے گا اور ان پر تنگی ہوگی۔

نہ آباد کرنے اور حکومت سے جاگیر ملنے
کی وجہ سے ان امور کا کوئی مالک ہوتا ہے
اور نہ یہ جائز ہے کہ عام مسلمانوں پر
اس سے استفادہ کی راہ بند کی جائے
کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان

فقہاء نے اس قانون کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث سے مستنبط کیا ہے جو ابوداؤد،
ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ابیض بن حمال نامی صحابی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ان کی درخواست پر مآرب (بیمن) کے ایک کھارے چشمہ کو بطور جاگیر کے عطا فرما دیا، لیکن سند لے کر جب روانہ ہوئے تو لوگوں نے عرض کیا کہ حضورؐ نے خیال نہیں فرمایا کہ اس شخص کو جاگیر میں کیا چیز عطا فرمادی گئی وہ تو ایک نہ ختم ہونے والا جاری چشمہ ہے، حضورؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر ارشاد فرمایا "فلا اذن" یعنی جب وہ ایسا چشمہ ہے تو پھر وہ جاگیر میں نہیں دیا جاسکتا، اسی لئے فقہاء نے یہ طے کر دیا ہے کہ حکومت اس قسم کی چیزیں کسی کو جاگیر میں بھی دے جب بھی وہ کسی کی جاگیر نہیں بنے گی، اور وہ ہر حال میں پبلک جائداد ہی رہے گی۔

علاوہ ان معادن کے فقہاء نے انھیں مصالح کی بنا پر لکھا ہے کہ

لیس للامام ان یقطع مالا
غنی للمسلمین عنہ یعنی
۱۰ اذ كانت اجمۃ ۱۰
غیضۃ ۱۰ و بحر یشربون منه
۱۰ و محلة لا اهل ببلدة
فلیس للامام ان یقطع
ذلک لاحد۔
(عنایہ بر حاشیہ ہدایہ ص ۳۸۲ ج ۲)

ایسی چیزیں جن سے عموماً مسلمان بے نیاز
نہیں ہو سکتا یعنی ان کی عام ضرورت
کی چیزیں ہوں تو حکومت کو حق نہیں
ہے کہ کسی خاص آدمی کی جاگیر میں ان کو
دے دے، مثلاً اجمہ (آبی نیستان)،
یا جنگل ہو، یا دریا ہو جس سے پانی
پیتے ہوں یا نمک بنانے کی جگہ کسی خاص
آبادی کی ہو، جائز نہ ہو گا کہ امام کسی کو

یہ چیزیں جاگیر میں دے دے۔

اسی طرح آبادی کی چہرہ گاہیں یا ارد گرد کی جھاڑیوں جن سے لوگ ایندھن کا کام لیتے ہیں یا آبادی کے اطراف
کی ایسی زمین جن پر کھلیان وغیرہ لگاتے ہیں اور ان کا کوئی مالک نہ ہو تو فقہاء نے لکھا ہے

ماکان خارج البلد
من صرۃ فقہا و محتطباً
لا اهلها ۱۰ و مرعی لخصم
لا یكون موطاً تاحتی لایملک
الامام اقطاعها۔

آبادی سے باہر جو سہولت کی چیزیں ہوں
اور باشندوں کی لکڑی حاصل کرنے کی جگہ
ہوں، تو یہ ساری چیزیں نہ موات (یعنی ایسی
زمین نہیں ہو سکتی ہیں جنہیں آباد کر کے
کوئی ان کو ذاتی ملک بنا سکتا ہے) اور

نہ امام (حکومت) کسی کو جاگیر میں یہ چیزیں دے سکتی ہے۔

زرعی نے اس دفعہ کو نقل کرتے ہوئے یہ لکھا ہے۔

فتاء العامر فینتفعون
بہ لانهم محتاجون
الیہ لرعی موطاً شیخہم
وطرح حصا عدہم

آبادی کے اطراف و اکناف کی زمین کا
بھی یہی حکم ہے کہ عام لوگ اس سے نفع
اٹھاتے ہیں، لوگ اپنے مویشیوں کے
چرنے کے لئے اور کھلیان لگانے کے لئے

فلم یکن انتفا عھم
منقطعا عنه ظاھراً
فلا یكون موثقاً۔

(زیلعی برہانہ ص ۳۸۰ ج ۲)

اس کے محتاج ہیں اور اس وجہ سے استفادہ
جو حق ہے وہ اس قسم کی زمینوں سے منقطع
نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کا شمار
الموات (آباد کر کے آدمی جس کا

مالک ہو سکتا ہو) اس میں شمار نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے جب ان چیزوں میں انفرادی ملک کو ناجائز ٹھہرایا ہے تو ظاہر ہے کہ شاہراہ عام
یا عام آب پاشی کے ذرائع جنھیں یوں بھی پبلک کی ملک خیال کیا جاتا ہے ان میں انفرادی ملک کو
کس طرح جائز قرار دیا جاسکتا ہے، فقہ کی کتابوں میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے کہ جس طرح
مندرجہ بالا امور کو حکومت کسی کی انفرادی ملک نہیں قرار دے سکتی اسی طرح

لاقطاعہ کمشارع الماء
وطرقات المسلمین۔

(ابن قدامہ ص ۱۵۸ ج ۶)

جائز نہ ہوگا کہ پانی کے خزانوں اور مسلمانوں
کی عام شاہراہوں کو حکومت کسی کی
جاگیر میں دے دے۔

نہ حکومت دے سکتی ہے اور نہ آبادی کے باشندے ان پر قبضہ کر کے اپنی ملک بنا سکتے ہیں، کفایہ شرح ہدایہ میں ہے
وکن الا یجوز احیاء
ما تعلق به حق العامة
کما فی النہر والطریق۔

(ص ۳۸۲ ج ۲)

خلاصہ یہ ہے کہ پانی، آگ، گھاس اور ایسے معادن جن کی پیداوار کے حاصل کرنے میں کسی
محنت و مشقت، جدوجہد اور مصارف کی ضرورت نہیں ہوتی اور عام لوگوں کی ضرورت کی چیزیں ان
سے برآمد ہوتی ہوں، آبادی کی چراگاہیں، جنگل جھاڑ جن کا کوئی مالک نہ ہو، آبادی کے اطراف
کی وہ زمین جس میں آباد کار اپنے زرعی کاروبار کرتے ہوں مثلاً کھلیان وغیرہ لگاتے ہوں یا شوارع
عام (عام راستے) یا آبپاشی کے عام خزانے وغیرہ ایسی چیزیں نہ حکومت کسی کو انفرادی طور پر ان کا
مالک بنا سکتی ہے اور نہ قبضہ کر کے خود کوئی ان کو اپنی انفرادی ملک بنا سکتا ہے، اگر کوئی قبضہ بھی کر لے گا
تو قانوناً غلط ہوگا اور ہمیشہ یہ پبلک جائداد ہی سمجھی جائے گی، گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام ان امور
کے متعلق اپنا نقطہ نظر اشتراکی رکھتا ہے، اجمالی طور پر تو ان امور کا یہی حال ہے، لیکن فقہاء نے ان کی
مختلف قسموں پر غور کیا ہے اور بعض چیزوں کو اشتراک کے اس حکم سے مستثنیٰ بھی کیا ہے، مثلاً پانی کی
انہوں نے چار قسمیں قرار دی ہیں، صاحب بدائع لکھتے ہیں

پانی کی مختلف قسمیں اور ان کے مختلف احکام | صاحب بدائع لکھتے ہیں۔

پانی کی چار قسمیں ہیں، پہلی قسم پانی کی

المیاء اربعة انواع الاول

الماء الذي يكون في الارض
والظروف والثاني الذي
يكون في الآبار والبحياض
والعيون الثالث ماء الانهار
الصغار التي تكون اقوام مخصوصين
والرابع ماء الانهار العظام
كجيمون سيمون ودجلة
والفرات.

وہ ہے جو برتنوں اور ظروف میں ہو،
دوسری قسم وہ ہے جو کنوؤں اور حوضوں
اور چشموں میں ہو، تیسری قسم وہ ہے جو
ان چھوٹے دریاؤں اور ندیوں میں ہو
جن کا تعلق خاص خاص قوموں سے ہو
چوتھی قسم وہ ہے جو بڑے بڑے دریا
جیسے جیمون اور سیمون، دجلہ و فرات
وغیرہ میں ہو۔

بڑے بڑے پانی کے ان چار اقسام کے متعلق بالاتفاق سب کا یہ مذہب ہے کہ جو پانی بڑے
دریا کا پانی بڑے دریا مثلاً جیمون و سیمون یا ہندوستان میں گنگا جمنہ کرشنا گوداوری کا ہے
یہ ملک کے تمام باشندوں کا پانی ہے۔ ہر شخص کو اس سے خود پینے کا جانوروں کو پلانے کا اور کھیتوں
باغوں کے سینچنے کا قانونی حق ہے۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں۔

الانهار العظام كسيمون
وجيمون ودجلة والفرات
ونحوها فلا ملك لاحد
فيها ولا في ساقية
النهر ولا لاحد حق خاص
فيها ولا في الشرب بل
هو حق عامة المسلمين
فلكل احد ان ينتفع
بهذا الانهار بالشفة
والسقي.

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ ان دریاؤں سے وہ نوشیدنی اور سیرابی دونوں قسم کے منافع اٹھا سکتا ہے

بڑے دریاؤں سے نہریں کا نکالنا صرف یہی نہیں بلکہ ان دریاؤں سے نہر کاٹ کر اگر کوئی اپنی زمین میں لائے اور کسی دوسرے
کی زمین اس کے اس فعل سے برباد نہ ہوتی ہو یا باشندگان ملک کو اور کسی قسم کا نقصان
نہ پہنچتا ہو تو کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ نہر کھودنے سے اس کو روکے حتیٰ کہ حکومت بھی یہ نہیں کر سکتی۔
بدائع میں ہے۔

له ان يشق ليها نهرا
من هذا الانهار وليس
اس کا بھی ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنی
زمین تک ان دریاؤں سے نہر کاٹ کر لے جا

للا مام ولا لا حد منعه
عنه يضرب جملہ اولم یضرب
اس کو روک کے بشرطیکہ اس نہر کی وجہ سے کسی کو ضرر نہ پہنچے۔

ان دریاؤں کے پانی کی قوت سے چکی وغیرہ | اسی طرح ہر باشندہ ملک کو اس کا بھی حق
چلانا یا موٹ چسرس ان پر قائم کرنا ہے کہ اس قسم کے دریاؤں اور ندیوں پر۔
ان ۲ نصب علیہ رحمۃ اللہ
وسانیۃ (ہدایہ)
کہ ان پر پن چکی اور زہٹ موٹ وغیرہ قائم کرے۔

البتہ حکومت اور پبلک دونوں کو اس کا حق ہے کہ اس کے ان افعال سے خود نہریا دریا کو کوئی نقصان
نہ پہنچے اس کی نگرانی کریں۔ بدائع ہی میں ہے۔

کل واحد بسبیل من
الا انتفاع لا کن بشریطۃ
عدم الضرر بالنہر
کالا انتفاع بطریق العامہ
وان ۲ ضرر بالنہر فلکل
واحد من ۲ المسلمین منعه۔

اگرچہ ہر شخص کو نفع گیری کا حق حاصل
ہے بشرطیکہ اس کی نہر کی وجہ سے کسی کا
کچھ نقصان نہ ہوتا ہو، وہی حکم اس کا بھی
ہے جو عام شاہراہوں کا ہے۔ لیکن اگر
اس سے نہر کو نقصان پہنچتا ہو تو ہر مسلمان کو
حق ہے کہ اس فعل سے اس کو روک دے۔

دریاؤں کے سوا پانی کے اقسام | اسی طرح پانی کی دوسری اور تیسری قسم یعنی مخصوص افراد
کی زمین میں جو نہر میں ہوتی ہیں یا مملوکہ زمینوں کے تالاب اور کنوؤں کا پانی اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ
حق ۲ الشفۃ ثابت
نوشیدنی کا ہر حق پبلک کے ہر فرد کو اس میں حاصل

یعنی خود پینے یا اپنے جانوروں کو پانی پلانے کا حق تو اب بھی عام پبلک کو حاصل ہے۔ البتہ چونکہ مملوکہ
زمینوں سے اس پانی کو تعلق ہے۔ اس لئے زمین کے مالکوں کی اجازت کے بغیر دوسروں کو اس پانی
سے باغوں یا کھیتوں کے سینچنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہدایہ میں ہے۔

فات ۲ اسل درجل ۲ ن یسقی
بذلک ۲ ارضنا ۲ حیاء کا زلاہل
النہر ان یمنعوا عنه ۲ اضر جملہ
۲ اولم یضرب۔ (ہدایہ ص ۳۸۶ ج ۲)
اگر کوئی اپنی آباد کردہ زمین کو اس قسم
کے پانی سے سینچنا چاہے تو نہروالوں کو
حق ہے کہ اس کو روک دیں، خواہ
نقصان ہو، یا نہ ہو۔

نہروں کنوؤں تالابوں کے | مگر باایں ہمہ اس قسم کے پانی کے نیچنے یا اجارہ کی بھی اجازت
پانی کے فروخت کا حکم | نہیں ہے فقہار اس باب میں ایک حدیث بھی نقل کرتے ہیں۔
نھی رسول ۲ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عن بیع نبع ۲ البیر۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کنوؤں
کے سوت کے پانی کو کوئی فروخت کرے۔

”بیع البئر“ کا ترجمہ صاحب بدائع نے ”فضل ماہا“ یعنی کنوؤں کا زائد از ضرورت پانی کیا ہے۔ بہر حال اس حدیث کی وجہ سے پینے پلانے سے تو کسی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن اگر ہر شخص کو ایسی نہروں یا تالابوں یا بابلوں سے آبپاشی کی عام اجازت دیدی جائے گی تو جیسا کہ صاحب بدائع لکھتے ہیں

کل احد یتبادر ۱۲ لیسہ
فیستقی منه زرعہ و اشجارہ
فیبطل حقہ ۱۳ صلا۔

ہر شخص پیشقدمی کرے اس پانی سے نفع اٹھانا چاہے گا اور اس سے اپنے کھیت اور باغ کو سیراب کرے گا

بس نہروں کا حق مارا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے پانی میں اشتراکیت کا نظریہ صرف ”حق الشفۃ“ یعنی نوشیدنی تک محدود ہے، پھر فقہاء نے اس کی مختلف شکلوں کے احکام بھی لکھے ہیں۔ مثلاً اگر کنواں یا تالاب کا مالک پبلک کو اپنی زمین سے آنے سے روکے اور کہے کہ قانوناً پانی پر تمہارا حق ہے لیکن میری مملوکہ زمین کے احاطہ میں داخل ہونے کی تو اجازت نہیں، تو ایسی صورت میں دیکھا جائے گا اگر نوشیدنی کی ضرورت پبلک کسی اور ذریعہ سے پوری کر سکتی ہے تو جھگڑنے کی حاجت نہیں۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر کنوؤں کے مالک کو مجبور کیا جائے گا کہ یا تو وہ لوگوں کو اپنے کنوئیں سے پانی لینے دے ورنہ کوئی نظم کرے کہ لوگوں تک ان کا قانونی حق پہنچ جائے یعنی ان کے جانوروں تک پانی پہنچ جائے۔ اس حق پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ دونوں باتوں میں سے کسی پر راضی نہ ہو تو پبلک کو حق ہے کہ باضابطہ مسلح ہو کر اس سے جنگ کریں اور اپنا حق حاصل کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسی قسم کی ایک صورت پیش آئی تو آپ نے فرمایا۔

حلا وضعتم فیہم ۱۴ السلاح (بدائع) تم نے لوگوں کے درمیان ہتھیار کیوں نہ ڈالا۔

پانی کی وہ قسم جو بیک سکتی ہے | یعنی پانی کی چوتھی قسم یعنی جب برتنوں یا مشکوں میں پانی بھر لیا گیا ہو تو اس قسم کے پانی میں انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے صاحب بدائع لکھتے کہ اب اس پانی کی کھیت ایسی ہو گئی کہ

کما ۱۵ ستولی علی الخطیب کوئی جنگل کی لکڑیوں اور گھاس اور شکار پر

والحشیش ۱۶ لصید۔ قابو پالے (تو وہ اس کی ملک بن جاتا ہے)

کہ ان چیزوں سے استفادہ کا حق اگرچہ پبلک کے ہر فرد کو حاصل ہے لیکن جب ان پر کسی کا قبضہ ہو گیا تو قبضہ کرنے والے کی وہ ملک ہو جاتی ہیں اسی طرح برتن اور مشک کا پانی بھی مملوک ہو جاتا ہے فیجوز بیعہ۔ اور ایسی صورت میں (مشک و برتن وغیرہ)

کے پانی کا فروخت کرنا بھی جائز ہے

اس قسم کے پانی کی بیع و فروخت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ

السقارون ۱۷ یبیعون ۱۸ طیارہ برتنوں میں جس پانی کو محفوظ کر لیا گیا ہو

المحونة في الظروف به
جوت العادة في الامصار
في سائر الاعصار من غير تكير
(بدائع)

اس کو بہشتیوں کی جماعت ہمیشہ بچتی رہی
ہے۔ تمام شہروں اور ملکوں میں اس کا
عام رواج ہے اور کسی نے اس پر
اعتراض نہیں کیا۔

اس لئے اس پانی کے متعلق حکم ہے کہ

فلم یحل لاحد ان یأخذ
منه فی شرب من غیر اذنه

جائز نہ ہو گا کہ پانی کے مالک کی اجازت کے
بغیر کوئی اس کو لے اور پیے۔

ابنہ ایسی صورت میں کہ پیاس سے کسی کی جان پر بن آئے اور دوسرے کے برتن میں زائد از ضرورت پانی ہو
تو غیر مسلح لڑائی کر کے پانی زیر دستی چھین کر پی سکتا ہے۔

شدید ضرورت کی چیزوں | اور یہ حکم کچھ پانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہلاکت کے اندیشے کی
میں اشتراکیت کا نقطہ نظر | صورت میں زائد از ضرورت چیز دوسرے سے آدمی زیر دستی چھین کر

استعمال کر سکتا ہے خواہ کھانا ہو یا اسی قسم کی دوسری چیز۔ ہدایہ میں ہے کہ

وکن اطعام عند إصابة المخصصة
یعنی یہی حکم کھانے کا بھی ہے شدت

بھوک میں۔

(ص ۳۸۴ ج ۲)

مملوک کہ پانی میں بھی | لیکن پانی برتن والا ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث میں چونکہ (الماء) مطلق پانی میں عام
اشتراکیت کا اثر | لوگوں کو شریک قرار دیا گیا ہے اس لئے فقہار اسلام نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بلا

ضرورت اگر کسی کی مشک یا برتن سے آدمی پانی چرائے تو چوری کی شرعی سزا قطع ید کا حکم اس پر نہ
لگایا جائے گا خواہ اس پانی کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو جس کے چرائے پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے ہدایہ میں ہے

لو سرقته انسان فی موضع

اگر کسی ایسے مقام میں جہاں پانی شکل

سے میسر آتا ہو اور کوئی (برتن) کے پانی

چرائے تو چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا خواہ پانی

کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو جس پر ہاتھ کٹتا ہو،

یعز وجوده وهو سیاوی

نصابا لم تقطع یدہ

(کتاب الشرب جلد ۴ ص ۳۸۶)

کیونکہ بہر حال ایک گونہ شرکت کا شبہ اس میں پیدا ہو گیا ہے اور شبہ سے اس قسم کی سزائیں ٹل جاتی ہیں۔

مچھلیوں کا حکم | پانی ہی کے ذیل میں مچھلیوں کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس طرح
ہوا کے پرندوں کا کوئی مالک نہیں ہے اور جو ان پر قبضہ کر لے گا وہی مالک ہو جاتا ہے۔ محض اس لئے

کہ کسی تالاب یا باغ یا کھیت میں یہ پرندے چرتے چگتے ہیں یا رہتے ہیں کوئی ان کو فروخت نہیں کر سکتا
حتیٰ کہ حکومت کو بھی اس کا اختیار نہیں ہے کہ اس قسم کی خشکی یا ترمی کے جانوروں کو کسی کی انفرادی

ملکیت قرار دے۔ غنا یہ شرح ہدایہ میں ہے

الامام لا یملک ان یخص

امام (حکومت) کو اس کا اختیار حاصل نہیں

کہ کسی خاص شخص کو ان امور کی خصوصی ملکیت عطا کرے تا آنکہ اگر کسی کو امام حکم دے کہ فلاں خاص شکار کو پکڑے خواہ خشکی کا ہو یا دریا کا تو جسے حکم دیا گیا ہے وہ شکار پکڑنے سے پہلے اس شکار کا مالک نہیں ہو سکتا۔

واحد۱ دون واحد بذالک
حتی لو امر واحد۱ ان
یاخذ شیئا صید۱ البعینہ
من برا وبحرا لا یملک۱ المامو
قبل۱ الاخذ۱ والا صطیاد۔
(ہایہ ص ۳۸۰ ج ۲)

سوال ہوتا ہے کہ جب ہوا کے جانوروں کا یہ حکم ہے تو مچھلیاں جن کی حیثیت پانی میں وہی ہے جو ان وحشی پرندوں کی ہوا میں ہے ان کو بھی کوئی بیچ سکتا ہے یا نہیں۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں ایک خاص باب اس مسئلہ میں باندھا ہے۔ خود ان کا اور امام ابو حنیفہ وغیرہ کا خیال یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ غیر مملوک شئی کی بیع ہے۔ بلکہ ممانعت کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ خریدار کے متعلق دھوکہ کھا جانے کا اندیشہ ہے کہ پانی کے اندر کا حال اس کو کیا معلوم ہو سکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ فتویٰ قاضی صاحب نے نقل کیا ہے کہ لا تبالیعوا السمک فی الماء فانہ غرر میں دھوکہ ہے۔

اسی قسم کے الفاظ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہیں۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اسی کتاب الخراج میں یہ بھی مروی ہے۔ رس نامی مقام میں جوین میں واقع ہے۔

انہ وضع علی اجم۱ برس
اسربع۱ الاف دس ہم
وکتب لہم کتا با فی قطع۱
اد۔
(کتاب الخراج ص ۹۵)
رس نامی مقام کے اجمہ (آبی نیستان) پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چار ہزار درہم شخص فرمایا اور چمڑے کے ایک ٹکڑے پر ان کو اس کا پٹہ لکھ کر دیا (اجمہ کے لفظ کی تحقیق آگے آرہی ہے)

صرف یہی نہیں کہ حکومت نے اس خزانہ آب کو چار ہزار درہم میں بند و بست کیا بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے بھی اس کتاب میں یہ مروی ہے کہ عبد الحمید بن عبد الرحمن نے جو ان کے صوبہ دار تھے انھوں نے یسئلہ عن بیع صید۱ الاجام۔ آجام (آبی نیستانوں) کے شکار کے متعلق دریافت کیا کہ کیا ان کو فروخت کیا جائے۔

جواب میں عمر بن عبد العزیز نے فرمان بھیجا۔

ان لا باس بہ وسماک الحبس
(کتاب الخراج ص ۱۱۱)
اس کے فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اس کا نام انھوں نے الحبس رکھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالاب کی مچھلیوں کے متعلق ابتداء سے کچھ اختلاف چلا آتا ہے۔ خود قاضی ابو یوسف نے

لکھا ہے کہ اگر کسی ایسے گڑھے میں مچھلی ہو جو بغیر شکاری تدبیروں کے ہاتھ آجائے تو اس کے بیچنے میں حرج نہیں بلکہ آگے بڑھ کر ان کے الفاظ یہ بھی ہیں،

ومثله اذا كان يؤخذ
بغیر صید کمثل سمک فی
الجب۔

اور یہی حال ان مچھلیوں کا ہے جو بغیر
شکاری تدبیروں کے پکڑی جاتی ہوں
جیسا کہ ان مچھلیوں کا بیچنا جائز ہے جو

کنوئیں میں ہوں۔

(کتاب الخراج ص ۱۱۱)

ان تمام اقوال کے دیکھنے سے فیصلہ کی صورت یہی معلوم ہوتی ہے کہ سمندروں، دریاؤں، ندیوں وغیرہ کی مچھلیاں جو بند اور محدود پانی میں نہیں رہتی ہیں۔ ان کو نہ حکومت بیچ سکتی ہے اور نہ شکار کرنے سے پہلے کوئی اور بیچ سکتا ہے۔ بلکہ وہ عام پبلک کی چیز ہے۔ ملک کے ہر باشندے کو ان کے شکار اور ان سے استفادہ کا حق ہے۔ البتہ اگر محدود اور بند پانی مثلاً تالابوں وغیرہ میں ہوں تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فتویٰ کے مطابق ان کے فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں خصوصاً ایسی مچھلیاں جنہیں اس زمانہ میں لوگ اپنے مخصوص تالابوں میں خرید کر پالتے ہیں یعنی ان کے بچے جنہیں زیرہ کہتے ہیں خرید کر تالابوں میں چھوڑ دیتے ہیں چونکہ قبضہ کرنے اور مملوک بنانے کے بعد ان کو تالابوں میں چھوڑا جاتا ہے بظاہر ان کے فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آبادیوں کے اطراف و جوانب کے تالابوں یا جوہڑوں میں جو قدرتی خودزائیدہ مچھلیاں پائی جاتی ہیں، اگر زمیندار اور جاگیردار ان کو گاؤں کے عام باشندوں کو شکار کر لینے کی بغیر کسی معاوضہ کے اجازت دے دیا کریں تو کم از کم حنفی مذہب کی رو سے اسلام نے عوام کا جو معاشی حق قائم کیا ہے اس سے محروم کرنے کے وہ مجرم نہ ہوں گے۔

مچھلیوں کے سوا دوسری مچھلیوں کے ساتھ سمندر، دریا، ندی وغیرہ کی دوسری پیداواروں کا ابی پیداواروں کا حکم بھی سوال اسلامی فقہ میں اٹھایا گیا ہے۔ ہمارے امام ابو حنیفہ کا تو کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ خواہ جس قسم کی چیز بھی ہو اس کی کتنی ہی قیمت ہو مثلاً عنبر ہو یا موتی ہو، یا اس کے سوا کوئی اور چیز ہو، سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے۔ یعنی ملک کے عام باشندوں کا وہ مشترک سرمایہ ہے جس کا جی چاہے انہیں نکال سکتا ہے اور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حکومت تک کو اس سے کسی قسم کا محصول لینے کا حق نہیں ہے۔ قاضی ابویوسف نے اس کا بھی کتاب الخراج میں ایک مستقل باب باندھا ہے اور لکھا ہے کہ

اور حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں کا خیال تھا

کہ سمندری پیداواروں (مثلاً عنبر موتی

وغیرہ) میں سے کسی پر کوئی محصول یا

ان کی قیمت نہیں وصول کی جاسکتی، ان سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے

قد کان ابو حنیفہ وابن ابی لیلیٰ

يقولان ليس فی شیء من ذلک

شیء لانہ بمنزلة السمک

ان کی قیمت نہیں وصول کی جاسکتی، ان سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے

لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک فرمان کی بنا پر قاضی ابو یوسف نے خود یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ دریا کی وہ چیزیں جو بطور زیور یا خوشبو کے استعمال ہوتی ہیں (مثلاً موتی مرجان وغیرہ) اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ

فی ذلک خمس واربعة
احماسہ لمن اخرجه۔

حکومت ان پیداواروں سے خمس (پانچواں حصہ) وصول کرے گی اور باقی چار خمس (پنچے) اس شخص کے ہوں گے جس نے اسے نکالا۔

لیکن ان کے سوا اور تمام چیزوں کے متعلق ان کا بھی وہی خیال ہے جو امام کا ہے خود فرماتے ہیں۔

اما فی غیرہا فلا شیئ
فیہ۔

جو چیزیں بطور زیور (حلیہ) اور خوشبو کے استعمال ہوتی ہیں، ان کے سوا

سمندر کی اور چیزوں پر کچھ نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے جس فرمان سے انہوں نے حلیہ اور غنیر کو مستثنیٰ کیا ہے وہ یہ ہے کہ لیلیٰ ابن امیہ کو حضرت عمرؓ نے بحر (سمندر) کے علاقوں یا بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ لیلیٰ نے بارگاہ خلافت میں یہ لکھ کر پوچھا،

غنیرۃ وجدۃ رجل سیئله
عنہا و عما فیہا۔

غنیر (مچھلی جس سے غنیر نکلتا ہے) ایک شخص کو ملی ہے۔ وہ اس مچھلی اور

جو کچھ اس کے اندر سے برآمد ہوگا اس کے متعلق پوچھتا ہے۔

جواب میں یہ فرمان کیا کہ

سمندر سے اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو برآمد کرتے ہیں ان میں خمس (پانچواں حصہ) حکومت کا حق ہے۔

فیما ۲ خرج ۲ للہ جل شانہ
من البحر الخمس۔
(کتاب الخراج)

اس فرمان کے راوی ابن عباسؓ ہیں، خود بھی فرماتے ہیں۔

اور میری بھی یہی رائے ہے۔

و ذلک سرائی۔

بہر حال یہ سارے مباحث تو المآر (یعنی پانی) کے تھے جس میں آنحضرتؐ نے ملک کے عام باشندوں کو شریک قرار دیا ہے۔ گزشتہ بالا مسائل گویا اسی اشتراک کی نظریہ کی تفصیل تھی۔

سیال معدنیات | پانی اور پانی کے خزانوں اور چشموں کے ذیل میں چونکہ بعض سیال "معدن" کو کے احکام فقہاء اسلام نے اسی ذیل میں شمار کیا ہے۔ حتیٰ کہ قاضی ابو یوسف نے تو

کتاب الخراج میں صاف طور پر لکھ دیا ہے۔

جہاں تک میں جانتا ہوں مٹی کے تیل

(نفط) اور قیر (تارکول) مومیائی ہیں

کچھ نہیں ہے، بشرطیکہ زمین سے ان کا

لیس فی النفط والقییر

والزبیب والمومیائین کان

لشیئ من ذلک عین فی الارض

کوئی چشمہ ابلتا ہو، خواہ یہ چشمے عشری زمین میں
ہوں یا خارجی زمین میں۔

شیعی تعلمہ کان فی ارض عشر
(دفعہ ارض خراج (کتاب الخراج ص ۹۲)

لیکن یہ ایک اجمالی بیان ہے ورنہ جیسے پانی کے مختلف اقسام کے مختلف احکام تھے ان معدنی چیزوں کا
بھی یہی حال ہے، گنجائش کی حد تک ضروری مسائل درج کئے جاتے ہیں، اس مسئلہ کا پہلے بھی کچھ ذکر آچکا
ہے، لیکن اس وقت ہم اس کو شرح الکبیر للمقنع الحنبلی سے نقل کرتے ہیں۔ اس میں ہے۔

ایسے معادن جنہیں معادن ظاہرہ
کہتے ہیں مثلاً نمک اور قار (تارکول)
سرمہ، گچ، لفظ (مٹی کا تیل) وغیرہ کے
بعد معدنوں کا کوئی شخص ذاتی طور پر
مالک نہیں ہو سکتا، نہ "اجیاء" اور آباد

لا تملك المعادن الظاہرہ
کالمح والقاسر والکحل
والجص والنفط بالاحیاء
ولیس للامام اقطاعہ۔
(ج ۲)

کر کے ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے اور نہ حکومت کو حق ہے کہ کسی خاص شخص کی جاگیر میں چیزوں کو

یہ تو متن کی عبارت ہے۔ شرح اس کی یہ کی گئی ہے کہ

ایسے معادن جو ظاہری معادن کہلاتے
ہیں، جن کی تعریف یہ ہے کہ (۱) ان تک
بغیر کسی محنت و مشقت کے رسائی ہو (۲)
لوگوں کی اس پر آمد و رفت جاری ہو (۳)
اور اس سے عام لوگ نفع اٹھاتے ہوں
مثلاً نمک، گندھک، قیر (تارکول) مومیائی،
لفظ (مٹی کا تیل) سرمہ، یا قوت ہٹی نکالنے
کی جگہ (فلکول) اور اسی قسم کی چیزیں
آباد کر کے بھی کوئی ان کا مالک نہیں
ہو سکتا، اور نہ کسی کے لئے ایسا کرنا جائز ہے
اور نہ یہ درست ہے کہ عام مسلمانوں کو ان سے
استفادہ سے روکا جائے کیونکہ مسلمانوں کا
نقصان ہو اور ان پر تنگی و ضیق عائد کرنا ہے

المعادن الظاہرۃ وہی التي
یوصل الی ما فیہا من غیر
مؤنہ ینتاہا الناس
وینتفعون بہا کالمح والکبریت
والقیرو الموصیا والنفط
والکحل والیا قوت ومقاطع
الطین واشباہ ذلک
لا یملک بالاحیاء ولا یجوز
لاحد من الناس ولا
احتجائہ دون المسلمین
لان فیہ ضرر للمسلمین
وتضییق علیہم۔
(المغنی لابن قدامہ ص ۱۵۴)

نمک کا مسئلہ | گزشتہ بالا عبارتوں سے جہاں اور باتیں ثابت ہو رہی ہیں وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ
نمک کی کان بھی پبلک کا مشترک سرمایہ ہے نہ وہ انفرادی ملکیت بن سکتی ہے اور نہ حکومت اس پر کوئی
محصول عائد کر سکتی ہے اور اس بنا پر بعض علماء نے ہندوستان میں کچھ دنوں یہ عام فتویٰ دیدیا
کہ اسلامی حیثیت سے نمک سازی پر محصول لگانا یا حکومت کو نمک بنانے سے لوگوں کو روکنا جائز نہیں ہے

مجھے سیاسی مصالح سے بحث نہیں لیکن علماء کے متعلق یہ ضرور خیال آتا ہے کہ مسئلہ کو ہمیشہ اس کے تفصیلاً کے ساتھ پبلک میں پیش کرنا ان کی دیانت کا اقتضا ہونا چاہیے۔ نمک کی ایسی کانیں جن میں مندرجہ بالا صفات پائی جاتی ہوں۔ یعنی (۱) لوگوں کی رسائی بلا خرچ نمک تک ہوتی ہو (۲) عام لوگوں کی آمدورفت اس کان تک لگی ہوئی ہو اور لوگ اس سے نفع اٹھا رہے ہوں۔ بلاشبہ نمک کی ایسی کانوں کے متعلق اسلامی نقطہ نظر وہی ہے۔ لیکن اگر بجائے اس کے صورت حال یہ ہو کہ

کان لقرب ۱ ساحل
موضع ۲ ۱ حاصل فیہ
۲ الماء صار ملحا۔
سمندر کے کنارے کوئی ایسی جگہ ہو
جب سمندر کا پانی اس میں اکٹھا جمع ہو جائے
تو نمک بن جاتا ہو۔

تو اس کے متعلق فقہاء کا عام فتویٰ یہ ہے کہ
ملک بالاحیاء وللأمام
۱ قضاۃ۔
تو اس کا آدمی مالک ہو جاتا ہے، احیاء
(آبادی) کے ذریعہ سے بھی، اور امام
(حکومت) اس کو افراد کی جاگیر میں دے سکتی ہے۔

اس قسم کی زمینوں کی "احیاء" یا زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ
ترہیئة لما یصلح لہ من
حضر ترواہ و تہیدۃ و فتح
قناة الیہ تصب الماء الیہ
جس کام کی اس میں صلاحیت ہو اس کے
لئے اس کو تیار کرنا، یعنی اس کی مٹی
کھودنی، اس کو کشادہ کرنا۔ سمندر سے
نالی نکال کر اس گڑھے تک لانا تاکہ سمندر کا پانی اس میں آکر گرے۔

نمک بنانے کے لئے سمندر کی ساحلی زمینوں کو بند و بست کرنے کا حکومت کو اختیار کیوں ہے اور ان میں
انفرادی ملکیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ

لأنہ لا یضیق علی المسلمین
بأحد ۱ ثلہ بل یحدث
نفعہ بفعلہ فلم یمنع
منہ کیفیۃ ۲ الموات۔
کیونکہ سمندر کے کنارے اس قسم کے
کارخانے کے قائم کرنے سے مسلمانوں میں
کوئی تنگی پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس زمین کا
نفع آباد کرنے والے کے عمل سے ظاہر
ہوتا ہے۔ پس اس کو اس فعل سے نہیں

(المغنی ص ۱۵۸ ج ۶)

روکا جائے گا جیسے موات کی دوسری زمینوں کے آباد کرنے سے وہ نہیں روکا جاسکتا۔

اور غالباً ہندوستان میں نمک سازی کا جو مسئلہ پیدا ہوا تھا وہ یہی صورت تھی۔

عام معذنیات کا حکم | اور صرف نمک ہی نہیں بلکہ اس کے سوا بھی جن معدنی امور کا ذکر کیا گیا ہے
کہ اسلامی نقطہ نظر سے ان میں انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس حکم کو بھی ہر قسم کی کانوں کے
لئے عام حکم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ حکم ان ہی معدنی چیزوں تک محدود ہیں جو خود بخود باہر آگئی ہوں

اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہوں اور نہ ایسے معادن جن کو فقہی اصطلاح میں معادن باطنہ کہتے ہیں اور جن کی تعریف شرح کبیر میں یہ کی گئی ہے۔

ہی ۱۲ التی لا یوصل الیہا
۱۲ الا بالعمل والموئنة۔

(ص ۱۵۷ ج ۶)

یہ ان کانوں کو کہتے ہیں جن کی پیداواروں
تک رسائی بغیر عمل اور مشقت و محنت
کے نہیں ہو سکتی۔

پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

لہ تکن ظاہرة فخرها
۱۲ النسان و ۱۲ ظہرہا۔

یعنی ابتداً قدرتی طور پر وہ معدن ظاہر تھا
پھر کسی نے کھود کر اس کو نکالا اور نمایاں کیا۔

اس قسم کے معادن کی مثال میں حسب ذیل چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کمعادن الذہب والفضة
۱۲ الرصاص و ۱۲ البلورس۔

جیسا کہ سونے، چاندی، سیسہ، بلور وغیرہ
کی کانوں کا حال ہے۔

بہر حال ایسے معادن جن سے انتفاع بغیر عملی جدوجہد اور مصارف کے نہیں ہو سکتا، خواہ وہ کسی قسم کے
ہوں۔ اگرچہ بعض فقہاران میں بھی انفرادی ملک کے قائل نہیں ہیں، ان کا مذہب ہے کہ حکومت کسی انفرادی
شخصیت کے ساتھ ان کو بھی بند و بست نہیں کر سکتی۔ لیکن صاحب مغنی نے لکھا ہے کہ

والصحيح جواز ذلك
بند و بست کرنا جائز ہے۔

یعنی "انفرادی ملکیت" یہ بن سکتی ہے اور حکومت کو اس کا اختیار ہے کہ کسی واحد شخص کے ساتھ اس کو
بند و بست کر دے۔ "جواز" کے ثبوت میں ابوداؤد کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔

۱۲ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۱۲ قطع لیلال من حارث
معادن ۱۲ القبلیہ جلیسیہا
وغورس یہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن
حارث کو قبیلہ کے معادن خواہ پست
علاقوں میں ہوں یا بلند قطعات میں بطور
جاگیر کے عطا فرمایا۔

اور اس سے ثابت ہوا کہ صرف جامد معادن ہی نہیں بلکہ سیال معادن مثلاً پارہ، پٹرول، تارکول
وغیرہ ایسے معادن جن کے کھودنے اور نکالنے میں مصارف اور محنت پڑتی ہو وہ انفرادی ملکیت
بن سکتے ہیں اور حکومت ان کو بند و بست کر سکتی ہے۔ لیکن حکومت کو ان معدنی پیداواروں پر
کسی قسم کے محصول عائد کرنے کا بھی حق ہے؟ یا بغیر کسی ڈیوٹی کے ملک کے باشندے ان سے مستفید
ہو سکتے ہیں۔ اس سوال کا تفصیلی جواب تو آئندہ حکومت کی آمدنی کی ذیل میں دیا جائے گا لیکن اسلامی معاشیات
کی وسعت نظری کا سرسری اندازہ کرنے کے لئے غالباً اس مسئلہ کا ذکر بیجا نہ ہوگا جو فقہ کی عام کتابوں میں
پایا جاتا ہے، ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔

کالوں سے جو چیز نکلتی ہے وہ تین قسم کی ہوتی ہے، ایسی جامد چیزیں جو پھسل سکتی ہوں اور چھاپ قبول کر سکتی ہوں مثلاً سونے، چاندی لوہے وغیرہ کا جو حال ہے دوسری قسم وہ ہے جو جامد اور غیر سیال تو ہو، لیکن چھاپ قبول نہ کر سکتی ہو مثلاً گچ، چونا، سرمہ، ہڑتال، بلکہ ان تمام چیزوں کا حال ہے جن کا شمار پتھروں کے ذیل میں کیا جاتا ہے، مثلاً یا قوت، نمک، تیسری قسم ہے وہ ہے جو جامد

۱ علم ان ما یستخرج
من المعدن ثلاثة انواع
جامد یذوب وینطبع
كالنقدین والحدید
وجامد لا ینطبع كالجص
والنورة واللؤلؤ والزنج
وسائر الاجاسر کالیاقوت
والطبع والمالیس بحامد
کالماء والقیح والنقط
(فتح القدر ج ۱)

نہ ہو بلکہ سیال ہو، مثلاً پانی، تار کول، مٹی کا تیل۔

ان تین قسموں کو بیان کرنے کے بعد آئندہ جو چیز انھوں نے لکھی ہے دنیا کی حکومتوں کی شاید اس سے آنکھیں کھل جائیں اور موجودہ حکومتوں کی رعایا میں کسی حکومت کے اس نقطہ نظر کو سن کر معلوم نہیں کس قسم کے جذبات متلاطم ہونے لگیں۔ ابن ہمام نہایت سادگی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک۔

لا یحب الخمس الا فی الاول۔

خمس (پیداوار کا پانچواں حصہ) صرف

پہلی قسم سے حکومت وصول کر سکتی ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قسم اول کے سوا اور تمام معدنی پیداوار ہر قسم کے محصول سے آزاد ہیں اور یہ تو امام ابو حنیفہؒ کا خیال ہے۔ امام شافعیؒ نے تو اس سے بھی آگے قدم بڑھایا ہے۔

وعند الشافعی لا یحب

بخر سونے چاندی کے اور کسی پر خمس

واجب نہیں ہے۔

الا فی النقدین۔

اگرچہ اس مسئلہ کے متعلق بعض تفصیلات ہیں جن پر بحث کا یہاں موقع نہیں بالفعول اتنا اجمالی بیان کافی ہو سکتا ہے حدیث "الناس شرعاء" میں جن جن چیزوں کو پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا گیا ہے اب تک اس کے پہلے جز "الماء" اور اس کے متعلقات کی گویا یہ تفصیل تھی۔ باقی دو جز اور رہ گئے، یعنی "الکلاء" اور "الناس" اب ان کے متعلق مسائل کی تشریح کی جاتی ہے۔

الکلاء (گھاس) کے | حدیث میں چونکہ "الکلاء" کا لفظ آیا ہے اس لئے اس کی تحقیق ہونی چاہیے کہ "الکلاء" مسائل کی تفصیل کے لغوی معنی کیا ہیں۔ صاحب مغرب نے اپنی کتاب فقہی لغات میں اس لفظ کو

یا ہے اور اس پر ایک طویل بحث کی ہے امام محمدؒ کا قول تو یہ نقل کیا ہے کہ

الکلاء ایسی بناتی چیز کا نام ہے جو تنہ پر قائم نہ ہو

اور جو تنہ پر قائم ہو وہ کلاء نہیں ہے۔

الکلاء مالیس له ساق وما

قام علی ساق لیس بکلاء۔

ساق اور تنہ پر جو نباتات کھڑے ہوتے ہیں ان کی مثال میں ”عوسج“ اور ”غرقد“ وغیرہ جنگلی درختوں کو شریک کیا ہے۔ لیکن مطرزی صاحب مغرب نے خود اپنا فیصلہ یہ لکھا ہے۔

والظاہر انہ یقع علی ساق وغیرہ۔

نباتات پر ہوتا ہے۔

وجہ یہ بیان کی ہے کہ فقہاء ”الکلاء“ کی شرح میں عموماً یہ کہتے ہیں کہ

لما قرعنا الکلاء جنہیں عموماً چوپائے چرتے ہوں

سر طباکان ادیا بسا۔ خواہ خشک حالت میں یا تر۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ جانور عموماً بے تنہ والی گھاسوں کو بھی چرتے ہیں اور بعض تنہ رکھنے والے جنگلی جھاڑ مثلاً بھول، عوسج، غرقد وغیرہ کی پتیاں بھی چرتے ہیں اس سے ”الکلاء“ کو بجائے گھاس کے ہر اس نبات کے لئے عام رکھنا چاہیئے جسے جانور چرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ابو عبیدہ کی کتاب الاموال سے بھی اپنی تائید میں بعض چیزیں نقل کی ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ چاہیئے کہ اپنے بھائی کو پانی اور شجر (درخت) میں گنجائش دے اور اس درخت سے مراد وہی چرے جانے والے درخت ہی ہو سکتے ہیں۔ البتہ ”الکلاء“ کے بجائے یہاں الشجر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ حکم گھاس اور ان درختوں کو بھی عام ہے جنہیں چوپائے اور مویشی چرتے ہیں۔ نیز ایک مشہور حدیث ”حمی“ (رکھت) کے باب میں ہے کہ امیہ بن جمال نے اراک (پیلو) کے متعلق دریافت کیا کہ اس کو حمی (رکھت) یعنی اپنے اونٹوں کے لئے اس کے جنگل کو کوئی مخصوص کر سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مالہ متلہ اخفاح الابل ہاں۔ اگر اونٹوں کے قدم اگر وہاں

نہ پہنچتے ہوں تو جائز ہے۔

ابو عبیدہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حکم پیلو کے اُن درختوں سے متعلق ہو سکتا ہے جو کسی کی ملکوتہ اراضی میں ہوں۔ یعنی ملکوتہ زمین کے پیلو کو بھی محض اپنے مویشیوں کے لئے کوئی مخصوص نہیں کر سکتا کیونکہ غیر ملکوتہ زمین کے پیلو کو حمی (رکھت) بنانے کا تو کسی کو کیا اختیار ہے خواہ وہ دور کے ہوں یا قریب کے ہوں اونٹوں کی دسترس سے باہر ہوں یا نہ ہوں۔ پس مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ملکوتہ زمین کے پیلو کو بھی رفاہت عامہ کے خیال سے حمی نہ بنانا چاہیئے اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ ”الکلاء“ کا لفظ تنہ دار اور غیر تنہ دار ہر قسم کی چرہی جاننے والی روئیدگیوں کو عام ہے اور یہی واقعہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقصود مویشیوں کی چرائی میں سہولت پیدا کرنی ہے۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو حتی الوسج پبلک کا عام مشترک سرمایہ قرار دیا جائے۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں چرائی گاہوں کی چند مثالیں بیان کی ہیں۔

(۱) پہلی شکل تو یہ ہے کہ کسی گاؤں یا آبادی کی کوئی چراگاہ اور جنگلی جھاڑ اور گاؤں کا کوئی خاص باشندہ اس زمین کا مالک نہیں ہے بلکہ

قد عرفنا انہا لھم فھن لھم
علیٰ حالھا۔

عموماً یہ مشہور و معروف ہو کہ فلاں چراگاہ
(یا جنگلی جھاڑیاں) فلاں گاؤں والوں

کی ہیں پس وہ انھی لوگوں کی اپنے حال پر رہیں گی۔

اور گاؤں والوں کی اس زمین میں اجمالی ملک ثابت ہوگی اب دیکھا جائے گا کہ اس گاؤں کے باشندوں کی مویشیوں وغیرہ کے لئے کوئی دوسری چراگاہ یا کچھ ارنہ وغیرہ ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ایسی صورت میں۔

لیس لھم ان یمنعوا الکلاء
والماء ولا صحاب المواشی
ان یرعوا تلک المروج
و یتسقوا من تلک المیاء۔

گاؤں والوں کو اس کا حق نہ ہو گا کہ
عام مویشی والوں کو اس قسم کی چراگاہوں
اور رمونوں میں چرائی سے روکیں اسی طرح
مویشی والوں کو اس کا بھی حق ہے کہ

یہاں جو پانی ہو اس سے استفادہ کریں (خود پیئیں جانوروں کو پلائیں)

لیکن اگر یہ شکل نہیں ہے بلکہ

لم یکن لاهل ہذا القریۃ
الذین لھم ہذا المروج
وفی ملکھم موضع مسرح
ومرعی لدوابھم ومواشیھم
غیر ہذا المروج۔

اس گاؤں والوں کے لئے جن کی یہ
چراگاہیں ہیں ان کے لئے بجز ان کے
چرائی کی کوئی دوسری جگہ نہ ہو اور نہ
کوئی دوسری چراگاہ ہو جس میں ان کے
جانور اور مویشی چر سکتے ہوں۔

اور اس کے ساتھ صورت حال یہ ہو کہ

متی اذا نزلنا س فی ساعی
تلک المروج والاحتطاب
منھا اضرا ذلک بہم ولمواشیہم
رددوا بہم۔

اگر عام لوگوں کو ان زمینوں اور چراگاہوں
میں چرانے اور ہر شخص کو لکڑی کاٹنے کی
اجازت دیدیں گے تو یہ بات ان کے لئے
اور ان کے مویشیوں و چوپایوں کیلئے نقصان ساز ہوگی

قاضی ابو یوسف کا ایسی حالت میں یہ فتویٰ ہے کہ

کان لھم ان یمنعوا حل
من اسرا د ان یرعی فیھا
و یحتطب منھا۔

اس قسم کے گاؤں کے باشندوں کو اس کا
حق ہے کہ عوام کو اپنی چراگاہوں میں
چرانے سے روکیں اور اس سے منع کریں

کہ کوئی اس کی جھاڑیوں سے لکڑی کاٹے۔

بہر حال حدیث نے ”الکلاء“ کو جب پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا ہے تو ایسی صورت میں انفرادی ملکیت تو

اس پر طاری نہیں ہو سکتی لیکن "اشتراک" میں کچھ حد بندی اس وقت ہو سکتی ہے جب دوسرے گاؤں والوں کی شرکت سے خود اس گاؤں والوں کا نقصان ہو جن کی طرف یہ چراگاہ منسوب ہے اور یہ حال تو ان چراگاہوں کا ہے جن کی زمین کسی شخص کی واحد ملکیت میں نہیں ہے بلکہ یا تو ان کا کوئی مالک ہی نہیں ہے یا سارے گاؤں کی وہ ملکیت مشترکہ ہے۔ لیکن اگر کسی شخصی اور انفرادی ملکیت والی زمین میں "الکلاء" ہو تو باوجود زمین کے مالک ہونے کے "الکلاء" کا وہ قانوناً مالک نہیں ہے۔ بدائع میں ہے

۱ اما الکلاء الذی ینبت
فی ارض مملوكة فهو مباح
غیر مملوكة۔

الکلاء (گھاس) جو کسی مملوکہ زمین میں
ہو (اس سے استفادہ کا حق ہر شخص کو
حاصل ہے) یعنی مباح و جائز ہے اور

اس الکلاء کا کوئی مالک نہیں ہے۔

اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو پانی کا ہے کہ اگر اس الکلاء کے سوا لوگوں کو اپنے مویشیوں کے لئے چرائی نہ میسر آ سکتی ہو تو پبلک کا حق ہے کہ اس کو مجبور کریں کہ ان کے مویشیوں کو اپنی زمین میں آنے دے یا گھاس کٹوا کر لوگوں کے حوالہ کرے اور دونوں شکلوں پر راضی نہ ہو تو بہ زور اپنے حق کو اس سے لوگ حاصل کریں۔

یہ حکم تو الکلاء کا اس وقت تک ہے جب تک زمین میں لگا ہوا ہے۔ لیکن زمین سے الگ کر لینے کے بعد جو اس پر قبضہ کر لے گا وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ ٹھیک جو حال پانی کا تھا کہ برتن میں محفوظ کر لینے کے بعد انفرادی ملکیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ بدائع میں ہے۔

اذا قطعه صاحب الارض

واخرج فی ملکہ۔

جب اس کا مالک الکلاء کو کٹوالے اور نکال لے تو پھر اس کا وہ مالک ہو جاتا ہے

اذا سقاہ قام علیہ ملکہ

(بدائع)

اس کی ملکیت قائم ہو جائے گی۔

حدیث کے ظاہر معنی پر اصرار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

الصحيح جواب طاحل لرواية لان

الاصل فيه هو الا باحالة۔

اصل "تو یہی ہے کہ الکلاء سے استفادہ کا عام حق دیا گیا ہے۔

ظاہر روایت میں اس مسئلہ کا جو جواب
دیا گیا ہے وہی درست ہے۔ کیونکہ

اس سلسلہ میں فقہاء ایک اور مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عربی میں ایک لفظ "مروج" کا ہے جس کی جمع "مروج" ہے۔ یہ اردو کے "رمنہ" یا "کنجہ" کے ہم معنی ہے، غالباً فارسی کا "مرغزار" مرجزار ہی کی کوئی صورت ہے لیکن ایک اور لفظ "اجمہ" کا ہے جس کی جمع آجام ہے۔ علامہ مطرزی مغرب میں اس کی تفسیر کرتے ہیں الاجمۃ الشجر الملتف یعنی (گھنے درختوں) کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ لغوی معنی ہوئے۔ پھر فقہاء جس محاورہ میں اس کو استعمال کرتے ہیں اس کے متعلق کہتے ہیں۔

وقولهم بیع السمک فی الاجام
یوریدون البطیحة التي
منبت القصب والیراع

مچھلیوں کا آجام میں بیچنا یہ جو فقہاء
لکھتے ہیں تو آجام سے شکرینہ والی زمین مراد
جو زراعت یا کھد کے اُگنے کی جگہ ہے۔

یظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شکرینہ والی ریتی زمینوں کے گہرے حصوں میں برساتی پانی جو جمع ہو جاتا تھا اور اس کے ارد گرد یا خود اس میں "نیستان" بن جاتا تھا اس کو آجام کہتے ہیں۔ چونکہ پانی بھی اس میں جمع ہو جاتا تھا اس لئے اس میں مچھلیاں بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آجام دراصل آبی نیستان کو کہتے ہیں۔ فقہاء نے یہ سوال اٹھایا ہے کیا ان کا شمار بھی "مروج" اور کنجوں کے ذیل ہوگا اور انفرادی ملکیت اس کی درست ہو سکتی ہے یا نہیں۔ قاضی ابویوسف نے کتاب الخراج میں اس کا کلیہ یہ لکھا ہے کہ اس زمین کو دیکھنا چاہیے جس میں اجمہ ہے۔ اگر زمین کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں ہے تو نیستان (اجمہ) ہی کیا تمام غیر ملوکہ زمینوں کا حکم یہ ہے کہ

فان لم تکن فی ملک
لاحد ملک فلا یاس
ان یحتطب منه جمیع
الناس كالشمار فی الجبال
والمروج والودیة
والشجر ما لم یغراسه
الناس ولا یاس بان
یاکل من شمارھا ویزود
ما لم یعلما ان ذلک فی ملک
انسان وکن الذلک العسل
یوجد فی الجبال والغیاض
(الخراج)

اگر اس زمین میں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہے
تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہر قسم کے
لوگ اس سے لکڑی کاٹ کاٹ کر لے جائیں
جیسے پہاڑوں، مرغزاروں، رمنوں، وادیوں
اور نہیوں وغیرہ کے درختوں اور ان کے
پھلوں کا حال ہے کہ جب تک کسی خاص شخص نے
ان کو نہ لگایا ہو، ہر شخص کو ان سے استفادہ کا
حق ہے اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے
اگر اس قسم کے درختوں کے پھلوں کو آدمی
کھائے یا توڑ کر گھر لیجائے۔ عام استفادہ کا
یہ حق اسی وقت تک ہے جب تک ان جنگلی درختوں
کے متعلق معلوم نہ ہوا ہو کہ کسی خاص شخص کی

ملکیت میں ہیں پہاڑوں اور جنگلوں میں جو شہد پایا جاتا ہے ان کا بھی یہی حال ہے۔

لیکن اگر زمین کسی کی ملک ہو کہ ہے تو پھر "الکلا" کے سوا اس کی اور پیداواروں میں تقرب کرنے کا حق مالک کی

اجازت کے بغیر جائز نہ ہوگا۔ خواہ زمین کے مالک نے اسے بویا ہو یا خود رو ہو۔ بدائع میں ہے۔

ایسا احمد (فیستان) جو کسی خاص شخص کی ملک میں ہو، اس کے متعلق کسی کو اس کا حق نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی لکڑی کاٹے، کیونکہ لکڑی اور نئے کے ڈنٹھل یہ دونوں احمد کے مالک کی ملک ہے وہ زمین سے پیدا ہی ہوتی ہیں مالک زمین کی ملک میں اگرچہ ان کے لگانے

میں مالک زمین نے کوئی کام نہ کیا ہو، یعنی خود رو ہوں، جب بھی اسی کی ملک قرار پائیں گے

بہر حال اس باب میں کلیہ وہی ہے جو صاحب بدائع نے لکھا ہے کہ

اصل یہ ہے کہ مملوکہ چیز سے جو چیز پیدا ہوگی وہ بھی مملوک ہی ہوگی۔ لیکن اس اصل کے خلاف بعض چیزوں میں شریعت نے "اباحت" کا قانون نافذ کیا ہے۔ یعنی استفادہ کا حق ہر شخص کو دیدیا ہے لیکن اباحت کا یہ قانون چند مخصوص چیزوں کے ساتھ محدود ہے۔ اس لئے حکم بھی

لیس لاحد ان یحطب
من باجمة رجل الا
باذنه لان الحطب
والقصب مملوکان
لصاحب الاجمة ینبتان
على ملكه وان لم یوجد
منه الا نبات اصلا۔

الاصلا ان یکون من
المملوک مملوکا الا ان
الاباحه فی بعض الاشیاء
ثبتت علی مخالفة الاصل
بالشرع والشرع ورد بها
فی اشیاء مخصوصه
فیقتصر بها۔

ان ہی تک محدود رہے گا۔

تیسرے اشتراکی سرمایہ | اب تیسرا جز "النار" کا رہ گیا ہے۔ جسے حدیث میں عام پبلک کی مشترک آگ کے احکام | چیز قرار دیا گیا ہے۔ فقہار نے اس کی بھی کچھ تفصیل کی ہے۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں

آگ ایک تابناک روشن جوہر کا نام ہے جو ہمیشہ اوپر کی طرف متحرک رہتی ہے۔

النار اسم الجوهر مضمی
دائم محرکة علوا۔

اور اسی بنا پر فقہار کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ

پس جس نے آگ سلگائی ہو، اس کو اس کا حق نہیں ہے کہ دوسروں کو تاپنے سے روکے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ میں "شُرکت" ثابت فرمائی ہے۔

فلیس لمن اوقدها ان یمنع
غیرہ من الاصل طلاء بها لان
النبی صلی اللہ علیہ وسلم
اثبت الشریکة فیها۔

اور اصطلاحاً یعنی تاپنے کا ذکر تو بطور مثال کے کیا گیا ہے۔ ورنہ مقصد یہ ہے کہ حرارت ہو یا روشنی یا اسی قسم کا کوئی کام استفادہ کی ان تمام صورتوں کا حق ہر شخص کو ہے اور آگ یا لیمپ روشن کرنے والے کو

اس کا حق نہیں ہے کہ وہ استفادہ کے اس حق پر کوئی معاوضہ لے۔ مگر اس کے بعد سوال آگ سے نہیں بلکہ اس لکڑی یا بتی یا اس چیز سے ہے جس میں آگ پیدا کی جاتی ہے کہ کیا اس کا شمار بھی مشترک سرمایہ میں ہو جائے گا۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں۔

فنا ما الجمر فلیس بنار
وهو مملوک لصاحبه
فله حق المنع کسائر
املاکه۔

لیکن انگارہ تو وہ آگ نہیں ہے پس جس کا وہ ہے وہ اس کا مالک ہے۔ اسی لئے دوسرے کو روکنے کا حق اسے حاصل ہے جیسے دوسرے ملکات میں یہی حق اس کو دیا گیا ہے۔

اگرچہ جزئیات کا اور طویل سلسلہ موجود ہے لیکن اس باب میں اسلام کے جو کلی نقاط نظر تھے ایک حد تک ان کی بحث ختم ہو گئی۔ اب اس سلسلہ کی صرف ایک چیز رہ جاتی ہے یعنی "شوارع عام"۔

عام شوارع اور جن کی حیثیت اسلام ہی میں نہیں بلکہ تقریباً دنیا کے تمام قوانین اور دستور میں راستوں کے احکام آبادی کے عام باشندوں کے مشترک مفاد کی ہے اسلامی مقنین نے بھی اس کی اس حیثیت کو باقی رکھا ہے۔ بغیر کسی اختلاف کے فقہ کا یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ

ماکان من الشوارع
والطرق والرحاب
بین العمران فلیس لاحد
راستے، کوچے، شہر کے میدان چوک
جو آبادیوں کے درمیان ہوتے ہیں
ان کے متعلق کسی کے لئے جائز نہیں ہے
کہ ان کو آباد کرے۔

۱۰ حیاء ۸۔

یعنی کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ بطور انفرادی ملکیت کے ان پر قبضہ کر کے ان کو اپنی ملکیت بنائے مثلاً ان پر مکان بنائے یا اس قسم کا کوئی تملیکی تصرف کرے۔ مندرجہ بالا عبارت کے الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف سڑکوں اور کوچوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ "الرحاب" یعنی شہروں کے بیچ بیچ میں جو میدان مختلف ضرورتوں کے لئے مثلاً کھیلنے کو دینے کے لئے یا اس زمانے میں جو سیرگاہیں بنادی جاتی ہیں یہ بھی پبلک کے مشترک مفاد میں داخل ہو جاتی ہیں اور ان میں بھی کسی شخص واحد کو مالکانہ تصرفات کا حق نہیں ہے۔ اس قانون کی تفصیل کرتے ہوئے فقہاء نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ حکم صرف ان ہی سڑکوں یا گلیوں یا میدانوں تک محدود نہیں ہے جن پر تصرف کرنے سے عام مخلوق کو تکلیف ہوتی ہو بلکہ تکلیف ہو یا نہ ہو زمین کا ہر وہ حصہ جو عام گزرگاہ کی حیثیت کسی آبادی میں اختیار کر چکی ہے سب کے لئے یہ حکم عام ہے۔ ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

سواء کان واسعاً وضيقاً
وسواء ضيق علی الناس
اولم یضیق۔

خواہ کشادہ ہوں یا تنگ اور خواہ اس میں
تصرف کرنے سے لوگوں پر تنگی پیدا ہوتی
ہو، یا نہ ہوتی ہو۔

مسلمانوں میں شاہراہوں اور شہر کے ان مقامات میں عام باشندوں کے مفاد کو کس حد تک اہمیت حاصل ہے

اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس حکم کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب مغنی لکھتے ہیں۔

لان ذلک مشترک فیہ

۲ المسلمون و متعلق بہ مصلحتہم

فأشبه مساجدہم

عام راستوں کا | مندرجہ بالا فقرہ میں فاشیہ مساجد ہم کے الفاظ قابل غور ہیں، اس سے اندازہ اسلام میں احترام ہوتا ہے کہ شہری حقوق کا مسلمانوں نے کتنا احترام کیا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے الماطہ ۲ الاذی عن الطریق یعنی راستوں سے ان چیزوں کا ہٹانا جو راہ گروں کے لئے باعث تکلیف ہوں۔ اس فعل کو صحن الایمان (یعنی ایمان کا جز) قرار دیا ہے۔ اور اس بنا پر مشہور حدیث الطہور شرط الایمان (پاکیزگی اور صفائی ستھرائی ایمان کا ایک بڑا حصہ ہے) میں دوسری چیزوں کی تطہیر و ستھرائی کے ساتھ مکانوں اور سڑکوں کی صفائی کو بھی داخل سمجھنا چاہیے۔ جب راستوں کی صفائی کی صحیح حدیثوں میں اتنی اہمیت ہے تو فقہاء نے شوارع و طرق کو مسلمانوں کے حقوق کے اعتبار سے اگر فاشیہ بالمساجد قرار دیا ہے تو اس پر قطعاً تعجب نہ ہونا چاہیے اور اس خیال کی بھی تغلیط ہوتی ہے کہ بلدیات اور میونسپلٹی وغیرہ کے اصول و قوانین جدید مغربی تمدن کے نتائج ہیں۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی میں گفتگو ان فقہی احکام کے متعلق کر رہا تھا جو شہروں اور آبادیوں کی عام گزرگاہوں وغیرہ کے متعلق ہیں کہ ان میں کسی قسم کی انفرادی ملکیت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ نہ خود ان کو اپنی ملک کوئی بنا سکتا ہے اور نہ حکومت ایسا کر سکتی ہے۔ البتہ اس قسم کی سڑکوں اور گزرگاہوں پر بیٹھ کر عام طور سے جو لوگ خرید و فروخت کرتے ہیں، فقہاء نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

اگر گزرگاہوں کی ان نشست گاہوں کی

وجہ سے آمد و رفت کرنیوالوں کو تنگی محسوس ہو

تو پھر ان میں بیٹھ کر خرید و فروخت جائز نہ ہوگا

اور نہ حکومت کے لئے جائز ہے کہ ایسے

مقامات پر کسی کو قبضہ معاوضہ لے کر دے۔

۱ ان كان محالاً یضیق علی

المارة لم یحل له الجلوس

فیہ ولا یحل الا صامتة

بعوض ولا غیر۔

(المغنی)

لیکن سڑک اگر اتنی کشادہ ہے کہ راہ گروں کو کوئی تنگی نہیں پیدا ہوتی تو ایسی صورت میں۔

ان گزرگاہوں میں جو کشادہ اور وسیع

مقامات ہوں تو ان پر بیٹھ کر خرید و فروخت کی

یحرم الامرتفاق بالفتود

فی ۱ لو ۲ سع من ذلک البیع

۱ واقعہ یہ ہے کہ آج جن قوانین کا تعلق محکمہ صفائی یا آرائش وغیرہ سے ہے، اسلامی فقہاء نے ان کے مختلف پہلوؤں پر اپنی کتابوں میں بحث کی ہے، جاننا چاہیے کہ فقہ کی کتابوں سے ان قوانین کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار کیا جاسکتا ہے ۱۲

آسانی حاصل کرنا اس وقت جائز ہے
جب آنے جانے والوں کی راہ میں

والشراۃ علی وجہ لایضیق
علی احد ولا یضو المارة۔
تنگی نہ پیدا ہوتی ہو، نہ کسی اور کو۔

اس قسم کا استفادہ ٹرکوں سے شہر کے عام باشندے خود بھی کر سکتے ہیں اور حکومت کو بھی ایسی صورت
میں (یعنی جن میں ضرر کا اندیشہ نہ ہو) اختیار ہے کہ ٹرکوں بلکہ مسجدوں کے احاطہ وغیرہ میں جسے ر حاب
المساجد کہتے ہیں۔ اس قسم کے کاروبار کے لئے جگہ دے سکتی ہے۔

ابن قدامہ نے الطرق الواسعة اور سراجاب المساجد کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

للامام اقطاعها لمن
یجلس فیها۔
امام (حکومت) ان مقامات کو بیٹھنے والوں
کے لئے مخصوص کر سکتی ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے۔

ولا یملکها اقطع بدن لک بل
یکون الحق بالجلوس فیها
من غیره۔
لیکن حکومت جس کے نام سے اس کو مخصوص
کرے وہ اس کا مالک نہ ہوگا صرف دوسروں
کے اعتبار سے بیٹھنے کا وہ زیادہ حقدار ہوگا۔

اسی طرح اگر اس قسم کے مقامات پر حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی خرید و فروخت کے لئے بیٹھ جائے تو

السابق الحق به ما دام
فیہ فان ترک متاعه
فیہ لم یحزن لغیره
انرا لته لان ید الاول
علیه وان نقل متاعه
کان لغیره ان یقعد
فیہ لان ید احد
من الت۔
جس نے آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کر لیا ہو
تو وہی اس کا حقدار ہوگا۔ جب تک اس پر
قابض رہے گا، اگر اس قسم کے مقامات
میں اپنے سامان کو چھوڑ کر چلا جائے تو
کسی دوسرے کو اس کا حق نہ ہوگا کہ
اس کے سامان کو اس جگہ سے ہٹالے
کیونکہ ابھی پہلے آدمی کا اس پر قبضہ باقی
ہے۔ اور اگر اپنے سامان کو وہاں سے

ہٹالے تو بھراپ دوسرے کو یہ حق ہے کہ اس مقام پر بیٹھ جائے کیونکہ پہلے آدمی کا قبضہ اس سے اٹھ گیا۔

بہر حال مشہور حدیث منی مناخ من سبوت کی بناء پر ایسی صورت میں جس نے پہلے قبضہ کر لیا اس کو ترجیح
دی جائے گی۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مقامات میں کوئی دوکان کے لئے
کیا۔ مکان یا چبوترہ وغیرہ بنا سکتا ہے؟

ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ

لیس له ۲ النباء لا دكة
ولا غير هالانه يضيق
على ۲ الناس ويعثر به
۲ الماسرة بالليل والضرر
بالليل والنفاس ويبقى
على ۲ الدوام فربما
۲ دعي ملكه بسبب ذلك
شب وروز ضرر کا اس سے اندیشہ ہے اور چونکہ ایسی چیزیں دوامی ہوتی ہیں اسی لئے
اس کا بھی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اس کی ملکیت کا دعویٰ کر بیٹھے۔

لیکن اس کے ساتھ اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ

له ۲ ان يظل على نفسه
بمالا ضرر فيه من
بارية وتابوت وكساء
ونحوه لان الحاجة
تدعو اليه من غير
مضرة فيه۔

ان مقامات پر بیٹھ کر خرید و فروخت
کرنے والوں کو اس کی اجازت ہے کہ
اپنے اوپر کوئی سایہ کی چیز کھڑی کریں
جس میں کسی کو ضرر نہ پہنچے۔ مثلاً چٹائی یا
ٹاٹ یا کمر یا اسی قسم کی چیزوں سے سایہ
کریں، اور یہ اجازت اس لئے دی جاتی

ہے کہ اس کا وہ حاجت مند ہے اور دوسروں کا اس میں ضرر نہیں ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا زیادہ تر تعلق شوارع عام یا عام گزرگاہوں
وغیرہ سے ہے۔ لیکن خاص راستے اور کوچے جنہیں صرف کسی خاص مکان یا چند مکان کے رہنے والے ہی
اپنی آمد و رفت کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ ان کے احکام عام راستوں سے مختلف ہیں جن کی تفصیل
فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

ایسی غیر مملوکہ چیزیں جن میں قبضہ کے بعد بھی انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہوتی ان کی ممکنہ حد تک
تفصیل کو اس نقطہ پر ختم کر کے اب ان غیر مملوکہ امور کے بھی کچھ احکام سننے چاہئیں جن میں قبضہ کے بعد
انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بنجر غیر آباد زمینوں کی | اسلامی قانون میں ممالک محدوسہ کی ایسی غیر آباد زمین اور علاقے جن کا کوئی
ملکیت کے قوانین | مالک نہ ہو خواہ وہ کبھی آباد نہ ہوئی ہوں یا آباد ہونے کے بعد اس طرح ویران
ہو گئی ہوں کہ ان کا کوئی مالک باقی نہ رہا ہو، ان کا اسلامی نام (موات) یا مردہ بنجر زمین ہے۔ بظاہر یہ
خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی زمینوں کی مالک حکومت ہے اور اس لئے حکومت کی اجازت کے بغیر
عام طور سے دنیا میں یہی دستور مروج ہے کہ حکومت یا بادشاہ وقت کی اجازت کے بغیر ایسی زمینوں

پہاڑوں، جنگلات وغیرہ پر کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور نہ کوئی ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کا نقطہ نظر اس باب میں بالکل مختلف ہے وہ اس قسم کی تمام زمینوں کو بھی ملک کے عام باشندوں کا مشترک سرمایہ قرار دیتا ہے اور بجز ان چند مستثنیٰ زمینوں اور معادن کے جن کا ذکر گزشتہ فصل میں تفصیل ہو چکا ہے۔ رعیت کے ہر فرد کا یہ قانونی حق ہے کہ ان کو بغیر کسی معاوضہ (رائٹ) اور کئے قبضہ کر کے اپنی ملک بنالے۔ اس باب میں مسلمانوں کے پاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مشہور فرمان ایک ابدی وثیقہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کے راوی تقریباً تمام محدثین ہیں، مثلاً امام مالک، امام ترمذی، ابو داؤد وغیرہ سب کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے کہ

من احياء الارض صامية
فهي له - کسی مردہ غیر آباد زمین کو جو آباد کرے
یہ زمین اسی کی ہوگی۔

اسی بنا پر علامہ مقدسی نے معنی میں تمام ائمہ اسلام کا یہ اجتماع نقل کیا ہے کہ

عامۃ فقہاء الامصار علی
ان الموات یملک بالاحیاء - فقہاء امصار کا عامہ اس پر اتفاق ہے
کہ احوال (آباد کرنے) کی وجہ سے وہ آباد
کرنے والے کی ملک بن جاتی ہے۔

(۱۴ ج ۶)

خواہ یہ "ارض موات" ایسی زمین ہو جو کبھی کسی کی ملوک نہ ہوئی ہو اور اس کے آباد ہونے کی نوبت نہ آئی ہو جیسا کہ وہی لکھتے ہیں ایسی زمین کہ

صالحہ یجر علیہ ملک احد
ولم یوجد فیہ اثر عمارۃ
فخذ املک بالاحیاء
لغیر خلافت بین القائلین
بالاحیاء - کسی کی ملک اس میں قائم نہ ہوئی ہو، اور
اس میں کسی آبادی کی علامت نہ پائی جاتی
ہو، تو بالاتفاق آباد کرنے کی وجہ سے آدمی
اس کا مالک ہو جاتا ہے اس میں کسی کا اختلاف
نہیں ہے جو آباد کرنے کو ملک کا سبب کہتے ہیں

اسی طرح ایسی اراضی

ما یوجد فیہ اثار
ملک قدیم جاہلی
کا ثار الاروم و مساکن
شمود و نحوہم فخذ املک
بالاحیاء - جس میں کسی قدیم جاہلی ملک کی علامتیں
پائی جاتی ہوں، مثلاً روم کے آثار اور
قوم شمود کے مسکن کا حال ہے جو ایسے
مقامات ہوں تو آباد کرنے سے ان کا
بھی آدمی مالک ہو جاتا ہے۔

چونکہ اس قسم کی زمین اسلامی عہد سے قبل ہی سہی لیکن بنی آدم کی ملوکہ چیزوں میں ہو چکی تھی اس لئے مشبہ ہو سکتا تھا کہ دوسرے کی ملوکہ چیز پر قبضہ کرنے یا اس کو ملک بنانے کا کسی دوسرے کو کیا حق ہے۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے فرمان میں اس کی بھی تصریح فرمادی ہے کہ

عادی الارض للہ ورسولہ عادی اراضی (یعنی اقوام قدیمہ کے کھنڈر
مشمہ ہو بعد لکم۔ یا ان کے آباد کئے ہوئے بنجر علاقے)

یہ اللہ اور اس کے رسول کی ملک ہیں، پھر اس کے بعد اے مسلمانوں یہ تمہاری ملکیت ہے۔

یعنی اس قسم کی زمین کو جب اس کے مالک چھوڑ کر لاپتہ ہو چکے ہوں اور اسلامی حکومت کے زیر نگرانی آگئیں
تو اب وہ اپنے پرانے مالکوں کی ملک سے نکل کر اللہ و رسول کی ملک میں داخل ہو گئیں جسور صلی اللہ علیہ
وسلم نے حق تعالیٰ کی طرف سے پھر ان کو عام مسلمانوں کے حوالہ فرما دیا۔ ایستہ ارض موات کی ایک قسم
اور رہ جاتی ہے جو اسلامی عہد میں کسی خاص شخص کی ملکیت تھی لیکن ان کا مالک ان کو غیر آباد کر کے
لاپتہ ہو گیا۔ ایسی زمینوں کے متعلق اگرچہ بعض ائمہ اسلام کی رائے مختلف ہے مگر امام ابو حنیفہ امام مالک
وغیرہ کا ان اراضی کے متعلق بھی یہی فتویٰ ہے کہ

انہا تملک بالاحیاء وھو آباد کرنے سے وہ بھی ملوکہ بن جاتی

مذہب ابی حنیفہ و مالک ہیں، یہی ابو حنیفہ اور امام مالک کا

(معنی) مذہب ہے۔

بہر حال اس قسم کی تمام "ارضی" جن کا فقہ کی اصطلاح میں "موات" نام ہے۔ دراصل یہ ملک کے باشندوں
کی مشترکہ جائیداد ہے اور ملک کا ہر باشندہ اس کو اپنی انفرادی ملکیت بنا سکتا ہے جس کی اسلامی
قانون کی رو سے دو صورتیں ہیں۔

اقطاع یا جاگیرول کا حکم | ایک کو اقطاع کہتے ہیں، یعنی خود حکومت اس علاقہ کو کسی شخص کے ساتھ
بندوبست کر دے اور یہ امام کے صوابدید پر ہے کہ جس کو چاہے جتنی زمین کا اقطاع کر دے۔ خود
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایت ہے کیسا کہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے کہ

۱ قطع رسول اللہ صلی

۲ اللہ علیہ وسلم لبلال

بن الحارث المزنی

ما بین البحر والصحرا۔

آحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال

بن حارث مزنی کو دریا سے پہاڑ تک

جاگیریں دیدیا تھیں (یہ اصطلاح تھی

ساحل سمندر سے کسی خاص سلسلہ کوہ تک

کی درمیانی ارضی کی ہندوستان میں جیسے ازگنگ تا سنگ کالفظ بعض علاقوں میں بولتے ہیں)

ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الاموال" میں اس قسم کے قطائع (جاگیرات) جو بارگاہ رسالت اور

سریر خلافت سے مختلف لوگوں کو عطا ہوتے رہے ہیں، ذکر کیا ہے۔ میں نے خاص کر بلال بن حارث

کی جاگیر کا ذکر قصداً اس لئے کیا تا کہ معلوم ہو کہ بڑے سے بڑا علاقہ بھی حکومت اپنے صوابدید سے

جاگیر میں عطا کر سکتی ہے۔ لیکن حکومت کے صرف اقطاع سے اس علاقہ کا وہ شخص مالک نہیں ہو جاتا،

جب تک کہ "احیاء" کر کے اس پر قبضہ نہ کر لے، علامہ مقدسی لکھتے ہیں۔

فان اقطعه الامام شیئاً من اگر "موات" زمین کو امام (حکومت)

۱۔ الموات لہم یملک بذاک
لکن یصیر الحق بہ۔

کسی کی جاگیر میں دے تو محض اس سے
وہ اس زمین کا مالک نہیں ہو جاتا البتہ نسبت
دوسروں کے وہ اس کا زیادہ حقدار ہوگا۔

(معنی)

اپنے اس دعویٰ کی انھوں نے دلیل بھی یہ پیش کی کہ ”عقیق“ میں جو جاگیر انھیں بلال کے نام رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے اقطاع کی تھی چونکہ اچھا پر قادر نہ ہو سکے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے واپس لے لی۔
علامہ مقدسی لکھتے ہیں۔

لوملکہ لم یخیر استرجاعہ

اگر صرف اقطاع سے بلال مالک ہو جاتے

تو حضرت عمرؓ کو اس کی واپسی جائز نہ ہو سکتی تھی۔

اسلامی جاگیروں کا مطلب | یہاں جاگیر کا یہ مطلب نہیں ہے جیسا کہ ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے
کہ وہ لاخراج کردی جاتی ہے بلکہ ”موات“ کی اراضی کے عطا کرنے کے بعد اس پر ”عشر“ یا ”خراج“ بھی لگایا
جاسکتا ہے اور اس معاملہ میں مختلف زمینوں کا حکم مختلف ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے
خراج کے باب میں صرف امام (بادشاہ وقت) کو اتنا اختیار دیا گیا ہے کہ ملک و رعایا کے
مصلح کی بناء پر مثلاً وقت پر فوجی امداد جاگیردار سے حاصل کی جائے گی یا از زمین قبیل کوئی اور مصلحت ہو
تو جیسا کہ قاضی ابویوسف نے لکھا ہے۔

اگر امام اسی میں مصلحت دیکھے کہ زمین کا

یکون ۲ الامام قداری الصلاح

خراج جاگیردار کو عطا کر دیا جائے تو امام

فی تفویض خراج ۲ ارض

ایسا کر سکتا ہے اور جاگیردار کو بھی اجازت

صاحب الارض فیجوز لہ

ہے کہ وہ اس عطیہ کو قبول کرے۔

یسعہ ۲ ان یقبلہ۔

لیکن امام کے سوا حکومت کے کسی عہدے دار کو خواہ اس کا درجہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو خراج کی معافی
بلکہ تخفیف تک کا اختیار نہیں ہے۔

بہر حال یہ ایک ذیلی بات تھی۔ جاگیروں کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ مقصود تھا ورنہ
اس کے تفصیلی مسائل تو بہت سے ہیں جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔ اصل بات یہ کہی جا رہی تھی کہ
”ارضی موات“ میں انفرادی ملکیت ایک تو اس اچھا (آباد کرنے) سے حاصل ہوتی ہے جو اقطاع
کے ذریعہ سے کسی کو ملی ہو اور عام طور سے غیر آباد زمینوں کے بندوبست کرنے کا دنیا میں یہی طریقہ
مروج ہے۔ اگرچہ مختلف حکومتوں کا طرز عمل بندوبست کے شرائط اور نتائج میں مختلف ہے۔ لیکن
ارضی موات کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ جو اسلام میں ہے دوسری حکومتوں کی رعایا کے
لئے شاید وہ عجیب ہو۔

ملک کی غیر آباد زمینوں کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ | میرا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان یعنی،

من احیاء ارض موات ففی له موات اراضی کو جو آباد کرے گا اسی

کی وہ ہو جاتی ہے۔

کی بنا پر فقہار امت کی اکثریت کا یہ فتویٰ ہے کہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ غیر آباد زمینوں اور علاقوں (ارضی موات) سے جتنا حصہ بغیر کسی معاوضہ اور رائلٹی کے چاہے۔ احیاء کر کے اسے اپنی ملک اور جاگیر بنالے۔ صرف امام ابو حنیفہ اس مسئلہ میں متفرد ہیں کہ حکومت سے بھی اجازت احیاء کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن عام فقہاء اسلام حکومت کی اجازت کو غیر ضروری سمجھتے ہیں حتیٰ کہ امام صاحب کے شاگرد رشید قاضی ابویوسف نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے مذکورہ بالا بنوی وثیقہ کی بنا پر لکھا ہے،

ان اذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت
علیہ وسلم جائز الی یوم القیمۃ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت
قیام قیامت تک نافذ رہے گی۔

یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ففی له (وہ آباد کرنے والے کی ملک ہے) موجود ہے تو اس میں اب کسی دوسرے شخص سے پوچھنے اور اجازت حاصل کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں، البتہ حکومت کو صرف اس کی نگرانی کرنی چاہیے کہ اس سے مفاد عامہ کو کوئی ضرر تو نہیں پہنچتا۔ قاضی ابویوسف نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی بعض روایتوں میں لیس لعرق ظالم حق کے الفاظ سے اسی "ضرر" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ کسی غیر آباد زمین میں (یعنی موات) میں اگر کوئی درخت نصب کرے جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے تو پھر اس ظلم کا حق اس کو نہ دیا جائے گا۔ عام فقہاء اسلام سے امام صاحب کے اس اختلاف کے متعلق قاضی ابویوسف سے پوچھا گیا تھا کہ اس صحیح و صریح "بنوی وثیقہ" کے ہوتے ہوئے حکومت کی اجازت کی قید امام صاحب نے کیوں بڑھائی۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کافی نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا جواب امام صاحب کی طرف سے نقل کیا جاتا ہے کہ آخر بیت المال کے متعلق بھی تو عام قانون یہی ہے کہ

هو بیت مال المسلمین
یعنی اس کے مالک مسلمان ہیں۔
اور باوجود اس کے کہ امام بیت المال کا مالک نہیں ہے لیکن اس پر اتفاق ہے کہ
للامام تعیین مصارفه
امام کو بیت المال کے رقوم کے مصارف
و ترتیبہ۔ (مقدمہ)
کی تعیین و ترتیب کا حق ہے۔

اسی طرح "زمین" کے متعلق بھی امام کو نظم و ترتیب میں بھی دخل دینا چاہیے۔ ورنہ رعایا میں باہمی کشمکش کی توہین کے بعد جھگڑے کا خطرہ نہ رہے گا۔ لیکن لوگوں نے امام صاحب کی اس توجیہ کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ پوچھا گیا ہے کہ کیا ہوا کے ہر پرندے پر قبضہ کرنے کے لئے بھی حکومت کی اجازت درکار ہے آخر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی موات کو تمام مسلمانوں کے لئے مباح قرار دیا اور سند دے دی کہ جو اس کو آباد کرے گا اسی کی وہ زمین ہو جائے گی۔ اس کے بعد حکومت سے

اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔

بہر حال یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ موات کی اراضی کو اجیار کے ذریعہ سے اپنی مملوکہ جاگیر بنالینے کا اختیار صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو ہے مسلم ہو یا غیر مسلم اور یہ میرا صرف قیاسی نتیجہ نہیں ہے بلکہ فقہ کی کتابوں میں ہمیشہ اس کی تصریح کر دی جاتی ہے، مقدسی لکھتے ہیں۔

لا فرق بین المسلم
والذی فی الاحياء وبہ
قال ابو حنیفہ۔

موات زمین کو آباد کر کے اپنی ملک بنالینے میں
مسلم اور ذمی (غیر مسلم رعایا) میں کوئی فرق نہیں
ہے۔ امام ابو حنیفہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ میدانی علاقہ ہو یا کوہستانی۔ جزیرہ ہو یا خشکی کا خطہ جنگل ہو یا بیابان، ملک کا ہر باشندہ جتنی زمین چاہے موات اراضی میں سے آباد کر کے ان کو اپنی مملوکہ جاگیر مفت بنا سکتا ہے۔

قاضی ابو یوسف کے الفاظ یہ ہیں

کل ما عالج فی اجمة او
من بحر او من بر بعد ان
لا یكون فیہ ملک لا انسان
فاستخرجہ رجل و عمره فصولہ
بمنزلة الموات۔

اجمہ (نیستان) ہو یا تری کا علاقہ ہو، یا
خشکی کا، اگر کسی خاص انسان کی ملک میں
وہ نہیں ہے اور محنت مشقت کر کے جس نے
اس کو اوپر کیا اور آباد کیا تو اس کا وہی مالک ہو گا۔
جیسے موات اراضی کا حال ہے۔

مثلاً دجلہ و فرات جیسے دریاؤں میں عموماً بڑی بڑی زمین باہر نکل آتی ہیں۔ اگر ان کے آباد کرنے میں کسی کا ضرر نہ ہو تو ان کا حکم بھی مثل ارض الموات ہے۔

یعنی اس جزیرہ کا آباد کرنے والا قانوناً مالک ہو جائے گا۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ”اجیار“ یا آباد کرنے کا لفظ جو اس سلسلہ میں برابر استعمال ہو رہا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ محض کھیتی کرنا یا باغ لگانا یہی مقصد نہیں ہے بلکہ جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے۔

احیاء کل واحد من
ذلک تمیہا للانتفاع الذی
اسریلات بہ۔

ان میں ہر چیز کی اجیار کا مطلب یہ ہے کہ
جو نفع اس سے مقصود ہو اس کے لئے
اس کو تیار کیا جائے۔

یعنی ”آبادی“ صرف زراعت یا باغبانی پر منحصر نہیں ہے۔ مکان بنانا کر یا دوا بگاہ (موشی رکھنے کی جگہ) یا لکڑی وغیرہ جیسی چیزوں کو رکھنے کی جگہ بنانا یہ سب اجیار میں داخل ہے۔ علامہ مقدسی نے بطور مثال کے چند چیزوں کا ذکر کیا ہے مقصد کے سمجھانے کے لئے ہم بچنسہ نقل کرتے ہیں،

فاما الدار فی ان یبني
حیطانها مما جرت
به العادة وتسقيها

گھر کے اجیار کا مطلب یہ ہے کہ اس کی
دیوار میں کھڑی کی جائیں، یعنی جس طرح
اس ملک میں دیواروں کے بنانے کا طریقہ ہو

لا نهال اتكون سكنى
بذلك واما الحظيرة
فاحياءها بحائط
جرت به عادة مثلها
ليس من شرطها التسقيف
لان العادة ذلك من
غير تسقيف سواء ارا
خطيرة الموشى والخشب
چھت نہیں پاٹتے خواہ موشی کے لئے احاطہ بنایا جائے یا لکڑی کا گودام بنایا جائے۔

وہی دیوار کھڑی کر دی گئی ہو اور اس کی
چھت پاٹ دی گئی ہو، کیونکہ رہنے کے
قابل بغیر اس کے نہیں ہو سکتا، اسی طرح
”خطیرہ“ (احاطہ) کی اجیاء کا مطلب یہ ہے کہ
جس قسم کی دیوار گھیر کر احاطہ بندی کا طریقہ
اس ملک میں جاری ہو، یعنی چھت پاٹنے کی
ضرورت اس کی اجیاء میں نہیں ہے کیونکہ
عام طریقہ یہی ہے کہ ان احاطوں کے لئے

الغرض آباد کرنے کی جو غرض ہے اس کا سامان مہیا کرنا یہی اس کی اجیاء ہے، مثلاً کھیتی ہے تو اس کا جوتنا
سیرابی کا انتظام کرنا یہی اس کی اجیاء ہے مقدسی لکھتے ہیں کہ زراعت کی اجیاء کی صورت یہ ہے۔

ان يسوق اليها ماء
من نهرا وبيئروان كانت
مما لا يمكن زرعها
لكثرة ايجارها كارض
الحجائر فبان يقلع ايجارها
ومنتقنيها حتى يصلح
للزراع وان كانت غياضا
واشجارا كارض الشعري
فبان يقلع اشجارها
ويزيل عروقها التي
تمنع الزراع۔

کہ آدمی اس کی طرف کسی نہر سے یا کنوئیں سے
پانی لے جائیں، اور اگر زمین ایسی ہو جس
میں کھیتی نہ ہو سکتی ہو، مثلاً کثرت سے اس
میں پتھر ہوں، جیسا کہ حجاز کی زمینوں کا حال
ہے تو اس کی اجیاء کے معنی یہ ہوں گے کہ
پتھروں کو زمین سے باہر نکالا جائے اور
زمین صاف کی جائے حتیٰ کہ کھیتی کے قابل
ہو جائے اور اگر بنجر (موات) زمین میں
جنگل جھاڑ ہو درخت ہوں جیسا کہ شری
کی زمین کا حال ہے تو اس کی اجیاء کے
معنی یہ ہیں کہ درخت اکھاڑے جائیں

اور ان جڑوں کو کھود کھود کر نکال دیا جائے جن سے کھیتی میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہو۔

بہر حال ہر چیز اور ہر ضرورت کی اجیاء خود اس ضرورت کے حسبِ حال ہوتی ہے اور جیسا کہ علامہ مقدسی نے
لکھا ہے کہ اس باب میں اعتبار زیادہ عرف عام اور رواج کا ہے۔ آباد کرنے کا اطلاق جس کا رو بار پر
کیا جاتا ہو وہی اس کی اجیاء ہے۔

رعایا کی اسلام | اس کے بعد خواہ اقطاعی (حکومت کی بند و بست کی ہوئی) جاگیر ہو۔ یا خود کسی
میں تملیکی قوت | نے ارض موات پر قبضہ کر کے اجیاء کر لیا ہو، یہ آباد کرنے والے کی انفرادی ملک
بن جاتی ہے۔ اقطاعی جاگیرات کا حکم اجیاء کے بعد جو ہو جاتا ہے قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں،

فلا یحل لمن ینا تی من
بعد ھم من الخلفاء ان
یرد ذلک ولا یخرجہ من
ید من ہونی ید کا وارثا
۱۰ و مشتریا۔ (ص ۳۴)

بعد کو جو خلفاء ہوں، ان کے لئے جائز
نہ ہوگا کہ (کسی امام کی عطا کی ہوئی جاگیر کو)
اس شخص سے واپس لیں جس کے قبضہ میں
وہ جاگیر خواہ بطور وراثت کے ہو یا خریداری
کے ذریعہ سے اس تک پہنچی ہو۔

جس سے معلوم ہوا کہ جس نے آباد کی ہو خود اس کے یا اس آباد کرنے والے سے کسی کو وراثتاً ملی ہو یا آباد
کرنے والے سے کسی نے خریدی ہو، کسی سے بھی حکومت اس کی یہ ملوکہ زمین چھین نہیں سکتی انھوں نے
اس کی تصریح کر دی ہے کہ

فاما ملیاخذ الولاية من
ید واحد رضا و قطعھا
آخر فھذا بمنزلة الغاصب
غصب واحد او اعطى
آخر (کتاب الخراج ۲۴)

اور حکومت کے ولایت (صوبہ داروں،
گورنروں) وغیرہ کا جو یہ طریقہ ہے کہ جاگیر کو
ایک شخص کے قبضہ سے نکال کر دوسرے کو
جاگیر میں دیدیتے ہیں تو اس کی صورت
وہی ہے جو غاصب اور زبردستی چھیننے والوں

کی ہوتی ہے یعنی ایک شخص سے اس کی ملوکہ چیز زبردستی چھین کر دوسرے کو دیدے۔

دوسری جگہ مزید صراحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اما من اخذ من واحد
قطع آخر فھذا بمنزلة
مال غصبه من واحد
واعطى واحد (ص ۲۳)

اور وہ جو ایک شخص سے جاگیر چھین کر دوسرے
کی جاگیر میں دی جاتی ہے تو اس کی حیثیت
اس مال کی ہے جو ایک شخص سے چھین کر
دوسرے کو دے۔

اسی طرح اراضی موات کو ایسا کر کے جس نے اپنی ملوکہ جاگیر بنالی ہے، اس کے متعلق بھی لکھتے ہیں
امام (حکومت) کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ
کسی کے قبضہ اور ملک سے زمین کو چھین لے۔
شیعاً من ید واحد (ص ۳۵)
ولیس للامام ان یخرج
اسی دفعہ کی تعبیر دوسرے الفاظ میں دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں۔

فلا یحل الا صام ولا یسعه
ان یقطع من الناس
حتی مسلم ولا معاهد
ولا یخرج من بعد من
ذلک شیعاً۔

امام (حکومت) کے لئے جائز نہیں ہے
اور نہ قانوناً اس کے لئے اس کی گنجائش
ہے کہ کسی مسلمان یا جس سے اسلامی حکومت نے
معاہدہ کیا ہو کہ اس کے حق کو اس سے منقطع کر دے
نیز کر سکتا ہے کہ اس کے قبضہ سے کوئی چیز نکالے

دوامی بندوبست | یعنی یہ حکم حکومت کی مسلم غیر مسلم ہر قوم کی رعایا کے لئے عام ہے گویا ان زمینوں کی

حیثیت بند و بست دوام کی ہو جاتی ہے اور جاگیردار کو اختیار ہے کہ خواہ وہ خود اس کو آباد کرے یا کسی اور ذریعہ سے آباد کرے قاضی صاحب لکھتے ہیں،

فمن احیاءها وھی کذلک
فھی له ویزرعها ویزرعها
ویؤاجرہا یکرھی منها الا انها
ولعمرہا بما فیہ مصلحتہا۔
(ص ۳۷)

جس نے اس زمین کو آباد کیا ہو، اور وہ
اسی حال میں ہو تو اس زمین کا مالک
اس کا آباد کرنے والا ہو گا اسے حق ہے
کہ اس میں خود کاشت کرے یا کسی سے
کاشت کرائے یا کسی کو کرایہ پر دے۔

اسے اس کا بھی حق ہے کہ اپنی زمین میں نہر کھودے اور اس کا بھی کہ جس قسم کی عمارت
اور آبادی جس میں مصلحت ہو، اپنی زمین میں قائم کرے۔

البتہ اس پر حکومت کی جو مالگزارسی عائد کی گئی ہو صرف اس کا ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے۔

فان کانت فی ۲۰۰ ص ۲۰۰ العشر
۲۰۰ ص ۲۰۰ العشر وان کانت
فی ۲۰۰ ص ۲۰۰ الخراج ۲۰۰ ص ۲۰۰
الخراج۔

اگر اس کی یہ زمین عشر کی زمین ہو،
تو اس سے عشر ادا کرے گا۔ اور اگر
خراجی زمین ہو تو اس سے خراج
ادا کرے گا۔

تجیر کا مطلب اور حکم | عشر و خراج کی عدم ادائیگی کی صورت میں حکومت اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے
اس کی تفصیل مناسب موقع پر آگے آتی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی غیر آباد زمین کے حدود
میں صرف پتھر نصب کر کے یا کانٹوں وغیرہ سے گھیر کر اس کو اپنی مملوکہ زمین قرار دینا صحیح نہیں ہے،
فقہاء میں اس عمل کا نام تجیر ہے چونکہ یہ زمین کا اجارہ نہیں ہے۔ اس لئے ملکیت تو پیدا نہ ہوگی البتہ
بہ نسبت دوسروں کے اس کے حق کو گو نہ ترجیح ہوگی۔ مگر وہ بھی ایک خاص مدت تک جس کی تفصیل فقہ کی
کتابوں میں موجود ہے۔ مندرجہ بالا بیانات سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اپنی حکومت کی رعایا
کی معاشی سہولتوں کے کتنے ذرائع پیدا کر دیئے ہیں۔ آج جبکہ دنیا میں کوئی ایک انچ زمین پر بھی بلا معاوضہ
مفت قبضہ نہیں کر سکتا اس سے اس وقت کا اندازہ لگانا چاہیے اور اس لئے میں نے اس سلسلہ میں
تھوڑی تفصیل سے کام لیا کیونکہ اسلامی حکومت کا نظام جب سے ناپید ہو گیا ہے۔ لوگ ان واقعات کو
بھول گئے ہیں ورنہ سچ یہ ہے کہ ہندوستان تک میں حکومت مغلیہ کے آخری دور تک زیادہ تر اس قسم کی
معاشی سہولتیں آباد کاروں کو حاصل تھیں۔

بہر حال یہ احکام تو غیر مملوکہ امور سے متعلق تھے۔ اب بحث ان چیزوں پر کرنی چاہیے جو کسی کی
ملک میں داخل ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ مالک کی مرضی کے بغیر ان پر قبضہ کرنے
کی اسلام اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ پھر ایسی مملوکہ چیزیں جن پر مالک کی مرضی کے بغیر بھی قبضہ کر کے ان کو
اپنا مملوک بنایا جاسکتا ہے اس کی بھی اسلام میں دو شکلیں ہیں۔

مالک کی مرضی کے بغیر کسی چیز پر قبضہ کرنا | (۱) اسلامی حکومت کی رعایا کا اگر مال ہو تو مالک کی مرضی کے بغیر صرف دو شکلوں میں ان پر قبضہ کرنے کی اجازت ہے ایک کی فقہی تعبیر لفظ ہے۔

لفظ کا مطلب | یعنی گرا پڑا ہوا مال اگر کسی کامل جائے۔ تو بعض صورتوں میں یہ جائز ہے کہ آدمی ان پر قبضہ کر لے اور خاص شروط و حالات میں ان کو اپنے تصرف میں بھی لاسکتا ہے۔ لیکن جب کبھی اصل مالک کا پتہ مل جائے اور وہ اس کا مطالبہ کرے تو معاوضہ ادا کرنا پڑے گا۔ چونکہ اس باب کا تعلق معاشیات سے نہیں ہے کہ یہ آمدنی کی نہایت نادر شکل ہے۔ اس لئے اس کے تفصیلات کی یہاں ضرورت نہیں۔

قانون شفعہ | دوسری شکل شفعہ کی ہے یعنی مالکانہ شرکت یا پڑوس کی وجہ سے اسلام نے ملک کے باشندے کو یہ قانونی حق دیا ہے کہ آدمی دوسرے کی خریدی ہوئی چیز کو زبردستی دام ادا کر کے اپنی ملک بنالے مثلاً کسی مکان یا زمین میں دو آدمی یعنی زید و عمر شریک ہیں۔ اگر عمر کے حصہ کو خالد خریدے تو زید کا یہ قانونی حق ہے کہ جس دام میں خالد نے اس کے شریک کے حصہ کو خریدا ہے ادا کر کے خالد کی رضامندی ہو یا نہ ہو خریدے قانون اس جبری خریداری کو نافذ کرائے گا، معلوم نہیں اس باب میں دنیا کے اور قوانین کا کیا حال ہے لیکن اس قانون کی وجہ سے اسلامی حکومت کی رعایا کو دکانوں، کھیتوں باغوں وغیرہ کے متعلق کتنی آسانیاں بہم پہنچتی ہیں اور پہنچ سکتی ہیں۔ اس کا اندازہ تجربہ سے ہو سکتا ہے۔ خصوصاً حنفی مذہب میں اس قانون کو ملکی شرکت سے آگے بڑھا کر مرافق (مثلاً راستہ ذرائع آبپاشی وغیرہ) کی شرکت اور جوار (پڑوس) کی شرکت تک وسیع کر دیا گیا ہے۔ فقہ کا یہ ایک طویل باب ہے۔ میرے لئے اس سلسلہ میں صرف اتنا بیان ہی کافی ہو سکتا ہے۔

غیر اسلامی حکومتوں کی رعایا کے ساتھ مسلمانوں کے معاشی تعلقات | (۲) غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے مملوکات پر مالکوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے

ہیں، اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے بھی اس حق کو اسلام نے قانونی حق قرار دیا ہے یعنی اسلامی حکومت کے باشندوں کے اموال پر العیاذ باللہ اگر ان کا قبضہ ہو جائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس دفعہ کا تعلق قانون جنگ سے ہے اسی سلسلہ میں غنیمت۔ فنی۔ متعلقات فنی وغیرہ کی آمدنیاں ہیں۔ علاوہ ان عطایا و وظائف وغیرہ کے جو اسلامی فوجوں کو حکومت سے ملتے تھے۔ چونکہ لڑنے والے ہر سپاہی کو غنیمت سے بھی حصہ ملتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں میں آمدنی پیدا کرنے کا یہ بھی ایک بڑا آسان اور قیمتی ذریعہ تھا اور ان کی معاشی فراغیوں پر اس قانون کا کافی اثر مرتب ہوتا تھا۔ چونکہ اس آمدنی کا تعلق معمولی کاروبار سے نہیں ہے بلکہ اس کی اکثر شکلوں کا

العیاذ باللہ کالفظ میں نے اپنے فقہاء کی تقلید میں لکھا ہے تاکہ معلوم ہو کہ مسلمانوں پر ایک وہ وقت بھی گزرا ہے جب غیر اسلامی اقوام کے تسلط کو اپنے اوپر ناقابل برداشت تصور کرتے تھے۔ پھر آسمان نے رخ بدلا اور جس کا سوچنا بھی ناگوار تھا اسے دیکھنا پڑا۔ اور کیسا دیکھنا؟

تعلق حکومت سے ہے۔ اس لئے اس باب کی بھی تفصیل کی یہاں حاجت نہیں۔ البتہ اسی بین الاقوامی قانون کی بنا پر کہ شریعت میں چونکہ یہ طے کر دیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کی رعایا کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لئے مباح اور جائز ہے۔ یعنی قبضہ کرنے کے بعد ان کی ملک میں داخل ہو جاتا ہے اور ان سے اگر کوئی مسلمان اس مال کو خریدے تو یہ قانونی مالک سے مال کا خریدنا ہوگا۔ اسی لئے اس کا لینا جائز ہوگا۔

غنیمت و فنی کی حلت کی وجہ | پھر جس طرح مسلمانوں کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کی ملک میں صرف قبضہ سے داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لئے غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کا بھی مال مباح و جائز ہے۔ یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے قانونی مالک بن جاتے ہیں، غنیمت (یعنی غیر اسلامی حکومت کے لوگوں سے جو مال بزور حاصل کیا جائے) اور فنی (جو مال غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کا بغیر کسی جنگ و جدال کے مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے) ان دونوں قسم کے اموال کے قانونی مالک مسلمان اسی بنا پر ہو جاتے ہیں کہ ان لوگوں کے اموال کو اسلام نے مسلمانوں کے لئے مباح اور جائز قرار دیا ہے۔

غیر اسلامی ممالک میں سود، قمار وغیرہ کا حکم | اسی مسئلہ کی بنیاد پر ایک اور معاشی سوال پیدا ہو گیا۔ یعنی غیر اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم باشندے کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رو سے لین دین کا قانونی اور شرعی ذریعہ نہیں ہے مثلاً ربوا (سود) یا قمار یا ازین قبیل کسی اور غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ میں آجائے تو کیا قانوناً یہ مسلمان اس کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں۔ چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے اور مباح و جائز مال کے مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے، مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کر کے قبضہ کر لینا اس پرندے کے مالک ہونے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس قسم کے اموال کا مسلمان قانونی طور پر مالک ہو جاتا ہے اور یہی ان کا وہ مشہور نقطہ نظر ہے جس کی وجہ سے حنفی فقہ کی عام کتابوں میں

لاسر بوابین الحربی والمسلم الحربی (غیر اسلامی حکومت کا باشندہ)

اور المسلم (اسلامی حکومت کا باشندہ) میں ربوا (سود) نہیں ہے۔

کا ذکر پایا جاتا ہے۔ گویا یہ ”بین الاقوامی“ قانون کا ایک دفعہ ہے۔ عوام چونکہ اس کے اصل منشاء سے واقف نہیں ہیں، اس لئے ان کو حیرت ہوتی ہے کہ ”ربوا“ (سود) جب اسلام میں حرام ہے تو ہر جگہ ہر شخص سے لینا حرام ہونا چاہیئے۔ ”حربی“ یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کے جائز ہونے کے کیا معنی؟ مگر سچی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ ربوا کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایک مباح مال کو قبضہ کر کے اسے اپنی ملک بنانا ہے۔ اس قانون سے پہلے ایک اور قانون کا ذکر کتابوں میں عموماً کیا جاتا ہے کہ

لارہوالبین العبد والمولیٰ یعنی درمیان غلام اور اس کے آقا کے

ربوا (سود) کا معاملہ سود کا معاملہ نہیں ہے۔

یعنی شرعی غلام اور آقا کے درمیان بھی اگر ربوا کا معاملہ کیا جائے گا تو وہ ربوانہ ہوگا یہ بھی امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ باوجود ربوا اور سود ہونے کے امام نے اس کو حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے۔ بھلا اس کا حق ایک مجتہد کو کیا ہے۔ بلکہ بات وہی ہے کہ قانوناً غلام کا مال آقا ہی کا ہے۔ پس آقا نے غلام سے جو کچھ لیا وہ اس کا مال نہیں اپنا مال لیا اور اپنا مال کسی پر کیوں حرام ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آدمی اپنی آمدنی کے مختلف مدوں کو مختلف مصارف کے لئے معین کر دیتا ہے۔ لیکن بسا اوقات کسی ایک ضرورت کے لئے دوسری مد کی آمدنی سے قرض کے نام سے لے لیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر اس قرض میں وہ کچھ سود بھی لگا کر اس مد میں جمع کر دیا کرے جس سے اس نے قرض لیا تھا تو کیا واقعی لفظ سود سے وہ سود ہو جائے گا۔ اس نے تو اپنے ہی روپے کو اپنے مال میں ملایا ہے۔ خواہ کسی نام سے ملائے۔ قانوناً شرعاً کوئی اس کو سود نہیں کہہ سکتا ہندوستان میں مسئلہ اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جہاں اس وقت اسلامی حکومت قائم نہیں ہے ربوا (سود) کا حکم یہاں کے غیر مسلم باشندوں سے بعض حنفی علماء سودی کاروبار کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ بعض غیر قانونی دماغوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر اس جواز کی بناء پر اس پر ہے کہ غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے تو پھر اس ملک میں فریب چوری ڈاکہ وغیرہ جو شرعاً لین دین کے ناجائز ذرائع ہیں کیا ان ذرائع سے بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کا مال لینا جائز ہوگا؟ حالانکہ جہاں یہ مسئلہ فقہ حنفی میں لکھا گیا ہے وہیں دوسرا فقرہ من غیر غدر (یعنی خلاف معاہدہ) لین دین نہ ہو کی قید بھی بڑھی ہوئی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں جو حکومت قائم ہے اس کے قانون میں فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ کے ذریعہ سے لین دین کو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے اور اس ملک میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اس معاہدے کے ساتھ ہی آباد ہیں کہ حکومت وقت کے قانون کی خلاف ورزی نہ کریں گے اب اگر چوری ڈاکہ یا فریب وغیرہ ذرائع سے ملک کے کسی باشندے کا روپیہ کوئی لے گا تو غدر (عہد شکنی) کے اسلامی جرم کا وہ مرتکب ہے۔ بخلاف ربوا (سود) کے کہ موجودہ حکومت نے اس ذریعہ سے لین دین کو ناجائز نہیں قرار دیا ہے۔ پس یہ حکومت وقت کے ساتھ غدر (عہد شکنی) نہیں ہے اور بغیر کسی عہد شکنی کے مسلمان کے قبضہ میں جب اس ملک کے غیر مسلم باشندے کا روپیہ آئے تو معاً

۱۵ جس میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ شاہ صاحب کے فتاویٰ عزیزیہ میں یہ فتویٰ ایک سے زیادہ مقام میں موجود ہے یہاں یہ بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ شاہ صاحب نے یہ فتوے اس وقت صادر کئے تھے جب لال قلعہ میں تیموری سلاطین نام نہاد شاہ ہند کے نام سے موجود تھے لیکن عملاً چونکہ ان کی حکومت ختم ہو چکی تھی اس لئے شاہ صاحب نے حنفی فقہ کے اس معاشی مسئلہ کا عام اعلان سرزمین ہند میں کر دیا تھا ۱۲

قبضہ کے ساتھ ہی وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کا یہ اتنا مستحکم قانونی نقطہ نظر ہے کہ اس قسم کے اموال کی حرمت کی کوئی دلیل شرعی پیش کرنا مشکل ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے اموال کے عدم اباحت کی دلیل پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ان کی حرمت کا دعویٰ؟ اور یہی اس معاشی مسئلہ کی بنیاد ہے۔ افسوس کہ علمائے اسلام نے اسلام کے اس قیمتی نقطہ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا ورنہ ادھر سو ڈیڑھ سو سال میں مسلمان جن معاشی دقتوں میں مبتلا ہو گئے خائباً صورت حال یہ نہ ہوتی ملک کے باشندوں کا ایک طبقہ صرف لیتا رہا اور دوسرا طبقہ صرف دیتا رہا۔ اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں بلکہ زیادہ تر علماء پر اس لئے ہے کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورت حال کا علاج موجود تھا۔ لیکن انھوں نے ایک جزو پر عمل کیا اور دوسرے کو ترک کر دیا۔ اور اب تو شاید مرض لا علاج ہو چکا ہے۔

اس مسئلہ کا ذکر چاہئے تو تھا کہ میں سود کے باب میں کرتا جیسا کہ عموماً فقہ کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق ربوہ کے باب سے نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی معاشی تعلقات کا یہ ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ اسی لئے یہاں یہ بات باسانی سمجھ میں آ جاتی ہے بخلاف اس باب کے جہاں خود مسلمانوں کے باہمی مالی و معاشی معاملات سے بحث کی جاتی ہے۔ غیر موزوں مقام پر درج ہونے کی وجہ سے امام صاحب کا صحیح نقطہ نظر لوگوں کے سامنے نہیں آتا۔ بہر کیف مذکورہ بالا چند استثنائی صورتوں کے سوا باہمی لین دین کو قرآن نے

عن تراض منکم
باہمی رضا مندی سے لین دین ہو۔

پر مبنی کیا ہے۔ یعنی کوئی کسی کے مال کو اس کی مرضی کے بغیر اپنی ملک نہیں بنا سکتا۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فقہاء اسلام نے تمام معاشی ابواب کے قوانین کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ لین دین میں "باہمی مرضاة" کی شرط تقریباً تمام تمدن اقوام کے قوانین میں مسلم ہے۔ چوری، ڈاکہ، فریب، دھوکا، غصب وغیرہ کو جرم اسی بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ ان تمام شکلوں میں مالک کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے، لیکن اسلام نے اس عام قانون کے سوا مالی معاملات اور مال کے لین دین کے متعلق چند اور امور کا اضافہ بھی کیا ہے جن میں پہلی اصل تو وہ ہے جس کا ذکر قرآن میں۔

لا تاکلوا أموالکم بینکم
"باطل" طریقے سے باہم ایک دوسرے کا مال نہ کھایا کرو۔

بالباطل۔
کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور دوسری اصل قرآن ہی میں۔

۱۵۔ اسی لئے ان لوگوں سے جو اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ کے مسلک کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ میرا مطالبہ ہے کہ قرآن و حدیث و اجماع، قیاس الغرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کے عدم اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہوں تو پیش کریں ۱۲

لا تظلمون ولا تظلمون۔

نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے

کے دو مختصر نقطوں میں مذکور ہے ہم اس وقت ان ہی دو اصول اور ان کے نتائج پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی معاشیات کی تصحیح و ارتقاء میں ان دو قاعدوں کو میرے خیال میں بہت زیادہ دخل ہے۔

اکل یا لباً ظل کا مطلب پہلی بات یعنی باہم ایک دوسرے کا مال یا لباً ظل نہ کھایا جائے۔ پہلے اس کے مفہوم کو سمجھ لینا چاہیے۔ مثال سے اس کو یوں ذہن نشین کیا جاسکتا ہے مثلاً ایک شخص آپ کا کوئی کام کر کے یا آپ کو اپنی کوئی چیز دے کر یا اپنی چیز سے آپ کو نفع اٹھانے کا موقع دے کر اگر آپ سے آپ کا مال لیتا ہے تو ظاہر ہے کہ آپ پر اپنا ایک حق قائم کرنے کے بعد اس کے معاوضہ میں آپ کا مال لے رہا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں کوئی حق قائم کئے بغیر اگر آپ کا مال لینا چاہتا ہے تو یہی اکل یا لباً ظل ہے۔ یعنی بغیر کسی حق کے آپ کا مال لے رہا ہے۔ یہ تو الفاظ کا مطلب ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا میں کاروبار کی ساری سرگرمیاں اس پر مبنی ہیں کہ ہر شخص ایک دوسرے کی ضرورت کو پوری کر رہا ہے۔ اگر اسی شکل کو یک طرفہ کر دیا جائے یعنی دینے والوں کو لینے والوں سے کچھ نہ ملے تو نہ زراعت چل سکتی ہے نہ تجارت نہ حرفت نہ صنعت۔ جب معاوضہ ادا کئے بغیر لوگوں کو زندگی کی ضرورت یا ملنے لگیں گی تو پھر خواہ مخواہ معاوضہ کے مہیا کرنے کی فکر میں کوئی کیوں مشغول ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے باشندوں کی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ دنیا میں آ کر اپنی قیمت حاصل کئے بغیر قبر میں دفن ہوتا چلا جائے گا۔ نیز ان کے دل و دماغ اور عملی جدوجہد سے ملک کو اپنے معاشی ارتقاء میں جو مدد مل سکتی تھی اس سے وہ محروم ہو جائے گا۔

گداگری کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر یہی وہ بنیاد ہے کہ گود دنیا کے اکثر حصوں میں گداگروں اور سائلوں کو صرف یہی نہیں کہ غیر مجرم قرار دیا جاتا تھا۔ بلکہ بعض علاقوں مثلاً ہندوستان میں غلط و احترام کی آخری بلندیوں پر وہی لوگ قابض تھے اور اب تک ہیں جن کا گذار ابھکتا اور دان پین پر ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بڑی نیکی اور پُن کی بات ہے۔ لیکن معاشی نقطہ نظر سے یہ کتنا بڑا خسارہ ہے۔ اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کہ کھاتے پیتوں کے لئے سوال کو جرم قرار دیا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

باوجود غنی ہونے کے جو لوگوں

سے بھیگ مانگتا ہے وہ جہنم کے

انگارے جمع کر رہا ہے۔

من سال الناس عن ظہر

غنی فانہا یستکثر من جہر جہنم

(صحاح)

یعنی باوجود ”غنا و استطاعت“ کے جو بھیگ مانگتا ہے وہ جہنم کے انگاروں کو اکٹھا کر رہا ہے اور غنا سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ کافی دولت و ثروت رکھتا ہو بلکہ اسی حدیث میں ہے کہ پوچھنے والے نے دریافت کیا۔

غنی کا یا رسول اللہ کیا مطلب ہے۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لئے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لئے

باعثِ عبرت ہے ارشاد ہوا،

جو یہ جانتا ہے کہ اس کے گھر میں اتنا

سرمایہ ہے کہ جس کے ذریعہ سے صبح و

۱۲ ان يعلم ان عند اہلہ

ما یغد یحرم وما یعشی یحرم

شام کی غذا مہیا ہو سکتی ہے۔

خواہ وہ کسی شکل میں مہیا ہو سکتی ہو مثلاً جو یا جواری، باجرہ کی روٹی ہی کیوں نہ ہو، بہر حال اتنے معمولی سرمایہ رکھنے والے کے لئے بھی اسلام نے سوال کو قطعاً حرام کر دیا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس مالی سرمایہ نہ ہو لیکن ہاتھ پائیوں کا سرمایہ اور اتنی قوت رکھتا ہو کہ کما کر کھائے اس کے متعلق بھی ارشاد ہے۔

صدقہ حلال نہیں ہے صاحبِ غنا کے لئے او

نہ مضبوطی تاکڑے کے لئے۔

لا تحل الصدقة لغنی

ولا الذی مرۃ سوی۔

صدقہ میں حق نہ کسی غنی کا ہے اور نہ

کمانے والے توانا آدمی کے لئے

لاحق فیہا الغنی ولا لقوی

حکسب۔

اس میں (صدقہ میں) حصہ ہے۔

بہر حال بجز چند مخصوص صورتوں کے جن کی فقہاء نے تصریح کر دی ہے۔ ملک کے ہر باشندے پر جس میں کسی قسم کی بھی مالی یا بدنی صلاحیت ہو عموماً اسلام سے سوال کو حرام کر دیا ہے اور اس سے یہی غرض ہے کہ اس قسم کی تمام قوتیں ملک کے معاشی ارتقار میں اپنی اپنی وسعت کی حد تک ہاتھ بٹائیں اس زمانہ میں مسلمانوں کو کون کہہ سکتا ہے۔

تندرست و توانا آدمی کو | ان کو شاید معلوم نہیں کہ اسلام میں لینے والوں ہی پر عموماً بھیک حرام نہیں بھیک دینا بھی ناجائز ہے | ہے بلکہ فقہاء کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ مذکورہ بالا صفات یعنی کم از کم مالی یا بدنی صلاحیت رکھنے والوں کو بھیک دینا بھی ناجائز ہے۔ علامہ ابن نجیم حنفی نے ”الاشباہ والنظائر“ میں مذکورہ بالا صورتوں کے متعلق لکھا ہے،

بھیگ مانگنے والے اور بھیک دینے والے

دونوں مجرم ہیں۔

۱۲ ان سائل واطعنی

اشمان۔

سائل اور گداگر کے مجرم ہونے کی وجہ تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن دینے والوں کو مجرم کیوں قرار دیا جاتا ہے اس کی وجہ انہوں نے لکھی ہے،

اس نے ایک جرم میں مجرم کی مدد کی۔

اگرچہ بعض علماء کو اس سے اختلاف ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ

اگر دینے والا یہ جانتا ہو کہ سوال کر رہا

اس کو اپنا پیشہ نہ بنالے گا تو ایسے دینے

والے کو گناہ نہ ہوگا۔ اور اگر یہ جانتا ہو کہ

فلکونہ معینا علی الحرام

لو علم اطعنی ان السائل

لا یتخذہ کسباً فلا اثم

علیہ ولو علم انه یتخذہ

وہ بھیک کو اپنا پیشہ بنائے گا تو دینے والا

بھی گنہگار ہوگا۔

قمار اور اس کی مختلف اکل مال با بطل ہی کی ایک شکل وہ ہے جس میں لاکھوں اور کروڑوں کی دولت صورتوں کی حرمت لوگوں کو اس طرح مل جاتی ہے کہ ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضے میں کچھ نہیں ملتا۔ میری مراد قمار اور اس کی مختلف شکلوں سے ہے جس کا رواج اس وقت تک دنیا کے ان علاقوں میں بھی موجود ہے جو کسی معاشی قوت کو بیکار چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں کرتے۔ آخر جوئے میں جو رقم جیتنے والے کو ملتی ہے اس کے معاوضے میں ہارنے والوں کو نہ سہی کسی اور کو وہ کیا دیتا ہے صرف یہی نہیں کہ یہ اکل مال با بطل ہے بلکہ گویا ہارنے والا اپنی مانی ہوئی شرط کی بنا پر ہارتا ہے اور اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ رضا مندی سے اس نے اپنا مال جیتنے والوں کو دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جوئے میں جتنے غصہ اور غیظ و غضب میں بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہے شاید اتنا غصہ اتنا غیظ تو چوروں اور ڈاکوؤں پر بھی ان لوگوں کو نہیں ہوتا جن کا مال چوری جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو (قمار) کے متعلق جو یہ ارقام فرمایا ہے۔

لأنه اختطاف الاموال الناس
عنهم معتد علی اتباع جہل
وحرص و منية باطله و ركون
غير يتبعه علی هذه الشرط
وليس له دخل فی القمار
والتعاون فان سكت الطغيون
سكت علی غيظ و خيبة و ان
خاصه خاصه فيما التزمه
بنفسه ا قبحه بقصد الغاين
يستلذه و يدعوق ليله في
كثيره و لا يدعه حرصه ان
يقلع عنه و عما قليل يكون
لثرة عليه۔

کیونکہ (جوئے میں) لوگوں کے اموال کو
اس طرح اچکتا ہے کہ اس میں بالکل جہالت
حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں
آدمی گرفتار ہوتا ہے۔ اور دھوکہ پر
سوار ہو کر اس میدان میں کودتا ہے
اور حرص غلط آرزو وغیرہ اس کو ان
شرائط کے مان لینے پر آمادہ کر دیتی ہے
جنہیں نہ شہری زندگی کی تعمیر اور نہ باہمی
امداد میں دخل ہے، ہارنے والا اگر
ہارنے کے بعد خاموش رہتا ہے تو
اس کی یہ خاموشی غصہ اور ایسی ناکامی
و نامرادی کی چگاریوں پر قائم ہوتی ہے جن میں
وہ اپنے قصد و ارادہ سے گھسا تھا۔ یوں ہی
جیتنے والا اپنی جیت سے لذت گیر ہوتا ہے اور اس کا دوبار کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے اور
اس کی حرص و جانت نہیں رہتی کہ اس فعل سے باز آنا بالآخر کچھ ہی دن بعد اس کا تان خود ہی اسکے سر پر مسلط ہو جاتا ہے

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس بد عادت کا رواج ہو جاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ،

۱ فساد للاموال و مناقشات طويلة و
۲ اھمال الاسرافات
۳ المطلوبۃ و اعراض
عن التعاون المبنی
علیہ التمدن -
سے لاپرواہی برتنے لگتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔

فرماتے ہیں۔

۱ المعائنة یغنیك عن
۲ الخبر هل سئلت من اهل
القمار لا ما ذکرناہ -
(حجة اللہ البالغہ ص ۱۰۶)

دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور شاہدہ
اس باب میں تمہیں بے نیاز کر سکتا ہے
آخر جواریوں میں تم نے ان امور کے سوا
جن کام میں نے ذکر کیا۔ کبھی بھی کسی اور

چیز کا مشاہدہ کیا ہے۔

بہر حال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ قمار کے ذریعہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلام نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں ہی کو نہیں بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قمار کی رنگ پایا جاتا تھا ان کو ممنوع قرار دیا۔ عرب میں خرید و فروخت کی بعض صورتیں ایسی تھیں جنہیں موجودہ زمانے کا سٹہ کہہ سکتے ہیں۔ اور تمدن ممالک میں اب تک ان کا رواج ہے۔ اسلام نے ان کو غیر قانونی قرار دیا۔ مثلاً منابذہ (کپڑے کو پھیک دیا جاتا جس پر کسی کا ہاتھ پڑ جاتا وہ اس کا جبری خریدار بن جاتا تھا) ملائسہ (جس کپڑے پر مثلاً ہاتھ پڑ گیا جبراً خریداری اس کی ضروری تھی) ازیں قبیل اور صورتیں بھی تھیں جو اسلامی معاشیات کے باب سے خارج کر دی گئیں۔ مقصود یہی ہے کہ ہر شخص ملک اور ملک کے باشندوں کی کچھ خدمت کر کے کھائے اور کمائے تاکہ ملک کی دولت عامہ کی پیدائش میں ہر شخص اپنی اپنی استطاعت کی حد تک حصہ دار ہو اور یہی وجہ ہے کہ ایسی چیزیں جن کا استعمال مختلف طبی، اخلاقی، اجتماعی اغراض سے اسلام نے اپنے ماننے والوں پر حرام کر دی ہیں، ان چیزوں کی تجارت بھی اس نے ممنوع قرار دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور فرمان ہے۔

۱ ان الله اذا حرم شیئاً
حرم مثمنه -
حرام قرار دیا۔

حق تعالیٰ نے جب کسی چیز کے استعمال
کو حرام قرار دیا تو اس کے دام کو بھی

کیونکہ ایسی چیزوں کے لینے والے جب اس سے نفع ہی نہیں اٹھا سکتے تو ان کا جو مال ان چیزوں کے معاوضہ میں لیا گیا وہ بالباطل ہی لیا گیا اس ذیل میں فقہاء اسلام نے بعض چیزوں کی تجارت ممنوع قرار دی ہے۔ تاہم انہوں نے کوشش کی ہے کہ ہر وہ چیز جس میں نفع کا پہلو کسی راہ سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کے استثناء کی بھی راہ نکالی جائے مثلاً میتہ (مردار) حرام ہے لیکن باوجود اس کے مردہ جانوروں کی کھال دباغت کے بعد بلکہ ان کی ہڈیاں، اون، گھر، سینک، پٹھوں وغیرہ کی تجارت جائز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جمادات و نباتات، حیوانات بلکہ ہر وہ چیز جس میں انتفاع کی کوئی صورت نکل سکتی ہو فقہاء نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی معاشی سہولتوں کے لئے ان کی تجارت کی اجازت دی جائے اور یہی وجہ ہے کہ بجز چند چیزوں کے جن کی حرمت قطعی ہے یا جو نجس العین ہیں یا صراحتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بیع کی ممانعت فرمادی ہے۔ عموماً عام چیزوں کی خرید و فروخت جائز ہے اور تقریباً تجارت لین دین کے وہ تمام طریقے جو دنیا میں مروج ہیں اگر اکل یا باطل اور لا یتلّموز ولا تظلمون کی زد میں نہ آتے ہوں۔ اسلام نے ان کی اجازت دے رکھی ہے۔ مثلاً نقد دے کر ضرورت کی چیزیں خریدنی، چیز دے کر چیز لے لینا یا دام بعد کو دینا جسے نسہ (ادھار) کہتے ہیں۔ یا دام پہلے دینا اور چیز بعد کو لینا جسے سلم کہتے ہیں (بعض خاص شروط جن کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی نہ کسی پر ظلم ہو جاتا تھا) سلم کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔ فقہاء اسلام نے اسلامی اصول کو پیش نظر رکھ کر ہر شکل کے احکام اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں، پھر اس لئے تاکہ خرید و فروخت کرنے والوں کو سوچنے، غور کرنے کا، دیکھنے بھانے کا موقع ملے یا عیب و نقص کی وجہ سے واپسی کا امکان پیدا ہو، تجارت میں خیار کا قانون بھی رکھا گیا ہے۔ الغرض ممکن سے ممکن آسانیاں جو ہو سکتی ہیں سب فراہم کر دی گئی ہیں اور شرآن میں،

۱۔ اصل ۲ اللہ ۲ بلیع۔ تجارت کو خدا نے حلال فرمایا ہے۔

کے ذریعہ سے گویا مذکورہ بالا صورتوں کی حلت کا اعلان کیا گیا ہے۔ مگر دنیا میں لین دین کی ایک خاص شکل جس کا نام ربوایا سود ہے، اور آج تک دنیا کے بڑے بڑے معاشی اس کے متعلق حیران ہیں۔ اس کے جو از و عدم جو ازہ کی بحث تقریباً تاریخ کے نامعلوم زمانے سے چھڑی ہوئی ہے، اسلام نے فیصلہ کر دیا کہ اس کو قطعی طور پر حرام کر دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو اسلام میں کتنی اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اسلام میں یوں تو اخلاقی اجتماعی یا طبی یا کسی اور نقطہ نظر سے جرائم کی ایک

۱۔ البتہ اس کی چوتھی عقلی شق یعنی دام بھی نہ دیے جائیں اور چیز بھی نہ خریدی جائے دونوں کی دونوں ادھار ہوں عربی میں اس کو بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں۔ یہ بیع کی ناجائز صورت ہے کہ دونوں کے نامعلوم و مبہول ہونے سے ادائیگی کے وقت بے شمار جھگڑوں کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ صحیح حدیثوں میں اس بیع کو ناجائز قرار دیا گیا ہے ۱۲

۲۔ خیال یعنی اختیار مطلب یہ کہ خریدار کو بھی اور بیچنے والوں کو بھی چند خاص شروط کے ساتھ اس کا اختیار ہے کہ معاملہ کریں یا نہ کریں ۱۲

تفصیلی فہرست پائی جاتی ہے۔ لیکن زندگی کے معاشی پہلو کی اہمیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ صرف ایک اسی معاشی جرم پر قرآن نے بجائے کسی ایک سزا کے چار چار سزاؤں کی دھکیاں دی ہیں۔ یعنی سود خوار اسید زدہ مجنون کی شکل میں کھڑا ہوگا۔ اس کی دولت کا وہ حصہ جو سود کے ذریعہ سے حاصل ہوگا محق اور بر باد کر دیا جائے گا۔ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اور آخر میں یہ کہ سود خوار کو حکم دیا گیا کہ یا وہ اس معاشی جرم سے باز آئے ورنہ اللہ اور اس کے رسول کو اعلان جنگ دیدے۔ یہ بات کہ اسلام نے تجارت کے اس طریقہ کو کیوں جرم قرار دیا ہے۔ اس کی توجیہ آسان نہیں ہے بلکہ سچی بات یہی ہے کہ اگر سود کی خرابیاں اتنی واضح اور جلی ہوئیں تو قرآن میں غالباً اس کا ذکر بھی نہ ہوتا یا ہوتا تو جیسے اور جرائم مثلاً چوری، ڈاکہ، فریب، جھوٹ وغیرہ کا ذکر ہے اس کا بھی اسی نوعیت سے تذکرہ کیا جاتا۔ لیکن اتنی اہمیت جو اس کو دی گئی ہے اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ عوام کیا بلکہ انسانوں کے خاص عقول کی بھی رسائی اس کے دور رس نازک خطرناک نتائج تک نہیں ہو سکتی۔ ہزار ہا ہزار سال سے عقلی معاشیات والے سود کے افادہ و اضرار پر بحث کر رہے ہیں لیکن آج تک کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ اسی لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ میں انسان کو عقل سے بھی کسی بالاتر ذریعہ سے اس کے متعلق آخری فیصلہ واضح لفظوں میں سنا دیا جاتا اور یہی قرآن نے کیا۔

حرمت سود کی وجہ | تاہم اگر اکل بابا ظل اور لا تظلمون ولا تظلمون قرآن کے ان دونوں معاشی بنیادوں کو ہم سامنے رکھ لیں تو شاید کچھ اس مسئلہ کے خطرناک پہلوؤں تک ایک حد تک پہنچ سکتے ہیں مثال سے اس کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ دینا کے سارے کاروبار لین دین میں معاملہ کے فریقین میں ہر ایک دوسرے کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی کرتا ہے مثلاً تاجر کپڑے دیتا ہے۔ خریدار روپیہ ادا کرتا ہے کرایہ کی شکلوں میں مثلاً موٹر کے مالک کو اگر کرایہ کار روپیہ ملتا ہے تو جس وقت تک کرایہ دار اس کی موٹر کو استعمال کرتا رہتا ہے۔ موٹر کے تمام کل پرزے اپنے صفات کارکردگی کو بتدریج کھوتے رہتے ہیں۔ یہ سال بھر کے بعد مکان کو جب کرایہ دار واپس کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ مکان اور اس کے تمام عناصر و اجزاء اپنی اس حیثیت پر باقی نہیں رہتے جو کرایہ دینے کے وقت ان کی تھی۔ الغرض کرایہ کی شکلوں میں بھی اگرچہ اصل چیز یعنی موٹر، مکان وغیرہ مالک کو واپس ہو جاتی ہے۔ لیکن صفات کی قربانی ان میں بھی ضرور ہو جاتی ہے۔

۱۵ زراعت کا مطالعہ جنھوں نے سائنس اور کیمیا کی معلومات کی روشنی میں نہیں کیا ہے۔ ان کو زمین کے متعلق بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر کوئی کھیتی کرنے کے لئے کرایہ پر کسی کی زمین لے اور چند سال اس میں کاشت کرنے کے بعد اسے واپس کر دے تو جس حال میں اس نے زمین لی تھی اسی حال میں واپس کر رہا ہے، حالانکہ یہ واقعات سے جھل کا نتیجہ ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک دفعہ بھی جس زمین سے پیداوار حاصل کی جاتی ہے تو اس کے بہت سے کیمیاوی مفید اجزاء ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے سائنسنگ کاشت کاری میں ہر سال کھاد وغیرہ کا دینا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے جاہل کسان اس راز سے ناواقف ہونے کی وجہ سے (بقیہ صفحہ آئندہ)

اس کے مقابلہ میں جس نے بجائے موٹر کے آپ سے دو ہزار روپے قرض لئے اور دس سال بعد واپس کے تو لینے کے وقت آپ اپنے روپوں کو اسی طرح ٹھوک بجا کر لیں گے جس طرح آج سے دس سال پہلے دیے گئے تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس عرصہ میں روپے کے صفات پر کھنگلی اور فرسودگی طاری ہو گئی اور اس کی وجہ روپیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر روپیہ دوسرے روپیہ کی کامل طور سے قائم مقامی کرتا ہے جس کے معنی یہی ہوئے کہ قرض دینے والے کی طرف سے نہ اصل مال کی قربانی ہوتی ہے اور نہ مال کے صفات کی اب اگر دس سال تک جو روپیہ آپ کا مقروض کے پاس رہا اس کے معاوضہ میں آپ ہر مہینے اس کا کرایہ اگر وصول کریں گے تو سوال یہی ہے کہ آپ کی طرف سے کیا قربانی ہوئی، نہ روپیہ کے ذات کی نہ صفات کی، خلاصہ یہ ہے کہ قرض دینے والے کا پوزیشن بغیر کسی قربانی کے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ بخلاف لینے والے کے کہ اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا اور اس میں خرچ کر دیا تو روپیہ اور اس کا سود یا کرایہ اس طور پر دے رہا ہے کہ اس نے اس روپے سے کچھ آمدنی نہیں پیدا کی۔ اور اگر تجارت وغیرہ کے لئے لیا تو تجارت کی کامیابی ہر حال میں ضروری نہیں۔ لیکن قرض دینے والے کا روپیہ بھی اپنی ذات و صفات کے ساتھ محفوظ اور اس کی دن دوئی آمدنی بھی۔ ایسا شخص جو اپنے کاروبار میں کبھی نفع اٹھاتا ہو اور کبھی نقصان کیا اس شخص کا مقابلہ کر سکتا ہے جس پر نقصان کے تمام دروازے بند ہیں اور صرف نفع اور کیا نفع؟ اضعا فامضاعفہ (دو گئے چو گئے) کے حساب سے منافع کے دروازے جس پر کھلے ہوئے ہیں، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ جو کبھی بیمار نہیں ہوتا اس کی صحت کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا ہے جو کبھی اچھا اور کبھی بیمار ہوتا ہے۔ پس چند دنوں میں تو شاید نہیں لیکن اگر کسی ملک یا قوم میں ذرا زیادہ مدت تک اس قسم کی یک طرفہ گردش دولت کی جب کبھی ہوئی ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ ملک کا ایک قلیل گروہ یعنی ایسے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

آج جاپان اور یورپ و امریکہ کے کسانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مسٹر مسانی کی کتاب ”ہمارا ہندوستان“ ایک بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ اردو میں بھی عصمت اللہ بیگ صاحب نے اس کو منتقل کر دیا ہے، اسی کتاب میں ”زمین کے کھار“ کے عنوان سے جو باب لکھا گیا ہے، وہ پڑھنے کے قابل ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ کھار جو ہماری زمین میں پائے جاتے ہیں جب زمین کسی خاص حصہ میں یہ خاص کھار (نائٹروجن، پوٹاشیم، فاسفورس، لائم) کافی مقدار اور صحیح تناسب میں پائے جاتے ہیں، وہاں پیداوار خوب تیزی سے ہوتی اور وہ زمین زرخیز کہلاتی ہے، مگر جہاں ان میں سے چند یا سرے سے تمام کھار غائب ہوں تو ایسی زمین کو بخر کہتے ہیں۔ آگے اسی میں ہے کہ دوسری تمام اچھی چیزوں کی طرح زمین میں بھی قدرتی کھاد کا ذخیرہ کم و بیش محدود ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ کھار خاصی مقدار میں ہوتے ہیں اور گوان کی کمی قدرتی طور پر تھوڑی پوری ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب کاشت ہونے لگے تو وہ برابر کم ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایک زمین میں معمولی فصل پر تقریباً بیس پونڈ نائٹروجن سال بھر میں خرچ ہوتی ہے۔ اور یہ ایک کھار نائٹروجن کا حساب ایک ایک کے لحاظ سے ہے، اس پر اب دوسرے کھاروں کو قیاس کر لیجئے۔ اسی کتاب میں ہے جتنی زیادہ مقدار میں یہ کھار پودوں اور انج کا خرب کر نکلتا رہتا ہے اتنی ہی مقدار میں زمین کے اندر اس کی کمی ہوتی جاتی ہے۔ (ہمارا ہندوستان)

لوگ جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ رہی ہو اور ان کے پاس قدر حاجت سے بچ کر پس انداز بھی ہوتا ہو جو عموماً ہر ملک و قوم میں تھوڑے ہوتے ہیں۔ جب یہ اپنے روپیہ کو سود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تو ان کے یہی روپے ملک کے اکثر افراد کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر آہستہ آہستہ ان کی دولت کو کھینچ کھینچ کر قرض دینے والوں کی جیبوں میں پہنچا دیتے ہیں اور صدی ڈیڑھ صدی کے بعد یہ تماشا نظر آتا ہے کہ قوم کے اکثر افراد بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہیں اور معدودے چند گھرانوں یا شخصوں کے پاس دولت کا ورم پیدا ہو گیا ہے۔ پھر بات اسی حد پر آ کر رک نہیں جاتی۔ ان دولت مندوں کے پاس اگر دولت اور سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے تنگ آکر ان سود خواروں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا وحشیانہ حملہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہوتا ہے جو کچھ ہوتا ہے سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں، امن و امان غارت ہو جاتا ہے۔ غربا بھوکے غضبناک بیٹریوں کی طرح دولت مندوں کو چیر بھاڑ دیتے ہیں۔ تاریخ ان نتائج کو آج یورپ میں دہرا رہی ہے یا دہرانے والی ہے۔ اور یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہے یہی کہ معاشی کاروبار میں اکل بالباطل (یعنی بغیر کچھ دیئے ہوئے دوسرے کے مال سے استفادہ) اور لا تظلمون ولا تظلمون کے قانون کی پابندی سے بے اعتنائی برتی گئی۔ حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں،

فیروبو المال علی المحتاج	محتاج (مقروض) پر مالی بار زیادتی کے
من غیر نفع یحصل له	ساتھ بڑھ جاتا ہے اور اس طور پر بڑھتا
و یزید من غیر نفع	ہے کہ خود اس مال کا نفع اسے نہیں ملتا
یحصل منه لا خیر فیہ	اور (قرض دینے والے) سود خوار کے
مال لا خیر بالباطل -	مال میں اضافہ اس طور پر ہوتا ہے کہ
(ص ۲۰۰)	اس سے اس کے بھائی (مقروض) کو

کچھ نفع نہیں پہنچا یہی وجہ ہے کہ (سود) میں آدمی اپنے بھائی کا مال بغیر کسی وجہ کے باطل طور پر کھاتا ہے۔

آخر سود خوار کو جب اس کا روپیہ اپنے تمام ذاتی و صفاتی کمالات کے ساتھ بجنسہ واپس ہو جاتا ہے تو بغیر کسی قربانی کے وہ غریب قرضخواہوں سے سود کا روپیہ کس بنیاد پر لے رہا ہے۔ ”تمہارے روپے کیا بچے دیتے ہیں۔“ اس سوال کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے، جس ملک میں اس قسم کے لین دین کی جب کبھی قانونی اجازت دی جائے گی اور اس کے دائرے میں وسعت پیدا ہوگی تو آمدنی کے پس انداز کرنے والوں کا قلیل گروہ اگرچہ اپنے آپ کو یا اپنے خاندان کو مالی فائدہ پہنچاتا ہے لیکن وہی ملک کے اکثر افراد کو شدید معاشی ضرر پہنچا رہا ہے۔ اس قسم کے کاروبار ان ہی ممالک میں فروغ پا سکتے ہیں جن کے باشندے اپنے آپ کو صرف اپنے لئے یا اپنے خاندان ہی کے لئے سمجھتے ہوں اور اپنے ملک یا شہر یا گاؤں کے دوسرے افراد سے اس میں کچھ بحث نہ ہو، آخر یہ سارا روپیہ جوان کی پس انداز

زائد از ضرورت رقم نے بہ شکل سوداں کے گھر پہنچائی ہے وہ عموماً اسی ملک، اسی شہر، اسی گاؤں اسی محلہ کے باشندوں کی جیبوں ہی سے تو وصول ہوتی ہے جن میں وہ رہتے بہتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یورپ آج قومیت اور (نیشن نیٹی) کے دعوے کا اپنے آپ کو ساری دنیا میں علم بردار کہتا ہے اس نے صرف یہی نہیں کیا ہے کہ چند سا ہو کاروں اور پیشہ ور سود خواروں ہی کو اس کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے بلکہ بینکنگ سسٹم کو جاری کر کے اس نے موقع فراہم کر دیا ہے اس بات کا کہ جن پس انداز کرنے والوں کو سود خواری کی فرصت نہ تھی۔ وہ بھی اب باسانی سود خواروں کی کمیٹی میں شریک ہو کر ملک کی اکثریت کا معاشی خون چوسنے میں مشغول ہیں اور اس لئے مغربی سود خواری نے اپنے رد عمل کو دنیا پر بہت جلد ظاہر کیا۔ یہ ایک حیثیت سے اچھا ہوا، ہلکے بخار سے تیز بخار کا ابھر کر آجانا مریض کو چونکانے کے لئے زیادہ مفید ہے۔ آج یورپ اشتراکی حیوانوں بلکہ شیطانوں کے تھپڑوں سے مغبوط ہو رہا ہے۔ سودی کاروبار کو اختیار کر کے اس نے قدرت کو جنگ کا اعلان دیا۔ چیلنج قبول کیا گیا اسی سود کے بل بوتے پر وہ جنگ لڑی جا رہی ہے جس کی نظیر دنیا کی آنکھوں نے پہلے دیکھی تھی اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ دیکھے گی۔ ماہرین کا بیان ہے کہ سود پر باسانی حکومتوں کو روپیہ قرض اگر نہ ملتا تو یومیہ کر ڈھا کر وڑ دینے کی رقم موجودہ جنگوں میں جو صرف ہو رہی ہے۔ اتنی رقم کی فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا۔ گویا آج سود ہی اعلان جنگ اور اس ہولناک جنگ کا ذریعہ بنا ہوا ہے جس کی نظیر انسانیت کی تاریخ میں مفقود ہے اور پھر اسی جنگ کے ذریعہ سے انسانوں کی کھائی ہوئی آمدنی دھواں بن بن کر کچھ فضائی ہواؤں میں اور کچھ جہاز، تار پٹو، اور خدا جانے کیا کیا بن بن کر سمندر کے پانیوں میں محق و فرسودہ ہو ہو کر برباد ہو رہی ہے آئندہ زندگی میں تو جو کچھ ہوگا وہ تو اسی وقت دیکھا جائے گا۔ لیکن شہر کے جن ڈاکٹروں و کیلوں تاجروں اور ہر پیشہ ور نے سود خواری کی انجمن (بنک) میں شرکت کی تھی۔ میدان جنگ بلکہ اپنے اپنے محل سراؤں اور کوٹھیوں میں، بنگلوں میں برستی ہوئی آگ اور دھکتے ہوئے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں نہ گھر کے اندر چین ہے اور نہ گھر کے باہر جائے پناہ، خدا سے جنگ کرنے کے بعد لوگ پناہ کہاں ڈھونڈ رہے ہیں، سود خوار کو جن جن عذابوں کی قرآن نے دھکی دی تھی، جن کی آنکھیں ہیں وہ دیکھیں اور جن کے کان ہیں وہ سنیں اور جن کے دل ہیں وہ بچپتا ہیں، ان کو کہا گیا تھا کہ نہ دوسروں پر ظلم کرو اور نہ اپنے اوپر ظلم کرو۔ لیکن انھوں نے دوسروں پر بھی ظلم کیا اور اپنے اوپر بھی ظلم کیا و ما ظلمنا ہم و لکن کانوا ۲۱ نفسہم یظلمون۔

اور یہ تو ربوا کی عام صورت تھی جس کے خطرناک نتائج پر اسلام سے پہلے بھی مختلف مذاہب میں تنبیہ کی گئی تھی، بلکہ بعض عقلی معاشیوں نے بھی اس معاملہ کی شدت سے مخالفت کی تھی لیکن اسلام نے صرف ربوا کی مروجہ شکل ہی کو اکبر الکبائر اور بدترین جرائم میں شریک نہیں کیا بلکہ اگر کوئی شخص کسی کو دس روپے دے کر کچھ دن کے بعد اس معاوضہ میں بیس روپے لے لے اور بجائے اس کے کہ اس کو سودی قرض کا معاملہ قرار دیتا یوں کہے کہ میں نے اس دس روپے سے تمہارے بیس روپے خریدے ہیں یا کسی تاجر نے دس روپے کے پیڑے ایک ماہ کے لئے کسی کے ہاتھ اس شرط سے ادھار بیچے کر ایک

ماہ کے بعد دام ادا نہ کر سکا تو تا جبر اس سے یوں کہے کہ میں ایک ماہ کی مہلت اس شرط سے دیتا ہوں کہ تم بجائے دس کے بارہ ادا کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام شکلوں میں صرف لفظوں کا ہیرو پھیر ہے۔ ورنہ حاصل وہی ہے جو سودی قرض کا حاصل ہے۔ اس لئے اسلام نے قرض کے سودی کاروبار کے ساتھ بیع اور خرید و فروخت کی ان شکلوں کو بھی سود اور ربوا قرار دیا۔ نیز جو حالت روپے کی ہے بجنسہ ہی کیفیت اور بھی چند چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً اگر ایک من گہوں قرض دے کر دو مہینے بعد کوئی شخص بجائے ایک من کے مزید ایک من گہوں کا اضافہ کر کے دو من لیتا ہے تو اس میں اور اس شخص میں جس نے دس روپے دے کر دو مہینے بعد بیس روپے لئے کیا فرق ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمیق معاشی نگاہ اس دقیق نکتہ تک پہنچی اور اسی بنا پر آپؐ نے اعلان فرما دیا کہ سود یا ربوا صرف روپے کے لین دین ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ربوا کے ذیل میں اور بھی چند چیزیں شریک ہیں اور ٹھیک جیسا کہ میں نے قمار میں عرض کیا تھا کہ جن جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قمار کی رنگ پایا جاتا تھا، اسلام نے قمار کی جڑ کاٹنے کے لئے ان کی بھی ممانعت کر دی، اسی طرح ربوا کی مندرجہ بالا شکلوں کے سوا جن میں دینے کے کچھ دن بعد بطور کرایہ کے زیادتی وصول کی جاتی ہے، جسے اصطلاحاً ربوا النسہ (ادھار کے معاملہ کا سود) کہتے ہیں اسلام نے ان صورتوں کو بھی جن میں ادھار نہیں بلکہ نقد مثلاً ایک تولہ چاندی لے کر کوئی دو تولہ چاندی یا نقد ایک من گہوں دے کر اس کے معاوضہ میں دو من گہوں دے اس کو بھی ناجائز ٹھہرا دیا اور مشہور صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربوا کی ان تمام چھوٹی بڑی واضح وغیرہ شکلوں کی ممانعت فرمادی یعنی

الذہب بالذہب والفضة	سونے کا معاملہ سونے سے، چاندی کا
بالفضة والبر بالبر والشعیر	چاندی سے، گہوں کا گہوں سے، جو کا
بالشعیر والتمر بالتمر والطحلح	جو سے، کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے
بالمالح مثلاً بمثل ید ابید	(ہمیشہ) برابر برابر اور اس ہاتھ لے
فمن نزل دو استرا د فقد	اس ہاتھ دے (یعنی نقداً) ہونا چاہیے
اربی الاخذ والطحطی فیہ	پھر جو بڑھائے یا بڑھوائے، اس
سوۂ (صحاح ستہ)	نے سود (ربوا) کا معاملہ کیا لینے والا

اور دینے والا دونوں اس میں برابر ہیں۔

حدیث میں تو صرف یہی چیزیں اموال ربویہ یعنی ایسے اموال قرار دیئے گئے ہیں جن کا باہمی تبادلہ زیادتی کے ساتھ نہ ادھار جائز ہے نہ نقد خواہ یہ تبادلہ قرض کے الفاظ سے ہو یا بیع کے لفظ کے ساتھ ہو، بظاہر ربوا کے تحت میں ان شکلوں کو اسلام نے غالباً پہلی دفعہ داخل کیا ہے ورنہ اس سے پہلے عموماً سود اور ربوا روپیہ اور اثرفی یعنی سکہ کے سودی کاروبار ہی تک مشابہ محدود تھا، پھر بعد کو فقہاء اسلام نے اس حدیث پر غور کیا تو جو خصوصیات ان چھ چیزوں کی تھیں اور دوسری چیزوں میں بھی انہیں محسوس ہوئیں اسی لئے

انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان کو ایک توضیحی بیان قرار دیتے ہوئے ان چیزوں کو بھی اموال ربویہ یا ربانی مالوں میں شریک کر دیا جن میں ان کی نگاہ میں وہی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں، امام شافعیؒ اور قریب قریب امام مالکؒ نے سونا اور چاندی کو دیکھ کر خیال کیا کہ مراد اس سے ہر وہ چیز ہے جو لین دین میں قیمت کا کام دیتی ہے۔ اب خواہ وہ سونا چاندی ہو یا اس کے سوا کوئی اور چیز ہو، اسی طرح گہو، اور جو، مک، کھجور کو دیکھ کر ان بزرگوں نے خیال فرمایا کہ مراد ہر وہ چیز ہے جو کھانے پینے میں کام آتی ہو یا جن سے خورد و نوش کی چیزوں کی اصلاح کی جاتی ہو جیسے مک۔ لیکن ربانی اموال کی یہ خصوصیت کہ اس کا ہر فرد دوسرے فرد کا قائم مقام ہوتا ہے اور ان کی یہی خصوصیت ان نتائج کی ذمہ دار ہے جو سودی کاروبار میں پیش آتے ہیں۔ اس نکتہ پر نظر فرما امام ابو حنیفہؒ کی پہنچ۔ انہوں نے خیال کیا کہ یہ خصوصیت کن کن چیزوں میں پائی جاسکتی ہے، چونکہ ہر وہ چیز جس کی خرید و فروخت کیل (پیمانہ) یا وزن (تول) کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی تھی اس لئے امامؒ نے بجائے ان خاص چیزوں کے ہر اس چیز کو جو کیل (پیمانہ) یا وزن (تول) کے ذریعہ سے بکتی ہو۔ اموال ربوی قرار دیا اور ان کے باہمی تبادلہ میں ربوا (زیادتی) کو انہوں نے ناجائز ٹھہرایا ان اجتہادی دقیقہ سنجیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی ربوا جو اب تک دنیا میں صرف روپے کے قرض کے کاروبار کی ایک شکل تھی اب ہمسرا رہا چیزوں تک پھیل گیا۔ خصوصاً حنفی مذہب جو اسلام کے تشریحی مکاتب خیال میں سب سے زیادہ محتاط اسکول ہے اس میں تو سود کی اتنی گونا گوں شکلیں پیدا ہو گئیں کہ اب ان کا سمیٹنا دشوار ہو گیا ہے فقہاء نے تفصیلات میں دفتر کے دفتر تیار کر دیئے ہیں لیکن اصلی بحث کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے جو عرض کیا گیا۔ عموماً فقہ کی کتابوں میں سود کے مباحث کو دیکھ دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ عوام جسے سود کہتے ہیں اس کا تو اس میں گویا ذکر ہی نہیں ہے حتیٰ کہ اسی بنا پر عوام ہی کو نہیں بلکہ بعض اچھے اچھے پڑھے لکھوں تک کو پچھلے دنوں یہ معاملہ ہو گیا کہ اسلام نے جس سود کو حرام کیا ہے وہ قرض الا موجودہ سود نہیں ہے بلکہ بیع اور خرید و فروخت کی چند نادر شکلیں تھیں جو ایام جاہلیت میں مروج تھیں اور ان ہی کا ذکر فقہ کی کتابوں میں کیا گیا۔ مگر ظاہر ہے کہ اسلام نے اس سود کو اگر منع نہیں کیا تو پھر اس نے منع کس چیز کو کیا۔ آخر پر اس نے مذاہب بدعت، عیسائیت حتیٰ کہ ہندومت تک میں جس سود کو حرام یا گواہ کھانے کے برابر قرار دیا گیا ہے یا ارسطو نے جس سود کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ تمہارے روپے بچے نہیں دیتے یہ قرض والا سود نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس "معاشی سرطان" کی تشخیص ارسطو تک کی عقل نے کر لی تھی اسی کے متعلق کہا جائے کہ اسلام کی نگاہ معاشیات کے اس زیرِ پلے گھاؤ پر نہ پڑی اور پڑی بھی تو کس چیز پر جس کا نہ اب دنیا میں رواج ہے اور نہ کسی کو ان کا تجربہ ہے خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی بھلا ایسے لوگوں سے کون بحث کر سکتا ہے جو قرآن کے خنزیر کو عرب کا کوئی چوہا اور قرآن کے خمر کو عرب کے کسی درخت کا خاص رس قرار دے کر واقعی جو خنزیر و خمر ہے اس کی حلت کا فتویٰ دیدیں۔

بہر حال فقہائے اسلام کی ان احتیاطی موثکافیوں کی وجہ سے ایک وقت اور یہ پیدا ہوئی کہ ربوا کے بعض مسائل جن کا ذکر وہ اپنی کتابوں میں کرتے ہیں، بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں مثلاً اس مسئلہ کی بنا پر کہ سونے کا سونے سے چاندی کا چاندی سے تبادلہ کسی شکل میں ہو جائے یا ردی، زیور کی شکل میں ہو یا سنگہ کی، بہر حال جب ان کا تبادلہ کیا جائے تو دونوں کو وزن برابر ہونا چاہیے۔ سوال ہوتا ہے کہ چاندی کے کسی زیور یا برتن کو کوئی ایک ہی تولہ چاندی کے معاوضہ کیوں دینے لگا گویا زرگر کی کاریگری اور برتن بنانے کی محنت کی اسلام میں کوئی قیمت نہیں اسی طرح سوال ہوتا ہے کہ سونے چاندی کے تبادلہ میں یہ قید لگا دی گئی ہے کہ لینے اور دینے والے کے ہاتھ میں دونوں بہ یک وقت آئیں ورنہ خالی ہاتھ والے کے مقابلہ میں بھرے ہاتھ والا گویا ایک قسم کی زیادتی یا ربوا کا مستحق ہو رہا ہے خواہ یہ زیادتی غیر محسوس اور غیر مادی ہی کیوں نہ ہو، اس قسم کی بعض اور حیرت انگیز صورتیں بھی فقہ میں پیدا ہو گئی ہیں۔ پہلے مسئلہ کے متعلق تو حنفی فقہاء بیچارے یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ واقعہ تو یہی ہے کہ ایک تولہ چاندی کا زیور ایک ہی تولہ چاندی کے معاوضہ میں کوئی نہ دے گا۔ لیکن ہم کیا کریں مذہب کا حکم یہی ہے، پس حکم کی تعمیل کرنے والے کو چاہئے کہ ایسی صورتوں میں چاندی کے زیور کو سونے کے سکوں سے اور سونے کے زیورات کو چاندی کے سکوں سے خریدے۔ لیکن حنبلی فقہاء نے ایک صورت یہ نکالی کہ زیور بیچنے والے سے خریداریوں کہے کہ تمہارے زیور کی چاندی جو ایک تولہ ہے اس کے معاوضہ میں تو میں یہ ایک تولہ کا سنگہ دیتا ہوں باقی زیور کی گھڑائی کی اجرت مثلاً ایک روپیہ یہ الگ دیتا ہوں وہ کہتے ہیں کہ اگر معاملہ یوں کیا جائے تو درست ہو جائے گا۔

مقدس لکھتے ہیں۔

اگر سُنار سے (زیور کا خریدار) یوں کہے کہ
میرے لئے ایک انگوٹھی بنا دو جس کا وزن
ایک درہم کے مساوی ہو، اور میں تمہیں
اس چاندی کے معاوضہ میں اس قدر
چاندی دیتا ہوں (یعنی ایک درہم دیتا
ہوں) اور تمہاری مزدوری ایک دام
الگ ہوئی تو یہ ایک درہم کو دو درہم سے
بیچنا نہ قرار پائے گا۔ ہمارے بزرگوں
(فقہاء و خبالہ) فرماتے ہیں کہ سُنار کے لئے

۱۲ قال الصایغ صغ لی
خاتم ورنہ درہم
و۲ عطیک مثل ورنہ و
۳ جر تک درہم فلیس هذا
بیع درہم بد درہمین
قال ۲ صحابنا للصایغ اخذ
۲ درہمین ۲ احد ہما فمقابلہ
الخاتم و الثانی ۲ جرۃ لہ
(۱۳۰۔ المغنی ج ۴)

ان دو درہموں کا لینا جائز ہوگا۔ جن میں ایک درہم تو انگوٹھی کے مقابلہ میں ہوگا
اور دوسرا درہم سُنار کی مزدوری ہوگی۔

لیکن سچی بات ہے کہ ربوہ کے باب میں اس قسم کے بعض مسائل کا جو ذکر کر دیا جاتا ہے جن میں بظاہر عملی دشواریاں نظر آتی ہیں ان کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اسلام چونکہ قطعی طور پر ربوہ کی بنیاد انسانی معاشیات سے اکھاڑ کر نکال دینا چاہتا ہے اس لئے جہاں کہیں اس کی باریک گ اور ریشے نظر آتے ہیں انہیں بھی فوراً نوچ کر پھیک دیتا ہے اور ایک ایسے خطرناک مہلک معاشی جراثیم کے نکالنے کے لئے مسلمانوں کو اگر کچھ عملی دشواریاں پیش آجاتی ہیں تو چاہیے کہ اپنے نقطہ نظر کے استحکام کے لئے اسے بخوشی برداشت کر لیا جائے۔ کچھ مذہب ہی کے راہ میں نہیں بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی اپنے آئیڈیل کی حفاظت کے لئے لوگ اس سے بھی زیادہ دشواریاں خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔

ماسوا اس کے ایک قصہ اور بھی ہے کہ اس قسم کے مسائل کا تعلق اگر ایک طرف ربوہ سے ہے تو اسی کے ساتھ اسلام کے بعض دوسرے اصول بھی ان پر اثر انداز ہوتے ہیں، چونکہ ان مسائل کا عموماً ذکر ربوہ ہی کے باب میں کیا جاتا ہے۔ اس لئے لوگ صرف اسی نقطہ نظر سے ان کو دیکھتے ہیں لیکن اگر ان کے سامنے ان مؤثرات کو بھی واضح کر دیا جائے تو شاید دشواری جتنی محسوس کی جاتی ہے وہ باقی نہ رہے۔

مثلاً یہی سوئے چاندی کے ظروف اور زیورات وغیرہ کے خرید و فروخت کا مسئلہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مساوات اور تقابض (یعنی دست بدست) لینے کی دونوں قیدوں نے ان کی خرید و فروخت میں ضرور دشواری پیدا کر دی ہے۔ لیکن یہ دشواری اس میں کیوں پیدا کی گئی کیا صرف ربوہ سے بچنے کیلئے؟ بظاہر یہی خیال کیا جاتا ہے لیکن کاش اسی کے ساتھ لوگوں کو اسلام کے اس نقطہ نظر کا بھی علم ہوتا جو سوئے چاندی کے ظروف اور زیورات کے متعلق وہ رکھتا ہے دنیا نے پہلے سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو، لیکن اب تو یہ مسئلہ تقریباً بد اہت کے درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ سونا اور چاندی جو بنی آدم کا ایک بین الاقوامی پیمانہ قیمت ہے ان کو مالی مبادلات کا واسطہ بنانے کی جگہ مقصود بالذات بنا کر زیوروں اور برتنوں کی شکل میں مقید کر دینا ملک کی معاشی ارتقاء میں بدترین سنگ راہ کو حائل کرنا ہے۔ ایک ہندوستانی معاشی اپنے مفلس ملک کا لوحہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

”ہندوستان کی قدامت پسندی اور جہالت بھی اس ملک کی غربت کی بہت کافی حد تک ذمہ دار ہے۔ ہندوستان میں جس قدر بھی دولت موجود ہے اس ملک کے باشندے اس کا صحیح استعمال نہیں جانتے ان کی دولت یا تو زیورات کی شکل میں ان کی عورتوں کے گلے کا ہار بن گئی ہے یا دھینوں کی صورت میں زمین کے نیچے پڑی ہوئی ہے۔“

پھر اس غریب ملک میں ”زیور“ اور ”ظروف“ نے معاشی آب حیات کے اس بحر رواں کو جس مقدار میں منجمد کر کے بیکار کر دیا ہے اس کی رپورٹ دیتے ہیں۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۴۸ روپے فی کس اس وقت ہندوستان میں بالکل بیکار موجود ہیں۔

جس ملک میں فی کس تین پیسے بھی آمدنی کا اوسط مشکل سے ہے اس ملک پر اس معاشی فالج کا کیسا سخت اور شدید ترین حملہ ہے کہ فی کس ۴۸ روپے زیوروں اور برتنوں یا دفتینوں کی شکل میں اس طرح قید ہوا کہ اس طرف تماشائیں لب تشنہ بہ آب اندر کا تماشا پیش کر رہے ہیں وہی بیچارہ معاشی لکھتا ہے۔

”ہمارے ملک والوں کو ابھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ دولت کا صحیح مصرف اسے کاروبار میں لگانا ہے۔ انھیں خبر ہی نہیں کہ دوسرے ملک ہم سے کس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کیونکہ وہ اپنا ایک پیسہ تک بیکار رکھنا گناہ سمجھتے ہیں، ان کے پاس جو رقم بھی ضروریات پوری ہونے کے بعد بچتی ہے اسے سرمایہ کی صورت میں اپنے کاروبار میں لگا دیتے ہیں اس کے برعکس ہمارے بھائیوں کے پاس جب کبھی ایک آدھ پیسہ بچ جاتا ہے تو اس کا زیور بنوا کر اپنی عورتوں اور بچوں کو اس میں جکڑ دیتے ہیں۔“

گویا سونے چاندی کو زیورات یا برتنوں وغیرہ کی شکل میں مقید کرنا ملک کی دولت کو بیکار کرنا ہے اور معاشی مذہب میں ایک پیسہ تک کو بیکار رکھنا گناہ ہے۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ سونے چاندی کی ایک رتی کا بھی زیور یا ظروف وغیرہ کی شکل میں رکھنا معاشی نقطہ نظر سے ملک اور قوم کا جرم ہے۔ لیکن دنیا کے معاشیوں کو تو شاید اس کا علم اب ہوا ہے۔ مگر دینی معاشیات کے پیغمبر عظیم صلی اللہ علیہ وسلم آج سے ساڑھے تیرہ صدی پہلے یہ اعلان فرما چکے تھے۔

لا تشربوا فی ائینۃ الذہب
والفضۃ ولا تاكلوا فی صحافہا
(صحاح ستہ)

سونے چاندی کے برتنوں میں نہ
پانی پیا کرو، اور نہ ان کے بادیوں
میں کھانا کھایا کرو۔

صرف ممانعت ہی پر کفایت نہیں فرمائی گئی بلکہ ملک کے اس معاشی مجرم کے متعلق یہاں تک ارشاد ہوا
الذی یا کل ویشرب فی ائینۃ
الفضۃ انه یجر فی بطنہ
نار جہنم۔ (بخاری)

چاندی کے برتن میں جو کھاتا پیتا ہے
جہنم کی آگ میں اس کے پیٹ میں
وہ کھولے گا۔

اور اس لئے بالاتفاق تمام فقہاء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ سونے چاندی کے برتن کا استعمال ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے حرام ہے اور جو حکم ظروف کا ہے مردوں کی حد تک قریب قریب یہی حکم زیورات کا بھی ہے۔ یعنی بجز خاتم (انگوٹھی) کے کہ اس کے متعلق فقہاء کا کچھ اختلاف ہے۔ ہر قسم کے زیور سونے کے ہوں یا چاندی کے مردوں پر حرام ہیں اور گویا عورتوں کے خاص جذبات کے

محافظ سے ان کو ایک گونہ اجازت دی گئی ہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس باب میں جو ارشادات ہیں اور مختلف اوقات میں آپ نے عورتوں کے زیور کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس سے منشاء مبارک یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی ملک کے اس سرمایہ کو اپنے گلے کا طوق ہاتھوں کی بیڑیاں نہ بنائیں تو بہتر تھا۔

یالیت امتی لم تحل الذھب کاش! میری امت ہی (مرد ہو یا عورت)

(مسند احمد) سونے کا زیور نہ پہنتی۔

یہ آپ کی مشہور حدیث ہے جس میں مردوں ہی کے متعلق نہیں بلکہ امتی جس میں عورتیں بھی داخل ہیں، تمنا کی گئی ہے کہ سونے کا زیور استعمال نہ کریں تو اچھا تھا۔ قطع نظر اس روایت کے جس میں ایک صحابیہ ام عطیہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے لئے سونے کے زیور کی اجازت چاہی گئی تو

خابی علیتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے انکار کیا۔

ایک اور عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سونے کے مختلف زیوروں کا نام لے لے کر پوچھا شروع کیا کہ کیا اس کی اجازت ہو سکتی ہے؟ لیکن ہر ایک کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیار (اگ کا زیور) ہے فرماتے رہے، عورت پھر بھی عورت تھیں فطری جذبہ پر اتنی سخت چوٹ بردا نہ ہو سکی اور بولیں،

ان المرأة اذا لم تترین عورت جب اپنے شوہر کے لئے بناؤنگھا

لزوجھا صلفت عندا۔ نہیں کرتی تو اس کی نگاہوں سے اتر جاتی ہے

لیکن اس پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بیوی صاحبہ کو جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا۔

ما یمنع احد ان تصنع تم عورتوں کو کس چیز نے اس سے

قرطین من فضة ثم روکا ہے کہ چاندی کی دو بایاں اپنے

تصفر بزعفران او کان میں ڈالیں اور ان کو زعفران یا

بعبیر۔ عبیر سے رنگ دیں (تا کہ سونے کی

زر دی کی جھلک پیدا ہو جائے۔

اور یہ حال تو سونے کے زیورات کا ہے چاندی کے زیوروں پر اگرچہ عام عورتوں کے متعلق زیادہ سختی نہیں فرمائی گئی۔ لیکن آپ کے منشاء مبارک کا اظہار اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا جیسی چہیتی بیٹی کے گھر میں بھی آپ نے چاندی کے زیوروں کا دیکھا بھی پسند نہ فرمایا اور حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ

یا ثوبان! فاطمة قلادة من ثوبان! فاطمہ کے لئے تم بچوں کا ایک ہار اور

عصب وسواسین من عاج فیل دنداں کے دو کنگن خرید کر لے آؤ۔

بہر حال اگرچہ فقہاء اسلام نے قانونی طور پر طلائی و نقرہ کی زیورات کی حرمت کو صرف مردوں تک محدود رکھا ہے۔ لیکن بجائے قانون کے اگر مسلمان اپنے پیغمبر کے منشا اور آرزو کی پیروی کرنے پر آمادہ ہو جاتے تو عورتوں سے بھی زیور کا قصہ تمام ہو جاتا مگر افسوس ایسا نہیں ہوا۔ تاہم اسلام نے صراحتہ عورتوں کے لئے اگر سونے چاندی کے زیور کو ممنوع نہیں کیا ہے۔ لیکن سونے چاندی سے سکے کے سوا جو چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں خواہ وہ زیور ہوں یا برتن ہوں یا کچھ اور ہوں ان کے خرید و فروخت کی شکلوں میں ایسی دشواریاں پیدا کر دی ہیں کہ اسلامی نظام معیشت رکھنے والی قوم میں آسانی کے ساتھ ان کا چلن نہیں ہو سکتا۔ مندرجہ بالا چند فقہی صورتیں جن میں قیمتی سے قیمتی زیور کی نازک ترین حُسن کاریاں بالکل بے قیمت ہو جاتی ہیں جس کا حاصل بالآخر یہی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی چیزوں کا پہنتا ہی رُک جائے گا اور یہی اسلام کا مقصود ہے۔ پس اصل یہ ہے کہ یہ دشواریاں جو بظاہر صرف (یعنی سونے چاندی کے تبادلہ) میں نظر آتی ہیں وہ پیدا ہوئی نہیں ہیں بلکہ میرے خیال میں قصداً پیدا کی گئی ہیں۔ جس کی بنا ربو اسے زیادہ معاشی رگوں کے اس خونِ حیات کے انجماد پر ہے اور گونا گونا گونے نظر میں دشواریاں ہیں۔ لیکن غور کیا جائے تو ان ہی دشواریوں میں دراصل غظیم اشفاق معاشی آسانیاں پوشیدہ ہیں۔ اسی طرح ربو کی بعض دوسری شکلوں میں بھی جو کچھ پیچیدگی محسوس ہوتی ہے اس کا تعلق بھی ربو اسے زیادہ اسلامی تعلقات کے دوسرے ابواب سے ہے اگر ان مسائل پر غور کرتے ہوئے ان ابواب کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو پھر کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی مثلاً اسی سلسلہ کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس باریک چاول ایک من ہیں، وہ موٹے چاولوں کے دو من سے اسے بدلنا چاہتا ہے لیکن وہی برابر ہونا چاہیے کہ حکم کے تحت وہ مجبور ہے کہ ایک من باریک چاول کے عوض میں ایک ہی من موٹے چاول لے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسا کون شخص ہو گا جو اپنا ایک من باریک چاول دے کر خواہ مخواہ کسی سے موٹے چاول ایک من لے گا اسی قسم کی ایک صورت کھجور کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب پیش آئی تو آپ نے حکم دیا کہ بجائے بدلنے کے یہ کرنا چاہیے کہ ادنیٰ قسم کے کھجور بیچ دیئے جائیں اور پھر اس کے پیسے سے عمدہ کھجور خرید لیا جائے۔ بظاہر اس میں بھی ایک طولِ عمل نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ایک ہی جنس کی دو درجہ کی چیزوں کا باہمی تبادلہ زیادتی کی اجازت دے دی جاتی تو پھر دو چاندیوں تک میں آدمی فرق یا سانی نکال سکتا ہے کہ میری چاندی چونکہ اعلیٰ درجہ کی تھی اس لئے ایک تولہ سے دو تولہ لینے میں کیا حرج ہے بلکہ شاید دو روپوں میں بھی جملہ جو چاہیں گے تو اسی قسم کی نمبر اندازی کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے ایک جنس کی دو چیزوں میں نمبر کے فرق کو سود کے معاملہ میں ناقابلِ لحاظ قرار دیا اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا کہ

ان کی عمدہ اور ردی قسمیں دونوں

جید ہا و سد ہا سوا

برابر ہیں۔

(بخاری)

جس سے یہ غرض نہیں ہے کہ واقع میں ان چیزوں کے اقسام میں نمبروں کا تفاوت نہیں ہوتا بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر اس فرق کی بنا پر زیادتی کی اجازت دیدی جائے گی تو لوگوں کے لئے سود خواری کی راہ کھل جائے گی اور اسلام اس کے چھوٹے سے چھوٹے سوراخ کو سخت ترین ڈالوں سے بند کرنا چاہتا ہے۔ رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مشورہ

بيع التمر بیعاً آخر ثم
استریہ۔
کھجور (جو ادنیٰ قسم کا ہو) اسے بیچ دو، پھر
اس کی قیمت سے اچھے کھجور خریدو۔

اس میں اگرچہ بظاہر ایک گونہ دشواری ضرور ہے۔ لیکن جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے اس میں ضمناً معاشیات کے ایک خاص پہلو کی طرف بھی لوگوں کی توجہ دلائی جا رہی تھی میرا مطلب یہ ہے کہ عموماً ایسے ممالک جن کا تمدن و حضارت سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا ان میں چیزوں کو بجائے سکوں سے خریدنے کے چیز ہی سے چیز کے لین دین کا دستور عموماً جاری رہتا ہے۔ ابن قیم کا بیان ہے۔

لا سیما اهل العمود والیوادی
فانما یتناقلون الطعام بالطعام۔
خصوصاً خیمہ میں رہنے والے اور
صحرا کے باشندے وہ لوگ غلہ کو
عموماً غلوں سے بدلتے ہیں۔
(اعلام صفحہ ۲۰۲ جلد ۱)

اسلام سے پہلے عربوں میں بھی عام طور پر چیز ہی سے چیز خریدنے یعنی بربطریقہ BARTER یا فقہ کی اصطلاح میں ”مقائضہ“ کا دستور تھا اسلام ان ذرائع سے بتدریج اس رواج کو بھی گھٹانا چاہتا تھا۔ علماء معاشیات جانتے ہیں کہ معاشی ارتقا میں تبادلہ EXCHANGE کے اس طریقہ کے بدل دینے میں کتنا دخل ہے۔ چاندی کا مبادلہ چاندی سے اور سونے کا مبادلہ سونے سے برابر برابر ہو۔ اس معاشی نظریہ کا جہاں انسداد ربا اور دولت کے انجماد سے تعلق ہے میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس سے ایک اور بات بھی مقصود تھی جس کی طرف افسوس ہے کہ دنیائے اب تک توجہ نہیں کی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ حکومتوں کے مختلف سکون میں عدم مساوات کی وجہ سے بٹاؤن کا جو دستور پایا جاتا ہے، مثلاً حکومت آصفیہ کے سکے سے اگر کوئی انگریزی سکہ کو خریدنا چاہے تو سو روپے انگریزی کے معاوضہ میں سولہ روپے فرید علاوہ سو روپے کے دینے پڑتے ہیں، اور بٹاؤن کا یہ بھاؤ ایک حال پر بھی باقی نہیں رہتا، کبھی کبھی بجائے سولہ روپے کے سترہ سترہ اٹھارہ روپے تک زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ کبھی گھٹ کر بٹاؤن کا یہ قصہ بندرہ اور چودہ روپے تک اتر آتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بٹاؤن کی زیادتی اور کمی کا مدار صرف اس چاندی یا سونے کی کمی اور زیادتی پر مبنی نہیں ہے جو دو مختلف حکومتوں کے دو مختلف سکوں میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے دو حکومتوں کے ایسے دو سکے جن کی چاندی اور جن کا سونا برابر ہوتا ہے، مختلف اسباب کے زیر اثر ان میں بھی اسپیج (تبادلہ) کے وقت بسا اوقات بٹاؤن ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک حکومت کے قلمرو سے دوسری حکومت کے قلمرو میں آمد و رفت رکھنے والوں کو بھی اور تجارتی کاروبار کرنے والوں کو بھی بٹاؤن

ان جھگڑوں کی وجہ سے شدید نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں بلکہ ایک ہی حکومت کے ایسے دو علاقے جہاں دو مختلف قسم کے سکے مروج ہیں وہاں بھی بٹاون اور اکسیجیج کی یہ دشواریاں پائی جاتی ہیں۔ مدت ہوئی یعنی ۱۹۲۵ء میں مصر کے مشہور علمی مجلہ الہلال (عربی) نے فروری کی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا تھا مضمون نگار نے جینوا کی مرحوم لیگ آف نیشن (انجمن اقوام) کے امکانات کو پیش نظر رکھ کر یہ تجویز پیش کی تھی کہ

۱۔ ممکن ۲۔ ایجاد ۳۔ اتفاق لتوحد
۱۔ نقد ۲۔ اساسی عند
۱۔ الامم۔

یعنی (انجمن اقوام) کی وجہ سے اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی سکے ایجاد کیا جائے جس پر دنیا

کی قوموں کا اتفاق ہو جائے اور سارے جہاں کے باشندے اس پر متحد ہو جائیں۔

آگے چل کر اس کا مشورہ دیتے ہوئے کہ امریکہ کے ڈالر کو اساسی سکہ مان لیا جائے اسی لئے لکھا تھا کہ

لکی يمنع ۱۔ التلاعب من حيث
۱۔ العیار یجب ان یسک الدولار
سکة واحدة فی مصنع
واحد حتی یبقی عیاسرہ
واحد عند الامم۔

سکوں کے معیاری اختلافات کی وجہ سے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں اس کے اسناد کی یہی شکل ہے کہ ڈالر کو ایک ہی سکہ جو ایک ہی ٹکسال میں ڈھالا جائے بنا دیا جائے تاکہ دنیا کی ساری قوموں

میں ایک ہی معیار کے سکہ کا چلن ہو جائے۔

اسی مضمون میں یہ بھی ہے کہ آج مختلف ممالک اور حکومتوں کے مختلف معیار والے سکوں کی وجہ سے حال یہ ہے کہ

لا یدسری ما یاتی ۱۔ عند
یعنی بازار میں کس ملک کے سکہ کا بھاؤ کل کیا باقی رہے گا اس کا جتنا بہت دشوار ہے۔
مثال سے یوں سمجھایا ہے کہ

قد یشتری ۱۔ لیوم واحد ۲۔ السلع
فرنسا و یحسب حال ۱۔ الفرنک
والد ولاسر فیجد انه قد یم
لانه لم یشترها من
۱۔ امریکا مثلاً فلا یکاد یمضی
على تاریخ شلئہ اسبوع حتی
یحسب حسابہ ثانیاً ویجد انه
۱۔ خطاء کل الخطاء لاعتمادہ

یعنی ایک شخص کوئی مال فرانس میں مول لیتا ہے اور فرانک (سکہ فرانس) ڈالر (سکہ امریکہ) دونوں کا حساب کر کے خیال کرتا ہے کہ وہ نفع میں رہے گا کیونکہ مال اس نے امریکہ میں نہیں خریدا ہے، لیکن ایک ہفتہ بھی اس مال کی خریداری پر گزرنے نہیں پاتا کہ اب جو دوسری دفعہ حساب کرتا ہے تو پاتا ہے کہ

علیٰ السوق ۲ لفظ نسبیہ بدلا
من الامریکہ -
اس نے سخت غلطی کی کہ بجائے امریکی بازار
کے فرانسیسی بازار پر اس نے اعتماد کیا۔

بہر حال سکوں کے اس اختلاف کی وجہ سے دنیا جن مصائب کو بھگت رہی ہے اس کا علاج جیسا کہ مضمون نگار نے لکھا ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تمام سکوں کا وزن و معیار سب ایک کر دیا جائے اپنی اس تجویز کا نام اس نے ”نظریہ توحید نقد اساسی“ رکھا ہے، آخر میں مضمون کو ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ”نقد اساسی کی توحید“ کے نظریہ پر اگر اقوام عالم کا اتفاق ہو جائے تو،

وحدت فی العالم طریقة
التعامل وتسهلت بذلک
التجاسر و تروال کثیر
من الحسائر التي يتحملها
التجاسر و سائر الناس فی
غش السماسرة فی تحویل
النقد و شلها و بیعها۔
دنیا میں لین دین اور کاروبار کا طریقہ سارے
عالم میں ایک ہو جائے گا اور اس کی وجہ
سے تجارت میں بڑی آسانیاں پیدا
ہو جائیں گی اور بہت سے سارے خسارے
جو بیچارے تاجروں کو صرافہ کے دلالوں
کی وجہ سے برداشت کرنے پڑتے ہیں
یعنی سکوں کے ادل بدل ایر پیچر (کسیج)

میں جو فنی فریب چال اور دھوکہ دیتے ہیں اس سے دنیا محفوظ ہو جائے گی۔

کیا یہ سارا مشورہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک ۲ الذہب بالذہب و الفضة بالفضة
سواء بسو۱۶ مثلاً بمثل کا ترجمہ نہیں ہے تفصیل کے لئے دیکھئے الہلال مصر ماہ فروری ۱۹۲۵ء۔
اس کے سوا بھی سکوں کے کسیج سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانے میں حاکم اقوام نے محکوم
قوموں کے ساتھ جو مظالم جنگ عظیم کے بعد تلافی مافات کے لئے توڑے تھے ہندوستان کے بیوپاریوں
اور ساہوکاروں سے درد کے اس افسانہ کی داستان سننی چاہیے لاکھ دو لاکھ نہیں صرف کسیج کے مغالطہ
لے کر وڑوں بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اربوں کا دارا بنایا کیا ہے، جن کی تفصیلات شاید علماء معاشیات
بتا سکتے ہیں۔

حالانکہ بنی آدم کے تمام افراد ایک ہی آفتاب، ایک ہی ہوا، ایک ہی پانی ایک ہی مٹی سے
نفع اٹھانے میں مشترک ہیں اسی طرح چاندی سونے سے استفادہ کے حق کو بھی اگر عالمگیر کر دیا جائے تو
اس میں دنیا کا کیا بگڑتا ہے۔ حکومتوں کا اپنے اپنے سکوں پر مخصوص علامات کی نمائش کے جذبہ کی
اگر تسکین بھی مقصود ہو حالانکہ بجز ایک وہی ہوسناکی کے شاید چند اں مادی نفع اس کا کیا ہے
لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہر حکومت اپنے امتیازی نشان کو سکوں میں قائم رکھتے ہوئے ان کے اوزان
اور جو کھوٹ ملایا جاتا ہے اس کو مساوی کر دے کسی زمانے میں یہ تجویز اگر کچھ ناقابل عمل نظر آتی ہو تو شاید اس کے کچھ
اسباب بھی تھے۔ لیکن اب جبکہ زمین کی طنابوں کو قدرتی قوانین کے چند نئے انکشافات نے کھینچ کھینچ کر
اس طرح ملا دیا ہے کہ اب ایک ملک ہی نہیں بلکہ کرہ زمین کے تمام ممالک تقریباً ایک لیبی یا زیادہ سے زیادہ

ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ رات کو جو واقعہ واشنگٹن میں پیش آتا ہے صبح ہوتے ہوتے حیدرآباد میں اس کی خبر گھر گھر پھیل جاتی ہے۔ اور اب تو بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ گئی ہے چھ چھ مہینے میں جو راستہ آج سے سو سال پہلے طے ہوتا تھا کل پندرہ گھنٹوں کا فاصلہ بن کر رہ گیا ہے گویا ایسی صورت میں سکوں کے ہم وزن ہونے پر اگر حکومتیں بین الاقوامی معاہدہ کے طور پر اتفاق کر لیں تو گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ کسی شہر کے چند میرمختوں یا شہر کے محلے کے چند امیروں نے کس مسئلہ پر اتفاق کر لیا ہے۔ موصلات کے موجودہ ذرائع سے جب دنیا محروم تھی پیغمبر صلوٰۃ اللہ علیہ نے جب اس وقت یہ تجویز دنیا میں پیش فرمائی تو اس وقت تو اس تجویز کو علی لباس پہنا نا پہلے کی نسبت سے آسان بلکہ آسان تر ہو چکا ہے۔ لیکن ہیومنٹی (عام انسانیت) کی خدمت آدمی کا سب سے بڑا فریضہ ہے یا اسی قسم کے بلند بانگ دعوؤں کے بلند کرنے والوں کی زبانوں پر جو کچھ ہے کاش وہ دلوں میں بھی ہوتا جو اپنے کو سب کے لئے کہتے ہیں، لیکن سب کو جو اپنے لئے سمجھتے ہیں ان کے فاسد اغراض کیسے پورے ہو سکتے ہیں۔ جب اسپینج کے مغالطہ دینے کی یہ چال ان کے ہاتھوں سے چھن جائے گی۔ ان کا فائدہ تو اسی میں ہے، اسی راہ سے تو ان بڑی مچھلیوں کو چھوٹی مچھلیوں کے ننگنے کا موقع مل رہا ہے۔ اور ان بڑے درختوں کو چھوٹے پودوں کے چبانے کی آسانیاں فراہم ہو رہی ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دوسروں کے بھی اسی طرح پیغمبر ہیں جیسے ہمارے لئے ہیں، انھوں نے انسانیت کی عام فلاح و بہبود کی ایک تجویز پیش کر دی ہے۔ آدم کے بچوں میں ہمت ہو تو وہ اس تجویز کو مان کر اسپینج کے گرداب سے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ ساری نسل انسانی کو نجات دلا سکتے ہیں، وَلَعَلَّ اللَّهُ يُمُخِّدُكَ لَعَدَا ذَٰلِكَ ۝۲۰۔

شغل اصل | اب اس سلسلہ میں ایک آخری بات یہ رہ جاتی ہے کہ اسلام نے سودی کاروبار کو جب اپنے معاشیاتی نظام سے قطعاً خارج کر دیا ہے تو سوال ہوتا ہے کہ ملک کے جن افراد کے مصارف سے آمدنی کی جو رقم پس انداز ہو جاتی ہے۔ آخر وہ اس کا صحیح استعمال کیا پیدا کریں۔ یا سوا اس کے یہ بھی مسلم ہے کہ جس طرح موجودہ زمانہ کی قارونی مصارف والی کیمیائی اور ساکنسی جنگوں کی ذمہ داری اگر ان سہولتوں پر عائد ہوتی ہے جو سود کی وجہ سے فراہمی سرمایہ میں پیدا ہو گئی ہیں تو اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج دنیا کی ساری صنعتی ترقیاں جو کبیر پیمانے کی پیداواروں پر مبنی ہیں بہت کچھ ان ہی آمدنیوں کی رہ ہیں منت ہیں جو سود کی بدولت آج دنیا کو حاصل ہیں۔ سودی کاروبار کو یک قلم بند کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ساری میکینیکی اور صنعتی چہل پہل کا بازار یکا یک سرد پڑ جائے اور دنیا پھر اس عہد تاریک کی طرف واپس ہو جائے جس میں بجائے بجلی کے قمقموں کے مٹی کا دیا اور بجائے پیٹاروں اور سیٹاروں کے بیل کی گاڑیوں پر آدمی راستہ طے کرتا تھا۔

بلاشبہ یہ دونوں سوالات قابل غور ہیں، اگر اسلام کا معاشی نظام راہبانہ نظام ہوتا تو

بآسانی کہہ دیا جاسکتا تھا کہ باسی بچانے کی ضرورت ہی کیا ہے جو کتوں کے کھانے کی فکر کرنا پڑے۔ یعنی مصارف کے پس انداز کرنے کا اصول ہی غلط ہے۔ یا دنیا کو ریل و موٹر، برق و گیس ہی کی کیا حاجت اور بعض جو گیانہ فطرتوں کو یہ کہتے ہوئے پایا بھی گیا ہے۔

مگر جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور آئندہ دخل کے صرف یا خرچ کا باب جب آئے گا اس میں بھی بتایا جائے گا کہ یہ اسلامی نقطہ نظر سے انحراف ہو گا۔ حقوق و مطالبات کے ادا کرنے کے بعد اسلام مال کے جمع کرنے یا رقم کے پس انداز کرنے کا مخالف نہیں ہے۔ بلکہ آئندہ معلوم ہو گا کہ وہ ایک حد تک اس کا ایک معاشی مشیر ہے۔ اسی طرح اسلام کی غلط ترجمانی ہوگی۔ اگر کائناتی اشیاء اور قدرت کے نئے نئے قوانین سے استفادہ کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا جس دین کے پیغمبر نے غیر قوموں کی ایک سائنس کو یعنی جنگی ضرورت کے لئے (خندق کھودنے کو) اپنی اور اپنے اصحاب کی سنت قرار دی ہے، جس نے منجیق اور دبابوں کے استعمال کو عرب میں مروج کیا ہو، بجائے بے سلی لنگی (ازار) کے ایران کے سراویل (پانچامہ) کو پسند کیا ہو اور جس نے کفن اور قبر تک میں حسن کاری کی تعلیم دی ہو، اس کو جدید صنعتی ترقیوں کا مخالف آخر کس بنا پر قرار دیا جاسکتا ہے واقعہ یہ ہے کہ ربوہ کے حرام کرنے والے اسلام کے پیش نظر یہ دونوں سوالات تھے، اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان دونوں کا جواب اسلامی معاشیات میں موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مصارف سے بچے ہوئے یا بجائے ہوئے سرمایہ کو جو لوگ سود پر چلاتے ہیں عموماً وہ یہی تو کرتے ہیں کہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے کے حوالہ کر دیتے ہیں اور اس طور پر حوالہ کرتے ہیں کہ اس سرمایہ کے منافع میں تو وہ اپنے کو شریک رکھتے ہیں، لیکن نقصان کے تمام پہلوؤں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں بلکہ جیسا کہ بیان کر چکا ہوں کہ ان کا سرمایہ بھی جوں کا توں اپنی تمام ذاتی و صفاتی خصوصیات کے ساتھ محفوظ رہتا ہے اور جنہیں یہ سرمایہ حوالہ کیا جاتا ہے ان کو نفع ہو یا نقصان اس سے بالکل بے تعلق ہو کر اپنے مشروط منافع کو بھی قانون کے زور سے اتنے استوار اور مضبوط طریقہ سے اس طرح پر جکڑے رہتے ہیں کہ ان کے نفع کا ایک پیسہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا بلکہ سود و سود کی شکلوں میں تو صرف اصل سرمایہ کے منافع ہی نہیں بلکہ اس کے نفع کا بھی ہر حصہ پیسہ اور ہر پیسہ روپیہ و پیرا پیرا شرفیاں مسلسل بغیر کسی انقطاع کے بنتا چلا جاتا ہے، جن کے حیرت انگیز ریاضیاتی نتائج پر دنیا نے اکثر سردھنا ہے۔ سو سو روپے کے معاوضہ میں بذریعہ سود و سود بعض اوقات لاکھ لاکھ روپے تک لوگوں نے وصول کئے ہیں۔ عدالتی رپورٹوں میں اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی ملک ایک ہی قوم بلکہ ایک ہی شہر میں بلکہ بسا اوقات ایک ہی محلہ اور ایک ہی گھرانے کے چند افراد کے مصارف سے بچی ہوئی رقم کی حفاظت کا تو قانون اتنا زبردست انتظام کرتا ہے کہ صرف اصل رقم ہی نہیں بلکہ اس رقم کے منافع اور منافع کے منافع تک پر

توپ و تفنگ کے بھروسہ پر اتنی کڑی نگرانی رکھی جائے، لیکن اسی ملک اسی قوم اسی شہر اسی محلہ میں اسی گھرانے کے جس آدمی نے اس رقم کو ضرورت میں لگایا شب و روز کی مسلسل محنتوں سے اس کے ذریعہ سے کچھ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے، اس غریب کو یہی قانون اتنا لاوارث اور بے کسی کے حال میں چھوڑ دیتا ہے کہ خواہ اس پر آسمان ٹوٹے، پہاڑ گرے، کچھ بھی گذر جائے، لیکن اصل رقم کے ایک ایک پیسہ اور اس کے منافع درمنافع کے ایک ایک چھدام کا اسے ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے کہ جہاں سے ہو جس طرح سے ہوا اپنے مصارف سے جن لوگوں نے یہ زائد رقم پس انداز کی تھی ان تک دام دام پہنچاتا چلا جائے۔

دنیا کے قانون نے اگر اس ظالمانہ بے جا طرفداری کو جائز رکھا ہو تو ظالم کو اس دنیا میں ہر ظلم کے اختیار کرنے کا اقتدار حاصل ہے، لیکن اسلام سے اس یک طرفہ، یک چشمی، جنبہ داری کی توقع فضول ہے۔ اس لئے اس نے اس راہ کو تو مسدود کر دیا، لیکن اسی کے ساتھ اپنے مصارف سے ملک کے جو باشندے کچھ سرمایہ پس انداز کر سکتے ہیں، ان کے لئے اگر محض اس راہ سے اپنے سرمایہ سے استفادہ کے طریقہ کو اس نے قانوناً جرم اور ظلم قرار دیا ہے تو کون کہتا ہے کہ پھر اس سرمایہ کے استعمال اور اس استعمال سے استفادہ کی کوئی دوسری صورت بھی باقی نہیں رہی اسلامی معاشیات کے نظام نامہ کو پڑھیے اور دیکھیے، اس نے ایک نہیں بلکہ بیسیوں راہیں اور کھول دی ہیں جن کے ذریعہ سے اس پس انداز سرمایہ کو آمدنی کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ شرکت ہی کے ایک باب کو فقہ میں اٹھا کر دیکھیے تو ایک نہیں، متعدد شکلیں مختلف حالات کے لحاظ سے فقہاء نے بتائی ہیں کہ ایک یا ایک سے زائد آدمیوں کے ساتھ شریک ہو کر اس سرمایہ کو مختلف کاروبار میں لگایا جاسکتا ہے۔ شرکت عنان، شرکت مفادۃ، شرکت وجوہ، شرکت تقبیل، ان کے سوا بھی اور شکلیں ہیں جن میں اپنی اپنی سہولتوں کا اندازہ کر کے آدمی اس پس انداز سرمایہ کو لگا سکتا ہے، شرکت ہی کی ایک شکل مضاربت یا قراض ہے، یعنی ملک کے بے سرمایہ افراد کو سرمایہ دار لوگ سرمایہ دے کر کاروبار کریں اور باہم منافع کو تقسیم کر لیا کریں، سرمایہ دار کو سرمایہ کا، اور بے سرمایہ والے شریک کو محنت کا نفع ملے گا، چونکہ یہ فقہ کے مطول ابواب ہیں، اس لئے تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، لیکن قدر مشترک ان تمام معاملات میں وہی بات ہے کہ جب سرمایہ لگانے والے منافع میں شریک ہیں تو نقصان میں بھی ان کو شریک رہنا پڑے گا، اور چونکہ شرکت کا معاملہ بھی ایک سے زیادہ آدمی کر سکتے ہیں، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی بے سرمایہ آدمی ایک سے زائد سرمایہ داروں سے سرمایہ لے کر کاروبار کر سکتا ہے، جس کے قیود و شروط فقہ کی کتابوں میں تفصیلاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پیمانہ کبیر کی پیداواروں کی بھی کافی گنجائش نکل آتی ہے، اس ذریعہ سے بڑے سے بڑا سرمایہ جمع کیا جاسکتا ہے اور بڑے سے بڑے کاروبار کا امکان ہے اور مسلمانوں میں ہمیشہ سے بری و بھری تجارتوں اور صنعتوں میں یہ معاملات کروڑ ہا کروڑ روپے کے سرمایہ سے جاری تھے جن کے متعلق

تاریخ سے بڑا مواد فراہم کیا جاسکتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ سود کے روک دینے سے ملک کے پس انداز سرمایہ سے استفادہ کی کوئی دوسری صورت باقی نہیں رہتی یا پیدائش پر پیمانہ کبیر کے امکانات کا دروازہ مسدود ہو جاتا ہے، قطعاً غلط ہے۔

ماسوا اس کے ملک کی ایسی ضرورتیں جن کی تکمیل "پیدائش پر پیمانہ کبیر" ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے، اس کے متعلق اسلام نے خود حکومت کو بھی متوجہ کیا ہے کہ رعایا کی سہولت کے لئے اس قسم کے کاموں کو خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور بیت المال کی مدد خراج و عشر وغیرہ سے ان کی پابجائی کی جائے، مثلاً دریاؤں سے نہروں کا نکالنا، سڑکوں کا بنانا، پل باندھنا وغیرہ جس کا ذکر حکومت کی آمدنی کے سلسلے میں آئے گا،

بہر حال پس انداز سرمایہ سے جو مادی نفع اٹھانا چاہتا ہے اس کے لئے تو اسلام میں نہ کوئی بالاصورتیں رکھی گئی ہیں، لیکن ایسے لوگ جن کے نزدیک نفع صرف وہی نہیں ہے جو مادی شکل میں اسی زندگی میں آدمی کو مل جائے۔ بلکہ ان کی نگاہیں بلند ہیں اور اس زندگی کے سوا زندگی کے دوسرے اطوار و ادوار میں جو نفع آدمی کو پہنچ سکتا ہے۔ اسے بھی وہ نفع ہی سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کی دوسری رعایا سے نہیں تو مسلمانوں کے ہر فرد سے تو یقیناً اسی کی توقع کرنی چاہیے، ایسے لوگوں کے لئے پس انداز سرمایہ کے استعمال کی اسلام نے ایک اور صورت بھی نکالی ہے۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے اس سرمایہ کو خیرات کر دیں اور لوگوں میں اس پس انداز سرمایہ کو بانٹ دیں، یہ تو خیر ایک عام شکل ہے اور اس کے لئے کسی خاص مشورے کی کیا حاجت ہو بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے اقوال جو کبھی کبھی آپ نے ارشاد فرمائے ہیں کہ

یا قی ۱۱ حد کہ بمجمیع مایملک
فیقول ہذا صدقۃ شہ
یقعد یستکف الناس۔

تم میں کا ایک آدمی وہ سب کچھ جس کا
وہ مالک ہے لے کر آتا ہے اور کہتا ہے
کہ یہ صدقہ ہے اس کے بعد بیٹھ جاتا ہو

اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

(ابوداؤد)

اس میں تو مصارف سے بچے ہوئے کل سرمایہ کے خیرات کر دینے کی مخالفت فرمائی گئی ہے، اس بنا پر اسلام نے خیرات کرنے کے سوا ایک اور صورت ایسی نکالی ہے کہ مصارف سے بچا ہوا سرمایہ لوگوں کا محفوظ بھی رہ جائے اور چاہیں تو باوجود اس کے اس سے زندگی کے دوسرے مقامات و حالات میں نفع بھی اٹھا سکتے ہیں، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ لوگوں کا عام خیال یہی ہے کہ جس طرح خرید و فرو کرایہ، اجارہ وغیرہ یہ سارے کاروبار دنیاوی معاملات ہیں اور ان کا شمار خیرات و صدقات کے ذیل میں نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح سمجھا جاتا ہے کہ قرض کا لین دین بھی ایک خالص دنیاوی کاروبار ہے اس لئے قرض دینے والے کو جب کہا جاتا ہے کہ تم اس پر سود نہ لو تو وہ بیچارہ پوچھتا ہے کہ آخر اس روپے پر مجھے نفع کیا ملا۔ جیسا کہ میں تفصیلاً عرض کر آیا ہوں کہ قرض کے کاروبار میں

دینے والے کی طرف سے کسی قسم کی کوئی قربانی نہیں ہوتی، اتنی بھی نہیں جو ایک جھٹکے (اگر) ہکانے والے کی طرف سے کرایہ پر چڑھنے والوں کی راہ میں ہوتی ہے کہ جتنی دیر بھی اس کا اگر چلتا ہے اس عرصہ میں اس کے پیچھے نیز تمام پرزوں کے صفات کی وہ حالت قطعاً باقی نہیں رہتی جو چلنے سے پیشتر تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر دنیا میں کبھی کوئی اگر نہ پرانا ہوتا اور نہ خراب ہوتا، یقیناً مسلسل ان ہی مخفی فرسودگیوں کا چند سال کے بعد آخر میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگے کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔

مگر قرض کا روپیہ اگر دس سال بعد بھی واپس ہو تو اسی حال میں واپس ہوتا ہے جس حال میں دیا گیا تھا اور روپیہ کی اس خصوصیت کو وہ لوگ بھی سمجھتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح جواز سود کے لئے اور اس کو ظلم کے دائرہ سے نکالنے کے لئے کوشاں ہیں۔ دماغوں پر بہت زیادہ زور دینے کے بعد ان لوگوں نے ایک مفہوم پیدا کیا ہے جس کی تعبیر یہ ”انتظار کشی“ کے لفظ سے کرتے ہیں، یعنی بغیر موجودہ خواہشوں کے ملتوی کئے، زمانہ آئندہ کے لئے کوئی اپنی آمدنی سے پس انداز نہیں کر سکتا ہے۔ اب اگر آئندہ زمانے میں بھی اس غریب کو کچھ نفع اس پس انداز والی رقم سے نہ ملا تو اتنے دن تک جو اپنی خواہش کے سینہ پر اس نے پتھر رکھا، اور انتظار کرتا رہا اس کا صلہ اس کو کیا ملا گویا التوائے خواہش اور آئندہ کے توقعات کے انتظار کی جو زحمت اس کو ہوئی، یہی سود کی قیمت ہے۔ مادی منافع کی ٹوہ میں عمریں بسر کرنے والوں کی طرف سے سود کی یہ سراسر غیر مادی اور جذباتی مبہم، مجہول قیمت پیش کرنی خود ان کے دعویٰ کی انتہائی کمزوری کی دلیل ہے لیکن اگر واقعی انتظار کشی کوئی چیز ہے اور اسی کی قیمت قرض دینے والا سود کی شکل میں چاہتا ہے تو اسلام نے اس قیمت کی پابجائی کا نظم کیا ہے کہ قرض جواب تک ایک خالص دنیوی اور مادی کاروبار سمجھا جاتا تھا، دنیوی معاملات سے اس کو نکال کر قرآن نے نیکی اور تیرے، خیر و خیرات کی طویل فہرست کی کوئی معمولی چیز نہیں، بلکہ اہم ترین جزء کی حیثیت سے شریک کر دیا۔ شاید آسمانی کتابوں میں قرآن ہی ایک ایسی دینی کتاب ہے جو

من الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً وہ کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے

کی آواز سے گونج رہی ہے، مصارف سے رقم بچانے والوں کے سامنے قرض خواہوں کو ہٹا کر خود حق تعالیٰ جل مجدہ نے اپنے کو لا کر کھڑا کر دیا اور اعلانِ عام کر دیا گیا کہ انتظار کشی کی اجرت طلب کرنے والوں کو اجرت دینے کے لئے خود ان کا مالک

فیضاً عفوہ ۲ ضعافاً کشیراً اللہ تعالیٰ (اس انتظار کشی کے صلہ میں)

دونا دون منافع اسے عطا فرمائے گا۔

کے وثیقہ کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن نے خیرات کی یہ ایک نئی قسم نکالی کہ خیرات میں دی جانے والی رقم بالکل محفوظ رہتے ہوئے بھی اس پر خیرات کے منافع کی توقع کی جاسکتی ہے اور توقع کیا جب قرضداروں کی طرف سے ”دونا دون“ منافع کا اعلان خود خدا کر رہا ہے تو اب اس سے زیادہ یقینی

رہنہ اور نفع کی ضمانت اور کیا دی جا سکتی ہے۔ اسلام کی یہ ایک عجیب معاشی دقیقہ سنجی ہے کہ قرض کو اس نے صرف خیرات اور نیکی کی مدد ہی میں شامل نہیں کیا ہے بلکہ قرآن کی مذکورہ بالا آیت جس کا ذکر اس کتاب میں ایک سے زیادہ جگہ میں کیا گیا ہے۔ اس کے سوا حدیثوں میں اس کی تصریح بھی آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

ملائت ليلة اسری بی علی باب

الجنة مكتوبا الصدقة بعشر

امثالها والقرض ثمانية عشر۔

(ابن ماجہ)

جس رات میں مجھے معراج ہوئی میں نے

جنت کے دروازے پر یہ لکھا ہوا دیکھا

کہ صدقہ کا بدلہ دس گنا اور قرض کا

اٹھارہ گنا ملے گا۔

اسی بنا پر بعض صحابہؓ فرمایا کرتے

لان ۱ قرض دینا سرین ثمر

یوردان ثمر ۱ قرضہا ۱ حب

۱ من ۱ لصدق ۱ بھما

(معنی)

میں دو دینا قرض میں دوں، پھر مجھے

واپس مل جائیں اور میں اسے پھر قرض میں

دوں، یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ

میں ان دونوں کو خیرات کر دوں۔

صرف یہی نہیں کہ صدقہ کو قرض سے افضل قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ خیرات میں جو ایک پہلو اس کا تھا جس کا سوال کی بحث میں ذکر کر چکا ہے یعنی خیرات لینے اور بھیک پر زندگی گزارنے کی اسلام نے مذمت کی ہے۔ لیکن قرض کو باوجود خیرات کی مد میں شمار کرنے کے خیرات کے اس مکروہ پہلو سے اس کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور اس طور پر مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ صرف زبان سے نہیں بلکہ کائنات کی افضل ترین ہستی جس نے خود اپنے لئے اور قیامت تک آنے والی اپنی نسل کے لئے صدقہ کو حرام فرمادیا ہے، اسی ذات مبارک نے خود عمل کر کے اس میں بے عزتی یا کراہت کا جو اندیشہ تھا اس کو مٹا دیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے،

لیس ۱ القرض بسیئة وذلک لان

النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان

یستقرض ولو کان مکروہا کان

۱ بعد ۱ الناس منه۔

(معنی صفحہ ۳۵۳)

قرض لینا یہ بھیک مانگنا نہیں ہے اور اس

کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

خود قرض لیا کرتے تھے۔ اگر قرض لینا مکروہ

ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

سب سے زیادہ اس سے دور رہتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مصارف سے بچا کر ملک میں جن لوگوں کے پاس پس انداز سرمایہ ہے۔ اگر وہ اس سے مادی نفع اٹھانا چاہتے ہیں تو نفع کے ساتھ نقصان میں بھی اپنے کو شریک کر کے وہ ایسا کر سکتے ہیں اور اسلام میں اس کی متعدد راہیں کھلی ہوئی ہیں اور اگر نقصان میں شریک ہونے سے ڈرتے ہیں تو ان کے سرمائے کو محفوظ کر کے انتظار کشتی کے صلہ میں اسلام نے بجائے مادی نفع کے خیراتی منافع کے

کمانے کا وسیع میدان فراہم کر دیا ہے۔ قومیت اور وطنیت کے نشہ میں سرشاری کا ادعا رکھتے ہوئے جو یہ کہتے ہیں کہ اپنی انتظار کشی کا صلہ غیر مادی منافع کی صورت میں لینے پر کتنے آدمی تیار ہو سکتے ہیں بالکل عجیب ہے، آخر جو رقم ضروریات سے بچ گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ خود دلیل ہے کہ تمہاری ضرورت سے زیادہ تھی، ورنہ بچتی کیسے۔ اپنی خواہشوں کو ملتوی کر کے پس انداز کرنا اولاً یہ ہمیشہ ضروری نہیں۔ دنیا میں ایسے دو لاکھوں کی کمی نہیں ہے جن کے پاس ہر قسم کی خواہشوں کی تکمیل کے بعد بھی لاکھوں اور کروڑوں کی رقم آمدنی سے پس انداز ہو جاتی ہے، ماسوا اس کے اگر خواہشوں کو ملتوی کر کے جو پس انداز کرتے ہیں تو عموماً یہ (NASASARY) ضروری خواہش قطعاً نہیں ہوتیں۔ بلکہ (لغیثات) کی خواہشوں تک یہ التوا محدود ہو سکتا ہے اور یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے، بہر حال کسی وجہ سے بھی ہو، اگر کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ رقم بچ گئی ہو تو اس میں اس کا کیا بگڑتا ہے کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے ضرورت مندوں کو دیکر یا بے کاروں کو کاروبار میں لگا کر اپنی رقم جوں کی توں واپس بھی لے لے اور اس حسن سلوک کا خدا کے یہاں سے صلہ کی امید اس دنیا میں یا آئندہ زندگی میں کرے، آخر سوال ہوتا ہے کہ قرض نہیں بلکہ مطلق خیرات اور چیرٹی میں جو لوگ آج بھی اور ہر زمانہ، ہر ملک میں لاکھوں کروڑوں کی رقم دے ڈالتے ہیں، ان کا تو سرمایہ اور سرمایہ کے منافع ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں، آخر وہ کس بات کی توقع پر ایسا کرتے ہیں، لیکن جب ان ہی لوگوں کو بجائے خیرات کے سود و سودی غیر سودی قرض دینے کے لئے کہا جاتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ میرا کیا نفع ہوگا۔ خیرات جس میں نفع ہی نہیں اصل سرمایہ بھی چلا گیا۔ اس میں تو سوال نفع کا نہیں پیدا ہوتا لیکن غیر سودی قرض میں اس سوال کو اٹھانا اس متناقض ذہنیت کا آخر کیا جواب ہو سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ محض ایک رواجی بات ہے۔ خیرات میں روپے کے لینے دینے کا چونکہ رواج ہے اس لئے لاکھوں اور کروڑوں کے دینے سے بھی لوگ دریغ نہیں کرتے۔ لیکن غیر سودی قرض کے لین دین کا خیرات سمجھ کر چونکہ عام طور سے رواج نہیں ہے، اس لئے دس بیس پر بھی لوگ مادی نفع تلاش کرنے لگتے ہیں۔ خصوصاً جن ممالک میں (نیشن نیلٹی) اور قومیت و وطنیت کا صور پھونکا جاتا ہے ان کے منہ پر تو یہ سوال کسی طرح نہیں پھبتا۔

الحاصل اسلامی معاشیات سے سودی کاروبار کو خارج کر دینے کے بعد ملک کے پس انداز سرمایہ کے استعمال اور دنیوی و دینی منافع کے حاصل کرنے کی راہیں بے روک ٹوک کھلی ہوئی ہیں اور جس طرح لین دین کے سلسلہ سود اور سود کی مختلف چھوٹی بڑی شکلوں کو روک کر اسلام نے ملک کی اکثریت کو سرمایہ داروں کے ظلم سے نجات عطا کی ہے۔

اسی طرح لین دین کے دوسرے ابواب میں بھی جہاں معاشی مظالم نظر آئے ان کے سد باب کی بھی اس نے کوشش کی ہے۔ ظلم و فریب، دھوکہ، جھگڑے، رگڑے کا انسداد اس نے صرف کلی قوانین ہی کے ذریعہ سے نہیں کیا ہے بلکہ بعض اہم جزئی شکلوں کو بھی قانون کی

بندش میں لاکھ ان کی جڑ کاٹ دی ہے، میرا مضمون اتنا طویل ہوتا جا رہا ہے کہ اب سب کا تفصیلی ذکر ناممکن ہے اس لئے مختصر اشارے کرتا ہوں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔

حکومت اور قیمتیں | معاشیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی بنیاد طلب و رسد کی باہمی مناسبتوں پر مبنی ہے۔ طلب اور رسد میں ایک نسبت تو وہ پیدا ہوتی ہے جس میں بجائے قدرتی ذرائع کے بعض لوگوں کے اختیار کو دخل ہوتا ہے، مثلاً حکومتیں درآمد اور برآمد پر ڈیوٹی لگا کر قیمت کے معیار کو گھٹاتی اور بڑھاتی رہتی ہیں، اور دوسری صورت وہ ہوتی ہے جس میں قدرتی عوامل زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور عمل سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس کو ناپسند کرتے تھے کہ قیمت کے مسئلہ کو اختیاری تصرفات سے متاثر کیا جائے۔ آپ سے ایک دفعہ درخواست کی گئی کہ چیزوں کا بھاء و حکومت کی جانب سے مقرر فرما دیا جائے۔ لیکن جواب میں ارشاد ہوا

۱ ان ۲ اللہ هو المفسر هو القابض
۲ الباسط الرزاق ۲ فی لا درجۃ ان
۲ لقی ۲ اللہ تعالیٰ ولیس احد
یطلبنی بظلمۃ فی دمر ولا مال
بھاء و کا مقرر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے
وہی تنگی پیدا کرتا ہے اور وہی کشادگی، و
روزی پہنچانے والا ہے، میں امیدوار ہوں کہ
حق تعالیٰ سے ملوں اور مجھ سے کسی کا مطالبہ
خون اور مال کے مظالم کا نہ ہو۔

(ترمذی)

جس سے معلوم ہوا کہ قیمت کے مسئلہ میں حکومت کی دراندازیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم قرار دیا۔ خواہ یہ ظلم پبلک پیر ہو یا تاجروں پر اور حکومتوں کا بیجہ تو آہنی بیجہ ہوتا ہے، اس لئے ان کی زبردستیوں کے نتائج تو بہت سنگین ہوتے ہیں۔ لیکن ملک کے عام باشندوں تک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ بازار کے مسئلہ کو اور قیمت کے معیار کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ عرب میں دستور تھا کہ مال لے کر جو قافلہ اونٹوں کا کسی بازار کی طرف آتا تو چند لوگ جو پہلے سے اس کی ٹوہ میں رہتے خبر پاتے ہی سود و سومیل آگے نکل کر مال پر قبضہ کر لیتے اور تاجروں سے کچھ بات طے کر لیتے یا جیسے اس زمانے میں کسی بازار کی "سول ایجنسی" کوئی لے لیتا ہے، یہ شکل اختیار کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان دیا کہ

لا تلقوا الركبان ولا بیع
حاضر لباد۔
شتر سواروں کے قافلے کو آگے نکل کر
کوئی ان سے نہ ملا کرے اور باہر کے

تاجر سے بازار کا کوئی آدمی بیع کا معاملہ نہ کرے

پھر اس فرمان کی غرض بھی بیان کر دی گئی،

دعوا الناس یورث ۲ اللہ
بعضہم بعض۔
لوگوں کو چھوڑ دو، یوں ہی اللہ تعالیٰ بعض کو
بعض سے روزی پہنچاتا ہے۔

منشائے مبارک ان تمام ہدایتوں سے یہی تھا کہ تجارتی کاروبار میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس میں دخل اندازی کر کے خواہ مخواہ قیمتوں کے مسئلہ کو قبل از وقت ہاتھ میں نہ لیا جائے یہاں تک صارف تھا کہ جیسا کہ تجارتی کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہی ۱۲۱ تتلقى السلع حتیٰ تجارتی سامان پر آگے بڑھ کر قبضہ کرنے سے حضورؐ نے منع فرمایا تاکہ یہ ضبط بھالالا سواقی۔

مال منڈی میں گرنے جائے۔

کہاں یہ حکم کہ منڈی میں گرنے سے پہلے کوئی تجارتی مال کے متعلق کسی قسم کی کارروائی نہ کرے کہ بازار میں گرنے کے بعد ہی طلب اور رسد کا قدرتی تناسب واضح ہو سکتا ہے اور کہاں یہ حال ہے کہ موجودہ زمانے کی حکومتیں درآمد و برآمد دونوں پر من مانے طور پر جس قسم کے تصرفات چاہتی ہیں کرتی ہیں اور غریب پبلک کچھ نہیں بول سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ جو چیزیں بغیر ان قیود کے محض تجارتی اصول پر جس قیمت پر بکیتیں، اس سے سو گنا قیمت لوگوں کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور صبر کئے غیظ و غصہ کے ساتھ لوگ ادا کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں "احتکار" کا مسئلہ بھی ہے یعنی غلہ وغیرہ کو اس لئے روک لینا تاکہ جب اکثر تاجروں کا مال ختم ہو جائے گا اور صرف میرے پاس یا متعدد چند آدمیوں کے پاس رہ جائے گا تو من مانگے داموں پر بیچیں گے۔

"احتکار" کے متعلق متعدد حدیثیں پائی جاتی ہیں جن میں اس کی ممانعت کی گئی ہے مثلاً

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے

وسلمہ ان یحتکر الطعام (صحاح)

کہ غلہ کا کوئی احتکار کرے۔

فقہائے اسلام نے عموماً اس حکم کو صرف غذائی مواد تک محدود رکھا ہے اگرچہ بعضوں نے اور چیزوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے نیز مختلف دوسرے قرائن اور روایات سے ہر حال میں اس فعل کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ فروشنده کا کسی چیز پر اس طرح قبضہ کر لینا کہ گاہکوں کو "مقابلہ" کی وجہ سے جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ نہ پہنچے۔ اسلام اس کو کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے بدنیت لوگوں کے متعلق ایسی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں کہ شاید دنیا میں بھی ان کو اس عمل کی پاداش بھگتنی پڑے گی، کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو احتکار سے منع کیا، لیکن وہ نہ مانا، حضرت عمرؓ نے کہہ دیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے آدمی کے متعلق جذام اور افلاس کا خطرہ ظاہر فرمایا ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس احتکار کرنے والے کو

سرا ینا حجد و ما۔ (معنی) میں نے دیکھا کہ وہ کوڑھی ہو گیا ہے۔

تجارتی مسلک | ان جزئیات کے نقل کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ تجارت کے متعلق اسلام کا

نقطہ نظر معلوم ہو، اور اس کا اندازہ صرف

دعو الناس ینزق اللہ بعضہم

لوگوں کو چھوڑ دو تا کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں

سے بعض کو روزی پہنچاتا ہے۔

بعض

سے ہو سکتا ہے کہ اسلام آزاد تجارت کا حامی ہے، جس کا جہاں جی چاہے ایک ملک سے دوسرے ملک میں، ایک شہر سے دوسرے شہر میں، دیہات سے شہروں میں، شہروں سے دیہاتوں میں مال لائے بیچائے، نہ باشندوں کو اس میں خلل اندازی کر کے ”بھاؤ“ کے طبعی معیار کو پست و بلند کرنا چاہئے اور نہ حکومت کو اس باب میں خواہ مخواہ دخل دے کر رعایا پر زندگی تنگ کر نی چاہئے۔

باقی درآمد برآمد پر جو کر وڑ گیری (چنگی) لی جاتی ہے، اگرچہ اس زمانے میں اس کو ملک کے معاشی حالات کے توازن کا جو ذریعہ بنایا گیا ہے اور اس ذریعہ سے قومی ممالک ضعیف ممالک پر ظلم کر رہے ہیں، اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ کر وڑ گیری کا محصول اموال تجارت میں اسلام میں بھی لیا جاتا ہے، لیکن وہ حکومت کا ایک ٹیکس ہے۔ یعنی مسلمانوں سے تو زکوٰۃ لی جاتی ہے اور اسی مصرف میں صرف ہوتی ہے جس مصرف کے لئے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یوں ہی اسلامی حکومت کی دوسری رعایا بھی اس کو بطور محصول ہی ادا کرتی ہے اور اس لئے ادا کرتی ہے تاکہ جان و مال کی حفاظت کے مصارف کی پابجائی ہو ان تمام مسائل کی تفصیل حکومت کی آمدنی کے باب میں آئے گی۔ البتہ غیر ممالک کے تاجروں سے جو کر وڑ گیری لی جاتی ہے اس کی بنیاد بھی دوسری ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ جس ملک کے لوگ اسلامی حکومت کی رعایا کے اموال تجارت پر کوئی محصول نہ لیں گے ان سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہ لے گی۔ ہدایہ میں ہے

ان کا لوٓا لا یاخذون

اگر غیر اسلامی حکومتیں ہماری حکومت

ان کا لوٓا لا یاخذون

کے باشندوں سے بالکل نہ لیں گے

اصل لا ناخذون

تو ہم بھی ان سے کچھ نہ لیں گے۔

لیکن اگر وہ ہمارے یہاں کے لوگوں کے مال پر محصول لیتے ہیں تو اس وقت ہم بھی ان سے اسی قدر لیں گے جتنا ہمارے یہاں کے لوگوں سے وہ لیتے ہیں۔ پھر کوئی ظالم حکومت اگر مسلمانوں کا سب مال لے لیا کرتی ہے تو ہمیں حکم دیا گیا ہے

ان کا لوٓا لا یاخذون

اگر وہ سارا مال مسلمانوں کا لے لیتے

ان کا لوٓا لا یاخذون

الکل

لا ناخذون

الکل

کے سب مال نہ لیں گے۔

صاحب ہدایہ نے اس کی وجہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ

اعلیٰ اخلاق امور کی پابندی کے

منہن اسحق بیکارہ الاخلاق

ہم زیادہ مستحق ہیں۔

اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گروڈگری کا تعلق اسلام میں معاشیات سے نہیں بلکہ سیاسیات سے ہے۔ جتنی کہ دنیا کی حکومتیں اگر اسلامی حکومتوں کی رعایا سے گروڈگری کے ذلیقے کا معاہدہ کر لیں تو سب سے پہلے بین الاقوامی تجارت کو آزاد قرار دینے پر جو دستخط کریں گے وہ مسلمان ہوں گے۔ ٹھیک جو حال غلامی میں ہوا کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں کو غلام بنا رہی تھیں تو ہم ہی بناتے تھے۔ پھر اسخوں نے مل کر خواہش کی کہ آئندہ سے مسلمانوں کو غلام نہ بنایا جائے گا۔ خلیفہ وقت نے شیخ الاسلام کے مشورہ سے وہی غن حق ہمکا سر والا اخلاق کہتے ہوئے اس مقدس معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اور آج بھی عام تجارت کو آزاد کرانے پر اگر غیر مسلم حکومتیں رضا مندی ظاہر کریں تو ان کا نو لا یا حذون و لا یصل لا ناخذ پر عمل کرنے کے لئے ہمارے پاس پُرانا دستور موجود ہے۔

خیر گروڈگری کے مسئلہ کا ذکر یہاں تو ضمنی طور پر آ گیا، تجارتی کاروبار کے متعلق میں نے چند تفصیلی احکام کا تذکرہ اس لئے کیا تاکہ تجارت کی آزادی و عدم آزادی کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر سامنے آجائے۔

اور اب اس بحث کو میں اسی پر ختم کرتا ہوں۔ یوں تجارت کے متعلق اور بھی چند قوانین ہیں جن پر بحث کی حاجت تھی، لیکن بخوف طوالت ان کو ترک کرتا ہوں، بہر حال سب میں وہی قرآنی حکم لا تظلمون ولا تظلمون کی روح کار فرما ہے۔ جب کوئی تفصیلی کتاب معاشیات پر لکھی جائے گی تو اس سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے، البتہ مصارف سے بچے ہوئے سرمایہ کے متعلق ایک پہلو کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔

سرمایہ کا استعمال و حفاظت | مقصد یہ ہے کہ اس سرمایہ سے استفادہ کی جو دو شکلیں اسلام نے بتائی ہیں، یعنی اگر اس سے کوئی شخص نفع اٹھانا چاہتا ہے تو خسارہ اور خطرے کی ذمہ داریوں کو بھی قبول کر کے ایسا کر سکتا ہے اور اس کی بہت سی صورتیں ممکن ہیں، اور اگر خطرے کی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کر سکتا تو شخصی نفع سے دست بردار ہو کر ملک کے ضرورت مندوں یا بے سرمایہ لوگوں کو قرض دے کر قومی فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس قومی نفع کے ساتھ بالآخر اسی زندگی یا دوسری زندگی میں شخصی منافع سے بھی وہ محروم نہ رہے گا، بلکہ خیرات و صدقات سے زیادہ قرض دینے میں شخصی نفع کی توقع کی جاسکتی ہے جس کی تفصیل گزر چکی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس قرض اور دین کی ادائیگی کی ضمانت کے لئے اسلام نے جو ممکن صورتیں اس دنیا میں ہو سکتی ہیں انہیں بھی اختیار کیا ہے۔ یعنی رہن اور رجسٹری جس کے ذریعہ سے چاہیے تو اپنے دین کو آپ محفوظ کر سکتے ہیں یہن کا ایک مفصل باب فقہ میں موجود ہے اور رجسٹری کے اصولی قوانین مع قانون شہادت تو خود قرآن میں موجود ہیں، وہی بات کہ اسلام نے زندگی کے معاشیاتی تعلقات کو کتنی اہمیت دی ہے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلاف دستور قانون رجسٹری کے لئے قرآن میں ایک پوری رکوع سورہ بقرہ کے آخر میں مختص کر دی گئی ہے تاکہ کسی کا دین ضائع ہونے کے ممکنہ خطرات سے

محفوظ ہو جائے اور آخر میں تو

ما تبدوا ما فی النفسکم ۱ و
تخفوا یحاسبکم بہ ۲ اللہ -
اپنے جی کی جو بات ظاہر کر دے گے یا
جسے چھپاؤ گے، اللہ تعالیٰ اس کا
حساب فرمائے گا۔

کے ذریعہ سے اس پر بھی تنبیہ کر دی گئی ہے کہ معاشیاتی ذمہ داریوں کی رتی رتی کا حساب ایک دن ہو کر رہے گا، اور جس نے جس کسی کو جو کچھ دیا ہے وہ قطعاً ضائع نہیں ہو سکتا، بلکہ مل کر رہے گا، مگر یہ سب سامان تو پس ماندہ سرمایہ کے استعمال و حفاظت کا اس وقت تک کے لئے ہے جب تک آدمی زندہ ہے، لیکن اگر کوئی اپنے بعد بھی کچھ پس انداز چھوڑ کر مرنے والا ہے تو اس سرمایہ کے متعلق بھی تقریباً اسلام نے دو ہی صورتیں مقرر کی ہیں، یعنی اگر اپنے جانشینوں میں اس کی صلاحیت نہیں پایا تاکہ اس بچائی ہوئی دولت سے صحیح مسنوں میں نفع نہیں اٹھا سکتے یا کم از کم اس کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو وقف "خصوصاً وقف علی الاولاد" کا عجیب و غریب قانون نافذ کر کے اسلام نے اس کی حفاظت کی ایک محکم اور استوار صورت پیدا کر دی ہے گویا جیسے قرض میں اصل سرمایہ کو محفوظ کر کے دوسروں کو نفع پہنچایا جاسکتا ہے۔ یہی حال وقف کے اس قانون کا ہے کہ بچا ہوا پس ماندہ سرمایہ جوں کا توں محفوظ بھی رہ جاتا ہے اور جن لوگوں کو واقف نفع پہنچانا چاہتا ہے ان کو نفع بھی پہنچتا رہتا ہے وقف علی الاولاد کے متعلق لوگوں کو عجیب مغالطہ ہوا کہ اسے وہ خیرات کی ایک قسم قرار دے کر متحیر ہوئے اور بڑے بڑے قانونیوں نے اظہار تعجب کیا کہ اولاد پر وقف کے کیا معنی؟ قطع نظر اس کے کہ اسلام کا عام قانون صدقہ کے باب میں

وابدعہن تعول ۱ ملک و اباک
لمتک ۲ احاک ۱ دناک ۲ فادناک
جس کا بار تم پر ہو پہلے ان میں سے شروع
کر یعنی ماں باپ کو، بہن کو بھائی کو،

پھر رشتہ میں جو زیادہ قریب ہوتا جائے۔

کا ہے اور خود صدقہ کے مفہوم کو تو اس نے اتنا عام کیا ہے کہ بیوی کے ساتھ ہم بستری کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ قرار دیا۔ اسوا اس کے وقف میں خیرات کے مفہوم سے زیادہ پس ماندہ جائداد کی حفاظت بھی مد نظر ہے۔ ابتدائے اسلام میں عموماً صحابہؓ نے بکثرت اپنی اولاد کے نام اوقاف کئے۔ علامہ مقدسی لکھتے ہیں۔

۱ امام شافعیؒ نے کتاب الام میں دعویٰ کیا ہے کہ وقف کی جو شکل اسلام میں پائی جاتی ہے، اس کی نظیر اسلام سے پہلے نہیں ملتی، لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ممکن ہے کہ عرب میں رواج نہ ہو، لیکن عیسائیوں میں اوقاف بکثرت تھے، ان کے گرجوں پر مصر کی زمینیں وقف تھیں۔ لیکن میرے نزدیک امام شافعیؒ کا مطلب مطلق وقف سے نہیں ہے۔ بلکہ وقف کے منافع کو اپنے اقرباء و اعزہ کے ساتھ منقص کرنا یہ اسلامی وقف کی خصوصیت ہے ۱۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے
کوئی مقدور والوں میں ایسا نہ تھا
جس نے وقف نہ کیا ہو۔

حمیدی راوی ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی
اولاد پر اپنے گھر کو وقف کیا، یوں ہی عمرؓ
نے بھی مروہ کے پاس جو گھر تھا اس کو
اپنی اولاد پر وقف کیا، حضرت عثمانؓ نے بھی

قال جابر لم یکن احد من اصحاب
النبی صلی اللہ علیہ وسلم
ذو مقدرة الا وقف۔

قال الحمیدی تصدق ابو بکر
بدارۃ علی ولدہ وعمر بدارۃ
عند المروۃ علی ولدہ و
عثمان وتصدق علی باریضہ

۱۱ حضرت عثمانؓ کے وقف کی قیمت کا اندازہ کتابوں میں مائتی الف دینا کیا گیا ہے، یعنی دو لاکھ اشرفی جس سے اندازہ
کیا جاسکتا ہے کہ روپے کے حساب سے اس کی قیمت کتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہی حال دوسرے اوقاف کا بھی کم و بیش تھا ۱۲
۱۲ اوقاف کے سلسلہ میں ایک دلچسپ تاریخی چیز مسلمانوں کے یہاں جو ملتی ہے، وہ مصارف اوقاف کی گونا گونی ہے، امیر
شکیب آریان جو اسلامی تاریخ کے ایک مستند اور وسیع النظر عالم ہیں، مشہور امریکی مصنف ٹوٹھراپ سٹوڈارڈ نے ”نیا عالم اسلام“
کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اردو عربی میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ عربی ترجمہ پر امیر کے بڑے مفید حواشی ہیں ان ہی حاشیوں
میں امیر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”مجنونوں، مجذوبوں، بیماروں کے لئے مسلمانوں نے جو اوقاف کئے ہیں وہ تو حد شمار سے خارج
ہیں، بیمار جانوروں کے لئے مسلمان وقف کرتے تھے۔ شام میں ”مرج“ نامی جو مرغزار ہے لکھا ہے کہ جہاد میں جو گھوڑے زخمی
اور بیکار ہو جاتے تھے۔ ان کے لئے یہ مرغزار وقف تھا کہ کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ہر گھوڑا جس طرح چاہے چرے رہے، دمشق
میں ایک وقف کا مصرف صرف یہ تھا کہ چینی کاہن کسی کا غلام اگر توڑ دے تو توڑنے والے غلام کو بھیج دے سالم برتن دیدیا جائے
تاکہ مالک اس کو مارے پیٹے نہیں۔ مگر میں ایک صاحب نے صرف اس لئے وقف کیا تھا کہ اس کی آمدنی سے کتوں کو شہر کے
میں رہنے سے روکا جائے۔ مگر میں ایک وقف تھا جس کا مصرف واقف نے یہ مقرر کیا تھا کہ تقریبات اور شادیوں میں
فرش و فرش روشنی وغیرہ کا نظم اس کی آمدنی سے کیا جائے۔ ایک وقف تونس میں اس لئے کیا گیا تھا کہ جمعرات کے
دن مدارس کے طلباء کا امتحان لیا جائے اور بچوں کو وقف کی آمدنی سے ہر مہینہ انعام تقسیم کئے جائیں۔ ایک وقف تونس ہی میں
اس لئے کیا گیا تھا کہ حمام کی فیس اس سے ہر اس شخص کے لئے ادا کی جائے جو خود حمام کی فیس ادا کرنے کی صلاحیت نہیں
رکھتا۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ راہ گروں کو برون کا ٹھنڈا پانی پلایا جائے۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ غریبوں کے
بچوں کی ختنہ کے مصارف اس سے ادا ہوں۔ تونس میں بھی برتن توڑنے والوں کے لئے ایک وقف تھا۔ بعض اوقاف
اس لئے تھے کہ رمضان میں مٹھائی روزہ داروں میں اس کی آمدنی سے تقسیم کی جائے۔ ایک دلچسپ وقف کا تونس میں
پتہ چلا ہے کہ خاص قسم کی مچھلی موسم پر وہاں کے سمندر کے ساحل پر آتی ہے غریبوں کے لئے ان مچھلیوں کو خرید کر تقسیم کیا
جائے۔ بعض اوقاف کا مصرف یہ تھا کہ کسی کے کپڑے پر اگر داغ دھبہ لگ جائے یا ناقابل استعمال ہو جائے تو وہ اس
وقف کی آمدنی سے نیا کپڑا خرید سکتا ہے۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ راستوں سے پتھر کاٹنے سے آمدنی کی آمدنی سے ہٹائے
جائیں۔ الغرض اندھوں، لنگڑوں، لولوں، اپاہجوں، کوڑھیوں وغیرہ وغیرہ کے لئے اکثر اسلامی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

یہی کیا، حضرت علیؑ نے اپنی اس زمین کو جو مینوع میں تھی وقف کیا، حضرت زبیرؓ نے اپنے اس گھر کو جو مکہ میں تھا اور جو گھر مصر میں تھا اور مدینہ میں ان کا جو مال (بہ شکل باغ و زراعت تھا) اسے اپنی اولاد پر وقف کیا، حضرت سعدؓ نے مدینہ میں ان کا جو گھر تھا اور جو مصر میں تھا اپنی اولاد پر وقف کیا۔ عمر بن عاصؓ نے وہ ط کے گھر کو اور جو مکہ میں ان کا گھر تھا اپنی اولاد پر وقف کیا، یونہی حکیم بن حزامؓ نے مکہ اور مدینہ کے گھر کو اپنی اولاد پر وقف

بینبع و تصدق الزبیر بدارة
بمكة ودارة بمصر وامواله
بالمدينة و تصدق
سعد بدارة بالمدينة
ودارة بمصر على ولده و
عمر بن العاص بدارة
بالوهط ودارة بمكة
على ولده وحكيم بن حزام
بدارة بمكة والمدينة
على ولده كله الى اليوم
(المنفى)

کیا، اور یہ سارے اوقاف اس وقت تک موجود ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”وقف“ دراصل اس زمانے میں اپنی پس ماندہ جائیداد کی حفاظت کا ایک محفوظ طریقہ تھا اور اس قانون کی اصلی روح یہی تھی، اگرچہ اس قانون میں تبرع اور نیکی کا مفہوم بھی شریک تھا لیکن اسی معنی میں جس معنی میں خود اپنے آپ کو اپنی بیوی کو کھانا کھلانا بھی اسلام میں صدقہ ہے۔ ہر ذوق و تقدر صحابی کا اس پر عمل کرنا جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے اس سے تویہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی بلکہ پس ماندہ رہنے والی جائیداد کے متعلق اسلام نے پہلے ”وقف علی الاولاد“ اور بعد کو وراثت کا قانون پیش کیا ہے۔ یعنی اگر جانشینوں سے جائیداد کے برباد ہونے کا خطرہ ہے تو اس کو وقف کر کے محفوظ کر دینا چاہیے اور اگر ان میں اس کی صلاحیت نظر آتی ہے کہ ان میں ہر ایک کو کچھ سرمایہ اگر دے دیا جائے گا تو اس کے الٹ پھیر اور اس کو اصل بنا کر اپنی معاشی ترقیوں میں مدد حاصل کر سکتے ہیں تو ایسی صورت میں وراثت کے قانون سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ورثاء جو اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے موت کے انتظار میں ہوں مثلاً ماں باپ وغیرہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

ممالک میں اوقاف تھے۔ مراکش کے ایک اسلامی وقف کا ذکر اس نے لکھا ہے کہ ایک فرانسیسی سیاح نے ان لفظوں میں کیا لوق و دوق عمارت ہے جس میں چھ ہزار اندھے ہمیشہ رہتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے رہنے سہنے کا باضابطہ نظم ہے اور تعلیم بھی ان کو دی جاتی ہے۔ ایک دلچسپ وقف یہ بھی تھا کہ جن شوہروں سے ان کی بیویاں خفا ہو جائیں تو خفگی کے دنوں میں اس وقف کی آمدنی سے استفادہ کر سکتی ہیں جب تک میاں بیوی میں صفائی نہ ہو جائے وقف کی طرف سے بیویوں کے مصارف کی پابجائی کی جائے۔ ان نئے مصارف کے علاوہ تعلیم وغیرہ کے لئے تو مسلمانوں نے ہر جگہ اوقاف کئے ہیں۔ لیکن افسوس کہ غیر ہمدرد حکومت ان کا انتظام نہیں کرتی۔ (الحاضر الاسلامی ص ۲۹۲ ج ۱) ۱۶

ان کو تو میت کے مال سے بقدر گذر اوقات دلایا جاتا ہے لیکن جن کے سامنے زندگی کے آئندہ عملی مراحل پیش آنے والے ہیں، مثلاً اولاد، تو ان میں جس کو دوسرے سے بھی کچھ مدد مل سکتی ہے، یعنی لڑکیاں جو شوہر کی قوت بھی رکھتی ہیں۔ ان کو لڑکے کے حساب سے نصف دلایا جاتا ہے اور لڑکوں کو عموماً چونکہ کسی دوسرے سے امداد کی توقع نہیں ہوتی بلکہ مزید بیوی کا بار اس پر پڑتا ہے۔ اس لئے اس کو بجائے نصف کے پورا دلایا گیا اور یہ تو اس وقت ہے کہ آدمی اپنی تمام اولاد کو ایک حال میں چھوڑ کر مر رہا ہو لیکن اگر بجائے اس کے یہ دیکھتا ہو کہ اس کا کوئی بیٹا یا بیٹی ایسے معذور اور بیمار یا کسی ایسی حالت میں ہیں کہ اگر ان کو صرف قانونی حصہ ملے گا تو کفایت نہ کرے گا، ایسی صورت میں اسلام اجازت دیتا ہے کہ اپنی کسی خاص اولاد کو میراثی حصہ سے زیادہ اپنی زندگی میں ہبہ کر دے۔ امام احمد بن حنبل کا فتویٰ ہے کہ

لا بأس إذا كان الحاجة
وإذا كرهه إذا كان على
سبيل الأثرية۔

اپنی اولاد میں کسی کو زیادہ حصہ ہبہ
کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں اگر اس
کی ضرورت ہو، مگر بغیر ضرورت یہ بات

مجھے ناپسند اور میرے نزدیک مکروہ ہے، یعنی بلا وجہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دینی چاہئے۔

مقدس نے ان حاجات کی کچھ تفصیل بھی کی ہے۔

مثل اختصاصه بالحاجة أو
سماحة أو عملى أو كثرة
عائلة أو اشتغاله بالعلم
أو نحو من الفضائل۔

مثلاً کسی بچہ کو اس کی کسی ضرورت کی
وجہ سے ترجیح دی جائے یا وہ کسی
مریم مرض میں بیمار ہو، یا اندھا ہو، یا
اس کی اولاد زیادہ ہو، یا علم کے ساتھ

مشغول ہو، یا اسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل کر رہا ہو۔

اور اس سے ایک عام سوال کا جواب بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وقف و ہبہ وغیرہ کے ذریعہ سے جب کوئی اپنی جائیداد کا نظم کئے بغیر مر جاتا ہے تو اسلام نے میراث کا قانون اسی قسم کی جائیدادوں کی تقسیم کے لئے بنایا ہے اور قانون ظاہر ہے کہ شخصی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنتا۔ عموماً کلیاتی اصول واضح قانون کے سامنے ہوتے ہیں۔ میراثی قانون کی بنیاد یہ رکھی گئی ہے کہ براہِ راست قریب ترین رشتہ داروں کو ترجیح دی جائے گی اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر عمل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے اور وراثت کے لئے صرف رشتہ داری کافی ہو تو غالباً ایک ایک مورث کے سینکڑوں وارث بلکہ شاید سارے بنی آدم وارث ہو جائیں، کیونکہ بالواسطہ رشتہ دار تو تقریباً ہر آدمی کا دوسرا آدمی ہے۔ کم از کم آدم میں تو سب ہی جا کہ شریک ہو جاتے ہیں، مگر اسی اصول پر کبھی براہِ راست قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ مورث کا کوئی بالواسطہ رشتہ دار ایسا بھی پایا جاتا ہے جو واقعہ کے اعتبار سے براہِ راست رشتہ داروں سے زیادہ قابلِ رحم اور محتاجِ امداد ہوتا ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ

کبھی بیٹوں کے ساتھ کوئی یتیم پوتا کسی کا رہ جاتا ہے، میراثی قانون کے مذکورہ بالا نقطہ نظر کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پوتا محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ پوتا اپنے دادا کا براہ راست نہیں بلکہ اپنے باپ کے واسطے سے رشتہ دار ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی پوتا بوجہ یتیم اور کسین ہونے کے امداد کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ ایسے مواقع جو کبھی کبھی پیش آ جاتے ہیں، ان کی وجہ سے لوگوں کو میراث کے قانون میں کچھ نقص نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ قانون کا نقص نہیں بلکہ قانون کے استعمال کرنے والے کا عقلی نقص ہے۔ یہ تو دادا کا فرض ہے کہ جب وہ اپنے پوتے کو اس حال میں پاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ براہ راست رشتہ دار نہ ہونے کی وجہ سے وہ میراثی قانون کے تحت میں نہ آئے گا تو اس کو کس نے منع کیا ہے کہ قانون ہبہ اور عطیہ سے اس قابل رحم پوتے کو نفع نہ پہنچائے۔ خصوصاً جب خاص حالات میں ایک وارث کو دوسرے وارث پر ہبہ اور عطیہ میں ترجیح دی جاسکتی ہے اور مرنے کے بعد کسی وارث کو یہ حق نہیں ہے کہ اس عطیہ کو اس سے واپس لے لے۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ

اذا فاضل بین ولد فی
العطایا وخص بعضہم
بعطیۃ ثمرات قبل ان
یستردہ ثبت ذلک للموہب
لہ ولزم ولس لبقیۃ
الورثۃ الرجوع۔

اور اس کا حق واجب ہو جائے گا۔ باقی وارثوں کو اس کا حق نہیں ہے کہ اس عطیہ کے متعلق اس پر دعویٰ کریں۔

اس مسئلہ کو تفصیل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

بہ قال مالک وشافعی و
اصحاب الرائے واکثر اهل
العلم۔

امام مالک امام شافعی اور اصحاب
رائے (حنیفہ) اور اکثر اہل علم
کی یہی رائے ہے۔

اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آیت قرآن

فی أموالهم حق المساکین

والمحرورم۔

ان کے مال میں مانگنے والوں اور جو (قانونی

حقوق) سے محروم ہیں ان کا بھی حق ہے۔

میں "المحرورم" کے تحت اس قسم کے محروموں کا حق قرآن نے سرمایہ داروں کے اموال میں اگر نہیں قائم کیا ہے تو پھر یہ اور کن کے حقوق ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے اگرچہ اپنے یا اپنے بال بچوں، اپنی آئندہ نسلوں کی رزاقیت کے سررشتہ کو تو اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم نہیں دیا ہے اور اللہ عزوجل ذو القوۃ المتین ہی کو اس کا تکفل قرار دیا ہے، اسی بنا پر صرف ان ہی لوگوں کو نہیں جو

مالتس وغیرہ وسواسیوں کی طرح نسل انسانی اور زمین کی غذائی پیداواروں میں عدم توازن کا خطرہ محسوس کر کے خود بھی ڈرے اور دوسروں کو ڈراتے رہتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو بھی اس نے ڈنٹا ہے جنہیں اولاد کی کثرت میں معاشی تنگ حالی کا خطرہ محسوس ہو چکی کہ ان میں بعضوں نے تو اتنی تنگ دلی اختیار کی کہ پیدا کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کی گردن تک مروڑنے پر آمادہ ہو گئے اور ایسا فعل جو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ ضرورت ہوئی کہ اس کے متعلق قرآن میں

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةً

اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو تنگ

معاشی کے خوف سے۔

۲ ملاق۔

کا حکم دیا جائے اور یہ تو کہا جاتا ہے کہ ”ایام جاہلیت“ کی قساوت تھی، لیکن آج بجنسہ ان ہی معاشی مشکلات کے بھوت کو سامنے کھڑا کر کے نسل انسانی کے ہمدردوں کا ایک گروہ (برہتہ کنٹرول) (ضبط حمل) کے ذریعہ سے پیدا ہونے سے پیشتر انسانی نسل کو تباہ کر دینے کا جو وعظ سن رہا ہے ”کیا جاہلیت“ کی اس سنگدلی سے ”عالمیت“ کی یہ رحم دلی کچھ کم ہے۔ وہی برہتہ کنٹرول کا وعظ کہنے والا اگر خدا نخواستہ برہتہ کنٹرول کی پیٹ میں آجاتا تو آج اسٹیجوں پر چہک چہک کر یہ باتیں کیا کر سکتا تھا؟ بہر حال اسلام نے ”رزا قیت“ کی فکر میں شہر کے قاصینوں کو گھٹلنے سے توبے نیاز کر دیا ہے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی بعض معاشیوں نے الغزل (صحبت کا ایسا طریقہ جس سے حمل قرار نہ پائے) کی راہ سے جب برہتہ کنٹرول کے متعلق منشاءے مبارک دریافت کیا تو ارشاد ہوا کہ یہ (داد خفی) ہے، یعنی اولاد کو زندہ مار ڈالنے کی یہ ایک مخفی تدبیر ہے، اور اس کی واقعیت میں کون شبہ کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت بھی نہیں دی ہے کہ خواہ مخواہ اپنی آمدنی کو کوئی اس بے ترتیبی سے اڑائے یا خرچ کرے کہ نتیجہ اس کی اولاد دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے پر مجبور ہو۔ مشہور واقعہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حدیثوں میں آتا ہے کہ اپنی ایک سخت بیماری میں ان کو زندگی سے جب مایوسی ہو گئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے تشریف لائے تو سعدؓ نے کہا کہ میری وارث صرف میری ایک لڑکی ہے ”کیا مناسب نہ ہوگا کہ میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ خیرات کر دوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نہیں“ سعدؓ نے کہا تو آدھا؟ پھر جواب ملا ”نہیں“ سعدؓ نے کہا تو ایک تہائی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تہائی بہت ہے۔“ اس کے بعد آپ کے الفاظ یہ تھے۔

تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر جاؤ

یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں ایسے افلاس

کی حالت میں چھوڑو کہ لوگوں کے

سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

۱ تک ۱۲ تذروہ رشتہ تک

اغنیاء خیر من ان قد عہم

عالة یکفون الناس۔

(صحاح)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اپنی ذات ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لئے بھی اگر کسی کو پس انداز کرنے کا موقع ہے تو اسلام اس موقع سے نفع اٹھانے کا حکم دیتا ہے، پھر پس ماندوں کی حالت اگر وقف کی مقتضی ہو تو منافع کو ان تک پہنچا کر اصل کو محفوظ کر دیا جائے یا اولاد میں سے کوئی لڑکا یا لڑکی زیادہ ضرورت مند ہو یا کوئی رشتہ دار قابل امداد ہونے کے باوجود میراثی حصہ سے محروم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہو، ان کو ہیہ کے ذریعہ سے کچھ دیدیا جاسکتا ہے اور باقی کو ارثی قانون سے تقسیم ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے تاکہ ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ سرمایہ پہنچ جائے جس کے ذریعہ سے اگر کافی ہو وہ زندگی گذاریں، نا کافی ہو تو اس کو اصل بنا کر آمدنی پیدا کریں۔

مضمون گویا زندگی سے شروع ہو کر ایک حد تک موت اور موت کے بعد تک پہنچ چکا ہے۔ اختصار کی کوشش کے باوجود بات پھیلتی جا رہی ہے اور ابھی چند اہم نقاط اور مصارف و خرچ کا مستقل باب باقی ہے۔

محنت و مزدوری

باہمی لین دین کے سلسلہ کی ایک بڑی اہم چیز اجارہ ہے، اردو میں تو اجارہ ٹھیکہ اور گتہ کے معاملہ کو کہتے ہیں، لیکن فقہاء کی اصطلاح میں نوکری، مزدوری، کاریگری، کرایہ داری مکان کی ہو یا زمین کی، سب اجارہ کا معاملہ ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ خود چیز دے کر معاوضہ لینا نہیں جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے، بلکہ چیز سے استفادہ کا حق دے کر اس کے معاوضہ میں کچھ لینا یہی اجارہ کا معاملہ ہے۔ پھر اگر مکان، گاڑی، گھوڑا وغیرہ کے متعلق یہ معاملہ کیا جائے تو کرایہ کا معاملہ ہوا اور اگر بجائے اپنی کسی چیز کے خود آدمی اپنی خدمت اور محنت کا معاوضہ حاصل کرے تو اس کی بھی دو صورت ہے۔ مستاجر کی ماتحتی میں اگر کام نہ کرے بلکہ اپنے گھر میں مثلاً کام کرتا ہو تو یہ کاریگری ہے۔ اور اگر مستاجر کی ماتحتی میں کرتا ہے تو اس کی بعض شکلوں کو نوکری، بعضوں کو مزدوری کہتے ہیں۔ فقہاء اسلام نے ہر ایک کے متعلق اپنی کتابوں میں مفصل قوانین بنائے ہیں۔ اس زمانے میں ربوا (سود) کی وجہ سے سرمایہ کے ملنے میں جو آسانیاں ہوئیں تو عموماً کاریگروں کو لوگوں نے نوکر اور مزدور رکھ کر ان کی اجتماعی محنت سے نفع حاصل کرنا شروع کیا۔ اس طریقہ سے پیداوار تو اجتماعی شکل میں ہونے لگی، یعنی ایک ایک کارخانہ میں دس دس ہزار مزدور کام کرنے لگے اور سرمایہ چونکہ ایک ہی یا چند محدود اشخاص کا ہوتا ہے اس لئے آمدنی شخص یا چند محدود اشخاص کو ملتی رہی۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کا سوال اسی شکل نے پیدا کر دیا۔ سرمایہ داروں کو ظاہر ہے بوجہ محدود افراد ہونے کے لاکھوں اور کروڑوں کی شکل میں نفع ملتا رہا، اور مزدور جن کی اجتماعی محنت کا یہ ثمرہ ہے ان کو صرف مزدوری ملتی رہی۔ لیکن چونکہ انفرادی طور پر کام کرنے سے اتنا نفع بھی ان کو نہیں ملتا تھا۔ اس لئے قدرتنا کارخانوں میں کام کرنے کو انھوں نے اپنے لئے زیادہ منفعت بخش پایا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر

مزدور نہ ان مشینوں کو خرید سکتے ہیں اور نہ خام مواد کا اتنا ذخیرہ فراہم کر سکتے ہیں جو سرمایہ دار خود یا اپنی ساکھ پر بنکوں سے سودی قرض لے کر مہیا کر سکتے ہیں۔ کارخانہ داروں نے چونکہ اس کا اندازہ کر لیا کہ انفرادی مزدوری سے زیادہ اگر مزدوروں کو کارخانہ میں مزدوری دے دی جائے گی تو سود کے حساب سے نقصان کیا نفع اور کافی نفع ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ شکل میں بھی اگر غور کیا جائے تو مشکلات کی بڑی وجہ یہی سودی اور بنکنگ کا کاروبار ہے۔

اسلام نے اس کا کیا حل پیش کیا ہے، ایک مستقل مسئلہ ہے۔ پوری تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں تاہم چند کلیات اجارہ کے متعلق ذیل میں سمجھ چکے کرتے ہیں اور علمائے معاشیات کو توجہ دلاتے ہیں کہ سرمایہ و محنت کی جو کتنی کسی جتن سے آج تک سلجھتی نظر نہیں آرہی ہے۔ انسانی زندگی کے پہلوؤں کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ان کو پیچیدگیوں کا کوئی حل کیا مل سکتا ہے یا کم از کم ان کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج جو باتیں نئی خیال کی جاتی ہیں۔ واقع میں وہ کتنی پرانی ہیں، بہر حال بخاری شریف کی ایک حدیث ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اخوانکم خولکم جعل اللہ
تحت ایدیکم فمن کان
اخوانک تحت یدک فلیطعمہ
مما یا کل ولیلبسہ مما یلبس
ولا تکلفوہم مما یغلبہم
فان کلفتموہم فاعینوہم
خول (یعنی تمہارے ہاتھ کے نیچے کام
کرنے والے) تمہارے بھائی ہیں، حق
تعالیٰ نے ان کو تمہارے ہاتھ کے نیچے
ڈال دیا ہے، پھر جس کا بھائی کسی کے
ہاتھ کے نیچے پڑ جائے تو چاہیے کہ جو کچھ
خود کھاتا ہو اسے کھلائے اور جو خود
پہنتا ہو اسے پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو ان کو مغلوب کر دے اور اگر
ان پر بار ڈالو تو ان کی مدد و اعانت کرو۔

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) مزدور اور جو مزدوری پر لوگوں سے کام لیتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ہے کہ ان کو وہ اپنا بھائی خیال کریں، اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

(۲) کم از کم کھانے، پہنے، رہنے سہنے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح برابر ہو، جو خود کھائے وہ مزدور کو کھلائے اور جو خود پہنے وہ مزدور کو پہنائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اجرت کے معاملہ میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ یعنی کم از کم اتنی اجرت تو بہر حال ہر مزدور کو ملنی چاہیے کہ کھانے اور پہنے کی حد تک وہ اپنے مالک کے برابر ہو جائے۔ مزدوری کی شرح اگر آج اتنی بھی بلند کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شورش کی کمی کی بہت حد تک توقع کی جاسکتی ہے۔

(۳) وقت اور کام دونوں کے حساب سے مزدوروں پر اتنا بوجھ نہ لاداجائے جو ۱۱۰۰

مغلوب کر کے تمھارے لڑا تکلّفوہم ما یغلبہم یہ ایسا فقرہ ہے جس سے موجودہ زمانے میں وقت اور کام کی نوعیت کے مسئلہ کو طے کیا جاسکتا ہے۔

(۴) اور اگر کوئی کام ایسا پیش آ جائے جس کی انجام دہی میں مزدوروں کو دشواری پیش آرہی ہو تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس کام کو نہ کرایا جائے۔ اور نہ یہ مطلب ہے کہ خواہ مزدور پر کچھ ہی گزر جائے لیکن بہر حال اس سے وہ کام لیا ہی جائے۔ بلکہ ایسی صورت میں یہ کام کرنا چاہیے کہ مزدور کی اعانت مزید قوت سے کی جائے "فاعیلوہم" کا یہی مطلب نہیں ہے کہ خود اس کام میں لگ جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ بہر حال مزید قوت سے مزدور کی اعانت کی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "تحت اور سرمایہ" کے جتنے جھگڑے اس زمانے میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں مندرجہ بالا حدیث کے ذریعہ اس کا حل پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کی یہ صرف کوئی خوشگوار نرمی تجویز ہی نہیں ہے بلکہ ایسے عملی واقعات کی ایک فہرست پیش کی جاسکتی ہے جن میں مسلمانوں نے اسے عملاً کر کے دکھایا۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابو ذرؓ ہی کی زندگی کا یہ دستور العمل تھا، اور حضرت عمرؓ کا سفر بیت المقدس میں نصف راستہ خود سوار ہونا اور نصف راستہ غلام کو اونٹ پر سوار کرانے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے مزدوری کے متعلق دوسری حدیث بخاری کی یہ ہے۔

قال اللہ ثلاثۃ انا خصمہم
یوم القیامۃ رجل اعطی
بی ثمنہ رجل باع حراً
ثمناً کل ثمنہ رجل استاجر
اجیراً فاستوفی منہ ولم
یعطہ اجرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کا
قیامت کے دن میں فریق مخالف ہونگا
ایک شخص جس نے میرے نام سے کسی کو
کچھ دیا اور پھر عہد شکنی کی (یہ پہلا آدمی
ہی ہے) دوسرا وہ جو کسی آزاد آدمی کو
بیچ کر اس کی قیمت کھائے۔ تیسرا وہ

جس نے کسی کو مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا، لیکن اس کی پوری مزدوری ادا نہ کی۔

تیسری حدیث،

ان ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اعطوا الاجیر
اجرہ قبلی ان یجف سرائہ۔
(رواہ ابویعلی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مزدور کو
اس کی مزدوری ادا کر دو، قبل اس کے
کہ اس کا پسینہ خشک ہو۔

ایک اور روایت مسند احمد میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اعطوا العامل من عملہ
فان عامل اللہ لا یمنیب۔
مزدور کو اس کے کام سے بھی حصہ دو
کیونکہ اللہ کا عامل و مزدور نامراد
نہیں کیا جاسکتا۔

اس حدیث کا کیا مطلب ہے، کیا علاوہ مزدوری کے "منافع" میں بھی مزدور کا کچھ حصہ اسلام مقرر کرنا چاہتا ہے افسوس ہے کہ فقہائے اسلام کی کتابوں میں اب تک اس کے متعلق کوئی بات نہیں ملی۔ لیکن ایک اور حدیث ہے جس سے اس کی ایک گونہ تشریح ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد مبارک ہے۔

۱۲ اصنع لاحدکم خادمہ طعاما
ثم جاء به وقد ولی حرہ ودخا
فلیقعدہ معہ فلیاکل فان
کان الطعام مشفوا فلیضع
منہ فی یدہ اکلۃ او اکلتن
(صحیح بخاری)

تمہارا خادم اگر تمہارا کھانا تیار کرے
اور لے کر تمہارے پاس آئے اور گرمی
دھویں کو اس نے برداشت کیا تھا تو
چاہیے کہ اپنے ساتھ اس کو بٹھا لو اور
کھانے پر زیادہ آدمی ہوں تو پھر خادم
کے ہاتھ میں کھانے سے کچھ چیز اٹھا کر

(صحیح بخاری)

رکھ دو ایک لقمہ یا دو لقمے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس کام سے بھی جو خادم نے کیا خادم کو کچھ نہ کچھ حصہ ملنا چاہیے کیا مزدور کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے؟

مزدوروں اور نوکروں کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کرنا چاہیے۔ ایک تو اس باب میں بخاری کی روایت گذر چکی کہ بھائی بھائی کا معاملہ کیا جائے۔ نیز اس سلسلہ میں ان کے ساتھ درگزر اور چشم پوشی کے متعلق ایک قابل ذکر حدیث وہ ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے دریافت کیا،

یا رسول اللہ کہ اعفو عن الخادم

میں اپنے نوکر کو کتنی دفعہ معاف کیا کروں

راوی کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، اُس نے پھر اسی سوال کو دہرایا۔ آپ نے تب اس کے جواب میں جو بات کہی وہ یاد رکھنے کی ہے، ارشاد ہوا

اعفی عنہ کل یوم سبعین مرۃ

روز تشر دفعہ معاف کیا کرو۔

(ابوداؤد و ترمذی)

اسی بنا پر فقہائے اسلام نے یہ طے کر دیا ہے کہ نوکر یعنی،

الذی یستاجر مودة فلیضمن

کسی مقررہ مدت کے لئے جو تنخواہ پر نوکر

علیہ مال لم یعد۔

رکھا جائے۔ اس پر (چیزوں کے نقصان

کرنے کا تاوان قانوناً حائد نہ ہوگا، اگر اس کی طرف سے قصد نقصان کرنے کا ارادہ نہ ہو (ہو)

مقدس نے اس جزیئہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے،

وهذا من ذهب مالک و ابی

یہی امام مالک اور امام ابو حنیفہ اور

حنیفة و اصحابہ۔

ان کے اصحاب کا مذہب ہے۔

اس سلسلہ میں بعض ایسی حدیثیں بھی قابل ذکر ہیں جن کا تعلق اگرچہ غلاموں سے ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ

احکام ہر شخص کے لئے عام ہیں جو کسی کی ماتحتی میں کام کرتا ہو۔

ابو مسعود بدری صحابی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ کوڑے سے اپنے غلام کو مار رہے تھے، پیچھے سے ایک آواز،

۱ علم! با مسعود۔

خبردار! ابو مسعود۔

کی آئی۔ ابو مسعود کہتے ہیں غصہ میں مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کون ہے کہ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور فرما رہے ہیں،

۱ علم! با مسعود! ان ۲ اللہ

خبردار! ابو مسعود حق تعالیٰ تم پر

۱ قدر علیک علیٰ هذا الغلام

تمہارے غلام سے زیادہ قابو

(مسلم)

رکھتے ہیں۔

اور غالباً یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ غلاموں اور لونڈیوں کو عبدی (میرا غلام) امتی (میری لونڈی) کہنا اور ان لوگوں کا اپنے آقاؤں کو ربّی (میرا رب اور مالک) ربّتی (میری مالکہ کہنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی تھی اور حکم تھا کہ بجائے غلام کے فتائی (میرا جوان) اور آقا کو بجائے رب کے سیدی (میرے سردار) کہا کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں غریبوں کے اس طبقہ کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آخری آواز دینا کے کالوں نے خدا کے آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے جو سنی وہ،

۱ الصلوة وما ملکت

نماز اور جن کے تم مالک ہو ان کی خبر

۱ یمانکم۔

لیتے رہنا (یعنی ان دونوں کے حقوق کا

سب سے زیادہ لحاظ رکھنا)

کی تھی صلی اللہ تعالیٰ علی النبی الامی وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

اسی طرح قرآن کی مشہور آیت،

۱ ان ۲ کر مکم عند ۲ اللہ

اللہ کے پاس سب سے زیادہ شریف

۱ اتقاکم۔

وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ

پرہیزگار ہو۔

میں ”پیشہ و رازہ“ طبقات کی جن درجہ بندیوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا ہے اور بجائے پیشوں اور نسلوں کے تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیا گیا ہے اس سے مزدوری کے کسی پیشہ کو افضل اور کسی کو کمتر قرار دینے کی بنیاد ہی نکل گئی۔ اسلام اور اسلام پر صحیح معنوں میں چلنے والوں نے اس سلسلہ میں جو عملی نظائر پیش کئے ہیں تاریخ کے اوراق اس سے معمور ہیں۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر ہندوستانی تمدن کے نشہ کا ایک متوالا ابو الفضل تعریضاً کہا کرتا تھا کہ فلاں حلوائی اور فلاں کفش دوز کی باتوں کا کیا اعتبار۔

یعنی اسلام میں عموماً بڑے بڑے علماء، فقہاء جو گذرے ہیں ان میں زیادہ تر لوگوں کا تعلق مزدوری کے معمولی پیشوں سے تھا۔ افسوس کہ جو چیز اسلام میں باعثِ فخر ہے، اس ہندی تمدن کے مسحور کی نگاہ میں وہی باعثِ ننگ قرار پائی۔ مگر بھلا اللہ اب دنیا فہم کے جس نقطہ پر آچکی ہے وہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ آج جس چیز کے ماننے کے لئے عالم مضطرب ہے، اسلام صدیوں پہلے اس نظریہ کو پیش کر چکا ہے اور عمل کر کے دکھا چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ٹھٹھیروں کو بھی اسلام نے جب تخت و تاج کا مالک بنایا تو صفاریت کے لقب کو انھوں نے بطور فخر کے استعمال کیا، اور غلاموں کی جو قدر و عزت اسلام میں ہوئی دنیا کی تاریخ اپنے پاس اس کی نظیر نہ اس سے پہلے رکھتی ہے اور نہ بعد۔ تقریباً ائمہ حدیث و فقہ کی بڑی جماعت موالی ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ صرف دین ہی میں نہیں، مختلف مقامات میں دنیا کے حساب سے بھی دنیوی ارتقاء کے آخری نقطہ سلطنت و بادشاہت تک غلاموں کو عروج پاتے ہوئے تم مسلمانوں میں پائے جاتے ہو۔

لیکن باوجود اس کے ذلت کی وجہ سے نہیں بلکہ بعض پیشوں کا چونکہ گندی اور سجا ست سے تعلق ہے اس لئے چند خاص پیشوں کے متعلق علمائے اسلام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے جن میں ایک تو سنگھی لگانے (جماعت) کا پیشہ ہے۔ چونکہ سنگھی لگانے والے خون کو چوستے ہیں اور خون نجس چیز ہے۔ اس لئے بعض حدیثوں میں آیا ہے۔

کسب الحجاء خبیث۔ سنگھی لگانے والے کی کمائی گندی ہے۔

لیکن باوجود اس کے بھی اکثر ائمہ اسلام نے اس کی اجرت اور مزدوری کو حلال ہی قرار دیا ہے۔ علامہ مقدسی نے اجورہ مباح یعنی سنگھی لگانے کی مزدوری حلال ہے۔ لکھنے بعد ارقام فرماتے ہیں۔

ہذا قول ابن عباس قال

انا اكله وبه قال عكرمة

والقاسم و ابو جعفر و محمد بن

علی بن الحسین و ربیعہ و مالک

والشافعی و اصحاب الرأی۔

یہ ابن عباس کا قول ہے، انھوں نے فرمایا کہ میں اس کو کھاتا ہوں اور یہی فتویٰ

نکیرہ قاسم ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین اور ربیعہ امام مالک امام شافعی اور اصحاب رائے (ابو حنیفہ) کا ہے۔

اگرچہ بعضوں کو اس سے اختلاف بھی ہے۔ تاہم یہ اختلاف حجام کے صرف سنگھی لگانے کے کام کی حد تک

محدود ہے، باقی عموماً حجام جو دوسرے کام کرتے ہیں ان کے جواز میں تو کسی کو کلام ہی نہیں ہے، مقدسی کا بیان ہے

استیجاراً لحجام بغير الحجامۃ

کالقصد و حلق الشعر و

تقصیرہ و الختان و قطع شیء

یہ بچھنا لگانے کو چھوڑ کر حجاموں کے یہ کام یعنی قصہ کا کام، بال موڈ لگانے کا کام یا تراشنے کا یا ختنہ کرنے کا یا جسم کے کسی

من الجسد للحاجة فجائز۔ حصہ کے کاٹنے کا اگر ضرورت پیش آئے

تو اس کی مزدوری جائز ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک اور چیز کا تذکرہ بھی فقہائے اسلام نے کیا ہے، یعنی خاکروبوں اور بھنگی کا کام ظاہر ہے کہ اگرچہ یہ بھی ایک قسم کی مزدوری ہے۔ لیکن بھنگیوں کو چونکہ نجاست سے کام پڑتا ہے اس لئے علماء نے اس پیشہ کو اچھا نہیں خیال کیا ہے۔ ابن عباس کا ایک اثر بھی اس باب میں نقل کیا جاتا ہے کہ حج سے فارغ ہو کر ایک آدمی ان کے پاس آیا اور بولا کہ

اُكْتِسْتُ فَمَا تَرَى فِي مَكْسِيٍّ۔ میں صفائی کا کام کرتا ہوں، میرے

پیشہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ابن عباسؓ نے پوچھا

اَتَى شَيْءٌ تَكْسُ (کس چیز کو صاف کرتے ہو) بولا العذرۃ (یعنی غلاظت) کو صاف کرتا

ہوں اور آگے اس پر اس نے اضافہ بھی کیا،

ومنہ حجبت ومنہ تزوجت اس کی مزدوری سے میں نے حج بھی

کیا اور شادی بھی کی۔

یہ سن کر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سخت کراہت پیدا ہوئی غصہ میں بولے۔

انت خبیث وحجک خبیث و تو بھی گندہ تیرا حج بھی گندہ اور جو تو نے

ما تزوجت خبیث۔ شادی کی وہ بھی گندی۔

لیکن باوجود ابن عباس کے اس سخت فتویٰ کے علماء نے اس "خبث" کا مطلب مذہبی "خبث" نہیں لیا ہے بلکہ طبعی خبیث اور کراہت مراد ہے، اسی لئے عام خیال یہی ہے کہ

الاجارة فجائزة لان الحاجة غلاظت صاف کرنے کی مزدوری جائز ہے

داعية اليها لاتندفع الا کیونکہ ضرورت کا تقاضا ہے کہ جب تک

باباحة الاجارة فوجبت اباحتها اس کی مزدوری حلال نہ ہوگی یہ ضرورت

كالجمامة (المغنی ص ۱۳۶) پوری نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کا حلال

ہونا ضروری ہوا جیسے سنگھی لگانے کی مزدوری حلال ہے۔

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

کھاد جس میں ہر طرح کی نجس چیزیں شریک ہوتی ہیں گوبر، غلاظت وغیرہ، لیکن مشہور صحابی یعنی فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کتب بول میں یہ نقل کرتے ہیں کہ

كان سعد بن ابی وقاص حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ یحمل کھاد خود اٹھا کر اپنے کھیت میں ڈالتے

عرة الى ارض له وكان يقول تھے جو ان کی ملکیت میں تھا اور فرماتے کہ

”ایک ٹوکرے کھا د کی گیہوں کی ایک

سعد مکتل عرۃ مکتل بر۔

ٹوکرے ہے۔“

(بیہقی ص ۱۳۹ ج ۲)

عرہ کی شرح اصمعی کے حوالہ سے بیہقی نے نقل کیا ہے کہ عذرۃ الناس کو کہتے ہیں، یعنی غلاظت ! ظاہر ہے کہ خالص غلاظت تو وہ نہیں گے بلکہ مختلف چیزوں کو ملا کر کھا د تیار کرتے تھے، ترکاری کی کھا د کا ذکر ابن سعد میں بحوالہ ابو العالیہ یہ ہے کہ الخمر والبول والحائض ص ۸۴ ج ۴۔ یعنی پرندوں کی بیٹ، پیشاب اور حیض کے لئے۔ اس لئے بعض صحابہ کھا د ڈالنے کو ناپسند کرتے تھے۔ ابو العالیہ بھی عموماً ساگ پات ترکاری اس لئے کم کھاتے، البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بصرہ میں جو باغ تھا اس سے تحفہ جب ترکاری آتی تو شوق سے کھاتے شاید بغیر کھا د کے اگائی جاتی ہوگی حضرت انس کے اس باغ میں، لکھا ہے کہ ایک پھول تھا جس سے مشک کی بو آتی تھی (ابن سعد ص ۱۷۱ ج ۴)

اسی قسم کی ایک ”گندہ اجرت“ جس کا جاہلیت میں غالباً رواج تھا اور اسے اصطلاحاً ”عسب الفحل“ کہتے تھے۔ یعنی اونٹ، بکری، گھوڑے وغیرہ کا جس کے پاس نر جانور ہوتا، وہ بچہ کشی کے لئے اس نر کو کرایہ پر چلاتا تھا۔ فقہاء نے اس معاوضہ کو مکروہ لکھا ہے اگرچہ ضرورت کی وجہ سے بعضوں نے اجازت بھی دی ہے۔ بہر حال اگر معاہدہ کے طور پر نہیں بلکہ بطور ہدیہ کے نر کے مالک کو کچھ دیدیا جائے اس میں حرج نہیں سے لکھا ہے،

اپنے نر کو کوئی اگر بغیر کسی اجارہ اور

۲ ن ۲ طرق ۲ انسان فحلہ

شرط کے چھوڑے اور اس کے بعد

بغیر اجارۃ ولا شرط فاحکمت

کوئی تحفہ دیا جائے یا کوئی عزت افزائی

لہ ہدیۃ ۲ او اکرم بکرامۃ

ہو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لذلک فلا باس یہ۔ (ص ۱۳۲)

خلاصہ یہ ہے کہ بجز ایسی چیزوں کے جن سے استفادہ ہی کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً زنا، گانا بجانا، نوحہ گرمی، تصویر کشی وغیرہ۔ چونکہ یہ سارے کام بھی اسلامی نقطہ نظر سے برے ہیں، اس لئے ان کو بھی حصولِ معاش کا ذریعہ بنانا جائز نہیں ہے۔ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ائمہ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے لصوص اور اسلامی مستندات کی بنیاد ہی پر کہا ہے ورنہ جہاں کہیں تھوڑی سی بھی گنجائش نظر آئی ہے سبھوں نے نہیں تو بعض ائمہ نے معاش کی اس راہ کو بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔ فقہائے اسلام نے اس باب میں کس حد تک وسعت نظر سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے کہ شراب جیسی حرام چیز کے متعلق اوروں کا تو نہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہ کا یہ فتویٰ کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے۔

اگر کسی غیر مسلم ذمی کی شراب (مسلمان) ڈھوئے

من حمل لذیذ خمر فانہ یطیب

تو مسلمان کے لئے اس ڈھونے کی مزدوری

لہ الاجر عند ابی حنیفہ۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک پاک ہے۔

(کتاب الکراہتہ ہدایہ ص ۳۷۵ ج ۲)

امام صاحبؒ کے خیال کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ شراب کا پینا حرام ہے اور پینے کی نیت سے اس کا ڈھونا بھی حرام ہے۔ لیکن اس مسلمان بیچارے کی غرض تو مزدوری ہے خواہ پانی ہو یا شراب۔ پھر اس کی مزدوری کو کس بنیاد پر ناپاک قرار دیا جائے۔ لیکن اور تو اور امام صاحب کے دونوں شاگرد ابو یوسف و محمد بن حسن کا فتویٰ اس کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں چونکہ شراب کے سلسلہ میں جن جن لوگوں پر لعنت کی گئی ہے ان میں حاملہا اس کے ڈھونے والے کا لفظ بھی ہے۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ جو خود پینے کے لئے شراب ڈھوئے اس کے ساتھ یہ حکم مخصوص ہے۔ بہر حال مجھے اس مثال سے فقہاء کی معاشی وسعت نظری کا ثبوت پیش کرنا تھا اور یہ اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ مگر باوجود ان وسعتوں اور اجازتوں کے دو چیزیں فقہاء کی کتابوں میں عجیب پائی جاتی ہیں، یعنی ایک تو یہ کہ مسلمان کیا کسی کافر کی ملازمت اور نوکری کر سکتا ہے؟ یہ سوال اٹھایا گیا تھا اور بدقسمت مسلمانوں کے متعلق کیا معلوم تھا کہ کبھی ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جواب تو جواب سوال بھی دماغوں سے نکل جائے گا۔ حتیٰ کہ بالآخر ان کی ساری قومی اور ملی کوششوں کا آخری محور یہی مسئلہ رہ جائے گا کہ غیر اسلامی حکومتوں میں ملازمت کے حقوق کی کتنی مقدار ان کو حاصل ہونی بیغنی کے متن کا مسئلہ ہے۔

لا تجوز اجارة المسلم
للذمی لخدمته نص عییه
احمد۔

مستمان کو ذمی کا فراہمی خدمت کے
کے لئے نوکر رکھے یہ جائز نہیں ہے۔
امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے۔

دلیل یہ بیان کی ہے کہ یہ

حلیس ۲ مسلم عند ۲ الکافر
و ۲ ذلالہ لہ۔

یہ مسلمان کا کافر کے پاس قید ہونا بھی
ہے اور مسلمان کو ذلیل کرنا بھی ہے۔

مجھے مسئلہ کے ذکر سے اس وقت جواز و عدم جواز کی تحقیق مقصود نہیں ہے۔ آخر اسے اگر جائز نہ قرار دیا جائے گا تو مسلمانوں کے جینے کی شکل ہی کیا رہے گی، بلکہ دکھانا کسی قوم کے تاریخی انقلاب کا ہے۔

اور اللہ جب کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ فرماتا ہے۔ تو پھر اسے کوئی پٹا نہیں سکتا اور نہ اس کا کوئی

والی و مددگار ہوتا ہے۔

اسی سلسلے کے ایک مسئلہ کا ذکر آخر میں اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ فقہائے امت کی بلند نظری کا
لوگوں کو کچھ احساس ہو اور معلوم ہو کہ اسلامی معاشیات کی تدوین میں ان بزرگوں نے کتنی
بے لوثی سے کام کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان بزرگوں کا کام ہی قرآن و حدیث کی تدریس و
تعلیم یا مساجد کی امامت و خطابت وغیرہ تھا۔ اور اب بھی بیچارے مولویوں کا یہی کام ہے مگر باوجود

اس کے حیرت ہوتی ہے کہ چند لوگوں نے نہیں بلکہ اکثر ائمہ اسلام کا فتویٰ ان تمام امور کے متعلق یہ ہے کہ ان خدمات کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ جن کاموں پر معاوضہ لینا درست نہیں ہے ان میں "الامامة والاذان والحدیج وتعليم القرآن" بھی ہے اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

رضی علیہ السلام و بہ قال
عطاء و الضحاک بن قیس
امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے
اور یہی فتویٰ ضحاک بن قیس، ابو حنیفہ
و ابو حنیفہ و الزہری۔
اور زہری کا ہے۔

فقہ کی کتابوں میں اس پر بحث کی گئی ہے اور بالآخر زمانے کے حالات کا اندازہ کر کے جواز کا فتویٰ اس بنا پر دے دیا گیا کہ چند ائمہ مثلاً شافعی، مالک جواز کے قائل تھے۔ آخر اگر اس کا فتویٰ نہ دیا جائے تو مفت حسبہ اللہ ان خدمات کو انجام دینے کے لئے کون آمادہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو کچھ گذشتہ ہزرگوں ہی کی ہمت تھی کہ معاش کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کر کے دین کی ان خدمات کو مفت انجام دیتے تھے لیکن ع زمانہ دیگر گو آئین نہاد

مزارعت و مساقات | چاہیے تو یہی تھا کہ ان دونوں معاملات کا ذکر بھی اجارہ ہی کے ذیل میں کر دیا جاتا۔ کیونکہ اس کا تعلق بھی محنت و مزدوری سے ہے۔ لیکن کچھ تو اس لئے کہ عموماً فقہاء اسلام ان دونوں کو الگ الگ کر کے لکھتے ہیں۔ اس لئے میں بھی ان کا علیحدہ ذکر کرتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ محنت و سرمایہ میں جو جھگڑا اس وقت دنیا میں جاری ہے اس سلسلہ میں جس طرح صنعتی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے اختلاف کے حل کی ایک شکل اسلام نے پیش کی ہے جیسا کہ گذر چکا کہ مزدور اور سرمایہ دار کی معاشرتی زندگی کم از کم ہونے کی حد تک ایک ہو۔ یا یوں کہئے کہ مزدوری مزدوروں کو اتنی ملنی چاہیے جس کے ذریعہ سے ان کی خوراک اور ان کا لباس سرمایہ دار کی خوراک اور لباس کے برابر ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مزدور کو منافع سے بھی کچھ حصہ ملنا چاہیے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مزدوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ یعنی سرمایہ دار کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ محض مصارف کے ڈر سے زیادہ مشقت کے کام کو چند ہی مزدوروں سے لے بلکہ ان کی اعانت کے لئے قوت کا اضافہ کرے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کام کا وقت اسی قدر مقرر کیا جائے جتنا کہ وہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ صحاح کی صحیح روایتوں سے یہ تینوں نتائج برآمد ہوتے ہیں قریب قریب کچھ اسی قسم کا مسئلہ زمین کے سرمایہ داروں اور مزدوروں کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ قبل اسلام عرب خصوصاً مدینہ و اطراف مدینہ میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان

مختلف قسم کے معاملات جاری تھے مثلاً

(۱) زمین میں کچھ بھی پیدا ہو مگر زمیندار کو بہر حال بیس من فی بیگہ مثلاً کاشت کار ادا کرے گا اسی کو مزارعت بجز معلوم کہتے ہیں۔ اس کی بھی دو صورتیں تھیں، اسی کھیت سے غلہ کی اس مقدار کو ادا کرے گا یا خود گھر سے دے گا۔

(۲) زمین کے اچھے قطعات کی پیداوار زمیندار کو ملے گی اور معمولی خراب پیداوار قطعہ کا مستحق کاشت کار ہوگا۔

(۳) جو کچھ پیدا ہو اس کا نصف یا ثلث جو بھی ملے ہو جائے کاشت کار کو ملے گا۔ گویا یہ ساری شکلیں بٹائی کی عرب میں مروج تھیں۔ لیکن نقدی بند و بست یعنی فی بیگہ کاشت کار سالانہ مثلاً دو روپے، چار روپے الغرض جو ملے ہو جائے ادا کرے گا اور کل پیداوار کا وہ مالک ہوگا۔

نقدی کی یہ شکل بھی عرب میں مروج تھی یا نہیں، اس کا اب تک صاف صاف پتہ نہ چلا رافع ابن خدیج جن کا گھرانہ مدینہ کے سب سے بڑے کاشت کاروں میں تھا، ان کے ایک بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم مدینہ کے لوگ اس سے واقف نہ تھے۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹائی کے نمبر (۱) اور نمبر (۲) دونوں طریقوں کو غیر قانونی قرار دیا۔ کیونکہ بسا اوقات ان میں سے بے چارے کاشت کار کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ گھر سے تاوان ادا کرنا پڑے۔ تمام فقہاء اسلام بلا استثناء بٹائی کی ان دونوں شکلوں کے ناجائز ہونے کے قائل ہیں۔

البتہ تیسری شکل اس کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ جو کچھ من دو من دس من کھیت میں پیدا ہو، اس کا ثلث یا نصف بانٹا جائے اس میں کاشت کار کے نقصان کی شکل نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اس کو گھر سے کچھ دینا نہیں پڑتا۔ البتہ اگر کچھ پیدا نہ ہو تو تخم اور محنت دونوں اس کی ضائع ہو سکتی ہیں۔ مگر زمیندار کی زمین بھی چونکہ اس کی کاشت کی وجہ سے بے کار رہی۔ اس کو نہ معاملہ برابر برابر سا ہو جاتا ہے پھر بھی ائمہ اسلام میں اکثروں کا اسی وجہ سے یہ خیال ہے کہ ایسی صورت میں تخم بھی زمیندار ہی کو دینا چاہیے۔ معنی میں ہے،

کھیتی کا معاملہ اسی وقت درست

ہو سکتا ہے جب تخم مالک زمین (زمیندار) کا

ہو، اور محنت کاشت کار کی۔ امام

احمدؒ نے اسی کی تصریح فرمائی ہے

جیسا کہ ایک جماعت کی ان سے روایت

ہے اور عام اصحاب احمدؒ نے اسی کو

اختیار کیا، یہی ابن سیرینؒ اور امام

۲۱ المزارعة ۲۲ انما تصح ۲۳

کان البذر من رب الارض

والعامل لضرعہ

۲۴ احمد فی مسراۃ جماعۃ

واختارہ عامۃ الاصحاب

وہو مذہب ۲۵ ابن سیرین

والشافعی ۲۶ اسحاق۔

شافعیؒ اور اسحاق کا مذہب ہے۔

۱۲ یكون مثل س المال كله
من عند احد هما
تاکہ کل سرمایہ (زمین و تخم) دونوں
میں ایک ہی کا ہو۔

اگرچہ کچھ لوگ یہ بھی جائز قرار دیتے ہیں کہ تخم بھی کاشت کا رکھا ہو تو کچھ حرج نہیں۔
نقدی طریقہ | یہ ظاہر یہ صورت ہر دو فریق کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔ مگر عملی تجربہ بتاتا ہے کہ
زیادہ مفید ہے | عموماً بٹائی کی اس شکل میں کاشت کا رجبی لگا کر زمین میں محنت نہیں کرتا وہ بیچارہ
یہ خیال کرتا ہے کہ جوتے، بولنے، پانی دینے، گھاس اکھاڑنے، کاٹنے، دانہ نکالنے وغیرہ کا سارا
کام تو میں کروں گا یا کوئی قیمتی غلہ اس میں لگاؤں گا تو اس کا بھی کیا حاصل، اس لئے کہ میری
محنت کا ایک بڑا حصہ زمیندار محض اس لئے لے جائے گا کہ اس کی زمین ہے۔ اولاً یوں ہی یہ حصہ جو
اس کا کمایا ہوا ہے، دیتے ہوئے جبرگذرتا ہے۔ ثانیاً وہ جانتا ہے کہ میری زیادہ محنت یا زیادہ
قیمتی پیداوار سے کیا نفع کہ اس محنت کا بڑا حصہ تو دوسرے کے گھر پہنچے گا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بٹائی
کی زمینوں پر ان ہی وجوہ سے کبھی کاشت کا رپوری تن دہی سے محنت نہیں کرتے۔ بلکہ ایک اور
طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ بہت سی زمین مختلف زمینداروں سے لے کر کاشت کر لیتے ہیں۔ پوری
توجہ کسی پر نہیں کرتے، سمجھتے ہیں کہ ہوا تو خیر ہمیں کچھ تو مل ہی جائے گا۔ اور نہ ہوا تو ہمارا کیا
بگڑے گا۔ خصوصاً جب ان فقہار کی رائے اختیار کی جائے جو تخم بھی زمیندار کے سر ڈالتے ہیں
کاشت کاری کا یہ بڑا اہم راز ہے جو براہ راست اس کا تجربہ نہیں رکھتے وہ اس کو شاید سمجھ ہی نہیں
سکتے۔ البتہ کاشت کاروں کے لئے بہترین اطمینان بخش شکل نقدی بندوبست کی ہے۔ یعنی فی بیگہ کوئی
معین رقم طے کر کے ان کو زمین دیدی جائے۔ ایسے کھیتوں پر کاشت کار پورا زور لگا دیتا ہے کیونکہ
رقم تو اس کو بہر حال دینی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ نفع ہم زمین سے اٹھا سکتے
ہوں اس میں کمی نہ کریں۔ بجائے ایک فصل کے دو دو تین تین فصل تک ایک ایک کھیت سے اٹھانے
کی کوشش کرتا ہے اور یہ مشاہدہ ہے کہ جس کھیت سے بٹائی کی صورت میں کاشت کار تین چار
من غلہ بھی سالانہ پیدا نہیں کرتا تھا نقدی کی صورت میں اسی کھیت سے دو دو سو تین تین سو روپے
پیدا کر لیتا ہے۔ اچھی سے اچھی قیمت کی چیزوں کی کاشت کرتا ہے۔

بہر حال یہ تو کاشت اور اس کی بندوبست کے مختلف طریقے ہیں اور جیسا کہ میں نے عرض
کیا۔ یوں تو بٹائی کی مذکورہ بالا شکل عام علماء اسلام کے نزدیک جائز ہے۔ مگر حدیثوں کے دیکھنے
سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ جب عموماً صحابہؓ میں بٹائی کا طریقہ مروج تھا اور بقول امام بخاری،
ما بالمدینۃ اهل بیت الا و
یزرعون علی الثلث والرابع۔
مدینہ میں شاید ہی کوئی گھرا نا ہوگا جس میں
تہائی اور چوتہائی پر کھیتی نہ ہوتی ہو۔

وزراع علی وسعد بن مالک
وابن مسعود وعمر بن عبد العزیز
وقاسم وعروة والابی بکرو
ال عمر وال علی وابن سیرین
وقال عبد الرحمن بن الاسود
كنت اشارك عبد الرحمن
بن یزید فی الزراع -
(البیہقی ص ۱۳۵ ج ۲)

اور حضرت علی حضرت سعد بن مالک و
ابن مسعود و عمر بن عبد العزیز قاسم اور
اور عروہ اور حضرت ابو بکر کے گھرانے والے
حضرت عمر کے گھرانے والے حضرت علی
کے گھرانے والے اور ابن سیرین سب ہی
کاشت بند و بست کرتے تھے عبد الرحمن
بن اسود لکھتے ہیں کہ میں عبد الرحمن بن یزید
کے ساتھ بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔

جس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ عہد صحابہ میں کاشت کاری کا رواج کس پیمانہ پر تھا۔ وہیں اس سے
بٹائی پر کاشت کاری کا بھی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کو ناجائز کہنے
کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مخفی منشاء کا بھی پتہ
چلتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ وہی رافع ابن خدیج جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جن کا گھرانہ مدینے
کے سب سے بڑے کاشت کاروں کا تھا ان سے ایک روایت عہد صحابہ میں مشہور ہوئی جس کے
الفاظ مختلف ہیں۔ ایک طریقہ اس کا درج کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
انما یزراع ثلاثة رجل له ارض
فھو یزار عھا ورجل منھ اخا
ارضاً فھو یزراع ورجل اکثری
بذھب وفضة (الطحاوی)

کھیتی تین ہی قسم کے آدمی کر سکتے ہیں
ایک تو وہ جس کی زمین ہو اور اس میں
کھیتی کرے، دوسرا وہ جسے اس کے
بھائی نے زمین دی ہو اور وہ اس میں کھیتی

کرے، تیسرا وہ آدمی جو زمین کو سونے یا چاندی کے معاوضہ میں کرایہ پر لے۔

حضرت رافع نیز حضرت جابر بن عبد اللہ دونوں صحابیوں سے اس باب میں اس قسم کے الفاظ مروی ہیں۔ حاصل
ان سب کا یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس زمین ہو تو یا اس میں خود کاشت کرے اور اگر خود نہیں کرتا تو پھر
اس کے لئے کل دو صورتیں ہیں، یا تو اپنے کسی بھائی کو مفت کاشت کرنے کے لئے دیدے، اور یہ
بھی پسند نہ ہو تو سونے یا چاندی کی شکل میں اس کا کرایہ لے۔ یعنی نقدی بند و بست کر دے۔ جس کے
معنی یہی ہوئے کہ بٹائی کی مذکورہ بالا شکل کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باقی رکھنا نہیں چاہتے تھے
بلکہ جس طرح پس ماندہ سرمایہ کو قرض میں دلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیرات کی مدوں میں ایک
جدید مد کا اضافہ فرمایا ہے، اسی طرح زائد زمین کے متعلق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کے ایک
نئے باب کو کھولا ہے جس سے شاید دنیا اب تک ناواقف ہے ٹھیک جس طرح قرض کی صورت میں
مقروض سے کسی قسم کے نفع اٹھانے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اسی طرح زائد زمین جو بطور حسن سلوک کے

دی گئی ہو، اس سے نفع اٹھانے کی ممانعت ہے۔ ان ہی رافع سے کسی نے پوچھا تھا کہ اگر ہم زمین میں کچھ نہ بویں اور نہ کسی کے ساتھ نقدی بند و بست کریں اور کسی دوسرے نے اس میں کاشت کی پھر اگر وہ بلی من بناتھا شیئاً اخذہ

اس کی روئیدگی سے مجھے کچھ جزدے کیا

میں اسے لے سکتا ہوں بولے نہیں۔

قال لا (الطحاوی)

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث کے الفاظ یہ ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانے میں بعض لوگوں کے پاس

زائد از ضرورت زمینیں تھیں، عموماً

لوگ نصف یا تہائی چوتھائی پر

اپنی زمینوں کو بند و بست کر دیا کرتے

تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا جس کے پاس زمین ہو اس میں

وہ خود کاشت کرے ورنہ پھر اپنے کسی

بھائی کو دیدے اور اگر اس سے وہ انکا

کرتا ہے تو پھر رک جائے۔

قال کان لرجال من فضول

۲ ارضین علی عہد

۲ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم فکانوا

یو۲ جرونها علی ۲ النصف

و ۲ الثلث و ۲ الربع فقال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

من کان لہ ۲ ارض فلینزعھا و

لیمنع ۲ احدا فان ۲ ابی فلیمسک

(طحاوی)

(فضول ارضین) یعنی زائد از کاشت زمین اگر زمیندار کے پاس ہو تو ایک صورت یہ ہے کہ آخرت کے لئے اس میں کاشت کرائے اور ثواب کی خدا سے توقع کرے، اور یہ نہ ہو سکے تو جیسا کہ حضرت رافع سے مروی ہے زمین کو نقدی بند و بست کر دے۔

مساقات اور یہ حال تو زراعت یعنی کاشت کا ہے، قریب قریب یہی نقطہ نظر اسلام میں مساقات یعنی باغات اور تاکستانوں کے متعلق ہے کہ عموماً فقہاء یہ جائز قرار دیتے ہیں کہ مالک باغ کسی کو اپنا باغ اس شرط سے بند و بست کرے کہ جو کچھ پھل آئے نصف و ثلث کے حساب سے تقسیم کر لیا جائے گا۔ البتہ مالک باغ کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ کوئی متعین حصہ پھلوں کا مثلاً یہ کہ چار سو آم یا دو ہزار جام اس معاملہ

۱۵ ان دونوں حدیثوں کے سوا حدیث کی کتابوں سے اور بھی مواد فراہم کیا جاسکتا ہے جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین کو آدمی خود جوتے یا بلا کر ایہ کسی کو دیدے۔ یعنی یہ بات کی نقدی بھی کچھ نہ لے بعض حدیثوں میں اس پر ”بولو“ کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ زمینداروں کے اس طبقہ کو جو نہ خود کاشت کرتے ہیں اور نہ مفت دوسروں کو دیتے ہیں، بلکہ زمین کا کرایہ بہ شکل نقد یا غلہ کھاتے ہیں۔ کیا اسلام اس طبقہ کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ یہ ایک اہم معاشی سوال ہے اور اس پر بحث کی کافی گنجائش ہے ۱۶

۱۵ جام حیدر آباد میں امروہ کو کہتے ہیں ۱۶

مستثنیٰ نہیں گئے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے باغ میں اسی قدر پھل آئے۔ پھر بیچارے باغ لینے والے کو اپنی محنت کا کیا صلہ ملے گا۔ وہ سال بھر اس میں پانی دے گا، درختوں کو چھانٹے گا، حفاظت کرے گا اور مالک باغ اس ناجائز شرط کی بناء پر پوری آمدنی اس کی لے لے گا۔

لیکن باوجود اس عمومی جواز کے خصوصیت کے ساتھ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مشہور اماموں میں ایک ایسے امام گذرے ہیں جو کاشت ہو یا باغ یعنی زراعت ہو یا مسافات دونوں صورتوں میں بٹائی کے طریقہ کو ناجائز قرار دینے پر مصر ہیں، ان کا مذہب اس باب میں نہایت تعجب سے یہ نقل کیا جاتا ہے۔

۲۱ لا یجوز ۲ طساقاۃ
ولا ۲ المز ۲ دعة ۲ لا
بالدر ۲ اھم والدانیر
وما ۲ شبھاھا۔

باغبانی کا معاملہ اور کاشت کاری کا
معاملہ ہر دو صورت کے جواز کی شکل
اس کے سوا نہیں ہے کہ ان کو درم
و دنیا وغیرہ (نقدی) کی شکل میں

(لمحاوی) بندوبست کیا جائے۔

اب تک تو دنیا نے امام کے اس خیال پر حیرت کا اظہار کیا ہے حتیٰ کہ ان کے دونوں مشہور شاگرد محمد بن حسن و قاضی ابو یوسف تک کے متعلق طحاوی کو لکھنا پڑا کہ

و ۲ ما ۲ ابو یوسف و محمد بن
الحسن رحمہما اللہ قد ذھبا
۲ لی جوازھا جمیعاً۔

لیکن ابو یوسف اور محمد بن حسن دونوں
کے دونوں (غیر نقدی شکل) کے
سوا بھی ان معاملات کے جواز کے

قائل ہیں۔ یعنی بٹائی پر بھی معاملہ ہو سکتا ہے۔

مگر اب شاید دنیا کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔ بٹائی سسٹم نے کتنی زمینوں کی زرخیزیوں کو روک رکھا ہے۔ اس اندیشے سے جو کچھ بویا جائے گا اس کے ایک بڑے حصے کا مالک زمیندار ہو جاتا ہے جو لوگ زمینداری اور کاشت کاری کے معاملات سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ کسانوں کی ہمتوں کو اس چیز نے کتنا پست کر رکھا ہے کہ مذکورہ بالا خوف سے نہ کھیتوں پر پوری محنت کرتے ہیں نہ قیمتی پیداواروں کے لگانے کی ان میں جرات ہوتی ہے۔

۱۵ موجودہ زمانے میں اس صورت حال کو دیکھ کر زمیندار جب چاہتا تھا کسان کو بے دخل بھی کر سکتا تھا اور اس پر لگان بھی بڑھا سکتا تھا۔ ایک تجویز سوچی گئی اور کچھ دن سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس پر عمل ہو رہا ہے کہ کم از کم کسانوں کو بے دخل کرنے کا اختیار زمین دار کو نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اب کسان جو یہ کرنے لگے ہیں کہ کچھ خود جوتے ہیں اور کچھ دوسروں کو نفع کی شرکت کی شرط پر بندوبست کر دیتے ہیں یا بعض تو باوجود کاشت کار ہونے کے کچھ زمین دوسرے کسانوں سے آباد (باقی بر صفحہ آئندہ)

خدا کی زمین اپنی سرسبزی و شادابی اور اپنی نفع بخشی میں بہت آگے بڑھی ہوتی اگر امام کے اصول کو مان لیا جاتا۔ تاہم جیسے جیسے صنعتی کارخانوں سے مزدور و سرمایہ کا سوال آگے بڑھ کر اب زراعتی مزدور و سرمایہ داروں کے درمیان اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ اسلام کے معاشی اصول بھی اپنے مقاصد سے نقاب الٹا رہے ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ چل کر دینا کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورے پر یعنی،

من کانت لہ ارض فلینزعہا
اولہمخ احاح فان ابی
فلہسک۔

جس کے پاس زمین ہو وہ اس میں
خود کھیتی کرے یا اپنے بھائی کو جو تنے
کے لئے دے دے اور اگر وہ

اس سے بھی انکار کرے تو پھر چاہئے کہ روک رکھے۔

یہ بھی غور کرنا پڑے گا کہ بے ضرورت جو لوگ زمینوں پر قبضہ کئے بیٹھے ہیں نہ خود اسے آباد کرتے ہیں نہ ملک کے دوسرے ضرورت مند افراد کو ان سے استفادہ کا موقعہ دیتے ہیں۔ آخر یہ سوال کب تک معائنہ فرمائیگا اس مسئلہ کے متعلق ابھی اور بھی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن میں بالفعل اسی پر بس کرتا ہوں ممکن ہے کہ اس کے متعلق بعض اجزاء کا ذکر حکومت کی آمدنی کے ذیل میں بھی آئے۔

— + —

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

کراتے ہیں جو خوف بے دخلی کا زمیندار سے کسان کو رہتا تھا۔ وہی دغدغہ اب کسان کے کسان کو اصلی کسان سے رہتا ہے۔ پس اگر یہ حل زمینداروں کے تباہ کرنے کے لئے سوچا گیا تو بڑھیک ہے۔ لیکن اگر کسانوں کی ہمدردی میں ایسا کیا گیا ہے تو آخر اس ہمدردی کا مستحق کسان کا کسان کیوں نہیں ہے۔ بالفرض وہی حق کسان کے کسان کو بھی دے دیا جائے جو آج زمیندار کے مقابلے میں کسان کو بعض صوبوں میں حاصل ہے تو اگر یہی حرکت کسان کے کسان بھی کرنے لگیں۔ یعنی دوسروں سے کھیت آباد کرائیں، اس وقت کیا ہوگا۔ آخر دور و تسلسل کے قصبہ کو کہاں ختم کیا جائے گا۔ نیز مختلف افراد میں زمینوں کی مختلف مقدار کے آباد کرنے کی صلاحیت مختلف وجوہ سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً سرمایہ کی زیادتی یا گھرانے کا بڑا ہونا، اس لئے ہر کسان کے لئے کھیت کی مقدار کا معین کرنا بھی ملک پر ظلم ہوگا۔ میرے خیال میں تسلسل کے اس قصبے کو چھوڑنا ہی غلط تھا ۱۲

حکومت کی آمدنی

اور

اس کے مصارف و اغراض

حکومت کی آمدنی پر بحث کرنے سے پہلے دراصل غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کے زور سے سرکاری خزانوں میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اس کے اغراض کیا ہیں یا کیا ہونا چاہئیں۔ جہاں تک تاریخ اور مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کبھی تو یہ آمدنی محض اس لئے جمع کی جاتی ہے کہ جن لوگوں نے زمین کے کسی حصہ پر کسی ذریعہ سے اپنا ایسا اقتدار قائم کر لیا کہ عام باشندوں سے ان کے مطالبوں کا انکار جان و مال کے لئے خطرہ بن جاتا ہے۔ اب ان کا نام خواہ کچھ رکھ لیا جائے راجہ یا بادشاہ یا کنگ یا کچھ اور۔ بہر حال محض ان کے اور ان کے اعزہ و اقرباء حوالی و موالی کے عیش و آرام کا مہیا کرنا ہی ان کی حکومت کی آمدنی کی غرض ہوتی ہے۔ حکومتی آمدنی کے متعلق تنگ ترین نقطہ نظر جو ہو سکتا ہے وہ یہی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ دنیا نے اس کا متناظر اکثر دیکھا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جو نصب العین اس آمدنی کا ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آمدنی کو دشمنوں کے خطرات سے محفوظ رکھنے اور آمدنی پیدا کرنے والوں کو اطمینان و فراغت کے ساتھ دولت کی پیدائش میں مشغول رکھنے کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے وہ بھی اس آمدنی سے پوری کی جائے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہئے کہ شاہی مصارف کے سوا کشوری (مثلاً عدالت پولیس) اور فوجی مدات پر خزانہ کار روپیہ صرف کیا جائے۔ پہلی غرض سے ظاہر ہے کہ یہ دوسری غرض اپنے اندر ذرا زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس وسعت کی بھی آخری غرض وہی ہوتی ہے کہ راجہ یا بادشاہ اور ان کے خاندان کے افراد کے عیش و آرام میں خلل واقع نہ ہو۔

اس سے بھی چند قدم آگے بڑھ کر تیسرا نصب العین یہ ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا اغراض کے عام باشندوں کی مشترک ضروریات مثلاً صحت و تعلیم طریقہ مواصلات (سڑکیں، ریلوے، پوسٹ، ٹیلی گرام) وغیرہ اغراض پر بھی حکومت کی قوت سے جمع کردہ رقم صرف کی جائے۔ غالباً اس زمانہ کی

مہذب ترین حکومتوں کی آمدنی کا یہ بلند ترین نصب العین ہے جو قائم کیا جاسکتا ہے یا جیسا کہ کہا جاتا ہے بعض حکومتیں عملاً بھی حاکمانہ اغراض کی تکمیل کے لئے نہیں بلکہ محض محکوموں کی رفاہیت اور خیر اندیشی کے لئے اپنی آمدنی کا ایک بڑا مصرف اسی کو خیال کرتی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں عام طور پر حکومتوں کی آمدنیوں کے اغراض اس زمانہ تک عموماً مذکورہ بالا نصب العینوں سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ خواہ وہ حکومت قومی ہو یعنی اپنی قوم پر ہو یا کسی دوسری قوم پر۔

کیا حکومت کی آمدنی کے اغراض اس سے آگے بھی کسی وسعت نظری کو مقتضی ہیں۔ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا اغراض کے سوا جب یہ واقعہ ہے کہ ہر حکومت اپنے محروسہ و مقبوضہ علاقہ میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی کو بسائے رکھتی ہے۔ اور ان ہی آبادکاروں کی محنت و جانفشانی کی بدولت ایک ایک پیسہ دو دو پیسے اکٹھا کر کے کروڑوں روپیہ کا خزانہ جمع کر لیا جاتا ہے اور جب اس زمانے میں کم از کم یہ مان لیا گیا ہے کہ اقتداری قوت خواہ شخصی یا خاندانی رنگ میں ہو یا کسی جتنے اور ٹولی کی شکل میں ہو ان کے عیش و آرام بنگے و گیلے کے سوا حکومت کی آمدنی کا مصرف رعایا کی سہولتوں کا بھی بہم پہنچانا ہے۔ اسی لئے تعلیم و صحت وغیرہ کو بھی اب حکومتوں نے اپنے موازنوں کا جز بنا لیا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکاری خزانے جن غریبوں کی پیشانیوں کے پیسنے کے قطرے قطرے سے سمندر بنتے ہیں کیا ان کی ضرورتیں ان ہی عام پسک ضرورتوں تک محدود ہیں جن سے محکوموں کے ساتھ ساتھ حاکموں کو بھی نفع پہنچتا ہے سڑکوں پر اگر غریبوں کے جھٹکے اور بندیاں چلتی ہیں تو اقتداری قوتوں کی موٹریں اور جوڑیاں بھی تو آخر ان ہی سے گذرتی ہیں۔ جن ہسپتالوں سے غریبوں کو دوائیں ملتی ہیں ان ہی کے سرجنوں اور نائب سرجنوں سے حاکمانہ دائروں کو بھی تو ڈیکل ایڈ وقت پر میسر آتا ہے اور جن کالجوں اور اسکولوں میں ملک کے عام رعایا کے بچے خواہ کسی قیمت پر بھی ہو علم حاصل کرتے ہیں۔ ان ہی سے حکومت کو اپنی مختلف مشنری کے لئے پرزے بھی مہیا ہوتے ہیں۔ یقیناً ملک کے آبادکاروں کی ضرورتیں ان ہی مشترک اور عام ضرورتوں تک محدود نہیں ہیں۔

آخر ان ہی میں آئے دن کتنے بچے یتیم ہوتے ہیں۔ کتنے جوان بوڑھے ہو کر بیکار ہوتے رہتے ہیں۔ کتنی عورتیں بیوہ ہوتی ہیں۔ کتنے تاجر نقصان اور خساروں میں مبتلا ہو کر دیوالیہ بنتے رہتے ہیں اور سب سے آخر میں یہ کہ کتنے کاشتکار غریب کاشتکار آفات ارضی و سماوی میں شکار ہو کر قرض و وام کے بوجھ کے نیچے دب دب کر رہتے رہتے ہیں۔ کتنے جوان باوجود تلاش معاش کے بیروزگار پڑے پھرتے ہیں۔

کیا ان غریبوں کی یہ ضرورتیں ضرورتیں نہیں ہیں یا ان کا حال قابلِ رحم نہیں ہے۔ وہی اپنی کمائی سے حکومت کے خالی خزانوں کو معمور کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ بیچارے خالی ہوتے ہیں تو ان پر ترس کھائیوا لا کوئی نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ملک کی یہ ایسی ناگزیر ضرورتیں ہیں جو (محکوم و حاکم کی) ان مشترکہ ضرورتوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جن کا نام آج رفاہیات عامہ وغیرہ ہے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے بلند بانگ دعووں والی حکومتوں نے بھی کھل کر اس سوال کی طرف توجہ نہیں کی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حکومتوں کی موجودہ آمدنیاں اتنی کافی بھی نہیں ہوتیں جو حاکم نہ قوتوں کے گملوں اور بنگلوں کی تکمیل کے بعد اتنا بچا سکتی ہوں جس سے مشترکہ ضرورتوں کے سوال ملک کی ان شدید ضرورتوں پر بھی باضابطہ منظم شکل میں کچھ خرچ کر سکتی ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی انجمن ہائے امداد باہمی کی تجویزیں سوچی جاتی ہیں تاکہ ملک کے مقروضوں کا کچھ بوجھ ہلکا ہو۔ کبھی سرکاری سرپرستی میں بیمہ کمپنیوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے اور بیمہ کے ایجنٹ شہر بہ شہر گاؤں گاؤں میں پھر پھر کر مرے ہوئے یا یوں کی لاشوں کے سامنے یتیموں اور بیواؤں کی تصویریں کھینچوا کھینچوا کر ہر شخص کو ہول دل میں مبتلا کرتے پھرتے ہیں، کبھی مسئلہ بیروزگاری پر میدانوں میں یا پہاڑوں پر کمیٹیوں پر کمیٹیاں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ سوچا جا رہا ہے کہ آخر اس کا حل کیا ہے۔ کبھی سرکاری ملازمتوں کی نشان دہی کے لئے دفاتر قائم کر کے حکومت کے مصارف میں ایک اور جدید مصرف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

سردست مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ تدبیریں واقعی مفید ہیں یا بے حاصل اور نہ ان کی بعض شکلوں مثلاً بیمہ یا انجمن ہائے اتحاد باہمی میں جو سودی کاروبار لین دین جاری ہے اس کے متعلق اسلامی نقطہ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں بلکہ دکھانا صرف اس قدر ہے کہ ان ساری کوششوں سے اتنا بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ ملک کی ضرورتوں کا انحصار صرف ان ہی مشترکہ ضرورتوں میں نہیں ہے جنہیں آج "پبلک ورکس" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو انجمن ہائے اتحاد باہمی کا جال بیمہ اور انشورنس والوں کی نوحہ خوانیوں ماتم سرائیوں، بے روزگاری اور روٹی کے ڈھنڈوروں کی آخر تو چیہہ کیا ہوگی۔

الحمد للہ کہ اسلام نے جس وقت حکومت اور حکومت کے خزانے کی بنیاد ڈالی۔ بنیاد ہی کے وقت ملک کی ضرورتوں کا یہ سب سے آخری سوال اس کے سامنے پہلے آیا اور اس سوال کا حل بھی اس نے سب سے پہلے نکال لیا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جب اسلامی دعوت نے مذہبی دعوت کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تنظیم کی شکل بھی اختیار کی تو ظاہر ہے کہ نہ اس وقت ملک تھا نہ خزانہ صرف چند اللہ کے بندے تھے جو اپنے ذاتی مصارف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جنگ میں اترے (۳۱۳) سپاہیوں کو جو پہلی فتح بدر میں ہوئی اور خواہ جنگ کی تاریخ میں یہ کتنی ہی چھوٹی جنگ کیوں نہ ہو لیکن عالم کی تاریخ کے جتنے انقلابی فیصلہ کن معرکے ہیں ان میں یقیناً سب سے بڑا انقلابی معرکہ یہی تھا۔ اسی جنگ نے وہ فیصلہ کیا جو بالآخر تاریخ کا ایک اہم فیصلہ بن گیا اور اب تک بنا ہوا ہے۔

اس جنگ میں سب سے پہلے ایک ہزار سپاہی اور وہ بھی غریب عرب کے بھاگے ہوئے سپاہیوں کا
مسلمانوں کو کچھ سامان ہاتھ آیا اور یہی اسلامی حکومت کی پہلی آمدنی تھی۔ حکومت کی آمدنی کے متعلق
مسلمانوں کا نقطہ نظر آئندہ کیا ہونا چاہیے کیا اقتدار حاصل کرنے والوں کے عیش و آرام کا وہ ذریعہ
ہے یا اور کچھ ہے حالانکہ ابھی حاصل ہی کیا ہوا تھا لیکن ”گر بہ راز و زاول باید کشت“ و شرآن نے نازل
ہو کر اعلان کیا۔

یسئلونک عن الالاف قال
قل الالاف لله والرسول۔
لوگ انفال (جنگ کے حاصل شدہ مال)
کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ یہ اللہ کا
اور رسول کا ہے۔

کسی کا کچھ نہیں ہے صرف اللہ کا ہے اور اللہ کی مرضی کی نمائندگی چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کریں گے اس لئے رسول کا ہے اب تک جو دنیا کا نقطہ نظر اموال مفتوحہ یا حکومت کی آمدنی
کے متعلق تھا، اچانک بدل گیا جب وہ بدل چکا تب اس اجمال کی تفصیل کی گئی،

والمسلمون من ثلث ما غنم من شیء
فان لله خمسہ وللرسول
ولذی القربی ولایتامی
والمسکین وابن السبیل۔
اس کو جان لو کہ تم نے جو کچھ غنیمت
میں حاصل کیا تو اللہ اور رسول اور
قربندوں یتیموں مسکین مسافر کے لئے
اس میں پانچواں حصہ ہے۔

یعنی جنھوں نے لڑائی میں کام کیا ہے ان کو بھی ان کا خدا ہی حصہ دے گا لیکن آئندہ سے قانون بن
گیا کہ اس راہ سے جو آمدنی ہوگی اس میں سے پانچواں حصہ حکومت لے لیگی باقی سپاہیوں پر
تقسیم کر دی جائے گی۔

حکومت کے خزانے میں جو یہ پانچواں حصہ جمع ہوگا اس کا مصرف کیا ہوگا۔ حالانکہ شدید
ضرورتیں تھیں۔ تنہا اسلام مٹھی بھر مددگاروں کے ساتھ دشمنوں کے نزعہ میں گھرا ہوا تھا سارا عرب
مشرکین یہود نصاریٰ حتیٰ کہ رومی اور ایرانی حکومتیں جو کہ زمین کے اقتدار اعلیٰ کی حیثیت اس وقت
رکھتی تھیں سب کی نگاہیں مدینہ کی اس دعوت و تنظیم پر لگی ہوئی تھیں۔ مگر دنیا کی حکومتیں جس مسئلہ کو
اب تک سوچ ہی نہیں سکی ہیں یا سوچ رہی ہیں تو عمل نہیں کر سکتی ہیں۔

تمام خطرات سے بے پرواہ ہو کر اسلامی خزانہ کی اس پہلی آمدنی کو پھر پانچ حصوں میں
تقسیم کر دیا گیا۔ پانچوں میں صرف ایک حصہ اس قوت کے ذاتی مصارف کے لئے مختص کیا گیا جس
کے ذریعہ سے یہ اقتدار حاصل ہوا تھا۔ یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور ایک حصہ
آپ کے جاں نثار رشتہ داروں کے لئے جنھوں نے مکہ سے مدینہ تک آپ کا ہر حال میں ساتھ دیا
تھا باقی تین حصوں کو بجائے کشوری و فوجی مصارف کے ملک کے ایتامی و المساکین و السبیل
(مسافروں) کے لئے چھوڑ دیا گیا اور یہ تو شروع میں ہوا، پھر جب کل پندرہ بیس سال کے قلیل عرصہ میں

اسی تین سو تیرہ آدمیوں والی جنگ کے فتح کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اس میں ساری ایرانی حکومت بازنطینی حکومت کا اکثر حصہ سما گیا تو فرعون بنانے والی زمین کے محاصل اور کلاہ کوچ کر دینے والی دولت مدینہ والی حکومت کے خزانے میں سمٹ سمٹ کر آئے لگی تو کیا اس وقت بھی یہ اصول فراموش کر دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب یہ تدریج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی اقتدار عرب میں بڑھنے لگا اور عرب کے قبائل مختلف طریقوں سے آپ کے زیر اثر آ گئے۔ مدینے کے اطراف کے یہود اور خیبر کے یہود کی زمینوں پر خدائے آپ کو قبضہ دلادیا اور یوں مختلف ذرائع سے آمدنی کا امکان پیدا ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک ہی میں ایسی صورتیں اختیار فرمائیں جن کے ذریعہ سے اسلامی خزانہ میں دو قسم کی آمدنیاں آنے لگیں۔

(۱) ایک آمدنی تو وہ ہوئی جس کا نام خراج رکھا جاسکتا تھا اور یہی بعد کو اس کا نام ہوا اور ایک آمدنی کی مدد وہ تھی جس کا نام "الصدقات" تھا۔

غیر مسلم اقوام کی زمینوں (یعنی کھیتوں اور باغوں) سے جو آمدنی آتی تھی یا جزیہ کے نام سے جو محصول ان سے وصول ہوتا تھا اس کا شمار تو خراج میں تھا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی زمین مسلمانوں کی تجارت مسلمانوں کے مولشی (جو بطور کاروبار کے پالے جاتے تھے اور اکثر زمانہ ان کا جنگلوں میں گذرتا تھا) مسلمانوں کی اندوختہ دولت بہ شکل سونا چاندی ان چار ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی کا نام "الصدقات" تھا پھر اسی میں غنیمت کے خمس (پانچویں) حصہ سے تین حصہ بھی جو ایتامیٰ والمساکین وابن السبیل کے لئے مخصوص تھا وہ بھی "الصدقات" میں شریک کر دیا جاتا تھا۔

خراج کی آمدنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو تھوڑی تھی لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں خراجی آمدنیوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ حالانکہ گذشتہ حکومتوں کے تمام ظالمانہ مطالبات کو حذف کر دیا گیا تھا۔ اسلامی قانون ہے کہ کسی زمین پر زیادہ سے زیادہ خراج نصف پیداوار سے زیادہ نہ لگایا جائے نیز

اگر خراجی زمین کو پانی سے نقصان پہنچے یا آب پاشی کے ذرائع منقطع ہو جائیں، یا کھیتی برباد ہو جائے تو ایسی زمینوں سے خراج وصول نہ ہوگا۔

۱) عتب علی ۲ رض الخراج
۲ الماء ۱۰۱ قطع الماء ۱۰۲
۳ صطلح الزر ۱۰۳ فلا خراج
علیہ (ھدایہ)

نیز اسی طرح جزیہ سے ظاہر ہے کہ عورت بچے بیمار معذور بڈھے بیروزگار مذہبی طبقہ (مثلاً پادری جوگی) غلام وغیرہ مستثنیٰ تھے صرف کاروباری آدمیوں پر لگایا جاتا تھا۔ وہ بھی اگر صلحی جزیہ ہے تو اس کی کوئی مقدار معین نہیں ورنہ یوں معمولاً امراء سے تقریباً ایک روپیہ ماہوار یعنی بارہ روپے سالانہ متوسط طبقہ والوں سے آٹھ آنہ ماہوار یا چھ روپے سالانہ ادنیٰ طبقہ سے ۴ ماہوار یا تین روپے سالانہ اور درمیانی سال میں اگر کوئی مر جاتا تو اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا۔ پھر جزیہ کے صلہ میں غیر مسلم رعایا کو

فوجی خدمت سے معاف کر دیا جاتا تھا، ہدایہ میں ہے۔

لَا فَنَّهُ وَجِبَ لِنُصْرَةِ الْمُقَاتِلَةِ

کیونکہ جزیرہ اس لئے واجب کیا گیا ہے

تاکہ جنگ کرنے والوں کی باشندوں کی طرف سے امداد ہو۔

ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں،

۱۲ اِخْلَافًا عَنْ نُصْرَةِ مُقَاتِلَةٍ

یعنی اسلامی قلمرو میں جو جماعت جنگی

۱۳ اَهْلُ الدِّارِ لَا يَنْصُرُونَ

خدمات انجام دیتی ہے ان کی امداد کا

۱۴ اَهْلُ الدِّارِ لَا يَنْصُرُونَ

کام (چونکہ غیر مسلم لوگوں سے نہ لیا جاتا

نصرتھم وقد فاتت۔

تھا) اس لئے اس کے قائم مقام جزیرہ کا

موصول ان پر عائد کیا گیا کیونکہ جو بھی اسلامی قلمرو کا باشندہ ہے اس پر واجب تھا کہ جنگ

کرنے والوں کی امداد کرے اور یہ بات چونکہ ذمیوں کے حق میں باقی نہ رہی (اس لئے

ان سے بجائے جنگی امداد کے جزیرہ لیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الخراج (یعنی جزیرہ اور غیر مسلم رعایا کی زمین کی آمدنی خواہ اس زمین کو مسلمانوں ہی نے کیوں خرید نہ لیا ہو) یہ حکومت کی آمدنی کی ایک علیحدہ مستقل مدتی اور اس کے مالک نہ خلفاء ہیں نہ سلاطین نہ مسلمانوں کا کوئی خاص طبقہ بلکہ جیسا کہ قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں

الخِراجُ حقٌّ لجميع المسلمين۔

خراج تمام مسلمانوں کی مشترکہ

آمدنی ہے۔

(کتاب الخراج ۱۶)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف کی کوئی ذاتی کتاب نہیں ہے بلکہ خلیفہ ہارون الرشید نے جو دستور حکومت اپنے لئے اُن سے لکھوایا تھا یہ وہی کتاب ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے کم از کم خلفاء بنی عباس تک وہ مسلم تھا اور حکومت میں اس کی حیثیت قانون کی تھی بہر حال خراج سارے مسلمانوں کا مال تھا البتہ خلفاء اس کی آمدنی کے نگرہ ان تھے۔

اور اپنے صوابدید پر جس کے وہ خُدا کے پاس ذمہ دار تھے خرچ کرنے کا اقتدار رکھتے تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جیسا کہ کہہ چکا ہوں خراجی آمدنی تھوڑی تھی اس لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو ہر سال اس خراج کے تقسیم ہونے کی نوبت نہ آتی تھی بلکہ

۱۵ فتح کے بعد جن ممالک کی غیر مسلم رعایا کا قبضہ ان کی زمینوں پر بحال رکھا گیا ہو، خواہ لڑائی سے ملک فتح ہوا ہو یا صلح و آشتی سے اس ملک کے لوگوں نے مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر لی ہو، ان زمینوں کے مالک وہی غیر مسلم لوگ رہتے ہیں۔ حکومت کو صرف خراج لینے کا حق ہے۔ البتہ اگر مسلمانوں میں کوئی ان سے زمین خریدے گا تو یوں وہ اس کا مالک ہو سکتا ہے لیکن اس کو بھی وہی خراج ادا کرنا پڑے گا۔ حضرت حسن و حسین و عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نے خراجی زمینیں خریدی تھیں لیکن ان کو بھی خراج ہی ادا کرنا پڑا ۱۶

جب کہیں سے خراج آگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صوابدید سے مسلمانوں میں اس کو تقسیم کر دیتے تھے۔ اس تقسیم میں غریب امیر معذور و غیر معذور سے بحث نہ ہوتی تھی بلکہ استحقاق کے لئے صرف مسلمان ہونا کافی تھا۔

عہد نبوی میں خراج کی سب سے بڑی آمدنی (ایک لاکھ درہم) بحرین سے آئی تھی اب تک کوئی باضابطہ خزانہ کا مکان بھی نہ تھا۔ مسجد نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مال ڈال دیا گیا نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد اپنے صوابدید سے لوگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تقسیم فرما دیا اور

فما قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و شتم منها درہم (بخاری)
اور نہ کھڑے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے اس وقت تک جب تک وہاں ایک درہم بھی باقی رہ گیا ہو۔

اس تقسیم میں امیر و غریب کی خصوصیت نہ تھی حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کو بھی اس میں حصہ ملا تھا۔ حالانکہ صدقہ کا مال بنی ہاشم پر حرام ہے۔ حضرت عمرؓ کو بھی ایک دفعہ اس کا شہہ ہوا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آمدنی کی اس مد سے کچھ دیا حضرت عمرؓ نے عرض کیا، جو مجھ سے زیادہ محتاج ہوا سے دیجئے۔

اعطہ من ہوا فقر منی انہوں نے خیال کیا کہ شاید یہ غریبوں کا حق ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر، خذہ فتمولہ فما جاءک

من ہذا مال و انت غیر مشرف ولا سائل فخذہ و ما لا تتبعہ نفسک۔ (طحاوی)
اے لو اور اپنا مال بناؤ کیونکہ یہ مال تمہارے پاس اس طریقہ سے اگر آئے کہ تمہارے دل میں اس کی طرف لو لگی نہ ہو اور نہ اس کے متعلق تم نے سوال کیا ہو، تو اسے لے لیا کرو اور جو ایسا نہ ہو تو اپنے جی کو ادھر نہ لگاؤ۔

امام ابو جعفر طحاوی اس روایت کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض یہ تھی، میں نے تم کو یہ اس لئے نہیں دیا ہے کہ تم فقیر اور محتاج ہو، بلکہ تم کو میں نے کسی اور وجہ سے جو فیری اور محتاجی

۲ فی لہ اعطک ذلک لانک فقیر انما اعطیتک لمعنی اخر غیر الفقرا۔

کے سوا ہے یہ عطیہ عطا کیا ہے۔

پھر اس جملہ کی شرح یہ کرتے ہیں کہ

لیس ہذا علی اموال الصلوات انما ہذا علی الاموال التي اس کا شمار صدقات کے مال میں نہیں ہے بلکہ اس مد کا شمار ان اموال میں ہے

یقسمہا الامام علی الناس فی قسمہا
 علی اغنیاءہم و فقرہم۔
 جنہیں امام لوگوں میں بانٹتا ہے امیروں کو
 بھی دیتا ہے اور فقیروں کو بھی۔
 طحاوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہد میں جو عطیہ و وظائف تقسیم فرمایا کرتے تھے وہ
 بھی اسی مد کی چیز تھی فرماتے ہیں،

کما فرض عمر لاصحاب رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 حین دؤن الدواوین ففرض
 للاغنیاء منهم و للفقراء
 فكانت تلک الاموال یعطیھا
 الاغنیاء للناس لا من
 جهة الفقر۔
 جیسا کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کے صحابیوں میں اسی آمدنی کو
 اس وقت تقسیم کیا جب دیوان مرتب
 فرمایا، حضرت عمرؓ نے اس وقت ان
 کے لئے بھی وظیفہ جاری کیا جو ان میں امیر
 تھے اور ان کے لئے بھی جو فقیر تھے الغرض
 یہ ایسی آمدنی تھی جو لوگوں کو اس لئے

نہیں دی جاتی تھی کہ وہ فقیر اور محتاج ہیں۔

بہر حال خراج کی آمدنی چونکہ ”فی جمیع المسلمین“ ہے اس لئے ہر مسلمان کا اس میں حق ہے البتہ اب
 یہ امام کے اختیار تیزی پر موقوف ہے کہ جب مال نا کافی ہو تو کن مسلمانوں کو پہلے ترجیح دی جائے
 اس کا فیصلہ ان کی خدمات یا دوسری خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر وہ کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کے بعد جب حضرت ابو بکرؓ کا زمانہ آیا تو آپؓ نے پہلے ان لوگوں کو ترجیح دی جن سے رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے خراجی آمدنی سے کچھ دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور باقی کو،

قسمہا بالسویۃ علی الصغیر
 والکبیر والحرم المملوک والذکر
 والنثی (الخراج لابن یوسف)
 پھر سب میں برابر بانٹ دیا چھوٹے
 ہوں یا بڑے، غلام ہوں یا آزاد
 مرد ہوں یا عورت۔

کہا جاتا ہے کہ فی کس شاید سات سات درہم اور کچھ یعنی پونے دو دو روپے کے قریب حصہ پہنچا۔
 دوسرے سال خراج کی آمدنی میں فتوحات کی وسعت کے حساب سے اضافہ ہوا۔ اس سال بھی
 انھوں نے سب کو برابر برابر طریقہ ہی سے بانٹ دیا۔ اب کے بیس بیس درہم یا فی کس تقریباً پانچ
 پانچ روپے پڑے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس دفعہ لوگوں نے کہا بھی کہ آپ
 سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے ہیں، آخر جن کے اسلام میں بڑے بڑے کارنامے ہیں ان کے
 حقوق کا بھی تولیحاظ کرنا چاہیے۔ فرمایا خدمات اور حقوق کا واقف کار مجھ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے
 لیکن ان خدمات کا صلہ خدا کے یہاں ملے گا باقی یہ آمدنی،

فہذا معاشرۃ الاستغنیۃ خیر من الاثرۃ
 یہ تو (دیناوی زندگی گزارنے کا ذریعہ ہے)

اس میں برابر برابر تقسیم اس سے بہتر ہے کہ کسی کو کسی پر ترجیح دی جائے۔

معاشیات میں جو مساوات کے حامی ہیں شائد ان کو خبر نہیں ہے کہ ابھی جو بات سوچی جا رہی ہے کچھ لوگ اسے کبھی گزرے ہیں۔ لیکن عہد صدیقی کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے مساوات کے اصول کو بدل دیا اور فرمایا کہ

لا تجعل من قاتل رسول الله
صلى الله عليه وسلم
كمن قاتل معه -
جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
مقابلہ میں جنگ کی اور آپ سے لڑے
ان کو میں ان لوگوں کے برابر نہیں قرار

دے سکتا جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر جنگ کی۔

پھر انھوں نے خدمات و حقوق وغیرہ کے لحاظ سے ایک فہرست مرتب کی جو مشہور ہے۔ بدینہ میں جو شریک تھے ان کا سالانہ وظیفہ پانچ پانچ ہزار درہم یا ایک ہزار ڈھائی سو روپے سالانہ، جو بدینہ نہ تھے ان کو چار چار ہزار درہم سالانہ اور اسی طریقہ سے مختلف جہات اور حیثیتوں سے انھوں نے بعضوں کا زیادہ اور بعضوں کا کم وظیفہ مقرر کیا۔ سب سے بڑا حصہ امہات المؤمنین کا تھا۔ یعنی بارہ بارہ ہزار درہم سالانہ۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کا عطیہ اسامہ ابن زید (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) سے کم مقرر کیا۔ حضرت عبداللہ نے باپ سے شکایت بھی کی، جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

ان با اسامة كان احب
الى رسول الله صلى الله عليه
وسلم من ابى بيك وكان اسامة
احب الى رسول الله صلى الله
عليه وسلم منك -
اسامہ کا باپ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو تیرے باپ سے زیادہ
محبوب تھا، اور اسامہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ
محبوب تھے۔

الغرض آنحضرت کی ذات مبارک کو مرکز قرار دے کر جو آپ سے جتنا جس حیثیت سے زیادہ قریب تھا اسی قدر آپ نے اس کو ترجیح دی۔ پھر شہروں میں مدینہ سب سے زیادہ قریب تھا کہ وہی نبی کا مدینہ (شہر) تھا۔ اس لئے اس کو سب پر مقدم کیا گیا۔ مدینہ کے بعد مکہ کی باری آئی۔ آٹھ سو درم سالانہ وہاں کے باشندوں کے نام بھی جاری ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حینال تھا کہ آمدنی جیسے جیسے بڑھتی جائے گی عطایا کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے گا۔

مثلاً ابتداء میں مدینہ کے صرف بالغ مردوں اور عورتوں کے نام وظائف مقرر ہوئے مگر جب وسعت پیدا ہوئی تو

للمنفوس اذا طرحت امه مائة
درهم واذا اترع ما ستين -
زندہ لڑکے کا بھی وظیفہ سو درہم اسی وقت مقرر
کر دیا جاتا تھا جو ہاں کے پیٹ سے
جدا ہوتا، اور جب جوان ہو جاتا، وظیفہ دو سو درہم کر دیا جاتا تھا۔

اور یہ طرز عمل تو خرارج کی اس آمدنی میں اختیار کیا گیا تھا جو روپے کی شکل میں ہوتی تھی چونکہ بعض علاقوں سے غلہ بھی لیا جاتا تھا اس لئے مدینہ والوں کے نام سالانہ غلہ کی مقدار بھی مقرر کر دی گئی یعنی فی کس سات ہزار دو سو گز مربع زمین کی پیداوار (گیہوں) دی جاتی تھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نقطہ نظر کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ ایک دفعہ خرارج لائے حضرت عمرؓ نے پوچھا کتنی رقم ہے۔ بولے اَلْف اَلْف اس عدد کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حیرت ہوئی اور فرمایا

هل تدري ما تقول۔ تم سمجھ بھی رہے ہو کیا کہہ رہے ہو۔

ابو موسیٰ نے کہا

لعمد مت بمائة ألف
ومائة ألف حتى عد
عشر مرات۔

جی ہاں میں ایک لاکھ اور ایک لاکھ
پھر دس تک اسی کو شمار کرتے گئے
اپنے ساتھ لایا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا

ان كنت صادقاً ليوثنين
الراعى نصيبه من هذا المال
وهو باليمن ودمه في وجهه

اگر تم سچے ہو، تو اس چرواہے کو بھی
اس مال سے حصہ پہنچایا جائے گا جو
یمن میں ہوگا اور اس کا پسینہ ابھی
چہرے ہی پر ہو۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ چند شہروں یعنی مدینہ یا مکہ یا فوجی چھاؤنیوں کو فہ و بصرہ وغیرہ تک اس تقسیم کو محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ ہر مسلمان تک اگر یہ پہنچ سکتی تو آپ کا خیال تھا کہ اسے پہنچایا جائے کیونکہ اسلامی نقطہ نظر سے خرارج کی ساری آمدنی مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس نقطہ نظر کا اعادہ بار بار اپنے خطبوں میں بایں الفاظ فرماتے،

والله الذي لا اله الا هو
ما احد الا وله في هذا المال
حق (الخرارج لابی يوسف)

قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی
معبود نہیں ہے کہ ایسا کوئی نہیں ہے جس کا
اس آمدنی میں حق نہ ہو۔

یعنی بات تو یہی ہے لیکن بعض خاص خصوصیات کی بنا پر پہلے اُن لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے جو اس کے زیادہ مستحق ہیں، ان تو ضیحی خصوصیات کا اظہار بھی آپ نے بایں الفاظ خود فرمایا ہے۔

ولكننا نأمر لنا من كتاب الله
عز وجل وقسمنا من رسول الله
صلى الله عليه وسلم فالرجل
تلاذه في الاسلام والرجل

یعنی قرآن نے جو مدارج مقرر کئے ہیں
پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات
مبارک سے قرب و بعد کے حساب سے
جو حصہ لوگوں کو پہنچ سکتا ہو، اس لئے

قدمہ فی الاسلام والرجل
غناء فی الاسلام والرجل
حاجتہ فی الاسلام۔

تقسیم کے باب میں آدمی کو دیکھا جائے گا
اسلام میں اس کی قدامت کیا ہے اسلام
میں اس کی مالی وسعت کا کیا حال ہے

اسلام میں اس کی مالی ضرورت کا حال کیا ہے۔

مطلب وہی تھا کہ قرآن مجید نے خود یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ

لا یستوی منکم من ۲ نفق
من قبل ۲ الفتح وقاتل ۲ ولئک
۲ عظم درجۃ من ۲ الذین
۲ انفقوا من بعد وقاتلوا
وکلوا وعد ۲ اللہ ۲ الحسنی۔

فتح مکہ سے پہلے جن لوگوں نے خرچ کیا
اور جنگ کی ان کے برابر وہ نہیں ہو سکتے
جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور
جنگ کی۔ وہ لوگ درجہ کے حساب سے
زیادہ بڑے ہیں یہ نسبت ان کے

جنہوں نے بعد کو خرچ کیا اور بڑے۔ باقی ہر ایک سے خدا نے اچھی باتوں کا
وعدہ فرمایا ہے۔

یہ فرق مراتب تو ان لوگوں میں تھا جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد اسلام کی راہ میں جانی
و مالی قربانیاں پیش کی تھیں۔ پھر جن لوگوں نے یہ قربانیاں کی تھیں اور جنہوں نے نہیں کی تھیں
ان میں بھی قرآن نے مدارج قائم کر دیئے تھے یعنی،

لا یستوی ۲ القاعدون من
۲ المؤمنین غیر ۲ ولی الضرر
والمجاهدون فی سبیل اللہ
بأموالهم و ۲ أنفسهم فضل
۲ المجاہدین بأموالهم و
۲ أنفسهم علی ۲ القاعدین
درجۃ وکلوا وعد ۲ اللہ
۲ الحسنی وفضل ۲ اللہ ۲ المجاہدین
علی ۲ القاعدین ۲ اجر عظیم۔

ایمان والوں میں جو لوگ (جہاد) سے
بیٹھنے والے ہیں، یعنی ان کو کچھ ضرر اور
دکھ نہ تھا (اور پھر بھی جنگ میں شریک
نہ ہوئے) یہ لوگ ان کے برابر نہیں
ہو سکتے جنہوں نے اپنے مال اور اپنی
جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں مالی
جانی جہاد کیا ہے، جہاد کرنے والوں کو
خدا نے جہاد سے بیٹھنے والوں پر فضیلت
عطا کی ہے اور اچھا وعدہ تو خدا کا
سب ہی سے ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر خدا نے بڑے
اجر کے ساتھ فضیلت عطا کی ہے۔

پھر اسی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کی بنا پر بھی قرآن ہی میں،

یا منساء ۲ النبی لستن کا حد
من النساء۔

اے نبی کی بیویا تمہاری حیثیت عام
عورتوں جیسی نہیں ہے۔

وغیرہ آیات میں اس کی جانب اشارہ تھا اور احسان مندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سارے فضائل کے ثمرات کو اخروی قرار دے کر معاشی لحاظ سے سب کو مساوی کر دیا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے معاشیاتی استحقاق میں بھی اس کا خیال کیا بہر حال دونوں ہی کے اجتہاد کی صحیح بنیاد اسلام میں موجود تھی۔ مگر یہ روایت اگر صحیح ہے کہ آخر عمر میں حضرت عمرؓ لماسری المال وقد کثر زیادہ بڑھ گئی ہے۔

تو یہ آرزو ظاہر کی کہ

لئن عشت من هذه الليلة
من قابل لا لحقن آخری الناس
باولهم حتی یكونوا فی العطاء
سواء و لكن تو فی رحمہ اللہ
قبل ذلک۔

اگر آئندہ سال اسی رات تک میں زندہ
رہا، تو پچھلے لوگوں کو پہلے لوگوں کے
ساتھ ملا دوں گا، تا آنکہ وظیفہ میں سب
برابر ہو جائیں (راوی کا بیان ہے کہ)
لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات
اس سے پہلے ہو گئی۔

(الخراج لابن یوسف ص ۲۷)

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کثرت آمدنی کی شکل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مساوات ہی کے قائل تھے یعنی اگر آمدنی اتنی ہو کہ سب پر تقسیم کرنے کی صورت میں ناکافی ہو۔ اس وقت تو ترجیح و تفضیل پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن اگر سب کو کافی ہو سکتی ہو تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مساوات ہی کے قائل تھے۔ گویا ان کا خیال تھا کہ کما و کیفاً مسلمانوں کا یہ مال ہر مستحق تک پہنچا دیا جائے۔ آخر حیب یمن کے چر دا ہے تک اس مال کو وہ پہنچانا چاہتے تھے تو اس کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر مسلمان کو خراج کی آمدنی کا وہ حصہ دینا چاہتے تھے نیز اگر وہ دوسرے سال تک زندہ رہتے تو سب کو برابر حصہ دیدیتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

سنن بیہقی اور دوسری کتابوں میں حضرت عمرؓ کی ایک اور تقریر کا بھی ذکر ہے، لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو جمع ہونے کا اس لئے حکم دیا کہ اجتمعوا لہذا المال فانظروا لمن ترونہ (اس مال (یعنی بیت المال میں جو آمدنی جمع ہوئی ہے) اس کے متعلق طے کریں کہ آخر اس کے مالک کون لوگ ہیں۔ لوگ جب جمع ہو گئے تو کھڑے ہو کر آپ نے تقریر فرمائی۔

ان تعریکم ان تجتمعوا لہذا المال
فانظروا لمن ترونہ وانی قد
قرأت آیات من کتاب اللہ
یقول ما احسأ اللہ
علی سہولہ الخ

میں نے آپ لوگوں کو اس لئے اکٹھا کیا
ہے تاکہ غور کریں کہ یہ مال کس کا ہے تو میں نے
قرآن کی ان آیتوں کو جو پڑھا ہے یعنی
اللہ نے جن بستیوں والوں کو اپنے
رسول کی طرف پلٹایا ہے الخ

اس کے بعد حضرت عمرؓ آیتوں کو تلاوت کرتے جاتے اور فرماتے کہ صرف ان ہی لوگوں کا نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا والذین جاءوا امن بعدہم (اور جو لوگ آئے مہاجرین و انصار کے بعد) اس کے بعد آپؐ نے فرمایا واللہ ما من احد من المسلمین الا وله حق فی ہذا المال اعطى منہ او صنع حتیٰ مراع بعدن (خدا کی قسم کوئی ایسا مسلمان نہیں ہے جس کا حق اس مال میں نہ ہو، خواہ اسے دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ حتیٰ کہ عدن میں جو چہرہ دیا ہے اس کا بھی) (البیہقی ص ۳۵۱ ج ۶) خراج کے دوسرے مصارف | خراج کی آمدنی کے متعلق جو تفصیل اوپر پیش کی گئی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس آمدنی کا صرف یہی ایک مصرف تھا کہ مال جمع کیا جائے۔ اور یہ قاعدہ صدیقی (یعنی مساوات) یا بہ قاعدہ فاروقی (یعنی تفضیل و ترجیح) مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائے بلکہ اس آمدنی کا پہلا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے عام کشوری و فوجی ضروریات پر خرچ کیا جائے۔ بالاتفاق تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ

ما جباہ الا ما من الخراج	امام (حکومت) کو جو آمدنی خراج سے ہو
ومن اموال بنی تغلب و ما	اور بنی تغلب کے مال سے جو ملے اور
اھداۃ اھل الحرب الی	اہل حرب سے جو کچھ بطور ہدیہ و تحفہ کے
الامام و بالجزیۃ یصرف	اسلامی حکومت کو دیں اور جزیہ کے ذریعہ
فی مصالح المسلمین کالتغور	سے جو آمدنی ہو، یہ ساری آمدنیاں
ویناء القناطر و الجسو	مسلمانوں کی عام ضرورتوں پر خرچ
و یعطى قضاۃ المسلمین	کی جائیں، مثلاً سرحدوں کی حفاظت
وعمالھم و علماءھم منہ	دریاؤں پر پل بنایا جائے اور مسلمانوں
ما یکفیھم منہ و یدفع منہ	کے قاضیوں کو ان کے عمال اور حکام
ارضاۃ المقاتلہ و ذلک ریم	و علماء کو دیا جائے جو ان کے لئے
(ہدایہ)	کافی ہو، اور فوجیوں کے بال بچوں

کی تنخواہوں پر یہ آمدنی صرف کی جائے۔

جس سے معلوم ہوا کہ عدالت و فوج پبلک ورکس (مواصلات مثل پل سڑک) وغیرہ یہ تمام مصارف، خراج اور متعلقات خراج کی آمدنی سے پورے کئے جائیں گے صرف یہی نہیں بلکہ تعلیمات کے مصارف کی پابجائی بھی اسی آمدنی سے ہونی چاہیے، ابن ہمام لکھتے ہیں،

و یعطى ایضا للمعلمین و المتعلمین
نیز پڑھنے پڑھانے والوں کو بھی اس
آمدنی سے دیا جائے۔

نیز ہمیشہ اسلامی حکومتوں نے عہد خلافت راشدہ سے آخر زمانہ تک صحت عامہ کے لئے دوا خانے اور شفا خانے بھی جاری رکھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مد پر بھی اس روپے کو خرچ ہونا چاہیے

ان مشترک ضرورتوں کے بعد جو روپیہ بچ جائے وہ مسلمانوں میں خواہ صدیقی خواہ فاروقی اصول سے بانٹ دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کو اس پر حیرت ہو لیکن جب مسلمانوں کا امیر اپنے کو
 ما۲ نافیہ الا کا حد کم
 میں تم میں نہیں لیکن تم ہی میں کسی ایک
 کے جیسا (حضرت عمرؓ)

قرار دیتا ہو اور اپنے بیٹے کو مسلمانوں کے آزاد شدہ غلاموں کے خاندان والوں سے کم حصہ دینے کی اپنے
 اندر قوت اور ہمت رکھتا ہو تو جو کچھ کر کے دکھایا جا چکا تھا صرف وہی نہیں بلکہ جس کا آئندہ قصہ تھا وہ
 بھی ہو کر رہتا لیکن کان امر اللہ قد ساء مقدوس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف
 طریقوں سے آنے والے حادثہ کی طرف اشارہ فرمادیا تھا کہ

۲ انکم ستلقون بعدی ۲ ثرۃ۔ تم لوگ میرے بعد پھر ترجمہ جی سلوک کا
 مشاہدہ کرو گے۔ (بخاری)

بخاری ہی کی بعض روایتوں میں ۲ ثرۃ شدیدۃ کے الفاظ بھی آئے ہیں سو دیکھا گیا اور محمد
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
 کے اس حکم کی تعمیل فرماتے ہوئے کہ

فا صبروا حتی تلقونی علی
 ۲ الحوض (بخاری)
 پھر صبر کرنا حتی کہ حوض پر مجھ سے
 آکر مل جاؤ۔

جو کچھ ہوتا رہا دیکھتے رہے اور جن سے اسی حال میں "حوض" پر ملنے کا وعدہ کیا تھا ان سے اسی حال
 میں حوض پر

محمد ۲ و حزبہ

غدا ۲ لقی ۲ الاحبہ

کہتے ہوئے مل گئے فاتنا للہ وانا لہ راجعون۔

بہر حال خراج و متعلقات خراج کے نام سے جو سرمایہ اسلامی حکومت کے خزانے میں جمع
 ہوتا تھا مجھے اس کے متعلق سچ پوچھیے تو خاص بات کہنی بھی نہ تھی۔ تقریباً اس کے اغراض وہی تھے
 جو عام طور پر مہذب حکومتوں کے خراج کی غرض ہوتی ہے۔ البتہ اس آمدنی کا ایک بڑا حصہ علاوہ
 رفاہیات عامہ کے جو اقتداری حاکمانہ قوتوں کے رنگ رلیوں طمطراق پر خرچ کیا جاتا ہے اسلام
 نے بجائے اس کے اس کا مصرف خود مسلمانوں کو قرار دیا تھا کیونکہ وہ ان ہی کا مال ہے۔ حتیٰ کہ
 کشوری و فوجی ملازمین کو جو تنخواہیں ملتی تھیں بے جھجک اس کی توجیہ ہمارے فقہا یہی کرتے تھے
 مثلاً ہدایہ میں ہے کہ یہ خرچ اس لئے ہے کہ

ھو لاء عملتھم و نفقة الذاری
 یعنی (سیول اور ملٹری) دونوں محکموں کے

علی ۱۲ الباء فلولم یعطو ۲
کفایتهم ۱۹ محتاجو ۱۲ الی
۱۲ الاکتساب فلا یتفرعون
للقتال۔

ملازمین چونکہ مسلمانوں کے علی اور نوکر
ہیں اس لئے ان کو تنخواہ مسلمانوں
کے مال سے ہی ملنی چاہیے اسی طرح
ان کی عورتوں اور بچوں کو جو ملتا ہے

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کے مصارف باپ پر عائد ہوتے ہیں۔ اگر ان کی اولاد کو
اتنا نہ دیا جائے جو ان کے لئے کافی ہو سکے تو پھر ان کو مزید کماتے کی ضرورت باقی
رہ جائے گی، پھر جنگ کے لئے فارغ البال ہو کر اپنے آپ کو ہمیشہ تیار نہیں رکھ سکتے۔

جب ”اثرہ“ کا دور نہیں آیا تھا اس وقت حکومت کے ان ملازمین کو کیا ملتا تھا۔ قاضی ابو یوسف
راوی ہیں کہ کو فہ

بعث عمر بن الخطاب رضی اللہ
تعالیٰ عنہ عمار بن یاسر علی
۱۲ الصلاة والحرب وبعث
عبد اللہ بن مسعود علی القضا
وبیت المال وبعث عثمان بن
حنیف علی مساحة الارضین
وجعل بینہم شاة کل یوم شطرا
وطینھا لعمار بن یاسر و لعمار
لعبد اللہ بن مسعود والشاة
لعثمان بن حنیف وقال ۱۲ فی
۱۲ نزلت لفسی و ۱۲ یا کم من
هذ المال بمنزلة و ۱۲ الی
الیتیم فان اللہ تبارک وتعالیٰ
قال من کان غنیا فلیستعفف
ومن کان فقیرا فلیساکل
باطحرون۔

عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے
عمار بن یاسر کو بھیجا کہ نماز اور جنگ
کی نگرانی ان کے سپرد ہے اور عبد اللہ
بن مسعود کو قضا (عدالت) اور بیت المال
(خزانہ) پر مقرر کر کے بھیجا۔ عثمان بن
حنیف کو زمین کی پیمائش کے لئے مقرر
کر کے روانہ کیا، ان سب کے لئے
روزانہ ایک بکری (کھانے کے لئے مقرر
ہوئی) عمار بن یاسر شکم اور چوتھا
اس کا عبد اللہ بن مسعود کے لئے دو بکری
چوتھا عثمان بن حنیف کے لئے اور
کہا کہ میں اپنے کو اور تم کو اس مال کے
حساب سے وہی خیال کرتا ہوں جو
یتیم کے مال کا حال اس کے ولی کے
ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا
ہے کہ جو امیر ہو وہ یتیم کے مال سے پرہیز

کرے اور جو غریب ہو وہ دستور کے مطابق کھائے۔

ظاہر ہے کہ یہ عطا (وظیفہ بیت المال) کے سوا ان بزرگوں کا یومیہ (راشن) تھا۔ لیکن فوج خزانہ
پیمائش و بند و بست تینوں محکموں کے اعلیٰ ترین افسروں کے راشن میں بھی کل ایک بکری روزانہ
اس پر بھی حضرت عمر کا یہ فرمانا،

ایسی زمین (ملک) جس میں روزانہ ایک
بکری (حکام) کے لئے لی جائے، میں
نہیں خیال کرتا کہ اس کی بربادی

ما اسی اسر ضا یوخذ منها
مشاة فی کل یوم الا استسرع
خرا بها۔

جلد کیوں نہ آئے۔

بلکہ اسی سے حضرت عمرؓ کے طریقہ

حضرت عمرؓ اپنے عامل (ملازم حکومت)
کی تنخواہ اس کی حاجت اور جس شہر
میں رہتا ہو اس کے حساب سے

کان عمر یزق العامل
بحسب حاجته وبلده۔
(الاسلام والحضارة العربیہ ص ۱۳۱)

دیا کرتے تھے۔

کی شرح ہو سکتی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفہ اعظم تک کے لئے یہ طے کر دیا تھا کہ
بیت المال میں ان کا حق بھی،

مرف ان کی خوراک اور ان کے بال
بچوں کی خوراک نہ زیادہ نہ کم خلیفہ کا
لباس جاڑے اور گرمی کے لئے، دو
سواری کے جانور جہاد اور عام ضرورتوں
منازلوں اور حج و عمرہ کے لئے

قوته وقوت عیالہ لاوکس
ولاشط وکسوتہم وکسوة
عیالہ للشتاء والصیف و
دایتان الی جہادہ وحوالہ
وصلاتہ وحجہ و عمرتہ۔

(بس کہتا ہے)

(الاسلام والحضارة العربیہ)

سے زیادہ نہیں ہے تو اس کی ماتحت قوتوں تک چہ رسد۔ ایک دلچسپ واقعہ اسی سلسلہ میں قابل ذکر
یہ ہے جسے مشہور راوی حدیث حضرت سعید المقبری خود اپنے متعلق بیان کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ میں پہلے
بنی جندع جو مدینہ میں ایک خاندان تھا، اسی خاندان کے ایک آدمی کا غلام تھا۔ میرے اور میرے
آقا کے درمیان طے ہوا کہ اگر چالیس ہزار درم اور ہر بقر عید کے موقع پر ایک بکرا دینے کا وعدہ کروں
تو مجھے وہ آزاد کر دیں گے، سعید کہتے ہیں کہ یہ رقم جمع ہو گئی، یعنی چالیس ہزار درم کہا کہ اسٹھوں نے اکٹھے
کر لئے اور اپنے آقا کو کہا کہ لیجئے رقم حاضر ہے آزادی کا سرخط عطا ہو، اس شخص نے کہا کہ میں ایک ہی
دفعہ سب رقم نہیں لوں گا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے قسط وار لوں گا۔ سعید کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی
خدمت میں چلا گیا جو اس وقت خلیفہ تھے، حال عرض کیا، آپ نے اپنے غلام یرقار کو آزادی کہ
سعید کی رقم کو خزانہ میں جمع کر دو اور سعید سے فرمایا کہ پچھلے پہر آنا، میں تمہارے آقا کو بلاتا ہوں،
اگر یکیشتم رقم لینے پر وہ بیٹا رہو گیا تو خیر ورنہ میں خود تم کو آزادی کا سرخط لکھ دوں گا۔ سعید نے حسب
حکم خزانہ میں چالیس ہزار کی رقم جمع کرادی، سعید کے آقا کو خبر ہوئی تو خود دوڑے ہوئے آئے اور اپنی

رقم اٹھالی اور مجھے آزاد کر دیا۔ سعید فرماتے ہیں کہ چند دن کے بعد اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر میں حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا آپ نے فرمایا کہ ہمارے خزانے سے تم نے کچھ لیا بھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جی نہیں ابھی تو مجھے کچھ نہیں ملا ہے، تب آپ نے فرمایا کہ

فارجع به حتى تأخذ منا شيئاً ثم آتنا بعد۔
تو ابھی واپس لے جاؤ اپنی زکوٰۃ کی رقم، پھر جب ہمارے خزانے سے تمہیں مل چکے تب اسے لے کر آنا۔

(ابن سعد ص ۶۱ ج ۵)

اس سے بیت المال کی فیاضی کا پتہ چلتا ہے۔ جس نے ابھی بیت المال سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے بیت المال بھی اس سے مستفید ہونا نہیں چاہتا تھا۔

زائد محصول کے عائد | ایسی صورت میں اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ کرنے کا حکومت کو اختیار | آئندہ ہر مسلمان کو بیت المال سے وظائف برابر برابر مساوی مقدار میں تقسیم کروں گا تو کیا تعجب ہے۔ خصوصاً جب ہمارے فقہاریہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے عام مصالح یا مشترکہ ضرورتوں کے لئے حکومت باشندوں پر حسب صوابدید زائد ٹیکس بھی عائد کر سکتی ہے جسے اصطلاحاً ”نوائب“ کہتے ہیں، النوائب کی تعریف ہدایہ باب الکفالة میں یہ کی گئی ہے۔

ما یکون بحق لکرمی النضر
المشترک و اجرة الحارس
للمحلة و الموظف لتجهیز
الجیش و قد ۲۶۲ لا ساری۔
یعنی جو محصول (واقعی ضرورت کے لئے) عائد کیا جائے، مثلاً ایسی نہر کھودنے کے لئے جو عام مشترک ضروریات کے لئے ہو پہرہ دینے والوں کی تنخواہ کے لئے جو

محلہ کی حفاظت کرتے ہوں اور وہ محصول جو فوج کی تیاری کے لئے عائد کیا جائے یا قیدیوں کا فدیہ ادا کرنے کے لئے حکومت کو ضرورت ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر واقعی اور صحیح ضرورت پڑ جائے تو اس وقت حکومت باشندوں پر جدید ٹیکس خواہ وہ ایک دفعہ وصول کیا جائے یا قسطوں پر تقسیم کر دیا جائے جائز ہے۔ اور عام پبلک پراس قسم کے محصول کا ادا کرنا واجب ہے جس کی وجہ ابن ہمام نے یہ لکھی ہے کہ

لانها واجبة علی کل مسلم
موسر یا یجاب طاعة اولی
الامر فیما فیہ مصلحة المسلمین
ہر مستطیع مسلمان پر اس محصول کا ادا کرنا اس لئے واجب ہے کہ اولوالامر کی اطاعت ان امور میں ضروری ہے جس

میں مسلمانوں کی بھلائی ہو۔

(ص ۳۲۲)

غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ حکومت کے ہر مطالبہ کی ادائیگی کو فقہاء واجب نہیں کہتے بلکہ یہ وجوب ان ہی مطالبوں تک محدود ہے جن کا تعلق مسلمانوں کی عام واقعی ضرورتوں اور ملک کے ضروری مصالح سے ہوں ورنہ ہدایہ اور اس کی شرح میں اس کے بعد تصریح کر دی گئی ہے کہ حکومت کے ایسے مطالبات جو

حق نہ ہوں، مثلاً جو محصول ہمارے
زمانے میں فارسی ممالک میں درزیوں
اور رنگ ریندوں وغیرہ پر بادشاہ کی
طرف سے ہر روز یا ہر مہینہ یا ہر تین
مہینے میں وصول کئے جاتے ہیں (تو اس کا

لیس بحق کالجیایات فی زماننا
ببلاد فارس علی الخياط والنصبغ
وغیرہم للسلطان فی
کل يوم او الشهر او ثلاثة
اشهر فارضا ظلمہ۔

ادا کرنا ضروری نہیں ہے) کہ یہ ظلم ہے۔

شمس الائمہ سے ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ ایسے مطالبات کا نہ ادا کرنا ثواب ہے ان کے الفاظ یہ ہیں،

ہمارے زمانے میں یہ عموماً جو محصول
وصول کئے جاتے ہیں چونکہ یہ ظلماً
وصول کئے جاتے ہیں اور ظلم کے ازالہ کا
جس کو جتنا موقع ملے وہ اس کے لئے بہتر ہے

اما فی زماننا اکثر النواصب
تؤخذ ظلماً ومن تمكن من دفع
الظلم عن نفسه فهو خير له۔
(فتح القدیر ص ۲۳۳ ج ۵)

یہ تو ایک ضمنی بات آگئی ہیں یہ کہہ رہا تھا کہ خراج اور خراج کے مصارف بجز اس نقطہ نظر کے کہ وہ حکومت
کی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کی ملکیت ہے اور اس لئے مسلمانوں کی عام ضرورتوں سے جب بچ جائے تو
قدرتاً بچی ہوئی رقم کو ان ہی میں بانٹ دی جائے اس کے سوا اور کوئی اہم خصوصیت حکومت کی اس
آمد کی نہیں ہے یا جی چاہے تو پیداوار کے نصف سے خراج کا تجاوز نہ ہونا وصول کرنے میں حتی الوسع
زرمی اختیار کرنا سیلاب یا خشکی یا کسی دوسری وجہ سے اگر فصل خراب ہو جائے تو خراج کا کم کر دینا
یا معاف کر دینا ان باتوں کا بھی اسلامی خراج کے خصوصیات میں کوئی چاہے تو اضافہ کر سکتا ہے
مگر مشکل تو یہ ہے کہ زبان سے تو آج تقریباً دنیا کی اکثر حکومتیں اس کی بلکہ اس سے بھی زیادہ مراعات
کی مدعی ہیں۔ پھر ایسی باتوں کے ذکر میں وقت کیوں ضائع کیا جائے یا ان معاملات میں دنیا
اگر اسلامی اصلاحات کی منت شناسی سے انکار کرنا چاہتی ہے تو اب ان سے خواہ مخواہ لڑنے کی کیا
حاجت ہے۔ روم اور ایران کی حکومتوں کا کسانوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اور اسلام نے اس
میں کیا ترمیم کی ایک طویل مقالہ کا مضمون ہے اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جرجی زیدان جیسی
”حق پوش“ ہستی جسے اسلام کی ہر بڑی بات کو چھوٹی ثابت کرنے میں معصومانہ کمال حاصل ہے
اس کا ظلم بھی زمین کے خراج کے متعلق نہیں بلکہ اسلامی خراج کے مشہور بدنام دوسرے جز یعنی
”جزیہ“ تک کے متعلق اضطراب اس اعتراف پر مجبور ہوا۔

مسلمانوں کو جزیہ کے نام سے جو رقم
(رومی و ایرانی رعایا) کو ادا کرنی پڑتی
تھی۔ ان محصولوں کی مجموعی مقدار
سے وہ بہت ہی کم تھی جو یہی لوگ روم

والجزية التي كانوا
يتكلفون دفعها الى المسلمين
اقل كثير عن مجموع الضرر الذي
التي كانوا يودونها الى الروم

۲۰ الفرس (تاریخ التمدن اسلامی ج ۱ ص ۱۰۱) اور ایران کی حکومت کو ادا کیا کرتے تھے۔

بہر حال حکومت کے خزانے میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے موجودہ زمانے تک اس کے اغراض اس سے زیادہ نہیں بڑھے ہیں کہ ملک کے باشندوں کی مشترکہ اور عام ضرورتوں یا مصالح کے لئے اس آمدنی کے ایک حصہ کو مخصوص کرنا چاہیے۔ میں بتا چکا ہوں کہ خراجی آمدنی کا ایک بڑا مصرف اسلام نے بھی یہی مقرر کیا ہے۔ پہلے بھی اس کے متعلق ہدایہ سے ایک عبارت پیش کی جا چکی ہے۔ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ جو مصارف خراج کے ہیں اسی طرح،

کذا الجزیۃ فی عمارۃ القناطر
والجسور سد الثغور و
کری الانہاس العظام الی
لاملک لاحد فیہا کجیحون
والفرات و دجلہ و الی اوراق
القضاۃ و المحاسبین و المعلمین
و اطلاقہ و حفظ الطریق
من اللصوص (باب الجزیہ ص ۲۵۴)

اسی طرح جزیہ کی آمدنی یگوں اور
گذرگاہوں کی تعمیر، سرحدوں
کے استحکام، بڑی بڑی نہریں جو
کسی کی ملک میں نہیں ہیں مثلاً جیحون
فرات، دجلہ سے نہر کھود کر نکالنا قاضیوں
کی، محاسبوں، معلموں، فوجیوں کی تنخواہ
راستے کی حفاظت چوروں سے وغیرہ ان ہی
مصارف میں یہ آمدنی خرچ ہوگی۔

گویا موصلات (پل ٹرک) محکمہ آبپاشی عدالت پولیس تعلیمات وغیرہ اور فوجی شعبوں پر ان کو خرچ ہونا چاہئے اور عام طور پر دنیا کی مہذب حکومتیں یہی کرتی ہیں البتہ جو رقم اس مد کے خزانے میں بچ جائے اس کو پھر اس کے حقیقی مالک کو یعنی عام مسلمانوں میں امام اپنے صوابدید سے تقسیم کر دے بس یہی ایک بات اسلام میں نئی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ملک کی ایک اور بڑی ضرورت ہے جس سے کسی حال میں بھی قطع نظر نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی معذوروں، بے روزگاروں، یتیموں، بیواؤں کا مسئلہ جس کے حل کے لئے آج دنیا مختلف شکلیں بیمہ انشورنس انجمن ہائے اتحاد باہمی وغیرہ کی صورتوں میں اختیار کر رہی ہے اور حکومتیں بھی کچھ ان کے ساتھ نیم دلچسپی لے رہی ہیں لیکن ابھی باضابطہ مسئلہ کو کسی حکومت نے براہ راست ہاتھ میں لینے کی جرأت نہیں کی ہے ان کو اندیشہ ہے کہ اگر اس سلسلہ کو چھوڑا گیا تو حکومت کی موجودہ آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی اور محصولات کے بڑھانے میں ملک کی عام ناراضی کا خطرہ ہے لیکن اسلام نے ٹھیک اسی وقت جس وقت پہلی آمدنی بزور حکومت اس کے خزانہ میں آئی اسی مسئلہ کو سب سے پہلے اس نے اپنے سامنے رکھ لیا اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں بدر کی فتح سے غنیمت کے خمس (پانچویں حصہ) کی صورت میں جو پہلی آمدنی ہاتھ آئی اس پہلی آمدنی کے تین حصوں کو ملک کے اسی طبقہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا جن کے مسئلہ کو باوجود شدید احساس کے اس وقت تک حکومتیں اپنے ہاتھوں میں لینے سے ہچکچا رہی ہیں۔ لیکن قرآن میں اس وقت جو آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی وہ مجمل تھی یعنی ایتمائی والمساکین وابن السبیل محض ان تین قسم کے

۳۹۷ اسلامی معاشیات
لوگوں کا نام تھا لیکن جوں ہی اسلام کا قدم آگے بڑھنے لگا اور حکومتی اقتدار میں دن بدن اضافہ شروع ہوا تو قرآن مجید میں حکومت کے ذریعہ سے اس حاصل شدہ اقتدار و قوت کے استعمال کا مسلمانوں کو ایک ایسے طریقہ سے روشناس کیا گیا جس سے شاید اس وقت تک دنیا کی حکومتیں ناواقف تھیں اور اب تک ان میں سے کسی کو حکومت کی قوت کو اس راہ میں استعمال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ گول ملک کے غریب و فقراء معذوروں کا مسئلہ اسلامی حکومت کی نگاہ میں شروع سے تھا۔ لیکن ابتداء میں (خمس غنیمت) یعنی غنیمت کے پانچویں حصہ سے جو حقہ ان لوگوں کے لئے مختص کیا گیا تھا اس وقت اجمالاً محض اس گروہ کے تین ہی طبقہ تک بات محدود تھی لیکن اب قرآن میں باضابطہ ملک کے ان معاشی حائتمندوں کی ایک تفصیلی فہرست نازل ہو گئی جس کا دائرہ علاوہ ان تین جماعتوں کے چند ایسے طبقات کو محیط تھا جن کی طرف شاید حاجت مندوں کے لفظ سے بھی لوگوں کا اکثر ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن میں معاشی جدوجہد کی قوت ہی گویا ساکن اور بچی ہوئی ہو، مثلاً جو یتیموں کا حال ہے کہ معاش حاصل کرنے کے لئے جن جسمانی اور عقلی قوتوں کی ضرورت ہے ابھی ان کا نشوونما بھی ان میں صحیح طور پر ہونے نہیں پاتا اور جس طاقت کے وہ زیر پرورش تھے اس سے بھی وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگ جن میں یہ قوتیں ابھری ہوں لیکن بوڑھا پے یا کسی اور وجہ سے جدوجہد کی صلاحیت ساکن ہو گئی ہو، خلاصہ یہ ہے کہ حصول معاش کی قوتیں جن کی متحرک نہ رہی ہوں۔ اب خواہ یہ سکون اس لئے ہو کہ ابھی ان کی حرکت کا وقت نہیں آیا یا متحرک ہو کر ساکن ہو گئی ہوں۔ بہر حال ان سب پر "المسکین" کا لفظ بولا جاتا ہے جو سکون سے ماخوذ ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی انتہائی سکون کی حالت میں جس کی معاشی قوتیں ہوں، المسکین کے ذیل میں قاضی بیضاوی لکھتے ہیں،

من المسکون کان العجز

المسکین کا لفظ "السکون" سے ماخوذ ہے

گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ عجز اور بیچارگی

۲ مسکنہ۔

۲ اس کو ٹھنڈا اور غیر متحرک ساکن بنا دیا۔

یا حصول معاش کی قوتیں اور ذرائع بالکل ساکن یا مفقود تو نہ ہوں۔ لیکن کچھ حالات اتفاقی کے شکار ہو کر

۱۵ آگے جو کچھ بیان کیا جائے گا دراصل وہ قرآن کی مشہور آیت صدقہ کی تفسیر ہوگی۔ یعنی ۲ نما ۲ الصدقات للفقراء ۲ والمساکین ۲ والعاملین علیہا ۲ والمؤلفۃ قلوبہم ۲ وفی الرقاب ۲ والغارمین ۲ وفی سبیل اللہ ۲ ابن السبیل (نہیں ہے اس کے سوا الصدقات کا مصرف کہ وہ فقراء و مساکین کو دیا جائے اور ان لوگوں کو جو تحصیل صدقات میں کام کریں اور جنکے قلوب کی تالیف مقصود ہو، نیز الرقاب (غلاموں کے آزاد کرانے میں) اور الغارمین (تاوان زدہ) لوگوں پر اور اللہ کی راہ میں اور مسافر پر ان ہی کا فقہ میں اصطلاحی نام مصارف زکوٰۃ و صدقات ہے آئندہ اگرچہ اسی آیت کی تفصیل کی گئی ہے لیکن بیان میں ترتیب وہ نہیں ہے جو قرآن میں آپ پارسہ ہیں ۱۲

۱۵ یہ فہرست یہی آیت ہے ۱۲

معاشی ذرائع سے وہ محروم ہو گئے ہوں۔ مثلاً ناگہانی طور پر کسی بیماری کا حملہ ہوا اور علاج و معالجہ میں کسی کا سارا سرمایہ ختم ہو جائے یا بیوی یا رکھیتی میں اسے نقصان پہنچا ہو یا اسی قسم کے دوسرے حوادث کے جو شکار ہوئے ہوں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیوں کا حال تھا جو مہاجرین کے نام سے موسوم ہیں کہ گھر بار جائیداد چھوڑنے پر ان کو مکہ معظمہ کے حالات نے مجبور کیا اور مدینہ منورہ میں آکر انھوں نے پناہ لی۔ حوادثِ روزگار میں ان ہی مبتلا ہونے والے ناداروں "الفقراء" کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں "مہاجرین" کے ساتھ فقراء کی صفت کا استعمال کیا گیا ہے حالانکہ حصولِ معاش کے لئے جن جسمانی و عقلی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب ان میں موجود تھیں خلاصہ یہ ہے کہ ہر ملک ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ ایسے چکروں میں آجاتے ہیں کہ باوجود عدم معذوری کے کچھ کرنا بھی چاہیں تو کرنے کی ساری راہیں اپنے اوپر مسدود پاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے بیروزگار تعلیم یافتوں کی نوعیت بھی شاید اسی کے قریب قریب ہے دوسروں کو حیرت ہوتی ہے کہ ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے چاق چوبند ہوتے ہوئے یہ لکھنے پڑھنے والوں کا گروہ آخر معاشی پریشانیوں میں کیوں مبتلا ہے کہ معمولی ان پڑھ جاہلوں سے زیادہ روٹی کا مسئلہ ان کے لئے پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ مجھے اس وقت تعلیم یافتوں کے اس قابلِ رحم گروہ سے بحث نہیں اور نہ اس سے کہ ان کی شکایت بجا ہے یا بجا۔ بلکہ صرف ایک واقعہ کو بتانا ہے کہ باوجود سب کچھ ہونے اور سب کچھ رکھنے کے معاشی ذرائع ان پر بند ہیں۔ یہ سب کا مشاہدہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ ظاہر حالات کسی کے کیسے کچھ بھی ہوں۔ لیکن اس کے واقعی حال کا وہ کوئی صحیح معیار نہیں ہو سکتا۔ حضرت اکبر مرحوم کا شعر اس موقع پر یاد آتا ہے فرماتے ہیں۔

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گذرتی ہے

اسی لئے اسلام نے جہاں ایک طرف مانگنے والوں کے لئے سوال کو اس وقت تک حرام قرار دیا، جب تک بالکل منحصر اور اضطرار کی حالت نہ پیدا ہو جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ دینے والوں کو حکم دیا گیا ہے جیسا کہ فاطمہ بنت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
للسائل حق وان جاء علی فرس
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ مانگنے والے کا حق ہے خواہ وہ گھوڑے
پر کیوں مانگنے نہ آیا ہو۔

(بیہقی فی سننہ)

کیا معلوم کہ گھوڑے سوار کی حالت کیا ہے اور وہ بیچارہ کس حال میں مبتلا ہے جب کہ اس زمانے کے زیادہ تر سائیکل سواروں کے حالات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس فہرست میں قرآن نے پہلے تو "الفقراء والمساکین" کا ذکر کیا اور دونوں الفاظ ان تمام لوگوں کو عام ہیں جو مندرجہ بالا صفات سے موصوف ہوں۔ عمر بن عاص فاتح مصر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے ان

الفاظ کی تفسیر پوچھی بطور مثال کے ان چند طبقات،

العجیان والعرجان والکسحار والیتامی
اندھے، لنگڑے، اپاہج اور یتیموں۔

کا ذکر کر کے فرمایا۔

کل منقطع بہ۔ ہر وہ شخص (جو وجوہ معاش) سے

جدا ہو گیا ہو۔

اور واقعہ یہ ہے کہ حاجتمندوں کے ان طبقات پر تو یوں بھی لوگوں کی نظر پڑتی ہے۔ ہر قوم اور ملک کے ارباب ثروت و حیثیت ان کی امداد اپنا ایک اخلاقی اور دینی فرض سمجھتے ہیں۔ اگرچہ حکومتوں نے اپنی آمدنی میں ان کا کوئی مستقل حصہ نہیں رکھا ہے۔ لیکن یوں بے قاعدہ طور پر غیر منظم شکلوں میں مختلف تقریبات کے سلسلہ میں یا یوں بھی ان لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کیا جاتا ہے۔ خوشی اور مسرت کے مواقع میں انڈھوں لنگڑوں غریبوں کو جمع کر کے کھانا کھلا دیا جاتا ہے یا کچھ پیسے بانٹ دیے جاتے ہیں۔ مگر اسلام کی نظر اس سے بھی آگے پہنچی، آج ابراہیم لنکن اور ان جیسوں کا نام غلاموں کے آزاد کرائے میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یورپ کے راجواڑوں نے غلاموں کے آزاد کرنے یا کرائے کا بیڑہ اس وقت اٹھایا جب ترکوں اور عربوں اور دیگر مسلمان قوموں کے مقابلہ میں ان کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ نظر آیا کہ جب تک ہم ہی لوگ غلامی کے انسداد پر رضامند نہ ہوں گے بری اور بھری راستوں سے یورپ کے بچوں اور عورتوں کو غلام اور لونڈی بنانے کے طریقہ کو مسلمان نہ چھوڑیں گے۔ آخر اس پر اتفاق ہوا مسلمانوں کے خلیفہ کے سامنے مسئلہ پیش ہوا شیخ الاسلام نے محض ۲ حق بیکار و الاخلاق کے ساتھ اس نیک کام میں بیک کہا۔ خلیفہ کے دستخط ہو گئے۔ کیونکہ ظاہر ہے غلام بنانا اسلام میں نہ فرض تھا نہ واجب نہ سنت نہ مستحب بلکہ دنیا کی قوموں نے جنگی تجربات کی

۱۱ سنن بیہقی ص ۱۳ ج ۲ کتاب الصدقات ۱۲

۱۲ واقعہ یہ ہے کہ ہر بڑی جنگ میں قیدیوں کی ہزاروں بلکہ لاکھوں تعداد گرفتار ہوتی ہے۔ ان کو چھوڑا بھی نہیں جاسکتا کہ دشمن کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ورنہ قید کرنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ جنگ کے زمانے میں خود اپنی فوجوں کے مصارف میں جب شوری ہوتی ہے تو ان ہزاروں اور لاکھوں قیدیوں کا رکھنا آسان نہیں ہے قتل کر دینا بے رحمی ہے۔ پس اسی قتل کا بدل غلامی ہے گویا ایک طرح کا احسان ہے کہ جو مستحق قتل تھے ان پر من و احسان کر کے جان بخشی کر دی گئی، اور سچ پوچھئے تو بجائے قتل کے ان قیدیوں کے زندہ رہنے کی غلامی کی صورت میں ایک صورت تو نکل آتی ہے آج جبکہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا سے غلامی کا رواج اٹھا دیا گیا ہے جنگ کے قیدیوں کا مسئلہ اسی طرح پیچیدہ بنا ہوا ہے جیسے پہلے تھا۔ دشمن کی فوج کے قیدیوں سے جس قسم کے ناقابل برداشت کام لئے جاتے ہیں، ایسا اندرونی طور پر ان قیدیوں کے لنگر ان اطباء (جیسا کہ سنا جاتا ہے) مخفی طور پر جو سلوک ان کے ساتھ کرتے ہیں اگر واقعی وہ صحیح ہیں تو میرے نزدیک ان قیدیوں کی حالت غلامی کے عہد کے قیدیوں سے بھی زیادہ قابل رحم ہے مسئلہ غلامی کی تفصیل میری کتاب "الدین القیم" لے حصہ دوم میں پڑھنا چاہئے جو عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ شائع ہونے والی ہے ۱۲

بنائے پر قیدیوں کے قتل کرنے سے ان کو غلام بنالینا نسبتاً آسان خیال کیا تھا۔ البتہ چونکہ غلام ہمیشہ دشمن قوموں کے افراد ہوتے تھے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ طبعاً نہ کیا جاتا تھا جس کی داستان درد سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اس جنگی صورت کی بنا پر اسلام نے بھی دیکھا کہ جب دنیا کی ساری قومیں مسلمانوں کو غلام بناتی ہیں تو اس نے بھی دشمن کے جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیتے ہوئے اتنی ترمیم کر دی کہ جب تک ان کو غلام بنا کر رکھا جائے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے حتیٰ کہ کھانے پینے کی حد تک برابر رکھا جائے اور جب امن کا زمانہ آجائے تو اسلام میں صرف یہی نہیں کہ بیسیوں شکلیں قانونی اور مذہبی۔ مثلاً کفارات وغیرہ کے ذرائع سے غلام آزاد کرائے جاتے ہیں بلکہ قرآن نے نیکی کی ایک بڑی اہم مدفع سرقبہ (غلام کا آزاد کرنا) بھی قرار دیا۔ پھر معاوضہ لے کر بھی غلاموں کے آزاد کرنے کی ایک صورت جو عرب میں جاری تھی یعنی کتابت اس کی بھی اسلام نے ہمت افزائی کی اور عام مسلمانوں کو ان مکاتب غلاموں کی امداد پر ابھارا۔ خیر یہ سب تو غلامی کی راہ میں اسلام کی غیر متعین کوششیں ہیں لیکن آخر میں تو وہ یہ بھی کر گذرا کہ جس فہرست میں اس نے "الفقراء والمساکین" کو رکھا تھا باضابطہ اسی فہرست میں "فی الرقاب" کا بھی اضافہ کر دیا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ "الرقاب" کے نیچے ایسے غلام داخل ہیں جن کے آقاؤں نے معاوضہ لے کر ان کے آزاد کرنے کا معاہدہ کیا ہو۔ اور جس وقت قرآن میں یہ فہرست نازل ہوئی اس وقت نہ عرب بلکہ دنیا کے ہر حصہ میں آباد کاروں کے ساتھ انسانوں کا یہ گروہ بہ تعداد کثیر پایا جاتا تھا جن کے مالکوں نے کہہ رکھا تھا کہ اتنی رقم اگر تم ادا کر دو تو تمہاری گلو خلاصی ہو جائے گی۔ مگر ان بیکسوں کے مددگار بہت کم تھے تا آنکہ اسلامی حکومت نے ان کے مسئلہ کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بہر حال "الرقاب" کا لفظ اگرچہ ہر قسم کے غلاموں کے لئے عام ہے۔ لیکن عموماً فقہاء امت نے "مکاتب" والی قسم ہی مراد لی ہے مگر امام مالک کا خیال ہے کہ

انہا سراقاب یبتاعون
من الزکوۃ فیعتقون۔

"الرقاب" سے وہ غلام مراد ہیں جنہیں
الزکوۃ کی مد سے خریدا جاتا ہے اور

اس کے بعد آزاد کئے جاتے ہیں۔

گویا غیر مکاتب "غلام" بھی اس کے نیچے داخل ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ صرف مکاتب غلاموں کے مسئلہ کو نہیں بلکہ اس عہد کے اس پورے طبقہ کو جو "غلام" طبقہ خیال کیا جاتا تھا قرآن نے اپنی اس فہرست میں داخل کر لیا ہے اور اس وقت داخل کیا جب ابراہیم لنگن جیسوں کے باپ دادا غلاموں کو درندہ سے پھڑوا کر اور ان کی جوڑیوں کو لٹا لٹا کر تڑپتی ہوئی لاشوں سے اپنی دعوتوں کی رونق بڑھاتے تھے (تفصیل کے لئے دیکھیے تاریخ اخلاق یورپ اڈورڈ ہارٹ لیکی)

خیر اس وقت نہ سہی بعد ہی کو سہی ترکوں کے دباؤ کی وجہ سے یا واقعی انسانی ہمدردی کے تحت غلاموں کی طرف حکومتوں کی توجہ ضرور منعطف ہوئی لیکن ہر ملک اور ہر آبادی میں غلاموں سے بھی

بدتر حال میں ایک اور طبقہ رہتا ہے یہ اس لئے زیادہ قابلِ رحم ہے کہ اوروں کے ساتھ حکومت نہ سہی عوام انفرادی طور پر حسن سلوک کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اب انسانیت کے جس طبقہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ وہ بیکسن مرحوم طبقہ ہے جس کو کسی زمانہ میں حکومتی یا انفرادی ہمدردی کا مستحق نہیں ٹھہرایا گیا اور زمان کے ساتھ نیکی کرنی نیکی سمجھی گئی۔ میری مراد مقروضوں سے ہے۔ یہ دنیا کا وہ مظلوم گروہ ہے جس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک تو بڑی بات ہے اس وقت تک دنیا کی حکومتوں نے ان کے ستانے والوں اور ان پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑنے والوں کی صرف زبانی نہیں بلکہ قانونی امداد و اعانت کو اپنا فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ ہر حکومت کی فوجی اور عسکری قوت اس لئے تیار رہتی ہے کہ مقروضوں کے ذمہ قرض خواہوں کا جودین اور مطالبہ ہے صرف اصل ہی نہیں بلکہ سود در سود کے ساتھ اس سے وصول کرادیا جائے خواہ اس راہ میں اس کی ساری جائیداد گھر کا سارا اثاثہ ہی کیوں نہ نیلام ہو جائے۔ یہ ایک واقعہ ہے اور تمدن و تہذیب کی ترقی اور روشنیوں میں یہ اندھیر کھلم کھلا اودھم مچائے ہوئے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا فہرست کی گوتام مدون کے ساتھ دنیا کی حکومتوں نے اب تک کسی باضابطہ نیکی کا ارادہ نہیں کیا لیکن باضابطہ ظلم بھی ان حکومتوں نے روا نہ رکھا تھا۔ الا ایک یہ بیچارہ مقروضوں کا طبقہ ہے کہ خدا جانے کن مشکلات میں مبتلا ہو کر قرض کے بوجھ کو لادنے پر یہ آمادہ ہوتا ہے اور پھر ان مشکلات سے نجات تو کوئی کیا دلاتا۔ سود در سود کی زنجیروں میں سا ہو کر اس کو جکڑتا چلا جاتا ہے اور حکومتوں کے سارے سوار و پیادے توپ اور بندوق سے ہرزنجیر کے جکڑنے میں اس کے معاون و مددگار بنے ہوئے ہیں۔ حکومت پہلک کے لئے ہے بلکہ پہلک ہی کے لئے ہے۔ اس دعویٰ کے مدعیوں کا پہلک ہی کے ایک طبقہ کے ساتھ یہ طرزِ عمل قابلِ غور ہے۔ بہر حال جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے قرآن نے قرض کو دنیاوی کاروبار یا معاملہ کی مد سے نکال کر ایک توپیوں ہی اس کو ایک اہم ترین انسانی ہمدردی کا مظہر قرار دیا اور بجائے مقروض کے قرض دینے والے کے سامنے خدا نے خود اپنا ہاتھ پیش کیا جس سے اس نیکی کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ بالآخر اسی فہرست میں "الغارین" کے لفظ کے ساتھ ملک کے قرضہ دار طبقہ کے مسئلہ کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

المؤفقہ کا اتفاق ہے کہ "الغارین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو مقروض ہوں، یا زراعت و تجارت یا اسی قسم کے کاروبار میں ان کو نقصان پہنچ گیا ہو، بیت المال میں ایک مدہر سال الغارین کی بھی رکھی جاتی تھی، خصوصاً مقروضوں کے متعلق تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے زمانے ہی میں یہ اعلان فرمادیا تھا،

من ترک مالا
فلم یترک
یعنی مرنے کے بعد جو کوئی مال
چھوڑ کر مرے وہ تو اس کے

کَلَّا فَنَالِیْنَا۔

(البخاری)

دارتوں کا حق ہے۔ لیکن کوئی بوجھ

(قرض وغیرہ) کا چھوڑ کر مرا ہے تو

اس کی ذمہ داری ہم پر ہے (مراد حکومت پر ہے)

صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دوسری روایت یہ بھی ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قال رسول اللہ

لے فرمایا کہ میری امت

صلی اللہ علیہ و

کے کسی آدمی پر اگر قرض

سلم من حمل من

چڑھ جائے اور وہ اس

مستی دینا سراجہد

قرض کے ادا کرنے کی کوشش

فی قضاء فمات

کرتا رہا، لیکن ادا کرنے سے

قبل ان یقضیہ

پہلے مر گیا۔ تو اس قرض کا

فاننا ولیہ

ذمہ دار میں ہوں (یعنی

(البیہقی فی سننہ ص ۲۲ ج ۱)

میں ادا کروں گا)

ان چند اہم مدون کے علاوہ ہر شہر اور ہر آبادی میں ایک اور واقعہ بھی پیش آتا ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب مواصلات کے ذرائع اتنے وسیع اور سہل نہ تھے۔ میری مراد ان لوگوں سے ہے جو مختلف کاروبار کے سلسلے میں اپنے ملک یا شہر یا گاؤں سے پردیس جاتے ہیں ان لوگوں میں بسا اوقات مختلف حالات کے تحت کبھی ایسی صورت پیش آ جاتی ہے کہ وطن میں خواہ کتنے بڑے امیر ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن پردیس میں وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چونکہ پردیس میں ہوتے ہیں اس لئے کسی سے نہ ان کی جان ہوتی ہے نہ پہچان، ایسی صورت میں ان کی حالت نہایت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ یوں تو پہلے زمانہ میں لوگ ایسے پردیسیوں کے ساتھ انفرادی طور پر اچھا سلوک کرتے تھے۔ خصوصاً بعض قوموں میں اس نیکی اور ہمدردی کا خاص ذوق تھا۔ جس میں عرب کا بھی نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ لیکن جن اقوام و ممالک میں ذات پات یا قومیت و طینت کا مرض شدت پذیر ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں تو اس غریب مسافر کی سخت درگت بنتی ہے۔ بھلا جہاں اپنے ملک اپنے وطن اپنی نسل اپنے رنگ کے سوا ہر دوسرے آدمی کو بجائے آدمی کے کسی جانور کا بچہ خیال کیا جاتا ہو، وہاں کے باشندوں سے کوئی پردیسی کیا توقع رکھ سکتا ہے اور یہ مرض گو موجودہ مغربی تمدن کی راہ سے بہت عام اور مہلک ہو گیا ہے۔ لیکن تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قومیں اس کا شکار رہی ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک ہندوستان ہی کی حالت پہلے کیا تھی بلکہ اب بھی یہی ہے کہ اس ملک کے بعض طبقے اپنے سوا دوسروں کو کتوں سے بھی زیادہ ناپاک قرار دیتے ہیں جن بستیوں اور گاؤں میں صرف اس قوم کے لوگ آباد ہیں اب بھی جا کر جس کا جی چاہے تجربہ کر سکتا ہے کہ مسافر کا

گاؤں میں شام ہو جاتی ہے کسی درخت کے نیچے بھوکا پیاسا پڑا ہوا ہے۔ لیکن گاؤں والوں میں کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ ایک لوٹا پانی یا ایک لقمہ کھانے سے اس کی تواضع کریں۔ بہر حال انسانی افراد کا یہ طبقہ بھی ہر ملک اور ہر قوم میں قابل توجہ تھا۔ اسی لئے قرآن کی فہرست میں ”ابن السبیل“ (راہ والے) مسافر کے نام سے ان کا بھی اضافہ کیا گیا اور اسلامی حکومت نے ان کی خبر گیری و پریشش کو بھی حکومت کا ایک اہم مسئلہ قرار دیا۔

الحاصل خراج و جزیہ وغیرہ کی آمدنی تو کشوری و فوجی ضرورتوں اور رفاهیات عامہ کے لئے تھی۔ لیکن جب اسلام نے انسانیت کے مصالح عامہ اور ضروریات مشترکہ کے ساتھ بنی آدم کے ان قابل رحم طبقات یعنی ”الفقراء والمساکین والغارمین وابن السبیل“ کے معاشی مشکلات کے مسئلہ کو بھی اپنے ہاتھ میں لیا اور اسلامی حکومت کے بجٹ (موازنہ) میں مصارف کی فہرست میں ان کا بھی اضافہ کیا تو ظاہر ہے کہ مصارف کی پابجائی کس مد سے ہوگی۔ اس کا سوال قدرتی طور پر پیدا ہونا چاہیے تھا سو ہوا۔

مگر جب حال یہ ہے کہ دنیا کی حکومتوں کی آمدنیاں فوجی اور کشوری (سیول ورٹری) ضرورتوں کے لئے بھی بسا اوقات ناکافی ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ مصالح عامہ کی مد کا اضافہ جب سے حکومتوں نے اپنے مصارف میں کیا ہے۔ اس وقت سے نئے نئے ناموں اور نئی نئی تدبیروں سے رعایا پر محصول بھی عائد ہونے لگے اور تجربہ بتاتا ہے کہ ان جدید محصولات اور مطالبات کا خواہ کچھ بھی نام رکھ دیا جائے لوگ آسانی سے دینے پر آمادہ نہیں ہوتے عموماً جو بھی دیتے ہیں جبراً قہراً حکومت کے خوف سے دیتے ہیں۔ لیکن اکثریت حب دلی سے ان کی ادائی پر آمادہ نہیں ہوتی صفا فی صحت عامہ، تعلیم عامہ وغیرہ کے فوائد کا لاکھ فلسفہ پر و فیسروں اخبار نویسوں کتب سازوں کے ذریعہ سے بیان کرایا جائے۔ لیکن عام طور پر پھر بھی اکثریت ان کو حکومت کا جبر ہی قرار دیتی ہے۔ اس تجربہ کے ہوتے ہوئے مذکورہ بالا طبقات کی امداد کے نام سے پبلک پر اگر کوئی جدید ٹیکس عائد کیا جائے گا تو کوئی تعجب نہیں کہ باشندوں کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑے اور خود حکومت کی جان کے لالے پڑ جائیں۔

اسلام کے سامنے بھی یہ ساری مشکلات متقیں پھر اس نے ان کے حل کی راہ کیا پیدا کی اب میں اس کی کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو وہی ہے کہ حکومت کی آمدنی میں اسلام نے حاکمانہ قوتوں کا حصہ قدر ضرورت سے زیادہ نہیں رکھا۔ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی حکومت کے پہلے امام اور امیر تھے جیسا کہ بیان کر آیا ہوں، حکومت کی پہلی آمدنی سے بحیثیت امام یا امیر آپ کو خمس کے نام سے جو حصہ ملا اس خمس سے بھی تین ثلث کو خداوند تعالیٰ نے قرآن میں ”الیتامی والمساکین وابن السبیل“ کے لئے مخصوص فرمادیا باقی دو حصوں میں سے ایک حصہ آپ کے اقربا کا تھا اور اس خمس کا خمس

(یعنی پانچویں حصہ کا پانچواں حصہ) صرف یہ ”صرف خاص مبارک“ کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن اس کا حال بھی یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ضروریات سے جو کچھ بچ جاتا تھا اور آپ کی ذاتی ضرورتوں کا معیار ہی کیا تھا جو نہ بچتا اس کو بھی آپ مسلمانوں ہی کے عام مصالح میں صرف فرما دیا کرتے تھے۔ علامہ بھرے مجموعوں میں اعلان فرماتے کہ

ما یحل لی مما افاء اللہ علیکم
خدا نے جو آمدنی اے مسلمانوں تم پر
مثلاً ہذا الا الخمس۔
واپس کی ہیں (یعنی جن کا دروازہ تم پر
کھولا ہے) اس میں خود میرے لئے بجز اس خمس (پانچویں حصہ) کے اور کچھ

لینا جائز نہیں۔

جب پیغمبر کے لئے ”خمس“ کے سوا کچھ حلال نہ تھا تو اسی سے دوسرے امرار وائمہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد فرماتے اور

والخمس مردود فیکم
اور پھر یہ خمس (پانچواں حصہ) بھی
تم ہی لوگوں پر واپس کر دیا جاتا ہے۔

مطلب یہ تھا کہ اس پانچویں حصہ کی بڑی مقدار مسلمانوں کی عام ضرورتوں میں صرف ہو جاتی ہے۔
اس فقرہ کی شرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منقول ہے،

یعنی بالخمس حقہ من الخمس
یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس
سے آپ کا وہ حصہ تھا جو خمس سے آپ کو ملتا تھا۔

بعد کو آپ کے راشدین خلفاء نے جو عملی ثبوت خود اپنی اور اپنے عمال کی زندگی کی مثالوں سے پیش کی ہیں، تاریخ کے اوراق ان واقعات سے لبریز ہیں اور اجمالاً بعض چیزوں کا ذکر آچکا ہے اور اسی کو میں اسلام کا ایک جدید اقدامی کارنامہ خیال کرتا ہوں بنی آدم کے اس کس پیرس پس ماندہ طبقے جو ہمیشہ دوسروں کے سینہ کے بوجھ بنے رہے بلکہ مختلف زمانوں میں مختلف اقوام میں عملاً حتیٰ کہ کہیں کہیں قانوناً بھی افلاس و غربت مقروضیت دائم المریضی غلامی وغیرہ اتفاقی غیر اختیاری مصائب کو جرم اور سرمایہ صدر سوائی و خواری قرار دیا گیا۔ حقارت و ذلت کے بدترین سلوکوں کے جو ہمیشہ مستحق ٹھہرائے گئے ان کی باضابطہ منظم شکل میں صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ واقعی مالی اعانت کے لئے حکومت کا اپنی تمام عسکری اور فوجی قوتوں کے ساتھ کمر بستہ ہو جانا اور اس کو عملاً کر گزرنا غالباً انسانیت کی تاریخ میں دنیا کی حکومتیں اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتیں۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اسلامی بجٹ (موازنہ) میں جدید مصارف کی ان غیر معمولی مدوں کی تکمیل و پابجائی کے لئے علاوہ خمس کے حصول کے آمدنی کے جو ذرائع اسلام نے اختیار کئے اور

محصول اندازی کے اس سلسلہ میں جن حکیمانہ نراکتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے وہ بھی بجائے خود کچھ کم تعجب انگیز نہیں بلکہ اسلام کی صداقت یا قدرتی قانون ہونے کی وہ ایک بین دلیل ہو سکتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ موازنہ میں مصارف کی متعدد مددوں کا جو اضافہ کیا گیا یہ معمولی مد نہیں ہے۔ مذکورہ بالا طبقات میں سے تقریباً ہر ملک میں ہر طبقہ کے ہزاروں اور لاکھوں افراد رہتے بستے ہیں ان کی انفرادی مالی اعانت کا بیڑہ اٹھانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ معمولی رقوم سے مقصد حل نہیں ہو سکتا تھا ضرورت وافر آمدنی کی تھی۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے یوں تو سب ہی جانتے ہیں۔ لیکن شائد ان کی حکمتوں پر غور نہیں کیا گیا میں ان میں سے بعض نکات اور مصالح کو نمبر وار بیان کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ موازنہ کے ان مصارف کی تکمیل کے لئے اسلام جن لوگوں پر محصول عائد کرنا چاہتا تھا ان کے لئے اس نے اس عجیب و غریب رعایت کا اعلان کیا کہ جو لوگ اس محصول کے ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے ان کو ان تمام مالی مطالبات سے سبکدوش کر دیا جائے گا جو عموماً دنیا کی حکومتیں اپنی رعایا پر عائد کرتی ہیں۔ ایک تو اسلام نے یونہی اپنی رعایا کو رومی و عجمی سلاطین کے ناجائز مطالبات سے سبکدوش کر ہی دیا تھا۔ لیکن ان لوگوں کے ساتھ رعایت کی حد کر دی گئی یعنی زمین کا خراج جو ہر حکومت کا ایک قانونی اور فطری حق ہے اس سے بھی اس مد کے محصول ادا کرنے والوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔

(۲) حکم دیا گیا کہ جس طرح ہر قوم و ملک کے لوگ خصوصاً جو کسی نہ کسی قسم کا مذہب رکھتے ہیں، منجملہ دیگر مذہبی امور کے آخر خیر و خیرات بھی ضرور کرتے ہیں، پس خیر و خیرات کی یہی مد جسے ہر حال ہر مذہبی زندگی رکھنے والا آدمی اپنی آمدنی سے ضرور نکالتا ہے۔ لیکن اب تک اس کو لوگوں نے بہم غیر متعین شکل میں رکھا ہے۔ آمدنی سے نکالی ہوئی اسی رقم کو اسلام ذرا متعین و مشخص شکل دے کر لوگوں سے وصول کرے گا اور بجائے اس کے کہ حاجتمندوں تک اپنی آمدنی سے بچائی ہوئی اس رقم کو لوگ انفرادی طریقہ سے پہنچاتے تھے۔ حکومت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور اپنے صوابدید سے مستحقین تک پہنچا دے گی، جس کے معنی یہی ہوئے کہ ایک طرف حکومت کے تمام مطالبوں سے سبکدوشی بھی ہوئی اور لوگوں کی مالیات اور آمدنی پر مزید کوئی بار بھی نہ پڑا۔ بلکہ وہی چیز جسے غیر منظم شکلوں میں لوگ ادھر ادھر بانٹ دیا کرتے تھے اب منظم شکل میں تقسیم ہوگی۔

(۳) آمدنیوں سے پس انداز ہونے والی اس رقم سے چونکہ ملک کے مذکورہ بالا اتفاقی آفات و مصائب کے شکار طبقات کی امداد کی جائے گی۔ اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ خود ان رقوم کے جمع کرنے والے یا ان کے خاندان میں سے کوئی آدمی کسی وقت خدا نخواستہ ان مصائب و آفات کا شکار ہو تو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے گویا جن اتفاقی مصائب و آفات کی تصویریں کھینچ لی گئیں ہیں یہ کمپنی والوں کے ایجنٹ آج یہ حکم دیتے ہیں کہ ان کا خیال کر کے اپنی آمدنی سے فی صدی کچھ رقم ان کی کمپنیوں میں جمع کی جائے یا انجمن ہائے اتحاد باہمی کے مبلغین جن اتفاقی ضرورتوں کے لئے

قرضہ و وام وغیرہ کا ہول دل میں پیدا کر کے انجمن کی کسی شاخ سے متعلق ہونے کی تلقین کرتے پھرتے ہیں۔ ان ساری ضرورتوں کی کفالت خود بخود ہو جاتی ہے۔ ملک کے یتمامی، فقراء، مساکین، بیویاں، مسافر جب سب ہی کا اس میں حق ہے تو خزانہ کار و پیہ ان تمام خطرات کے وقت جیسے دوسروں کی مدد کرے گا، خدا نخواستہ اگر دینے والوں پر یا ان کے خاندان والوں پر کسی وقت وہی مصیبت آجائے تو اس کی اعانت سے کیسے گریز کیا جاسکتا ہے۔ البتہ فرق صرف اس قدر ہے کہ بیمہ یا انجمن اتحاد یا بھی یا دوسری امدادی یونینس جو ان ہی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر قائم ہوتی ہیں، ان کی جمع شدہ رقوم سے اتفاقی حوادث کی صورت میں جمع کرنے والے یا ان کے خاندان والوں ہی کو نفع پہنچ سکتا ہے اور اسلامی تنظیم کی شکل میں اگر ان پر ان کے خاندان پر کوئی حادثہ پیش آئے تو ان کی امداد بھی وہ کرے گا اور اگر ان کے سوا ملک کے دوسرے باشندوں کو اگر ان حادثات میں مبتلا ہونا پڑے تو ان کی بھی وقت پر مدد کی جائے گی۔

علاوہ اس کے پہلی صورت میں ایک بڑی خرابی یہی ہے کہ آمدنیوں سے رقم اس لئے پس انداز کرائی جاتی ہے کہ اتفاقی حوادث کے موقع پر کام آئے گی۔ لیکن اگر اتفاقاً کیا اکثر یہی ہوتا ہے کہ ان رقوم کے جمع کرانے والے ان مفروضہ یا متوقعہ حوادث سے محفوظ رہتے ہیں اور خواہ ان کا بڑوسی بلکہ حقیقی بھائی بھی کسی اتفاقی حادثہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کی بھی امداد ان رقوم سے نہیں ہو سکتی گویا ملک کی یہ رقم جو باشندگان ملک کے ان حوادث کو پیش نظر رکھ کر جمع کرائی جاتی ہے عموماً ان اغراض میں بہت کم کام آتی ہے اور جمع کرنے والے ان کو بہ آمد کر کے عموماً غیر ضروری مصارف میں پھونک دیتے ہیں۔ گویا بیمہ ہو یا انجمن ہائے اتحاد یا بھی یا ازین قبیل دوسرے ادارہ جات ان سب کا قرآنی الفاظ میں

دولة بین الاغنیاء منکم
تو نگرہوں ہی میں چرخ کھاتی ہے

(وہ دولت)

ہی کی شکل میں زیادہ تر انجام ہوتا ہے یعنی گھوم گھا کر اور ہر پھر کر امیروں ہی کے دائرے میں وہ ٹریڈ گشت کرتا رہتا ہے۔ غریبوں کے منہ میں اڑ کر اس کی ایک کھیل بھی نہیں پہنچ سکتی ہے۔ وہی جو حال ملک کے اس سرمایہ کا ہوتا ہے جسے گو ملک کے اکثر افراد میں بہ ظاہر پھیلا دیا جاتا ہے۔ لیکن گھوم پھر کر بالآخر اصل مع اپنے تمام بیٹوں پوتوں پر و توں کے ”الاغنیاء“ یا سرمایہ دار ہی کے جیبوں میں اپنا احسری ٹھکانا بناتا ہے۔ میرا اشارہ سود اور بیاج کی طرف ہے۔

لیکن اسلام ملک کی آمدنیوں سے جو کچھ پس انداز کرتا ہے، وہ بہر حال ان ہی اغراض میں خرچ ہوتا ہے جس کے لئے وہ جمع کیا جاتا ہے خواہ ان اغراض کے لئے خود جمع کرانے والے اور اس کے خاندان کو ضرورت پیش آئے خواہ ملک کے کسی اور دوسرے باشندے کو ان کی ضرورت ہو۔

(۴) اسلام یہ محصول ملک کے ہر باشندے پر عائد نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تمام مطالبات محض ان لوگوں تک محدود رکھے گئے ہیں جو اپنی اور اپنے زیر پرورش متعلقین کے روزمرہ معمولی مصارف کی

تکمیل کے بعد اپنے پاس کچھ پس انداز کر سکتے ہوں۔ اصطلاحاً اسی کا نام نصاب ہے اور ہر چیز کا نصاب اسلام نے جدا جدا مقرر کیا ہے۔ جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں پڑھی جاسکتی ہے۔ عموماً لوگوں کو معلوم بھی ہے۔

(۵) اس کے بعد بھی یہ مطالبات ہر قسم کے مملوکات پر عائد نہیں ہوتے بلکہ صرف ان چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں جن میں عموماً بڑھنے بڑھانے کی صلاحیت ہو۔ مثلاً تجارت، زراعت، بغرض افزائش نسل جن موبشیوں کی پرورش کی جاتی ہے یا نقد سرمایہ بہ شکل سونا چاندی، ظاہر ہے کہ آدمی ان کو بڑھا سکتا ہے اور ان سے آمدنی پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ آمدنی پیدا کرنے کے عام ذرائع دنیا میں عموماً یہی نقدیں (سونا چاندی) اور ان کے سکے ہیں۔

(۶) اس محصول اندازی میں اس کا بھی خاص طور پر بڑی احتیاط سے خیال کیا گیا ہے کہ جن چیزوں کے حصول میں زیادہ محنت اور کدو کاوش ہوتی ہو۔ اسی نسبت سے مطالبہ میں تخفیف کی جائے اور جس حد تک اس کی پیدائش میں محنت کم اور قدرتی وسائل کو زیادہ دخل ہو، محصول میں اضافہ ہوگا یعنی تجارتی اموال یا سونا چاندی یا ان کے سکے چونکہ ان سے آمدنی حاصل کرنے میں پورا وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ بجز سرمایہ کے سارا بار تاجر ہی پر پڑتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے اموال سے چالیس روپے میں ایک روپیہ لیا جاتا ہے۔ بخلاف کاشت کے کہ اگر اس کی سیرابی وغیرہ میں مصنوعی ذرائع مثلاً رہٹ چرس وغیرہ سے کام لینا نہیں پڑتا بلکہ قدرتی بارش یا نہروں کے پانی سے سیرابی ہوتی ہے تو مثلاً دس من سے ایک من یعنی دسواں حصہ اور اگر آبپاشی کے مصنوعی ذرائع رہٹ، موٹ، چرس وغیرہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے تو بیسواں حصہ اسی طرح اگر کسی کو خزانہ مل جائے (جس کی مختلف شکلیں ہیں) بہر حال خزانہ پانے کی جن صورتوں میں پانے والا قانونی طور پر اس کا مالک قرار دیا گیا ہے چونکہ یہ ایک غیر مترقبہ شے اس طور پر حاصل ہوتی ہے کہ اس میں محنت کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ اس لئے حکومت پانچواں حصہ اس سے لے لیگی اور یہی حکم سونے، چاندی، لوہے، سیسے، پتیل وغیرہ کے معینات کا ہے یعنی حکومت پانچواں حصہ لیگی۔ البتہ ایسے مولشی (مثلاً اونٹ، گائے، بکریاں وغیرہ) جن کا زیادہ وقت چراگاہ اور جنگل میں گذرتا ہو، یعنی عموماً جن سے افزائش نسل کا کام لیا جاتا ہے اصطلاحاً انھیں "السوام" کہتے ہیں، اور دنیا کے مختلف علاقوں میں لوگ اس کا مستقل روزگار کرتے ہیں، ہندوستان کے آباد علاقوں میں اس کا رواج کم ہے ورنہ صحرائی علاقوں کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کی گذراوقات مولشیوں کی اسی قسم کی پرورش سے ہوتی ہے اور یہی ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکوٰۃ نبوت کی روشنی میں ان میں ہر قسم یعنی اونٹ، گاؤں، بکرے، بیل، گائے، بکروں، دنبوں، بھیڑوں، کالگ، الگ، نصاب اور جو کچھ محصول ان سے لیا جائے ان کی تعداد مقرر فرمادی ہے۔

یہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی درہی چالیسویں حصہ کا عمل ہوا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ

عرب میں زیادہ تر مذکورہ بالا جانوروں ہی کی پرورش بطور ذریعہ معاش کے گلوں اور ریوڑوں کی شکل میں کی جاتی تھی۔ لیکن جب ایسے ممالک فتح ہوئے جہاں یہی کاروبار گھوڑوں کا بھی جاری تھا جیسا کہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں،

لم یکن أصحاب الخیل النساء
من المسلمین بل اهل الابل
وما تقدم اذا أصحاب هذا
انما هم اهل المداخن والاشت
والتراکہ وانما فتحت
بلادهم فی زمن عمر و عثمان
(ص ۵۰۲ ج ۱)

(عہد نبوت میں) مسلمانوں کے کسی طبقہ
میں گھوڑوں کی پرورش کا (افرائش
نسل کی غرض سے) عموماً رواج نہ تھا۔
بلکہ اونٹوں اور جن امور کا ذکر ہوا ان
ہی کی پرورش کا رواج تھا کیونکہ گھوڑوں
کی پرورش کرنے والے اس زمانہ میں
یاد اُن کے لوگ ہیں یا دشت کے

یا ترکمانی خمرگاہوں والوں میں اس کا رواج ہے اور ان علاقوں پر مسلمانوں کا
قبضہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عہد میں ہوا۔

بہر حال جب گھوڑوں والی رعایا بھی اسلامی محروسہ میں داخل ہوئی تو سوال پیدا ہوا کہ ان گھوڑوں پر
بھی محصول عائد کیا جائے جیسا کہ دوسرے جانوروں پر ہے۔ لیکن محصول کی مقدار کیا ہو تو حنفی
فقہاء لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا۔

صاحبها بالخیار ان شاء
اعطی من کل فرس دیناراً
وان شاء قومها واعطی من
کل مائتی درہم خمسة
درہم (ہدایہ)

اس قسم کے گھوڑوں کے پالنے والوں کو
اختیار ہے چاہیں ہر گھوڑے کی زکوٰۃ
ایک دینار (اشرفی) ادا کریں اور چاہیں
تو یہ بھی کر سکتے ہیں کہ گھوڑے کی قیمت
لگا کر ہر دو سو درہم پر پانچ درہم

درہم (ہدایہ)

زکوٰۃ ادا کریں۔

جب دو سو درہم کی قیمت سے پانچ درہم کا یہاں بھی حضرت عمرؓ نے حکم دیا تو وہی چالیسواں حصہ اس میں
بھی ہوا، اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً موشیوں میں بھی چالیسویں حصہ کے اصول کو محفوظ
رکھا گیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۷) عام طور سے جن اموال پر محصول عائد کیا جاتا ہے۔ عموماً محصول اسی وقت ان کا
وصول نہیں کیا جاتا جس وقت مالک کی ملک میں وہ چیز آئی ہو بلکہ مالک ہونے کے کامل ایک سال
(حولان حول) گزرنے کی ضرورت ہے یہ عام دستور ہے۔ زراعت میں کچھ ترمیم بھی ہوئی ہے۔

(۸) نہایت شدید تاکید احکام اس باب میں بھی ہیں کہ حکومت کی خراجی وغیرہ مدوں
کی آمدنیوں کو اس آمدنی سے بالکل الگ رکھا جائے۔ یعنی مذکورہ بالا مصیبت زدہ طبقات کی امداد

کے لئے جو آمدنی حاصل کی جاتی ہے اس کا خاص نام "الصدقات" ہے اور الصدقات کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس فنڈ کی رقم کو حکومت کی دوسری آمدنیوں میں نہ ملایا جائے اور نہ ان خراجی مصارف پر اس آمدنی کا کوئی حصہ (بجز خاص صورتوں کے) ایک جہہ خرچ ہو سکتا ہے۔ قاضی ابویوسف نے ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے بڑے سخت تحدیدی لہجے میں بار بار پلٹ پلٹ کر یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ

لا ینبغی ان یجمع مال الخراج
الی مال الصدقات والعشور
لان الخراج فی جمیع المسلمین
والصدقات لمن سہی اللہ
عن وجل فی کتابہ۔
(الخراج ص ۴۶)

جائز نہ ہو گا کہ خراج کی آمدنی الصدقات
اور العشور کی آمدنی کے ساتھ جمع کی
جائے، کیونکہ خراج تو ہر قسم کے مسلمانوں
کی مشترکہ آمدنی ہے اور الصدقات
تو صرف ان ہی لوگوں کے لئے مخصوص
ہے جن کے نام کا ذکر حق تعالیٰ نے

اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔
حتیٰ کہ انہوں نے تو یہاں تک تاکید کی ہے کہ دونوں مدوں (خراج و صدقات) کے تحصیلدار بھی
الگ الگ ہونے چاہئیں فرماتے ہیں،

ولا یتولاھا عمال الخراج
فان مال الصدقة لا ینبغی
ان یدخل فی مال الخراج
(کتاب الخراج ص ۴۶)

بلکہ خراج کے کلکٹروں اور تحصیلداروں
کے ہاتھ میں الصدقات کی آمدنی کے
وصول کا مسئلہ نہ سپرد کیا جائے اور
نہیہ جائز ہے کہ الصدقات کی آمدنی

(۹) جس علاقہ یا ضلع یا علاقہ سے الصدقات کی آمدنی وصول کی جائے سب سے پہلے ان
صدقات کے مستحق اسی علاقہ کے مندرجہ بالا طبقات کے اہل حاجت ہیں۔ ہدایہ میں ہے،
وبکرہ نقل الزکوۃ من بلد
الی بلد وانما تفرق صدقة
کل فریق فیہم۔ (ج ۲)

ایک شہر سے دوسرے شہر میں صدقہ کو
منتقل کرنا مکروہ ہے بلکہ ہر فریق کا صدقہ
ان ہی لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔

ابن ہمام نے کلیہ لکھا ہے کہ

والمعتبر فی الزکوۃ
مکان المال۔

زکوۃ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آمدنی
کس جگہ سے وصول ہوئی ہے (یعنی)

جس مقام سے وصول ہوئی ہے اسی مقام کے مستحقوں میں تقسیم ہوگی)

اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث مشہور ہے کہ

توخذ من اغنياهم وترد
على فقرائهم۔
(بخاری و مسلم)

جس علاقہ کے تو نگروں اور مرہائے داروں
سے الصدقات وصول کئے جائیں، اسی
علاقہ کے فقراء میں وہ تقسیم کی جائے۔

حضرت عمران ابن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کسی جگہ وہ الصدقات کے تحصیلدار
بنا کر بھیجے گئے، کچھ دن کے بعد جب واپس ہوئے تو لوگوں نے پوچھا "این المال" (مال کہاں ہے) بولے
للمال اسرسلتمونی اخذناھا
من حیث کما نأخذھا علی
عهد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ووضعناھا
حیث کنا نضعھا۔
(سنن بیہقی)

کیا آمدنی لانے کے لئے تم نے ہمیں
بھیجا تھا، ہم نے اس کو ان ہی مقامات
سے وصول کیا جہاں سے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وصول
کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے عہد میں جہاں اس کو تقسیم کرتے تھے

وہیں ہم نے اسے بانٹ دیا۔

البتہ اگر وہاں کی ضروریات سے بچ جائے تو پھر باقی ماندہ حصہ کو "مرکز" کے خزانے میں جمع کر دیا جائے
اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یمن اور قبیلہ طے "تیم" تک کے صدقات
آتے تھے، بہر حال کلیہ یہی ہے کہ "الصدقات" پہلے اس مقام کے مستحقین میں تقسیم کیا جائے جہاں
کے ارباب حیثیت سے وصول کیا گیا ہو خواہ وہ کسی شکل میں ہو بعض فقہاء نے تو مختلف اصولی حدیثوں
کی بنا پر اس قانون میں یہاں تک تفصیل کی ہے کہ

یہ زیادہ بہتر ہے کہ "الصدقات" کی آمدنی
موصول ادا کرنے والوں کے محتاج
بھائیوں میں تقسیم کی جائے، پھر ان کے
بعد اس کا استحقاق بھائی کی اولاد کو ہے
پھر محتاج چچاؤں کا حق ہے پھر ماموں
پھر عام رشتہ دار پھر بڑوسی پھر جو لوگ
اس سڑک پر رہتے ہوں جس پر صدقہ

۱۲ الا فضل ان یصرفھا الی
۱۲ اخوتہ ۲ الفقراء ۳ ثمن الی
۱۲ اولادہم ۴ اعمامہ
۲ الفقراء ۵ احوالہ ۶ ثمن ذوی
۲ ارحامہ ۷ جیرانہ ۸
۲ اهل سکتہ ۹ اهل مصرۃ
(فتح القدیر ص ۲۹ ج ۲)

ادا کرنے والا رہتا ہو، پھر اس کے شہر والے۔

جس کے یہ معنی ہوئے کہ صرف مقام ہی کو ترجیح حاصل نہیں ہے بلکہ دینے والوں کے رشتہ داروں کو
غیر رشتہ داروں پر اور رشتہ داروں میں بھی جو جتنا زیادہ رشتہ میں قریب ہو وہ اگر مذکورہ بالا مصائب و
آفات میں گرفتار ہو گیا ہے تو اس مال کا وہ زیادہ مستحق ہے۔

"الصدقات" کے متعلق ان نازک حکیمانہ اصولوں کے ساتھ یہ اعلان کہ جو مسلمان اس

محصول کو ادا کرے گا۔ اس کو دوسرے حکومتی مطالبات سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔ اس کا قدرتی اثر یہ تھا کہ برضا و رغبت لوگ اسی الصدقاتی مطالبہ کو قبول کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی عربوں کو منیٰ طیب فرما کر ارشاد فرماتے

یا معشر العرب! احمد و الحمد لله
اذ رفع عنکم العشور۔

عرب کے لوگو خدا کا شکر کرو کہ تم
سے اس نے حکومتی عشور (دھیک)

کو اٹھوا دیا۔

(الطحاوی ص ۳۱۲)

لوگوں کو اس حدیث کے سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ حالانکہ صاف مطلب یہی تھا کہ حکومتیں اپنی رعایا پر جو دھیکی (عشر) وغیرہ کے نام سے ٹیکس اور رنٹ عائد کرتی تھیں۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے معاف فرما دیا ہے اس لئے آپ کبھی یہ فرماتے کہ

لیس علی المسلمین عشور

اہل اسلام پر العشور (حکومتی ٹیکس)

انما العشور علی اهل الذمة۔

نہیں ہیں، بلکہ العشور صرف اہل

ذمہ پر ہے۔

(طحاوی ص ۳۱۲)

مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام چونکہ ”الصدقات“ ادا کرتے ہیں اس لئے حکومتی دھیک باج و خراج وغیرہ سے وہ مستثنیٰ ہیں اور اب خراجی آمدنی صرف اہل ذمہ پر رہ جاتی ہے۔ حکومتی ٹیکسوں سے استثناء ہی کا شرف تھا جسے بعض مسلمان کھونا نہیں چاہتے تھے اور اسلام کے اس قانون کی بنیاد پر یعنی غیر مسلم رعایا کی مملوکہ خراجی زمین اگر مسلمان بھی خریدے گا تو اس سے بھی خراج ہی لیا جائے گا۔ بہت سے مسلمان ابتدا میں خراج کی اس ذلت کو برداشت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ ابن آدم القرشی نے اپنی کتاب الخراج میں یہ سوال اٹھا کر کہ خراجی زمین خرید کر کیا اس کا خراج اپنے ذمہ کوئی مسلمان لے سکتا ہے۔ مختلف اکابر اسلام کا یہ فتویٰ جواب میں نقل کیا ہے۔

لا تجعل فی عنقک صغاسر۔

اپنی گردن میں ذلت کا طوق کیوں ڈالتے

(کتاب الخراج قرشی ص ۵۴)

ہو (یعنی بلا وجہ خراج) کی ذلت کیوں

برداشت کرتے ہو۔

الغرض الصدقات کے خفیہ محصول کو قبول کر لینے کے بعد اتنی قیمتی آزادی کا حصول، پھر ”الصدقات“ کے نام سے مسلمانوں کے مال و جائیداد و مولیٰ پر جو محصول عائد کیا گیا وہ کوئی نئی چیز کبھی بھی نہیں ہے۔ ہر مذہب والے اپنی آمدنی کا ایک حصہ خیر و خیرات میں صرف ہی کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اسی بہم غیر منظم خیرات کو صرف منظم اور باقاعدہ شکل میں تبدیل کر دیا اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس تنظیم کی وجہ سے اگر نسبتاً عام خیرات سے کچھ رقم بڑھ بھی گئی ہو، جب بھی ہر قسم کے مطالبات سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سے الصدقات کے فنڈ میں شریک ہونے والے قطعاً نفع ہی میں رہتے ہیں۔ کہاں پیداوار کا نصف حصہ کہاں دسواں اور بیسواں حصہ دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے اور اس پر لطف یہ ہے کہ جس

علاقوں کے لوگوں سے لیا جاتا تھا زیادہ تر اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ اسی علاقہ کے حاجتمندوں میں تقسیم کر دیا جائے جو ان اتفاقی مصائب کے شکار ہو گئے ہوں، بلکہ ان کے اعزہ اقربا خاندان والوں کو جب ترجیح دی جاتی تھی تو گویا قریب قریب الصدقات میں شریک ہونے سے وہی غرض حاصل ہوئی جس غرض سے آدمی آج کل بیہ کمپنیوں یا انجمن ہائے اتحاد باہمی میں شریک ہوتا ہے پھر محصول عائد کرنے میں اتنی نرمیاں کہ اپنے اور خاندان بھر کے روزمرہ مصارف سے بچانے اور فراغ بالی کے ایک خاص معیار کے بعد اس محصول کا مطالبہ کیا جاتا ہے، دقت رسی کے تمام اصولوں محنت و جان کا ہی کی تمام نزاکتوں کا خیال کرتے ہوئے سال بھر کے استفادہ کا موقع دینے کے بعد ان کو وصول کرنا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کو خدا کی خوشنودی کا ایک بہترین ذریعہ قرار دینا قرآن و حدیث جن کے فضائل سے معمور ہیں، اس کے بعد ملک کے ان واقعی حاجتمندوں کی اعانت کا ارادہ کر کے حکومت کا اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لینا اور اپنی تمام فوجی و عسکری قوتوں کو اس کی وصولی کے لئے مختص کر دینا حتیٰ کہ ایسے خطرناک وقت میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عرب کے ایک بڑے حصہ میں بغاوت پھیل گئی ہو۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکومت کے خراج کے لئے نہیں جیسا کہ اکثر مغربی مؤرخین کو دھوکا ہوا ہے بلکہ غریبوں کے ان حقوق کی حفاظت کے لئے اپنی آخری قوت تک مقابلہ کا چیلنج دینا کہ

لو منعونی عقلاً ما
عطوہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم لجاہد ہم

اگر الصدقات کے سلسلہ میں کسی ایسی
ڈوری کے ادا کرنے سے انکار کریں گے
جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

میں ادا کرتے تھے تو ان سے میں جہاد کروں گا۔

جیسا کہ صحاح کی ہر کتاب میں مذکور ہے۔ حضرت عمرؓ کی مخالفت کے باوجود اس پر اصرار کرنا اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلام نے حکومت کے موازنہ میں جہاں ان جدید مصارف کا اضافہ کیا ہے وہیں اس کی وصولی کی کتنی آسان اور کتنی قطعی و یقینی راہیں اس نے اختیار کی تھیں جو الصدقات کا ایک مذہبی فریضہ ہونا اور کیسا مذہبی فریضہ کہ صحابہؓ میں بعضوں کا خیال تھا،

ما مانعاً لزکوۃ بمسلم ومن
لم یؤدھا فلا صلوۃ لہ۔

زکوۃ کا نہ ادا کرنے والا مسلمان ہی
نہیں ہے اور جو زکوۃ ادا نہیں کرتا۔

(الخزاج لابن یوسف ص ۴۵) اس کی نماز بھی نہیں ہوتی۔

قرآن اور صحیح حدیثوں میں اس مطالبہ کے نہ ادا کرنے والوں کے متعلق اتنی شدید تاکیدیں مثلاً اس کی پیشانی اس کے پہلو قیامت میں داغ دیے جائیں گے (قرآن) قیامت کے دن اس کا مال جس کی زکوۃ ادا نہ ہوئی ہو اس شخص کے سر پر یہ شکل اثر دریا چھتے ہوئے اونٹ اور بکریوں کی شکل میں آنا اور ان سب پر مزید برآں حکومت کی تلوار کا اس کی وصولی کی ضمانت لینا کون

کہہ سکتا ہے کہ دینے والے کے پاس اس مد کا ایک پیسہ بھی باقی رہ سکتا ہوگا۔ پھر سوچنا چاہیے کہ جس حکومت کے خزانے میں ملک کے ان ناپربان حال طبقات کے لئے ایسا انتظام کیا گیا ہو اس ملک کی امن و عافیت کا کیا حال ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی باپ اپنے مرنے سے اس لئے خوف زدہ رہ سکتا ہے کہ اس کے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ بیوی بیوہ ہو کر لاوارث ہو جائے گی۔ نہ کسی کو اس کا خطرہ رہ سکتا ہے کہ میں اگر اتفاقی طور پر کسی مصیبت یا مرض کا شکار ہوا اور میرا ہاتھ خالی ہو گیا تو علاج کون کرے گا۔ میرے بچے کیا کھائیں گے۔ اگر کسی تاجر کو تجارت میں خسارہ آجائے۔ کسان کو زراعت میں نقصان پہنچے۔ کوئی لنگڑا ہو جائے، اندھا ہو جائے، بڈھا ہو جائے سب کو اطمینان ہے کہ میری امداد کے لئے سرکاری خزانہ میں مستقل کافی رقم موجود ہے جس ملک کے مقروضوں کو قرض توڑنے کے لئے نہ سودی قرض کی حاجت نہ جائیداد بیچنے کی ضرورت کہ ان کے قرض کی ادائیگی کا سامان حکومت کے خزانے میں موجود ہے۔ بیوپار کاروبار کرنے والے مسافر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہیں نہ ان کو اس کی فکر کہ کس جگہ جا کر میرا ہاتھ خالی ہو جائے گا کہ ہر ضلع ہر تعلقہ کے مقامی خزانہ میں اس کی امداد کا فنڈ موجود ہے۔ شاید صاحب حیثیت مسافروں کو شبہ ہو کہ اس مد کا تعلق ہم سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر مطمئن کر دیا کہ

(لا تحل صدقة الا فی سبیل اللہ) صدقہ کا مال جائز نہیں (مستطیع لوگوں کیلئے)

و ابن السبیل (سنن بیہقی) لیکن جہاد اور مسافر کے لئے۔

بلکہ مسافروں کے لئے تو اسلام نے ایک جدید سہولت کا بھی اضافہ کر دیا ہے کہ یوں تو ہر مسلمان پر واجب قرار دیا کہ

ان نزلتم بقوم فان ادواکم
بما ینبغی للضیف قاقبلوا فان لم
یفعلوا فخذوا منھم جو الضیف
الذی ینبغی لھم۔

(رواہ البخاری) تم کسی کے یہاں مہمان بن کر جب اترو اور میزبان اگر مہمان کے لئے مناسب انتظام کرے تو اس کی مہمانی کو قبول کر لیا کرو، اور اگر میزبان ایسا نہ کرے تو پھر ان سے مہمانی کا حق جو میزبان

کی آمدنی کے مناسب حال ہو وصول کر لیا کرو۔

اسی طرح غیر اقوام جب اسلامی حکومت کی رعایا بننے پر آمادہ ہوتی تھیں تو اس وقت ان سے جو معاہدہ لیا جاتا تھا اس میں یہ بھی ہوتا تھا کہ

ضیافۃ من مر بھم من

المسلمین (بیہقی)

اس کی مہمانی کریں گے۔ اگرچہ فقہاء نے اب ”ضیافت“ کے مسئلہ کو بجائے واجب کے مستحب قرار دیا ہے۔ لیکن جب بہ کثرت حدیثوں میں،

من ۲ صبح الضیف بفتائہ فہو
علیہ حق ۲ و قال دین انشاء
۲ اقتضاہ ان شاء ترکہ۔
جس کے گھر کی انگنائی میں مہمان پہنچے تو
مہمان کا اس پر حق قائم ہو جاتا ہے (بعض
روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا بن پروردہ دین
(بیہقی)

ہے، چاہے اس دین کو مہمان وصول کرے چاہے چھوڑ دے۔

وغیرہ الفاظ میں آئے ہیں تو مسافروں کے لئے اسلام کی مہیا کردہ سہولت کو آسان کیوں نہ کیا جائے
گھر میں رہنے والے کے لئے کسی باہر سے آنے والے مسافر کا کھانا غالباً باعث مشقت نہیں ہو سکتا۔
واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے ابتدا میں جو نقشہ قائم کیا تھا کاش کچھ دن بھی مسلمان اس نقشہ کو
باقی رکھتے تو آج گھر گھر اگر نہ دنیا ہیہ اور انشورنس کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی نہ غریب مخلوق اور
کاشتکاروں کی مشکلات کا حل باہمی اتحاد والی سود خوار انجمنوں میں سوچا جاتا، گویا ”پنجہ گرگ“
(ساہوکار) سے نکال کر اس کے حلق پر ان انجمنوں کی چھری چلائی جاتی ہے۔ مسلمان علماء کو مجبور
کیا جا رہا ہے کہ سود اور ہیہ وغیرہ کی شکلوں کے جواز کی صورت پیدا کریں۔ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام
کے نظام میں ان مشکلات کے حل کی کوئی تدبیر نہ تھی اور گویا اب یورپ کا ذہن پہلی دفعہ ان مسائل
کی طرف منتقل ہوا۔ لیکن کیا کیجئے کہ کسی تصویر کے کسی ایک حصہ کے دیکھنے سے پوری تصویر کا حال
معلوم نہیں ہو سکتا۔ صرف زندگی کا یہی ایک شعبہ ہے جس میں اسلام کی ان نکتہ نواز یوں کا کوئی ٹھکانہ
نہ ہے۔ ابھی یورپ اور اس قسم کے دوسرے مفکروں کو مدت چاہیے جو اللہ کے بنائے ہوئے نظام نامہ
حیات کو خود تو کیا بنا سکیں گے سمجھ لیں تو غنیمت ہے۔

الصدقات کے متعلق اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جدید اسلامی نظام زندگی کی جو شادابی و تواترگی
ایک تاریخی تغیر عہد نبوت اور عہد صحابہ میں تھی وہ بعد کو باقی نہ رہی لیکن اس معاشی نظام
کی پہلی اینٹ خدا جانے کن اسباب کے تحت کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے
میں اپنی جگہ سے سرک گئی آپ نے ”الصدقات“ کی اور تمام مدون (یعنی مویشی کاشت کردہ گیری)
کی شکل میں جو وصول ہوتی تھی ان کو تو باقی رکھا۔ لیکن روپیہ اور اشرافی سونا چاندی کی شکل میں
جو اندوختہ مسلمانوں کے پاس تھا اس کی زکوٰۃ کو بجائے حکومت کے پھر انفرادی طور پر دینے کی
اجازت دیدی۔ امام ابو بکر جصاص رازی اپنی تفسیر میں ناقل ہیں،

۱ صامز کوۃ ۲ الاموال فقہ
کانت تحمل الی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم و
ابی بکر و عمر و عثمان ثم
خطب عثمان فقال هذا
الاموال (سونا چاندی) کی زکوٰۃ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر و عمر و عثمان
رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد تک ان ہی
بزرگوں تک پہنچائی جاتی تھی۔ یعنی
(حکومت میں یہ آمدنی داخل ہوتی تھی)

پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے
ایک دن خطبہ دیا اور فرمایا کہ (رمضان کا
یہ مہینہ تمہاری زکوٰۃ ادا کرنے کا مہینہ
ہے۔ پھر جس پر کچھ دین (باقی ہو) وہ

شہر زکوٰۃ تم فہم کان
علیہ دین فلیودہ شہ
لیترک بقیۃ مالہ -

(احکام القرآن ج ۵ ص ۵۵ ج ۲)

ادا کر دے اور اپنے باقی مال کو چھوڑ دے۔

جصاص لکھتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے،

حضرت عثمان نے (زکوٰۃ دینے والوں کو)
اختیار دیدیا کہ خود براہ راست مسکینوں
کو دے دیا کریں، اس وجہ سے امام

فجعل لہم اداۃھا ۲ لی

المساکین و سقط من اجل

ذلک حق الامام فی اخذھا

(حکومت) کا جو حق اس مد کی وصولی کا تھا وہ ساقط ہو گیا۔

حالانکہ چند سطر پہلے جصاص ہی نے آیت قرآنی،

خذ من اموالہم صدقہ

کے تحت یہ لکھا تھا کہ،

ان کے مال سے اے پیغمبر صدقہ لیا کرو۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ "الصدقات"

کی وصولی امام (حکومت) کے سپرد ہے

اور وہ شخص جس پر زکوٰۃ واجب ہے اگر

خود مسکین کو (براہ راست) ادا کر دے گا

تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ کیونکہ زکوٰۃ کی وصولی کا

جو حق امام (حکومت) کو حاصل تھا وہ

یدل علی ان اخذ الصدقات

الی الامام و انہ متی اداھا

من وجبت علیہ المساکین

لم یجوز لان حق الامام

قائم فی اخذھا فلا سبیل

الی اسقاطہ۔

اب تک باقی ہے اور اس کے ساقط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

جب یہ قرآنی قانون ہے اور تنظیم جس کا قرآن نے ارادہ کیا تھا اس کا اقتضا بھی یہی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ
حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے یہ کیسے اخذ کر لیا گیا کہ آئندہ ہمیشہ کے لئے مالی زکوٰۃ کی حد
یہ قانون منسوخ ہو گیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قول سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ خصوصیت کے
ساتھ اس سال حضرت نے کسی خاص وجہ سے "اموال" کی زکوٰۃ کا اختیار خود مالکوں کو عطا کر دیا
تھا اور یہ ہو سکتا ہے کہ امام کسی سال اپنی مرضی سے اپنے کسی اختیار کو دوسرے کے سپرد کر دے
لیکن اس کو دوامی قانون بنا دینا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد ہر امام سے اس حق کو چھین لینا جو
قرآن کا عطا کیا ہوا حق بلکہ سپرد کی ہوئی خدمت ہے۔ آخر کس بنا پر جائز ہو سکتا ہے۔ مگر باوجود
اس ایک مد کے انفرادی ہونے کے "الصدقات" کی اور دوسری مد میں جو کم نہ تھیں اور بلا مبالغہ
کہا جاسکتا ہے کہ خلافت عباسیہ تک ان مدوں کی آمدنی کروڑوں سے متجاوز ہوگی چرچی زیدان نے

موجودہ مؤرخوں کی تحقیقات کی بنا پر لکھا ہے کہ

ان متوسط جباية الدولة في
العصر العباسي الاولی بلغ ۳۶۰
مليون درهم في العام (ص ۱۷۷ ج ۲)
کہ عباسی عہد کی ابتدا میں دولت کی
آمدنی تین سو ساٹھ ملین درہم
سالانہ آمدنی تھی۔

جرجی زیدان ہی کا بیان ہے کہ خراجی آمدنی جو حکومت کے مصارف پر خرچ ہوتی تھی،
لا ینفق منها علی مصالح الدولة
اکثر من ۵۰ مليون والباقي نحو
۳۰۰۰۰۰۰ درهم تبقى فی بیت
اطال (ص ۶۷ ج ۳)
رہ جاتا تھا۔

بہ ظاہر یہ تیس کروڑ درہم والی آمدنی یہی "الصدقات" کی آمدنی تھی جن کے مصارف "مصلح الدولة" کے سوا وہی
تھے جن کی فہرست حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل کی تھی۔ اور جہاں تک میراجیال ہے اکثر و بیشتر ان میں بے ضابطگی
کم برتی جاتی تھی آخر کتاب الخراج امام ابو یوسف ہارون الرشید کے زمانے کی کتاب ہے اس کو ہارون نے
فرمانش کر کے لکھوایا ہے کہ حکومت کے دستور العمل کی حیثیت سے وہ کام آئے اس کتاب میں الصدقات کے
متعلق جو قوانین درج ہیں ان کے بعض اجزاء گزر چکے۔ اسی کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا مسلمان عباسیوں کے عہد تک
پہنچتے ہوئے بہت کچھ اصل راہ سے ہٹ گئے تھے لیکن پھر بھی عام مسلمانوں کی فراغیا لیاں اسی تھیں
جنہیں تاریخ کی زبان باوجود چھپانے کی انتہائی کوششوں کے اب بھی چھپانہ سکی جرجی زیدان جیسے آدمی
کے قلم سے بھی یہ الفاظ نکل پڑے کہ حکومت کے خزانے میں ملک کا جو کچھ روپیہ جاتا تھا۔

فیعود الی العامة کانه
لم یوخذ منهم وھی سنة
الاسرائاق تظہر الاول
وہ بالآخر عامہ (ملک کے عام باشندوں)
کی طرف واپس آجاتا تھا۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ گویا لوگوں سے کچھ لیا ہی نہیں گیا۔

۱۵۔ الاسرائاق دراصل ہمارے یہاں کے "وظائف" کے لفظ کا ترجمہ ہے۔ اسلامی حکومتوں کے بیت المال اور خزانہ کی یہ ایسی
خصوصیت ہے جس کی یادگار محمد اللہ کسی نہ کسی شکل میں اب تک ان ممالک میں پائی جاتی ہے جہاں اسلامی حکومت قائم ہے
خصوصاً سلطنت آصفیہ کا خزانہ عامہ اس زمانے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب و عجم میں بھی اس خاص معاملہ میں کافی شہرت رکھتا
ہے۔ خدا کا فضل ہے کہ اب تک وظائف کے نام سے ہر سال بیش قرار رقوم ماہوار کمیشنت ارباب استحقاق میں تقسیم ہوتی
رہتی ہیں۔ جن لوگوں کو اسلامی بیت المال کی اس خصوصیت اور نقطہ نظر کا علم نہیں ہے وہ حیدرآباد پہنچ کر وظائف کے رواج پر
حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ بعضوں سے تو یہاں تک سنا ہے کہ اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر صرف سلطنت آصفیہ کا ہی ایک خزانہ ہے جہاں
سے بغیر کسی معاوضہ کے لوگوں کو امدادیں ملتی ہیں شاید جنگ عظیم کے بعد یورپ کے بعض ممالک نے بھی بے روزگاروں کے لئے کچھ وظائف منظور
کئے ہیں۔ لیکن جو یاتین آج دوسری قوموں کے لئے نئی ہیں مسلمانوں کے لئے اس میں کوئی اجنبیت نہیں ہے ۱۲

وہلۃ اہل اہل من خصائص اہل تمدن
الاسلامی۔

اور یہ نتیجہ اس خاص رواج کا تھا جسے
الارتزاق (وظائف حکومت) کہتے

ہیں پہلی نظریں معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی حکومتوں کی یہ خاص خصوصیت تھی۔

جرجی زیدان اگرچہ اس ”ہنر پر عیب“ کی چادر اڑھانے کے لئے اس پر اضافہ بھی کرتا ہے۔ یعنی
شاید یہ کوئی نئی بات نہ تھی قدیم زمانے میں،

فاهل ایشیا خاصة اليونانيون
كانوا لا يعملون عملا ولا
يحترفون حرفة في سبيل
الزرق وانما كانت ارضهم
من خزينة الدولة يتناولونها
سواء في اوقات معينة
او هبات في اوقات غير
معينة ولم يكن لهم شغل
غير سماع الخطب السياسية
او العلمية او التمشي في
حدائق المدينة وحضرة
الاحتفالات الرسمية ونحوها

ایتھنز کے باشندوں کا بھی یہی حال تھا
اور یہ یونانیوں میں خواص کا طبقہ تھا جو نہ
کوئی کاروبار کرتے تھے اور نہ کوئی دستکاری
پیشہ روزی حاصل کرنے کی راہ میں اختیار
کرتے تھے۔ ان کے وظائف حکومت کے
خزانے سے جاری تھے جسے وہ ماہ بہ ماہ
مقررہ اوقات میں وصول کرتے تھے یا
غیر معین طور پر بطور ہبہ اور بخشش کے
ان کو ملا کرتا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ ایتھنز
والوں کا کام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ
سیاسی یا علمی لکچروں کو گھوم گھوم کر
سنا کریں یا باغوں اور پارکوں میں

گھوما کریں یا ملک کی سرکاری مجلسوں میں شرکت کیا کریں۔

مگر اس بندہ خدا کو پھر خیال آیا کہ آخر پھر وہ کیا چیز ہے جو اسلامی تمدن دنیا کے سارے تمدنوں سے ہر مؤرخ کو
جدا نظر آتا ہے پھر خود جواب دیتا ہے کہ یونانیوں کی یہ خصوصیت،

كانت محصورة في ایشيا و
غيرها من العواصم الكبرى
اما المسلمون فتوسعوا فيه
حتى شمل كل مدينة وكل
طبقه (ص ۶۷)

یونانیوں کی یہ خصوصیت صرف ایتھنز
شہر یا چند دوسرے مرکزی شہروں
محدود تھی، لیکن مسلمانوں نے اس
میں وسعت پیدا کی حتیٰ کہ ہر شہر اور ہر
طبقہ تک اس کو عام کر دیا۔

پھر اس کی توجیہ و تاویل میں حسب عادت آسمان و زمین کے قلابے ملانے کی بیکار کوشش کی ہے
یہ مذہبی کوشش یہاں تک پہنچتی ہے یعنی زیدان نے دعویٰ کیا ہے کہ اسلام سے پہلے سلاطین عرب کا
بھی یہی دستور تھا۔ غریب عرب بھلا سلاطین سے اتنا آشنا ہی کب تھا اور کچھ تھا بھی تو عرب کو اس سرسبزی
و شادابی اس امن و عافیت سے قبل اسلام کیا تعلق تھا جس کا نظارہ عرب اور عجم کی آنکھوں نے اسلامی

دور میں دیکھا کہ ہر یتیم ہر یتیم ہر معذور ہر مقروض ہر تاروان رسیدہ تاجر، مصیبت زدہ کسان سب اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ ان کے اکھن اتحاد باہمی اور ہمہ کینی میں ان کا کثیر سرمایہ جمع شدہ ہے۔ خصوصاً کاشتکاروں کے ساتھ حکومت کی دلچسپیاں اس حد تک بڑھی ہوئی تھیں کہ زمین اور آبپاشی کے انتظامات کے ساتھ ساتھ مسلم ہی نہیں بلکہ غیر مسلم کاشتکاروں تک کے لئے یہ حکم تھا کہ اگر تخم اور ہل بیل وغیرہ کے لئے ان کے پاس سرمایہ نہ ہو تو

۱۰ یدفع للعاجز کفائتہ من
بیت المال قرضاً لیعمل فیہا
(فتح القدیر ص ۳۶۲ ج ۳)

جو کسان تخم وغیرہ کے مہیا کرنے سے
معذور ہو، اسے سرکاری خزانہ سے
بطور قرض کے اتنا سرمایہ دیا جائے

جس سے اپنے کاروبار کو جاری کر سکے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ تقاضی کی رقم مسلمانوں ہی کی نکالی ہوئی ہے یا ہندوستان میں اب تک اس کا رواج ان ہی کی بدولت باقی ہے۔

کاشتکاروں اور کسانوں کے ساتھ کس حد تک خراج کے لینے میں نرمی اختیار کرنی چاہئے۔ اس کا اندازہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس اثر سے ہو سکتا ہے، ایک صاحب جنہیں اپنی خلافت کے عہد میں مالگزارمی کی تحصیل کے لئے حضرت والائے روانہ کیا تھا ان ہی کا بیان ہے کہ

۱۰ ستعملنی علی بن ابی طالب علی
بوزج سالیوس فقال لا تقر بن
رجل سوطانی جبایۃ درہم
ولا تبیع رزقا ولا کسوة شتا
ولا صیف ولا دابة یعملون
علیہا ولا تقم رجلا قائما فی
طلب درہم قال قلت یا امیر
المومنین ۱۰ اذ ۱۰ رجع ۱۰ لیک
لما ذہبت من عندک قال
وصیک ۱۰ انما امرنا ان نأخذ منهم
العفو یعنی ۱۰ الفضل۔

مجھے حضرت علی بن ابی طالب نے بزرگ سالیو
(نامی تحصیل) کا تحصیلدار مقرر فرمایا (جب
روانہ کرنے لگے تو فرمایا) دیکھو روپے
(درم) کی تحصیل میں کسی کو کوڑے سے
نہ مارنا اور نہ کسی کی خوراک کو بیچنا اور
نہ سرما و گرما کے کپڑے ان کے نیلام کرنا
اور نہ ان کے ان جانوروں (بیل وغیرہ) کو
نیلام کرنا جس سے وہ کام کرتے ہیں
اور روپے کی تحصیل میں کسی کو ایک ٹانگ پر
کھڑا بھی نہ کرنا (تحصیلدار نے کہا) کہ ایسی
صورت میں تو حضور میں اسی طرح واپس
آجاؤں گا جیسے گیا تھا یعنی خالی ہاتھ آنا

(سنن بیہقی ص ۲۰۵ ج ۹)

پڑے گا، تب حضرت علیؑ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہے ہمیں حکم ہی یہ دیا گیا ہے کہ العفو سے
وصول کریں، یعنی جو ضرورت سے زائد بچا ہوا ہو،

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسانوں کے ساتھ اسلام کا صحیح نقطہ نظر کیا تھا! العفو کی شرح میں نے کسی اور

موقعہ پر بھی کی ہے، جس کا مطلب یہی ہے کہ ان کے ذرائع آمدنی پر دست اندازی نہیں کرنا چاہیے بلکہ آمدنی سے مال گزاری وصول کرنا چاہیے۔ جب بیل وغیرہ تک کو نیلام کرنے کی اجازت حضرت نہیں دے رہے تھے۔ تو اس سے اندازہ کرنا چاہیے، اور چیزوں کے متعلق ان کا کیا خیال ہوگا اس سلسلہ میں خیال کرنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ معاہدے کے بعد کسانوں کو جو زمین اسلامی حکومت بندوبست کر دیتی تھی تو جو مال گزاری معاہدے کے وقت طے ہو جاتی تھی اس پر اضافہ کا استحقاق بھی آئندہ حکومت کو نہیں رہتا تھا۔ اس باب میں متعدد روایتیں ہیں، جن میں ایک روایت حضرت عمرؓ کی ہے ابراہیم نخعی اس کے راوی ہیں وہ کہتے ہیں،

جاء رجل الى عمر فقال ان
ارض كذا وكذا يطيقون من
الخراج اكثر مما عليهم فقال
لا سبيل اليهم انما صالحناهم
صالحا۔ (البیہقی ص ۱۲۲ ج ۹)

ایک آدمی حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اگر
اس نے خبر دی کہ فلان فلاں اراضی سے
اتنا اس وقت وصول ہوتا ہے اس سے
زیادہ مال گزاری ادا کرنے کی اس میں
صلاحیت ہے، تب حضرت عمرؓ نے فرمایا

ان لوگوں پر اضافہ کی راہ بند ہے جو مال گزاری اس وقت لی جا رہی ہے اسی پر
ان سے صلح ہوئی ہے۔

بہر حال اسلامی حکومت کے خزانے میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اس کے جو اغراض تھے یا ان کو ہونا چاہیے غالباً اس کے متعلق کافی بحث ہو چکی جن لوگوں کے سامنے معاش کا یہ نظام پیش کیا گیا ہے وہ اب فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بیت المال کے اس عجیب و غریب نظام کے بعد پھر کیا دنیا کو بیمہ انشورنس انجمن ہائے اتحاد باہمی جیسی سطحی اور وقتی معالجوں کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ بے روزگاری کی جو عام شکایت پھیل گئی ہے کیا اس کا احتمال اس وقت بھی باقی رہ سکتا ہے جب حکومت اپنی رعایا کے بے سرمایوں کو سرمایہ دینے کے لئے اپنے پاس مستقل بیش قرار رقم رکھتی ہو، ہبہ بھی دینے کے لئے تیار ہو اور قرضہ بھی۔

”الصدقات“ کی ”وصولی“ اور ”صرف“ کے متعلق اسلام نے جن نکات کو اپنے پیش نظر رکھا ہے، اگرچہ موٹی موٹی باتیں اس سلسلے میں جو یہاں قابل اندراج ہو سکتی تھیں ان کا بیان گزر چکا۔ لیکن اسی ذیل کی دو چیزیں چھوٹ گئی تھیں مناسب ہے کہ آخر میں ان کا بھی اضافہ کر دیا جائے میرا مطلب یہ ہے کہ منجملہ گذشتہ بالا امور کے ”الصدقات“ کے متعلق اسلام نے ان دو شرطوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

(۱) ایک تو یہ ہے کہ جس طرح الصدقات کے مد کی آمدنی کو الخراج والجزیہ وغیرہ کی آمدنیوں سے بالکل جدار کھنے کا حکم ہے اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اس مد کی آمدنی کا ایک جبہ کسی ایسے آدمی کو نہیں مل سکتا جو اسلامی نقطہ نظر سے غنی اور صاحب حیثیت ہو۔ اس

”غنی“ سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں کا مالک ہو، بلکہ ملک کا ہر ایسا باشندہ جو اپنی اور اپنے اہل و عیال کے روزمرہ مصارف کے سوا دوسو درہم یا ساڑھے باون تو لہ چاندی یا اس کے مساوی کسی سرمایہ کا مالک ہو اس کے لئے اس آمدنی کا ایک جہ تک حرام ہے اس معاملہ میں کتنی شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر کے سامنے ایک آدمی آیا جس کے مشکیزے میں دودھ تھا۔ حضرت عمر کو بھی ایک پیالہ اس دودھ کا ملا دودھ کچھ مزیدار تھا آپ نے دریافت فرمایا کہ کہاں سے لائے ہو بولا کہ فلاں گاؤں کی چراگاہ پر میرا گزر ہوا وہاں ”الصدقات“ کے اونٹ چر رہے تھے ایک اونٹنی کا لوگ دودھ دوہ رہے تھے میں نے بھی سھوڑا سا مانگ کر اپنے چھاگل میں رکھ لیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت عمر پر عجب حالت طاری ہو گئی، راوی کا بیان ہے،

فدخل صبعه فی فیه واستقأ

اپنی انگلی منہ میں ڈالی اور قے کرتے

(بیہقی)

جاتے تھے۔

بہر حال قانونی ”الغنی“ کے لئے تو قطعاً اس مال کا ایک ایک پیسہ حرام ہے لیکن جو قانونی غنا نہ رکھتا ہو بلکہ شب و روز کی خوراک سے زیادہ اس کے پاس سامان ہو، ایسے آدمیوں کے لئے یہ حرام تو نہیں ہے۔ لیکن ”الصدقات“ کے شعبہ سے مانگنا اس کے لئے بھی ناجائز ہے۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک طرف ملک کے ان مصیبت زدہ طبقات کے لئے اسلامی حکومت نے اپنے خزانے میں کچھ یہ سارا انتظام بڑی طاقت سے کر رکھا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی نظر اس پر بھی تھی کہ کہیں خزانے کی اس مدیر بھروسہ کر کے ایتھنز کے خوش باشوں کی طرح بے کاری اور بیکار وقت گزاری کے لوگ عادی نہ ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر خاص نظر تھی۔ جب کوئی اس مدرسے مانگنے والا آتا تو آپ ایک خاص نظر سے اس کو دیکھتے اور نرمی سے مختلف الفاظ میں ان کو سمجھاتے جس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ حتیٰ الوسع ”الصدقات“ کے مال سے صاحب استطاعت لوگوں کو پرہیز ہی کرنا چاہیے۔ حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر ایک وقت میں بڑی تنگی پیدا ہو گئی گھر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا کہ الصدقات کی رقم کچھ میری مدد فرمائی جائے۔ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے عرض کرنے پر ارشاد فرمایا،

من استغنی اغناہ اللہ من

جو بے نیازی کا رویہ اختیار کرے گا، خدا

استعف اعفہ اللہ۔

اسے بے نیاز رکھے گا اور جو دوسروں سے

لینے میں احتیاط برتے گا، خدا بھی اس کی آبرو کی حفاظت کرے گا۔

۱۔ یہ ہندوستان کے قدیم فقہاء کے حساب کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے میں ساڑھے چھتیس تو لہ ہی کو غنا کا نصاب قرار دیا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک پہلی صورت زیادہ درست ہے ۱۲

حضرت ابوسعید پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ
لاستعفف فی غنی ۲ اللہ و
لاستغنی فی غنی ۲ اللہ۔

میں دوسروں سے مانگنے میں احتیاط
کر دی گا خدا میری آبرو بچائے گا۔

اور میں اپنے کو مخلوقوں سے بے نیاز رکھوں گا خدا مجھے بے نیاز رکھے گا۔

کہتے ہوئے واپس ہوئے ان کا بیان ہے کہ اپنے اس استعفاف واستغفار کے نتائج کو بالآخر میں
نے اپنی آنکھوں سے اس شکل میں دیکھا کہ

سالت علینا ۲ اللہ نیا فقر دتنا
۲ لا من عصم ۲ اللہ۔

ہم پر دنیا کا سیلاب چھا گیا اور
اور ہمیں اس نے ڈبو دیا۔ لیکن وہی
جنہیں اللہ نے محفوظ رکھا ہو۔

(الطحاوی)

اس کا ہلی اور بے عملی کے خطرے کے انسداد کے لئے تقریباً عام مجلسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
جہاں چند اور باتیں فرماتے ان میں ایک فقرہ عموماً یہ بھی ہوتا تھا،

۲ الید ۲ العلیا خیر من ۲ الید
۲ السفلی (صحاح)

اوپر والا ہاتھ (دینے والا ہاتھ) نیچے والے
ہاتھ سے بہتر ہے۔

یہ بھی ارشاد ہوتا

۲ الیدی ثلاث فید ۲ اللہ ۲ العلیا
وید ۲ المطعی ۲ التی تلہا وید
۲ السائل ۲ السفلی ۲ الی یوم القیمۃ
فاستعفف ما ۲ استطعت
ولا تعجز عن نفسک ولا تلام
علی کفایت ۲ واذ ۲ تاک ۲ اللہ
خیر ۲ فلیر علیک۔ (الطحاوی)

ہاتھ تین ہیں، تو سب سے اونچا ہاتھ
خدا کا ہے اور دینے والے کا ہاتھ
(خدا کے ہاتھ کے بعد ہے) اور مانگنے والے کا
ہاتھ سب سے نچلا ہاتھ ہے (اور یہ
نسبت قیامت تک قائم رہے گی) پس
جہاں تک مانگنے سے بچ سکتے ہو، بچو، اور
خود کمانے سے نہ تنہو اور بقدر کفایت

اگر تمہارے پاس ہو تو پھر تم قابلِ ملامت نہ ہو اور خدا تمہیں جب کچھ خیر (مال) دے
تو چاہیے کہ اس کو اپنے اوپر نمایاں کرو،

حتیٰ الوسع لوگوں کو واقعی مستحقین کے اس حق سے بچنے اور کنارہ کش رہنے کا حکم دیا جاتا تھا اطرار
اس پر کیا جاتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی خدا داد قوتوں سے روزی حاصل کرنے میں کوشش
کی جائے (لا تعجز عن نفسک کا یہی مطلب ہے) اور زیادہ امیر نہ ہونے کو کوئی جرم نہ خیال کرے اور
اس جرم سے برہی ہونے کے لئے الصدقات کی رقم سے امیری نہ پیدا کی جائے (مثلاً عموماً اپنی لڑکیوں
کی شادی میں نمائشی مصارف کے لئے لوگ کنیا دان مانگا کرتے ہیں کہ سو سائٹی میں ورنہ بے غرق ہوگی)
(۲) دوسری بات اس سلسلہ میں جو یہاں قابل ذکر ہے وہ الصدقات کی ایک خصوصیت بھی ہے

مقصود یہ ہے کہ جس وقت مسلمانوں سے "الصدقات" کا مطالبہ کیا گیا۔ بدگمانوں کو شاید اندیشہ ہو سکتا تھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (العیاذ باللہ) خود اپنی اور اپنے اہل خاندان کی معاشی مشکلات کے حل کی یہ راہ تو نہیں بنائی ہے۔ خصوصاً جب اس زمانے میں بھی اکثر ممالک میں اس وقت تک خیر و خیرات کی رقوم یا مصارف دعوت وغیرہ کا استحقاق اسفیں لوگوں کے ساتھ زیادہ مخصوص سمجھا جاتا ہے جن کی زندگی مذہبی ہو اور جو مذہب کی نمائندگی کرتے ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبی نمائندہ ہونا اس بنا پر آپ کے بعد مسلمانوں میں مذہبی نمائندگی کا قدر تا زیادہ استحقاق آپ کی آل اور آپ کے خاندان والوں ہی کو ہو سکتا تھا۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ عموماً اسلام سے پہلے مذہبی نمائندگی کے لئے صفات سے زیادہ ذاتی اور نسبی خصوصیات کو عموماً دخیل سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان بھی میں یہ عہدہ صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو برہمنوں کی نسل سے ہوں اور یہی حال تقریباً اکثر غیر اسلامی سوسائٹیوں کا ہے میرا خیال ہے کہ غالباً یہ بھی ایک مصلحت تھی جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے اوپر اور اپنے خاندان والوں پر خواہ وہ غربت و فقر کے کسی حال میں ہوں "الصدقات" کی آمدنی کو قطعی طور پر حرام فرما دیا۔ اس سلسلہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اتنا نازک احساس رکھتے تھے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام بچے تھے سامنے "الصدقات" کے مد کی کھجوروں کا ایک ڈھیر بڑا ہوا تھا۔ سرکتے ہوئے ڈھیر کے پاس پہنچ گئے اور صرف ایک کھجور منہ میں اٹھا کر ڈال دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ پڑ گئی جھپٹ کر دوڑے اور بے قرار ہو کر فرمانے لگے۔

تھو متھو اسے سچینک دو۔

کنج کنج ۲۰ روپہا۔

اور فرمانے لگے۔

تم نہیں سمجھتے کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے۔

اما شعرت انالا ناکل الصدقة
(رواہ البخاری)

بعض روایتوں کے الفاظ ہیں،

ہم لوگوں کے لئے صدقہ کا مال جائز نہیں ہے

انالا ناکل لنا الصدقة

اسی بنا پر فقہاء اسلام نے بھی بالاتفاق اپنی قانونی کتابوں میں اس دفعہ کو قانون کی شکل میں داخل فرمایا اور اب تک اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ مساوات اور آلِ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین رشتہ داروں پر الصدقات کی آمدنی حرام ہے۔

آخر میں ایک شبہ کا ازالہ باقی رہ جاتا ہے میں نے کہا تھا کہ "الصدقات" کے مطالبوں کو ادا کرنے والوں کو اسلام ہر قسم کے حکومتی مطالبات سے مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کی رعایا مسلمان ہو کر اس طرح اپنے آپ کو حکومتی مطالبات سے مستثنیٰ کراتے رہے تو پھر حکومت کی کشوری و مطری ورفاہیات عامہ کے مصارف کے لئے کہاں سے رقم آئے گی۔

لیکن اس کا پہلا جواب تو یہی ہے جو گذر چکا کہ اسلامی حکومت کی ہر وہ اراضی جو غیر مسلم رعایا کے قبضہ میں ہو خراجی ہوتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس کو خرید بھی لے گا اور اس کے سوا اس زمین پر قبضہ کرنے کی کوئی دوسری قانونی شکل نہیں جب بھی وہ خراجی ہی باقی رہتی ہے البتہ جزیہ کی آمدنی مسلمان ہونے سے ساقط ہو جاتی ہے اگرچہ بنی امیہ کے حریفوں نے مسلمانوں پر جزیہ باقی رکھا تھا لیکن بہت جلد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں اس غلط قانون کی اصلاح ہو گئی۔

بہر حال خراج کی وصولی کے لئے خراجی زمینیں پہلے تو کافی ہیں نیز ”الصدقات“ کے مصارف جہاں مذکورہ بالا طبقات کے لوگ قرآن نے بتائے ہیں ان ہی کے ساتھ اس آمدنی کو خود مکتفی بنانے کے لئے شروع سے ایک اور مد کا الصدقات کے مصارف میں قرآن ہی نے اضافہ کر دیا ہے یعنی العالمین علیہا یعنی جو لوگ صدقات کے تحصیل و وصول کا کام کرتے ہیں وہ بھی خواہ امیر ہوں یا غریب اپنی تنخواہ ”الصدقات“ کے مد سے بخوشی لے سکتے ہیں اس لئے محکمہ مال کے مصارف کی ادائیگی کی گنجائش تو خود ”الصدقات“ میں ہے۔ نیز ایک مد اس میں ”فی سبیل اللہ“ کی بھی ہے یعنی تبلیغی و دفاعی قوتوں پر بھی یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے، رہ گیا محکمہ عدلیہ سوا اسلام میں قضا کا کام دراصل ایک قسم کی عبادت ہے اگر قاضی غیر مستطیع ہے تو اس کو بھی تنخواہ اس مد سے دلائی جا سکتی ہے اور محکمہ تعلیمات کے لوگوں کو بھی فقہار نے بصورت احتیاج اس آمدنی کے مصارف میں شریک کیا ہے۔ بیضاوی نے سبیل اللہ کے ذیل میں القناطر والمصانع بھی لکھا ہے گویا اس بنا پر مواصلات پر جو مصالح مسلمین ہی کی ایک چیز ہے یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے ”الصدقات“ کے مصارف ایک تو وہ رکھے ہیں جن کا تعلق مصیبت زدہ طبقات سے ہے۔ لیکن اس لئے کہ اگر کسی وقت اسلامی حکومت کے پاس بجز ”الصدقات“ کی مد کے اور کوئی آمدنی نہ رہ جائے تو چند ایسے مصارف کا اس کی ذیل میں اضافہ کیا ہے جن کے بعد ایک حکومت کے قیام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے سب کی تکمیل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ ان ہی مصارف میں ایک مد ان لوگوں کی بھی ہے جو محض مالی کمزوریوں کی وجہ سے اسلامی حکومت اور اسلام کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ اس زمانے میں سیاسی شورش پسندوں کے ایک گروہ کی یہی حالت ہے۔ ان لوگوں کو چپ کرنے کے لئے بھی ”الصدقات“ کے مصارف میں قرآن نے ”مؤلفۃ القلوب“ کی ایک مد رکھی ہے۔ اگرچہ عام طور پر فقہاء کہتے ہیں کہ یہ مصرف صرف ابتداء اسلام کی حد تک محدود تھا اور اب ساقط ہو گیا۔ دلیل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اثر پیش کیا جاتا ہے کہ آپ نے مؤلفۃ القلوب کے بعض افراد کو دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اب اسلام اتنا قوی ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کی تالیف قلب کی ضرورت نہ رہی۔ حالانکہ قصہ صرف اس قدر ہے کہ چند خاص لوگوں کو حضرت عمرؓ نے دینے سے یہ فرماتے ہوئے انکار کر دیا تھا کہ

ان الله اعز الاسلام فما ذهب

اب خدا اسلام کو عزت و شوکت عطا کر چکا

پس تم دونوں جاؤ (کچھ نہ ملے گا۔)

لیکن اس کا یہ مطلب قرار دینا کہ ہر شخص کے لئے حضرت عمرؓ نے اس مد کو ساقط کر دیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا قرآن نے جس مصرف کو منصوص کیا ہے اس کو اولاً حضرت عمرؓ منسوخ ہی کیسے کر سکتے ہیں نیز ایک ایسی واحد خبر سے قرآن کے ایک قانون پر خط نسخ نہیں پھیرا جاسکتا بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ امام اور حکومت وقت کے صوابدید پر ہے جس وقت جن لوگوں کے لئے اس کی ضرورت سمجھے دے جن کے لئے ضرورت نہ سمجھے نہ دے۔ آخر میں اس سلسلہ میں فقہاء کے اس مذکورہ بالا مسئلہ کو بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ واقعی ضرورتوں کے لئے اسلامی حکومت رعایا پر بقدر ضرورت جدید محصول عائد کرنے کا بھی اختیار رکھتی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ میں نہیں خیال کرتا کہ ان امور کے ہوتے ہوئے اسلامی حکومت کو کبھی دشواری کا سامنا ہوگا۔ لے

قبل اس کے کہ اسلام کے معاشی مداخل (آمدنیوں) کا باب ختم کیا جائے چند اور ذیلی امور کا تذکرہ بھی کم از کم اجمالی طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک مسئلہ ”زر“ یا ”سکہ“ کا بھی ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اسلامی قانون میں اس سلسلہ کی جواہم ترین امتیازی چیز ہے ”وہ توحید سکہ کا مسئلہ ہے جس کا ذکر ”ربو“ سود کے باب میں گزر چکا ہے۔ بتایا گیا تھا کہ مختلف ممالک و اقالم کے مختلف سکوں کے مبادلہ میں جو بٹاؤن کا رواج ہے یہ اسلام کے اس قانون کی بناء پر کہ چاندی کا چاندی سے اور سونے کا سونے سے جب تبادلہ کیا جائے خواہ سکہ کی شکل میں ہو یا زیور یا تہر (پتھر) کی شکل میں ہو، برابر ہونا چاہیے اور بٹاؤن لگانے کی صورت میں چونکہ یہ مدعا فوت ہو جاتا ہے جس کے حل کی راہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بین الاقوامی طور پر تمام حکومتیں اپنے اپنے تقریاتی و طلائی سکوں کو ہم وزن کر دیں اور جیسے سال و ہفتہ کے ایام تقریباً تمام ممالک میں یکساں ہیں، ہر جگہ

۱۔ مضمون پریس میں چھپ رہا تھا کہ ۳۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کا چلا ہوا ایک تلغرافیہ پیام لندن سے ہندوستان وصول ہوا میں چاہتا ہوں کہ قارئین کرام کے لئے اس کو یہاں نقل کر دوں، اخبار ”رہبر دکن“ مؤرخہ ۴۔ دسمبر میں اس تار کا ترجمہ ان الفاظ میں درج کیا گیا:۔
لندن ۳۔ دسمبر۔ سر ولیم پیورج (مشہور مؤرخ معاشیات) نے ”برطانیہ میں غربت کا خاتمہ“ کرنے کے لئے جولائی ۱۹۴۲ء میں پیش کیا ہے۔ اس کو انگلستان اور امریکہ دونوں جگہ اخبارات میں صفحہ اول پر نمایاں کیا گیا ہے ”ڈیلی ٹیلی گراف“ کہتا ہے کہ لائٹھ عمل کا اساسی نقطہ یہ ہے کہ اس میں معیشت کی ایک قومی اقل سطح مقرر کی گئی ہے جسے نیچے گرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اس اخبار کے پیش نظر وظائف (جو شوہر اور بیوی کے لئے دو دو پونڈ تک ہوں گے) ہر شخص کے لئے طبی معالجہ بچوں کے لئے فی ہفتہ آٹھ شلنگ کا الاؤنس، بیواؤں کے لئے فی ہفتہ دو پونڈ اور ازدواج و مادری کے فیاضانہ عطیے ہیں جبکہ سر ولیم نے بتایا یہ لائٹھ عمل ایک ہمہ گیر ہے جس سے آجروں اور مردوروں کی یکساں بہبودی کی گوارہ سے گورتک نگہداشت ہوگی تدفین کے مصارف تک کی گنجائش رکھی گئی ہے اور بیماری برسر روزگار ہو، یا بے روزگار جوانی ہو یا بوڑھا یا کسی کو اس معینہ سطح سے پست تر ہونے نہیں دیا جائے گا۔ ”عرب میں جولائی ۱۹۴۲ء عمل صدیوں پہلے خدا کی طرف سے بنی آدم کو سپرد کیا گیا ۱۹۴۲ء کی تیسری دسمبر کے تاریخ میں دیکھیے کہ اسی ضرورت کو عقل بھی پالنے لگی قبل من مذکرہ ۱۲۹

سات دن ہی کا ہفتہ اور بارہ مہینے ہی کا سال ہوتا ہے جس سے بین الاقوامی تعلقات میں بیشمار سہولتیں ہیں، اسی طرح کچھ حرج نہ ہوگا اگر سکوں کے وزن کو بھی ساری دنیا میں برابر کر دیا جائے۔ اور بٹاون کے رواج کو مسدود کر دیا جائے۔ اکیچینج کے مغالطوں سے جو نتائج کاروباری دنیا کو آئے دن بھگتتے پڑتے ہیں خصوصاً محکوم قوموں کے ساتھ حاکم قومیں اس باب میں جو سلوک کر رہی ہیں وہ علماء معاشیات سے معفی نہیں ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ حیثیت پیغمبر عالم ہونے کے دنیا سے آپ کا یہ مطالبہ اس کا مستحق ہے کہ علماء معاشیات اس کے فوائد و ثمرات اور اس کی مفایا موجودہ شکل کے نقصانات واضح کریں۔

اس مسئلہ کے سوا بھی فقہاء اسلام کو تجارت، بارہ وغیرہ کے ابواب میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن چونکہ ان میں کوئی خاص ندرت نہیں ہے اور اور اسلامی قانون کے بعض دقیق پہلوؤں سے ان کا تعلق ہے۔ اگر تفصیل کی جائیگی تو پھر ایک مستقل کتاب اس کے لئے درکار ہوگی۔ اس لئے چند اشارات پر کفایت کی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل سوالات کے ذیل میں ”زر“ کے متعلق آپ کو اسلامی قانون کے مباحث ملیں گے

(۱) فطری اور مصنوعی سکوں میں کیا فرق ہے۔ یہ مانا گیا ہے کہ سونا اور چاندی یہ ایسی دھات ہے جسے قدرت نے اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ مبادلات کے میعار کو قائم رکھے بعض حدیں بھی اس باب میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان دونوں دھاتوں کے سوا اور بھی دوسری چیزوں کو بطور سکے کے استعمال کیا جاسکتا ہے مثلاً فلوس (یعنی تانبے کے پیسے) لیکن ان کے سکے ہونے کی حیثیت آیا پبلک کے ہاتھ میں ہے یا معاملہ کے فریقین پر اس کا دار و مدار ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں میں اختلاف ہے۔ اس کی بحث کچھ آئندہ بھی آرہی ہے۔

(۲) ہر وہ چیز جو بطور سکے استعمال ہوتی ہو غیر معین ہو جاتی ہے یعنی معاملہ میں اگر خاص سکے کو دکھا کر معاملہ کیا جائے لیکن ادا کرنے کے وقت بجائے اس کے دوسرا سکے دیا جائے تو یہ جائز ہے۔ اس کلیہ کا یعنی سکے غیر معین ہوتا ہے۔ بے شمار تجارتی مسائل پر ان کا اثر پڑتا ہے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

(۳) سکوں کے مقطعات (یعنی اٹھتی، چوٹی، دوٹی) جس کو اصطلاحاً ”درہم غلہ“ کہتے ہیں، ان کی بھی ایک مستقل بحث ہے۔ چیز کا دام مثلاً سو روپیہ طے ہوا اور کوئی بے اس کے سو روپے کے پیسے یا اکنیاں دو نیال دے تو کیا یہ جائز ہو سکتا ہے۔

(۴) چاندی سونے کے ایسے سکے جن میں کسی دوسری دھات کی آمیزش ہو ان کے احکام کا بھی ایک سلسلہ ان کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ الغطارفہ والعدالیہ اسی قسم کے سکوں کے نام ہیں۔ سود کے باب میں بعض عجیب نتائج ان سکوں کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں۔ صاحب ہدایہ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ہمارے بزرگوں نے اس کے جواز کا
فتویٰ نہیں دیا۔

وَمَشَانُخْنَارِ حَمَلِ اللَّهِ لَهُ يَفْتَوُا
بِحَوَازِ ذَلِكِ (کتاب الصرف)

وجہ یہ لکھی ہے کہ

اگر ان معاملات میں زیادہ گیری کی
اجازت دیدی جائے گی تو سود کا
دروازہ کھل جائے گا۔

فَلَوْ اَبِيحِ التَّفَاضُلِ فِيهِ يَفْتَمُ
بَابُ الرُّبَا۔

(کتاب الصرف)

ایک وہ زمانہ تھا کہ ”جواز“ کی بعض قانونی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں۔ لیکن اس خوف سے کہ سود کا دروازہ
کھل جائے گا۔ علماء ان سوراخوں کو بھی بند کر دیتے تھے، جن سے معاشی رگوں میں ایسے زہریلے خون
کے داخل ہو جانے کا اندیشہ ہوتا، آج یہ حال ہے کہ ”ربوا“ کی سرکج اور واضح بلکہ بین الاقوامی
شکلوں تک کے متعلق بعض علماء نے جواز کی کوشش کی حد یہ ہو گئی کہ قرض ہی کے سود کے متعلق
ایک بڑے عالم صاحب نے فتویٰ دیا کہ قرآن نے اس کو حرام نہیں کیا ہے بلکہ عرب کے کسی گناہ
مبادلہ سے اس حکم کا تعلق ہے۔ عربی میں کتاب لکھی گئی اور علماء کی خدمت میں پیش ہوئی،
فَانَا لَشَرِّ دَانَا لِيَه رَاجِعُونَ۔

(۵) کھولے ٹکڑے اور آمیزش کے اعتبار سے سکون کے متعلق ایک اور اصطلاح بھی
ہے یعنی بعضوں کو زیون (یہ خاص کر ان کھولے سکون کو کہتے ہیں جنہیں حکومت کا خزانہ مسترد کرے)
البنہرجہ (ایسے سکے جنہیں کاروباری لوگ بیوپار میں لینے سے انکار کرتے ہوں) اسی نوعیت کے سکون
میں ایک قسم کا سکہ ”الستوق“ بھی تھا۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ فارس کے ”سہ طاقہ“ کا معرب ہے اوپر نیچے
تو چاندی کا پتر مڑھا جاتا تھا اور بیچ میں تانبا بھر دیا جاتا تھا۔ یہ المموہہ (قلعی کئے ہوئے سکون) سے
ایک الگ چیز تھی۔ مختلف قانونی ابواب میں ان کے نام آتے ہیں اور حالات کے لحاظ سے ان پر حکم
لگایا گیا ہے۔

باقی اس زمانے میں مصنوعی زر کی ایک شکل جو نوٹ کی پیدا ہو گئی ہے۔ اگرچہ
عام طور پر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ مغربی تمدن کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے
لیکن جہاں تک تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، ابن بطوطہ نے

۱۵ جیسے ستوقہ کو سہ طاقہ کا معرب کہتے ہیں ”بنہرجہ“ بھی کیا ہندوستان کے ”نہہنے والا“ لفظ کی کوئی بگڑی ہوئی
صورت ہے کیونکہ ”جھنٹے“ کی اصلی ہندی شکل ”بھینا“ اور ”جھنٹا“ ہے۔ ”جھنٹ“ کے لفظ میں اس وقت اصل ہندی مصدقہ
مادہ اب تک باقی ہے، ہندستان اور قدیم عرب کے تجارتی تعلقات پر مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب ملاحظہ فرمائی جائے
اسلام کے بعد عرب کی بندرگاہ کا نام ہی باب الہند تھا اور دارمی جو حدیث کی معتبر کتاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
کوفہ میں ایک محلہ ہی ”دار الہند“ کے نام سے موسوم تھا ۶۲

لکھا ہے یہیں بحینہ اس کے الفاظ ترجمہ کے ساتھ نقل کرتا ہوں،

و ۱ اهل الصين لا يتبايعون
بدینا سر ولا درهم وجميع
ما يتحصل لبلا درهم من ذلک
یسکونہ قطعاً کما ذکرنا
وانما بیعہم وشرائہم یقطع
کاغذ کل قطعة منها بقدر
الکف مطبوعة لطابع السلطان
وتسمى الخمس والعشرون منها
"بالشت" وھی بمعنی الدینار
عندنا واذ اتمرت تلک لکوا عند
فی ید الانسان حملها ۲ لی
د ۲ سرکد ۲ السکه عندنا
فانخذ عوضها جدد ۲ و دفع
تلک ولا یعطی علی ذلک اجرة
ولا سواها لان ۲ الذین یتولون
عملها لهم الارزاق لجارية
من السلطان وکل بتلک الدار
امیر من کبار الامراء و ۲ اذ ۲
مضی ۲ الانسان ۲ لی السوق
بدلهم فضة ۱ و دینار
شرأء شیء لم یؤخذ منه
ولا یلتفت ۲ الیه حتی یصرفه

اور چین کے لوگ خرید و فروخت نہ اشرفیوں
سے کرتے ہیں اور نہ درہم سے اور اس
ملک میں جب یہ چیزیں آتی ہیں (یعنی درہم
یا اشرفیاں) تو اسے پگھلا کر ٹکڑے ٹکڑے
بنا لیتے ہیں، ان لوگوں میں باہم خرید و
فروخت کا ذریعہ کاغذ کے ٹکڑے ہیں
ہر ٹکڑا اس کاغذ کا کف دست کے برابر
ہوتا ہے اور اس پر حکومت کی مہر ہوتی
ہے۔ ان ٹکڑوں کے پچیس کاغذوں کے
مجموعہ کو "بالشت" کہتے ہیں۔ بالشت ہمارے
یہاں کی اشرفی کے برابر ہے۔ جب یہ
کاغذ پھٹ جاتے ہیں تو جس کے ہاتھ
میں یہ پھٹا ہوا کاغذ ہوتا ہے اسے لیکر
وہ ایک کوٹھی میں لے جاتا ہے یہ اسی
قسم کی کوٹھی ہوتی ہے۔ جیسے کمال
ہمارے یہاں ہے اور ان پھٹے ہوئے
کاغذوں کو داخل کر دیتا ہے۔ معاوضہ
میں اس کو نئے کاغذ مل جاتے ہیں۔
اور اس کی کوئی اجرت اسے نہیں ادا
کرنی پڑتی ہے کیونکہ جن لوگوں کے
ہاتھ میں اس کا انتظام ہے وہ حکومت
سے تنخواہ پاتے ہیں۔ ان مقامات کا

۱۵ چین کے متعلق اسی موقع پر ابن بطوطہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ عموماً ختا اور چین والے ایندھن کا کام ایک خاص قسم
کی مٹی سے لیتے ہیں، ہاں حقیروں پر لا دلاد کر شہر میں وہ لائی جاتی ہے، اسے توڑ توڑ کر کوئلے کے برابر کر دیتے ہیں اور چولہے
میں جھونکتے ہیں۔ اتنی تیز آگ اس سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئلے کی آگ کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں پھر جل جانے کے بعد بھی
اس کو جلاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ اس کی راکھ میں بعض دوسرے پتھروں کا سفوف ملا کر جو مواد تیار کرتے ہیں اسی سے چینی برتن بنتے
ہیں، دیکھو ص ۱۹۵ ج ۲ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کے کوئلے کا رواج چینیوں میں عام تھا جس کتابوں میں لکھا ہے کہ اسی راکھ سے کپڑے بھی دھوتے ہیں ۱۲

بالت "ویشتری بہ

صا ۱۱۱-۱۲

جہاں یہ کاخذ (بنتا ہے اور بدلا جاتا ہے)

تعلق بڑے بڑے امرار حکومت سے ہے

آدمی اگر چین کے بازار میں چاندی یا

(سفر نامہ ص ۱۹۵ ج ۲)

سونے کے سکتے سے کچھ خریدنا چاہے تو لوگ ان سکوں کو نہیں لیتے ہیں۔ نہ ان کی

طرف توجہ کرتے ہیں جب تک کہ "بالت" سے ان کو بھنا نہ لے۔ تب جس چیز کے خریدنے کا

ارادہ کرے خرید سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ابن بطوطہ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں اور آج کل کے نوٹوں میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے ابن بطوطہ جس زمانے کا حال چین کے متعلق بیان کر رہا ہے۔ اس وقت وہاں چنگیز خاں کی اولاد کی حکومت تھی۔ تاتاریوں کی تمام تاریخوں میں اسی بالت کا ذکر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل اور تاتاریں زیادہ تر اسی کاخذی سکے کا رواج تھا۔

محمد تغلق کے متعلق بھی جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے چرمی سکے کو ہندوستان میں اس بادشاہ نے مروج کیا تھا۔ کیا تعجب ہے کہ مغلوں اور تاتاریوں ہی سے اس خیال کو اس نے اخذ کیا ہو،

لیکن اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے جسے الکتانی نے بعض کتابوں سے نقل کیا ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ان عمر بن الخطاب کان یستعمل

ورق اور چمڑے کو نقد کی جگہ ضرورت کے

الورق والجلود صکان النقد

وقت استعمال کرتے تھے۔

للحاجة (کتاب الترتیب لادایہ ص ۱۲۲ ج ۱)

پھر مشہور اسلامی شاعر ابو تمام کا ایک شعر بھی اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے جو یہ ہے۔

کیا حضرت عمرؓ نے اس کا حکم نہیں دیا تھا کہ

الم یبتدب عمر کلامی یجعل من

اونٹ کے چمڑے کو نقد کی جگہ استعمال کیا جائے

جلودھا النقد چین عنہ الذهب

جب سونا نایاب ہو گیا تھا۔

کتاب الترتیب لادایہ ص ۱۲۲ ج ۱)

واللہ اعلم یہ روایت کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن درایت میرے نزدیک یہ بات محل تعجب نہیں ہو سکتی۔ چین میں

جب اس کا رواج عام طور پر پایا جاتا ہے اور عرب و چین میں جو تجارتی تعلقات تھے۔ کیا بعید ہو کہ

ان ہی تاجروں سے یہ خبر حضرت عمرؓ تک پہنچی ہو اور ضرورت آپ نے کسی وقت اس طریقہ کو اختیار

کیا ہو۔ ابو تمام کے شعر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت ہی کے موقع پر حضرت عمرؓ نے اس کو

اختیار فرمایا تھا۔ بہر حال چونکہ اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا اور نہ اس عبارت کے سوا اور کسی دوسرے

چیز سے اس کی تائید ہوتی ہے ہم اس پر زیادہ بحث نہیں کر سکتے۔

چمک کا رواج | البتہ نوٹ ہی کے قریب قریب بنکوں کے چمک کی جو کیفیت ہے یہ تو ابتداءً اسلام

یعنی عہد صحابہ و تابعین کی عام بات معلوم ہوتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ چمک دکھا کر عام بنکوں یا

سرکاری خزانے سے روپیہ برآمد کرانے کا عام رواج معنوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جاری تھا بلکہ خود چک کا یہ لفظ عربی کے صک کے لفظ ہی سے بنا ہے۔ اس موقع پر البیہقی کی ایک دل چسپ روایت کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مشہور و جلیل القدر تابعی حضرت ابو وائل اس قصہ کے راوی ہیں، فرماتے ہیں۔

استعملنی ابن زیاد علی بیت
العمال فاتانی سرجل بصک فیہ
اعط صاحب المطبخ ثمانمائة
درهم فقلت مکا نک
ودخلت علی ابن زیاد
فحدثتہ۔

مجھے بیت المال پر ابن زیاد (بنی امیہ کا
کوفی گورنر حضرت امام حسین علیہ السلام
کی شہادت میں مشہور بدنام آدمی) اسی
نے مقرر کیا تو میرے پاس ایک آدمی
چک لے کر پہنچا جس میں تھا "باورچی خانہ
کے داروغہ کو آٹھ سو درم ادا کر دو"

میں نے اس شخص سے کہا ذرا اپنی جگہ ٹھہر جا اور میں ابن زیاد کے پاس پہنچا
اس سے گفتگو کی۔

اس کے بعد اپنی پوری گفتگو انہوں نے نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں تین تین
افسروں کے درمیان روزانہ صرف ایک بکرے کا راشن مقرر تھا اس پر بھی حضرت عمر فرماتے تھے کہ
جس مال سے روزانہ ایک بکرہ لیا جائے گا وہ جلد ختم ہو جائے گا۔ ابو وائل کا مطلب یہ تھا کہ تم آٹھ سو
سوروپے خزانے سے صرف مطبخ کے داروغہ کو دلاؤ گے تو بیت المال کا آخر انجام کیا ہوگا۔ ابو وائل
فرماتے ہیں میں جب یہ کہہ چکا تو دیکھا کہ ابن زیاد مجھ سے کہہ رہا ہے۔

ضع المفتاح و اذهب حیث
شدت (سنن البیہقی ص ۳۵۲ ج ۶)

خزانے کی کنجی رکھ دو اور جہاں جی
چاہے چلے جاؤ۔

میری غرض اس قصے کے نقل کرنے سے "چک" کے رواج کو بتانا تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ زمانے
کے چکوں اور اس زمانے کے "چک" میں کسی قسم کا کوئی فرق نظر آتا ہے۔

(۶) جیسا کہ میں نے عرض کیا زر خلقی و فطری اور زر مصنوعی کی اصطلاح تو ہمارے فقہاء
کے ہاں بھی مروج ہے، ہدایہ وغیرہ عام فقہ کی کتابوں میں سونے اور چاندی کے متعلق یہ الفاظ ملتے
ہیں یعنی لکونہ ثمننا خلقہ (فتح القدیر ص ۳۷۰ ج ۵ کتاب الصرف) جس کا مطلب یہی ہے کہ دھات
کی ان دونوں قسموں کے متعلق یہی طے کیا گیا ہے کہ پیدا کرنے والے نے ان کو ثمن (دام اور قیمت ہی)
بننے کے لئے پیدا کیا ہے، ابن ہمام اسی کتاب الصرف میں ایک موقع پر لکھتے ہیں،

واعلم ان الاموال تنقسم الى ثمن علی
کل حال و هو الدراهم والدنانیر ص ۳۶ ج ۵

معلوم ہونا چاہیے کہ الاموال کی چند قسمیں ہیں،
جن میں ایک قسم تو مال کی وہ جو ہر حال میں ثمن
(یعنی دام) ہی ہونے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ دراہم و دنانیر ہیں۔

الدرآہم سے مراد چاندی کے سکتے ہیں اور الدنایر سے سونے کے، پھر آگے چل کر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔

وینقسم باعتبار الاصطلاح
على التمنية وهو في الاصل
سلعة فان كانت سلعة
فهي ثمن لا تتعين بالتعيين
وان كانت كاسداة فهي
سلعة كالفلوس۔ (ص ۱۱)

پھر مال کی وہی قسم جو ثمن (یعنی دام اور قیمت) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ایک قسم وہ یہی ہے کہ فی الحقیقت ہے تو وہ سلعہ لیکن لوگوں نے بطور ثمن اور دام کے اس کو چلانا شروع کیا۔ پس جب تک وہ رائج رہتا ہے تو اس وقت وہ ثمن

ہی سمجھا جائے گا۔ یعنی معین کرنے سے معین نہ ہوگا۔ لیکن اگر رواج پذیر نہ رہا ہو تو پھر وہ معمولی سلعہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے مثلاً الفلوس (یعنی پیسوں کا) یہی حال ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ الدرآہم والدنایر کے سوا اور جن چیزوں کو بطور سکہ کے لوگ چلاتے ہیں ان کی حیثیت مصنوعی زر کی ہے۔ البتہ ایک سوال ہو سکتا ہے کہ بعض چیزوں کو تو پبلک بطور سکہ کے چلا دیتی ہے مثلاً کوڑیوں کا رواج ہندوستان میں کچھ دن پہلے اسی حیثیت سے تھا یعنی حکومت کی طرف سے یہ مقررہ سکے کی حیثیت کوڑیوں کو نہیں دی گئی تھی اور غالباً تانبے کے چوکور ٹکڑے جو ان ہی کوڑیوں کے ساتھ ہندوستان میں مروج تھے۔ ان کی حیثیت بھی یہی تھی یعنی حکومت سے ان کا تعلق نہیں تھا، ہمارے فقہاء بھی ان کو پبلک ہی کی چلائی ہوئی چیز سمجھتے ہیں۔ شرح ہدایہ ہی میں ایک موقع پر الفلوس کے بعض احکام کا ذکر کرتے ہوئے امام محمد کی طرف ان الفاظ کو منسوب کیا گیا ہے۔

التمنية في الفلوس ثبت باصطلاح الكل۔ (ص ۲۸۷)

پیسے میں ثمن (دام) ہونے کی حیثیت کل (عام مخلوق) کی اصطلاح سے

پیدا ہوتی ہے۔

لیکن حکومت اگر کسی سکہ کو الدرآہم والدنایر کے سوا مروج کر دے تو یہ دوسری قسم سکے کی ہوگی، گویا زر مصنوعی و وضعی کی دو قسمیں ہوں گی۔ ایک تو وہ جنہیں لوگ باخود بطور سکہ کے چلاتے ہوں۔ اور دوسری قسم ان سکوں کی ہوئی جو سونے چاندی کے تو نہ ہوں لیکن حکومت نے ان کو چلایا ہو۔ بہر حال ان کی حیثیت وضعی اور مصنوعی سکے ہی کی ہوگی ابن ہمام نے الفلوس کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھا ہے کہ

لہ سکے سے جو چیزیں خریدی جاتی ہیں، عربی میں ان کو سلعہ کہتے ہیں۔ مثلاً کپڑے گھوڑے وغیرہ۔ اردو میں کوئی خاص لفظ اس کے لئے نہیں ملا۔ اپنے درس میں طلبہ کو اس کا ترجمہ سودا بتایا کرتا ہوں۔ یعنی جو چیز بطور سودے کے بکتی ہے لیکن پھر بھی دل اس ترجمہ سے مطمئن نہیں ہے۔ اسی لئے اصل عربی لفظ ترجمہ میں رکھ دیا گیا۔ سلعہ ہی کو فقہاء کبھی عروض بھی کہتے ہیں یعنی علاوہ سکے کے عام طور پر استعمال اور برتنے کی چیزیں ۱۲

پیسے اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے
عروض ہی ہیں (یعنی سکے ہونے کی حیثیت

الفلوس فی الاصل عروض۔
(فتح القدر ص ۲۸۸)

نہیں رکھتے ہیں)

اسی سلسلہ میں ایک اور چیز کا پتہ جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی میں دیا ہے یعنی لکھتا ہے
و کثیرا ما يستخذمون جواهرہا
من الکثیرۃ فاذا غرام احدہم علی
سفر طویل لیستغرق نفقہ عشرۃ
الاف دینار مثلا فبدلا من ان
یحمل ذلک ذهباً و فضة استبدلہ
بجوہرۃ او عذۃ جواهر لیسہل
حملہا فی الجیب فاذا وصل الی البلد
المقصود باع الجواهر و الفوق ثمنہا
بسا اوقات بڑی رقموں کی
جگہ لوگ جواہرات سے کام لیتے تھے
مثلاً کسی طویل سفر پر جانا ہے جہاں
دس ہزار رقم کے مصارف کی ضرورت
ہوتی تو سونا یا چاندی کی جگہ ایک
یا چند عدد جواہرات رکھ لیتے اور مقام
مقصود پر پہنچ کر اسے فروخت کر کے
پھر اسی رقم کو صرف کرتے۔

مسلمانوں کے اس طرز عمل کو بیان کرنے کے بعد پھر خود لکھتا ہے کہ

جیسا کہ اس زمانے میں لوگ مالی کاروبار
میں چکوں اور بینک کے نوٹوں سے
کام چلاتے ہیں۔

کما یفعل الناس الیوم
بتحاویل العالیۃ و البنک نوٹ
(التمدن الاسلامی ص ۸۱ ج ۵)

لیکن اس تدبیر کے سوا بھی ایک اور طریقہ مسلمانوں میں جاری تھا جو دوسری قوموں کے میل و جول
سے انہوں نے بھی قبول کر لیا تھا۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو "سفینہ" کہتے ہیں جس کی جمع "السفایج"
ہے۔ غالباً یہ کسی فارسی لفظ کا معرب ہے۔ چونکہ یہ تجارتی کاروبار کی چیز تھی۔ اس لئے "سفایج التجار"
کے نام سے بھی اس کو موسوم کرتے ہیں اور یہ وہی "ہنڈی" ہے جو اب بھی دنیا میں اس لئے مروج
ہے کہ روپیہ کی منتقلی میں اس سے آسانی بھی ہوتی ہے۔ نیز راستہ کے خطرات سے بھی مال محفوظ ہو جاتا ہے
روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ ہی میں اس کا رواج ہو گیا تھا۔ بیہقی نے حضرت عبد اللہ
بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ اثر نقل کیا ہے کہ

عبد اللہ بن زبیر لوگوں سے مکہ میں درہم
لیتے اور مصعب بن الزبیر کے نام اس
کی ہنڈی لکھ کر دیتے جو عراق کے گورنر تھے

ان عبد اللہ بن الزبیر کان یا حد من
قوم مکہ درہم ثم یکتب بہا الی
مصعب بن الزبیر بالعراق فیأخذہ

اور وہ شخص اتنی رقم مصعب سے عراق پہنچ کر وصول کر لیا کرتا تھا۔

۱۰ سفینہ (سیاہوا) فارسی لفظ ہے۔ شاید ہنڈی کے کاغذ وغیرہ کو بھی کہتے ہوں اس لئے سفینہ نام ہوا۔

اسی طرح ایک روایت ابن عباسؓ کے متعلق بھی یہ درج کی ہے کہ

مسئل ۲ بن عباس عن ذلک
فلہ یربہ باس۔

ابن عباس سے ہنڈی کے متعلق پوچھا
گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی

مضائق نہیں ہے۔

بیہقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

وروی فی ذلک یضاً عن علی رضی اللہ
تعالیٰ عنہ (سنن بیہقی کتاب بیوع ۷)

ہنڈی کے متعلق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
بعض روایت بیان کی گئی ہے۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے فقہاء عموماً اور حنفی فقہاء خصوصاً کچھ اس شکل کے متعلق تذبذب کا اظہار کرتے رہے "تذبذب" کے اسباب کیا تھے کیا ان کو اس کا اندیشہ تھا کہ بتدریج ہنڈی کی یہ شکل نوٹ کی صورت شاید نہ اختیار کر لے اور نوٹ کے جن نقصانات کو باوجود منافع کے آج دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کیا یہ خطرات ان کے سامنے آگئے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ جہاں تک کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ہنڈی میں ان کو گوئہ "ربوا" کی بو آتی تھی، کیونکہ پہلے زمانے میں بلکہ شاید اب بھی اس میں زیادہ تر یہ کیا جاتا تھا کہ لوگ ایک شہر میں روپیہ بطور قرض کے لیتے تھے اور ہنڈی لکھ کر قرض خواہ کو دیدیتے تھے کہ وہ دوسرے شہر میں ان کے نمائندے سے وصول کر لے۔ قرض دینے والا اس ذریعہ سے اپنے روپوں کو راہ کے خطرات اور بار برداری کے مصارف سے محفوظ کر لیتا تھا۔ گویا قرض دے کر مقروض سے نفع اٹھاتا تھا۔ گو حقیقی سود کی تو یہ شکل نہیں ہے لیکن ایک قسم کا غیر مادی نفع قرض دینے والے کو ضرور پہنچتا ہے۔ چونکہ فقہاء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مشہور ہے کہ

کل قرض جر نفعہ فہو ربوا

ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے

وہ سود ہے۔

اس حدیث کی بناء پر "سفنجہ" کو بھی انہوں نے مکروہ قرار دیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا حدیث خواہ فقہاء میں جس درجہ بھی مشہور ہو مگر محدثین کے اصول سے صحیح نہیں ہے۔ اس کے راویوں میں سوار بن مصعب ایک ایسا شخص ہے جس سے حدیث روایت کرنے کی محدثین نے ترک کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک اور روایت بھی ہے جسے مشہور صحابی حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے بیان کیا جاتا ہے یعنی حضرت سمرہ بن جندب کہتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

السفنجات حرام۔

ہنڈیاں حرام ہیں۔

ابن جوزی نے اس روایت کا شمار "موضوعات" میں کیا ہے اور واقعہ بھی کچھ یہی معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں "سفنجہ" کے لفظ کا سراغ نہیں ملتا۔ نیز اس کے راویوں میں عمر بن موسیٰ انتہا درجہ کا غیر معتبر آدمی ہے اور یہ کرامت ان ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال روایات کی بنیاد پر "سفنجہ" کی حرمت

کراہیت تک کا فیصلہ مشکل ہے البتہ ربوہ کے کلی قواعد کے تحت چونکہ ”کل قرض جرفعا فهو حرام“ کے اصول کو عہد تابعین میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جیسا کہ مشہور تابعی حضرت عطاء سے مصنف بن ابی شیبہ میں منقول ہے۔ اس لئے ایسے ”تسفیجے“ جو قرض لینے کے بعد کسی کو دیئے گئے ہوں ان کو مکروہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنا روپیہ کسی بینک یا سیٹھ ساہوکار کی دوکان میں جمع کر دے اور بینک سے چک لے کر یا ساہوکار سے ہنڈی لے کر دوسرے شہر میں وصول کرے یا جیسے آج کل منی آرڈر کا اصول ہے کہ آدمی ڈاکخانے میں روپیہ جمع کر دیتا ہے ڈاک ڈالے اس کے اس ”منی آرڈر“ کو مقام مطلوب میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں کا ڈاک خانہ روپیہ ادا کر دیتا ہے۔ یہ ظاہر اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

فقہاء حتیٰ کہ حنفی فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قرض ہی روپیہ دیا جائے لیکن قرض دینے میں ہنڈی کی شرط نہ ہو اور بعد کو ہنڈی لکھ دی جائے کہ اس قرض کو فلاں شہر میں فلاں شخص کو دکھا کر وصول کر لینا تو جائز ہے۔

ابن ہمام نے ”الواقعات“ وغیرہ فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ

۱۲ قرضہ بغیر شرط و کتب
جانرا (فتح القدیر ص ۵۲ ج ۵)
اگر بغیر کسی شرط کے قرض دے پھر
ہنڈی لکھ دی جائے تو جائز ہے۔

کفایت البیہقی سے ابن ہمام ہی نے یہ جزیئہ بھی نقل کیا ہے۔

۱۱ یقرض مطلقا ثم یکتب
السفاح فلا باس به۔
اگر مطلقاً قرض لے پھر ہنڈی لکھ کر دے
تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اور جب قرض کی صورت میں بھی غیر شرط ہونے کے بعد ”تسفیجہ“ جائز ہے تو جہاں قرض نہ ہو وہاں اسے بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

ذیلی مباحث میں جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ ”عشر“ یا ”چنگی“ یا ہمساری حکومت کی اصطلاح میں جس کا نام ”کروڑ گیری“ ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے لیکن جرجی زیدان نے اپنی کتاب التمدن الاسلامی میں اس سلسلہ میں ایسا طرز تعمیر اختیار کیا ہے جس سے مغالطہ کا اندیشہ ہے مسئلہ کو صاف کرنے کے لئے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

جرجی زیدان نے اسلامی حکومتوں کی آمدنیوں کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ بالا مداخل کے سوا چند جدید چیزوں کا اضافہ ”توابع الخراج“ کے عنوان سے کیا ہے۔ جس میں اس نے معدنیات اجماعات (نیستان) وغیرہ کے محصولوں کے ساتھ جن کا ذکر اپنے اپنے موقع پر میں کر چکا ہوں اعشار السفن (جہازوں کی چنگی) اعشار المراسد (ناکوں کی چنگی) کو بھی درج کیا ہے۔ یہ ظاہر خیال گذرتا ہے کہ عام عشر کے سوا شاید مسافروں پر اسلامی حکومتیں کوئی جدید قسم کے ٹکس

عائد کرتی تھیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ وہی عشر ہے جس کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔ مسلمانوں سے دوسری چیزیں یعنی مولشی و کاشت سے ”الصدقات“ کے مد کا محصول بنام زکوٰۃ و عشر لیا جاتا تھا۔ اسی طرح تجارتی اموال سے زکوٰۃ بحساب چالیس فی صدی وصول کی جاتی تھی پھر کبھی یہ زکوٰۃ دکانوں سے وصول ہوتی تھی اور کبھی بری یا بحری گزرگاہوں سے۔ جب کوئی تجارتی مال گزرتا تھا اس سے چالیسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ اور پھر سال بھر تک اس مال سے کوئی جدید محصول وصول کرنا ناجائز تھا۔ اسی طرح غیر مسلم کی دکانوں کے تجارتی اموال تو محصول سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن باہر سے جب وہ اسلامی ملک میں مال لاتے تھے تو ان سے بجائے زکوٰۃ کے چالیس فی صدی کے حساب سے خراج کے طور پر محصول لیا جاتا تھا۔ اسی طرح غیر ممالک کے غیر مسلم تجارتی اسلامی علاقہ میں تجارتی مال لے کر آتے تھے تو قاعدہ یہ مقرر تھا جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ جس ملک کے وہ باشندے ہوتے اس ملک کی حکومت مسلمانوں کے تجارتی مال پر جتنا محصول عائد کرتی تھی اسی قدر اسلامی حکومت بھی ان سے وصول کرتی۔ اگر مسلمانوں کے تجارتی مال کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تو اس ملک والوں سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہیں لیتی ہے۔ البتہ اگر ان کی حکومت طرز عمل معلوم نہ ہوتا تھا۔ مثلاً وہاں مسلمان تجارت کے لئے کبھی نہ گئے ہوں تو ان کے تجارتی اموال سے خواہ کسی نوعیت کے ہوں، دس فی صدی کے حساب سے محصول کیا جاتا تھا لیکن غیر مسلموں سے جو یہ آمدنی ہوتی تھی اس کو خزانے میں خراج کے فنڈ میں جمع کیا جاتا تھا۔ بخلاف مسلمانوں کے تجارتی اموال کی آمدنی ”الصدقات“ کے مد جمع ہوتی تھی کیونکہ یہ دراصل ان کے تجارتی مال کی زکوٰۃ ہوتی تھی قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں۔

وکل ما اخذ من المسلمين	مسلمانوں سے العشور (کر وٹری)
من العشور فسیله سبیل	کے نام سے جو محصول وصول کیا جاتا ہے
الصدقاته وسبیل	اس کا شمار زکوٰۃ کی مد میں ہوگا اور
ما یؤخذ من اهل الذمة	اسلامی حکومت کی غیر مسلم ذمی رعایا کے
واهل الحرب جمیعاً سبیل	مال سے العشور جو وصول کیا جاتا ہے
الخراج (ص ۷۸)	یا (غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا)

یعنی حربیوں سے جو العشور وصول ہو ان سب کا شمار خراج کی مد میں ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اموال تجارت اسلامی ملک میں کسی راستے سے آئیں، بری ہوں یا بحری ان سے وہی ایک عشر والی مد کا محصول سال بھر میں ایک دفعہ وصول کیا جاتا۔ جرجی زیدان کا عشر السفن عشر المارصد وغیرہ کو الگ الگ کر کے بیان کرنا ایک قسم کا مغالطہ ہے نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی اس کا خاص طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ سال بھر میں ایک ہی مال پر دو دفعہ قطعاً محصول وصول کیا جائے۔ مشہور ہے کہ ایک عیسائی تاجر سے کر وٹری کے حامل نے دو دفعہ محصول وصول کر لیا۔

عیسائی حضرت عمرؓ کے پاس سیدھا دوڑا ہوا پہنچا۔ آپ اس وقت بہ تقریب حج مکہ میں تھے مل ملا کر شکایت کی۔ اس وقت آپ نے عامل کو سخت ڈانٹ کھلا بھیجی اور اس کا مال واپس دلایا گیا۔ مدت کے بعد ہی عیسائی حضرت عمرؓ کی خدمت میں پھر آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا کہ

انا الشیخ النضرانی الذی
میں وہی بوڑھا عیسائی ہوں جس نے
کلمتک فی زیاد۔
تم سے زیادہ (عشار) کے متعلق بات کی تھی

حضرت عمرؓ نے اسی لہجے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

وانا شیخ الحنیفی الذی
میں بھی تو وہی حنیفی بوڑھا ہوں جس نے
قضیت حاجتک (کتاب الخراج)

واقعہ یہ ہے کہ غیر ممالک کے تاجروں کے ساتھ اسلامی حکومت رواداری اور انصاف کا ایسا برتاؤ کرتی تھی کہ دور دراز ممالک کے باشندے خصوصاً سمندر پار ممالک جاتے ہوئے اب تک گھبراتے تھے، عدل فاروقی کا شہرہ سن کر انہوں نے اسلامی ممالک میں پہنچ کر تجارت کرنے کی خود درخواست کی۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ

ان اهل منبج قوم من اهل
منبج کے لوگ جو غیر اسلامی قلمرو کے
الحرب و ساء البھم کتبوا الی عمر
باشندے تھے انہوں نے سمندر پار سے
بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت عمرؓ کے پاس درخواست بھیجی ہیں اجازت
عنا ندخل اسرا ضک تجارا
دیکھئے کہ آپ کے ملک میں سوداگری کے لیمم
وتعشنا۔
داخل ہوں اور ہم سے جنگی (عشر) وصول کیجئے

جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ

فقد کان عمال الیمن یاخذون
یمن کے عمال (کروڑ گیری والے) اس
هذک الضريبة من السفن لتي
محصول کو ان جہازوں سے وصول کرتے
تم بسواھم قادمة من الهند
جوان کے ساحلوں پر ہندوستان سے
تحت الاعواد المختلفة والمسک
آتے ہوئے گزرتے جن پر خوشبودار
والکافور والعنبر والصندل
لکڑیاں مختلف قسم کی مشک کا فور
والصینی (۱ ج ۱۲)

میرا خیال ہے کہ جرجی زیدان کو جو یہ مغالطہ ہوا کہ مجموعی محصول جو تجارتی اموال پر مسلم غیر مسلم ہر قسم کے سوداگروں سے لیا جاتا تھا اسے "عشر السفن" کوئی الگ چیز تھی اس کا منشا یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں امن و امان کی فراوانی، عام فراغت و ثروت کی وجہ سے ہر قسم کے اموال کے طلب کا یہ نتیجہ تھا کہ بکثرت غیر ممالک کے تاجر مسلمانوں کے ملکوں میں تجارت کے لئے آتے جاتے رہتے تھے اور اس سلسلہ میں بڑی کافی آمدنی حکومت کو ہو جاتی تھی۔ جرجی زیدان ہی کا بیان ہے کہ

قد بلغت اعشار السفن فی ایا
والواثق بالله ما لا کثیراً۔
واثق باللہ کے زمانے میں جہازوں کے
محصول کی مقدار بہت بڑھ گئی تھی۔

بلکہ زیدان کا خیال تو یہ ہے کہ یورپین ممالک کے تجارتی ابنائے جبل الطارق پر بکثرت اس محصول کے ادا کرنے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ موجودہ زمانے میں TAREF کا جو لفظ مغربی زبانوں میں تجارتی محصول کے لئے مستعمل ہے یہ عربی کے لفظ "طریف" جو جبل الطارق کے کسی کروڑ گیری کی چوکی کا نام تھا۔ اس کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا "تعریف" سے ٹرف بنا ہے۔ بہر حال "عشور" کے متعلق اس غلط فہمی کا مجھے ازالہ مقصود تھا۔ البتہ اس سلسلہ میں جرجی زیدان نے بعض نئے ناموں کے محاصل کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ایک کا نام "غله دار لفری" ہے۔ یعنی سرکاری ٹکسالوں میں لوگ اپنی اپنی چاندی یا سونا بھیج کر سکوں کی شکل میں ڈھلواتے تھے اور لکڑی آگ محنت وغیرہ کے معاوضہ میں فی صد ایک درہم دیا جاتا تھا۔ جرجی زیدان کا بیان ہے کہ یہ بھی اسلامی حکومتوں کے مداخل کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ہر صوبہ جاتی اصناعی مرکزوں میں ٹکسال بنے ہوئے تھے مخلوق ان میں اپنے سکے ڈھلواتی تھی۔ چونکہ بمقدار کثیر سکے ڈھلتے تھے حتیٰ کہ صرف ایک شہر اندلس کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ کسی کسی سال میں ایک ایک کروڑ طلائی گنی ڈھالی جاتی تھی۔ جرجی کے قلم سے اضطرار ایہاں پر یہ الفاظ ٹپک پڑے ہیں،

وذلك نحو ضعف ما تضرب دولة
انگریزی حکومت جو اس وقت اپنی

۱۰ تکلیر الیوم وھی فی
عنقوا بن شباب میں ہے وہ سالاز جتنے

۱۱ بان مجدھا۔
سکے ڈھالتی ہے یہ اس کی چوگنی رقم ہے

اور پھر حیرت سے پوچھتا ہے کہ جب ایک اندلس کا یہ حال تھا تو مصر و بغداد وغیرہا من المدن الاسلامیہ اس باب میں کیا حال ہوگا۔

ظاہر ہے کہ دار الضرب کی بنیاد خلافت بنی امیہ کے زمانے میں باضابطہ شکل میں قائم ہوئی ورنہ اس سے پہلے عموماً اسلامی ممالک میں رومی و ایرانی سکے چلتے تھے جنہیں دنانیر ہر قلعہ اور درہم کسٹری بھی کہتے تھے۔ اس لئے رعایا پر اس مزید محصول کا اضافہ عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ کی بات تو نہیں ہو سکتی۔

اب تک اس محصول کے متعلق کوئی تصریح مجھے اسلام کی قانونی کتابوں میں نہیں ملی البتہ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ کا ایک مکتوب نقل کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے والی (گورنر) عبدالحمید بن عبدالرحمن کو خراج کے وصول کرنے میں رعایا کے ساتھ ملائمت و نرمی کی تاکید کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ خراج کی مد میں مندرجہ ذیل مدوں کو ہر گز رعایا سے نہ لو یعنی

۱۲ جو من لصر ابین ولا اذابیۃ لفضہ
سکہ ڈھالنے والوں اور چاندی کے

والاھدیۃ النیروز والموہبان
والاثنین الصنف ولا اجور
الفتوح ولا اجور لبیوت ولا
درل ہما النکاح والاخراج علی
علی من اسلم من اهل الارض
(کتاب الخراج ص ۱۹)

پگھلانے کی مزدوری نہ لی جائے اور نیروز
و مہرجان (غیر اسلامی تہواروں) کا ہدیہ
بھی نہ لیا جائے اور نہ کاغذ کے دام
لئے جائیں اور نہ گھروں کا ٹیکس اور نہ نکاح
نکاحانہ اسی طرح باشندوں میں جو مسلمان
ہوں ان پر بھی خراج نہ عائد ہوگا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پیشتر کے خلفاء بنی امیہ کے زمانے میں کچھ اس قسم کے نئے محصولوں کا
گذشتہ حکومتوں کی تقلید میں اضافہ ہو گیا تھا بلکہ ثمن الصنف کے مستثنیٰ کرنے کا کچھ واضح مطلب سمجھ میں
نہیں آتا۔ کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ کتابوں کی درآمد برآمد پر محصول نہ لیا جائے جیسا کہ ہماری حکومت
آصفیہ میں اس کا اب تک رواج ہے کہ کروڑ گیری سے احتراماً للعلم کتابوں کی درآمد برآمد پر محصول معاف ہے
یا حکومت میں یہ سلسلہ مقدمات کاغذی مصارف کا صرفہ رعایا سے وصول کیا جاتا تھا جیسا کہ اس زمانہ میں عدالت کے محکموں تک
میں کورٹ فیس بیچارے ہر دادخواہ سے وصول کی جاتی ہے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس محصول کو معاف کر دیا تھا۔
بہر حال حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس مکتوب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ناجائز ابواب
میں "اجور الضرابین واجور اذابہ القفۃ" بھی ہے۔ اگرچہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آخر سکہ بنا کر تو لےنے کی
بار بار جھنجھٹ سے اور کاٹنے گھٹانے بدلنے وغیرہ کے دغل و فصل سے حکومت لوگوں کو مطمئن
کر دیتی ہے اور اس کے صلہ میں ایک فی صدی اگر اجرت لیتی ہے تو اس کو بجائے جباہیات انظلم
کے "النوائب" میں کیوں شریک نہ کیا جائے جس کے عائد کرنے کا ذکر چچا کہ حکومت کو قانوناً اختیار ہے



صرف دولت

حدیث من اکتسبه کی تفصیل کے بعد فیمہ الفقہ کے ٹکڑے کی اب تو صبح باقی رہ جاتی ہے اور اب آئندہ صفحات میں ہم اسی کے متعلق مختصر الفاظ میں اسلام کے نقاط نظر کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ گو عام مذاہب و ادیان میں مال و دولت کی بہت کچھ خدمت کی گئی ہے حتیٰ کہ اسی بنیاد پر مذہب اور دنیا کی نفرت دونوں قریب قریب ایک دوسرے کے مرادف ہو گئے ہیں اور اسلامی مستندات میں بھی اس قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن مولینا روم کے مشہور شعر چہیت دنیا والے نے تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان تک اس دنیا کا صحیح مطلب پہنچا دیا ہے جس کی اسلام نے خدمت کی ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ اگر دولت کمائے میں آدمی خدا سے غافل نہ ہو اور اکتساب دولت کے جن قوانین کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا گیا ہے اگر ان قانونی جائز ذرائع سے مال حاصل کیا جائے اور خدا کے قائم کئے ہوئے حدود سے لاپرواہی نہ برتی جائے تو صرف حدیثوں میں نہیں بلکہ قرآن میں بھی

۱ اموالکم التي جعل الله لكم

تمہارا مال جسے خدا نے تمہارے تمہاؤ

قیاماً۔

اور قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔

کے عجیب و غریب جامع مانع الفاظ میں "مالی قوت" کی حقیقت بیان کی گئی ہے گویا حق تعالیٰ کی ذات جس طرح سموات و ارض کی قیوم ہے اسی "قیومیت" اور تمہاؤ کا ایک حصہ اس عالم مجاز میں "اموال" کو دیا گیا ہے۔ یعنی بنی آدم کے ٹھہراؤ اور قیام کا ذریعہ مال ہے یہ قرآن کا نظریہ ہے۔

انسانیت کی ہر آرزو اور اس کی تمنائیں زیادہ تر مالی قوت ہی کے ساتھ وابستہ ہیں

اس لئے بعض روایتوں میں آیا ہے کہ

۲ الدراهم والدنانیر خواتم اللہ

فی ارضہ من جاء بنجاستہ مولا

قضیت حاجتہ۔

درہم و دنانیر (روپیہ اشرفی) اللہ کی

مہریں ہیں، جو اپنے مالک کی مہر

لے کر آئے گا اس کی حاجت

پوری ہوگی۔

طبرانی فی الاوسط

قدرت کی ایک ایسی نعمت جس کے ساتھ ہمارا قیام وابستہ ہے ضرورت ہے کہ ہم اس کے صرف کرنے میں پوری احتیاط اور بیداری سے کام لیں، اگرچہ یوں بھی قدرت نے انسانی فطرت میں مال کی حفاظت و صیانت کا جذبہ محفوظ کر دیا ہے قرآن ہی میں ہے،
 و احضرت الا نفس الشیح
 نفوس انسانی لالچ کے سامنے
 حاضر کی گئی ہیں۔

انسان کا یہی فطری شیخ (اور دولت کی نو) ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ صرف دولت میں لوگ اتنی لاپرواہی نہیں برتتے جتنی حصول دولت میں عموماً برتی جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صرف دولت پر اسلام نے اتنی پابندیاں نہیں عائد کی ہیں جتنی حصول دولت میں عائد کی گئی ہیں۔ مگر پھر بھی صرف دولت کے سلسلے میں اسلام کا جو ہدایت نامہ ہے گو وہ مختصر ہی سہی۔ تاہم جو کچھ بھی اس باب میں ہدایتیں دی گئی ہیں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ عقل کی راہ سے آدمی اس وقت تک ان نکات تک نہیں پہنچا ہے۔
 ”صرف دولت“ کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے چند سوالات کو رکھ لینا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کے پاس جب جائزہ اور قانونی ذریعے سے دولت جمع ہو گئی تو قدرتنا اس کے سامنے دو سوالات آتے ہیں یا ان کو آنا چاہیے۔

کن کن چیزوں پر اس دولت کو نہ صرف ہونا چاہیے۔ جب اس سوال کا جواب معلوم ہو جائے تب اس کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ پھر کن چیزوں پر اس کو صرف کرنا چاہیے، اور یہی دوسرا سوال ہے گویا پہلے سلب پھر ایجاب کی تحقیق ہونی چاہیے۔

پہلے ہم سوال اول کو لیتے ہیں یعنی اسلام کن چیزوں پر صرف دولت سے آدمی کو منع کرتا ہے تبذیر ظاہر ہے کہ جب ہر جائز و ناجائز ذرائع سے اسلام دولت کمائے کی اجازت نہیں دیتا تو پھر ہر جائز و ناجائز خواہش کی تکمیل میں بھی صرف دولت کی وہ کیسے اجازت دے سکتا ہے الغرض قانوناً جن افعال و اعمال سے اسلام نے روکا ہے۔ ان راہوں پر صرف دولت کا نام قرآن کی اصطلاح میں تبذیر ہے، قرآنی آیت،

ولا تبذیرا

اور غلط مصارف پر ہرگز خرچ نہ کرو۔

میں صرف دولت کے اساسی اتناعی قانون کا اعلان کیا گیا ہے، اگرچہ عام طور پر تبذیر اور اسراف کو لوگ ہم معنی خیال کر کے دونوں کا ترجمہ فضول خرچی کر دیتے ہیں لیکن جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ صرف دولت کے یہ دو مستقل دفعات ہیں فضول خرچی کے معنی تو یہ ہیں کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے مثلاً اگر کسی کا پیٹ جو کی روٹی سے بھر سکتا ہے گیہوں کی روٹی کھانا اس کے لئے بایں معنی فضول خرچی ہوئی۔ پھر کیا اسلام میں یہ جرم ہے؟ گزر چکا کہ اسلام جب زیب و زینت اور آرائش تک کی ممانعت نہیں کرتا تو بھلا بجائے جو کے جو گیہوں کی روٹی کھاتا ہے اس کو تبذیر کیسے اسلام میں قرار دیا جاسکتا ہے خصوصاً جب ہم اسی آیت کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے تبذیر کرنے والوں کو

تنبذیر کرنے والے شیاطین کے بھائی
ہیں اور شیطان تو اپنے رب کا
ناشکر ہے۔

ان المبذرین کالواۓ خوارین
الشیاطین وکان الشیطان
لربیہ کفوراً ۱۰

قرار دیا ہے۔ "شیطان کا بھائی ہونا" اور اس کی صفت "گفورت" میں مبذرین کو شریک کرنا یہ منرا کیا اس شخص کی قرآن مقرر کر سکتا ہے جو بجائے جو کے باوجود قدرت کے گیموں کی روٹی کھاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ "تنبذیر" کا مادہ "بذر" ہے، بذر کے معنی تخم کے ہیں، تنبذیر تخم چھڑکنے کو کہتے ہیں پھر جیسے کسان اپنے کھیت میں دانے ڈالتا ہے اور بغیر اس خیال کے چھڑکتا چلا جاتا ہے کہ دانے کہاں گریں گے کہاں نہ گریں گے، یہی حال اس شخص کا ہے جو اپنی دولت خرچ کرتا چلا جاتا ہے لیکن اس صرف میں اس کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ جائز خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے یا ان خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے جن کی تکمیل قانوناً جرم ہے یہاں تک تو مبذر کسان کے مشابہ ہی لیکن آگے کسان کے دانے تو ایک سے سو پیدا کرتے ہیں اس معاملہ میں مبذر اس سے جدا ہو جاتا ہے بلکہ ٹھیک جو حال شیطان کا ہے وہی حالت اس کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان جیسا کہ اس قوت کا نام ہے جو بجائے خیر کے ہمیشہ شر اور بُرائی پر صرف ہوتی ہے۔ یہی حال مبذر کا ہے کہ خدا کی دی ہوئی مالی طاقت کو وہ بھی بُرائی اور شر کے حصول میں صرف کرتا ہے اسی لئے اس کا بھائی ہے اور جس طرح شیطان اپنی قوت کے غلط استعمال سے خدا کا ناشکر اقرار پایا یہی حال اس کی ناشکری کا ہے۔ الحاصل "تنبذیر" کے صحیح معنی جو خود قرآن سے پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مال جو جائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے انسان کو دیا گیا ہے اسے ناجائز خواہشوں اور غیر قانونی اعمال و افعال پر خرچ کرنا، مثلاً شادی بازی، حرام کاری، شراب خواری وغیرہ قانونی جرائم پر جو دولت کو صرف کرتا ہے وہ مبذر ہے۔ پس "تنبذیر" کے حقیقی معنی یہی ہیں۔ اسراف وہ اس سے بالکل جدا گانہ چیز ہے، اپنے محل پر اس کا ذکر آئے گا تعجب ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں جہاں تنبذیر کی یہ آیت ہے اسی کے بعد اسراف کے قانون کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، اگر دونوں ایک ہی چیزیں ہوتیں تو پھر اس کو دہرانے کی کیا ضرورت ہوتی۔ جب "تنبذیر" کی حقیقت واضح ہو گئی تو اب اس کا پتہ چلانا کہ مصارف کا کون سا سلسلہ تنبذیر کے تحت میں داخل ہے اس کے لئے اسلامی جرائم کی فہرست اپنے سامنے رکھ لینا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ ان جرائم میں سے ہر چیز پر دولت کا صرف کرنا تنبذیر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے تنبذیر کی یہی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے
ولو دالفاً
اگرچہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ جرائم پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک روپیہ خرچ کرے اور اس سے بھی

یہی معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب کے معنی فضول خرچی کے نہیں ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ ضرورت سے زیادہ ایک جہ بھی خرچ کرنا شیطان کا بھائی بننا اور خدا کے کفور بندوں میں شریک ہونا ہے۔ حالانکہ ایسا دنیا میں کون ہے۔

تہذیب کے بعد صرف دولت کے متعلق اسلام میں اور بھی دو امتناعی قانون ہیں جن میں ایک کی تعبیر اسراف سے اور دوسری کی تعبیر ریاء الناس سے کی جاتی ہے۔ طبعی ترتیب کا اقتضاء تو یہی ہے کہ ان دونوں قانون کی تشریح بھی اسی وقت کر دی جائے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ان دونوں قانونوں کی صحیح حقیقت جیسی کہ وہ ہے اسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب ہم پہلے صرف دولت کے ایجابی سوال کے جواب کو سمجھ لیں۔ اس لئے خلاف ترتیب میں اس وقت ان دونوں سے الگ ہو کر دوسرے سوال کو چھیڑ دیتا ہوں جیسا کہ میں نے کہا تھا سبلی سوال کے بعد دوسرا مرتبہ ایجابی سوال کا ہے۔

کن چیزوں پر دولت کو | اسلام کے لئے یہ بڑا دل چسپ سوال ہے یعنی اس باب میں دنیا کے صرف کرنا چاہیے | دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام نے اپنے خاص نقاط نظر پیش کئے ہیں۔ پہلی خصوصیت تو اسلام کی اس باب میں وہی ہے جس کا ذکر مختلف طریقوں سے پہلے بھی ہو چکا ہے یعنی اس نے فقط ضرورت کی حد تک مصارف کو محدود کرنے کا حکم نہیں دیا ہے جیسا کہ عموماً دنیا کے تمام مذاہب کے عام رجحانات ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ضرورت میں بھی کمی کی جائے حتیٰ کہ کھانا جتنے دن آدمی چھوڑ سکتا ہو چھوڑ دے، پانی ترک کر دے، سانس تک نہ لے، کپڑے بھی جہاں تک بدن سے اتار سکتا ہو اتار دے گویا ان ہی چیزوں کو مذہبی جذبے کے افراط کا ثبوت قرار دیا گیا ہے لیکن جیسا کہ میں بار بار دہراتا چلا آ رہا ہوں کہ ضرورت تو بہر حال ضرورت ہے اسلام زینت و آرائش کے حدود تک بھی جانے والوں کو مذہبی دائرے میں بلند سے بلند مقام عطا کرنے کے لئے تیار ہے، سلیمانی تخت پر بھی مذہبی مدارج کا سب سے بلند ترین درجہ یعنی نبوت تک مل سکتی ہے۔ رسول علیہ السلام کے خلیفہ برحق بھی ”الغنی“ کے لقب کو اپنے لئے باعث فخر قرار دیتے ہیں اور یہ بات اسلام کی ایسی خصوصیت ہے جس پر بحث کرنے کی بھی چند ان ضرورت نہیں جو کچھ اب تک اس سلسلے میں کہا جا چکا ہے وہی کافی ہے۔

دوسری خصوصیت اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ عموماً مذاہب نے دولت کے جائز مصارف کے بھی دو حصے کر دیئے ہیں، ایک دینی مصارف دوسرے دنیوی مصارف۔ لیکن اسلام نے اس تقسیم ہی کو حذف کر دیا۔ اسلامی نقطہ نظر سے دولت کے سارے ایسے مصارف جنہیں عام طور پر دنیوی مصارف میں شمار کیا جاتا ہے وہ دینی مصارف بن سکتے ہیں، اسی طرح ایسے تمام مصارف جنہیں عام طور پر دینی مصارف خیال کیا جاتا ہے دنیوی بن سکتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ صرف دولت یا خرچ کے متعلق قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ

لوگوں نے دو دفعہ ما ذیٰ یفقون (کیا خرچ کریں) کے الفاظ میں استفسار کیا۔ اس سوال کے جواب میں جو پہلا جواب قرآن نے دیا ہے وہ یہ ہے

قل ما نفقتم من خیر۔

کہہ "خیر" سے جو کچھ تم خرچ کرو۔

یعنی "خیر" اور "نیکی" کی راہ جسے عموماً دینی مصارف بھی کہتے ہیں اگر اس کے متعلق تمہارا سوال ہے تو اب تک جو یہ سمجھا جاتا تھا کہ صرف غریبوں اور مسکینوں کو دینا یہ "خیر" اور خیرات ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ یتیموں اور مسکینوں کو دینا یہ بھی دینی خرچ ہے اور اپنے خاندان والوں مثلاً والدین یا اقرباء وغیرہ پر خرچ کرنا یہ بھی "خیر" ہے۔ "خیر" کے معنی عربی میں "مال" کے بھی آتے ہیں، اور عموماً لوگوں کا ذہن اس آیت میں بھی اسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، حالانکہ آیت کو ختم کرتے ہوئے،

وما تنفقوا من خیر فان الله به علیم۔

اور نیکی کی راہ سے جو کچھ تم خرچ

کرو گے تو خدا اس سے باخبر ہے۔

میں "خیر" کے جو معنی یہاں مراد ہیں اس کو متعین کر دیا گیا ہے کہ "خیریت" اور "نیکی" کا مدار اس پر ہے کہ حق تعالیٰ تمہارے اس خرچ کے متعلق کیا جانتے ہیں، یعنی اگر تم نے اپنے اقرباء اور خاندان والوں کو اس لئے خرچ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ حکم ہے تو تمہارا یہ خرچ جو بظاہر دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے دینی خرچ ہے اور یتامی و مساکین پر جو تم صرف کر رہے ہو اگر اس سے خدا کی مرضی کا اتباع مقصود نہیں ہو تو گو بہ ظاہر وہ کتنا ہی بڑا دینی صرف سمجھا جائے لیکن پھر بھی وہ دنیوی خرچ ہی ہے قرآن میں تو اس کی طرف کلیاتی رنگ میں اشارہ کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر جو تفصیلات اس باب میں ارشاد فرمائے ہیں حدیث کی کتابوں میں ان کا ایک ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

اس اصول کی تشریح میں کہ عام طور پر جسے دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے صرف نیت اور نقطہ نظر کی

تصحیح سے وہ بھی دینی خرچ بن جاتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اپنی بیوی پر آدمی جو خدا کو سامنے

ان المسلم اذا نفق علی

رکھ کر خرچ کرتا ہے یہ اس کی

اهله نفقة وهو یحسبها کانت

طرح سے صدقہ ہے۔

له صدقة (بخاری مسلم)

صرف یہی نہیں کہ وہ دینی خرچ بن جاتا ہے بلکہ تمام دینی مصارف میں اس دنیوی خرچ کو برتری حاصل ہے، فرمایا جاتا ہے،

وہ اشرفی جسے اللہ کی راہ میں

دینا سر ۲ نفقته فی سبیل اللہ

تم نے خرچ کیا اور وہ اشرفی جو

دینا سر ۲ نفقته فی مراقبة

غلام آزاد کرانے میں صرف کی

دینا سر ۲ الصدقة به علی

اور وہ اشرفی جو کسی مسکین پر تم نے
صدقہ کیا اور وہ اشرفی جو تم نے اپنی
بیوی پر خرچ کی، ان تمام اشرفیوں

مسکین، دینار، نفقہ
علیٰ اہلک اعظمہا اجر الذی
نفقت علیٰ اہلک (مسلم)

میں ثواب اور اجر کے حساب سے سب سے بڑی وہ ہے جسے تم نے اپنی بیوی پر خرچ کیا

اور بیوی بچوں کو تو خیر ایک حد تک غیر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے
بھی آگے بڑھ کر ارشاد فرمایا کہ آدمی خود اپنی ذات پر جو دولت صرف کرتا ہے یہ بھی صدقہ ہے۔ مسند احمد
کی حدیث ہے،

تم نے خود اپنے کو جو کھلایا یہ بھی
تمہاری طرف سے صدقہ ہے جو اپنی
اولاد کو کھلایا یہ بھی تمہاری طرف سے
صدقہ ہے اور اپنی بیوی کو جو کھلایا وہ
بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے اور
اپنے نوکر کو جو کھلایا وہ بھی تمہاری

ما اطعمت نفسك فهو لك
صدقة ما اطعمت ولدك
فولك صدقة ما اطعمت
نرجك فهو لك صدقة
ما اطعمت حارسك فهو لك
صدقہ۔

طرف سے صدقہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ "احتساب" (یعنی حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کو اپنے دھیان میں سامنے رکھ کر)
تبدیر کے سوا دولت کے تمام مصارف "صدقہ" اور دینی خرچ ہیں، گویا مشہور حدیث "انما الاعمال
بالنیات" کا ایک مصداق یہ بھی ہے لیکن "صدقہ" کے باب میں "احتساب" کا مفہوم کتنا وسیع ہے
اس کے سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے مسند احمد کی اس حدیث کو رکھ لینا چاہیے جس میں حضرت
ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ
مبا صنعتك اهلك صدقة

تیرا اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہونا

پر بھی صدقہ ہے۔

حضرت ابو ذرؓ نے اس پر سوال کیا کہ

ہم اپنی خواہش بھی پوری کرتے ہیں

النصیب شہوتنا و لوجنا۔

اور نصاب بھی دیا جائے ؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا

تم سمجھتے ہو کہ اگر اس خواہش کو

لو صنعتہ فی غیر حقہ

بے موقعہ تم پوری کرتے تو کیا اس کا

کان علیہ و نزار۔

گناہ تم کو نہ ہوتا۔

ابو ذرؓ نے فرمایا بلی (کیوں نہیں) اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "احتساب" کے اس

معنی کو بیان فرمایا جس کے بعد تقریباً ہر مسلمان کا جائز فعل صدقہ بن جاتا ہے ارشاد ہوا کہ
تحتسبون بالسئۃ ولا تحتسبون بالخیر۔
تم لوگ بُرائی کا احتساب کرتے ہو اور
خیر و نیکی کا احتساب نہیں کرتے۔

”الغرض“ اپنے مال کو جہرا تم میں نہ استعمال کر کے جو خود اپنے اوپر اپنے عیال پر، خاندان پر خرچ
کرے گا یہ سارے مصارف ”صدقہ“ اور دینی مصارف میں شمار ہوں گے۔

ریاء الناس | لیکن ٹھیک جس طرح دنیوی مصارف ”احتساب“ کے قانون کی بنا پر دینی مصارف
بن جاتے ہیں۔ بجنسہ ہمارے تمام دینی مصارف دنیوی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ یعنی ”بتذیر“
کے تحت داخل ہو جاتے ہیں، یہ کیسے ہوتا ہے؟ قرآن ہی نے اس کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔

الذین ینفقون ۲ أموالهم
سریاء الناس ولا یؤمنون
باللہ ولا بالیوم الآخر ۲
لیکن الشیطان لہ قرینا
فساء قرینا۔
جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال کو لوگوں کو
دکھا کر اور اللہ اور قیامت کے
دن پر ایمان نہیں لاتے اور جس کا
ساتھی شیطان ہو، اس کا بہت
بُرا ساتھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نیکی کے بہترین کام ہی میں کیوں نہ خرچ کرے۔ لیکن اگر اس نے یہ سارا خرچ
”الناس“ (لوگوں) کو دکھانے کے لئے کیا ہے اور اس کے سامنے نہ خدا ہے اور نہ روزِ جزا ہے بلکہ صرف
چند لوگوں پر اپنی دولت کی دھونس جمانا، محلہ، ٹوٹے، بستی یا شہر، ملک یا دنیا میں نام آوری
حاصل کرنا، اپنی بُرائی اور کبریائی کا اعلان مقصود ہے تو جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا اس شخص
کے ساتھ وہی بر خود غلط طاقت یعنی شیطانی قوت ساتھ لگ گئی ہے، اپنی مالی طاقت کو غلط محل پر
اسی طریقے سے خرچ کر رہا ہے جیسے شیطان نے اپنا استعمال غلط کر دیا۔ دوسری جگہ ”سریاء الناس“
والے خرچ کے متعلق ارشاد ہے کہ

مثله کمثل صفوان علیہ تراب
فاصابہ وابل فترکہ صلاً لا
یقدر ۲ و علی شیء مما ۲ کتسبوا
واللہ لایہدی لقوم الکافرین
(آل عمران)
اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ چٹان پر
گرد ہو، اور اس پر بارش برسے پھر
اسے سپاٹ بنا چھوڑے ایسے لوگ
جو کچھ کماتے ہیں اس کے کسی حصہ پر قابو
نہیں رکھتے اور ناشکروں کی خدائیں نہیں کرتا

ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اور اس کے انعام کے دن کو چھوڑ کر جو محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے
وہ یہی کرتا ہے کہ اپنی امیری اور دولت مندی کے نشانات لوگوں کے حافظوں اور دلوں پر قائم
کرنا چاہتا ہے، اپنے بچوں کی شادیوں میں دھوم مچانے والے تقریبات پر روپے لٹانے والوں کا
مقصد اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ان لوگوں کی یہ ساری مالی زور آزمائیوں کا

اثر عوام کے قلوب پر چند دنوں سے زائد قائم نہیں رہتا۔ ٹھیک اس کی مثال وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے کہ چٹان پر گرد بیٹھی، پانی کا ایک چھینٹا آیا اور سب صاف، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ چاندی اور سونے کے گزروں اور لائٹھیوں سے یہ لوگ عوام کے دل و دماغ میں جو اپنے لڑکے کی ختنہ یا شادی کی یاد ٹھونسنا چاہتے ہیں خواہ مخواہ کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے جو اپنے حافظوں کو ان بوالفضولوں کے مصارف کی یاد کے لئے ہمیشہ بیدار رکھے، تماشا ہوا، دیکھ لیا گیا اور لوگ بھول گئے۔

الحاصل ”اناس“ کو پیش نظر رکھ کر جو دکھاوے کا خرچ کرتے ہیں یہ اپنے تمام مصارف خواہ بہ ظاہر وہ کتنے ہی دینی نظر آتے ہوں، مثلاً کسی مدرسہ کو دیں، مسجد بنائیں، پبلک ورکس میں دیں، ہسپتالوں پر خرچ کریں، کچھ بھی کریں، قرآن کی رو سے یہ سب دنیوی، بلکہ شیطانی خرچ بن جاتا ہے۔

اور یہی میرا دعویٰ تھا کہ اسلام نے دینی اور دنیوی مصارف کی ان دو قسموں کو ختم کر کے صرف دینی یا صرف دنیوی خرچ میں دولت کے مصارف کو منحصر کر دیا ہے۔ یہاں ایک نکتہ کا ذکر ضروری ہے، اسلام نے جہاں اس قسم کے عجیب قوانین پیش کئے ہیں ان ہی میں اس کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسانی فطرت کے طبعی رجحانات اور جلی عواطف و میلانات کی بھی ساتھ ساتھ رعایت کرتا جاتا ہے اور کوئی ایسی تدبیر نکال لیتا ہے جس کے ذریعہ سے اصل مقصد جو اس کا ہے وہ بھی فوت نہ ہو اور عام انسانی کمزوریوں کا بھی نباہ ہو جائے یہی ”ریا بالناس“ والا قانون ہے۔ عقلاً اس کے بے نتیجہ ہونے اور غلط مصرف ہونے میں کیا شبہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا۔ مگر کیا کیجئے کہ انسان میں دولت کی نمائش کا جذبہ بھی تقریباً فطری ہے۔ دولت کمانے والے بہر حال کچھ اس کی نمائش بھی چاہتے ہیں، اسی جذبہ کی رعایت ہے جس کا بُراغ ان حدیثوں سے ملتا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دولت مندوں کو پھٹے اور بُرے حال میں دیکھ کر دریافت فرمایا کہ

۱۔ مال (کیا تمہارے پاس مال ہے) جواب میں کہا گیا غم (ہاں) آپ نے فرمایا
من ۲۔ المال (کس قسم کے اموال تمہارے پاس) جواب ملا من کل المال (ہر قسم کا مال) مثلاً
اونٹ، گھوڑے، بکریاں، غلام سب ہی کچھ ہیں، یہ اس شخص نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے تب اس سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا

جب خدا نے تمہیں مال دیا ہے تو
چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور
جو تمہیں سرفراز کیا ہے وہ

فاذ ۲ تا ۲ تاک ۲ اللہ صالافلیو
۲ ثر نعمۃ ۲ اللہ علیک کرامتہ
(انسانی)

دکھایا جائے۔

ظاہر ہے کہ دکھایا جائے گا تو انسان ہی کو دکھایا جائے گا جس کے معنی یہی ہوئے کہ لوگوں کو اپنی مالی حیثیت دکھانی چاہیے اس کا حکم ہے، لیکن برائی کی تصحیح کے لئے احتساب کا ایک پہلو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال لیا وہ یہ ہے کہ اپنی دولت و نعمت کو خدا کا عطیہ قرار دے کر اور اس نیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر دولت کی نمائش کی جائے گی تو یہ دکھانا اور ”یا انسان“ بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوا۔ اس لئے جس بربادی یا دولت کے غلط استعمال کا جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا اسی نقطہ نظر کو ایک اور حدیث میں اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے کہ

۱۲۰ اللہ یحب ۱۲۰ نیری ۱۲۰ اثر اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اپنی نعمت کے نشانات کو اپنے

نعمتہ علی عبدہ -

(ترمذی) بندے پر دیکھیں۔

گویا ”انسان“ کو یہ دکھانا، انسان کو دکھانا نہیں ہے بلکہ اپنے مالک ہی کو دکھانا ہے کہ وہی اس کو پسند فرماتا ہے کہ جن پر اپنی نعمتیں نازل کر دیں وہ دوسروں کو یہ دکھائیں کہ ہمارے خدا کی یہ نعمتیں ہم پر ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہی ۱۲۰ اعمال بالنیات کے قانون سے ”ریا انسان“ جیسا غولیکہ شیطانی فعل بھی ملکوتی صفت بن جاتا ہے اور ان سارے معاملات کا تعلق باطن اور اندر سے ہے۔ کون کس لئے کیا کر رہا ہے۔ اس کا فیصلہ یومرتبلی ۱۲۰ السواغر ہی کے دن ہوگا کہ اب تک سائنس کسی ایسے آلہ کی ایجاد میں کامیاب نہیں ہوئی ہے جس کے ذریعے سے لوگوں کی نیتوں کا حال معلوم ہو سکے۔

خیرات اور صدقات | بہر حال دولت کے مصارف میں اسلام کی دوسری خصوصیت یہی ہے کہ اس نے دینی و دنیوی دو قسم کے مصارف کا باب حذف کر دیا۔ اور اب اب صرف دنیوی مصارف دولت کا رہ گیا ہے یا صرف دینی کا اور ”صدقہ“ کی وسعت دامانی کا حال جب یہ ہے کہ ناجائز مصارف سے بچا کر جائز مصارف میں خرچ کرنا بھی اسلام میں خیرات اور صدقہ ہے تو ظاہر ہے کہ مسلمان کا شاید کوئی جائز خرچ ایسا نہیں نکل سکتا جو خیرات اور صدقہ کی مد میں داخل ہو کر دینی خرچ نہ بن جاتا ہو البتہ ان دینی مصارف میں پھر اسلام نے ایک ترتیب قائم کی ہے۔

سب سے پہلا حق تو آدمی کا خود اپنا ہے اور اس لئے اسلام نے یہ ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی اپنے کو قتل کر دے یا اپنے کسی عضو کو ضائع کرے یا بگاڑ دے حتیٰ کہ اسلامی قانون کی رو سے کسی کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ کھانا پینا اس حد تک چھوڑ بیٹھے کہ اس کی جان باقی نہ رہے یا اس کا کوئی عضو خراب ہو جائے زلیعی میں ہے،

ہلاک النفس ۱۲۰ و ۱۲۰ العضو جائز اور حلال چیز کو چھوڑ کر اپنی

بالامتناع عن المباح حرماً۔ جان ضائع کرنی یا کسی عضو کو نقصان

(شامی ص ۹۲ ج ۵) پہنچانا حرام ہے۔

بہر حال دولت کا سب سے پہلا مصرف خود کمانے والے کی ذات ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث مروی ہے۔

۱۲ کان احدکم فقیراً
فلیبدأ بنفسه (مغنی ص ۲۵۸)

تم میں جو کوئی نادار مفلس ہو تو چاہیے
کہ خرچ کی ابتدا خود اپنی ذات سے کرے۔

دوسری حدیث ہے۔

۱۲ ابدء بنفسک ثم من لقول۔ پہلے اپنی ذات سے شروع کرو، پھر ان پر

(المغنی صحیح) جو تمہارے زیر پرورش ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ میرے پاس ایک شتر فی ہے کیا کروں۔ پہلا جواب اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی دیا کہ
تصدق بہ علی نفسك۔ اپنی ذات پر اسے خیرات کرو یعنی خرچ کرو۔

اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلا مصرف اسلام نے خود کمانے والے کی ذات کو قرار دیا ہے اس کے بعد ان لوگوں کے مصارف کا درجہ ہے جن کی پرورش کا وہ قانوناً ذمہ دار ہے مشہور حدیث ہے

و۱۲ ابدء بمن لقول۔ شروع کرو خرچ کرنا ان لوگوں سے جو

(صحاح ستہ) تمہارے زیر پرورش ہیں۔

فقہاء نے اس سلسلہ میں بیوی بچے اور ان کے مختلف قانونی حالات کو تفصیل کے ساتھ طویل دفعات کے تحت بیان کیا ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

ان لوگوں کے بعد پھر ایسے ماں باپ کے مصارف واجب ہیں جو فقیر ہوں۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ

۱۲ جمع اهل العلم علی ۱۲ ن
نفقة الوالدین الفقیرین الذین
لا کسب لهما ولا مال واجبة
فی مال الولد۔ علم والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسے
نادار والدین جن کی نہ کمائی ہو اور
نہ ان کے پاس مال ہو، ان کا خرچہ
اولاد کے مال پر واجب ہے۔

والدین کے مصارف قانونی طور پر تو اسی وقت واجب ہوتے ہیں جب وہ واقعی محتاج ہوں یعنی حکومت مجبور کر کے رکے کے مال سے والدین کے مصارف کی پابجائی کرے گی۔

لیکن غیر قانونی طور پر یعنی حکومت جبر تو نہیں کر سکتی لیکن اخلاقاً والدین کی خدمت اپنے مال کا سب سے بڑا مصرف ہے۔ خصوصاً اس سلسلہ میں ”ماں“ کے حق کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

جتنی اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ کس کے ساتھ
حسن سلوک کروں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

۱ مک ۲ مک ۳ مک ثم الاقرب

ماں کے ساتھ ماں کے ساتھ ماں کے ساتھ

پھر جو قریب تر رشتہ دار ہو اور

جو اس کے بعد،

(ابوداؤد)

پھر آپ نے خود ہی تشریح بھی فرمائی

۱ مک واپاک اختک و اختاک

ماں کو دو، باپ کو، بہن کو، بھائی کو

۲ دناک فادناک (صحاح)

قریبی رشتہ دار کو پھر جو ان کے بعد قریب ہوں

رشتہ داروں کو غیروں پر اسلام نے کیوں ترجیح دی، اس کی وجہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف
مواقع پر بیان فرمائی کہ ایسی صورت میں

لہ ۱ اجران ۲ اجر القرابة واجر

دینے والے کو دو ثواب حاصل ہوتے ہیں

۳ الصدقة۔ (بخاری و مسلم)

رشتہ داری کا ثواب اور صدقہ کا ثواب۔

الغرض یوں ہی درجہ بدرجہ مصارف کا استحقاق آگے بڑھتا چلا گیا ہے سچی بات یہ ہے کہ اس میں بھی
اسلام نے انسان کی فطرت کے ایک خاص میلان کا لحاظ رکھا ہے۔ یوں تو لوگ دوسروں پر بھی خرچ
کرتے ہیں لیکن مختلف تعلقات اور موثرات کے تحت آدمی کا میلان زیادہ تر اپنے رشتہ داروں ہی
کی طرف ہوتا ہے۔ مگر خدا جانے دُنیا والوں نے یہ کیسے سمجھ رکھا تھا کہ اپنوں پر خرچ کرنا تو خود
غرضی ہوئی اور خود غرضی کے بعد نیکی کہاں؟

اسلام نے صلہ رحمی کو نیکی کا ایک باب قرار دے کر اس فعل کو جسے فطرتاً آدمی کا جی چاہتا
تھا، نقطہ نظر کی تھوڑی سی تبدیلی سے خیرات و صدقات میں شریک کر دیا۔ اور یہ ایک ایسا نظم ہے
کہ ہر شخص یا سانی اس کو انجام دے سکتا ہے۔ لوگ اپنے رشتہ داروں کے ان اسلامی ذمہ داریوں کا
احساس اگر کرنے لگیں تو بے روزگاری، محتاجی کے نالوں کی آواز کچھ دھیمی پڑ سکتی ہے۔

بہر کیف یہ تو صرف دولت کی ایک تنظیمی ترتیب ہے۔ اس سلسلہ میں بعض مصارف تو فرض
ہیں جیسے اپنے بیوی بچوں اور والدین کے مصارف جب وہ فقیر ہوں۔ ازیں قبیل بھائی بہن وغیرہ
بلکہ دور کے رشتہ داروں کے مصارف بھی بعض حالات میں آدمی پر فرض ہو جاتے ہیں۔ اسی
طرح اگر لُصَاب کا آدمی مالک ہو تو پھر اسلام نے ہر شخص کے مال میں فقراء، غرباء، غارمین، مقروضین
وغیرہ کا جو حق قائم کیا ہے جس کی تفصیل حکومت کی آمدنی میں گزر چکی ہے۔ ان مصارف کا شمار بھی
فرائض میں ہے، فرائض کے ادا کرنے کے بعد اسلام نے آدمی کو اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو
اپنے مال سے اور بھی خرچ کر سکتا ہے، یہی مقام ہے جہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں تک
خرچ کر سکتا ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے آدمی کو اس معاملہ میں بہت

دور تک آزادی دے رکھی ہے بلکہ قرآن مجید نے یہ اصول مقرر کر کے

لینفق ذو سعة من سعته
ومن قدر علیہ سرقہ
فلینفق مما آتاه الله -

وسعت و گنجائش والوں کو چاہیے کہ
اپنی گنجائش کے لحاظ سے خرچ کریں،
اور جس کی روزی پنی تلی کر دی گئی ہے

چاہیے کہ جو کچھ اسے خدا نے دے رکھا ہے اسی سے وہ خرچ کرے۔

گویا اس اصول کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ اپنے مصارف کے مدارج آمدنی کی حیثیت سے رکھنی چاہیے یہی بات ہے جس کی طرف ان حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خدا کی نعمت کسی پر ہو تو چاہیے کہ نعمت کے اثر کو اپنے اوپر دکھائے (جیسا کہ گزر چکا) لیکن کیا اس سلسلہ میں اسلام نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے کہ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سارے مال و منال زمین و جائیداد کو کھاپی کر برابر کر دے۔ گذشتہ ابواب میں اس حدیث کے ایک ٹکڑے کا ذکر اچکا ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سونے کا ٹکڑا یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر توجہ دلائی، بار بار وہ توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رخی برتتے تھے تا آنکہ جب اس کا اصرار حد سے گذر گیا تب مجبوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ٹکڑے کو ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد اس زور سے اس شخص کی طرف پھینکا کہ راوی کا بیان ہے،

لو اصابته لاولعته اولعقرته

اگر اس پر پڑ جاتا تو اس سے دُکھ پہنچتا

یا زخمی ہو جاتا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ تم میں ایک شخص اپنا سارا مال اٹھا کر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے اس کے بعد خالی ہاتھ ہو کر گھر میں بیٹھ جاتا ہے پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرتا ہے۔ اس کے بعد اپنے وہ مشہور فقرہ استعمال فرمایا

خیر صدقة ما كان عن

سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تو نگر

کی پشت پناہی میں ہو،

ظہر غنی۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا سارا مال خرچ کر ڈالیں اور دراصل یہی وہ مسئلہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات میں کیا گیا ہے۔ میں اپنی اس بحث کو اسی مسئلہ پر ختم کرنا چاہتا ہوں، بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا

ما ذل ينفقون

کتنا خرچ کریں مسلمان

کا سوال پوچھا گیا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا

قل العفو

کہہ کہ "العفو"

یعنی "عفو" خرچ کریں، یہ "عفو" کیا چیز ہے؟ اس کا جواب بعد کو دیا جائے گا۔ پہلے دوسری آیتوں کو بھی نقل کر لوں۔ سورۃ اسرائیل میں ارشاد ہے

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝۲

اور تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں نہ ڈالو
اور نہ اس کو اتنا کھولو کہ بالکل کھل جائے
(کیونکہ اگر ایسا کرو گے) تو بیٹھ جاؤ گے اس

حال میں کہ لوگوں کی ملامت کے نشانہ بنے ہوئے ہو اور در ماندہ ہو۔

پھر سورۃ الفرقان میں ہے

الَّذِينَ ۲۲ ذُكِرُوا بِمَا لَمْ يُحِبُّوا
وَلَمْ يَلْتَمِسُوا عَنَّا عُدَّتْ أَعْيُنُهُمْ
ذَٰلِكَ قَوْلُهَا ۝۲

جو لوگ خرچ کرتے ہیں تو نہ حد سے گذرتے
ہیں اور نہ تنگی پیدا کرتے ہیں بلکہ ہوتا ہے
خرچ ان کا درمیان ان دونوں راہوں

کے اندازہ کے ساتھ۔

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ تینوں آیتوں میں قریب قریب ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ "العفو" کا عام طور پر مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جو باسانی ہو سکے اور پچھلی دو آیتوں میں تو ظاہر ہی ہے کہ خرچ کے باب میں "اعتدال" کی فہمائش کی گئی ہے۔ امام رازی اور ان کے سوا بھی عمومًا العفو کا مطلب یہی کہتے ہیں کہ اس کا تعلق

فَمَا لِيْ فَضْلٌ عَنْ حَاجَةِ الْاِنْسَانِ
فِيْ نَفْسِهِ وَ عِيَالِهِ ۝

آدمی کی ذات اور اہل و عیال کی ضرورت
سے جو بچ جائے۔

یعنی اپنے اور اپنے اہل و عیال وزیر پرورش لوگوں کے مصارف سے جو بچ جائے قرآن حکم دیتا ہے کہ ان سب کو خرچ کر دو۔

مگر ابھی حدیث گذر چکی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ سونے کے ڈلے والے آدمی کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ

خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ
ظَهْرٍ غَنِيٍّ (ابن خاری)

بہترین صدقہ وہ ہے جو تو نگری کی
پشت پناہی میں ہو۔

مشہور شارح حدیث امام خطابی "ظہر غنی" کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں۔

۲۱ عَنْ غَنِيٍّ يَعْتَدُ عَلَيْهِ وَ
يَسْتَظْهِرُ بِهِ عَلَى النَّوَائِبِ الَّتِي
تَنْوِبُهُ ۝

یعنی ایسی تو نگری جس پر بھروسہ
کر سکتا ہو، اور جس کی پشت پناہی
حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب

مصائب اور حوادث کا وہ شکار ہو۔

خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں

خیر الصدقة ما ابقت

بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی

تو نگر می کو باقی رکھے۔

غنی۔

جس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ ”صدقہ“ یا ”انفاق“ یا ”خرچ“ کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی حاصل کرنے یا مصارف پیش آنے میں مدد لے۔ خطاب کے الفاظ لیستظہریہ (یعنی جس سے پشت پناہی حاصل کر سکے) کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ما سوا اس کے سمجھ میں نہیں آتا کہ خود قرآن نے جب یہ ممانعت کی ہے کہ آدمی کل البسط کے طور پر یوں خرچ نہ کرے کہ گھر میں جا کر ذلیل و رسوا، تھکا ماندہ بن کر اسے بیٹھنا پڑے۔ حدیث میں بھی حضور نے یہی فرمایا کہ لوگوں کے سامنے اس کے بعد ہاتھ پھیلاتا پھرے۔

سعد بن ابی وقاص کی حدیث بھی گزر چکی جس میں رسول اللہ نے کل مال کے صدقہ سے یہ کہتے ہوئے منع فرمایا کہ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ تمہاری اولاد تمہارے بعد ہاتھ پھیلاتی پھرے۔

علی الخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعضوں کا ذریعہ معاش کوئی سرمایہ مثلاً تجارت کی پونجی یا زمین یا باغ یا مکان وغیرہ ہوتا ہے اور بعض لوگ محنت و مزدوری نوکری کر کے زندگی گزارتے ہیں۔ ثانی الذکر طبقہ اگر روز جو کچھ کمائے خرچ کر دے تو چونکہ دوسرے دن یا دوسرے مہینہ اس کو پھر آمدنی کی توقع ہے اس لئے اس کو تو شاید کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے لیکن اول الذکر طبقہ اگر ”العفو“ کا وہی مطلب سمجھ کر جو عام طور پر سمجھا گیا ہے اپنی پونجی یا زمین و مکان، باغ کو بھی ختم کر دے۔ کیونکہ بال بچوں کے کھلانے پلانے کے بعد اس کا یہ سرمایہ تو باقی ہی رہ جاتا ہے تو کیا اس کو دوسرے دن ملوم و محسوس ہو کر اسے بیٹھنا نہ پڑے گا۔

میرے خیال میں اسی لئے ”العفو“ کا مطلب ہی ہے جو واحدی سے امام رازی نے نقل کیا ہے

”العفو کے معنی لغت میں زیادتی کے ہیں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوگوں سے ”العفو“

یعنی زیادتی، نیز ارشاد ربانی ہے حتی عفو

یعنی اس قوم کے لوگ جب بڑھ گئے اور بہت ہو گئے

اصل ۱ العفو فی اللغة الزیادة

قال اللہ تعالیٰ حذ العفو

۱ ای الزیادة قال ایضاً حتی

عفو ۱ ای کثروا

مطلب یہ ہے کہ گذشتہ بالا طبقوں میں سے وہ طبقہ جس کی گذر بسر کسی سرمایہ یا جائداد ”زمین“ ”مکان“ وغیرہ کی آمدنی پر ہے یا معاشی اصطلاح میں یوں کہیے جو شغل اصل کے منافع سے اپنی معاشی ضرورتیں پوری کرتا ہے ان کے متعلق تو اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ ”العفو“ یا (الزیادة) کی حد سے آگے نہ بڑھیں یعنی اصل کو محفوظ رکھتے ہوئے جو زائد آمدنی ہو اس کو خرچ کرتے رہیں کہ ان کا یہی خرچ عن ظہر غنی ہو سکتا ہے۔

مشہور امام لفت الفراء سے منقول ہے،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو قل العفو
ہے۔ اس سے مراد المال (سرمایہ)
فضل یا بڑھوتری ہے۔

قوله تعالیٰ قل العفو وهو
فضل المال۔

(لسان العرب)

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ”العفو“ مال کی زیادتی اور آمدنی کو کہتے ہیں۔ پھر صاحب لسان العرب ہی
نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا اعفی قتل بعد اخذ الدیۃ
دیت (خون بہا) لینے کے بعد
لینے والوں نے عفو نہ کیا۔

پھر ”اعفی“ کے لفظ کا ترجمہ کرتے ہیں،

ای لا اکثر مالہ ولا استغنی

یعنی اس کا مال نہ بڑھے اور نہ وہ خوشحال ہو
اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ”سرمایہ“ کی آمدنی یا ”اصل“ کے ”منافع“ کو ”العفو“ کہتے ہیں پس اس
قسم کے لوگوں کے لئے میرے خیال میں ادائے فرائض کے بعد عام مصارف و انفاق میں اس کا
خیال رکھنا چاہیے کہ حتیٰ الوسع اصل کو ضائع نہ کریں۔

یہ حدیث جو مسند احمد ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا یبارک فی ثمن ارض ولا
دراہم لا یجعل فی ارض ولا دار
نبرکت دے اللہ اس زمین اور اس
گھر کی قیمت میں جو پھر زمین ہی یا گھر
ہی میں نہ لگا دی جائے۔ (مسند احمد)

ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں،

من باع دراہم وعقار فلم
یجعل ثمنہ فی مثله کان
قمنان لا یبارک فیہ۔
جو شخص کوئی گھر یا جائداد جب فروخت
کرے اور پھر اسے اسی جیسی چیز یعنی گھر
یا جائداد کے خریدنے میں نہ لگا دے تو

وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے مال میں برکت نہ دی جائے۔

یہی ابن آدم القرشی نے اپنی مشہور مستند کتاب ”الخراج“ میں بھی اس حدیث کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

لا یبارک فی ثمن ارض و دراہم
ان یجعل فی ارض و دراہم
زمین یا گھر ہی میں لگا دیا جائے۔
نہیں برکت دی جاتی زمین اور گھر کی
قیمت میں مگر یہ کہ پھر اس قیمت کو

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں جو ”اصل“ کی حیثیت سے کام کرتی ہیں اولاً ان کو الگ
ہی نہ کرنا چاہئے اور اگر کسی ضرورت (مثلاً تبدیل مقام یا اور کسی وجہ سے) آدمی ان کو الگ کرے
بھی تو چاہیے کہ ان کے روپے کو پھر کسی ایسی چیز میں لگا دے جو ”اصل“ کا کام دے سکیں۔
یہ حکم تو ان لوگوں کے لئے ہوا جن کے مال میں ”الاصل“ اور ”العفو“ کی صورت بھی پیدا ہوئے

باقی جن کی گذراوقات کسی "اصل" کی آمدنی پر نہیں ہے مثلاً ملازم پیشہ لوگ جو یا مزدوری وغیرہ کرتے ہیں ان کو اپنے مصارف میں کس قانون کی پابندی کرنی چاہیے اسی کا جواب سورہ بنی اسرائیل کی آیت

لا تجعل يدك الى عنقك ولا

تسطها كل البسط۔

اور سورہ الفرقان کی آیت

الذين اذا الفقوا الحديث

ولم يقتروا وكان بين

ذالك قواما۔

قوام کی تفسیر کرتے ہوئے بیضاوی نے قوام یعنی قاف کے زیر کی صورت میں اس کا ترجمہ "وسطاً عدلاً" کیا ہے۔ وجہ یہ لکھی ہے کہ

لاستقامة الطرفین۔

اور "قوام" قاف کے زیر سے اس کا ترجمہ

ما يقام به الحاجة لا فضل

عنها۔

خلاصہ یہی ہے کہ درمیانی حالت اختیار کرنی چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی معین بات نہ ہوئی

جس کا مطلب یہی ہوا کہ یہ ہر شخص کے اختیار تمیزی کے سپرد ہے کہ اپنے مصارف کو حد اعتدال سے

متجاوز نہ ہوئے دے نہ روکنے میں نہ خرچ کرنے میں اور واقعہ یہی ہے کہ جن لوگوں کی آمدنی کا

ذریعہ کوئی اصل نہیں ہے۔ بجز ان کے اختیار تمیزی کے اور اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے کہ خود

ان ہی کے سپرد ان کا معاملہ کیا جائے اور یہی کیا گیا ہے۔

